گاڑی آچکی تھی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا اژدحام تھا۔ خدمت گار نے ڈبے تک ہماری رہبری کی۔ سلمٰی کے ہاتھ پاؤں کپکپا رہے تھے۔ سانس بھی قابو میں نہیں تھی۔ بسمل نے نشست پر بٹھا کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا" اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اسے بازو میں سمیٹ کے بولا "اب مٹی جھاڑ دے ری ساری۔"

سلمٰی کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ بسمل کے شانے پر سر رکھ کے وہ پھوٹ پڑی۔ بہت دیر بعد بسمل کی تسلیوں سے کہیں اس کے آنسو تھمے۔

گاڑی چلنے سے چند منٹ پہلے زورا اور جمرو خندہ پیشانی سے ڈبے میں داخل ہوئے۔ "بس استاد!" جمرو نے زیر و زبر آواز میں کہا "گاڑی چلنے تک شاید لوٹ کے نہ آئے۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہے۔"

اس طرح سلمٰی کو کچھ باور کرانا جمرو کا مقصود تھا۔ بسمل نے بھی ان سے تفصیل نہیں پوچھی۔ جمرو اور زورا دو ایک پہر کے لیے ضرور ارشاد علی کو خود سے بے گانہ کر کے آئے ہوں گے۔

انتظار گاہ کا اندرونی کمرا ایسی جگہ نہیں تھا جہاں سے کوئی باہر نہ نکل سکے۔ دروازے کے ساتھ دائیں بائیں فرش سے قریباً دو فٹ اوپر کھڑکیاں نصب تھیں۔ دونوں کھڑکیاں اندر سے بند تھیں اور اندر ہی کی جانب پردے لگے ہوئے تھے۔ متعدد روشن دانوں سے کمرے میں ہوا اور روشنی کی کمی نہیں رہنے دی تھی مگر روشن دان بہت اونچے تھے۔ بچوں کی آمد و رفت روکنے کی خاطر کھڑکیوں کے نچلے حصے پر لوہے کی جالی دار سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ارشاد علی کے حکم کے بموجب ہم اندرونی کمرے میں بند ہو جاتے اور باہر سے وہ کنڈی لگا دیتا تو کرسی رکھ کر کھڑکیوں سے یہاں کمرے میں کودا جا سکتا تھا۔ کھڑکیاں نہ ہوتیں تو دروازہ توڑنا ایسا دشوار نہیں تھا لیکن ارشاد علی کو وقت ہی کتنا چاہیے تھا، اس قدر کہ اندرونی کمرے میں ہمیں بند کرتے ہی وہ پوٹلی اپنے قبضے میں کرے اور آناً فاناً انتظار گاہ سے نکل کر اسٹیشن کے ہجوم میں گم ہو جائے۔ سلمٰی کے ساتھ یقیناً رکاوٹ پیش آتی۔ مال ہاتھ میں آجانے کے بعد اسے سلمٰی سے غرض بھی کیا تھی۔ سلمٰی کو وہیں چھوڑ کے وہ کسی محفوظ سمت کو نکل سکتا تھا۔

سورج زمین سے خاصا اوپر ہو چکا تھا۔ یہ بڑی لائن کی گاڑی تھی۔ رفتار بہت تیز تھی۔ ڈبا بھی کشادہ تھا۔ سلمٰی بانو کے خیال نے مجھے روکے رکھا۔ میں جمرو اور زورا سے نہ پوچھ سکا کہ انہوں نے ارشاد علی سے کس درجے کا سلوک کیا تھا۔

STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH 5556532
PROP.

دلی تک کا سفر پورے دن اور رات پر محیط تھا۔ ہوش میں آتے ہی ارشاد علی سے بعید نہیں کہ وہ سیدھا پولیس کا رخ کرے۔ وہ کوئی بھی دیوانگی کر سکتا ہے۔ نواب عابد علی خان نے جس طرح حیدر آباد سے جانے والی گاڑیوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے، ہماری جستجو میں بھی آنے والے اسٹیشنوں پر پولیس چھاپے مار سکتی ہے اور ہمیں تلاش کرنا نہایت آسان ہوگا۔ چار آدمی، ساتھ میں ایک عورت اول درجے کے مسافر' ان عمروں اور ایسی وضع قطع کے حامل! زرو جواہر کی پوٹلی کہیں محفوظ نہیں کی جا سکتی تھی۔ سامان میں تمنچے اور کارتوس الگ تھے۔ شاید مختلف گاڑیوں میں سفر کرنا ہمارے لیے بہتر ہوتا یا پھر آنے والے کسی اسٹیشن پر اتر کے کوئی اور گاڑی پکڑنی چاہیے تھی۔

گاڑی میں [illegible] گم صم سلمیٰ بانو نشست کے کونے میں دبکی [illegible] تک اس کے قریب بیٹھا جانے کیا کتنا رہا [illegible] آگیا۔ ابھی تک کسی کے چہرے سے [illegible] نہیں تھیں۔ اس کا سبب محض گزشتہ رات کا غبار نہیں ہوگا یا درپیش سفر کی طوالت کا بار۔ میری طرح ان کے سروں پر بھی مکڑی جالا بن رہی ہوگی کہ وہ مجھ سے زیادہ شامل رہے تھے۔

جمرو اور زورا 'ارشاد علی کو ختم کر کے نہیں آئے ہوں گے۔ اڈے پاڑے کے لوگ اور ہوتے ہیں۔ وہ ارشاد علی کو اندرونی کمرے کی آرام کرسی یا صوفے پر لٹا کے آئے ہوں گے۔ خدمت گار کو ابتدا میں بٹھل نے اچھی بخشش دی تھی اور میں نے بھی نوازا تھا۔ وہ مسلسل سلام کرتا رہا تھا۔ انتظار گاہ واپس جاکے جیسے ہی خدمت گار کی نظر بے حس و حرکت ارشاد علی پر جائے گی' وہ اپنے افسر کو مطلع کرے گا۔ کوئی حیل وحجت کے بغیر افسر کو طبیب اور پولیس طلب کرنا چاہیے۔ طبیب کی کوششوں سے ارشاد علی جلد ہوش میں آسکتا ہے۔ اپنے حواس کے قیام و قرار کے بعد اسے دو میں سے کوئی ایک فیصلہ کرنا ہے۔ اپنی جاں بخشی غنیمت سمجھے اور نوشتہ سمجھ کے دانش مندی کا ثبوت دے یا اپنی آگ کا فتیلہ پولیس کے ہاتھ میں تھما دے۔ سنا ہے 'ڈوبتا ہوا آدمی کنارے پر کھڑے ہوئے لوگوں کے ڈوب جانے کی آرزو بھی کرتا ہے' خواہ دوستوں کے لیے کوئی ایسا نہ چاہے' دشمن تو دشمن ہوتے ہیں۔ دوسرا فیصلہ صاف خود کشی تھی لیکن روح کی طمانیت کے ساتھ فیصلہ کرنا ارشاد علی کے لیے اتنا سہل نہ ہوگا۔ زندگی زرو جواہر کے بڑے سے بڑے ذخیرے سے بیش بہا ہوتی ہے۔ یہ زندگی ہی کا غلبہ تھا کہ اس نے نظام آباد اسٹیشن پر پولیس دیکھی تو سلمیٰ بانو کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ اسے پوٹلی بھی ساتھ لے جانی چاہیے تھی مگر پوٹلی کے ساتھ زندگی عذاب سے دوچار ہو سکتی تھی۔ زرو جواہر ارشاد علی کا ترکہ نہیں تھے کہ اجداد سے پشیمانی کا خیال کانٹے بچھائے رکھے۔ خاموشی میں ارشاد علی کے لیے بڑی نجات تھی۔ سلمیٰ کی بازیابی خارج از امکان نہیں تھی۔ امید رکھنے والے کو دنیا ہمیشہ جھوٹی نظر آتی ہے' دیواریں بھی۔ قمار باز از سر نو بساط بچھانے سے نہیں گھبراتا بلکہ مچلتا رہتا ہے۔ ارشاد علی بہرحال ایک آدمی تھا۔ آدمی احساس سے عبارت ہے۔ [illegible] ہے' کوئی خوابیدہ احساس ارشاد علی کے سیہ خانے میں بیدار ہو جائے اور آئینہ دیکھنے کے لیے ضد کرے۔

بٹھل کی ہدایت پر [illegible] پوٹلی والے کپڑے پہن لیے' برقع بھی نکال لیا۔ [illegible] مسافت کے بعد چالیس گاؤں نامی اسٹیشن آگیا۔ [illegible] جمرو اور زورا نے سلمیٰ سے آ ذرکھ کے سامان میں [illegible] بٹھل کے اور میرے کپڑے سلمیٰ کے [illegible] تھے۔ تمنچے اور کارتوس والی اٹیچی ساتھ لے لئے تھے۔ جمرو اور زورا چالیس گاؤں نامی اسٹیشن پر اتر گئے۔ بٹھل نے زرو جواہر بھی ان کے حوالے کر دیے تھے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو اسٹیشن سے باہر جا کے بس کے ٹکٹ خریدنے تھے اور کسی بھی ڈبے میں بیٹھ جانا تھا۔ اس اہتمام سے ظاہر تھا کہ بٹھل کے دماغ میں بھی وہ خود رو وہم و قیاس نمو پا رہے تھے جن سے میرا سر جکڑا ہوا تھا۔

من ماڑ سے چلے ہوئے تین گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ گیارہ بجے بھساول جنکشن آگیا۔ کسی سپاہی نے ہمارے ڈبے کا رخ نہیں کیا۔ پلیٹ فارم پر بھی دور دور تک پولیس نہیں تھی۔ چالیس گاؤں میں زورا اور جمرو کے ڈبے سے اتر جانے کے بعد بٹھل نے چائے منگوائی تھی۔ بھساول پر پولیس کی طرف سے مطمئن ہو کے زورا کھانے پینے کا سامان دے گیا تھا۔ دو گھنٹے بعد کھنڈوہ جنکشن آگیا۔ اس بار جمرو ہمارے ڈبے کے گرد چکر لگاتا رہا۔ ناشتا ہی اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ دوپہر کے کھانے کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ اٹارسے ہوتی ہوئی گاڑی ساڑھے پانچ بجے بھوپال پہنچ گئی۔ دلی جتنی قریب ہو رہی تھی' پولیس کی دست اندازی کا اندیشہ اتنا ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ ڈبے سے زرو جواہر چلے جانے سے سلمیٰ بانو کا چہرہ نکھر سا گیا تھا۔ اطمینان صرف چہرے کا نہیں ہوتا' آدمی کی حرکات و سکنات میں بھی ایک توازن آجاتا ہے۔ گو جمرو اور زورا کے ساتھ نہ ہونے سے بڑی اداسی ہو گئی تھی۔ سفر میں ساتھیوں

کی کثرت سے منزلیں آسان ہو جاتی ہیں [illegible] جانے کے بعد میں اوپر کی برتھ پر چلا گیا۔ سلمیٰ نے بھی مسلسل دو بے چین راتیں گزاری تھیں۔ عورت کو نیند میں بھی حجاب کا کیسا خیال رہتا ہے یا یہ سلیقے کی بات تھی۔ خوابیدگی کی حالت میں بھی سلمیٰ کا سلیقہ دیدنی تھا۔ سر سے پیر تک بدن چادر میں چھپائے' چپکے چپکے سوتی رہی۔ درمیان میں آنے والے اسٹیشنوں کی مجھے بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ بینا جنکشن پر بٹھل کی صداؤں سے کہیں آنکھ کھلی۔ جانے کہاں سے جمرو نفیس قسم کے کھانوں کا انبار اٹھا لایا تھا۔ ہم تینوں نے سیر ہو کے کھایا۔ جمرو اور زورا کو اب ڈبے میں واپس آجانا چاہیے تھا لیکن نہ بٹھل نے واپسی کے لیے ان سے کچھ کہا نہ انہوں نے زبان کھولی۔ چالیس گاؤں میں انہوں نے تیسرے درجے کے ٹکٹ لیے تھے اور جگہ نہ ملنے پر انٹر میں بیٹھ گئے تھے۔ بھساول اور بھوپال میں ٹکٹ چیکر ہمارے ٹکٹ چیک کرنے آیا تھا۔ زورا بتا رہا تھا کہ کھنڈوہ میں کسی قوطی ٹکٹ چیکر نے ان کے ڈبے کا بھی پھیرا لگایا تھا اور انٹر میں ان کے سفر کرنے پر معترض ہوا تھا۔ زورا نے جب انٹر کا کرایہ ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو ٹکٹ چیکر بے پروائی سے بولا "رکھو یار' جب تک گوری سرکار ہے' عیش کرو۔"

زورا اور جمرو اس سے نہ کہہ سکے کہ گوری سرکار کا بوریا تو انہوں نے پہلے ہی ترک کر دیا ہے۔ ان کے پاس تو من ماڑ سے دلی تک کے اول درجے کے ٹکٹ ہیں۔

صبح خوب روشن ہو گئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے گاڑی دلی شہر میں داخل ہو گئی۔ زورا اور جمرو نے آخر تک احتیاط کی۔ دلی اسٹیشن ہی پر وہ ہمارے ساتھ ہوئے۔ ارشاد علی کے سر میں کسی وقت بھی سودا سا سکتا تھا۔ ممکن ہے' اس باریک بین کے ذہن پر یہ رمز نقش نہ ہو گیا ہو کہ ہم نے من ماڑ سے آگے کسی بھی اسٹیشن سے راستہ بدل دیا ہوگا۔ عاقبت اندیشی یہی ہے کہ ہمیں اس گاڑی سے دلی کا سفر نہیں کرنا چاہیے۔ زندگی کی اپنی خامیاں' خوبیاں ہیں۔ کوئی عجب نہیں' یہی سوچ کے ارشاد علی نے ہمارے تعاقب کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔ اس کے لیے یہ تلخی مستزاد تھی کہ پولیس کو مہمیز کرنے سے مراد اپنے آپ سے بھی دست بردار ہو جانا ہے۔

دلی اسٹیشن بھول بھلیوں کے مانند ہے۔ ہر وقت ایک ہنگامہ' کسی گاڑی کے کوچ کا نقارہ پٹ رہا ہے' کسی گاڑی کی آمد کا غلغلہ ہے۔ دلی سے ہمیں فیض آباد کا ٹکٹ لینا تھا لیکن جب بٹھل نے زورا اور جمرو سے مراد آباد کے ٹکٹ کے لیے کہا تو میرے پیر زمین پر ٹکے نہ رہ سکے۔ میرے لیے یہ بہت ان کہی' ان ہونی تھی۔ میں تو بٹھل کو دیکھتا رہ گیا۔ مراد آباد میں مولوی صاحب کی موجودگی کی کسی توقع ہی میں بٹھل نے یہ عزم کیا ہوگا۔ درمیان میں یقیناً مجھ سے تسلسل کی کوئی چوک ہو گئی تھی۔ مجھے کہیں بھی گمان نہیں ہوا کہ بٹھل کو حیدر آباد میں کسی جگہ مولوی صاحب کی اگلی منزل کا اشارہ ملا ہے اور اسے دلی آنے کی کیا ضرورت ہے۔ سلمیٰ بانو کو زریں کے پاس فیض آباد پہنچنا ہے تو من ماڑ کے قریب کے کئی راستے ہیں۔ حیدر آباد میں ہر دم میں بٹھل کے ساتھ رہا تھا۔ صرف ایک جگہ جب ڈاکٹر ناصر مرزا کے بتائے ہوئے پتے پر وہ مولوی صاحب کی بالائی اقامت گاہ پر گیا تھا تو میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہیں خادمہ سے بازپرس میں اسے مولوی صاحب کے آئندہ پڑاؤ کی سن گن ملی ہو۔

ڈھائی گھنٹے انتظار کے بعد ساڑھے دس بجے مراد آباد جانے والی پسنجر ٹرین ہمیں مل گئی۔ دلی سے مراد آباد تک سو میل کا فاصلہ گاڑی نے رینگ رینگ کے کاٹا۔ راستے بھر میں نے مولوی صاحب کی بابت بٹھل سے کوئی سوال نہ کیا' زورا اور جمرو سے میں اپنے آپ ہی کو تسکین کرتا رہا کہ مجھے کون سا کام درپیش ہے۔ جو پہلے ہوتا رہا ہے' اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کوشش کر لینے میں یہ ملال تو نہیں رہتا کہ ایک خانہ خالی رہ گیا تھا۔ خوش نمائی کی امید کم سے کم رکھی جائے تو آدمی ٹھکانے سے رہتا ہے۔ شکستہ تو یہ امید ہی کرتی ہے۔

مراد آباد کے ارد گرد کے اسٹیشن مجھے ازبر تھے۔ امروہے سے مراد آباد بیس میل کی دوری پر ہے۔ امروہے ہی سے میرا دل اڑنے لگا تھا۔ آدمی دوسروں کی لگام خوب کھینچ سکتا ہے۔ خود کو قابو میں رکھنے کی دسترس اسے نہیں ہوتی۔ مراد آباد اسٹیشن پر قدم رکھ کے میرے ہاتھ پیر کھنچنے لگے تھے۔ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ اسٹیشن کے عین مقابل' سڑک کے اس پار اسلامیہ مسافر خانہ واقع ہے۔ قلی نے ہمارا سامان وہاں تک پہنچا دیا۔ مسافر خانے کی دوسری منزل ایک زمانے سے ادھوری تھی۔ پہلی منزل پر ایک کشادہ کمرے میں سلمیٰ بانو کا انتظام کر کے بٹھل مجھے مسافر خانے کے منیجر کے پاس لے آیا۔ منیجر کی تبدیلی ہو گئی تھی۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا اور مولوی صاحب کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ قصہ تمام ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گزشتہ تین چار دن کے مسافروں میں مولوی صاحب کا نام روزنامچے میں کہیں درج نہیں تھا۔ حیدر آباد سے مولوی صاحب کے براہ راست مراد آباد آنے کی صورت میں دو تین دن سے زیادہ کی طور نہ ہوئے ہوتے۔ بٹھل سے بحث و تکرار فضول تھی ورنہ کئی بار

میرے جی میں آئی' اس پر واضح کردوں کہ اب مراد آباد کے اسلامیہ مسافر خانے میں مولوی صاحب کے قیام کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انہوں نے اسی دن یہ طے کرلیا ہوگا جب حیدر آباد میں انہیں نواب ثروت یار کی زبانی ہماری آمد کی اطلاع ملی تھی۔ نواب ثروت یار کا پتا ہم نے مسافر خانے کے روزنامچے ہی سے حاصل کیا تھا۔ مولوی صاحب تو اس راستے سے اب گزریں گے بھی نہیں اور بٹھل کے خیال میں مولوی صاحب کو پے درپے حوادث' ایک مسلسل دربدری و درماندگی سے تنگ آکے آخر اپنے آبائی شہر میں پناہ لینے کا کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے بھولے بسرے احباب' اعزا کے دروازوں پر دستک دی ہوگی۔ مغلوں کے زمانے سے مسلمانوں کی ایک سرائے بھی شہر میں موجود تھی لیکن وہاں کورا کے ساتھ قیام ممکن نہیں تھا۔

بٹھل کی گزارشانہ خواہش کی تعمیل میں منیجر نے کسی قدر توقف کے بعد اپنے معاون کو دفتر سے باہر بھیج دیا۔ خلوت ہونے پر بٹھل نے کسی تمہید کے بغیر اس سے کہا' بہتر ہوگا' وہ کوئی سوال نہ کرے کہ دونوں کا وقت ضائع ہوگا۔ ایک پرانی معاملت کے سلسلے میں ہمیں مولوی محمد شفیق کی تلاش ہے۔ اس نام اور حلیے کا کوئی شخص آئندہ مسافر خانے میں قیام کرے تو تار کے ذریعے ہمیں مطلع کردیا جائے۔ دو ہزار روپے ایک بڑی رقم تھی۔ منیجر کی آنکھیں حیرت سے دوچار ہوگئیں۔ بٹھل نے اس خدمت یا سلوک کے عوض دو ہزار روپے کی نذر کا وعدہ کیا۔ منیجر ایک اصیل نوجوان تھا' اس نے ہمارے پتے پورے انہماک سے کاغذ نشین کیے' پھر مسکراتے ہوئے بولا "آپ کا کام ہوجائے گا جناب عالی! اس مسرت سے بڑھ کے کوئی انعام کیا ہوگا۔" بٹھل نے کرسی سے اٹھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

بٹھل نے مسافر خانے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ سلمٰی کے پاس زورا اور جمرو کو چھوڑ کے وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر شہر شروع ہوجاتا ہے۔ بازار شاہی مسجد کے علاقے میں جامعہ قاسمیہ کا راستہ مجھے یاد تھا۔ تانگے والے نے ہمیں شاہی مسجد کے سامنے اتار دیا۔ ایک بڑی مسجد کے اطراف دو منزلہ عمارتوں پر دارالعلوم قائم ہے۔ درس گاہیں بند ہوچکی تھیں لیکن ایک بنگالی طالب علم نے محلہ کھیر سید خاں میں مقیم دارالعلوم کے مہتمم کے گھر تک ہماری رہ نمائی کی۔ مغرب کی نماز کا وقت گزر جانے کے بعد ہم نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ نہایت متین اور خلیق بزرگ تھے۔ بیٹھک میں بٹھایا' شربت منگوایا۔ مولوی صاحب سے اچھی طرح واقفیت کے باوجود ایک عرصے سے انہیں مولوی صاحب کی کوئی خبر نہیں تھی۔ البتہ ان سے شہر میں مولوی صاحب کے کئی شناساؤں کے نام اور پتے معلوم ہوگئے۔ وہاں سے اٹھتے اٹھتے عشا کی اذان ہو رہی تھی۔ اس وقت کسی اور دروازے پر جانا مناسب نہیں تھا۔ پیدل چلتے چلتے ہم بازار منڈی چوک تک آگئے۔

چوک میں دن کا منظر تھا۔ آمنے سامنے قریب قریب جگمگاتی دکانیں' خوانچے والوں کی صدائیں' راہ گیروں اور خریداروں کا ہجوم' ایک جانب گل فروش پھولوں کی ٹوکریاں لیے قطار سے بیٹھے تھے۔ بٹھل نے موتیا کے بہت سے ہار خریدے۔ اتنے دنوں بعد یوں فرصت و فراغت سے بازاروں میں گھومنا عجب لگ رہا تھا' نیا نیا سا۔ اب نہ کوئی گراں باری تھی نہ وقت جلد یا دیر سے گزرنے کا احساس زیاں۔ پس پائی کی بے حسی بٹھل کے تیوروں سے نمایاں تھی۔ پس پائی کا سکون بہت ٹھہرا ہوا اور چھریلا سا ہوتا ہے۔ اپنے ہنر تمام کرلینے کے بعد آدمی کے پاس سوزش کے لیے رہ بھی کیا جاتا ہے۔ بے کار مباش کچھ کیا کرے' پیپل کے بھیگے پتوں میں با[ر]

پھول بندھوا کے بٹھل پان کی ایک سادہ اور صاف ستھری دکان پر ٹھہر گیا۔ دکان میں لوبان سلگ رہا تھا اور کرشن جی کے چھوٹے مجسمے کے سامنے دیا روشن تھا۔ اجلے کپڑوں میں ملبوس' قشقہ لگائے عمر رسیدہ پنواری نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور اہتمام سے بیڑا بنا کے نقرئی طشتری میں پیش کیا۔ سکے طشتری میں ڈال کے بٹھل چل پڑا تھا کہ پنواری نے ہاتھ کے اشارے سے رک جانے کی درخواست کی اور قسم قسم کے مسالوں سے مزین' چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا ایک بیڑا میری طرف بڑھا دیا "کھاؤ چھیلا!" وہ بیڑا تھماتے ہوئے بولا "ایک تم بھی کھاؤ اور جان بناؤ۔ بھگوان نے چاہا' پنڈت کو یاد کرو گے۔"

مجھ سے منع نہیں کیا جاسکا۔ میں نے بیڑا منہ میں رکھ لیا۔ بہت نفیس پان تھا۔ منہ میں خوشبو بکھر گئی۔

"سچی بولو' راج کمار! سواد آیا؟"

"بہت اچھا ہے۔" میں نے ممنونیت سے کہا "کوئی خاص چیز ڈالتے ہیں آپ اس میں؟"

وہ اوپر کی طرف سر اٹھا کے بولا "سب اس کی لیلا ہے۔ وہی ڈالتا ہے۔"

"بولتے ہیں ہاتھ کی بات ہوتی ہے پنڈت جی۔" بٹھل نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"نا مہاراج! جو سچ پوچھو تو بات ساری من کی ہے۔

تو دن بھر لگاتا ہوں' پر دن میں کوئی کوئی آتا ہے جن میں من لگتا ہے۔"

"اس کی پہچان کیا ہوتی ہے پنڈت؟" بٹھل نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں بھی یہی پوچھنے والا تھا۔

"اب کیا بولیں بھیا" اس کا تو روپ ہی اور ہوتا ہے۔" پنڈت تیکھی آواز میں بولا "بن باس والا الگ سے پہچانا جاتا ہے۔"

میرا جسم بل کھا گیا۔ پنڈت کی نگاہیں مجھی پر مرکوز تھیں۔ جیسے مجھے حصار میں لیے ہوئے ہوں۔

"چکر پورے کرائے بنا نہیں مانے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا "سے دیوتا بڑا البیلا بہت نٹ کھٹ ہے۔"

"کیا ہے پنڈت جی۔۔۔؟" بٹھل نے تجسس سے کہا۔

"کیا بھیا۔" پنڈت آہ بھر کے بولا "اپنے ساجنا کو دیکھو' بگیا میں' مانو آگ لگ رہی ہے۔ سے کی چکرن پوری ہے۔"

"پھر اپائے بھی تو بولو۔" بٹھل نے تندی سے کہا۔

"رام جی سے پوری چودہ گا جیسیں نہ کھوالیں تب تک منہ چھپے کیا رہا۔ کیا اپائے کرے کوئی۔" پنڈت بے چارگی کے انداز میں بولا۔ جوگی کا کام چیچے کرتے رہنا ہے۔ نہیں دم ہے تو چنتا کرلے پھر اپنی بھی۔"

وہ کوئی بڑا قیافہ شناس اور جہاں دیدہ شخص تھا مگر قیافہ کوئی یوں ہی تھوڑا ہی لگالیتا ہے۔ میری آنکھوں' میرے چہرے میں دوسروں سے جدا ضرور کوئی ایسی بات ہوگی' ضرور کچھ لکھا ہوگا جو پنڈت نے آسانی سے اخذ کرلیا۔ جرمن زبان وہی پڑھ سکتا ہے جو اسے جانتا ہو مگر کاغذ پر کچھ لکھا ہو بھی تو۔ بٹھل اسے نمسکار کرکے آگے بڑھ گیا۔ پنڈت سے مزید پوچھنا اور اسے بتانا بھی کیا تھا۔ لوگ اس سے ہمدردی کا اظہار کیوں کرتے ہیں جو کسی ہمدردی کا خواہاں نہ ہو۔ سارے راستے پنڈت کی باتیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔ میں تو کسی سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ سب کچھ خود تک محدود رکھتا ہوں لیکن یہ آنکھیں' یہ چہرہ' کہاں چھپاؤں۔ اگر ان سے ایسی ہی وحشت برستی ہے تو لوگ کیوں اور کیا جتانا چاہتے ہیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ مجھے تو اپنے آپ سے اور بیزاری ہونے لگتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ نوازش کیسی گراں گزرتی ہے۔ اس سے تو ٹھنڈک کے بجائے جسم و جاں میں اور تپش ہوتی ہے۔ یہ سلوک تو بھیک کے مانند لگتا ہے۔

چوک سے تانگے میں سوار ہوکے ہم مسافر خانے لوٹ آئے۔

منیجر عبدالباسط ہمارے انتظار میں باہر ٹہل رہا تھا۔ جمرو اور زورا ابھی اس کے ساتھ تھے۔ شام کو شہر جاتے وقت بٹھل نے عبدالباسط کو رات کا کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دی تھی۔ رسمی رد و قدح کے بعد وہ آمادہ ہوگیا تھا۔ ہماری عدم موجودگی میں اس نے عمارت کے بیرونی حصے میں ایک ہوٹل کے مالک صدیق باورچی کو احکام دے رکھے تھے۔ کھانا تیار ہوچکا تھا اور دفتر کی میز پر دسترخوان سجا ہوا تھا۔ سلمٰی کے لیے ایک طشت اوپر بھیج دیا گیا۔ اتنے کم وقت میں اتنی اقسام کے خوش ذائقہ کھانے تیار کرلینا بجائے خود ایک کمال تھا۔ صدیق باورچی بھی موجود تھا۔ دعوت ہماری جانب سے تھی۔ سرگرم وہ دونوں تھے۔ کھانے کے بعد ان کی مسکوٹ کا عقدہ کھلا جب صدیق نے پیسے لینے سے انکار کردیا۔ کھانے کے ساتھ وہ باتیں بھی خوب جانتا تھا۔ مخمل کی پوری ٹوپی اتار کے کہنے لگا "بہتر ہے' بندہ پرور! آپ اپنی جوتی اتار لیں۔ خادم کی تو کسی کام کی نہیں ہے۔" بٹھل کے اصرار پر وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "بہت سے وقت آئیں گے عالی جاہ! یہاں نہیں تو وہاں تو اگلا پچھلا سارا حساب کتاب ہوگا ہی۔ وہیں ایک دوسرے کو قائل معقول کرلیں گے۔"

کھانے کے دوران میں عبدالباسط مسافر خانے کی تعمیر کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ اس کا دعوا تھا کہ تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس عمارت کو ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے مسافر خانے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ فرشی اور پہلی منزل کے چاروں طرف ہر کمرے پر پیتل کی تختیاں آویزاں تھیں۔ تختیوں پر ان صاحب حیثیت لوگوں کے نام کندہ تھے جنہوں نے ایک کمرے کے تعمیری مصارف کے بہ قدر یا اس سے زیادہ رقم عطیہ کی تھی۔ کھانے کی میز سے اٹھ کے ہم صحن میں آکے بیٹھ گئے۔ تب بٹھل نے ہزار روپے جیب سے نکال کے عبدالباسط کے سامنے رکھ دیے۔ عبدالباسط پر حیرانی طاری ہوئی مگر اس نے معذرت کرلی کہ وہ ایسے کسی عطیے کی وصولی کا مجاز نہیں۔ مسافر خانہ شہر کی ایک خاص برادری نے بنایا ہے اور متوالی سے بات کرکے ہی وہ اس رقم کی قبولیت کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہے۔ بٹھل نے وضاحت کردی تھی کہ اس کا مقصد کسی کمرے پر اپنے نام کی تختی آویزاں کرانا نہیں ہے۔ حالت سفر کی وجہ سے وہ فی الحال زیادہ رقم نہیں دے سکتا۔ متوالی آمادہ ہوجائے تو گھر پہنچ کے مزید رقم بھی بھجوائی جاسکتی ہے۔

عبدالباسط مجلسی قسم کا ایک خوش باش اور پرعزم نوجوان تھا۔ مسافر خانے میں روز ہی بے شمار مسافر آتے جاتے تھے مگر کچھ لوگ کسی جواز کے بغیر مرغوب ہوجاتے

ہیں۔ ایک پہر میں عبدالباسط ایسا گھل مل گیا تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ گو بٹھل کی مراد مسافر خانے کی تعمیر میں اعانت کے سوا کچھ نہ تھی مگر یہ سخاوت، جاہ و حشمت کا مظہر تھی۔ دولت سب سے بڑا وصف ہے جس کے پاس نہ ہو، اس پر اس کا جادو اور کاری ہوتا ہے۔ بٹھل کے عطیے سے مسافر خانے کے کم از کم دو کمرے اور تعمیر ہو سکتے تھے۔ یقیناً عبدالباسط پر بٹھل کی اس دریا دلی و داد و دہش کا اثر بھی گہرا ہونا چاہیے تھا۔ رات گئے گھر کے لیے رخصت ہوتے وقت اس نے از خود بٹھل سے وعدہ کیا کہ وہ مولوی صاحب کی ٹوہ میں رہے گا اور ان کے بارے میں ہونے والی معلومات سے ہمیں مطلع کرتا رہے گا۔ اگر واقعی مولوی صاحب کا تعلق مراد آباد سے ہے تو وہ انھیں کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔ ہم میں سے کسی نے اس کی عزم شکنی نہیں کی کہ اس نے دنیا ہی کتنی دیکھی ہے۔ دنیا حد نظر سے بڑی اور دست رسائی سے کہیں سوا ہے۔ اس میں بہت سمندر، بہت دریا، بہت پہاڑ، بہت پتھر اور دیواریں ہیں۔

عبدالباسط نے سلمٰی کے کمرے سے ملحق ایک اور کمرے کا بندوبست کردیا تھا۔ سلمٰی نے پرسکون رات گزاری ہوگی۔ صبح جب ہم اس کے کمرے میں گئے تو بڑی شگفتہ و تروتازہ نظر آرہی تھی۔ وہیں سب نے ناشتا کیا۔ نو بجے کے قریب بٹھل اور میں شہر کی طرف نکل پڑے۔ امدادیہ مدرسہ، مدرسہ فلاح دارین میں مولوی صاحب نے کچھ عرصے قرآن پاک کی تعلیم دی تھی۔ جامعہ نعیمیہ میں ان کے پرانے ساتھی حافظ شفیع الدین کا نام بھی ہمیں کسی نے بتایا تھا۔ مولوی صاحب کے محلے، ان کے پڑوسی، دور دراز کے رشتے دار، شاگردوں کے علاوہ جس کمپنی کے برتنوں کے نمونے لے کر مولوی صاحب نے شہروں شہروں کمیشن ایجنٹی شروع کی تھی، جس سمت کی لوگ نشاندہی کرتے رہے، ہم وہاں وہاں جاتے رہے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے امروہہ گیٹ کے سلام ہوٹل میں کھایا۔ مراد آباد شہر اتنا بڑا نہیں ہے۔ تاہم رات آٹھ بجے تک کوچہ گردی کے بعد بھی بہت سی جگہیں اور لوگ رہ گئے۔ دوسرے دن پھر تیسرے دن دوپہر کو کہیں یہ تسلی ہوئی کہ شہر میں مولوی صاحب کے مزید شناساؤں سے مل کے کوئی نئی بات معلوم ہونے کا امکان نہیں ہے۔ بعض جگہوں سے ہمارا کئی بار گزر ہوا۔ کئی آدمی پہچاننے اور روک روک کر سلام دعا کرنے، حال احوال پوچھنے لگے تھے۔ مولوی صاحب کے بارے میں زبان کھولنے سے پہلے لوگ عموماً اپنا تجسس دور کرتے تھے۔ وہ ہم سے طرح طرح کے سوالات کرتے کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں وغیرہ۔

مولوی صاحب کی کوئی امانت لوٹانے کا ایک ہی موثر و معقول عذر بٹھل کے پاس تھا۔ امانت ہی کی بات تھی۔ ہمیں لوٹانی تھی یا مولوی صاحب کو۔ مراد آباد شہر ترک کیے ہوئے مولوی صاحب کو دس برس سے اوپر ہو چکے تھے۔ ابھی تک شہر میں انھیں بہت سے لوگ جانتے تھے۔ ان کی راست بازی، معاملہ فہمی اور خوش اطواری تقریباً سبھی پر نقش تھے۔ کسی کی پیشانی ان کے ذکر سے شکن آلودہ نہیں ہوئی۔ شاید کسی کے سینے میں ان کے لیے کوئی عناد نہیں تھا۔ مولوی صاحب کے محلے کے بعض لوگوں کو ان کی حد درجے کنارہ کشی اور گوشہ گیری سے شکوہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب ہر کس و ناکس کے قریب نہیں آتے تھے۔ منڈی چوک میں مسلم پبلک لائبریری کا لائبریرین کہتا تھا کہ انھیں تاریخ کے ساتھ قصے کہانیوں کی کتابیں پسند تھیں۔ اخبار و رسائل سے بھی دلچسپی تھی۔ مولوی صاحب پر لائبریری کی تین کتابیں ابھی تک قرض تھیں۔ جامعہ نعیمیہ میں ان کے دوست حافظ شفیع الدین نے مولوی صاحب کی بذلہ سنجی کے بہت سے واقعات سنائے۔ بھٹی محلے کے حکیم سراج الحق کا کہنا تھا کہ مولوی صاحب کو شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا۔ اساتذہ کا منتخب کلام حفظ تھا۔ میر کو وہ عشق کی حد تک پسند کرتے تھے۔ فارسی اور عربی میں غیر معمولی ادراک تھا۔ انگریزی میں بھی کچھ شد بد ہو گئی تھی۔ موزوں طبع تھے اور کچھ کہنا بھی شروع کردیا تھا۔ ممکن ہے چپکے چپکے کہتے رہے ہوں لیکن شاعری عشق اور مشک کی مانند ہے، زر کی طرح بھی۔ ان کا چھپانا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کی طبیعت کو قرار نہیں تھا اس لیے وہ جامعہ قاسمیہ کی اعلیٰ ترین اسناد حاصل نہ کر سکے۔

محلہ تمباکو والان کے شیخ محمد یونس تاجر سے ان کے مراسم خصوصی تھے۔ مولوی صاحب کے ذکر پر شیخ یونس کی آواز چرمرا گئی، کہنے لگے، 'اکثر ہمارے درمیان مذہبی مباحث میں تیزی آجاتی تھی۔ مولوی صاحب حد سے زیادہ تجاوز کرجاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے یقین میں آلودگی کا گمان ہوتا تھا باوجودیکہ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ دیگر مسلک کے علما میں نشست و برخاست تھی۔ جامعہ نعیمیہ بھی جاتے تھے۔ شاہ بلاقیؒ کے مزار پر سماع کی محفلوں میں دعوت ملتی تو ضرو جاتے تھے۔ نذر و نیاز خود نہیں کرتے تھے لیکن معترض بھ نہیں تھے اور شرکت میں بھی اجتناب نہ تھا۔ کہتے تھے، 'س کا مقصد ایک ہے، خدا سے قرب، رسولؐ سے محبت، اظہا

کے طریقے مختلف ہیں۔ ہر شخص اپنے مسلک اور فرقے سے نسبت درست سمجھتا ہے اور درست کون ہے، اس کا فیصلہ کون کرے۔ ہر شخص کی نسبت اس کے والدین، خاندان اور برادری والے طے کرتے ہیں۔ وہ دوسرے مسلک کے خلاف اسے مسلسل بدگمان کرتے رہتے ہیں۔ مطالعے، مشاہدے اور تحقیق و تفتیش کا موقع ہر کسی کو نہیں ملتا۔ سب اپنی مخصوص تربیت، خاندانی عقائد اور عادتوں سے مشروط ہیں۔ کوئی بھی اپنے مسلک سے جدا ہونا نہیں چاہتا، برادری اور گھر میں معتوب ہونے کا خوف اس پر غالب رہتا ہے۔ شیخ صاحب کا مولوی صاحب سے اختلاف معمول بن گیا تھا۔ شیخ صاحب کو اختلاف تھا کہ مولوی صاحب ہر سال ساتویں محرم کو اپنے ایک بزرگ سید علی شیدا کے ہاں عاشورہ کی مجالس میں شرکت کرنے امروہے کیوں جاتے ہیں۔ شیخ کے توسط سے محلہ گھیرا کے ایک پرہیز گار خاندان میں مولوی صاحب کی شادی کی بات پکی ہوگئی تھی۔ مولوی صاحب کو لڑکی دیکھنے پر اصرار تھا۔ مراد آباد کے ثقہ ماحول میں یہ خواہش نہایت معیوب تھی اور اس کی تکمیل اتنی ہی ناممکن۔ شیخ نے ہر طرح لڑکی کی خوش چہرگی، خوش قامتی، تندرستی، تعلیم، سلیقے اور سیرت سے مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن مولوی صاحب اپنی ضد پر قائم رہے۔ آخر شیخ اپنے عزیز و محترم کا گھر بسانے کے لیے ایک غیر شرعی، غیر روایتی اقدام کیا۔ لڑکی کے گھر والوں کو اپنے ہاں مدعو کرکے کسی طور پر لڑکی کی جھلک دکھادی۔ شادی سے چند دن پہلے لڑکی کو یرقان ہو گیا اور مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ مولوی صاحب نے پھر ہمیشہ کے لیے شادی کا ارادہ ترک کردیا۔ اس سانحے نے انھیں بہت آزردہ کردیا تھا۔ بہت دنوں بعد کہیں ان کے چہرے کی تابانی واپس آئی۔

گزشتہ چھ ماہ میں مولوی صاحب تین بار مراد آباد آئے تھے۔ شیخ صاحب کے بڑے بھائی حاجی شیخ محمد یوسف کے پاس مولوی صاحب کی والدہ مرحومہ کے زیورات کی امانت ایک زمانے سے محفوظ تھی۔ حاجی صاحب کا زیادہ وقت عربستان میں گزرتا تھا۔ جب بھی مولوی صاحب اپنی امانت واپس لینے کی غرض سے مراد آباد آئے، حاجی صاحب سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ تین ہفتے پہلے حاجی صاحب مراد آباد میں تھے۔ مولوی صاحب چند گھنٹے بھی نہیں ٹھہرے، اپنی امانت لے کر واپس چلے گئے۔ اس بار انھوں نے مسافر خانے میں قیام نہیں کیا۔ کورا بھی نہیں جانا چاہیے تھا۔ کورا تو ان کے ساتھ ہی ہوگی، کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ کورا کو انھوں نے کہاں ٹھہرایا تھا۔ حاجی محمد یوسف کو بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ مولوی صاحب ان کے پاس تنہا آئے تھے۔

مراد آباد کے مولوی صاحب چیدہ چیدہ لوگوں ہی سے ملتے تھے۔ دس سال کے عرصے میں انھوں نے کچھ لوگوں سے حساب فہمی کی تھی۔ ایک مختصر مکان، محلہ مغل پورہ کہنہ کی دو دکانیں اور حال میں مراد آباد سے سات میل دور ہر تلا بستی میں واقع ایک قطعہ اراضی فروخت کردیا تھا۔ مولوی صاحب کو ہمیشہ قلت و رنجش ہوتی تھی۔ شہر کے کسی دینی و سماجی اجتماع، کسی تقریب وغیرہ میں انھوں نے کبھی شرکت نہیں کی۔ دعوت کے لیے وہ معذرت کرلیتے تھے۔ تعزیت اور عیادت کے لیے شاید کسی کے گھر نہیں گئے تھے۔ عرصہ گزرا، مسافر خانے کے اہل کاروں کے ذریعے شہر میں مولوی صاحب کی جان پہچان والوں کو بھنک مل گئی تھی کہ مسافر خانے میں کوئی عورت بھی ان کے ساتھ مقیم ہے پھر شہر میں بہت دنوں تک چرچے ہوتے رہے۔ بعض احباب کے استفسار پر مولوی صاحب نے صرف اتنا بتایا کہ ان کا قیام بیش تر جنوبی ہندوستان کے شہر بنگلور میں رہتا ہے۔ وہاں عمارت سازی کا سامان بنانے والے ایک کارخانے میں شراکت داری ہے۔ کارخانے کی چیزوں کی کھپت کے لیے وہ مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہیں اور اس طرح تبلیغ و ترویج کا کام بھی بقدر استطاعت انجام دیتے ہیں۔ اپنے ساتھ موجود عورت یعنی کورا کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ وہ ایک بے آسرا لڑکی، ان کی منہ بولی بیٹی ہے اور اب انہی کے ساتھ رہتی ہے۔ مراد آباد میں معدودے چند ان کے قریب ترین رفیقوں کو گلہ تھا کہ مولوی صاحب ان کے گھروں میں اپنی بیٹی کو کیوں نہیں لاتے اور وہ مسافر خانے میں کیوں قیام کرتے ہیں اور ہر بار انھیں واپسی کی اتنی جلدی کیوں ہوتی ہے۔ وہ مولوی صاحب سے ناراضگی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ہر مرتبہ مولوی صاحب نے آئندہ کے لیے وعدہ کیا تھا مگر یہ وعدہ کبھی وفا نہیں ہوا۔ مولوی صاحب کے مزاج میں تبدیلی آجانے پر بھی متفق تھے۔ اب لوگوں نے ان سے زیادہ کہنا سننا چھوڑ دیا تھا۔ جتنا وقت گزرتا جارہا تھا، مولوی صاحب ان سے اوجھل ہوتے جارہے تھے۔ کوئی آٹھ دس برس پہلے مولوی صاحب اپنے ایک ہم جماعت، دیرینہ دوست، جامعہ قاسمیہ کے سابق مدرس حافظ عبدالخالق گھرایا سادات والے کے گھر کچھ عرصے ٹھہرے تھے۔ لوگوں کو یاد نہیں تھا کہ اس وقت ان کے ساتھ کوئی عورت تھی یا نہیں، لازماً ہوگی۔ یہی ہو سکتا ہے، حافظ صاحب نے اپنے دوست کی تاکید کے مطابق

احتیاط کی ہو' کورا کو اپنے گھر تک محدود رکھا ہو اور مولوی صاحب کے ساتھ ان کی موجودگی کا ذکر عام نہ ہونے دیا ہو لیکن حافظ صاحب نے کورا کو کوٹھری میں بند نہیں رکھا ہوگا۔ گھر میں ایک اجنبی لڑکی کی موجودگی پڑوسیوں سے چھپی نہیں رہ سکتی لیکن پڑوسیوں کے توحش و تردد کے لیے مولوی صاحب کے گرد و پیش سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ واللہ علم۔ حافظ عبدالخالق' اب مراد آباد میں نہیں تھے۔ وہ زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے مستقلاً اپنے آبائی شہر چلے گئے تھے۔

مراد آباد میں دوسرے دن جمرو اور زورا' سلمٰی کو شہر گھمانے لے گئے تھے اور انہوں نے سلمٰی کے لیے کئی جوڑوں کا کپڑا خریدا تھا' دیگر سامان بھی۔ زریں جہاں' کیر نیساں اور منیر علی کے گھر والوں کے لیے بھی انہوں نے سلمٰی کے مشورے سے بہت سی چیزیں اکٹھی کی تھیں۔ سلمٰی اپنے لیے کتابوں اور رسالوں کا ایک انبار بھی اٹھا لائی تھی۔ مراد آباد میں قدیم جامعہ مسجد اور رام گنگا دریا کے کنارے کے سوا کوئی قابل دید جگہ نہیں ہے۔ اسی دن شام کو زورا' جمرو اور سلمٰی کو منیجر عبدالباسط کے دائیں جانب شہر کے سرسبز علاقے سول لائنز کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ یہ مراد آباد شہر کا حصہ ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہاں چاروں طرف باغات اور صاف شفاف سڑکیں ہیں اور بڑے بڑے افسروں' دولت مندوں اور گوروں کی کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھاننے کے بعد رات کو ہم مسافر خانے واپس پہنچے تو زورا اور جمرو نے دن بھر کی روداد سنائی۔ سلمٰی بھی ان کی سرخوشی میں شامل تھی۔ عبدالباسط نے اپنے کسی عزیز کے ہاں سے سلمٰی کے لیے سلائی مشین عارضتاً منگوالی تھی۔ یوں مطالعے کے علاوہ سلمٰی کو ایک اور مصروفیت ہاتھ آگئی تھی۔ سینا پرونا اسے اچھا ہی آتا ہوگا۔ جمرو اور زورا کے پاس بھی اس کی دل جوئی' دل داری کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ دو دن میں ایسا لگتا تھا جیسے سلمٰی کے سراپا میں کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔

تیسرے دن سہ پہر کو زورا' جمرو اور سلمٰی کو مسافر خانے چھوڑ کے سنبھل مراد آباد سے تیس میل دور کے فاصلے پر تحصیل سنبھل کے لیے روانہ ہوگیا۔ معلوم ہوا تھا کہ کچھ دنوں تک سنبھل کے ایک مدرسے میں بھی مولوی صاحب نے درس و تدریس کا کام کیا تھا۔ واپسی کی گاڑی نہ ملنے کی وجہ سے رات کو ہمیں شہر کی ایک سرائے میں ٹھہرنا پڑا اور دوسرے دن صبح دس بجے مراد آباد واپسی ممکن ہو سکی۔ چند گھنٹے آرام کے بعد ہم مراد آباد سے مغرب کی جانب بیس میل دور تحصیل امروہہ جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب کے مربی سید علی شیدا کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے بھائی اور بیٹوں نے مولوی صاحب کا ذکر نہایت عزم و احترام سے کیا۔ وہ مولوی صاحب کو گھر ہی کا کوئی فرد سمجھتے تھے۔ رات کا کھانا کھلائے بغیر ان لوگوں نے ہمیں نہیں آنے دیا۔ سید علی شیدا کے خاندان والوں کے بہ قول محرم کی ساتویں کو وہ مولوی صاحب کا شدت سے انتظار کرتے ہیں لیکن مدت گزر گئی' مولوی صاحب نے امروہہ کا رخ نہیں کیا اور ان کی خیریت کیا' اطلاع بھی نہیں ملی۔

صبح ناشتے پر سلمٰی' زورا' جمرو اور منیجر الباسط کے پاس کچھ وقت گزار کے ہم پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس دفعہ سنبھل نے مختصر سامان بھی ساتھ لیا تھا۔ نگینہ' بجنور' دیو بند' سہارن پور' سے ہوتے ہوئے ہم میرٹھ' بلند شہر' خورجہ اور ہاپوڑ کی طرف آگئے پھر مراد آباد میں ایک رات قیام کرکے چندوسی اور علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگئے۔ مراد آباد کے اطراف کے ان شہروں میں پورا عشرہ گزر گیا۔ جامعہ قاسمیہ سے معلوم ہوا تھا کہ ابتدا میں مولوی صاحب مراد آباد سے قریب کی ان جگہوں پر کثرت سے دورے کرتے تھے۔ بعد میں جامعہ قاسمیہ کی جانب سے مختلف شہروں میں مدارس کے معیار اور تنظیمی تربیت کا کام بھی کچھ عرصے کے لیے انہیں سونپ دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کو قریباً سبھی پہچانتے تھے۔ بعض لوگ ان سے ربط خاص کے مدعی تھے لیکن مراد آباد سے رخصت ہونے کے بعد مولوی صاحب نے آس پاس کی کسی جگہ کو قصد نہیں کیا تھا۔ کورا کی وجہ سے مولوی صاحب کو جان پہچان کے علاقوں سے احتیاط ہی کرنی چاہیے تھی۔ شناسا بھی کبھی زندگی بہت عذاب کر دیتے ہیں۔ کسی نے کہا تھا' میرے جاننے والے میرا زنداں ہیں۔ مراد آباد بھی مولوی صاحب مجبوراً ہی آتے ہوں گے۔ جب ہاتھ بہت تنگ ہوتا ہوگا۔ مرادآباد سے کچھ بازیافت کی امید ہو سکتی تھی۔ لگتا تھا' وہ اپنی چیزیں بیچتے رہے ہیں۔ اب تک شاید انہوں نے کسی سے قرض نہیں لیا تھا لیکن کب تک۔ خزانے خالی ہو جاتے ہیں۔ اس وقت تو ان کے پاس پیسوں کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ نواب ثروت یار نے زرنقد کے علاوہ کورا کو جواہر کے تحفوں سے کیا نہیں نوازا ہوگا؟ ہمیں یہاں تیرہ دن ہوگئے تھے۔ سلمٰی بھی ایک کمرے میں خود کو محبوس تصور کرنے لگی ہوگی۔ مسافر خانے میں ہر طرح کا آرام تھا۔

ملازم جمرو اور زورا کی خبر گیری کے لیے ذرا ذرا سی آہٹ پر مستعد رہتے تھے۔ درمیان میں ایک دن عبدالباسط

بھی سلمٰی کو صبح سے شام تک اپنے گھر لے گیا تھا۔ روز مغرب کے بعد وہ تانگے میں سوار ہو کے سول لائنز کی طرف نکل جاتے۔ مراد آباد سے مشرق کی جانب بیس میل دور ریاست رام پور میں سالانہ نمائش لگی ہوئی تھی۔ ایک بار مجھے بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہندوستان بھر سے لوگ آتے تھے۔ زورا اور جمرو دو مرتبہ سلمٰی کو نمائش دکھانے لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے سرکس' مداریوں کے کرتب موت کی چھلانگ اور نوٹنکی کے کھیل تماشے دیکھے تھے اور جانے کیا کیا سامان خریدا تھا۔ عبدالباسط بھی ان کی رہنمائی کے لیے ساتھ تھا۔

سنبھل کی سیری نہیں ہوئی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ میرا مشورہ قبول کرے اور میرے لیے بھی لازم نہیں تھا کہ میں اپنی زبان بند رکھوں۔ میں نے بہت منع کیا کہ اب مزید جگہیں کھکھوڑنے سے کچھ حاصل نہیں مگر ایک رات مراد آباد ٹھہر کے وہ پھر اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ رام پور' شاہ جہان پور' نگریا سادات اور بریلی' فیض آباد کے رستے میں آتے تھے لیکن مراد آباد سے نزدیک' فیض آباد سے دور تھے۔ یہی بہتر تھا کہ سلمٰی مراد آباد میں ٹھہری رہے۔ پہلے رام پور' بریلی پھر شاہ جہان پور کے بعد ہم نے نگریا سادات میں دم لیا۔ نگریا سادات کے معزز شہری حافظ عبدالخالق کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

وہ ایک اوسط درجے کی حویلی تھی۔ زیبائش و آرائش میں کسی نواب کی حویلی کی مماثل۔ دوپہر کا وقت تھا۔ حافظ صاحب کسی قریبی بستی میں گئے ہوئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی عبدالمتین نے ہمارے لیے بیٹھک کھلوادی۔ بہت دنوں بعد سنبھل کے لیے حقے کا انتظام بھی ہوگیا۔ اتنی بستیوں' گلی کوچوں کی خاک چھاننے پر نگریا سادات آ کے پہلی بار کہیں ایسا لگا جیسے یہیں آنے کی دیر تھی۔ مراد آباد کے لوگوں کی طرح ادھیڑ عمر عبدالمتین بلا کا باتونی تھا۔ ایک سوال کے دس جواب دیتا تھا اور خود دس سوالوں کے لیے بے چین رہتا تھا۔ ایسے لوگ جلد قابو میں آجاتے ہیں۔ سنبھل نے مولوی صاحب کا نام نہیں لیا۔ ایک ضروری کام کے سلسلے میں حافظ عبدالخالق سے ملاقات کو اپنی آمد کی وجہ بتایا تھا۔ عبدالمتین کی تشویش بجا تھی کہ اس نے ہمیں دیکھا تھا نہ کبھی اپنے بھائی کی زبانی ہم دور افتادگاں کے بارے میں کچھ سنا تھا لیکن ایک مہذب شخص کا جو وتیرہ ہوتا ہے' دور سے آنے والے بڑے بھائی کے ملاقاتیوں سے چھوٹے بھائی کی بازپرس آداب کے خلاف تھی۔ روہیل کھنڈی عموماً تکلیف اور تصنع نہیں

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
FIRST A NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH:5558
PROP: ALI KHAN

دنیا کے 6 حیرت انگیز علوم

- پانسہ پھینکیے قسمت کا حال معلوم کیجیے
- تاش کے پتوں سے قسمت شناسی
- ماتھے کی لکیریں کیا کہتی ہیں!
- خال اور تل..... کردار بتاتے ہیں!
- شگون..... سعد و نحس!
- خواب..... مستقبل کے پیامبر!

قیمت 25 روپے ♦ ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

مطبوعات کا پتہ
مکتبہ نفسیات

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

kitabiat@hotmail.com
kitabiat@yahoo.com

کرتے۔ بہت متواضع' جرات مند اور صاف گو ہوتے ہیں لیکن عبدالمتین روہیل کھنڈیوں سے کچھ مختلف ثابت ہوا۔ مجھے یوں نزاکت اور طرح داری لکھنؤ جیسی تھی۔ بمبئی شہر کے متعلق پوچھنے لگا کہ سنا ہے ولایت کے شہروں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اپنا اضطراب دور کرنے کے لیے اس نے شائستگی سے ہمارے مشاغل' ہماری حیثیت اور دیگر کوائف جاننے کی کوشش کی۔ بٹھل کو ان سوالات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ سو جواب ازبر تھے۔ بمبئی شہر میں آباؤاجداد کی آمدنی سے گزر اوقات بنتی عمارتوں کی تعمیر اور شکار وغیرہ کی مصروفیات' ان وضاحتوں سے بھی ہماری آمد کی نوعیت واضح نہیں ہو پاتی تھی تاہم شش و پنج کے باوجود عبدالمتین نے ہم اجنبی مہمانوں کے لیے دیدہ و دل کی ارزانی میں کوئی بخل نہیں کیا۔ بالائی اور خشک میوے کی آمیزہ رساول اور خاص دان میں نفاست سے بنی ہوئی پان کی گلوریاں اس نے ہمیں کھلائیں۔ حقے ہی سے بٹھل کی آنکھوں میں سرور کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

اتنی دیر میں عبدالمتین کے اطوار کے اعتماد اور بیان کے زور سے ہمیں ان دونوں بھائی کی خوش اخلاقی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ ایک بھائی کا انتقال ہو چکا تھا۔ باقی دونوں بھائی اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ نگریا سادات کے علاوہ رام پور کے اطراف میں بھی ان کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اکھ (گنے کی کاشت) سبزیوں کے کھیت' چکی شکر بنانے کے دو کھنڈ سال' دو کولھوں اور بھینسوں کا باڑا' امرود اور آم کے باغ سے ظاہر ہے' انھیں معقول آمدن ہوتی ہوگی۔ خوش کسمی بھی داد و ستائش کے مانند ہے۔ بڑی حد تک لاف و گزاف سے آلودہ عبدالمتین کی باتیں بٹھل نے نہایت انہماک سے سنیں۔ جب ہمارے اور اس کے درمیان بے گانگی کا حجاب کسی طور پر کم ہوا تو بٹھل نے مولوی صاحب کا ذکر چھیڑا۔

جیسے کسی نے چٹکی بھر لی یا ریت اڑ کے عبدالمتین کی آنکھوں میں چلی گئی۔ ایک لمحے کے حیرت زدہ سکوت کے بعد وہ دگرگوں آواز میں گویا ہوا "آپ انھیں کس طرح جانتے ہیں؟"

میرے کان بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ بٹھل نے مسکرا کے کہا کہ جو حافظ عبدالخالق کو جانتا ہے' مولوی صاحب سے بھی واقف ہوگا۔

یہ جواب شافی نہیں تھا لیکن عبدالمتین نے ایک بردبار' پر تپاک شخص کے طور پر اپنے لہجے کی خوش اسلوبی قائم رکھی۔ وہ مولوی صاحب کی تعریف و توصیف کرنے لگا۔ نگریا سادات میں مولوی صاحب کی موجودگی کی اگر کوئی بعید ترین امید بٹھل کے دماغ میں نمو پر تھی تو مختصر جانی چاہیے تھی۔ ستاروں کو اپنی رفتار سے غرض ہوتی ہے۔ عبدالمتین کی بے قراری سے ایک بات ضرور طے ہو گئی کہ مولوی صاحب سے اس کے خصوصی روابط رہے ہیں۔ اس نے نسبتاً تحمل سے تکرار کی کہ ہم مولوی صاحب کو کس طرح جانتے ہیں؟

"تھوڑی بہت جان کاری ہے۔" بٹھل نے بھی بظاہر سادگی سے کہا "کدھری رہتے ہیں آج کل؟"

"کب سے جانتے ہیں جناب ان کو؟" عبدالمتین نے بہ عجلت پوچھا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" بٹھل نے حقے کا کش لیتے ہوئے پوچھا "ٹھیک سے تو ہیں وہ؟ پہلے ادھری مراد آباد میں ہوتے تھے۔"

"جی' جی ہاں' ان کا تعلق مراد آباد سے ہے اور الحمدللہ خیریت سے ہیں لیکن جناب نے انھیں کب سے نہیں دیکھا؟"

"ٹائم ہو گیا اب تو۔" بٹھل نے زیر لبی سے کہا۔

ہر شخص کی حدود ہوتی ہے۔ کون کتنا خود پر قدرت رکھتا ہے' اس کا پیمانہ۔ کتنا غم' کتنی خوشی' کتنی احتیاط' کتنی برداشت' کتنی اذیت سہہ سکتا' کتنی دے سکتا ہے۔ عبدالمتین کی ذات بس پہلے دوسرے ورقے پر ہی تھی۔ بہت سے تو سطح پر آئینہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے ضبط نہیں ہوا "کیا جناب مولوی صاحب کے سلسلے میں بھائی صاحب کے پاس آئے ہیں؟" اس نے بے کلی سے پوچھا۔

بٹھل کے لیے اس سوال کا جواب مشکل تھا۔ جب تک حافظ عبدالخالق نہ آئیں' ایک ہی جواب مناسب تھا کہ وہ صریحاً انکار کر دے۔ اس نے یہی کہا۔

عبدالمتین کے چہرے پر سکون کے آثار ہویدا ہوئے' "میں نے عرض کیا ہے' بھائی صاحب کو شام تک واپس آ جانا چاہیے لیکن دیر بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے بتائیے' میں کسی کام آ سکتا ہوں؟"

"آپ بہت کام آ سکتے ہو پر اپنے کو ایسی جلدی نہیں ہے۔ حافظ صاحب آ جائیں گے تو سامنے بات کریں گے' ہاں اگر آپ کو کوئی کام ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔ لوٹ کے آ جائیں گے۔"

"کیا جناب! کیا فرما رہے ہیں آپ! یہ گھر آپ کا ہے۔ مہمان تو باعث خیر و برکت ہوتے ہیں۔" عبدالمتین معذرت خواہانہ انداز میں بولا "غریب خانے کا یہ حصہ مردانہ ہے اور مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ جب تک چاہیں' قیام فرمائیں۔ یقین کیجیے دلی مسرت ہوگی۔"

"پھر تو ہم یہیں دھرے ہیں بھیا۔" بٹھل نے کسل مندی سے کہا "آپ کو سامنے کا کوئی کام ہو تو ہرجا مت کرو۔"

"مہمان کی خدمت سے بڑا کیا کام ہو سکتا ہے۔" عبدالمتین نے بے ساختہ کہا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا' جناب کی کیا خاطر مدارات کروں۔"

"سب سے بڑی خاطر تو آپ نے کر دی۔" بٹھل نے حقے کی نے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا "تمباکو میں بڑا سواد ہے۔"

"مراد آباد کا ہے۔ شیخ شمس الدین منظور الحق کے ہاں کا۔ بھائی صاحب کے پرانے مراسم ہیں۔ خاص طور پر ان کے لیے آتا ہے۔"

"ادھری تو ایک چھدا خاں بھی مشہور ہے۔"

"ہاں جناب!" عبدالمتین پھر کسمسانے لگا "معلوم ہوتا ہے' مراد آباد سے جناب کا کوئی تعلق ہے؟"

"نام سنا ہے چھدا کا۔" بٹھل نے استغنا سے کہا "مراد آباد بھی ایک دو بار جانا ہوا ہے۔"

"اب کیا جناب مراد آباد سے ہوتے ہوئے آ رہے ہیں؟"

"ہاں' ادھری پتا چلا کہ حافظ صاحب نگریا سادات جا کے بس گئے ہیں۔ اپنا سامان بھی مسافر خانے میں پڑا ہے۔"

"بھائی صاحب نے تو عرصہ ہوا' مراد آباد کو خیر آباد کہہ دیا ہے۔ زمینوں کی جب تک خود دیکھ بھال نہ کرو' کاشت کار کام نہیں کرتے۔ بھائی صاحب کے آ جانے سے بہت برکت ہوئی ہے۔ زمینیں بڑھیں' جائداد بڑھی اور جانے کیا کیا۔ یہ حویلی دیکھیے' رئیس اعظم مرزا دلاور بیگ نے دلی اور جے پور سے کاری گروں کو بلا کے بڑے چاؤ سے بنوائی تھی۔ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ لڑکیاں گھروں کی ہو چکی تھیں' بیگم صاحب کب کی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ مرزا صاحب کے انتقال کے بعد حویلی اجڑ گئی۔ دامادوں میں چپقلش ہوئی۔ بھائی صاحب نے تصفیہ صفائی کرا دی اور حویلی کے منہ مانگے دام ادا کر دیے۔ یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔ مرمت اور رنگ روغن کے بعد کہیں حویلی کی یہ صورت نکلی ہے۔ بھائی صاحب نے مراد آباد سے آ کے دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کو سب کچھ یوں ہی نہیں مل جاتا جب تک خدا کا فضل شامل نہیں ہوتا۔"

بٹھل حقہ گڑگڑاتا اور سر ہلاتا رہا۔

دھوپ اتر چکی تھی۔ عبدالمتین کئی بار زنان خانے کی طرف گیا اور جلد واپس آ گیا۔ یہ تو طے ہو چکا تھا کہ مولوی صاحب کا ذکر عبدالمتین کے لیے کشمکش کا باعث ہے۔ موضوع کی تبدیلی سے اس کی شائستگی کیسی بحال ہو گئی تھی۔ مولوی صاحب کا ذکر مرعوب خاطر ہوتا تو دیگر جزئیات بیانوں کی طرح وہ گل افشانی سے گریز نہ کرتا۔ وہ تو دریا بہا رہا تھا۔ یہ پہلو تہی اس بات کی غماز تھی کہ وہ مولوی صاحب کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہے اور اس امر کی علامت بھی تھی کہ پردہ پوشی کی کوئی مصلحت اسے درپیش ہے۔ ممکن ہے' یہ سب میرا وہم و قیاس ہو' بٹھل نے کچھ اور اندازہ لگایا ہو۔ میرے دماغ میں تو ایسے ہی جالے پڑنے شروع ہو جاتے تھے۔ بہرحال بٹھل نے عبدالمتین کو کچھ دیر کے لیے مطمئن کر دیا تھا۔ عبدالمتین کو کیا معلوم تھا کہ اس نے ہمیں کتنا بے آرام کر دیا ہے۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ ہمارے سینوں میں کیسا تلاطم برپا ہے۔ بہروپ بھرنے کی ہمیں خوب مہارت ہو گئی تھی۔ سب سے بڑے بہروپیے تو ہم خود تھے۔

اب سب کچھ حافظ عبدالخالق کی آمد پر منحصر تھا۔ ہمیں آئے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ میری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کسی وقت بھی عبدالخالق آ سکتے تھے۔ شام ہو گئی۔ عبدالمتین نے چائے منگوائی اور کہنے لگا "صاحب! ہم دیہاتی لوگ ہیں' نگریا سادات میں چائے کا ایسا رواج نہیں ہے۔ یہ شہر ہے بھی نہیں' قصبہ بھی اوسط درجے کا ہے۔ مراد آباد میں بھائی صاحب کو چائے کی عادت پڑ گئی تھی۔ انھی کی وجہ سے حویلی میں صبح و شام چائے بنتی ہے یا مہمانوں کی آمد پر۔ آپ بمبئی والے ہیں۔ سنا ہے' وہاں تو لوگ چائے کے بہت رسیا ہیں۔"

"وہ جنگل ہی اور ہے۔" بٹھل کی آواز کھو سی گئی۔

"کئی بار ارادہ کیا' جا کے دیکھ تو آئیں' کیا بہاریں ہیں لیکن یہ زمینیں چین ہی لینے نہیں دیتیں۔ کام ہے کہ ہر سال بڑھتا جا رہا ہے۔"

بٹھل نے اسے بمبئی آنے اور گھر پہ ٹھہرنے کی دعوت دی اور کہا کہ اسے وہاں کسی قسم کی اجنبیت نہیں ہوگی۔

"آپ کا بہت شکریہ' دیکھیے' آپ سے ملاقات ہوئی ہے تو اب کے شاید آنا ہو ہی جائے۔ سمندر کے قصے سن رکھے ہیں' کبھی دیکھا نہیں۔ بمبئی تو لوگ بتاتے ہیں' سارا سمندر

کے کنارے بسا ہوا ہے۔"

"پھر ساتھ ہی چلو اپنے!" بہل نے خسروانہ انداز میں کہا۔

"کیا صاحب' بھائی صاحب مان جائیں گے۔ توبہ کیجیے۔" عبدالمتین مچلتے ہوئے بولا۔ "وہ تو ابھی تک مجھے بچہ ہی سمجھتے ہیں' ناتجربہ کار' ناپختہ اور ہے بھی کچھ یہی۔ ان کے آگے تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ ان کے لیے میں اولاد' وہ میرے لیے باپ کے مانند ہیں۔"

"آپ نے ادھری مراد آباد میں پڑھائی نہیں کی؟" بہل نے اچٹتی آواز میں پوچھا۔

"چند سال کے لیے میں بھی وہاں رہا ہوں۔ جامعہ قاسمیہ میں پڑھتا تھا لیکن صاف بات یہ ہے' ایک تو مجھے دینی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' دوسرے والدہ کی بیماری کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑ کے واپس آنا پڑا۔ مشیت خداوندی دیکھیے' منجھلے بھائی جان بھلے چنگے تھے کہ اللہ نے والدہ سے پہلے انھیں اپنے پاس بلالیا۔ پھر تو مراد آباد واپس جانا ممکن ہی نہیں رہا۔"

"آپ کے مولوی صاحب بھی تو ادھری پڑھاتے تھے؟"

"کون! مولوی شفیق صاحب! جی' جی ہاں" عبدالمتین نے تذبذب سے دہرایا "وہ بھی جامعہ قاسمیہ میں مدرس رہے ہیں۔"

"بعد کو تو انھوں نے چھوٹا موٹا دھندا شروع کردیا تھا۔" بہل نے جیسے خود کلامی کی "برتنوں کے نمونے شہر شہر لے جانے لگے تھے۔"

"مراد آباد کے بیشتر لوگوں کا یہی کاروبار ہے۔" عبدالمتین سرسری انداز میں بولا۔

"آج کل کیا کرتے ہیں؟" بہل کی آواز میں کسی قسم کا تکدر نہیں تھا۔

"واللہ اعلم" عبدالمتین بے گانگی سے بولا۔

"یہاں تو آتے رہتے ہوں گے؟"

عبدالمتین نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد چونک کے جواب دیا "جی ہاں' کبھی کبھار' ان کا ایسا ہی ہے' آج یہاں' کل وہاں۔"

"پر بیس پچیس روز پہلے تو ادھری ضرور آئے ہوں گے۔ مراد آباد سے پتا چلا تھا کہ آگے نگریا سادات جانے کا بولتے تھے۔"

"جی' جی ہاں۔ آئے تھے" عبدالمتین بے اعتنائی سے بولا "اصل میں ان دنوں میں زمین کے ایک مقدمے کے سلسلے میں بریلی گیا ہوا تھا۔ یہاں آ کے معلوم ہوا' تشریف لائے تھے۔ میرے پیچھے آئے اور پیچھے ہی چلے گئے۔"

"شادی کی یا ابھی تک لنڈورے ہیں؟"

"کچھ صحیح نہیں معلوم" عبدالمتین کا چہرہ کھنچنے لگا۔

بہل نے اسے مزید زیربار نہیں کیا۔ زیادہ جستجو سے کچھ حاصل ہونے کی توقع نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا' اس سے زیادہ کا عبدالمتین کو یارا بھی نہیں ہے۔ اس نے ایک کو اماں ڈھونڈ ہی لیا تھا کہ لاعلمی کا اظہار کرتا رہے۔

بہل حقے میں مصروف ہوگیا۔ باقی حافظ عبدالخالق [illegible] واپسی پر اٹھائے رکھنا ہی مناسب تھا۔

اب کوئی ابہام نہیں رہ گیا تھا۔ ہمیں بہر طور حافظ صاحب کے آنے تک وہیں ٹھہرے رہنا تھا اور اس دوران عبدالمتین پر چھائی ہوئی دھند دور کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ ہم اسی کے گھر بیٹھے تھے۔ میزبان کی خوش نودی سے مہمان کی خوش وقتی مشروط ہے' دل جمعی بھی اور ہماری حیثیت تو [illegible] بھی سائل کی تھی۔ بہل نے کچھ دیر بعد اس سے [illegible] فرمائش کی۔

بہل کی صدا پر غلطاں و پیچاں عبدالمتین گھبرا سا گیا۔ "کدھری کھو گئے بابا! کچھ یاد آگیا کیا؟ کوئی کام وام [illegible]" بہل نے سادگی سے کہا۔

"نہیں' نہیں جناب!" عبدالمتین سیدھا ہو کے [illegible]

"آپ کیا فرمارہے تھے؟"

"پان مل سکتا ہے؟"

"ضرور ضرور' کیوں نہیں' میں تو بھول ہی گیا" عبدالمتین ندامت سے بولا اور دفعتاً مونڈھے سے اٹھ [illegible] وہ ملازم کو بھی آواز دے سکتا تھا لیکن اٹھنے کے لیے بس جیسے وہ کسی [illegible] کا منتظر تھا "پان کے بغیر چائے کا لطف ہی ادھورا ہے" [illegible] دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور خاصی دیر بعد آیا۔ چہرے سے گرد و غبار دھو کے آیا تھا۔ آواز میں کوئی [illegible] پڑی ہوئی نہیں تھی' خاص دان بہل کے سامنے رکھ [illegible] آراستہ لہجے میں کہنے لگا "زنان خانے میں یاد دلایا [illegible] صاحب کے آنے میں رات بھی ہو سکتی ہے۔ کھانے [illegible] تو ویسے بھی ہو جائے گا۔ جناب کا کوئی پرہیز ہو یا کوئی نا[illegible] پسند ہو تو کسی تکلف کے بغیر فرمادیں۔"

"گھر میں جو ہوگا' کھالیں گے۔"

"پھر بھی جناب!" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"اپنے کو دوائی کی ضرورت کم پڑتی ہے۔"

عبدالمتین ایسا دیر فہم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ [illegible] کشائی میں اسے لمحے لگ گئے اور وہ کھل کھلا پڑا "بہتر ہے جناب! خدا کرے کبھی نہ پڑے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے' پھر مجھ پر چھوڑ دیجیے۔"

"سارا آپ پر ہی ہے۔ مہمان تو آدھی جیل میں ہوتا ہے۔"

"بالکل' بالکل نہیں" عبدالمتین شوخی سے بولا "ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ مہمان کھلے رہتے ہیں۔ اتنا تکلف نہیں کیا جاتا۔ لکھنؤ تو یہاں سے ویسے بھی دور ہے۔"

"پر بمبئی اور بھی دور ہے۔" بہل نے مسکرا کے کہا۔

"وہاں کا تو معلوم نہیں کیا دستور ہے؟" عبدالمتین نے جنگی کی کوشش کی "میں تو جناب اپنے گاؤں کی بات کرتا ہوں۔"

"گاؤں' کھیت' کھلیان سے کیا ہے بادشاہ سلامت! ان کے بیچ بھی بڑے محل دو محلے' راجے' مہاراجے دیکھے ہیں ہم نے اور آپ کیا کسی سے کم ہو۔"

"کیا فرمارہے ہیں آپ!" عبدالمتین کا جسم دہرا ہوگیا۔ "ہم کو اس حویلی سے مت دیکھیے' اس کا قصہ تو آپ کو بتایا ہے' ہم تو پیدائشی کسان ہیں' مزدور ہیں۔"

"سارا تو من کا کھیل ہے بابو صاحب!"

عبدالمتین کی آواز تمتمانے لگی "بے شک سب دل سے ہے۔ دل ہے تو سب کچھ ہے' دل نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

رات ہوگئی۔ بیٹھک میں قندیلیں روشن کردی گئیں۔ عبدالمتین نے حقہ تازہ کرادیا تھا۔ ملازم نے کب سے تخت پر دسترخوان بچھا رکھا تھا۔ عشا کی اذانیں گونج رہیں اور عبدالمتین دیر تک غائب رہا۔ دیواری گھڑی نے نو بجائے تھے کہ دو ملازموں نے دسترخوان پر تام چینی کے ڈونگے رکھنے شروع کردیے۔ عبدالمتین پے در پے انھیں احکام دیتا رہا۔ [illegible] تشتری کی چٹنی' سرکے میں بھیگی پیاز' گرم کباب' گرم پراٹھے' ٹھنڈا پانی۔ یہ لاؤ' وہ لاؤ۔ کسی طے شدہ دعوت کی طرح عبدالمتین نے اہتمام کیا تھا۔ عمارت کے اندرونی حصے کی جانب کچی میں منہ ہاتھ دھو کے ہم دسترخوان پر آگئے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ابھی تک بھوک نہیں تھی۔ بہل کو بھی نہیں ہوگی۔ عبدالمتین نے دسترخوان پر کھانوں کی دکان لگائی ہوئی تھی۔ بھوک بھی اسی نے مٹائی تھی۔ میرا دل تو اڑا جارہا تھا۔ کچھ اچھا ہی نہیں لگ رہا تھا۔ [illegible]رے تو جی میں آتا تھا' حافظ عبدالخالق تو جب آئیں گے' آئیں گے۔ عبدالمتین بھی اسی گھر کا فرد ہے۔ یہ بھی بہت کچھ جانتا ہوگا۔ نہ جانتا ہوتا تو مولوی صاحب کے نام پر اس کی آواز کیوں اینٹھنے اینڈنے لگتی۔ یہ سیدھی طرح زبان نہیں کھولتا تو ٹھیک ہے' چاقو کی ایک جھلک ہی کافی ہوگی۔ ممکن ہے حافظ عبدالخالق کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہاں ہماری کون سی رشتے داری ہے اور کون سا بار بار ہمیں یہاں آنا ہے۔

ہم نے چند ہی لقمے حلق سے اتارے تھے کہ باہر گلی میں گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ساتھ ہی تانگے کی پوں پوں اور مختلف لوگوں کا شور "لیجیے بھائی صاحب آگئے" عبدالمتین معذرت کرکے دسترخوان سے اٹھ گیا۔ وہ دروازے سے باہر نہیں جاسکا تھا کہ آگے پیچھے کئی تومند' چست و چالاک آدمی بڑے بڑے تھیلے' کھیتی باڑی کا سامان' گنے اور سبزیوں کے گٹھے اور بوریاں ہاتھوں میں اٹھائے کاندھوں پر لٹکائے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں بندوق بھی تھی۔ ان کے عقب میں درمیانے قد' گٹھے ہوئے جسم' اونچی باڑھ کی ٹوپی' شیروانی اور تنگ مہری کے پاجامے میں ملبوس' پچپن سے ساٹھ سال کی عمر کا ایک شخص دروازے پر دکھائی دیا۔ چہرے کی رنگت تانبے سے مشابہ تھی۔ ترشی ہوئی داڑھی میں سیاہ بالوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ سب کی نگاہوں کا مرکز وہی تھا۔ حافظ عبدالخالق وہی ہو سکتا تھا۔ سامنے تخت پر ہم دو اجنبیوں کو دیکھ کے وہ متعجب ہوا اور کھنکتی ہوئی آواز میں اس نے ہمیں سلام کیا۔ میں اور بہل تخت سے اتر آئے۔

"بہت دیر ہوگئی" عبدالمتین نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"کیا بتائیں' صاحب بہادر کلکٹر صاحب بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ کہیں سے بھنک مل گئی۔ بس بلوالیا۔ نواب راشد علی خاں کے ساتھ شکار پر جارہے تھے۔ بہت منع کیا' نہیں سنی اور اتفاق دیکھو' پچھلے دنوں کتنی بار گئے' ہرن نظر ہی نہیں آئے۔ آج پورے چھ ہاتھ لگے" حافظ عبدالخالق فخریہ انداز میں بولے۔

"ہرن لائے ہیں؟" عبدالمتین نے اشتیاق آمیز حیرانی سے کہا۔

"نواب صاحب نے پورے دو عطا کردیے۔ ہرن کے علاوہ بھی آج بہت کچھ ہے۔ نواب صاحب کے ساتھ شکار کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ نشانہ تو کمال کا ہے۔ کئی بار تمہارا خیال آیا تم بھی ساتھ ہوتے۔ نواب صاحب بہت پوچھتے تھے۔ تمہارے نشانے کے تو بڑے قائل ہیں۔"

"چلیے پھر سہی" عبدالمتین نے کشادہ دلی سے کہا "مجھے تو

F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH:5556532
PROP:ALI KHAN

فکر ہونے لگی تھی۔ ایسی کیا بات ہوئی۔ اتنی دیر تو آپ نے کبھی نہیں لگائی۔"

"مجبوری تھی۔ کلکٹر صاحب کی زبان سے میرا نام نکل گیا تھا۔ نواب صاحب نہیں مانے' کہنے لگے' حافظ کو بھی ساتھ لے لو۔ میں نے عرض کیا' گھر کہہ کے نہیں آیا ہوں' کہنے لگے "ہرکارہ بھجوا دیتے ہیں۔ عرشی صاحب بھی ساتھ تھے۔ راستے بھر شعروشاعری ہوتی رہی۔ کیا اہتمام تھا۔ پورا لاؤلشکر' بیس پچیس کے قریب نفری ہوگی' ہر چیز کی افراط۔"

"یہاں مہمان دوپہر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" عبدالمتین کو آخر ہمارا خیال آ گیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں" حافظ عبدالخالق کی حیرت بھری نظریں ہم پر مرکوز ہو گئیں "جناب کی تعریف!"

اس سے پہلے کہ حافظ صاحب کچھ کہتے یا عبدالمتین زبان کھولتا' بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا "اب آپ کو یاد نہیں ہوگا۔ بیچ میں برس ہو گئے۔ مراد آباد میں کبھی آمنا سامنا ہوا تھا۔"

حافظ عبدالخالق کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمودار ہوئے "یا خدا! مجھے یاد نہیں' اور میری یادداشت ایسی کمزور بھی نہیں" حافظ صاحب الجھی ہوئی آواز میں بولے "کہاں سے تشریف لائے ہیں جناب!"

"بمبئی سے آئے ہیں صاحب!" بٹھل نے کہا "ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ سمجھو' تھوڑا آپ کو پریشان کرنا ہے۔"

"ضرور' حاضر ہوں جناب! سر کی ضرورت تو نہیں ہے؟" حافظ عبدالخالق خوش گواری سے بولے۔

"ہاں صاحب!" بٹھل نے تیکھے لہجے میں کہا "ایسا ہی ہے پر تھوڑی دیر کے لیے۔"

"خدا خیر کرے" حافظ صاحب پلکیں جھپکانے لگے۔

"پہلے مراد آباد گئے تھے۔ ادھری لوگوں نے بولا' آپ تمکریا سادات لوٹ گئے ہو۔"

"ایسی کیا بات ہے جناب!" حافظ صاحب تردد سے بولے۔

"چندا لینے کو نہیں آئے۔"

حافظ صاحب کو ہنسی آ گئی "پھر تو ٹھیک ہے' وہ لطف لیتے ہوئے بولے "ہماری تو جان پر بن گئی تھی۔"

"دھیرج سے بات ہوگی' اپنے کو جلدی نہیں ہے۔ پہلے آپ کھانا کھا لو۔ ادھری آپ کے چھوٹے صاحب نے ہم پردیسیوں کا بہت دھیان کیا۔"

"انھیں یہی کرنا چاہیے تھا مگر سچ مانیے' مجھے یاد نہیں پڑتا' جناب سے کبھی ملاقات ہوئی ہے۔"

"ابھی آپ تھکے ہوئے لوٹے ہو۔ تھوڑا ٹھکانے سے ہو جاؤ۔ یاد آ جائے گا سارا" بٹھل نے دسترخوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ صاحب کو ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔

"معاف کیجیے' بڑی کوتاہی ہوئی۔ یہاں تو ماشاء اللہ دسترخوان سجا ہوا ہے' بسم اللہ' بسم اللہ۔ مجھے نہانے اور کپڑے بدلنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔ نہائے بغیر تو چین نہیں آئے گا۔ آپ کھانا جاری رکھیے' بسم اللہ۔"

"ہم بعد میں کھا لیں گے" بٹھل پیٹ پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"نہیں جناب! یقین کریں' بھوک بھی ایسی نہیں ہے۔ راستے بھر کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے ہی رہے ہیں۔ اب زیادہ نہیں ہو جائے گی" حافظ نے لجاجت سے کہا۔

ملازم سارا سامان اندر صحن کی جانب لے جا چکے تھے۔ حافظ عبدالخالق بھی بیٹھک میں نہیں ٹھہرے۔ عبدالمتین ... وجہ سے ہمیں خاطر داری تو کرنا ہی تھی۔ ہم پھر تخت پر آ گئے۔ نہایت لذیذ کھانے تھے لیکن معدے کے ساتھ دل و دماغ ... حاضری بھی ضروری ہے۔ ادھر عبدالمتین پیچھے پڑ گیا تھا۔ رکابی میں ایک قسم کا سالن ختم نہیں ہوتا تھا کہ وہ دوسرا ... دیتا۔ اتنا اصرار تو کوئی اذیت پسند ہی کر سکتا ہے۔ آدمی بھی ... سے زیادہ تو سن بھی نہیں سکتا' بول سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ... معدہ تو بالکل کسی ظرف کے مانند ہے۔ جیسے تیسے ہم ... عبدالمتین کی مدارات کا مرحلہ طے کیا۔ مگر میٹھے کے بغیر سیری کہاں ہوتی ہے۔ میٹھے کو ہم بھول ہی گئے تھے۔ یاد رہتا تو عبدالمتین ہمیں مستقل نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔ ... نے ہمارے لیے بطور خاص کھیر بھتا بنوایا تھا۔ ہم نے ... تک زہرمار نہیں کر لیا' دسترخوان سے رہائی نہیں ملی۔

حافظ صاحب کو گئے ہوئے گھنٹے بھر سے اوپر ہو گیا تھا۔ انھیں اب تو آ جانا چاہیے تھا۔ میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ گمان ہوا' کہیں وہ عبدالمتین کے اندر آنے کے ... ہوں۔ وہ اپنے بھائی سے ہماری آمد کے مقصد کے بارے ... کوئی اندازہ کرنا چاہتے ہوں گے۔ عبدالمتین تمکریا سا... کے اطراف کے واقعات کی قصہ گوئی میں مگن تھا۔ جیسا سامع شاید اسے پہلی بار ملا تھا۔ بٹھل نے تو جیسے ... میں روئی ٹھونس رکھی تھی۔ دس بج چکے تھے' پھر ساڑھے ... ہو گئے۔ واپسی کے لیے گیارہ بجے والی گاڑی کا وقت ... تھا۔ عبدالمتین کے طویل کلام کا سلسلہ اس وقت ... جب ایک ملازم نے حیدر آباد دکن کا مرغوب عربی قہوہ

... فنجانوں کا طشت بٹھل کے سامنے رکھا۔

"یہ کیا؟" بٹھل نے سرخوشی کے انداز میں صدا بلند کی۔

"بھائی صاحب کو بہت پسند ہے' اس کا مطلب ہے' وہ اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ حج پر گئے تھے تو بس اس قہوے کی عادت پڑ گئی" عبدالمتین چہک کے بولا۔

ملازم نے طشت سے فنجان اٹھا کے سب کے سامنے رکھنے شروع کر دیے تھے کہ صحن کی جانب سے بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے حافظ صاحب گونجتی آواز میں سلام کرتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ململ کے کرتے پر سفید شال اوڑھ رکھی تھی۔ سر پر ٹوپی نہیں تھی۔ خاصے تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ آتے ہی معذرت کی کہ عشا کی نماز میں وقت لگ گیا۔ بڑے بھائی کو دیکھ کے عبدالمتین بالکل گونگا ہو گیا تھا "رات مہمانوں کے لیے تم نے کیا انتظام کیا ہے" حافظ صاحب نے فکرمندی سے پوچھا۔

"بالائی کمرے کی صفائی کرا دی گئی ہے" عبدالمتین نے ... سے جواب دیا۔

"پر شاید ہم رات بھر کے لیے آپ کو تکلیف نہ دیں۔" بٹھل نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسٹیشن سے پتا چلا تھا کہ تڑکے میں مراد آباد کی کوئی گاڑی جاتی ہے۔"

"کیا جناب!" حافظ عبدالخالق کے لہجے میں شکوہ نمایاں تھا "ٹھیک پانچ بجے گاڑی ضرور جاتی ہے لیکن آپ رات کیوں بے آرام کرتے ہیں۔ ایسا ہی ہے تو صبح دس والی سے چلے جایئے' اور میں تو کہوں گا کہ کچھ اور قیام کیجیے۔ یہ تو دیہات ہے۔ بمبئی والوں کا دل کہاں لگے گا لیکن اچھی کھلی سرسبز جگہ ہے۔ اطراف میں دل کش مقامات ہیں۔"

"جگہ سے زیادہ آدمی کی بات ہوتی ہے۔ آدمی دل کے کھلے ہوں اور چھاؤں والے ہوں" بٹھل نے نیچی آواز میں شکریہ ادا کیا اور عذر کیا کہ مراد آباد کے مسافر خانے میں ہمارے تین ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔

"ابھی تو آپ سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی' صحیح تعارف بھی نہیں ہوا اور آپ جانے کی بات کرنے لگے۔"

"بات کوئی لمبی نہیں ہے۔"

"پھر بھی جناب! ایک رات تو قیام کیجیے۔ رات کو کہاں ... کیجیے گا" حافظ صاحب نے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور فنجان ... قہوہ انڈیل کے بٹھل کو پیش کیا۔

"سفر ہی کتنا ہے' گھنٹے بھر کا۔"

"پورا گھنٹا بھی کہاں' درمیان میں صرف ملک اور رام پور چند منٹ کے لیے گاڑی ٹھہرتی ہے۔ لیکن بس آپ صبح ہی کو جایئے گا" حافظ صاحب نے حتمی طور سے کہا۔

"جیسا آپ کا حکم ہو" بٹھل نے سر جھکا لیا۔

"میزبان صرف درخواست کر سکتے ہیں۔"

"پر مہمان بن بلائے نہ ہوں تبھی صاحب۔"

"مہمان تو مہمان ہی ہوتا ہے جناب! بن بلائے کا اور لحاظ کرنا پڑتا ہے" حافظ صاحب نے چہکتی چہکتی آواز میں کہا پھر سنجیدگی سے بولے "بہتر ہے' آپ اپنا مدعا بیان فرمائیں۔ کیسے زحمت کی' ہزاروں کوس دور سے اس جنگل بیابان کا رخ کرنے کی۔ اور ہاں' بہتر ہوگا پہلے مجھے کچھ یاد دلایئے' کب اور کن حالات میں مراد آباد میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی؟"

بٹھل نے حقے کا ایک گہرا کش لیا "بات ذرا۔۔" اس نے عبدالمتین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چلیں' سویرے بات کریں گے۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ آپ کے سونے کا بھی ٹائم ہو گیا ہوگا۔"

بٹھل کا اشارہ واضح تھا۔ دونوں بھائی سمجھ گئے اور عبدالمتین شائستگی سے بولا "اب بھائی صاحب موجود ہیں' انھی کا انتظار تھا نا آپ کو؟ اب کھل کے بات کیجیے۔ میں ذرا اوپر جا کے آپ کا کمرا وغیرہ دیکھتا ہوں۔"

کسی نے اسے نہیں روکا۔ عبدالمتین مونڈھے سے اٹھ گیا اور دیکھتے دیکھتے اوجھل ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بیٹھک میں دیر تک گھڑی کی ٹک ٹک اور حقے کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہی۔ حافظ عبدالخالق کی متجسس نگاہیں بٹھل پر جمی ہوئی تھیں۔ بٹھل نے پہلو بدل کے خاص دان حافظ صاحب کی طرف بڑھایا۔ حافظ صاحب نے گلوری اٹھا کے خاص دان بٹھل کو واپس کر دیا۔ بٹھل نے بھی ایک گلوری منہ میں رکھ لی۔

"دیکھو صاحب! ہم جانے کدھری سے چلتے ہوئے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہماری بات ذرا دھیان سے اور ٹھنڈے ہو کے سنو۔" اس مختصر تمہید کے بعد بٹھل نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "ہم کو آپ سے مولوی شفیق کے بارے میں پتا کرنا ہے۔"

بٹھل کی جانب سے ایسی کوئی ابتدا حافظ عبدالخالق کے سان و گمان میں نہ تھی۔ وہ مونڈھے پر اچھل پڑے "مولوی شفیق!" وہ حیرت سے بولے۔

"آپ کا ان کا بہت ساتھ رہا ہے" بٹھل نے سرد لہجے

STATIONARY AND LIBRARY

میں کہا "ہم کو بتاؤ' بڑے صاحب! وہ کدھری چھپے ہوئے ہیں؟"

"آپ' آپ کون ہیں؟" حافظ صاحب اضطراری انداز میں بولے۔

"ہم کوئی بھی نہیں' دروازے پر سوال کرنے والے لوگ سے نام پتا کون پوچھتا ہے اور منھی کھولنے کو یہ آپ کی کوئی شرط ہے تو ہم باپ دادا سے اپنا آگا پیچھا سارا بول دیں گے۔"

"کیا' کیا فرما رہے ہیں آپ؟" حافظ صاحب بدحواس ہوگئے۔

"اپنا مولوی صاحب کا ایک پرانا بل پڑا ہوا ہے۔ بل بھی ان کا ڈالا ہوا ہے۔ ابھی تا ٹم بہت ہو گیا ہے صاحب!" بھُسل نے پتھریلی آواز میں کہا۔

"مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں؟" حافظ صاحب کسی قدر سراسیمگی سے بولے "کیا' کیا آپ صرف اسی کام کے لیے آئے ہیں؟"

"اپنے پاس بہت دنوں سے اس کے سوائے کوئی کام نہیں ہے۔" بھُسل نے تھوڑی سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھو صاحب! آپ حافظ ہو' نمازی آدمی ہو' اپنے کو اس خواری سے نکالو۔"

"کیسی خواری' کیا بات ہے جناب!" حافظ صاحب نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنی ناتوانی اور بے چارگی کا اظہار کیا "میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ چاہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔"

"کاش ایسا ہو لیکن آخر کس وجہ سے آپ کو مولوی شفیق کی تلاش ہے؟" حافظ صاحب کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

"اپنی ایک چیز مولوی صاحب کے پاس ہے۔ ان کو بولو' اس کو لوٹا دیں" بھُسل نے سرگرانی سے کہا۔

"کیسی چیز؟" حافظ صاحب منتشر لہجے میں بولے "مولوی شفیق سے میرے اچھے مراسم ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں' وہ ایک سچے اور کھرے آدمی ہیں۔ دین دار' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امین۔ مجھے شبہ ہے' آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"دور کرا دو نا صاحب پھر" بھُسل کے لہجے میں تلخی آگئی۔

"یہ خدا' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا" حافظ عبدالخالق کی حالت غیر متوقع طور پر سیمابی ہو گئی۔

"آجائے گا صاحب! اپنے کو پتا ہے' ایسا آسان نہیں ہے آپ کے لیے۔ تھوڑی دیر کے لیے مولوی صاحب کو ... کر کے دھیان دو گے تو سارا کالا سفید سمجھ میں آجائے گا ... ہے۔"

"اگر' اگر آپ کی مراد مولوی صاحب کے اور آپ کے درمیان کسی پرخاش میں میری دخل اندازی سے ہے تو میں واضح کر دوں" حافظ صاحب نے رکھائی سے کہا "میں کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ خصوصاً مولوی شفیق کے کسی معاملے سے میں الگ ہی رہنا چاہوں گا۔"

"اس کا کارن ان کا آپ سے پرانا ناتا ہے نا؟"

"جی' جی ہاں" حافظ صاحب جزبز ہو کے بولے "سمجھیے۔"

"تو ہماری تو آپ سے کوئی دور بندھی نہیں ہے۔"

"جی' جی صاحب!" حافظ صاحب سٹ پٹا سے گئے پھر سنبھل کے بولے "مگر فریق کوئی غیر نہیں' مولوی ... ہیں۔"

"آپ کو ڈر ہے کہ ان کا گھاٹا ہو جائے گا؟"

"میں' میں نے یہ کب کہا؟"

"پھر کیا ہے' آپ کیوں گھبراتے ہو؟"

"گھبرانے کی کیا بات ہے" حافظ صاحب چیں بچیں ... بولے "یہ کام میرے مزاج کے خلاف ہے۔ یا یوں سمجھیے مجھے اس کی ہمت نہیں۔ اس طرح آدمی دو ستیاں ... ہے۔ برا بن جاتا ہے۔ ممکن ہے' آپ حق پر ہوں مگر میں فیصلہ کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ فریقین میں کسی ایک سے قرابت داری ہو تو منصف بھی معذوری ظاہر کر دیتا ہے۔"

"کیوں کر دیتا ہے؟" بھُسل نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے کہ اس سے جانب داری سرزد ہو جائے۔"

"ہم سے آپ کچھ نہیں کھوؤ گے۔"

"مجھے' ان سے مولوی شفیق سے کھو سکتا ہوں۔"

"یہی تو ہم بولتے ہیں' آپ کو ڈر ہے' ہم حق پر ہو ... آپ ان کو کھوؤ گے۔ اس کو الٹا کرو تو آپ حق کو کھو ... ہو۔"

"آپ کیوں الجھا رہے ہیں جناب! حافظ صاحب ... پیشانی سکڑ گئی "مجھے جو کہنا تھا' آپ سے کہہ دیا ہے۔"

"بات تو اسی تال میل کی ہوئی صاحب! ... صاحب کے بعد آپ نے گھر کے دروازے بند نہیں ... ہوں گے۔ ہم کو بولو' ادھری ان کے برابر جگہ لینے ... ہم کو کیا جتن کرنا ہے۔ ویسے ہم بھی آدمی کے بنے ہیں ...

"کیا کہہ رہے ہیں آپ!" حافظ صاحب جھرجھری لے کے بولے "بس کیجیے جناب۔ میرے لیے آپ بھی نہایت محترم ہیں۔"

"ایک بات بولو صاحب! رستے میں ایک آدمی دوسرے آدمی کا گلا گھونٹتا ہے تو آپ دیکھتے ہوئے آگے چلے جاؤ گے' ... اس لیے کہ ان میں ایک آپ کا جاننے والا ہے' گلا گھونٹنے والا۔"

"آپ بات کیوں بڑھا رہے ہیں۔"

"اپنے کو جواب دو صاحب!"

حافظ صاحب نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"گلا دبانے والے کا ہاتھ روکو گے یا اس کی پیٹھ پر تھپکی دو گے' مار ڈالو گے سور کی اولاد کو' آنکھ بچا کے بڑھ جانا بھی تھپکی دینے سے کم نہیں ہے۔"

"مجھے مولوی شفیق پر پورا بھروسا ہے۔"

بھُسل نے حجت نہیں کی کہ پھر پیش رفت میں کون سا امر مانع ہے۔ اس نے سرپوش اٹھا کے چلم کی آگ انگلی سے کریدی اور پھونکیں مار کے فروں کی۔ کوئلے چٹخنے لگے۔ ... وقفے میں حافظ صاحب پھر بے چین بیٹھے رہے "ٹھیک ہے ... صاحب!" بھُسل نے حقہ کھینچتے ہوئے کہا "ہم کو بولو' ہم ... کدھری جائیں؟"

"میں' میں کیا کہہ سکتا ہوں" حافظ صاحب بے رخی سے ...

"آپ نے مولوی صاحب سے نہیں پوچھا کہ ان کے ساتھ وہ لڑکی کون ہے؟" بھُسل نے آہستگی سے کہا۔

"کون' کون سی لڑکی؟" حافظ صاحب کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"جوان کے ساتھ آپ کے گھر آئی تھی۔ ادھری رہی ... اس گھر' اس حویلی میں' نہیں کیا؟"

"میں آپ کے ہر سوال کی جواب دہی کا پابند نہیں ہوں۔"

"بالکل نہیں' ہم آپ کے سوتیلے بھی نہیں لگتے۔ پر ہم آپ سے پہلے ہی بولا تھا کہ ہم تو راج محل کی زنجیریں کھینچتے آئے ہیں۔ آپ کے چپ رہنے کا مطلب ہے کہ آپ کچھ جانتے ہو اور چھپانے کا مطلب بھی کھلا ہے کہ آپ نے لنگوٹے مولوی صاحب کے بارے میں خود بھی گنہگار رکھتے ... دیکھنے میں بڑے صاحب! آپ کا رویے بھی حساب سے ... تن تن بولنا چاہیے۔ دکھی دہائی گھر خوب چلتا ہوگا۔ ... رات کو سوچتے میں آپ نے برا ملا کے نہیں دیکھا کہ ... صاحب کو ہمارے آگے آنے میں کون سی بیڑی پڑی ہے؟"

"کوئی ہوگی جناب!" حافظ صاحب نے بے زاری سے کہا "اور دیکھیے' میرے محترم! مجھے اپنے بارے میں آپ کی کسی رائے' آپ کے کسی مشورے کی حاجت نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں' اس طرح آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"اب تک یہی کیا ہے صاحب! پر شاید اب زیادہ نہ ہو' ہم کو آپ سے جو جاننا تھا' ہم نے جان لیا ہے۔"

"کیا' کیا جان لیا ہے؟" حافظ صاحب نے بھڑک کے کہا۔

"یہی صاحب کہ آپ کو ساری رام کتھا' سارے الٹ پھیر کا پتا ہے اور آپ ہم کو بھی پہچان گئے ہو کہ کون سی نسل کے کاٹ کھانے والے ہیں۔"

میں بھُسل سے یہی کہنا چاہتا تھا کہ اب مزید اصرار و تکرار سے کیا حاصل ہے۔ اب اور کیا نہاں رہ گیا ہے۔ اتنی دور سے آنے والے اجنبیوں کا مقصد جانتے' ان کا ماجرا سننے کی جستجو اور اضطراب اور ہی ہونا چاہیے تھا۔ مولوی صاحب سے اپنے دیرینہ تعلق کی نسبت سے تو حافظ صاحب کو جزئیات کی بے چینی ہونا لازم تھا۔ شناساؤں کے درون خانہ احوال' کچے چٹھے کی ٹوہ کے لیے ہر ایک کان لگائے رکھتا ہے۔ حافظ صاحب نے حیرت و تجسس کے بجائے تردد و تشویش کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مولوی صاحب کی وکالت کا فریضہ انجام دے رہے ہوں۔ ان کے جواب بے محل تھے اور برہمی بے ساختہ نہیں تھی۔ لگتا تھا' ہم ان کے لیے اجنبی نہیں ہیں' جیسے کبھی کسی آنے والے وقت میں ہماری آمد کا دور دراز امکان انہوں نے احتیاطاً دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ رکھا تھا۔ بے شک انہوں نے مولوی صاحب کی تلاش کی وجہ جاننے کی بے کلی ظاہر کی تھی مگر بہت رسمی۔ ان کی جانب سے اپنی وحشت چھپانے کی کوشش بھی مصنوعی لگتی تھی۔ بھُسل مجھ سے رائے طلب کرتا تو میں اسے ایک ہی اشارہ کرتا۔ گو نہ وقت موزوں تھا' نہ جگہ مناسب تھی لیکن میرے خیال میں اب چاقو اور رسّے کا مرحلہ آگیا تھا۔ ہتھیار لوہار کی ضرب کی مانند ہے۔ سو دلیلوں کی ایک دلیل۔ ہتھیار کبھی کبھی تریاق بھی ثابت ہوتا ہے۔ بہت عرصے بعد' جیسلمیر اور حیدر آباد کے بعد کہیں حاشیے میں بسے ہوئے اس قصبے میں پھر کوئی ٹھکانا دستیاب ہوا تھا جہاں مولوی صاحب اور کورا کے پیروں کے نقش پیوست تھے۔ یہ نقش ہمیں منزل تک لے جا سکتے تھے۔ میرے پاس بھی چاقو تھا۔ بھُسل کے خیال سے میں ہاتھ جکڑے بیٹھا رہا۔

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH:5556532
PROP: ALI KHAN

میرا جسم دھڑک رہا تھا۔

حافظ صاحب کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ قندیلوں کی روشنی میں یہ سرخی کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ انہوں نے جھڑکنے کے انداز میں بٹھل سے کہا "دیکھیے جناب! آپ مہمان کی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ بہتر ہوگا' اب یہ باب بند کر دیجیے۔ مجھے آپ کے اور مولوی صاحب کے کسی مناقشے سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے اس بابت کوئی علم ہے نہ دلچسپی اور جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے' میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ مجھے آپ سے کسی واقف کاری کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے اٹھ جاؤں تو میں اٹھا جاتا ہوں۔"

"ہم ایسا کیسے بول سکتے ہیں' آپ کا گھر ہے صاحب' آپ ادھری کے حاکم ہو" بٹھل نے کھردری آواز میں کہا "تسلی رکھو' ہم ادھری قبضہ جمانے کو نہیں آئے' ہمی اٹھ جائیں گے پر آپ خالی ہاتھ لوٹا دو گے کیا! ہم کو بول دو صاحب! مولوی صاحب کو کدھری چھپایا ہے۔ اپنے لیے یہی جائداد' جاگیر' جان کے برابر ہے۔"

"یعنی' یعنی' آپ کا مطلب ہے۔ میں نے مولوی شفیق کو کہیں چھپا دیا ہے" حافظ صاحب تڑخ کر بولے "آپ کو یہ بدگمانی ہے تو اسے دماغی فتور کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں قطعی لاعلم ہوں" حافظ صاحب چڑ سے گئے' کہنے لگے "آپ او نچا سنتے ہیں کیا؟"

"بیس دن پہلے مولوی صاحب ادھری تھے" بٹھل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

حافظ صاحب کے نتھنے پھڑکنے لگے "یہ' یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"اپنے کو چھوٹے صاحب نے بولا تھا۔"

"انہوں نے ٹھیک بتایا ہے' آئے تھے' یقیناً آئے تھے۔ وہ کسی وقت بھی یہاں آ سکتے ہیں' ٹھہر سکتے ہیں۔ یہاں کوئی بھی مہمان آ سکتا ہے' جیسے آپ آئے ہیں۔"

"اب وہ کدھری کا بول کے گئے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم' نہیں معلوم' میں آپ سے کتنی بار کہہ چکا ہوں' یوں میں دفع الوقتی کے لیے کسی جگہ کا نام لے سکتا ہوں۔ کیا آپ یہی چاہتے ہیں۔ بس کیجیے' جتنا کہا جا رہا ہے' اتنا ہی سنیے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بٹھل نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا "پر اچھا ہے' ایک بات جان لو صاحب! اتنی چھوٹی بھی ہے۔ یہ آنکھ مچولی کب تک چلے گی' پھر مولوی صاحب کو چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی اور ان کو بول دینا صاحب! ا[illegible] لڑکی کو کچھ ہوا تو۔" بٹھل نے لمحے کے توقف میں خود [illegible] قابو پایا اور دھیمے لہجے میں بولا "اچھا نہیں ہوگا۔ بالکل [illegible] نہیں۔"

"بہتر ہے' یہ دھمکیاں آپ انہی کو دیجیے گا۔ میں ان[illegible] آپ کا قاصد نہیں ہوں۔ مجھے آپ کس جنجال میں ڈال ر[illegible] ہیں۔ کون سے جرم کی سزا دے رہے ہیں۔"

"آپ ان کا بہت دم بھرتے ہوتا۔"

"آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ بے شک وہ میرے نہا[illegible] معتبر دوست ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں" حافظ صاحب زور دے کر کہا لیکن ان کا عزم نمائشی لگتا تھا۔

"اسی واسطے آپ کو بولتے ہیں۔"

"مولوی شفیق اپنا اچھا برا مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"پھر ایسا جھٹکا نہ کرتے۔"

"ٹھیک ہے' وہ کبھی اس طرف آئے تو میں ضرور آ[illegible] پیغام انہیں منتقل کر دوں گا" حافظ صاحب نے گلو خلاصی کے لیے مفاہمت کا لہجہ اختیار کیا "اب آپ آرام کیجیے' اگر کو صبح جانا ہے تو کچھ دیر کے لیے آرام کر لینا ضروری[illegible] تانگے والے کو میں ہدایت کر دیتا ہوں۔ میں تو شاید ا[illegible] پاؤں۔ ملازم جاگ رہے ہوں گے۔ کوئی زحمت نہیں ہ[illegible] آپ کو۔"

"ہم ابھی اور ادھری ٹھہرنا چاہتے ہیں۔"

حافظ صاحب کا عالم دگر ہوا' کسمپرسی کا سا عالم اور ا[illegible] جو کہنا چاہیے تھا' انہوں نے کہا "ضرور' ضرور' شوق [illegible]"

"اپنے کو ادھری شیش محل میں نہیں تو کسی کو[illegible] کونے میں جگہ دے دینا۔"

"نہیں' نہیں۔ آپ یہیں ٹھہریے' مگر مگر" حافظ صا[illegible] تھکی ہوئی آواز میں بولے "معاف کیجیے' ابھی تو آپ فر[illegible] تھے۔ آپ کو بہت عجلت ہے' مراد آباد کے مسافر خا[illegible] آپ کے ہم سفر انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"سوکھ جائیں حرام کے" بٹھل نے منہ بگاڑ کے [illegible] نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی لیکن کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"مولوی صاحب کسی ٹائم بھی ادھری آ سکتے ہیں[illegible]"

"ان کے آسرے میں آپ ٹھہرنا چاہتے ہیں؟"

"آپ کو کیا اور کتنا بولیں' آپ نہیں [illegible] صاحب!" بٹھل نے دہکتی آواز میں کہا "ان سے [illegible] بازی

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
RAWALPINDI

برابر کے بنا اپنی نہیں سمجھے کی جہت نام لیا ہے انہوں نے بہت نچایا ہے اپنے کو' کتنے لوگ' کتنے گھر۔ جانے دو صاحب!"

"میں سمجھ رہا ہوں" حافظ صاحب معذرت آمیز ملائمت سے بولے "ضرور کوئی ایسی بات ہوگی لیکن جناب' ان کا کیا بھروسا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مالک و مختار ہیں۔ مہینے کیا' سال گزر جاتے ہیں۔ اس طرح کب تک آپ ان کی راہ دیکھیں گے۔"

"آخر تک' ادھری گھر سے آپ نکال دو گے تو باہر گلی میں' ادھری بستی میں آپ کے نزدیک ٹھکانا کرلیں گے۔ آپ فکر نہ کرو' دانے دنکے کے لیے اپنے پاس تھوڑا بہت سہارا ہے۔"

"جی' جی ہاں" حافظ صاحب کی آواز شکستہ ہوگئی' تذبذب سے بولے "میری مانیے تو کچھ عرض کروں؟"

"اب تک آپ ہی کی مانی ہے۔"

"ایسا کیجئے' مجھے اپنا پتا دے دیجئے' جیسے ہی انہوں نے یہاں کا رخ کیا۔ میں جناب کو اطلاع کردوں گا۔"

"ہم نے ماں کا دودھ بچپن ہی میں چھوڑ دیا تھا۔"

"کیا مطلب!" حافظ صاحب جھلا کے بولے "اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے!"

"ان سے پوچھے بغیر آپ ہم کو لکھ دو گے؟"

حافظ صاحب کش مکش سے دوچار ہوئے پھر قطعیت سے بولے "نہیں' ان سے پوچھنا تو ضروری ہوگا۔"

"ان کا جواب جانتے ہوئے بھی؟"

"ممکن ہے' وہ آمادہ ہو جائیں' اطمینان رکھیں' میں آپ کی بے تابی' آپ کی شدت کا سارا احوال ان کے گوش گزار کردوں گا۔ میں ان پر پورا زور دوں گا۔ میں یہی کرسکتا ہوں۔"

بھٹل نے کچھ نہیں کہا اور شیشے کے جگ سے کٹورا بھر کے پانی پیا۔

بیٹھک میں خاموشی چھائے دیر ہوگئی تو حافظ صاحب نے دبی ہوئی آواز میں ٹوکا "تو پھر کیا طے کیا آپ نے؟"

"کیا بولیں صاحب!" بھٹل نے سانس بھر کے کہا۔

"آپ کو میری عرض پر یقین نہیں آرہا۔"

"آپ کو بھی ہمارے پہ نہیں آرہا" بھٹل نے بوجھل لہجے میں کہا "لگتا ہے' بہت باندھ کے رکھا ہے آپ کو مولوی صاحب نے' طوطے کی طرح اپنی بولی رٹائی ہے۔ اپنے بارے بھی کم نہیں بولا ہے۔ پر ہم پاگل خانے سے اٹھ کے نہیں آئے ہیں۔ بہت ڈھول چاٹ کے چکر کاٹ کے ادھری پہنچے ہیں۔"

بھٹل نے حقے کی نال نیچے میں اڑا کے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں چاقو دبا ہوا تھا۔ ایک کھٹکے پر چاقو کا پھل کھل گیا۔

حافظ صاحب کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ مونڈھے پر ان کا جسم پھڑپھڑایا۔ وہ اٹھنا چاہتے تھے لیکن مونڈھے نے جیسے انہیں جکڑ لیا تھا۔ "یہ' یہ کیا جناب!" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کی پھٹی ہوئی آواز حلق میں ڈوب گئی۔

میرا سارا وجود دھڑکنے لگا تھا۔ بھٹل بھی آخر اسی نتیجے پر پہنچا جو میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ اس نے خاصی دیر کردی تھی۔ میں اب تک گونگا بنا بیٹھا رہا تھا لیکن میں نے طے کررکھا تھا۔ دونوں میں سے کسی ایک نے حجت تمام سمجھ کے بیٹھک سے اٹھنے کا ارادہ کیا تو میں خاموش نہیں رہوں گا۔ اس کا مطلب تھا کہ بھٹل نے حافظ صاحب کا شمار بھی مولوی صاحب کے ان واقف کاروں میں کرلیا ہے جن سے گزشتہ پندرہ دنوں کے درمیان ہم مراد آباد اور اطراف کی بستیوں میں مل چکے تھے۔ حافظ صاحب کسی طور بھی ان لوگوں کے زمرے میں نہیں آتے تھے۔

چاقو پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بھٹل نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آسکا مگر کسی معمول کی مانند میں نے اس کے اشارے پر عمل کیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے پنجے میں جکڑ لیا اور کچھ اور سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ کسی تاخیر کے بغیر چاقو سے میری کلائی پر لکیر کھینچ دی۔ بس ایک آن کے لیے رگ و پے میں بجلی سی چمکتی تھی اور کلائی میں چنگاریاں لپکی تھیں۔ میں نے اپنی سسکاری سینے ہی میں گھونٹے رکھی۔ بھٹل نے کہنی اور ہتھیلی کے درمیان سات انچ کے قریب لکیر کھینچ کے کھال کھول دی تھی۔ حافظ صاحب کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" انہوں نے بہ مشکل تمام کہا۔ اسی وقت بھٹل نے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی پر بھی میری کلائی جیسی ایک دھاری ڈال دی۔ دونوں کا خون چھلکنے چھلکنے بہنے لگا۔

بھٹل نے چاقو بند کرکے جیب میں واپس رکھا تو سینے میں اٹکی ہوئی حافظ صاحب کی سانسیں کسی قدر بحال ہوگئیں اور وہ بے تحاشا شور مچانے لگے "یہ کیا' یہ کیا' کیا آپ نے" ان کی لرزتی ہوئی صدائیں بیٹھک میں گونج رہی تھیں۔ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر منڈلاتی ہوئی ان کی نظریں میزپوش پر گئیں اور انہوں نے اس کے کونے سے پہلے میری پھر بھٹل کی کلائی سے ابلتا ہوا خون بند کرنے کی کوشش کیا۔ پھر انہوں نے اپنی شال پھاڑ دینا چاہی۔ اسی اثنا میں فنجان کے طشت پر ڈھکا ہوا کپڑا ان کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے اسے چاک کردیا۔ بھٹل نے انہیں روکا اور چلم کی راکھ چٹکی میں بھر کے میرے اور اپنے زخم پر بکھیردی۔ گرم راکھ سے مرچیں سی بھر گئیں۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ صاحب!" بھٹل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ کیا' کیا آپ نے؟" حافظ صاحب پر دہشت طاری تھی۔

"ٹوٹکا ہے صاحب' بولتے ہیں خون بہت کام کی چیز ہوتا ہے' جلدی اثر دکھاتا ہے۔"

"یہ تو بہت زیادتی ہے۔"

"اپنے ساتھ ہی کی ہے صاحب!"

حافظ صاحب کی چیخ پکار پر پہلے ایک ملازم بھاگا ہوا آیا' پھر دوسرا' تیسرا' "ارے جلدی کرو' پانی لاؤ' پھٹکری' روئی لاؤ۔ اسپرٹ ہے گھر میں؟ گیس کی لالٹین والی الماری میں دیکھو" وہ پے درپے احکام دینے لگے۔ تھوڑی دیر میں دو اور آدمی آگئے۔ ان میں ایک تیئس چوبیس سالہ صحت مند نوجوان بھی تھا۔ حواس باختہ عبدالمتین بھی ان کے پیچھے بیٹھک میں داخل ہوا۔ میزپوش کا بڑا حصہ خون میں رنگ گیا تھا۔ عبدالمتین وجہ جاننے کے لیے متوحش تھا۔ حافظ صاحب نے اسے جھڑک دیا۔ جگ کے پانی میں روئی بھگو کے انہوں نے ایک معمر ملازم کی مدد سے بھٹل کی کلائی دھوئی۔ بھٹل نے سوت کے چاقو چلایا تھا۔ لکیر زیادہ گہری نہیں تھی' نہ میری نہ اس کی لیکن خون بری طرح پھوٹ رہا تھا۔ حافظ صاحب نے اسپرٹ میں ڈوبی روئی زخم پر رکھی تو نہ میں نے اف کی نہ بھٹل نے۔ حافظ صاحب کو قرار نہیں آیا' انہوں نے حامد نامی ملازم کو ڈاکٹر پنت کو بلانے کی ہدایت کی اور کہا "میرا نام لینا' کہنا' جتنی جلدی ہوسکے' آجائیں۔ دیر نہ کریں۔ جس حالت میں ہوں' اٹھ جائیں۔ سو رہے ہوں تو جگادینا' میرا نام لینا" بھٹل نے ملازم کو منع کردیا تھا لیکن حافظ صاحب ملازم حامد کے پس وپیش پر بے طرح برس پڑے۔

بھٹل کی ترغیب پر حافظ صاحب نے باقی ملازموں کو واپس چلے جانے کا حکم صادر کردیا تھا۔ ملازم چلے گئے لیکن باہر سے آتی ہوئی آہٹوں اور سرگوشیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھک کے آس پاس ہی ہیں۔ عبدالمتین اور نوجوان وہیں بیٹھے رہے۔ ہم دونوں کے سکون سے حافظ صاحب کی کشیدہ تنی میں ظاہراً فرق آیا تھا' ہرچند ان کی چشم دریدگی' ذہنی انتشار کی مخبری کررہی تھی۔ انہوں نے سرزنش کے انداز میں نوجوان سے حقے' قہوے اور پان کا انتظام کرنے کی فرمائش کی۔ نوجوان ان کا بیٹا یا بھتیجا ہی ہوسکتا تھا۔ وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ بیٹھک کے باہر جھانکتے ہوئے ملازموں کو حکم منتقل کرکے فوراً واپس آگیا۔ وہ اور عبدالمتین حادثے کا سبب جاننے کے لیے بے تاب تھے اور حافظ صاحب سے کچھ پوچھنے کا انہیں حوصلہ نہیں ہورہا تھا۔ باربار کرسی کے ڈنڈے سے سرٹکاتے اور ہڑبڑا کے سیدھے ہوجاتے اور ان کی بکھری ہوئی نظریں ہم پر آکے ڈھیر ہوجاتیں۔

پندرہ منٹ سے کم وقت میں گاؤن میں ملبوس افتاں وخیزاں ادھیڑ ڈاکٹر پنت نے بیٹھک میں قدم رکھا۔ ملازم حامد نے جانے کیا کیا حاشیہ آرائی کی ہوگی "خیریت تو ہے حافظ صاحب؟" ڈاکٹر پنت نے آتے ہی پوچھا۔ اس نے سوال حافظ صاحب سے کیا تھا اور نگاہیں ہم دونوں کو زد پر لیے ہوئے تھیں۔

حافظ صاحب نے ناوقت زحمت پر جیسے تیسے ڈاکٹر سے معذرت چاہی اور بہ عجلت ہماری جانب اشارہ کیا۔

بھٹل نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرکے مرہم پٹی سے انکار کردیا تھا مگر عبدالمتین اور حافظ عبدالخالق کے اصرار پر چپ ہوگیا۔ ڈاکٹر اپنا بکسا ساتھ لایا تھا۔ وہ ٹانکے لگانا چاہتا تھا۔ بھٹل نے اجازت نہیں دی۔ زخم گہرا ہوتا تو ڈاکٹر باز بھی نہ آتا۔ ہم دونوں کی کلائیوں پر ایک جیسی لکیر اس کے لیے حیرت وفکر کا باعث ہونی چاہیے تھی مگر اس نے بردباری کا ثبوت دیا۔ جب تک وہ مرہم پٹی سے فارغ نہیں ہوگیا' زخم کی وجہ کے بارے میں اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

"آپ ہی پوچھیں ڈاکٹر صاحب!" حافظ صاحب ہراساں آواز میں بولے۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر بھٹل سے مخاطب ہو' بھٹل نے بے نیازانہ کہا "کچھ نہیں صاحب! آپ نے دیکھ ہی لیا۔ معمولی دھاری ہے۔"

ڈاکٹر مطمئن نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے۔ دونوں لکیروں کی پیمائش یکساں تھی اور بھٹل نے نسوں کا خیال رکھا تھا۔

"میں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا" ڈاکٹر پنت کدورت سے بولا۔

"اب تو دیکھ لیا صاحب!" بھٹل نے ہنس کے کہا۔

"مگر یہ تو۔ یہ تو۔" شاید ڈاکٹر کو احساس ہوا کہ ہمیں

بہرحال حافظ صاحب کے مہمان کی حیثیت حاصل ہے۔ سو اس نے اپنے لہجے کی ناگواری دور کرنے کے لیے کچھ توقف کیا۔

"کیا صاحب!" بھُل نے سرسری لہجے میں کہا "تھوڑا چاقو کا کرتب تھا۔ لگتا ہے ' ادھری کسی نے خون نہیں دیکھا۔"

"دیکھا ہے سب نے میاں جی! پر اس طرح سے نہیں"

ڈاکٹر کلبلاتی آواز میں بولا۔

"کبھی ٹائم ملا تو بولیں گے صاحب!" بھُل نے بات بڑھانے سے اجتناب کیا اور کسمسا کے بولے "اپنے کو دکھ ہے' اتنوں کی نیند اکارت ہوئی۔ ہم نے آپ کو بلانے سے منع کیا تھا۔ اب آپ گھر جاؤ صاحب!"

ڈاکٹر نے خشمگیں نظروں سے حافظ آباد صاحب کو دیکھا۔ حافظ صاحب کا ہیجان انگیز سکوت بالائے ستم تھا "اپنا کام یہی ہے مہاشے" ڈاکٹر پنت کی آواز میں ترشی کے ساتھ نخوت بھی عود کر آئی کہنے لگے "ڈاکٹر اور گھڑی کا کیا سمبندھ' فوجی اور ڈاکٹر کے لیے گھڑیاں نہیں بنیں۔"

"ادھری بمبئی' کلکتے آکے دکان کھولو تو پوچھیں گے صاحب!" بھُل نے بدیداتے ہوئے کہا "دیوار' کلائی پہ گھڑیاں لگاتے ہو یا نہیں۔"

اتنی دیر میں ملازم قہوہ لے آئے۔ خاص دان میں تازی گلوریاں اور تازی حقہ' چاقو اور خون کی بات تھی۔ ملازم اندر آنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر نے شکن آلود پیشانی سے ایک فنجان پیا اور اٹھنے سے پہلے متعدد پڑیاں' گولیاں ہمارے حوالے کیں' نسخہ لکھا' احتیاطی تدبیریں تجویز کیں اور رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد عبدالمتین اور نوجوان نادر مونڈھوں پر بیٹھے پہلو بدلتے رہے۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ عبدالمتین نے جھجکتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کو اٹھ جانے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

"تم لوگ جاؤ" حافظ عبدالخالق چیختی آواز میں بولے "مجھے مہمانوں سے کچھ بات کرنی ہے۔"

وہ دونوں بادل ناخواستہ مونڈھوں سے اٹھے اور بھاری قدموں سے باہر چلے گئے۔ اس وقت ڈیڑھ سے اوپر ہو چکا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں سے کتے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ صحن کی جانب بھی اندھیرا ہو گیا تھا لیکن سبھی جاگ رہے ہوں گے اور بیٹھک سے ابھرنے والی کسی آہٹ کے منتظر ہوں گے۔ ان کا مالک چاقو بردار اجنبیوں کے ساتھ تنہا بیٹھا تھا۔ میری کلائی میں ہلکی ہلکی کسک ہونے لگی تھی۔ بھُل تو حقہ گڑگڑاتا اور پان چباتا رہا۔

بہت دیر میں کہیں حافظ صاحب کے جسم میں جنبش ہوئی' جیسے انہوں نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو اور کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں۔ ایک لہر سی ان کے سراپا میں اٹھی۔ انہوں نے سر اٹھایا۔ ان کی چلتی بجھتی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں اور ان کے چہرے پر اندرونی خلفشار کی درشتی ہویدا ہوئی "اچھا تو تم ہی نرجس بانو کو مولوی شفیق کے پاس لائے تھے؟"

میری رگوں میں خون رک گیا' نرجس بانو سے ان کی مراد کورا ہی تھی "جی' جی ہاں" میں نے اضطراری انداز میں سر ہلایا۔

"اور تمہی کو سزا ہوئی تھی' دو آدمیوں کے خون کے جرم میں؟" حافظ صاحب بے ربطی سے بولے۔

میں نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے کہا "لیکن میں نے دانستہ تو ایسا نہیں کیا تھا۔"

"معلوم ہے' لڑکی کو بدمعاشوں کے چنگل سے بچانے کے لیے تم یہ انتہا درجے کا قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔"

حافظ صاحب کو بہت کچھ معلوم تھا۔ میں نے اپنی وحشت پر قابو پانے کی کوشش کی "میں کیا کر سکتا تھا" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا "ہمیں مولوی صاحب دریائے جگلی کی سیر کرانے لے گئے تھے' غنڈوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کے پاس ہتھیار بھی تھے۔ میرا کوئی دماغ خراب نہیں ہوا تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ سب تسلیم کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے سات سال کی سزا سنا دی۔"

"اگر مولوی شفیق اس وقت موجود نہ ہوتے تو لڑکی کا کیا حال ہوتا؟ تم تو گرفتار ہو گئے تھے؟"

"لیکن میں ان غنڈوں کو ختم نہ کرتا تو وہ ہم پر حاوی آجاتے۔ نہ جانے کب سے وہ ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ اس کے لیے مولوی صاحب کا اور میرا خون بھی کر سکتے تھے۔"

"مگر میں کچھ اور کہہ رہا ہوں" حافظ صاحب کا انداز تنبیہی تھا' کہنے لگے "جو نہیں ہوا' اس کی ہولناکی تصور کی جا سکتی ہے۔ جو کچھ پیش آیا' ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ مولوی شفیق اس وقت لڑکی کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے۔ یقیناً تمہارے علم میں ہوگا' وہ ایک مجرد آدمی ہیں۔ ان کا کوئی باقاعدہ گھر نہیں تھا' گھر میں کوئی عورت نہیں۔ ایک نوجوان لڑکی کی ذمے داری اچانک ان پر آن پڑی اور لڑکی بھی کیسی' چندے آفتاب' چندے ماہتاب۔

شہزادی کو بد نگاہوں سے بچائے رکھنا مولوی شفیق کے لیے کوئی آسان نہیں تھا' تم تو ایک مرتبہ پس زنداں کے راستے سے ہٹ گئے۔ مولوی شفیق کے ساتھ تو وہ ہر دم موجود تھی۔ اس کے بعد مولوی شفیق صاحب کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ وہ اسے چھپائے چھپائے پھرتے رہے' نہ ان کا کاروبار رہا' نہ گھر۔ لڑکی کی نگہداشت' اس کی تربیت ہی ان کا مقصود بن گئی۔ انہوں نے نرجس بانو کے لیے سبھی کچھ ترک کر دیا۔ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ انہوں نے لڑکی پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔"

"ظاہر ہے" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "ان کا بہت احسان ہے۔"

"صرف احسان نہیں" حافظ صاحب بے چینی سے بولے "میری بات توجہ سے سنو عزیز من! تمہیں خدانخواستہ موت کی سزا بھی ہو سکتی تھی۔ ہو سکتی تھی نا؟" میں ان کی صورت دیکھا کیا' مجھ سے کچھ کہا نہیں جا سکا۔

"سات سال کے بجائے تمہیں عمر قید بھی ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سزا بھگتنے کے بعد تمہاری توجہ لڑکی کی طرف سے ہٹ جاتی اور تم ایک پرانی تکلیف دہ داستان سمجھ کر سب کچھ بھلا دیتے۔ اس مدت میں۔"

"میں' میں اسے بھلا دیتا! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میں نے حافظ صاحب کو آگے کوئی ہرزہ سرائی نہیں کرنے دی۔ "اس کے لیے میں نے گھر' بھائی بہنیں' ماں باپ ... اس کی وجہ سے میں نے سات سال ..." میری آواز ہی نے ساتھ نہیں دیا۔

"مقصد یہ ہے برادرم!" حافظ صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں وضاحت کی "کچھ بھی ممکن تھا۔ اس عرصے میں مولوی شفیق کو بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا تھا' تمہیں بھی۔ درمیان میں ایک زمانہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مولوی شفیق کسی معقول جگہ نرجس بانو کی شادی کر دیتے۔ ہر لڑکی کو بہرحال ایک نہ ایک دن اپنا گھر بسانا ہوتا ہے' اور اس چاند سی لڑکی کے لیے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ جیل جانے کے بعد عملاً نرجس بانو سے دستبردار ہو گئے تھے۔ تم زنداں میں بس اس کی سلامتی کے لیے دعائیں ہی کر سکتے تھے۔ وہ تم نے پوری کی ہوں گی۔"

"آپ' آپ ... کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے ہذیانی آواز میں کہا۔

حافظ صاحب نے ہاتھ اٹھا کے مجھے تحمل کی تلقین کی اور آہستگی سے بولے "میں کہنا چاہتا ہوں کہ سزا ہو جانے کے بعد تمہارا اس پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ بعد میں سب کچھ مولوی شفیق ہی کو نرجس بانو کے لیے سوچنا اور کرنا تھا۔"

"انہوں نے بہت کچھ کیا۔ کوئی بھی شاید اتنا ایثار نہ کر پاتا' میں آپ کو کیا بتاؤں' جیل سے آزاد ہونے کے بعد میں نے جگہ جگہ ان کی تلاش کی' تقریباً ان ساری جگہوں پر جہاں ان کے ملنے کا امکان تھا۔ وہ کہیں نہیں ملے۔ جن خدشات کا آپ ذکر کر رہے ہیں' خوش قسمتی سے وہ پیش نہیں آئے یا اتفاق سے وہ سب کچھ نہیں ہوا' آپ کے بہ قول جن کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ سات سال کے عرصے میں ہم تینوں موجود ہیں۔ جیل سے نکلنے کے بعد میں نے مولوی صاحب کی تلاش اس لیے کی تھی کہ ان کا سہارا بن سکوں' انہیں باور کرا سکوں کہ اب برا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ اطمینان سے بیٹھیں' میں ان کے مصائب کی تلافی کے لیے آگیا ہوں۔ جس طرح میں نے انہیں تلاش کیا تھا' انہوں نے مجھے کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے ایک دفعہ بھی پلٹ کر میری خبر نہیں لی کہ مجھ پر کیا گزری' میں کس حال میں ہوں۔ میں نے کون سا گناہ کیا تھا' ایک طرح سے تو میں نے مولوی صاحب کی جان بھی بچائی تھی۔ وہ تو چشم دید گواہ تھے۔ آپ کے کہنے کے مطابق وہ تو بہت صادق' بہت امین آدمی ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں" حافظ صاحب نے بظاہر مشفقانہ انداز میں کہا "ذرا سوچو' جس لڑکی کے لیے مولوی صاحب نے اتنا وقت برباد کیا ہے' جس کی عزت و عصمت' جس کی خوشی و خوشنودی کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو بھلا دیا' اس سے ان کی وابستگی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں' انہیں وہی کرنا چاہیے۔ انہیں لڑکی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ وہ تمہارے تنخواہ دار تو نہیں تھے۔ کوئی کاغذ پتا بھی تمہارے ان کے درمیان طے نہیں ہوا تھا۔"

"کاغذ پتے کی کیا بات ہے؟" مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا' میں نے برگشتگی سے کہا "کاغذ پتا بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت نہیں تو بعد میں مگر انہوں نے اس کا موقع ہی کہاں دیا۔ جیل جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میری موت ہو گئی ہے۔ ورنہ جیل سے کسی وظیفے' روزینے کا بھی بندوبست ہو سکتا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر کچھ لوگ راستے کا پتھر بن جاتے ہیں تو سایہ دار لوگ بھی راستے میں ملتے ہیں۔ جیل میں مجھے ایسے مہربان مل گئے تھے جو سارا انتظام کر دیتے۔ وہ اس کی حفاظت بھی مولوی صاحب سے بہتر کر سکتے تھے مگر مولوی صاحب کو کبھی میری یاد نہیں آئی۔

STATIONARY AND ...
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH:5556532
PROP:ALI KHAN

انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ میں اس سے الگ نہیں ہوں۔ جیل آنے سے انہیں کوئی روکتا تو نہیں اور وہاں جاکے وہ مجرم تو نہیں بن جاتے، ناپاک تو نہیں ہوجاتے۔"

"تم نے عدالت میں لڑکی اور مولوی شفیق کے ذکر سے غالباً اجتناب کیا تھا۔ جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے، اس رات چند ایک بدمعاش فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب کو فوراً کلکتے سے چلے جانا چاہیے تھا۔"

"مگر بعد میں سہی" میں نے بپھری ہوئی آواز میں کہا "ایک سال، دو سال بعد۔"

"یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تمہیں کتنی لمبی سزا ہوگئی ہے، ان کے جیل آنے سے کیا حاصل تھا۔ تمہیں رہائی تو نہیں مل سکتی تھی۔ اس اشک شوئی سے تمہیں اور اذیت ہی ہوتی۔ میں نہیں کہہ سکتا لیکن شاید پھر مولوی شفیق کا کلکتے کی طرف جانا بھی نہیں ہوا۔ شروع کے دنوں میں تم ان کی کشمکش کا اندازہ کرسکتے ہو۔ پھر شاید انہیں روز و شب کی گردش سے مہلت ہی نہیں ملی، یا ہوسکتا ہے بھئی، انہوں نے تم سے نہ ملنے کا کوئی فیصلہ ہی کرلیا ہو۔ ممکن ہے، انہیں یہ اندیشہ ہو کہ اس رات ناکام ہوجانے والے بدمعاش مسلسل تمہارے سلسلوں کی تاک میں ہوں گے۔ جیل میں تم سے ملنے کون کون آتا ہے، تمہارا کن لوگوں سے رابطہ ہے، تمہارے جیل جانے کے بعد لڑکی پھر کہاں چلی گئی؟"

حافظ صاحب کو اپنی کٹ حجتی کا کچھ احساس ہوا اور وہ نرمی سے بولے "دیکھو بھائی! مولوی شفیق شروع سے ایک لاابالی، کسی جگہ جم کے نہ رہنے والے، کسی حد تک خودسر، اپنے خول میں مست شخص تھے۔ ہم لوگ انہیں بہت ٹوکتے سمجھاتے تھے۔ نرجس بانو کے بعد میں نے ان میں نمایاں تبدیلیاں دیکھیں۔ پہلی بار وہ سنجیدہ اور فکرمند شخص نظر آئے۔ میں آپ کو یہی جتانے کی کوشش کررہا ہوں۔ نرجس بانو کی انہوں نے دل و جان سے حفاظت بلکہ خدمت اور پرورش کی ہے۔ لڑکی نے اپنے شعور کی عمر ان کے ساتھ گزاری ہے۔ انہوں نے استطاعت سے زیادہ اس کا خیال رکھا ہے، اسے علم کے زیور سے آراستہ کیا ہے، اس کی ذہنی تربیت کی ہے۔ اسے انہوں نے پھولوں میں رکھا ہے۔"

"مگر اسے ان سے کون چھین رہا ہے" میں نے جھینپی آواز میں کہا "میرے مل جانے سے مراد یہ کہاں ہے کہ مولوی صاحب کا باب ختم ہوگیا اور وہ اس سے کنارہ کش ہوگئے۔ اس طرح وہ ان سے دور تو نہیں ہوجائے گی۔"

حافظ صاحب مجھے گھورنے لگے اور جزبز ہوکے بو…

"ہاں، ہونا تو نہیں چاہیے لیکن شاید مولوی شفیق اس… نہیں سوچتے۔ نرجس بانو تو ان کے لیے بیٹی کے مانند ہے… سے کہیں زیادہ۔ ہر باپ اپنی اولاد کے برے بھلے میں اختیار… حق رکھتا ہے۔ تمہارے ساتھ وہ رہی بھی کتنے دن ہے… چند دن، ممکن ہے کچھ زیادہ لیکن مولوی صاحب کی اور… کی رفاقت کو ایک جگ ہو رہا ہے اور یوں دیکھو تو نرجس… سے بہ باطن تمہارا تعلق بھی اتنی ہی دور کا ہے جتنا مو… صاحب کا۔ وہ کوئی تمہاری سگی، ذات برادری وغیرہ کی تو… ہے۔ تمہارے اور اس کے مابین خون کا تو کوئی رشتہ… ہے۔"

میرا سر گھومنے لگا تھا۔ حافظ صاحب جانے کیسی با… کررہے تھے۔ جی میں آتا تھا، ان کی زبان کھینچ لوں۔… کتنی آسانی سے فیصلہ صادر کردیتا ہے۔ انہیں کچھ ا… نہیں تھا کہ وہ مسلسل اپنے مخاطب کی توہین کررہے ہیں… جیسے مجھ سے کوئی بدلا لے رہے تھے یا مجھے آزار پہنچا… انہوں نے ٹھان لی تھی۔ جانے وہ مجھے کیا سمجھ رہے… اس پر اپنے استحقاق کے لیے اب مجھے دلیلیں ر… ضرورت پڑتی تھی۔ میں ان سے کیا کہتا کہ میرا وجود… خود ایک دلیل ہے۔ مولوی صاحب نے اتنا وقت اس… ساتھ کہاں گزارا ہے جتنا میں نے بتایا ہے۔ میرا تو… اس کے خیال کے سوا نہیں گزرا۔ جیل سے باہر آ… میں نے جیل کی زندگی گزاری ہے۔ وہ مسلسل میرے… رہی ہے، میں تو مسلسل اس کے ساتھ رہا ہوں۔ جس… طرح گزرا ہے، اسے بھی تو وقت کی پیمائش میں… چاہیے۔ کبھی ایک لمحہ ایک جگ سے بڑا ہوتا ہے۔… کے خون میں شامل ہوجاتا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں… آدمی، آدمی کی آنکھوں میں روشن رہتا ہے۔ کوئی چیز… جاگزیں ہوجاتا ہے کہ ایک دوسرے کا امتیاز باقی نہیں… حافظ صاحب بہت تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انہیں… سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ پڑھے لکھے آدمی ہوں… سطروں کے درمیان کا پڑھنا انہیں نہیں آتا تھا۔… بس ترازو کے سامنے بیٹھے رہے ہیں، وہ حاضری کو… تھے۔ ان سے شاید کبھی کوئی جدا نہیں ہوا تھا۔ اس… انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا جو سورج کے طلوع و غروب… نہیں ہوتی۔ انہیں وہ زبان ہی نہیں آتی… وسیرت سے ماورا ہے۔ ایسے آدمی سے مزید بات… ہی تھا۔ میں نے شکستہ آواز میں کہا "میں آپ کو بتاؤں…

…صاحب اس کے لیے اچھا نہیں کر رہے۔ وہ اس سے کیسا ہی …لوک کرلیں لیکن وہ اچھا نہیں کر رہے، وہ کیا سمجھتے ہیں۔ …طرح وہ خوش رہ سکے گی؟ مجھے دور رکھ کے وہ اسے خوش رکھ سکیں گے؟"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" حافظ صاحب ناراضی سے …لے "تم اس کی خوشی و ناخوشی کے بارے میں کس قدر اور کیا جانتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"یہ تمہاری عمر بول رہی ہے۔"

"آپ کو کیا معلوم، مولوی صاحب نے اسے کس …رے میں زندہ رکھا ہے، جس دن اس کی امید ٹوٹے گی، وہ …ں رہے گی۔"

حافظ صاحب سر جھٹکنے لگے اور بٹھل کی جانب دیکھتے …ے برہم آواز میں بولے "آپ تو میری بات سمجھ رہے …؟"

"پر آپ نہیں سمجھ رہے ہو" بٹھل نے بھڑک کے کہا۔

حافظ صاحب کا چہرہ لال ہونے لگا "میرے سمجھنے یا نہ …ے سے کیا ہوتا ہے جناب!" وہ بے رخی سے بولے "میں تو …ی صاحب کے معاملات کی وضاحت کررہا ہوں، وکالت …"

"آپ جو بھی الٹا سیدھا کرو صاحب!" بٹھل نے اکھڑی آواز میں کہا "اپنے کو بولو، مولوی صاحب کو سامنے …میں کیا لاج آتی ہے؟"

"جی، جی!" پہلے تو حافظ صاحب نے سرہلا کے تائید کی پھر …کا لہجہ سپاٹ ہوگیا "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ظاہر ہے، وہ …کی ضرورت نہیں سمجھتے یا مناسب خیال نہیں کرتے۔ میں …یہی کہتا ہوں، آپ مانیں یا نہ مانیں، حق بھی یہی ہے کہ …لڑکی کے سلسلے میں کوئی بھی قدم اٹھانے اور اچھا برا …کا اختیار ہے۔ زندگی دینے والا تو خدا ہے لیکن سبب بھی …بنا کرتا ہے۔ مولوی صاحب کی ذات نرجس بانو کے لیے …ی کا سبب بنی ہے۔"

"ساری تو تکاری گھما پھیری چھوڑو صاحب! ہم آپ کو …میں بولتے۔ ہم لڑکی کا دھیان چھوڑ دیں گے، اگر لڑکی …ہمارے سامنے نہیں تو اپنے کو آپ پر بھروسا …لڑکی سے خود پوچھو، وہ مولوی صاحب کے پاس …چاہتی ہے یا اپنے لاڈلے کے پاس یا دونوں کے؟"

…حافظ صاحب کوئی جواب نہیں دے سکے اور داڑھی نوچنے لگے پھر لمحوں کے تذبذب کے بعد بولے۔

"میں سمجھتا ہوں، یہ ایک معقول بات ہے۔"

"اپنے کو اس گھن چکر سے نکالو صاحب! ہم آپ کو زبان دیتے ہیں، ہم ایسے ہی لوٹ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" حافظ صاحب نے گہری سانس لی "ایسا ممکن ہے، بشرطیکہ مولوی شفیق صاحب اس طرف آجائیں۔"

"ہم آپ سے اب نہیں پوچھیں گے کہ ابھی وہ کدھری ہیں، سارا ہم آپ پہ چھوڑتے ہیں۔ آپ خدا والے آدمی ہو۔"

"میں کیا، میری بساط کیا" حافظ صاحب کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں اس کا نہایت عاجز بندہ ہوں، خدا مجھے معاف کرے۔ آپ مجھ پر بڑی ذمے داری ڈال رہے ہیں۔ فرض کیجیے، بار میاں سے نرجس بانو کی ذہنی و قلبی ناوابستگی کا کوئی شبہ ہی مولوی صاحب کے اجتناب کا باعث ہو اور وہ اپنی دانست میں نرجس بانو کا یہ فعل، یہ امید، نادانی، ناسمجھی پر محمول کرتے ہوں، اور قلب ماہیت کی توقع رکھتے ہوں، کیوں کہ وقت بڑے بڑے زخم مندمل کردیتا ہے۔ کسی نہ کسی دن نرجس بانو کی آس پر اوس پڑ جائے گی۔ اس صورت حال میں آپ ہی فرمائیے، وہ مجھے کیا، کسی کو بھی لڑکی کا عندیہ جاننے کا موقع نہیں دیں گے اور اگر انہوں نے یہ موقع فراہم بھی کردیا یا میں اپنے طور پر نرجس بانو سے سلسلہ جنبانی میں کامیاب بھی ہوگیا اور اس کی جانب سے واقعی مجھے کوئی ایسا اشارہ بھی مل گیا جس کی بابت آپ یقین کا اظہار کررہے ہیں۔ تو اس طرح نرجس بانو سے مولوی شفیق کی دستبرداری کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ کہاں ہوا کہ وہ نرجس بانو سے بری الذمہ ہوجائیں گے یا میں انہیں آمادہ کرپاؤں گا۔ نتیجہ تو وہی رہا۔ سمجھ رہے ہیں آپ؟ مولوی شفیق ایک ضدی شخص ہیں پھر میں آپ سے کیا کہہ سکوں گا اور آپ کے لیے کیا کرسکوں گا؟"

"آپ پھر الگ ہوجانا، ہم ان کو دیکھ لیں گے۔ اتنا جان کے آپ کو ان کے ٹھکانے کے بارے میں بولنے میں اتنی ایا بھی نہیں ہوگی، ایسا بل نہیں کھاؤ گے آپ پھر، آپ کو ہم سے بول دینا چاہیے صاحب!"

"میرے لیے پھر بھی یہ ایک مشکل مرحلہ ہوگا۔"

"سمجھتے ہیں صاحب! بہت کٹھن ہوگا، پر آپ ایک تھوڑا بول کے دو آدمی کو بچاؤ گے، ایک لڑکی کو، دوسرے لاڈلے کو۔ ہم آپ کو بولتے ہیں، لڑکی بھی ایسے زیادہ دنوں تک نہیں کھینچے گی، اور یہ شکرا بھی، آپ اس کو دیکھ رہے ہو

نا! اس کے پر کٹے ہوئے ہیں۔ ایک دم آدھا ہے۔ یہ آدھا بھی نہیں رہے گا جس دن۔۔۔ جس دن۔۔۔" بچھل کی آواز بھاری ہونے لگی۔ ایک لمحے ٹھہر کے اس نے کہا "اور کیا کیا بولیں آپ کو' کڑی سے کڑی مل کے بڑا خرابا ہوا ہے۔ بیچ میں ایک دو نہیں' بہت لوگ' بہت گھر تلپٹ ہوئے ہیں اور جیل' کوئلے کی کان نہیں ہوتی صاحب کہ ہر کوئی ادھری سے کالا ہی ہو کے نکلے۔ ادھری اس نے اوپر کے درجے تک پڑھائی کی ہے۔"

"اچ۔۔چھا" حافظ صاحب کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی "میں یہی سوچ رہا تھا بلکہ پوچھنے والا ہی تھا' گفتگو ہی سے اندازہ ہو رہا تھا۔ کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے میاں آپ نے؟"

میں نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ میں نے ایم اے کیا ہے۔

"خوب' خوب' ماشاءاللہ۔ یہ تو آپ نے کمال کر دیا۔ یقین نہیں آتا۔ سچ ہے' علم کے حصول کی خواہش ہو تو در کھلتے جاتے ہیں۔"

"ادھری جیل سے چھوٹ کے اس کو اپنے اڈے پہ آنا چاہئے تھا' پر یہ کسی کو بولے بنا سیدھا مولوی صاحب کو ڈھونڈنے نکل گیا' اپنے پاس تو بہت بعد میں لوٹا۔" بچھل نے مختصراً حافظ صاحب کو بتایا کہ سمتوں سمتوں بے شمار بستیوں کی خاک چھانتے ہوئے آخر جیسلمیر شہر میں ہم نے وہ محلہ اور وہ گھر دریافت کیا جہاں مولوی صاحب نے کچھ عرصے قبل قیام کیا تھا مگر مولوی صاحب وہاں سے جا چکے تھے۔ بچھل نے جیسلمیر میں مولوی صاحب کے پڑوسی منیر علی اور رانا ماہ تاب کی روداد سے پہلو تہی کی اور کہا کہ بہت دنوں بعد ہمیں مراد آباد کے مسافر خانے کے روزنامچے سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے سکونت کے خانے میں حیدر آباد دکن کا پتہ لکھوایا ہے۔ ہم نے حیدر آباد کا رخ کیا مگر مولوی صاحب وہاں سے بھی کسی اور طرف نکل چکے تھے۔ اب بھی ہم حیدر آباد سے آ رہے ہیں۔"

"آپ حیدر آباد سے آ رہے ہیں؟" حافظ صاحب بوکھلا سے گئے۔

بچھل نے بہ شد و مد ایک بار پھر اپنے عزم کی تجدید کی کہ دشت نوردی تو مولوی صاحب کے گریبان پر جا کے ختم ہوتی ہے۔ اس نے حافظ صاحب کو بتایا کہ حیدر آباد۔۔۔ میں مولوی صاحب نواب ثروت یار کے ہاں مہمان ہوئے تھے۔ ہماری آہ و زاری پر نواب نے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی حیدر آباد میں مولوی صاحب کی واپسی ہوئی' وہ ہمیں خط کے ذریعے مطلع کرے گا۔ مولوی صاحب کے حیدر آباد آنے پر اپنا [illegible] نبھانے' دوسرے لفظوں میں ہمیں خط لکھنے سے پہلے اس [illegible] بہتر جانا کہ کیوں نہ مولوی صاحب کے سامنے ہمارا ذکر [illegible] کے دیکھے۔ ہمارے بارے میں مولوی صاحب کی را[illegible] جاننے کے بجائے وہ ہم سے کئے ہوئے وعدے کی [illegible] ترجیح دیتا تو ہم نے مولوی صاحب کو جا لیا ہوتا۔ نواب [illegible] قول' اس کی زبانی ہماری آمد کا احوال سن کے مولوی صا[illegible] گنگ رہ گئے اور دوسرے دن کسی کو مطلع کئے بغیر وہا[illegible] چلے گئے۔ ان کے یوں چلے جانے سے نواب بہ[illegible] برداشتہ تھا۔ ایک دن پہلے اس کی والدہ نے مولوی صا[illegible] سے گورا کو اپنے گھر کی بہو بنانے کی خواہش ظاہر کی [illegible] نواب کو گمان تھا کہ دیرینہ خاندانی رابطہ و ارتباط کے ب[illegible] میں رشتے سے برملا انکار کا حوصلہ مولوی صاحب کو [illegible] اسی لئے انہوں نے چپ چاپ نواب کے گھر سے [illegible] مناسب سمجھا۔ نواب کو دوبارہ مولوی صاحب کی حیدر[illegible] کا یقین نہیں تھا مگر اس کی توقع کے خلاف اور اس کی [illegible] کے عین مطابق مولوی صاحب دوبارہ حیدر آباد پہنچ [illegible] بار نواب نے ایفائے وعدہ کیا اور بمبئی خط لکھ کے حیدر آباد میں مولوی صاحب کی موجودگی کی اطلاع [illegible] کیا۔

"یعنی' یعنی نواب ثروت نے بذات خود [illegible] حیدر آباد' آنے کی دعوت دی؟" حافظ صاحب مضطر[illegible] میں بولے۔

بچھل نے اقرار میں سر جھکا لیا اور نواب ثر[illegible] ہاں پیش آنے والے واقعات خاصی تفصیل سے ب[illegible] حافظ صاحب مبہوت ہو کے سنتے رہے۔ ان کی پلکیں [illegible] ہو گئی تھیں۔ جب بچھل نے نواب کی موت کی خبر [illegible] کی حالت اور غیر ہو گئی "کیا' کیا کہہ رہے ہیں آپ [illegible] ثروت کا انتقال ہو گیا؟"

جواب میں بچھل سرد آہ ہی بھر سکتا تھا "اور [illegible] شفیق؟"

بچھل نے انہیں بتایا کہ نواب ثروت کے ا[illegible] خدمت گار کو اپنے آقا کے انتقال سے ایک روز [illegible] آیا کہ آقا کے حادثے اور جاں بہ لبی کی کیفیت [illegible] مولوی صاحب کے گوش گزار بھی کرنی چاہئے۔ [illegible] صاحب کا گھر معلوم تھا۔ خدمت گار کے رخصت [illegible] مولوی صاحب نے رخت سفر باندھ لیا۔ انہوں [illegible] محسن نواب ثروت کی عیادت کرنے میں بھی وقت [illegible]

کیا۔ دوسرے دن رات کو ہم ان کے گھر پہنچے تو ایک روز پہلے وہ وہاں سے جا چکے تھے۔

"جا چکے تھے! کہاں کہاں؟" حافظ صاحب بدحواسی سے بولے۔

"یہی جاننے کے لئے ہم ادھری آئے ہیں۔"

"مگر وہ' وہ یہاں تو نہیں آئے۔"

"آئے نہیں تو آ جائیں گے صاحب!"

ایک عالم ہیجان کے بعد حافظ صاحب کے دست و بازو اکڑ سے گئے۔ وہ تو بت بن گئے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر بچھل کی جزئیات بیانی کی وجہ اب کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بچھل حقے سے شغل کرتا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا "ہم تو ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ گھیرا گھٹ رہا ہے' کسی دن پٹی بھی کھل جائے گی۔ اب نہیں تو آگے' سال بھر میں' اور زیادہ بھی' ایک دن کسی کونے میں تو مولوی صاحب کو ہاتھ لگنا ہی ہے پھر کیا ہو گا صاحب؟"

"وہ یہاں آئے تو میں ان سے بات کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیے' میں ضرور ان سے بات کروں گا" حافظ صاحب کی زبان بہک رہی تھی "بے شک وہ بیس پچیس روز پہلے یہاں آئے تھے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ مجھے بھی حیدر آباد ہی کا بتا کے گئے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ حیدر آباد میں مستقل سکونت کے لئے نواب ثروت یار نے بہت اصرار کیا ہے' ہر طرح کی اعانت کا یقین دلایا ہے۔ گومگو کی حالت تھی۔ کہتے تھے کہ حیدر آباد جا کے صورت حال کا جائزہ لیں گے اور جیسا کچھ بھی ہوا' بذریعہ خط مجھے آگاہ کریں گے۔ ابھی تک ان کا کوئی خط نہیں آیا ہے۔ انہوں نے نواب ثروت یار کے بارے میں بہت کچھ بتایا لیکن نرجس بانو سے نواب کی دل چسپی کی بات مجھ سے مخفی رکھی۔ اس کا سبب غالباً یہی ہو گا کہ میں نے بھی ایک مرتبہ اشارۃً اپنے بیٹے عبدالحمید کے لئے ان سے بات کی تھی۔ ابھی ابھی جس بچے کو آپ نے دیکھا ہے' جو یہاں بیٹھا ہوا تھا' اسی کے لئے۔ ہمارے ہاں عموماً اپنی برادری میں شادیاں ہوتی ہیں لیکن مولوی صاحب کی پریشانی دیکھ کے میں نے زبان کھولی تھی۔ دوسرے' یہی بات ہے کہ نرجس بانو مجھے پسند بھی بہت ہے۔ کون اسے اپنے گھر کی زینت بنانا نہیں چاہے گا؟ مولوی صاحب نے انکار کیا نہ اقرار' چپ ہو گئے پھر کچھ سوچ کے بولے "دیکھو حافظ! دوبارہ مت کہنا۔ جب کوئی صورت بنی تو میں خود تمہیں اشارہ کر دوں گا۔ اگر تمہیں عبدالحمید کی شادی کی بہت جلدی ہے تو انتظار بھی مت کرنا' جہاں موزوں رشتہ ملے' بسم اللہ کر دینا۔ صورت بنے اور سازگار حالات کی بات میری فہم سے بالاتر تھی۔ میرے ان کے درمیان کسی قسم کا تکلف نہیں ہے۔ عبدالحمید ان کے لئے اولاد کے مانند ہے۔ میں کوئی سوال کر کے انہیں کشمکش میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ کئی بار میں نے ترغیب دی' بھلے مانس! کب تک خانہ بدوشی میں گزارو گے۔ اس دربدری کی ضرورت کیا ہے میرا تمہارا معاملہ غیروں کا نہیں۔ نگریا سادات شریفوں کی بستی ہے' بہت پرسکون ہے۔ پہلو میں ریاست رام پور' اس سے بیس میل پرے تمہارا مراد آباد ہے۔ نینی تال' بریلی' سبھی نزدیک ہیں۔ دلی بھی ایسی دور نہیں۔ یہاں رہ کے زمینوں کا کام سنبھالو' اللہ برکت دے گا۔ مولوی شفیق نے ہر بار پورے غور و خوض سے مشورے سنے' تائید بھی کی لیکن عمل نہیں کیا۔ ہفتوں' مہینوں یہاں قیام کیا۔ یہاں سبھی ان کی بے انتہا عزت کرتے ہیں۔ بچے چھوٹے ابا کہہ کر پکارتے ہیں۔ بڑے القاب و آداب سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ایک بار تو عرصے تک رہے' زمینوں پر میرے ساتھ ذوق و شوق سے جانے لگے لیکن پھر دل اکھڑ گیا۔ مجھے ان کی مالی حالت کا بھی علم ہے۔ مجھے کہنا نہیں چاہئے' محض عرض حال مراد ہے' متعدد دفعہ انہوں نے کھل کے کہہ بھی دیا۔ انہیں کرنا بھی یہی چاہئے تھا۔ خدا گواہ ہے' میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک مرتبہ جیسلمیر سے بھی پریشانی کا خط لکھا تھا۔ مجھے معلوم ہے' انہوں نے اپنا سب کچھ بیچ دیا ہے۔ شاید اب کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ شروع شروع میں تو انہیں بہت ٹوکتا تھا۔ بعد میں اس خیال سے یہ پند و نصائح کم کر دیئے کہ کہیں ناگوار خاطر نہ ہو جائے۔ تنگی میں آدمی اور حساس ہو جاتا ہے۔ ایک نہ ایک دن لازماً انہیں اپنی روش بدلنی پڑے گی لیکن میرا اندازہ اب تک غلط ہی ثابت ہوا ہے۔ جانے کس ادھیڑبن میں ہیں۔ پہلے تبت کے لوگوں کی طرف سے فکرمند تھے۔ خیر ابتدا ہی سے نرجس بانو کو برقع پہنا دیا تھا۔ برقعے میں وہ خاصی محفوظ ہو گئی تھی۔ اب تو بہت وقت گزر گیا۔ تبت میں لڑکی کے قبیلے کے لوگ' کب کے ناامید ہو چکے ہوں گے۔ اب اس جانب سے بھی بظاہر انہیں کوئی ایسی فکر لاحق نہیں ہونی چاہیے۔ گزشتہ مرتبہ انہوں نے کسی ایسے اندیشے کا ذکر بھی نہیں کیا۔"

"آپ کی مرضی ہو تو کچھ بولیں صاحب؟" صاحب کے چپ ہوتے ہی بچھل نے کہا۔

"ضرور' ضرور' کیا بات ہے؟" حافظ صاحب چونک پڑے۔

"اب تک جو کچھ دھن دولت انہوں نے کھویا ہے' جو

کچھ بھی، ہم اس کا دس گنا، بیس گنا یا جتنا وہ بولیں، ان کو اپنے پہ بھروسا نہیں تو ہم پہلے بھی دینے کو تیار ہیں۔ ہم آپ کے پاس چھوڑ دیتے ہیں۔"

"جی، جی۔" حافظ صاحب کی زبان لکنت کرنے لگی۔ "مگر، مگر جناب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

جھمل نے ہاتھ اٹھا کے انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا "اس کو لڑکی کا براہ راست سمجھو صاحب! اپنے کو پتہ ہے، لوگوں نے کتنی بولی نہیں لگائی ہے۔ اپنا مطلب ہے، ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔"

"میں بھی کچھ عرض کروں" حافظ صاحب سنجیدہ لہجے میں بولے "مولوی شفیق کو پیسے سے بھی کوئی رغبت نہیں رہی، ورنہ انکے پاس بہت کچھ ہوتا کیا نہیں تھا۔ خاندانی آدمی ہیں۔ چاہتے تو دس کاروبار کر سکتے تھے مگر مزاج ہی شاہانہ بلکہ فقیرانہ ہے۔"

"آپ ان سے بات کر کے دیکھ لو، ہم پہلے آپ کو بول دیتے ہیں، لڑکی ان سے الگ نہیں ہو جائے گی۔ بیاہ اپنے گھر کی ہو کے ماں باپ سے دور نہیں ہو جاتی۔ ہم نے آپ کو بھی بولا ہے کہ سارا لڑکی پہ ہے۔ وہ منع بول دے گی تو ہم لوٹ کے بھی نہیں دیکھیں گے۔ روپیہ پیسہ بھی واپس نہیں لیں گے، ہمیں بھی اپنی طرف سے لڑکی کو کچھ دینا ہے، یہی جان لینا۔" یہ کہتے ہوئے جھمل نے خاص دان سے گلوری اٹھائی اور حافظ صاحب سے سواری کا انتظام کرنے کو کہا۔

"کیا جناب!" حافظ صاحب بے قرار ہو گئے "جا رہے ہیں آپ؟"

"پاس بولنے کو اور کچھ نہیں ہے" جھمل نے بجھی ہوئی آواز میں کہا "اپنا پتہ رکھ لو، کبھی دل نے ساتھ دیا تو کام آئے گا، اور کبھی من کرے تو ادھری بمبئی کا چکر بھی لگانا صاحب! آنکھوں دیکھا، کانوں سنا اچھا بھی ہوتا ہے، پکا بھی۔"

حافظ صاحب سے معذرت کے چند رسمی الفاظ بہ مشکل ادا ہوئے، انکسار سے بولے "کیا عرض کروں، کچھ منہ نہیں پڑتا۔ سچ تو یہ ہے، اب جی نہیں چاہتا کہ آپ ایسے چلے جائیں، بہرحال خاطر جمع رکھیے، مولوی صاحب یہاں نہ آئے، کسی جگہ سے ان کا خط آیا تو میں انہیں بلا لوں گا یا خود ان کے پاس چلا جاؤں گا۔"

"بہت ٹائم لے لیا آپ کا صاحب! پوری رات کالی کر دی۔ دیکھو، کبھی ادھری آئے تو ساتھ نینی تال چلیں گے۔ بولتے ہیں، ادھری رام نگر کے پاس شکار خود شکاری کے پاس آتا ہے۔"

"وہاں کی کیا بات ہے۔ وہ علاقہ تو شکاریوں کا مرکز ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا جناب! وہاں کے محکمہ جنگلات کا افسر اچھا واقف کار ہے، بہت خیال کرتا ہے۔"

جھمل نے گھڑی کی طرف نظر کی تو حافظ صاحب فوراً اٹھ گئے اور انہوں نے صحن کی جانب رخ کر کے صدا لگائی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا، ملازم جاگ رہے تھے۔ حافظ صاحب کو باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑی، پہلی صدا پر لپکتے قدموں سے ایک آدمی اندر آ گیا۔ حافظ صاحب نے اسے گھوڑا گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔

"کیوں نہ ایک ایک فنجان قہوہ اور ہو جائے، اتنی دیر میں گاڑی تیار ہوتی ہے، کچھ گلوریاں بھی ساتھ لیتے جائیے۔" حافظ صاحب نے تکلف آمیز لہجے میں کہا۔

گھر کے لوگوں کو جگانے کا یہ کوئی وقت نہیں تھا، اچھا ہوا کہ جھمل نے منع کر دیا۔ حافظ صاحب کی ہدایت پر ملازم اندر سے کاغذ قلم لے آیا۔ مراد آباد آنے سے اب تک بے شمار لوگوں کو ہم اپنا پتہ دے چکے تھے۔ میں نے روانی سے ابا جان کا پتہ لکھ کے کاغذ حافظ صاحب کے حوالے کر دیا۔

جب تک ملازم نے گھوڑا گاڑی تیار ہو جانے کی اطلاع نہیں دی، جھمل دم توڑتا ہوا حقہ نچوڑتا رہا۔ ریل گاڑی کی روانگی میں ابھی وقت تھا۔ حافظ صاحب کچھ دیر اور بیٹھ جانے کے لئے اصرار کر رہے تھے مگر جھمل مونڈھے سے اٹھ گیا۔ بیٹھک کے دروازے سے مجھے ملازموں کے ساتھ حافظ صاحب کے بھائی عبدالمتین اور بیٹا عبدالحمید بھی باہر کھڑے نظر آئے۔ سبھی مستعد تھے۔

دروازے سے باہر نکلتے نکلتے جھمل ٹھہر گیا اور حافظ صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے معنی خیز لہجے میں بولا۔ "کب تک سوانگ چلے گا۔ کبھی ٹائم ملے تو دھیان دینا صاحب! مولوی صاحب کا بس کتنا ہے۔ کسی ایک جگہ پاؤں نہ ٹکانے کی وجہ لڑکی کی کہانیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ لگام کس کے ہاتھ میں ہے اور رستے کون دکھا رہا ہے؟"

حافظ صاحب کوئی جواب نہ دے سکے تھے کہ جھمل نے ان سے کہا "ادھری تبت کے پاگل، ادھری ہم جنگلی لوگ، بچہ لڑکی کی ناک میں پھیری لگانے والے اٹھائی گیرے، حرام کے جنے، پر اس سے آگے بھی تو کوئی بات ہو سکتی ہے۔ لڑکی کو بھی کوئی جواب دینا ہوتا ہے مولوی صاحب کو، سامنے منی کی مورتی نہیں ہے۔ آگے فیصلہ ایک اسی کو نہیں کرنا، اپنے لاڈلے کی طرح ادھری وہ بھی بہت ہڑکتی ہوگی۔"

حافظ صاحب گم صم کھڑے تھے۔ جھمل بیٹھک کا چبوترا

پھلانگ کے گلی میں آ گیا۔

اسٹیشن پر گنتی کے چند مسافر تھے۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ گاڑی کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹے تک ہم پلیٹ فارم کی بنچ پر بیٹھے رہے۔

○☆○

صبح ٹھیک چھ بجے گاڑی مراد آباد پہنچ گئی۔ جمرو اور زوار کی بے کلی سے ایسا لگتا تھا، جیسے ہمیں ان سے جدا ہوئے زمانہ گزر گیا ہو۔ بچوں کی طرح اچھلنے کودنے لگے اور جمرو مچل کے جھمل سے بولا "اب کے اپنے کو بھی ساتھ لے چلو استاد! یہاں پڑے پڑے سالے ہاتھ پاؤں اکڑ جائیں گے۔"

"اب چھٹی ہو گئی رے سب کی۔" جھمل نے تھکی ہوئی آواز میں اسے مژدہ سنایا۔ کرتے کی آستینوں میں میری اور جھمل کی کلائیاں چھپ گئی تھیں لیکن زورا اور جمرو کی نظروں سے تا دیر نہ چھپا رہ سکا۔ "میرا تو کچھ نہیں تھا لیکن استاد کی کلائی پر پٹی دیکھ رہے تھے" اس جواب سے ان کی تسلی نہیں ہوئی مگر جھمل کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ دونوں کو چپ ہو جانا پڑا۔

سب نے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔ گھنٹے بھر کے قریب مسافر خانے میں ٹھہر کے جھمل شہر کی جانب چل پڑا۔ ابھی بازار بند تھے۔ تاجر محمد یونس اور مولوی صاحب کے دو ایک قریبی شناساؤں کو دیکھ لینا کافی تھا۔ ہماری عدم موجودگی کے دوران مولوی صاحب نے مراد آباد کا رخ کیا ہوتا تو ان لوگوں سے ضرور ملے ہوتے۔

جمرو اور زوار نے ٹکٹ پہلے سے خرید رکھے تھے۔ سوا گیارہ بجے ہم ہاوڑا ایکسپریس میں بیٹھ گئے۔ مسافر خانے کے منیجر عبدالباسط کا عجب حال تھا، آنکھیں بھری ہوئی، چہرہ تمتمایا ہوا۔ بار بار مجھے اور جھمل کو، زورا اور جمرو کو گلے لگاتا۔ گاڑی حرکت میں آنے تک وہ ڈبے سے نہیں اترا۔

گاڑی پھر اس سمت جا رہی تھی جہاں سے صبح ہماری واپسی ہوئی تھی۔ آدھ گھنٹے میں رام پور شہر آ گیا، پھر آدھ گھنٹے سے کم وقت میں ٹمریا ساوات۔ ڈبے میں ہمارے سوا کوئی مسافر نہیں تھا۔ جمرو اور زورا مسلسل چہک رہے تھے۔ پورے دو ہفتے بعد انہیں مسافر خانے کے زنداں سے نجات ملی تھی۔ سلمیٰ بھی پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ رخساروں کا گلابی رنگ جیسے چھلک چھلک جائے۔ لگتا تھا، زورا اور جمرو بس ایک ہی کام کرتے رہے ہیں، اسے دھوپ، دھول اور دھوئیں سے بچائے رکھنا۔ جنگلوں، موسم اور غذاؤں سے ایسا کچھ نہیں ہوتا، آدمی ہی آدمی کے لئے بہار اور خزاں ہوتے ہیں۔ آدمی ہی صحرا، آدمی ہی ریگستان۔ عبدالباسط دو دن کے لئے انہیں نینی تال بھی لے گیا تھا۔ کل ہی شام وہ واپس ہوئے تھے۔ زورا کہتا تھا، کسی کا وہاں سے آنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن کسی وقت بھی انہیں ہماری مراد آباد واپسی کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ نینی تال کے نظاروں کا احوال لہک لہک کے سناتے رہے۔ جھمل بھی دل جمعی سے سنتا رہا۔

ڈیڑھ بجے گاڑی بریلی پہنچ گئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ منع کرنے کے باوجود عبدالباسط نے بہت سا سامان ساتھ کر دیا تھا۔ صبح نو بجے مسافر خانے آ کے ہی اسے میری اور جھمل کی آمد کا علم ہوا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہماری روانگی تھی۔ گھر سے کھانے پینے کا انتظام کرنا ممکن نہیں تھا، اس نے مسافر خانے کے باورچی صدیق سے جلدی جلدی مرچ قیمہ بھنوالیا تھا۔ پراٹھے، دلی طرز کی کچوریاں، انڈے کا حلوہ اور پھلوں سے ٹوکری بھری ہوئی تھی۔ عبدالباسط کو گھر سے کچھ لانے کا وقت مل جاتا تو شاید سارا باورچی خانہ ساتھ کر دیتا۔ صدیق نے عجلت میں نہایت لذیذ قیمہ تیار کیا تھا۔ سب نے سیر ہو کر کھایا۔

سب کے سامنے میں نے اظہار نہیں کیا لیکن میری کلائی میں چنگاریاں اٹھ رہی تھیں۔ بریلی گزر جانے کے بعد میں اوپر کی برتھ پر آ کے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر لیٹتے ہی درد سارے جسم میں پھیل گیا۔ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ درد ناقابل برداشت ہو گیا تو میں نے پٹی کھول دی۔ زخم کے ارد گرد سوجن ہو گئی تھی۔ مرہم لگانے کے بعد بھی غالباً خون رستا رہا تھا۔ ڈاکٹر پنت کی گولیاں جیب میں پڑی تھیں، چار قسم کی گولیاں تھیں۔ زورا کو آواز دے کر میں نے پانی مانگا اور وقفے وقفے سے چاروں گولیاں نگل لیں۔ ڈاکٹر نے نسخہ بھی لکھا تھا مگر مراد آباد میں دوائیں خریدنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ زورا سے پانی مانگنا غضب ہو گیا۔ گلاس واپس لیتے وقت اس کی نظر میری کلائی پر پڑ گئی اور وہ غل مچانے لگا۔ جمرو اور سلمیٰ بھی بے قرار ہو گئے۔ مرہم اور خون میں سنی ہوئی کلائی کچھ اور وحشت خیز ہو گئی تھی۔ سلمیٰ کی تو چیخ نکل گئی۔ انہوں نے مجھے نیچے اترنے پر مجبور کر دیا۔ جمرو نے پرانی پٹی سے کلائی صاف کی۔ سلمیٰ نے سامان سے کپڑا نکال کے نئی پٹی تیار کی۔ خون اب نہیں بہہ رہا تھا مگر انہوں نے ریشمی کپڑا جلا کے زخم پر راکھ چھڑکنے کا ٹوٹکا آزمایا۔ مسافر خانے میں وقت گزاری کے لئے سلمیٰ اپنے لئے جوڑے سی رہی تھی۔ اس کے پاس قینچی بھی تھی۔ ان تینوں نے از سر نو میری کلائی پر پٹی باندھ دی۔ جھمل اپنی جگہ

سے نہیں اٹھا۔ جمرو اور زورا نے پہلی ہی نظر میں زخم کی نوعیت بھانپ لی ہوگی۔ زخموں کی ویسے بھی انہیں اچھی پہچان تھی۔ چاقو کی لمبی ستواں لکیر کسی جگہ نہ ہلکی نہ گہری' زخم جیسے تراشا گیا ہو۔ ایسی ہی ایک پٹی بٹھل کی کلائی پر بندھی تھی۔ یہ یکسانی جمرو اور زورا کے لئے کسی پہیلی سے کم نہ ہوگی۔ سلمیٰ کی وجہ سے وہ زیادہ چھیل نہیں سکتے تھے۔ ادھر بٹھل نے انہیں پہلے جھڑک دیا تھا۔ انہیں اپنے اضطراب کا اظہار مؤخر کرنے میں بہت گھٹن ہو رہی ہوگی۔ ڈاکٹر پنت کی گولیوں کا اثر تھا یا زخم کی صفائی اور نئی پٹی کا کرشمہ' رفتہ رفتہ جلن کم ہوتی گئی۔ گولیوں میں یقیناً کوئی گولی خواب آور بھی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سر بھاری ہونے لگا۔ میں دوبارہ اوپر کی برتھ پر چلا آیا پھر کون کون سے اسٹیشن آئے' کہاں گاڑی ٹھہری' مجھے کچھ خبر ہی نہیں رہی۔ سورج تقریباً غروب ہوچکا تھا جب انہوں نے مجھے جگایا اور بتایا کہ لکھنؤ شہر آگیا ہے۔

ہاوڑا ایکسپریس فیض آباد نہیں جاتی تھی۔ جمرو کو فیض آباد جانے والی گاڑیوں کا علم تھا۔ فیض آباد تو خیر اس کا آبائی شہر تھا' لکھنؤ کے گلی کوچوں سے بھی اس کی واقفیت کم نہیں تھی۔ بٹھل کے دوست' لکھنؤ کے دادا کبن خاں مرحوم سے اس کے اور بڑے بھائی جامو کے خاص مراسم تھے۔ کبن خاں کی موت بھی ہماری' بلکہ میری وجہ سے ہوئی تھی۔ نہ ہم ابا جان کی تلاش میں تبت کا رخ کرتے' نہ بٹھل کو اڈا سنبھالنے کے لئے اسے کلکتے بلانا پڑتا۔ بٹھل کی موجودگی میں کلکتے کے اڈے پر قبضہ جمانے کا سودا رتنا کے دماغ میں بھی نہیں سما سکتا تھا۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں تھی۔ لکھنؤ شہر آکے بٹھل کو کبن خاں بہت ستا رہا ہوگا۔ مجھے یاد تھا' ایک روز رات کو وہ فیض آباد کے اڈے پر گرجتا برستا آیا تھا کہ جامو کے چھوٹے بھائی جمرو نے روشن نامی طوائف لکھنؤ سے اغوا کرلی ہے۔ زریں کی حویلی اس کی خالہ کے ناجائز قبضے سے واگزار کرانے کے لئے بٹھل نے کبن خاں ہی کو خط لکھا تھا۔ رتنا نے شب خون مارا تھا ورنہ کبن خاں اس آسانی سے پسپا ہونے والا نہیں تھا۔

اسٹیشن سے باہر آکے ہم تانگے میں سوار ہوگئے۔ رات کے وقت لکھنؤ کی رونق ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ آسمان صاف تھا۔ ہوا میں گرمی کی ہلکی ہلکی آمیزش تھی۔ قمقمے روشن ہوگئے تھے اور سڑکوں پر خوب چہل پہل تھی۔ حضرت گنج کا علاقہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔ جمرو ہمیں جدید طرز سے آراستہ ایک چمکتے دمکتے ہوٹل میں لے آیا۔ پردہ نشین خواتین کے ساتھ بیٹھنے کے لئے ہوٹل میں کیبن بھی بنے ہوئے تھے۔ بٹھل اور سلمیٰ کو وہاں بٹھا کے جمرو اور زورا فوراً باہر آگئے۔ میں انہیں مسلسل یقین دلاتا رہا کہ اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے' وہ مانے نہیں اور ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر سری واستو کے مطب میں لے آکے ہی انہوں نے دم لیا۔ مطب میں مریضوں کی بھیڑ تھی مگر جانے جمرو نے کمپاؤنڈر پر کیا جادو کیا کہ ڈاکٹر کے روبرو ہونے میں ہمیں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے سوئی لگا کے اور نئی پٹی باندھ کے ہمیں جلد ہی رخصت کردیا۔ تمکیا سادات کے ڈاکٹر پنت کے نسخے میں اس نے بس ایک دوا کا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر کے تجسس پر جمرو مجھ سے پہلے بول پڑا۔ وہ شیشے اور ٹین لگ جانے ہی کا کوئی عذر کرسکتا تھا۔ ڈاکٹر کو اس نے مطمئن کردیا لیکن مطب سے نکلتے ہی اس نے اور زورا نے مجھے ٹہوکے مارنے شروع کردیے۔ میں انہیں کیا بتاتا لیکن ادھر ادھر کے حیلوں سے ان کی تشفی نہ ہوتی۔ میں نے مختصراً اصل بات بتادی۔ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ انہیں مجھ پر اپنے آپ سے زیادہ اعتبار تھا۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے۔ کسی کو بھوک نہیں تھی لیکن یوں کرسیاں توڑ کے ہوٹل سے اٹھ جانا وضع کے خلاف تھا۔ بیرے سے صرف چائے لانے کو کہا گیا تھا۔ وہ کیک' پیسٹریاں' نمکین بسکٹ اور سموسے بھی اٹھا لایا۔ چائے ختم کرتے ہی ہم باہر نکل آئے۔

جمرو کی معلومات کے مطابق ساڑھے دس بجے کے قریب کوئی گاڑی فیض آباد کی طرف جاتی تھی۔ جمرو کی رائے تھی کہ کیوں نہ رات لکھنؤ میں گزاریں۔ صبح نو بجے کی گاڑی سے پہنچنے میں ڈھائی تین گھنٹے لگتے ہیں۔ اس وقت حویلی کے مکینوں کو بے آرام کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بٹھل تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ رات کسی ہوٹل میں گزارنی پڑتی۔ مراد آباد کے مسافر خانے کی بات اور تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں اکیلی سلمیٰ کا ٹھہرنا اچھا نہیں لگتا تھا شاید اسی لئے بٹھل نے جمرو کا مشورہ مسترد کردیا۔ گاڑی کی روانگی میں خاصا وقت تھا۔ جمرو نے تانگے والے کو روک رکھا تھا۔ اس دوران ہم سلمیٰ کو شہر کی کچھ اور جھلک دکھا سکتے تھے۔ گومتی پر جانے کا وقت نہیں تھا۔ بٹھل نے کوچوان کو سیدھے اسٹیشن چلنے کا حکم صادر کردیا۔

ابھی اسٹیشن دور تھا کہ تانگے کو رک جانا پڑا۔ رستہ بند تھا۔ بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ شور غل بھی بہت تھا۔

زورا حادثے کی نوعیت جاننے کے لئے تانگے سے اترنا چاہتے تھے' بٹھل نے روک دیا۔ اتنی دیر میں ہمارے پیچھے بھی مختلف گاڑیاں کھڑی ہوگئی تھیں۔ واپسی کا راستہ بند ہوگیا تھا۔ سپاہی بھی اڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے تھے اور سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔ سپاہیوں کی دخل اندازی سے بھگدڑ مچ گئی۔ جمرو کے پوچھنے پر انتشار کی حالت میں بھاگتے ہوئے ایک راہ گیر سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ دو آدمیوں کو چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ تماشائیوں کو ہٹانے کے لئے پولیس کو لاٹھی چلانی پڑ گئی۔ اسی لمحے ایک شخص لوگوں کی بھیڑ کاٹتا' گرتا پڑتا ہمارے تانگے کے بائیں حصے سے ٹکرایا۔ وہ آگے جانا چاہتا تھا کہ اس کی نظر جمرو پر پڑ گئی اور اس نے سرخوشی کے عالم میں نعرہ بلند کیا۔ جمرو بھی اسے دیکھ کر چیخ پڑا "ارے آغا پیا!"

آغا پیا تانگے کی لگام تھام کے ٹھہر گیا "جمرو استاد! قسم اللہ کی' کیا دیکھ رہا ہوں" وہ دیوانہ واری سے بولا اور اس کی چھلکتی آنکھوں سے بٹھل بھی روپوش نہ رہ سکا۔ "ہائیں استاد! استاد بٹھل اپنے آقا بھی ہیں' غلام واری۔"

میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ پینتیس سے چالیس کے درمیان عمر' لمبے قد' چھریرے جسم اور سانولی رنگت کا آغا پیا کبن خاں کے اڈے کا خاص آدمی تھا۔ بازار کا علاقہ اس کے پاس تھا۔ چاقو پر اس کی گرفت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس نے بٹھل کے پیر چھو کے ماتھے پر ہاتھ لگائے۔ "زہے نصیب' زہے نصیب' آج تو اس نگری کے دن پھر گئے۔"

"کیا ہے ہرا لے بچے' بہت مستی میں دکھائی دیتا ہے" بٹھل نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے صدا لگائی۔

"مستی تو آقا' آپ کے دیدار سے ہوگئی۔ ہائے' کتنے دنوں بعد سرکار کو اس گاؤں کا خیال آیا۔ کبن خاں کیا گئے' آقا نے بھی لکھنؤ سے کنارہ کرلیا" آغا پیا ہاتھ لہرا کے بولا۔

"اب کون ہے رے ادھری؟" بٹھل نے بلند آواز سے پوچھا۔

"کون ہوتا عالم پناہ! کبن خاں کے جانے کے بعد سب لٹ لٹا گیا' وہی اپنے استاد' خدا عمر اور دراز کرے اور بلاؤں سے محفوظ رکھے' وہی شمشاد استاد ذرا اڈے کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔"

استاد شمشاد خاں' کبن خاں کا استاد تھا۔ کبن خاں کے رخصت ہوجانے کے بعد اسے مجبوراً اڈے کی چوکی پر بیٹھنا پڑا' ورنہ وہ کب کا گوشہ نشین ہوچکا تھا۔

"ابھی تک وہی گدھا چلا رہا ہے" بٹھل نے تعجب سے کہا "اب تو دن بہت ہوگئے۔"

"اس انوکھے لاڈلے بنے خاں کی نوک پلک سنوار رہے ہیں۔ کاٹا' چھانٹی پوری نہیں ہو پائی۔ کہنے کو بنے خاں ہی اڈے کے بادشاہ سلامت ہیں مگر بس دیکھنے کے۔ کبن خاں جانی کا رنگ جمانے کو بہت ترت۔ پھاڑ کھانا پڑے گا۔ یہ لکھنؤ ہے' یہاں ایک سے ایک سورما خاندانی پڑا ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں' کچھ دن کے لئے آقا ہی راج سنگھاسن پر بیٹھ جائے تو سارے دلدر دور ہوجائے۔ تکلف کے کپڑوں سے تو اڑا نہیں چلتا" آغا پیا کی آواز شور میں دب جاتی تھی۔ بٹھل کا تیور دیکھ کر جمرو نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا کہ سر دست استاد شمشاد خاں کے پاس حاضری ممکن نہیں ہمیں جلد سے جلد فیض آباد پہنچنا ہے۔ وہ تو گاڑی بدلنے میں کچھ وقت تھا اور لکھنؤ میں کچھ ضروری کام بھی تھا ورنہ شہر کی طرف آتے ہی نہیں۔ استاد شمشاد خاں کو سلام کہنا اور کہنا کہ شاید لکھنؤ جلد ہی آنا ہو۔

"واہ سرکار!" آغا پیا شکایتی لہجے میں بولا "استاد کو خبر ہوگئی تو کیسے حیران و پریشان ہوں گے کہ اپنے دلدار اتنے قریب آکے ملے بغیر چلے گئے۔"

"آئیں گے رے جلدی۔ کوئی مجبوری ہے۔ جیسا استاد جمرو نے بولا ہے' ایسا ہی استاد شمشاد کو جاکے بول دینا" بٹھل نے الجھ کے کہا۔

"جان کی امان پاؤں تو زبان کھولوں" آغا پیا ہاتھ جوڑ کے بولا "استاد شمشاد کو بہت ملال ہوگا' گھر میں مل آجائے گا۔"

پیچھے کی گاڑیوں نے واپس ہونا شروع کردیا تھا اس لئے کچھ گنجائش ہوگئی اور ہمارے تانگے کو بھی واپس ہونے کی جگہ مل گئی۔ جمرو اور زورا تانگے سے اتر گئے تھے۔ آغا پیا دور تک ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پولیس کی نفری میں اضافہ ہوگیا تھا۔ آغا پیا کی زبانی معلوم ہوا کہ بازار میں ان دنوں کسی چاندنی بانو نامی دوشیزہ کا طوطی بولتا ہے۔ حسن و جمال میں یکتا' رقص کے فن میں بے مثل ہے۔ آواز بھی خوب پائی ہے۔ خان پور کا کوئی سرکش نوجوان جنون کی حد تک چاندنی بانو کا طلب گار تھا اور ساری آبائی دولت اپنے مقصود پر نچھاور کرچکا تھا۔ چاندنی بانو کی نگراں تارا بیگم نے نوجوان سے ساری شرطیں پوری کرالینے کے باوجود وعدہ وفا نہیں کیا اور مزید ستم یہ کیا کہ بالا خانے پر کرائے کے ایک شوریدہ پشت' بازار کے معاملات کے مشاق اور ایسی صورتحال سے نمٹنے کے ماہر ہیرا لال سے مدد چاہی۔ ہیرا لال' چاندنی بانو اور

نوجوان کے درمیان دیوار بن گیا اور اس نے بھرے بازار میں نوجوان کو ذلیل و خوار کیا۔ نوجوان بہت دنوں سے ہیرا لال کی تاک میں تھا۔ وہ اڈے پر استاد شمشاد خاں کے پاس بھی دہائیاں دیتا ہوا آیا تھا۔ شمشاد خاں نے بازار کے معاملات میں اس قسم کی مداخلت سے صاف انکار کردیا تھا۔ آج نوجوان اور ہیرا لال کی مڈ بھیڑ ہوگئی اور نوجوان نے بے دریغ ہیرا لال کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ زخمی ہیرا لال بھی نہتا نہیں تھا۔ لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے ہوئے اسے چاقو نکالنے اور نوجوان پر اوچھا ترچھا وار کرنے کا موقع مل گیا۔ دونوں خون میں لت پت ہو کے بے ہوش ہوگئے۔ وہی پرانی کہانی تھی۔ آغا پا اتنا ہی جان سکا تھا کہ پولیس آگئی اور اس نے واردات کی جگہ سے بھاگ نکلنے میں عافیت جانی۔

بہت وعدے وعید اور اصرار و تکرار کے بعد آغا پا ہم سے جدا ہوا۔ اسٹیشن پہنچ کے معلوم ہوا کہ گاڑی کی روانگی میں ابھی سوا گھنٹا باقی ہے۔ جمرو ٹکٹ خریدنے چلا گیا۔ ہم چاروں انتظار گاہ میں آگئے۔ منہ ہاتھ دھونے اور چائے پی کے تازہ دم ہونے میں آدھ گھنٹے کے قریب وقت چپکے سے نکل گیا۔ آغا پا نے پانوں کا بڑا ساتھ کردیا تھا۔ بہت خوشبودار پان تھے۔ جمرو بھی واپس آگیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی جامو کے کلکتے چلے جانے کے بعد جمرو ہی فیض آباد کے اڈے کا نگراں تھا۔ دونوں بھائی چاقو کے ہنر میں طاق تھے۔ لکھنؤ میں بھی ان کا شہرہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آغا پا جمرو کو دیکھ کر مچلنے، پھڑکنے لگا تھا۔ میرے اور بٹھل کے ساتھ جمرو نے اپنے روز و شب کا بہت خون کیا تھا۔ کوئی کب تک کسی کے لیے اتنا وقت نثار کرسکتا ہے جہاں اس کی پذیرائی ہوتی ہو، جہاں لوگ اس کی آہٹیں پہچانتے ہوں۔ حلقہ بھی گھر کے مانند ہوتا ہے، بار بار نہیں بنایا جاسکتا۔ جمرو تو فیض آباد کے اڈے کا حاکم تھا۔ گھر جانے، اپنے ٹھکانے پر واپس جانے کی ایک اضطراری مسرت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کی رفتار و گفتار میں عجب بے تابی سی نظر آتی تھی۔

گاڑی کی روانگی میں پندرہ منٹ یا بیس منٹ رہ گئے تھے کہ بٹھل نے اٹھ جانے کا اعلان کیا۔ قلی نے سامان اٹھالیا تھا۔ سلمیٰ بھی برقع اوڑھ کے تیار ہوگئی تھی۔ ہم باہر نکلا ہی چاہتے تھے کہ اچانک دروازے پر شور ہوا اور اسی لمحے دروازہ کھول کے کئی آدمی اندر در آئے۔ سب سے آگے استاد شمشاد خاں تھا۔ بھرا ہوا جسم، میانہ قد، چمکتی ہوئی گندم گوں رنگت، چکن کے سفید کرتے اور پاجامے پر بھورے رنگ کی واسکٹ، سر پے دوپلیا، ایک ہاتھ میں چاندی کا کڑا، گلے میں مختلف پتھروں کی مالا، کانوں میں سنہری دریا۔ اس سن رسیدگی میں جوانوں کی سی آن بان تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جیسے قمقمے روشن تھے "بٹھل بھائی! بٹھل بھائی!" وہ سر جھٹکتے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے آیا اور بٹھل سے لپٹ گیا "اب آخری وقت میں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا۔ یہ انصاف نہیں ہے۔" وہ بٹھل کو جھنجوڑتے ہوئے بولا "بھلا دیا اپنے دیوانے کو۔"

بٹھل نے بھی اسے جکڑ لیا۔ "آغا پا نے چھنال بنا کیا سارا بول دیا تھا اٹھائی گیرے کو۔" بٹھل نے شمشاد خاں کی پیشانی چومتے ہوئے کہا "کیوں چلے آئے تم؟"

"کیسے نہیں آتا۔ لکھنؤ میں استاد بٹھل آئے اور شمشاد خاں چوکی پر اینڈتا رہے۔ یہ تو سور کی اولاد چاندی کے پورے سو کا حق دار ہے۔"

"بھیا بولیں شمشاد خاں! ضرور آتے پر۔۔۔" بٹھل نے سلمیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا "بیٹیا سر آنکھوں پر ہے۔" شمشاد خاں سینے پر ہاتھ مار کے بولا "بیٹیا شمشاد خاں کی نہیں ہے کیا؟"

"بہت چکر کاٹ کے آرہے ہیں سجنا!" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"گھر آرہے ہو۔ لکھنؤ میں شمشاد خاں زندہ ہے، صاحب! مرا نہیں ہے۔ اپنے کو تو ایسے ہی تمہارا انتظار تھا۔" شمشاد خاں نے اپنے ساتھ آنے والے اڈے کے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ سامان اٹھا کے تانگے میں رکھیں۔ بٹھل کا ہاتھ پکڑ کے شمشاد خاں انتظار گاہ سے باہر آگیا۔ بٹھل نے اسے سمجھانا چاہا، وہ جلد ہی دوبارہ لکھنؤ آئے گا، وعدہ کرتا رہا مگر شمشاد خاں نے ایک نہ سنی۔ اس کی ضد سے اندازہ ہوگیا تھا کہ کچھ کہنا سننا لاحاصل ہے۔ کسی کی اتنے اصرار کے بعد انکار کی مجال نہ ہوتی۔

اڈے سے کچھ فاصلے پر شمشاد خاں کے رشتے کے بھائی عزیز خاں کا گھر تھا۔ اڈے جانے سے پہلے شمشاد خاں نے سلمیٰ کو وہاں پہنچایا اور بھائی کو تاکید کی کہ زنان خانے میں سلمیٰ سے شہزادیوں کا سلوک کیا جائے، شمشاد خاں نے محض اس تاکید و انتباہ پر اکتفا نہیں کی، زنان خانے تک کو خود پہنچا کے آیا۔

ہم اڈے آگئے۔ یہ پرانی طرز کی ایک کشادہ عمارت تھی۔ اتنی بڑی بھی نہیں مگر صاف ستھری تھی۔ در و دیوار کو حال ہی میں روغن کیا گیا تھا۔ دالان میں دیوار کے ساتھ تخت رکھا تھا۔ صحن اور دالان میں تخت کے آس پاس چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ تخت کے وسط میں بٹھل کو بٹھایا گیا۔

سے خاصے لوگ موجود تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ جو آتا، پہلے بٹھل کو پھر شمشاد خاں کو سلام کرتا۔ کوئی بٹھل کے پیر چھوتا، کوئی ہاتھ چومتا، آغا پا بھی نظریں جھکائے ہاتھ باندھے، بٹھل کے سامنے آکھڑا ہوا۔ بٹھل مسکرانے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ آغا موتیا کے ہار لایا تھا۔ سب کے گلوں میں اس نے ہار ڈالے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دالان اور صحن بھر گئے۔ دالان میں ستون کے ساتھ سماوار... اور چائے کی پیالیاں رکھ دی گئی تھیں۔ بٹھل کے لیے بطور خاص قلعی کی ہوئی فرشی، منقش نیچے اور چلم اور زرتار سنگ کے حقے کا بھی بندوبست کردیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے اور شمشاد خاں کے احکام ختم نہیں ہو پاتے تھے پھر کہیں سے کبن خاں کا جانشین جواں سال ببے خاں بھی آگیا۔ نکلتا ہوا قد، بادامی رنگت، کانوں میں مختصر سی سنہری بالی، ہاتھوں میں کڑا، سفید براق لباس اور کالی واسکٹ۔ وہ ایک جامہ زیب نوجوان تھا۔ اڈے کا آدمی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ ببے خاں نے جھک کے سلام کیا، بٹھل کے پیر چھوئے، ہاتھ کو بوسہ دیا۔ بٹھل نے اسے پاس ہی بٹھالیا۔

تھوڑی دیر میں دسترخوان سجادیے گئے۔ جانے کس طرح اتنی جلدی اتنے لوگوں کے لیے انہوں نے کھانے کا انتظام کردیا تھا۔ بریانی، پتلے شوربے کا سالن، لوکی کا رائتہ اور چپاتیاں۔ شمشاد خاں نے اسٹیشن جانے سے پہلے ہی کھانے کی تیاری کا حکم دے دیا ہوگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہمیں اڈے سے لے کر ہی آئے گا ورنہ اتنے کم وقت میں تو یہ اہتمام ممکن نہیں تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہوتے بارہ بج گئے اور پھر جیسے ہی دسترخوان اٹھائے گئے، صحن کے کسی گوشے سے یکایک زرق برق لباسوں میں ملبوس، سولہ سنگھار کیے ہوئے بھنڈیلے ساز و سامان کے ساتھ نکل آئے۔ ان میں اور ناچنے گانے والی عورتوں میں کوئی فرق تھا تو مبالغہ آمیز ناز و ادا کا۔ پہلی نظر میں تو کوئی بھی دھوکا کھا سکتا تھا۔ انہیں اپنے درمیان دیکھ کے بام و در شور سے گونجنے لگا۔ مستانہ وار صدائیں، سیٹیاں اور آہیں۔ تخت کے سامنے آکے پہلے انہوں نے کورنش بجالانے کے انداز میں تعظیم پیش کی۔ بٹھل نے جیب میں ہاتھ ڈال کے انہیں کچھ نقدی نذر کی پھر وہ ببے خاں کے سامنے اڑ گئے۔ ایک شوخ بھانڈ نے گھونگھٹ نکال کے ورمالا کی طرح گیندے کا ہار ببے خاں کی گردن میں ڈال دیا۔ ایک نے بڑھ کے بدن لچکاتے ہوئے بلائیں لیں۔ جب تک ببے خاں نے ان کی حسب دل خاطر خواہ نذر نہیں گزار دی، وہ وہیں کھڑے ٹھٹولیاں کرتے رہے۔ ان میں ایک سے بڑھ کے ایک تھا۔ سر تال کے پکے تھے، رقص کا اچھا ملکہ تھا، نقل بھی کمال کے تھے۔ ان کی عشوہ طرازیاں، ناز نخرے، چٹک مٹک اور ٹھسکوں نے سب ہی کو ہنساتے ہنساتے لوٹ پوٹ کردیا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب جب محفل شباب پر تھی، شمشاد خاں نے ہاتھ اٹھا کے انہیں روک دیا۔

اڈے پر چند ہی آدمی رہ گئے۔ بٹھل، شمشاد خاں کے پاس بیٹھا۔ مجھے، زورا اور جمرو کو ببے خاں پہلی منزل کے گنبد جیسے ایک کمرے میں لے آیا۔ کمرا سجا ہوا تھا۔ صاف بستروں کے علاوہ ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ بٹھل کے لیے کسی اور جگہ انتظام کیا گیا تھا۔ آدھی رات تو ایسے ہی گزر گئی تھی۔ صبح کی گاڑی سے روانگی کا اب کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ نیند کے لیے فراغت بھی شرط ہے، فراغت کے لیے بے حسی۔ بے حسی جبری بھی تو ہوتی ہے۔ ہم تینوں کو جلد ہی نیند نے آلیا۔

صبح ناشتے کے بعد اڈے کے آدمیوں کے سامنے شمشاد خاں نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ وہ اڈے پر تادیر بیٹھنا نہیں چاہتا، اسے اب آزاد کیا جائے۔ ببے خاں کی رگوں میں تازہ خون رواں ہے، حوصلہ مند، جزرس اور معاملہ فہم ہے۔ جہاں تک بن پڑا ہے، ببے خاں کی تربیت دل و جان سے کی گئی ہے، شاید اب کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ باقی تجربہ خود سب سے بڑا معلم ہے۔ شمشاد خاں نے کہا، آرزو تھی کہ کبن خاں مرحوم کے جانشین ببے خاں کی چوکی پر بٹھانے کی رسم ادائی کے موقع پر استاد بٹھل بھی موجود ہو۔ کل جمعے کا دن ہے۔ اس دن کی ریت ہے، استاد بٹھل سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ کل اپنے ہاتھوں سے، ببے خاں کو اڈا سپرد کرنے کی رسم ادا کرے۔

چاروں طرف سے مسرت کے اظہار میں اٹھنے والے نعرے ببے خاں کی ہر دل عزیزی کے غماز تھے۔ گویا اب کل تک بھی فیض آباد روانہ ہونے کی صورت نہیں تھی۔

اڈے سے اٹھ کے ہم سلمیٰ کی خیر خبر لینے شمشاد خاں کے بھائی کے گھر چلے آئے۔ رہبری کے لیے شمشاد خاں نے ایک آدمی ہمارے ساتھ کردیا تھا۔ مراد آباد کے مسافر خانے میں قیام کے دوران میں سلمیٰ کو جمرو اور زورا سے مانوس ہوجانا چاہیے تھا۔ انہیں دیکھ کے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ سلمیٰ نے بتایا کہ میزبانوں نے تو حد کردی۔ اس قدر تکلف اور تواضع کہ گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ میزبان خواتین کے ساتھ سلمیٰ لکھنؤ کے خاص مقامات اور بازاروں کی سیر کے لیے جانے والی تھی۔ وہ حیدر آباد کے محل دو محلوں کے آداب

سے واقف تھی سوائے لکھنؤ کے۔ اوسط درجے کے ایک خاندان کے سامنے نشست و برخاست میں دشواری پیش نہیں آ رہی ہوگی۔ سائبان' ریشم' پھول' چند نرم و لطیف لفظ اور ایک نگاہ لطف بھی آدمی کے لیے غذا کے مانند ہیں۔ زندگی بڑھتی نہیں تو آسان ضرور ہو جاتی ہے۔ جمرو اور زورا نے خدا حافظ کہتے ہوئے سلمٰی کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

بٹھل کو بتا کے ہم تینوں اڈے سے نکل گئے اور حضرت شاہ مینا کے مزار' بھول بھلیاں اور چھتر منزل ہوتے ہوئے دریائے گومتی کی طرف چلے آئے۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے امین آباد کے ایک معمولی ہوٹل میں کھایا۔ کھانا البتہ معمولی نہیں تھا۔ کبھی پیدل' کبھی تانگے پر بے سروپا گھومتے گھامتے شام کو جمرو پھر مجھے ڈاکٹر سری واستو کے مطب میں لے آیا۔ مجھے اب ایسی کوئی تکلیف نہیں تھی تاہم جمرو کی خواہش پر ڈاکٹر نے پٹی کی تجدید کر دی۔ سورج ڈوبتے وقت کہیں ہماری واپسی ممکن ہو سکی۔

○☆○

اڈے پر گزشتہ رات سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ فرش دھویا جا رہا تھا' جھنڈیاں لگائی جا رہی تھیں۔ دیواروں' منڈیروں اور طاقوں پر ترتیب سے چراغ رکھے جا رہے تھے۔ گلی میں صدقے کے لیے بندھے ہوئے کالے بکرے شور مچا رہے تھے۔ رات کے کھانے پر بھی کچھ کم اہتمام نہیں تھا۔ شمشاد خاں کے مشورے پر رات کے کھانے سے پہلے ہم نے کپڑے بدل لیے تھے۔ جمرو کا خیال تھا کہ آج مجرے کی محفل ضرور آراستہ کی جائے گی لیکن کھانا ختم ہوتے ہی شمشاد خاں چوکی سے اٹھ گیا۔ باہر تانگے تیار کھڑے تھے۔ کچھ ہی دور جا کے ہمیں شمشاد خاں کے ارادے کا اندازہ ہو گیا۔ بازار کے سرے پر سب تانگوں سے اتر گئے۔

بازار میں دنیا ہی دوسری تھی' کسی میلے کا سا منظر۔ روشنی' پھول' رنگ برنگے زرق برق ملبوسات' جھروکوں' جالیوں' دروازوں اور چلمنوں سے تانیں ابھر رہی تھیں۔ ہوا میں جیسے راگ گھلے ہوئے ہوں۔ یوں بھی شمشاد خاں کی آمد سے بازار میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ کسی طرف سے گجرے' کسی جانب سے عطر کی پھریریوں کی نذر' کوئی گلوریاں طشتری میں لیے لپکا چلا آ رہا ہے۔ کشمیری چائے کے کسی خاص دکان دار نے شمشاد خاں سے کچھ دیر ٹھہر جانے کی التجا کی۔ شمشاد خاں سلام کا جواب دیتا' سنی ان سنی کرتا اور لوگوں سے سرسری طور پر حال احوال پوچھتا ہوا تیز قدموں سے بڑھتا رہا اور بازار کے وسط میں واقع ایک منزلہ عمارت کے سامنے آ کے ٹھہر گیا۔ بنے خاں نے کہنی مار کے سرگوشی میں جمرو کو بتایا کہ یہ چاندنی کا بالا خانہ ہے۔ آج کل اسی کی حکومت ہے۔ "ایمان سے جمرو استاد! نظارے کی چیز ہے۔" بنے خاں کی آواز بھڑک رہی تھی' بہک رہی تھی۔

"مطلب ہے' زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے بنے میاں۔" جمرو نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں جمرو بھائی؟" بنے خاں پلکیں جھپکانے لگا۔

"یہ راج پاٹ زیادہ راس نہیں آتا تارا بیگم کو۔ اس کا پنجرہ جلدی خالی ہو جاتا ہے۔"

"اب کے باہر سے نہیں' تارا بیگم کی اپنی بنائی سنواری بلبل ہے۔ تارا بیگم نے چپکے چپکے پروان چڑھایا ہے اور ہے' خوب مانجھ کے ایک دم سے محفل میں اتارا ہے۔ پورے لکھنؤ میں دھوم ہے۔"

"تارا بیگم کی اپنی بیٹی ہے کیا؟"

"یہی سمجھ لو' بچپن سے اسی کے پاس ہے۔ بیٹی ہی ہے' جھوٹ سچ خدا جانے۔"

بالائی منزل کے ریشمی پردوں میں سرسراہٹ ہوئی اور کسی نے جھانک کے دیکھا۔ شمشاد خاں نے اڈے کا ایک آدمی اپنی آمد کی اطلاع دینے اوپر بھیج رکھا تھا۔ دوسرے لمحے دو سازندے' ایک تنومند شخص کے ساتھ نیچے آ گئے۔ انہی کے جلو میں ہم نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ اوپر دروازے پر گوٹا کناری' تنگ غرارے' جمپر اور گلابی دوپٹے میں لپٹی' زیورات سے لدی پھندی' ایک ادھیڑ عمر خوش جمال عورت ہمارے استقبال کے لیے مضطرب کھڑی تھی۔ یہ تارا بیگم ہو سکتی تھی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا' وہ خود بھی بازار کی منتخب عورتوں میں سے ایک ہوگی۔ سر خم کر کے اس نے شمشاد خاں کو اور ہم سب کو باری باری آداب کیا اور آواز میں بولی "بندی تو سمجھ رہی تھی' اب کیا آنا ہوگا' شاید قاصد ہی آ گئے۔"

"بس کیا بتائیں ملکہ عالم' نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔" شمشاد خاں نے لہک کے کہا۔

"خاں صاحب کو معلوم ہوگا کہ بندی جمعرات کو نہیں سجاتی۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوا کہ جمعرات کو۔۔۔"

"اپنے کو معلوم ہے۔" شمشاد خاں نے اس کی بات کاٹ کے کہا "کیا کریں' ادھر لکھنؤ کے بادشاہ' اپنے جان استاد' بٹھل کو واپس جانے کی جلدی ہے۔"

"اخاہ! آپ ہی ہیں استاد بٹھل!" تارا بیگم چہکتی ہوئی آگے آئی اور چمکتی آنکھوں سے بولی "بہت نام سنا تھا سرکار کا' آج دیدار بھی ہو گئے۔" تارا بیگم نے شائستگی سے بٹھل کو دوبارہ آداب کیا اور ٹھنک کے بولی "زہے نصیب' بندی کے بخت جاگے' استاد بٹھل نے غریب خانے کا رخ کیا۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔"

بٹھل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر آ کے گزر گئی۔

"بندی ضرور حاضر ہوتی خاں صاحب!" تارا بیگم معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "لیکن خدا گواہ ہے' کسی سے پوچھ لیجیے' زمانہ ہو گیا' بندی نے باہر کی محفل آرائی کا سلسلہ ترک کیا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں نواب صاحب منور عباس کے ہاں کوئی بڑا فرنگی افسر آیا تھا۔ نواب صاحب سے برسوں کے مراسم ہیں' بہت خیال کرتے ہیں ناچیز کا۔ بندی نے دست بستہ معافی مانگ لی۔ نواب صاحب کی عالی ظرفی ہے' نہ صرف بندی کی التجا قبول کی بلکہ فرنگی افسر کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ انہوں نے کم ترین کا مان رکھا' بڑی عزت دی۔"

"اپنے کو کوئی گلہ نہیں ہے تارا بیگم۔" شمشاد خاں نے بے پروائی سے کہا "بہت چرچا ہوا تھا تمہارے انکار کا' ہم نے بھی سنا تھا۔"

"لوگوں نے بتنگڑ بنا دیا' بات ذرا سی تھی۔"

"پر نواب صاحب کی بات اور ہے' ہم تو فقیر لوگ ہیں۔"

"سبحان اللہ۔" تارا بیگم کھل کھلا پڑی۔ "پھر ہم لوگ کہاں جائیں گے' معلوم ہوتا ہے' آپ پر تو وقت ہی نہیں گزرا۔ وہی سج دھج' وہی آن بان' کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ ماشاءاللہ وہی شوخی اور زندہ دلی ہے۔"

"اور تمہارا اپنے لیے کیا خیال ہے؟" شمشاد خاں نے ہنسی سے کہا "وقت کو تو تم نے پنجے میں دبا رکھا ہے۔"

تارا بیگم کے رخساروں پر لالی دوڑ گئی "اب کیا رکھا ہے شمشاد صاحب! داستان ختم ہوئی۔ بس آپ کا حسن نظر ہے۔"

"اپنے پاس تو نظر ہے' باقی تو سارا تمہارے پاس ہے۔"

"کیا خوب! ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ اس دل جوئی سے ڈھارس دلاسا ہوتا ہے لیکن۔" وہ بل کھا کے بولی "وقت کب رعایت دیتا ہے۔"

ہم ایک مختصر آراستہ و پیراستہ ڈیوڑھی جیسی گزرگاہ میں کھڑے تھے۔ شمشاد خاں کے ٹوکنے پر تارا بیگم پشیمان ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کے اور ہاتھ پھیلا کے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔ ہم ہال کی طرز کے جگمگاتے ہوئے ایک کشادہ بیضوی کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے تین اطراف محرابیں بنی تھیں اور درمیان میں ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔ محرابوں کے پار ایک طرف بڑی شہ نشین' دوسری جانب کچھ فاصلے پر بے شمار طاقوں سے مزین در و دیوار۔ دیوار میں قریب قریب' متعدد کمروں کے منقش دروازے نظر آ رہے تھے۔ چھت' ستون اور دیواروں پر پچی کاری بہت مہارت سے کی گئی تھی۔ رنگ برنگے نقش و نگار میں جڑے ہوئے شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے کسی شیش محل کا گمان ہوتا تھا۔ چھت کے وسط میں ایک بڑے فانوس کے علاوہ جا بجا چھوٹے فانوس روشن تھے۔ ساری تزئین و آرائش شاہانہ تھی۔ نواب' راجے ہی یہاں آتے ہوں گے۔ بٹھل اور شمشاد خاں سازندوں کے مقابل کی نشست پر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ میں' زورا اور جمرو بنے خاں اور اڈے کے تین آدمی ان کے دائیں بائیں۔ کوئی سازندہ مدھم سروں میں ستار سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ خاص دان اور پیچوان تیار تھے۔ سازندوں نے کچھ ہی دیر میں ساز سنبھال لیے۔ تارا بیگم مہمانوں کے انداز میں بٹھل اور شمشاد خاں کے قریب بیٹھ گئی۔

یکایک بائیں جانب سے تسلیمات کرتی' چھم چھم کرتی ہوئی تیکھے خال و خد' کندنی رنگت کی ایک نوجوان دلکش لڑکی نے آ کے سازوں پر رقص شروع کر دیا۔

"یہ' یہی چاندنی ہے کیا؟ کل اسی پر خون ہوا تھا؟" جمرو نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں جمرو بھائی!" بنے خاں نے زیر لبی سے کہا "یہ تو اس کی چھوٹ بھی نہیں ہے۔ یہ تو ذرا محفل گرمانے کا چونچلا ہے۔"

"پر یہ بھی بہت پٹاخا ہے بنے میاں۔"

"بھول گئے' تارا بیگم کا بالا خانہ ہے۔ کوئی ایسی ویسی تو یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتی۔ تصویر کی طرح بناتی ہے تارا۔ ایک نمبر کی پارکھ ہے۔"

لڑکی نے اپنا سراپا سازوں سے ہم آہنگ کرنے کی اچھی مشق کی تھی۔ رفتہ رفتہ جیسے اس کے پاؤں' اس کے ہاتھ' اس کا سارا بدن ہی سازوں کے اشارے کا معمول بن گیا۔ وہ سازوں کا کوئی حصہ بن گئی یا ساز اس کے سراپا میں مدغم ہو گئے۔ سب گم صم سے تھے۔ لڑکی کو آئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ تارا بیگم نے ہاتھ اٹھا دیا۔ لڑکی نے نہیں دیکھا لیکن سازندوں نے ساز مدھم کر دیے تھے اور طبلہ نواز

نے طبلے سے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ لڑکی کے پیروں میں بھی پھر کوئی زنجیر سی پڑ گئی۔
"کیا غضب کردیا، کیوں روک دیا؟" شمشاد خاں نے ہیجانی لہجے میں کہا۔
"جلدی بہکنے لگتی ہے۔" تارا بیگم اٹھلا کے بولی "ابھی نو آموز ہے۔"
"کس سے سکھوا رہی ہو؟" شمشاد خاں نے اشتیاق سے پوچھا "کوئی بڑا گنی لگتا ہے۔"
"شکر ہے، بار خاطر نہ ہوا۔ بندی تو ڈر رہی تھی۔" تارا بیگم مسکرا کے بولی "برجوں ان کے گرو جو شی بابو کا نام شاید سنا ہو، وہ تو اب چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے۔ کچھ عرصے کے لیے ان کے پاس بھیجا تھا، بڑی منت کی تھی، تب مانے، وہاں جا کے یہ دیوانی ہوگئی نگی۔"
"لگتا ہے، نرت کے لیے بنی ہے۔"
"ابھی کیا دیکھا ہے آپ نے، غضب ڈھانے والی تو اب آیا چاہتی ہے۔"
"اسی کے لیے تو اپنے بٹھل بھائی کو کھینچ کے لائے ہیں۔"
"استاد تو زمانہ دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے اسے حاضر کرتے ہوئے سچ پوچھیے تو دل دھڑکتا ہے۔ خدا لاج رکھے، میری التجا ہے، کوئی کوتاہی ہو تو بچی سمجھ کے درگزر کر دیجیے گا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اسے محفل میں آئے۔"
"پر دیر کیا ہے تارا بیگم، جلوہ کراؤ۔"
"کیا خاں صاحب، آپ ایسی بھی کیا بے صبری۔ ذرا دم لیجیے، کچھ چائے وغیرہ نوش کیجیے۔ ایک زمانے بعد تو آپ نے غریب خانے کا رخ کیا ہے۔"
"وہ تو آنا بھی اپنے بھائی استاد بٹھل کی وجہ سے ہو گیا۔ کمین کے جانے کے بعد اب کہیں آنے جانے کو جی نہیں کرتا۔"
"آپ نے کمین خاں کا کیا ذکر چھیڑ دیا؟" تارا بیگم افسردگی سے بولی "آپ کے دکھ کا اندازہ ہے خاں صاحب! آپ ہی کا تراشا ہوا ہیرا تھا۔ یہاں سب ہی کو بہت قلق ہوا تھا۔ کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا جوان جہان، البیلا، دل والا آدمی، یہ عمر ایسی تو نہ تھی۔ کبھی کبھی یہاں آتے تھے اور کیا اعلیٰ ذوق پایا تھا، اتنے شعر یاد تھے کہ الاماں۔ ہر موقع پر ایک شعر حاضر، ہائے کیسا بانکا شخص تھا۔ ان جیسا شاید ہی لکھنؤ والوں کو کوئی ملے، آپ نے بہت اچھا کیا جو چوکی پر واپس آگئے۔"

"پر دل کا کیا کریں، نہیں لگتا تارا بیگم!"
"کیوں کر لگے گا گمر خاں صاحب، آپ چلے گئے تو کیسی لوٹ مار مچے۔ جب تک کمین خاں کی جگہ قابل کوئی نہ مل جائے، میری تو یہی بنتی ہے کہ آپ [...] رہیں۔"
"نہیں تارا بیگم! بنے خاں کو کل چوکی پر بٹھا رہے [...] بٹھل بھائی کو اسی لیے روکا ہے۔ بنے کو کمین بھی [...] تھا۔ اپنا تو یہ آخری دن ہے۔"
"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" تارا بیگم تعجب سے [...]
تارا بیگم پلکیں پٹ پٹانے لگی اور اس کی [...] آخر بنے خاں پر آکے ٹھہر گئیں۔
"ارے واقعی! یہ تو سامنے ہی بیٹھے ہیں، کیسے الگ۔ اب تو شاید اپنے ہوش و حواس ہی کھو گئے۔ [...] آپ کے اور استاد کے سوا کسی اور پہ غور ہی نہیں [...] خاں کمین خاں مرحوم کے ساتھ کئی بار آ چکے ہیں۔ [...] اب تو کچھ اور ہی تیور ہیں۔ شہزادوں کی طرح۔"
جمرو نے بنے خاں کو کہنی ماری تو بنے خاں کا [...] گیا۔ اتنی دیر میں دو کم سن لڑکیاں ہاتھوں میں طشت [...] کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ہمیں سلام [...] ہمارے سامنے طشت رکھ کے فوراً واپس چلی گئی۔ [...] خشک میوے، پھل، بھنا ہوا دھنیا، الائچی دانے اور [...] کے برتنوں میں سجا گئے۔
"یہ کیا، یہ کیا ہے؟" شمشاد خاں نے [...]
"کچھ بھی نہیں، بندی تو کچھ کر ہی نہ سکی۔ [...] کی شام زیارت کے لیے جاتی ہوں۔ برسوں کا معمول [...] آج وہاں کچھ دیر ہو گئی۔ مہلت ہی نہیں ملی کہ کسی [...] ادھر بانو کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ حکیم بھورے [...] یہاں آدمی بھیجا، انہی کی دوا بانو کے لیے شافی ہے [...] تھی، بندی نے کہا، بٹیا آج تو خود کو سنبھالے رکھنا [...] مہمان آنے والے ہیں۔"
"اب کیسی ہے وہ؟" شمشاد خاں نے تشویش سے پوچھا۔
"اللہ کا کرم ہے، طبیعت بحال ہے۔"
"نہیں خاں صاحب! اتنا تو مجھے بھی خیال ہے [...]"
"تمہیں نہیں ہوگا تو اور کس کو ہوگا۔"
"کیا بتاؤں، پہلے کیسے جتن کیے، کتنی آرزوؤں [...] کے بعد یہ دن آئے ہیں کہ بانو کسی لائق ہوئی ہے۔ [...] سے بانو پر محنت کی ہے، اپنے اوپر بھی شاید اتنی نہیں [...]

KHAN BOOK
STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 MISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH:5556532
PROP: ALI KHAN

[...] یا ایسا استاد ہے، جس کے در پہ جا کے بھیک نہیں مانگی۔ کہاں کہاں نہ گئی۔ کوئی ایسے ہی تو نہیں بن جاتا صاحب!" تارا بیگم کی آواز بھرانے لگی۔
"ہاں تارا بیگم، بالکل آدھے آدھے کی بات ہے۔ آدھا [...] ہوتا، آدھا دوسروں کا۔ جتنا آدمی اپنے کام آتا ہے، اتنا دوسروں کی بھی اس کو ضرورت پڑتی ہے۔"
"بجا کہتے ہیں۔" تارا بیگم سرہلا کے بولی "بے شک بانو [میں] خود بڑی صلاحیت تھی، میرا کام تو اجالنا، اجاگر کرنا ہی رہا [...] میں ہر لڑکی کو بانو نہیں بنا سکتی اس لیے ہر لڑکی بانو نہیں [ہو]تی لیکن اب احساس ہوتا ہے، بانو کو اتنا وقت نہ دیتی، اسے [اس] کے حال پر چھوڑ دیتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔"
"کیوں تارا بیگم؟" شمشاد خاں نے الجھ کے کہا۔ "[...] پچھتاوا کیسا؟ بانو تو اب تمہارے لیے حکومت ہے۔ تمہارے خرچ کیے ہوئے وقت کا ایک ایک پل اور لٹائے [ہوئ]ے پیسے کی ایک ایک پائی، ہزار کے حساب سے واپس [کر]ے گی۔ دیکھنا، بانو لکشمی ثابت ہوگی۔"
"دولت سکھ بھی تو ساتھ لائے۔"
"کیا مطلب، کوئی دکھ ہے تمہیں؟"
"نہیں، سب شکر ہے مولا کا۔"
"بولو، بولو تارا بیگم! کیا بات ہے؟"
"کچھ نہیں خاں صاحب!" تارا بیگم آہ بھر کے بولی "بس [...] مانگیے، خدا بانو کو سلامت رکھے، اسے بلاؤں سے محفوظ [...] بھٹکتے ہوں گے۔ وہی تو اب تعبیر، وہی تو اب ایک امید ہے۔ نہ بانو [...] ہیری کو بار بار ملتی ہے نہ زندگی اتنی۔" تارا بیگم جانے کیا کہنا [...] تھی کہ اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔
"ہم کو بتاؤ تارا بیگم!" شمشاد خاں بے قرار ہو گیا۔
"کیا بتاؤں خاں صاحب!" تارا بیگم یاسیت سے بولی۔ [...] نے سامنے رکھی ہوئی نوع بہ نوع چیزوں کی طرف ہماری [...] مبذول کرانی چاہی اور طشتری اٹھا کے پہلے بٹھل کی [...] پھر شمشاد خاں کی طرف بڑھائی۔
"کوئی پریشانی ہے تارا بیگم؟ جی میں انکاؤ رہے گا۔" [شمش]اد خاں نے اصرار کیا۔
"بندی کو ڈر ہے، زبان بہک نہ جائے۔"
"نہیں نہیں، کھل کے بولو۔"
"آپ نے کل کی بابت کچھ نہیں سنا۔" تارا بیگم کی [...] میں شکوہ نمایاں تھا "ہم پر تو قیامت گزر گئی۔"
"کل کی بابت؟" شمشاد خاں سٹ پٹا کے بولا "اچ چھا، [...] وہی کل جو چھرے نکل آئے تھے بیچ میدان میں۔ اسی

کیطرف اشارہ ہے نا تمہارا؟"
"جینا اجیرن کر دیا تھا اس مجنوں نے۔"
"یہ تو ہوتا رہتا ہے تارا بیگم! کوئی نئی بات تو نہیں ہے، سمجھو تو ایک دھوم مچ گئی ہے شہر میں چاندنی بانو کی۔"
"خاک! آپ اسے دھوم مچنا کہتے ہیں۔ اپنی تو جان پر بن گئی، کس عذاب میں وقت گزرا ہے، ہمی جانتے ہیں، ہر وقت ایک دھڑکا۔ در و دیوار سے خوف آنے لگا تھا، ایک تو بازار کے اپنوں میں بانو کی اٹھان سے کچھ کم سانپ نہیں لوٹے ہیں، ادھر یہ مجنوں، یہ فرہاد، کتنے خانوں میں چھپائے رکھوں یہ بلا۔ جب سے محفل میں آنا شروع کیا ہے، جنگل میں آگ لگ گئی ہے۔ نوابوں، نواب زادوں کی کوئی بھنگ لے، بھنگت ہی رہی ہوں۔ ایک سے ایک دعوے دار، بچارے اشرفیوں کے بھرے لیے چلا آرہا ہے اور گل بکاولی سنا رہا ہے۔ ٹھیک ہے، لیکن یہ گلی کے چوڑے چمار، خیر سے خاں صاحب، وہ نیا زادہ کیسی کیسی دھمکیاں دیتا تھا، کہتا تھا کہ ایک دن سارے بالا خانے کو دیا سلائی دکھا دوں گا، تیزاب پھینک دوں گا، سیندور کھلا دوں گا۔ ایک مرتبہ تو اس نابکار نے مجھ پر بھی ہاتھ اٹھا دیا۔ ایسی ذلت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کیا کیا امیدیں لگائی تھیں اس بانو سے کہ اب نچنت ہو کے کٹے گی مگر یہ بدنظر شہدے، سنپلے، یہ مجھے چین نہیں لینے دیں گے تہ ای بچی کو۔ آپ کے پاس قاصد بھیجا تھا، آپ نے بھی خبر نہیں لی۔"
"تمہارے سر کی قسم، اپنے پاس کوئی سور کا تخم نہیں پہنچا۔ اپنے کو کچھ نہیں معلوم۔۔۔"
"آغا پیا سے کہلوایا تھا، اس سے پوچھے گا۔"
"اس حرام زادے نے کچھ نہیں بتایا۔"
"شبہ تھا، ایسا ہی ہوا ہوگا، بھلا آپ کو معلوم ہو اور لوٹ کے نہ پوچھیں، یہ اندھیر تو کبھی نہیں ہوا تھا۔"
"آغا کو تو میں دیکھ لوں گا، بہت مستی کرنے لگا ہے۔"
"اس نے سوچا ہوگا کہ اتنی سی بات آپ کو کیا بتائے۔ اسے کیا خبر کہ بندی کس عالم سے دوچار ہے۔"
"پر آغا کو کہنا چاہیے تھا۔"
"یہ اس کی شکایت نہیں ہے، بندی میں اتنا حوصلہ نہیں۔ اسے میری طرف سے بدگمان نہ کر دیجیے گا، علاقے کا تھانے دار ہے وہ۔"
"نمبر ایک حرامی ہے وہ، تم فکر نہ کرو۔ بنے خاں کو بولتے ہیں کہ ادھر کی طرف ایک آدمی اور بڑھا دے۔ اب ذرا کوئی بات ہو، تم سیدھی بنے خاں کے پاس آدمی بھیجو، لیکن تارا بیگم!" شمشاد خاں نے آنکھیں چڑھا کے کہا "یہ جگہ ہی کھل

کھیلنے کی ہے، چھن چھنا چھن، تاک دھنا دھن، راگ رنگ، شاعری عاشقی۔ اب عاشقی پر تو ہم پہرا نہیں بٹھا سکتے، بٹھانا بھی نہیں چاہیے۔ کسی زمانے میں ہم نے خود بہت وقت خراب کیا ہے۔"

"اپنے اپنے وقت پر سب رنگ کھیلتے ہیں لیکن ایسا تو نہیں ہوتا۔"

"سوچ لو بیگم صاحب! ہم نے تانک اڑانی شروع کردی تو پیچھی اڑ بھی سکتے ہیں، بازار کے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ لو ہم پھر آگا پیچھا، الٹا سیدھا دیکھ کے آدمی بالا خانے کی طرف بڑھائیں گے۔ بولو ٹھیک ہے؟"

"ایسا بھی نہیں خاں صاحب! بندی تو لچوں لفنگوں کی بات کرتی ہے، بالا خانے میں آ کے جو بے لگام ہو جاتے ہیں، گالیاں گفتاریاں، دھمکیاں، توبہ توبہ۔"

"پر فرق کرنا آسان نہیں تارا بیگم! بعد میں پھر تم ہی کو انگلی اٹھانی پڑے گی، کون خرمستا زیادہ مستی میں ہے، کس کے سینگ نکلے ہوئے ہیں۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے، یہی تو بندی کہہ رہی ہے۔" تارا بیگم ہنس کے بولی "ہر ایک کے لیے نہیں، سانڈوں کے لیے التجا کرتی ہوں۔"

بٹھل انہماک سے ان دونوں کی نوک جھونک سن رہا تھا اور خشک میوے کے دانے ٹونگ رہا تھا۔ بائیں جانب دو بچیاں پھر کمرے میں وارد ہوئیں۔ اس بار وہ بھاپ دیتے آلو کے کباب اور پاپڑ کی قابیں لائی تھیں۔ تارا بیگم نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کے خود کو ملامت کی کہ اپنی باتوں میں اسے ہماری تواضع کا خیال نہیں رہا۔ بٹھل کے منع کرنے کے باوجود اس نے طشتری میں مٹھائی کے دانوں کا اضافہ کردیا پھر وہ ان کے پاس سے ہٹ کے ہمارے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔ اس کے آنے سے ہمارے گرد خوشبو کا ایک حصار سا کھنچ گیا۔ خوشبو میں بھی کیسا سحر یا نشہ سا ہوتا ہے۔ ہم چاروں سمٹ گئے۔ اتنے قریب سے اسے دیکھنے کا موقع اب ملا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت نرم و نازک تھے، انگلیاں لمبی لمبی، آنکھیں چمکیلی اور گہری۔ فانوسوں کی روشنی میں سرخی اور غازہ کی ہلکی تہ اور تاب دار ہوگئی تھی۔ عمر میں کمی اور حسن میں افزونی کے اس فریب سے دیکھنے اور دکھانے والے دونوں اچھی طرح واقف ہوتے ہیں پھر بھی یہ اچھا لگتا ہے۔ تارا بیگم کی آنکھیں پہلے مجھ پر پھر جمرو اور زورا پر بھٹکتی ہوئی بنے خاں پر ٹھہر گئیں

"مبارک ہو خاں صاحب! تخت پر بیٹھ کے ہم خاک نشینوں کو بھول نہ جائیے گا۔"

بنے خاں کسی قدر کسمسا کے اور مسکرا کے رہ گیا۔

"اجازت ہو تو بندی کچھ عرض کرے؟" بنے خاں بڑبڑا کے جیسے آنکھیں کھول دیں۔ تارا بیگم طرح دار ... بولی "جب ادھر کے ہنگاموں سے جی گھبرایا ...... کرے تو کبھی اس طرف کا رخ کرلیا کیجیے۔ تازہ ہوا کا احساس ہوگا"

"کبھی کبھی کیوں تارا بیگم؟" جمرو نے چہک کے کہا۔

تارا بیگم کا چہرہ اور لال ہوگیا۔ اس نے جھکتی نگاہ سے جمرو کو دیکھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کے بولی "کیوں نہیں سر و چشم، سر و چشم لیکن بندی جانتی ہے، چوکی پر بیٹھنے کے بعد خاں صاحب کو کہاں موقع ملے گا۔ کمبن خاں مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔ مہینوں گزر جاتے تھے، صورت ... ہوئے۔ الفت کو نخاس سے لے جانے کے بعد تو انہوں نے اس طرف آنا ہی بند کردیا تھا۔"

"یہ، یہ الفت کا کیا چکر تھا؟" جمرو نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"تارا بیگم نے گہری سانس کھینچی "بیتا ہوا دہرانے سے کیا حاصل، جب کہ بیتا ہوا دل بھی دکھاتا ہو۔"

"کچھ خبر ملی الفت کی؟"

"کسے معلوم، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" تارا بیگم ... بھر کے بولی "کہاں چلی گئی بد نصیب، خدا گواہ ہے، بندی نے کمبن خاں کو اشاروں کنایوں میں خبردار کیا تھا۔ الفت کو بھی سمجھایا تھا لیکن دونوں پر جنون سوار تھا۔ بازار کی ... سے نباہ ایسا آسان نہیں ہے میاں! بالا خانے پر بیٹھی عورت چاہے کتنی گھر گرہستی کی آرزو کرے لیکن اپنا گھر، چار دیواری اسے ملتی کہاں ہے۔ جاتی تو وہ یہاں سے ایک مرد کے ساتھ ہے مگر صرف ایک شخص سے تو نہیں رہتا۔ سینہ چھلنی کردیتے ہیں، آس پاس والے لیجیے، ڈیڑھ دو سال ہی بات چلی، وہ بھی جانے کس طرح۔ کمبن خاں بے چارے نے تو دہرا صدمہ سہا۔ ایک ... دوسرا بیٹے کا۔"

"پر اس میں کمبن خاں کا کیا دوش تھا۔" جمرو نے کہا "کمبن نے الفت کے لیے جو بھی لڑی تھی ... کیا نہیں کیا تھا۔"

"بندی کو معلوم ہے۔ بالا خانے سے کسی عورت کو لے جانے والے مرد کا ایثار بے شک بڑا ہوتا ہے۔ ... عزت کی بھلائی کی جستجو میں بالا خانے سے جاتی ہے ... نے اتنی بڑی قربانی نہیں دی جتنی کمبن خاں نے دی ... آدمی کو تمیں اور طرف بھی دیکھنا چاہیے۔ بالا خانے کی

کے طور طریقے، رہن سہن، سوچ و فکر سبھی کچھ گھر کی عورت سے الگ ہوتا ہے۔ بندی پوچھتی ہے۔" تارا بیگم کی آواز کرکرا سی گئی "جوانی اور عاشقی کا ساتھ اس قدر کیوں ہے صاحب! جوانی کا طوفان ختم ہو جانے پر عاشقی بھی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ مرد کا کچھ نہیں جاتا مگر بالا خانے کی عورت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔"

"پر الفت کو کون سی تکلیف تھی۔" جمرو نے تلخی سے کہا "اس کو کمبن خاں نے نکالا ہے کیا؟"

"بندی کب کہتی ہے۔ اصل بات تو الفت ہی جانتی ہے۔ کچھ تو ہوگا جو کم بخت دودھ پیتے بچے کو لے کر چلتی بنی۔ کنوئیں میں ڈوب گئی یا گومتی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ کوئی عورت ایسے ہی تو گھر بار نہیں چھوڑ دیتی۔"

"بالا خانے کی دس عورتوں کو ہم بھی جانتے ہیں مہارانی!" جمرو نے منہ بگاڑ کے کہا "گھر جا کے انہوں نے پھر بالا خانے کی طرف نہیں دیکھا۔"

"بندی بھی واقف ہے۔" تارا بیگم کے نتھنے پھول گئے "پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔"

"الفت نے کمبن کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اسی واسطے کمبن نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ نہیں تو ڈھونڈ نکالنا کمبن کے لیے کیا مشکل تھا۔"

"ہاں۔" تارا بیگم اداسی سے بولی "کمبن خاں کا دل ہی ٹوٹ گیا ہوگا۔ اس نے اچھا کیا جو الفت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہی تو بندی کہتی ہے۔ بالا خانے کی عورت اپنی جگہ ٹھیک رہتی ہے۔ وہ گھروں سے بہت دور ہوتی ہے۔ اسے نہیں چھیڑنا چاہیے۔"

"نہیں تارا بیگم! میں نہیں مانتا۔" جمرو نے ترشی سے کہا "بالا خانے کی عورت کے چار ہاتھ، آٹھ آنکھیں ہوتی ہیں کیا؟ اس کا من نہیں ہوتا کیا؟ وہ بھی تو سامنے آنے والے کسی پاگل دیوانے کے لیے بے کل ہو سکتی ہے۔"

"ہو سکتی ہے، کیوں نہیں لیکن دل کے ساتھ خدا نے دماغ بھی دیا ہے۔ دل کا چلا جانا، دماغ کا چلا جانا نہیں ہونا چاہیے۔"

"ایک بات پوچھوں تارا بیگم؟" جمرو نے مچل کے کہا۔

"اندازہ ہے کیا پوچھیں گے آپ، بندی نے ہمیشہ دل کو پیچھے رکھا ہے اور ٹھیک ہی کیا ہے۔ کوئی ملال بھی نہیں۔"

"اچھا ہے، پر ادھری سبھی کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔"

"سب کی بات میں نہیں کرتی۔ میں تو پہلے ہی کمبن خاں

KHAN BOOKS

ہپناٹزم کے عملی طریقے

ہپناٹزم کو سیکھنے کے آسان طریقے اور مشقیں

قیمت 30 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

مکتبہ نفسیات

74200

802552-5895313
فیکس 5802551

kitabiat@hotmail.com
kitabiat@yahoo.com

سے کہتی تھی۔ اب بھی میرا یہی کہنا ہے۔ بالا خانے تو تو شنگی کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ تو گزرگاہ ہے' اسے سرائے کی طرح جانو۔ یہ تو سیر و تفریح کی جگہ ہے۔ جو گھروں میں نہیں ملتا' اس کا ہم یہاں بندوبست کرتے ہیں۔ یہ گھروں کی چیز نہیں ہے۔ گھروں میں خوش صورت لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہوتی کہ لوگ بالا خانے کی لڑکیوں کے والہ و شیدا ہوتے ہیں پھر دونوں عذاب ... سے گزرتے ہیں۔ ساری پسندیدہ چیزیں ملکیت میں تو نہیں لی جاتیں۔ گلستان کے پھول اپنی شاخوں پر بھلے لگتے ہیں اور اگر توڑ لیے جائیں تو گلستان کا کیا حشر ہو۔"

"یہ من کی بھی کوئی بات ہوتی ہے تارا بیگم! سارا کچھ آدمی کے بس میں نہیں۔ تم بھی ادھر آدمی پر جادو کر دیتی ہو۔"

"یہ کوئی فریب تو نہیں۔ واپسی کے لیے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ شمعیں بجھا دی جاتی ہیں۔ جو کچھ عیاں ہے' میاں ہے کچھ ڈھکا چھپا تو نہیں ہے۔ بالا خانے بازار میں ہوتے ہیں' شرفا کی بستیوں میں نہیں۔"

وہ اپنی شربتی نینا یاد ہے؟ وہ کسی شاعر کا شعر گاتی تھی' عشق پر نہیں زور کیا تھا وہ...؟ پورا یاد نہیں آرہا۔"

"عشق پر زور نہیں' ہے یہ وہ آتش غالب۔" تارا بیگم کھل کھلا کر بولی "جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ غالب کا شعر ہے۔"

"ہاں ہاں وہی' کسی کا بھی ہو' گاتی اچھا تھی۔" جمرو نے اچک کے کہا "کیا بولتی ہو پھر؟"

"عشق اپنی جگہ ہے پر ملکیت تو شرط نہیں ہے کیا عشق کے لیے لازم ہے کہ محبوب ملکیت میں آئے؟ میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ آدمی کو دور کا بھی دیکھنا چاہیے۔ آدمی کو ایسا بے گانہ نہیں ہو جانا چاہیے۔"

مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔ "آپ کا کام بھی خوب ہے۔" میں اپنے لہجے کی پر خشکی دور نہ کر سکا' میں نے تارا بیگم سے کہا "دل جوئی بھی' دل شکنی بھی۔ اقرار و انکار' آمادگی و بیزاری' دروازہ کھلا رکھنا' دروازہ بند کر دینا' تماشا گاہ کا وقت مقرر ہے لیکن تماشے کا اثر تو دروازے بند ہو جانے پر بھی طاری رہ سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر ہوش مندی تو آتے ہیں جو آپ کے بہ قول عواقب پر نظر رکھتے ہیں لیکن کبھی کوئی اپنا اختیار کھو بھی تو سکتا ہے۔ اس کا کیا بنے؟"

تارا بیگم کے سراپا میں موج سی اٹھی۔ "آپ' آپ سے تعارف ہی نہیں ہوا بنے خاں صاحب۔" وہ تجسس آمیز لہجے میں بولی۔

بنے خاں کے بجائے جمرو نے جواب دیا "یہ اپنا لاڈلا ہے' سمجھو استاد بھلّن کا بھائی' بیٹا' جو بھی سمجھو۔"

"یہ بھی کسی چوکی پر بیٹھتے ہیں؟"

"اس کے پاس بہت سی چوکیاں ہیں۔"

"لگتا بالکل نہیں ہے۔"

"کیوں؟ لگنے والے کی آنکھیں پیچھے کی طرف ہوتی ہیں؟" جمرو نے جلی کٹی سی آواز میں کہا۔

"نہیں' خدا نہ کرے۔" تارا بیگم بے ربطی سے بولی پھر سنبھل کے کہنے لگی "مگر ان کی آنکھیں... ان آنکھوں میں تو بڑی آگ لگ رہی ہے۔"

"وہ تو ہے۔" جمرو نے جھجکتے ہوئے تائید کی اور بولا "یہ خود کو جلاتی ہیں۔"

تارا بیگم کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں "ماشاء اللہ تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔"

"جمرو کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے کہا "حرف شناسی کی حد تک۔"

"میں اسے کسر نفسی کہوں گا۔"

"من آنم کہ من دانم۔ میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آرہیں۔"

"یہ وقت گزرنے کی بات ہے۔" تارا بیگم شائستگی سے بولی "اور ہو سکتا ہے' میری ہی فہم کی کوتاہی ہو۔"

"موجودہ وقت بھی تو کوئی فریب نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک حقیقت ہے۔"

"جی جی۔" تارا بیگم سرہلا کے بولی "وہ بھی' بے شک [illegible] بھی ایک حقیقت ہے۔ آپ نے کہتی تھی اور ابھی بات کا [illegible] ہے۔"

پہلو سے شمشاد خاں کی دھمکتی آواز نے اسے متذبذب کر دیا "کیا بات ہے تارا بیگم اور کب تم امتحان لوگی۔"

تارا بیگم مجھ سے معذرت کر کے جلد ہی ہمارے پاس سے اٹھ گئی "واقعی خاں صاحب! توبہ' بندی تو جانے کہاں کھو گئی۔ اس طرف آنے پر کچھ اور باتیں چھڑ گئیں۔"

تارا بیگم کے اشارے پر محرابوں کے پاس مودب کھڑی ہوئی بچیوں نے ہمارے سامنے سے کچھ سامان کم کر دیا۔ [illegible] بیگم چند لمحوں بعد واپس آنے کا کہہ کے اندر چلی گئی۔ سازندوں نے آہستہ آہستہ ساز تیز کر دیے تھے۔ طبلہ ان سب سے نمایاں تھا۔ زورا تو باقاعدہ تھرکنے لگا۔ پانچ [illegible] منٹ بعد محرابوں کے پار ایک دروازے سے تارا بیگم [illegible] ہوئی۔ اس کے عقب میں چوڑی دار سفید پاجامے [illegible] گلابی کرتے اور ہرے دوپٹے میں ملبوس نوجوان لڑکی چا[illegible]

بانو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ نکلتا ہوا قد' کامنی صورت' ترشا ہوا سراپا' ترشے ہوئے نقش و نگار' بڑی بڑی شربتی آنکھیں۔ لمبے سیاہ بال' رخسار شعلوں کی طرح دہک رہے تھے۔ کسی دلہن کی طرح سجی بنی۔ کانوں میں ہیرے جڑے جھمکے' ناک میں لال ڈوری کے ذریعے کان تک بندھی ہوئی نتھ۔ کلائیوں میں طلائی چوڑیاں' گلے میں کئی طرح کے ہار' پیروں میں پازیب' صرف جھومر کی کمی تھی۔ وہ چھن چھن کرتی فرش کے وسط میں آکے کھڑی ہو گئی۔ سب کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔ سازندوں نے ساز بند کر دیے اور کمرے میں سکوت چھا گیا۔ چاندنی بانو کے سرخ ہونٹوں نے شمشاد خاں اور بھلّن کی جانب' پھر ہماری طرف رخ کر کے سلام کیا اور فرش پر خاص انداز سے بیٹھ گئی' اس طرح کہ کرتے کے گھیرے نے دائرہ بنا دیا۔

"واہ تارا بیگم! واہ!" شمشاد خاں نے بے ساختہ صدا بلند کی "یہ تو مورتی کی طرح ہے۔ روز اس کی نظر اتارتی ہو نا؟"

چاندنی بانو نے شرم سے سر جھکا لیا۔ تارا بیگم نے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ کانوں پر گھما کے انگلیاں چٹخائیں اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "کوئی پل نہیں جاتا خاں صاحب!"

"جی ہم نے کم سنا تھا۔"

"عنایت ہے آپ کی۔" تارا بیگم دمکتی آواز میں بولی۔

بنے خاں اور جمرو کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ زورا کو بھی سانپ سونگھ گیا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے اڈے کے تینوں آدمی بھی دم بہ خود ہو گئے۔ جمرو کو جیسے سب سے پہلے ہوش آیا اور اس نے بنے خاں کی آنکھوں کے آگے انگلیاں نچاتے ہوئے کہا "سنبھل کے نوشہ!"

بنے خاں سٹ پٹا سا گیا اور مضطرب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دونوں نو عمر لڑکیاں گھنگرو لے آئیں۔ چاندنی نے گھیر میں چھپے ہوئے پیر نکال کے ان کے سامنے کر دیے۔ لڑکیوں نے پازیب اتار کے پیروں میں گھنگرو باندھ دیے۔ اسی لمحے سازندوں نے ساز بجانا شروع کر دیے۔ تارا بیگم دوبارہ شمشاد خاں اور بھلّن کے قریب بیٹھ گئی اور چاندنی بانو کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے شمشاد خاں سے اجازت طلب کی۔

"ضرور ضرور' ہم تو کب سے اس گھڑی کو ترس رہے ہیں۔" شمشاد خاں نے خسروانہ لہجے میں کہا۔

تارا بیگم ہاتھ جوڑ کے عاجزی سے بولی "کوئی خامی ہو تو بچی سمجھ کے نظر انداز کر دیجئے گا۔"

"ہم کو معلوم ہے' بالکل نہیں ہو گی۔ اوپر والے نے اس کو بنانے میں پورا وقت لیا ہے۔ یہ تو اوپر سے نیچے تک سُر میں ہے۔"

چاندنی بانو نے سازندوں کی جانب کن انکھیوں سے دیکھ کے گنگنانا شروع کیا۔ بنے خاں اور جمرو سیدھے ہو کے بیٹھ گئے۔ اس کی گنگناہٹ سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ خوبی خداداد ہے' قدرت نے آواز کی عطا میں بھی خوب فیاضی کی ہے۔ چاندنی نے سودا کی غزل سے آغاز کیا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

مجھے نصیب میاں یاد آرہے تھے۔ کہتے تھے' سب سے پہلی شرط تو کسی کا سُر میں ہونا ہے۔ ایسا لگا جیسے کمرے میں ہر سو گھنٹیاں بجنے لگی ہوں اور روشنی بھی مترنم ہوئی ہو' ہوا بھی چاندنی کے ساتھ گا رہی ہو۔ اس کی ادائی' زیر و بم' لچک' سوز و گداز' سازندوں سے ہم آہنگی' مرکی بھاؤ۔ لگتا تھا چاندنی کا بدن پگھل رہا ہو اور اس کے مرتعش ہونٹوں سے ترنم کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ آواز کے بھی کیسے کیسے روپ ہوتے ہیں۔ فنکار کا انہماک' اس کی شمولیت لازم ہے۔ چاندنی آپ اپنی اسیر معلوم ہوتی تھی۔ مصور اپنے شاہکار میں خود بھی تو گم ہو جاتا ہے۔

ادھر اس نے غزل سرائی ختم کی' ادھر شمشاد خاں اٹھ گیا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے چاندنی بانو گھبرا سی گئی' اس کی غزالی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ شمشاد خاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے گلے سے سونے کی زنجیر اتار کے چاندنی بانو کے گلے میں ڈال دی۔ چاندنی بانو نے جھک کر اسے سلام کیا۔

"اسے چھپا کے رکھو تارا بیگم! اسے چھپا کے رکھو۔" شمشاد خاں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"ہاں خاں صاحب!" تارا بیگم کے چہرے پر اداسی چھا گئی "ہے تو یہی بات۔"

"بتاتا ہوں تم کو۔" شمشاد خاں تنبیہی لہجے میں بولا "ڈاکا پڑ جائے گا۔"

"اسی لیے کہتی تھی' آپ کیسے رکھوالے ہو۔"

"جتنی جلدی مول تول کرلو' اچھا ہو گا ورنہ دیر نہ ہو جائے' دیر ہو جائے گی۔"

تارا بیگم کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں' وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ چاندنی بیگم نے داغ کی غزل شروع کر دی تھی۔

بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں۔ سب گنگ بیٹھے رہے۔ نعرہ تحسین و آفریں بلند کرتے ہوئے شاید سب کو چاندنی بانو کے منتشر ہو جانے کا خدشہ تھا یا اس کی آواز کا سحر تھا جس نے سب کو جکڑ سا رکھا تھا۔ چاندنی بانو کو، راگوں کی باقاعدہ تربیت دی گئی تھی۔ جب وہ تان اٹھاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب ٹوٹا "اب ٹوٹا" جیسے بدن کا شیشہ ٹوٹ جائے گا، چاندنی کرچیوں کی طرح فرش پر بکھر جائے گی۔ نصیب میاں کہتے تھے، "آواز کی پہلی خوبی غنا ہے تو دوسری قابو یا فتگی۔ کھینچو تو کھینچی چلی جائے، سمیٹو تو سمٹی چلی جائے۔ اٹھے تو آسمان سے جا ملے، اترے تو پاتال جا چھوئے۔ نصیب میاں کو سُر کی بڑی پہچان تھی۔ کلکتے کے اڈے پر جب کوئی سُر سے اترتا تھا تو ان کا منہ بگڑ جاتا تھا، وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے یا اٹھ کر چپکے سے باہر چلے جاتے۔ رقص و سرود کے بارے میں مجھے جتنی شدبد تھی، اس کا بیشتر نصیب میاں کا بتایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی طبیعت کی روانی کے وقت وہ بہت سی باتیں اور یادیں سناتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آواز کا تعلق براہ راست دل سے ہے۔ آواز کی کمان سے نکلا ہوا تیر ٹھیک دل پر جا کے لگے، بات تو تب ہے۔ سُر گردش وقت سے بے نیاز کر دیتا ہے اور یہ مبالغہ نہیں کہ ٹھہرا ہوا پانی متلاطم کر دیتا ہے۔

تیسری غزل کے اختتام پر، چاندنی بانو فرش سے اٹھ گئی اور اس نے ستار کی سنگت پر ناچنا شروع کر دیا۔ طبلہ نواز تال دینے لگا۔ چاندنی بانو نے جیسے خود کو تال کے سپرد کر دیا اور اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ رہا۔ یہاں تک کہ صرف ناچ نظر آنے لگا، ناچنے والی اوجھل سی ہو گئی۔ طبلچی درمیان درمیان میں ٹھیکا لگا کے رقص کی شدت اور بڑھا دیتا۔ رقص کی یہ دیوانہ وار حرکات و سکنات کسی جبلی تحریک، تائید و تسکین یا جبلی قوت کے بغیر ممکن نہیں۔ چاندنی پھولوں کی طرح لطیف، ریشم کی طرح نرم و نازک تھی۔ اتنی توانائی جانے کہاں سے اس میں آ گئی تھی۔ رقص کے دوران میں اس کا رنگ اور نکھر رہا تھا۔ چہرہ اور خوں رنگ ہو گیا تھا۔ بمبئی میں کرشنا جی کے ساتھ میں نے ایک بار جنوبی ہندوستان کی ایک رقاصہ کا ایک ایسا ہی رقص، بھارت ناٹیم دیکھا تھا۔ وہ اپنے فن کی ماہر تھی۔ اس کا بھی انگ انگ پھڑکتا، تھرکتا تھا۔ لگتا تھا بس آخری رقص ہو اور رقص کرتے کرتے بس فنا ہو جانے کی آرزو ہو۔ چاندنی کسی طور اس سے کم نہیں تھی۔ اس کے اعضا، ستار نواز کی لے اور طبلے کی تھاپ سے بندھے ہوئے تھے۔ بھی کا عالم دیدنی تھا۔ کہیں پلک جھپکنے میں کچھ کھو نہ جائے، بھی

ٹکٹکی باندھے برق اندام چاندنی کو دیکھ رہے تھے پھر ستار نواز نے کوئی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

برکھا میں گوری ابھاگن

رتیاں بتائے جل جل کے

گیت کے بولوں پر چاندنی یاس و الم کی تصویر بن گئی۔ کبھی لہروں کی طرح اس کا بدن اٹھنے لگتا، کبھی شعلوں کی طرح بھڑکنے لگتا، جمرو اور زورا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ چاندنی کے ساتھ رقص میں شامل ہو جائے۔ میرا جسم بھی دھڑک رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ ستار نواز نے ہیتم کی بے وفائی پر اپنی آہ و بکا تمام کر دی اور چاندنی کو قرار آ گیا۔

شمشاد خاں سر جھٹکنے لگا۔ داد و تحسین کے جواب میں تارا بیگم بار بار آداب کرتی۔ رقص ختم کرتے ہی چاندنی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی۔ کمرے میں سناٹا ہو گیا۔

"کیا ہوا تارا بیگم؟" شمشاد خاں بد حواسی سے بولا "یہ کیا؟ کیا اٹھ جائیں؟"

"خدا خیر کرے۔" تارا بیگم نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے آنکھیں چڑھالیں "ذرا دم تو لینے دیجیے سرکار۔"

شمشاد خاں نے اطمینان کی سانس لی پھر بے چینی سے بولا "اب ہم سے کسی اور کوتہ دیکھا جائے گا۔"

"وہی نامراد آئے گی۔" تارا بیگم مسکرا کے بولی "ہر آیا یہی چاہتی ہے۔"

"کاش ہم بھی کوئی نواب ہوتے۔" شمشاد خاں نے حسرت سے کہا۔

"آپ کسی سے کیا کم ہیں خاں صاحب۔"

"ہاں ... یہ کہتی ہو۔" شمشاد نے زہر خند سے کہا "پر تمہیں دینے کے لیے کوئی جاگیر نہیں ہے پاس۔"

"آپ کے دو لفظ ہی بندی کے لیے جاگیر کے مانند ہیں۔ جاگیروں والے تو صبح و شام یہاں آتے ہیں۔"

بنے خاں ابھی تک بت بنا ہوا تھا۔ جمرو نے اس کے بازو میں چٹکی بھری تو وہ اچھل پڑا "کیا ہے نوشہ! اب یہ بچے کو ستانا۔"

"جمرو بھائی۔" بنے خاں کی آواز سنسنا رہی تھی "تم نے دیکھا؟"

"نیا نہیں ہے جانی!" جمرو نے بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کر کے بنے خاں کی شدت کم کرنے کی کوشش کی۔

"اپنے لیے بالکل نیا ہے۔" بنے خاں تمتماتی آواز میں بولا۔

"پرانا بھی ہو جائے گا۔" جمرو نے بنے خاں کی ران میں چٹکی دی "ابھی دو ایک رات کی کسر ہے۔"

"کیسی ہے وہ؟" بنے خاں نے بچوں کی سی سادگی سے پوچھا "شہزادی ہے بالکل۔"

"اچھی ہے۔" جمرو نے سرسری انداز میں کہا "اپنے کو ہاتھ لگنے والی چیز اچھی لگتی ہے۔"

"ہاں آں۔" بنے خاں کی آنکھیں بجھ گئیں "ایمان سے بولا جمرو بھائی! اس کے ملنے کے بعد کسی اور چیز کی کیا ضرورت ہے پھر اور کیا چاہیے۔ آدمی اسی کو دیکھا کرے۔" بنے خاں بہت اضطراب میں معلوم ہوتا تھا، کہنے لگا "کیوں غلط کہتا ہوں کیا؟"

"ٹھیک ہی بولتا ہے بھائی جان۔" جمرو نے بوجھل آواز میں کہا "پر دنیا میں کنائی نہیں ہے۔ ایک کے اوپر ایک پڑا ہے۔"

بنے خاں کہیں کھو سا گیا۔

"بلبلیں اڈے کے آدمی کو راس نہیں آتیں۔" جمرو نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

"اڈے پر ویسے بھی رہنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ دونوں مجھے گھورنے لگے اور بنے خاں سہلا کے بولا "ہاں لاڈلے بھائی، پھر اڈا کیا چچا سے سالا۔"

"میں تو چاندنی کے بغیر بھی کہہ رہا ہوں۔" میں نے وضاحت کی۔

"اڈے سے نکلنا بہت مشکل ہے لاڈلے بھائی۔" بنے خاں پژمردگی سے بولا۔

"کیا مشکل ہے۔" میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ارادہ ہو تو اڈا چھوڑ دینا کیا دشوار ہے۔ اچانک سامنے سے بجلی سی چمکی۔ چاندنی بانو نمودار ہوئی۔ اس نے اتنی جلدی لباس تبدیل کر لیا تھا۔ چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ جھمکیوں کی جگہ اب کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں پڑی تھیں، ناک میں لونگ اور ہراں تھی۔ فرش پر ایک خاص انداز سے بیٹھ کر اس نے مسکراتی نظروں سے سر گھما کے دیکھا اور جیسے ہی ساز بلند ہوئے، وہ نغمہ سرا ہو گئی۔ ہم لوگوں سے اب وہ اتنی دور نہیں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ رقص کناں تھے۔ لہراتے ہاتھ، تھرکتی انگلیاں اور بل کھاتی پلکیں شعروں کا مفہوم اور سازوں کا زیر و بم اجاگر کر رہی تھیں۔ لگتا تھا، چاندنی بانو کو اساتذہ کا کلام خوب یاد ہے۔ اس نے یکے بعد دیگرے ولی دکنی، میر، غالب اور آتش کی غزلیں سنائیں۔ شمشاد خاں مسلسل جھوم رہا تھا۔ بھلن کے اشتیاق بھی دیدنی تھے۔ جمرو اور زورا کے دست و بازو بار بار پھڑک اٹھتے۔ بنے خاں کا حال البتہ مختلف تھا۔ وہ تو جیسے پتھر بن گیا تھا۔ آواز میں بھی کیسا نشہ ہوتا ہے، آدمی اپنے آپے میں نہیں رہتا۔ سب خود سے بے گانہ ہو گئے تھے۔

شمشاد خاں نے کچھ کہا ہو گا کہ تارا بیگم کے اشارے پر چاندنی بانو بھلن اور شمشاد خاں کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔ بھلن نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کے چپکے سے شمشاد خاں کی طرف کھسکا دی۔ شمشاد خاں کو بھلن کی جانب سے اس خسروی کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس پر حیرت طاری ہوئی لیکن پھر اس نے گڈی کھول کے سارے نوٹ چاندنی پر نچھاور کر دیے۔ جمرو بھی خالی نہیں تھا، چاندنی کو پاس بلانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ بھی کچھ رقم سامنے رکھے۔ یہی ہوا، تارا بیگم نے کن انکھیوں سے چاندنی کو ہدایت کی اور شمشاد خاں کی طرف سے اٹھ کے چاندنی بانو ہمارے پاس آ گئی۔ اتنے قریب سے اس کی تجلی کا منظر کچھ اور تھا، رخساروں سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ چاند جیسے جل رہا ہو۔ جمرو نے اور اضافہ کیا۔ نوٹوں کی گڈی چاندنی کے سر پر گھما کے پرے بیٹھے ہوئے سازندوں کی جانب پھینک دی۔ فرش پر پڑے ہی پڑے بکھر گئے۔ چاندنی نے اس جود و سخا کے جواب میں اسے آداب کیا اور غزل مکمل ہوتے ہی ہمارے پاس سے اٹھ کے جانے لگی، جمرو نے اسے روک لیا اور وارفتہ لہجے میں بولا "آپ تو کمال کرتی ہو۔ اتنا بہت سا آپ نے کدھر سے سیکھ لیا؟"

"چاندنی بانو کا سراپا دہرا ہو گیا "کنیز کو کیا آتا ہے؟" اس نے کھنکتی آواز میں جھجکتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیا معلوم، کیا نہیں آتا آپ کو، تیر چلانا، بجلی گرانا۔" جمرو مچل کے بولا "تھوڑا سننے اور دیکھنے والے کا بھی دھیان کیا کرو۔ آپ تو بہت امتحان لیتی ہو۔"

چاندنی بانو کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔

"ابھی ایک بات پوچھے؟" زورا نے ادھر ادھر دیکھ کے رازدارانہ انداز میں کہا۔

چاندنی بانو کی آنکھوں میں بے چینی ہویدا ہوئی۔

"ابھی آپ کو، آپ کو یہ سارا کیسا لگتا ہے؟" زورا نے سرگوشی میں پوچھا "اپن کا مطلب ہے یہ سارا۔"

زورا کی مراد محفل آرائی سے تھی۔ چاندنی بانو بھی سمجھ گئی مگر اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مضطرب ہو کے رہ گئی۔

"روز یہ نوے نوے لوگ کے آگے گانا گانے کا۔" جمرو

کے ٹھوکا مارنے سے پہلے زورا کو خیال آگیا کہ وہ بلاغت سے تجاوز کر رہا ہے۔ اس نے لجاجت سے کہا "ابھی آپ کو کسی راج محل میں ہونے کا تھا۔ پتا ہے' ابھی اِیدر کا سراٹ بنے دادا کیا بولتا ہے۔" زورا نے سانس لینے کے لیے تامل کیا اور چاندنی کے چہرے پر نظریں جما کے کہنے لگا "ماں قسم' دادا بولتا ہے کہ آپ کے مل جانے پہ اور کیا چاہیے' آپ مل جاؤ تو اکھا۔"

چاندنی کا بدن لرز گیا۔ بنے خاں مبہوت بیٹھا تھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور دونوں ہی شاید ایک دوسرے کی تاب نہ لا سکے۔

چاندنی بانو گھبرا سی گئی۔

"ہم پوچھتے ہیں' مرد کا بھی تو کوئی مول ہوتا ہے؟"

چاندنی بانو کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔ اس کے لیے جواب آسان نہیں تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے جمرو کو دیکھا پھر زیر لبی سے اٹکتی زبان میں بولی "لیکن لکھے ہوئے کو کون مٹا سکتا ہے۔"

تارا بیگم نے اسے زیادہ دیر ہمارے پاس نہیں بیٹھنے دیا۔ اس کی صدا پر چاندنی ہڑبڑا گئی اور ہم سے معذرت کر کے فوراً اٹھ گئی۔ تارا بیگم نے اسے اندر جا کے آرام کا مشورہ دیا۔ چاندنی نے حکم کی طرح مشورے کی تعمیل کی۔ سازندوں نے ساز ایک طرف کر دیے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ شمشاد خاں نے بھی وقت نہیں لگایا اور رسمی وداعی کلمات کہہ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ تارا بیگم نے کچھ دیر کے لیے ہمیں اور روکنا چاہا' دوبارہ جلد آنے کی درخواست کی اور معذرت کا اظہار بھی کیا کہ وہ حسب خواہش شمشاد خاں اور اس کے معزز مہمانوں کی مدارات نہ کر سکی۔ وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آئی۔ سازندے بھی گلی کے نکڑ تک ہمارے ساتھ رہے۔

گلیوں میں اب اتنی چہل پہل نہیں تھی۔ پہلے کی طرح راستے میں اور کئی لوگوں نے شمشاد خاں کو اپنے اپنے بالا خانوں کی محفل میں شرکت کی دعوت دی۔ دکان دار بھی بار پھول' چائے' مٹھائی اور پان وغیرہ سے تواضع کے لیے اصرار کرتے رہے۔ شمشاد خاں کہیں نہیں ٹھہرا۔ ہم آہستہ قدموں سے دور نکل آئے۔ بنے خاں بالکل گم صم تھا۔ جمرو نے ازراہ لطف پچکارنے کے انداز میں اس سے کہا "ادھر لکھنؤ میں ہی ٹھکانا ہے دولہا! کل ہی کی تو بات ہے' کون روکے گا بادشاہ سلامت کو۔ گدی سنبھالنے کے بعد آنکھیں سینکنے کو پھیرے لگاتے رہنا۔ بولتے ہیں' حسینوں کا دیدار بھی سرے کا کام دکھاتا ہے۔"

بنے خاں سر جھکائے چلتا رہا۔ میں اس کے قریب آ... اس نے کوئی توجہ نہیں کی تو جمرو نے مجھے مخاطب کیا۔ ... ہے' ترچھا پڑ گیا ہے۔ پہلے ہی ہلے میں جھٹکا کر دینا ٹھیک ہے۔"

"ہاں بنے بھائی!" میں نے مڑ کے بنے خاں کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جل رہا تھا اور آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں ... نے اس کا ہاتھ سینے پر لگاتے ہوئے کہا "پیارے صاحب ... حال ہے؟"

میری اس سے ایسی بے تکلفی نہیں تھی' جانے اسے کیا ہوا' بے اختیار مجھ سے چمٹنے کے لیے امڈ پڑا۔ میں نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ آنکھوں کی طرح سینے کی بھی کوئی زبان ہوتی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے اسے کسی پناہ کی ضرورت ہے جیسے اس کا وجود مجھ میں پیوست ہو جانے' مجھ میں جذب ہو جانے کے لیے بے قرار ہو۔ میں نے اسے زور سے جکڑ لیا۔ چند لمحے مجھ پر کشاکش کے گزرے' میری سمجھ میں نہیں آیا اس کے لیے کیا کروں' جی چاہتا تھا کہ اس کی نشاط خاطر کے لیے احکام صادر کروں۔ اسے کوئی یقین دلاؤں مگر جلد ہی اپنی توفیق و استطاعت کا احساس ہو گیا۔ اس کے لیے ابھی ... جانی و ہمدردی کے باوجود میرے بس میں کیا تھا۔ میں نے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کی اور کسی موہوم عزم کی تلقین ... لیے اس کی کمر پر تھپکی دی۔ شمشاد خاں اور ... آگے چلے گئے تھے۔ ہم نے بھی رفتار تیز کر دی۔

چند قدم بعد ہی میرے پیر اٹکنے لگے۔ میں نے ... سے زورا اور جمرو کو ٹھہر جانے کے لیے کہا۔ بنے خاں ... رک گیا۔

"ٹھیک تو ہے؟" جمرو پریشان ہو گیا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" میں نے زورا سے کہا ... آگے جا کے جھلی اور شمشاد خاں سے کہہ آئے کہ ... دیر میں اوپر واپس آ میں گے۔

ایک لمحے کے پس و پیش کے بعد زورا لپکتا ہوا ... گیا۔ "کیا وچار ہے مہاراج!" جمرو معنی خیزی سے بولا۔

"واپس چلتے ہیں جمرو بھائی!"

"واپس! آپ کدھر کو بھیا جی؟"

"وہیں تارا بیگم کے ہاں۔"

جمرو سیدھا ہو گیا اور اس نے میری کلائی پر ہاتھ رکھ کر نبض ٹٹولنا چاہا۔ "ادھر اب کیا رکھا ہے میرے باپ ..." جمرو کی بھنویں کھنچ گئیں۔ اتنی دیر میں زورا ...

"دیکھتے ہیں جمرو بھائی!" میں نے اس کی منت کی "تو جلدی ... ابھی سو تو نہیں گئی ہوگی وہ تارا بیگم۔"

"پڑ لا لے۔" جمرو جز بز ہو کے بولا "ادھر' ادھر کیا۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کے اسے دھکیلا تو وہ چپ ہو گیا اور کندھے اچکا کے ہونٹ سکیڑتا ہوا چل پڑا۔

چند ہی منٹوں میں ہم بالا خانے کی گلی میں داخل ہو گئے۔ روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ زینے کا نچلا دروازہ بھی بند تھا۔ زورا کے کنڈی کھٹ کھٹانے پر اوپر کا دروازہ کھلا اور تیز قدموں سے کسی کے سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی' کوئی مرد تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے پوچھا "کون ہے؟"

"ہم ہیں استاد شمشاد خاں کے مہمان' ابھی ابھی جو گئے تھے۔ تارا بیگم سے کہو' ان سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

دروازے کا ایک پٹ کھول کر اور سر نکال کے اس نے پہلے ہمارے بارے میں تسلی کی۔ وہ شخص سازندوں میں شامل تھا "کیا بات ہے حضور؟" گھبرائے ہوئے لہجے میں اس نے پوچھا۔

"جا کے تارا بیگم سے کہو' زیادہ وقت نہیں لیں گے۔" میں نے نسبتاً بلند آواز میں کہا۔

تارا بیگم بھی زینے کے اوپر دروازے پر آ گئی تھی۔ اس نے متردد لہجے میں پوچھا "کیا استاد شمشاد خاں ہیں؟ خیریت تو ہے؟"

"نہیں آپا' استاد نہیں ہیں۔ بنے خاں صاحب اور ان کے مہمان تشریف لائے ہیں۔" سازندے نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

تارا بیگم نے کسی قدر تذبذب کے بعد سازندے کو حکم دیا کہ وہ ہمیں بہ عزت اوپر لے آئے۔

کمرے کی روشنیاں جلا دی گئیں۔ ہم فرش پر بچھے ہوئے قالین کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تارا بیگم وہاں نہیں تھی مگر اسے باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس دوران میں اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ غرارے اور کرتے پر سفید شال سلیقے سے اوڑھے ہوئے تھی' ہونٹوں پر گلابی سرخی بھی تھی۔

"آپ کو زحمت ہوئی۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "یقین تھا' ابھی آپ سوئی نہیں ہوں گی۔"

"بندی کو نیند کتنی آتی ہے۔" اس نے یاسیت سے کہا پھر تجسس سے بولی "آپ فرمائیے' زحمت تو آپ کو ہوئی' کہیے کیا حکم ہے؟" اور میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ "کیا لیجیے گا' چائے' قہوہ' شربت؟"

"کچھ نہیں' آپ اطمینان سے بیٹھ جائیے۔"

"یہ کیا ہوا' قہوہ بننے میں کیا وقت لگے گا۔"

"خواہش نہیں ہے۔ بس آپ سے ایک بات کر کے چل دینا ہے۔"

وہ ہمارے قریب بیٹھ گئی۔ جمرو' زورا اور بنے خاں کی متوحش نظریں مجھ پر منڈلا رہی تھیں۔ "بیگم صاحب!" میں نے کھنچی ہوئی آواز میں کہا "جو بات ہم کہیں' سوچ سمجھ کے جواب دیجیے گا۔"

"اللہ خیر کرے' ایسی کیا بات ہے سرکار؟"

"ہم سودا کرنے آئے ہیں۔" میں نے کسی لمبی تمہید سے اجتناب کیا اور اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کی "چاندنی بانو کا سودا! ہمیں اس کی قیمت بتائیے۔"

تارا بیگم کا عجب حال ہوا۔ سناٹا جیسے طاری ہو جائے' آنکھیں پھیل گئیں' چہرے پر شکنیں پڑ گئیں "کیا' کیا فرما رہے ہیں آپ؟" اس کی آواز بدل گئی تھی اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

"دیکھیے' ہمیں زیادہ بات نہیں آتی' لاگ لپیٹ تو بالکل نہیں جو بھی قیمت آپ نے چاندنی بانو کی مقرر کی ہو' ہمیں بتائیے۔"

"آپ' آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" تارا بیگم کھلی ہوئی آواز میں بولی "معاف کیجیے' آپ ہوش و حواس میں تو ہیں؟"

"ہم بالا خانے پر آئے ہیں بیگم صاحب! کچھ ناوقت ضرور ہے مگر نامناسب نہیں۔ کوئی نئی بات نہیں ہے جو آپ اس قدر حیران پریشان ہو رہی ہیں۔"

"مگر مگر۔" اس سے کچھ اور نہ کہا گیا۔

"ہم سودا کرنے آئے ہیں' سودے بازی کرنے نہیں۔ اطمینان رکھیے۔" میں نے تحمل سے کہا "ہم کمی بیشی کے لیے ایک حرف نہیں کہیں گے۔"

"مگر مگر۔" تارا بیگم بے بسی کے انداز میں بولی "بندی نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔"

"لیکن کبھی نہ کبھی تو چاندنی بانو کو آپ سے جدا ہونا ہے۔ کسی نہ کسی وقت یہ مرحلہ آ سکتا ہے' تو آج ہی کیوں نہیں' اور ابھی کیوں نہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ قبل از وقت گاہک خود چل کے منہ مانگی قیمت ادا کرنے آگے ہیں۔"

"آپ کو کیا معلوم' بانو تو میرا سرمایہ' میری جائداد' میری زندگی ہے۔ اسے کسی لائق بنانے کے لیے نہ دن کو دن سمجھا

ہے نہ رات کو رات۔ اس کے بغیر تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔"

"لیکن لڑکیاں تو ہر گھر سے ایک دن رخصت ہو جاتی ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں چاہیں گی کہ چاندنی بانو اپنے گھر میں عزت اور سکون سے زندگی بسر کرے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں' یہ زندگی نہ آپ کو پسند ہوگی نہ بانو کو۔ اسے اگر کوئی موقع مل رہا ہے تو آپ کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ بانو سے آئندہ جتنے فائدے کی آپ کو امید ہے' اسے آپ ابھی سے وصول کر لیجیے' ضرب تقسیم کر کے۔ آپ کا کوئی گھاٹا نہیں ہونے دیں گے ہم۔"

تارا بیگم جلتی بجھتی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی پھر گرفتہ آواز میں بولی "آپ نے کیسی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ بندی نے اس بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے تو جواب بھی کیا دے سکتی ہے۔"

"بیگم صاحب!" میرے لہجے میں تندی آ گئی "بہتر ہے' جو بھی بات ہو۔ آپ کھل کے کریں' ہر قسم کے اندیشے سے بے نیاز ہو کے۔"

"میں کیا کہوں۔" تارا بیگم حواس باختہ سی ہو گئی اور کہنے لگی "اچھا ہوگا' بندی کو سوچنے کی کچھ مہلت دیجیے۔"

"کیا سوچنے کی مہلت۔" میں نے ترشی سے کہا "ہمارے پاس اور کوئی وقت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے' اس طرح آپ ایک اچھا طلب گار کھو دیں۔"

"جی' جی ہاں' ہو سکتا ہے لیکن صرف قیمت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی جناب!" تارا بیگم بے اعتنائی سے بولی "ادھر ادھر بھی تو کچھ سوچنا دیکھنا پڑتا ہے پھر بانو سے بھی مشورہ کرنا ضروری ہے۔"

"بے شک' اس سے مشورہ کر لیجیے لیکن ادھر ادھر دیکھنے اور سوچنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کسی راجے نواب کا تو انتظار نہیں ہے آپ کو؟"

"اب آپ سے کیا کہوں۔" تارا بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری "اشارے تو کئی نوابوں نے کیے ہیں مگر صرف سونے چاندی کی بات نہیں ہوتی۔"

"نوابوں کے حال سے تو آپ ہم سے زیادہ واقف ہوں گی۔ بانو کو کل ضرور مل جائے گا' غالیچے' فانوس' باندیاں' شان و شوکت' پر وہ آرائش کی کوئی چیز بن جائے گی۔ بیگم تو شاید وہ نہ بن سکے۔ ہم آپ کو صاف بتا دیں' ہم اسے کسی محل حویلی وغیرہ میں نہیں لے جائیں گے' بس ایک عام سے

گھر میں' مگر وہ گھر چاندنی بانو کا گھر ہوگا' اس کی حکمرانی ہو[گی] وہاں۔"

تارا بیگم پوری طرح متوجہ تھی' منتشر لہجے میں بو[لی]

"لیکن' لیکن آپ نے ابھی تک یہ نہیں فرمایا۔ آپ میں [سے] کون' کون بانو کا طلب گار ہے؟"

"کوئی بھی! اسے افشا کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے [...] بہرحال ٹھیک ہے۔ آپ کی تسلی کے لیے کوئی مضائقہ [...] نہیں۔ ہم بنے خاں کے لیے چاندنی کو مانگ رہے ہیں۔"

بنے خاں نے آنکھیں بھینچ لیں اور زور سے میرا بازو [...] کر سر جھٹکنے لگا۔ میں نے اس کی پنڈلی دبا کے خاموش رہنے [کی] تلقین کی۔

"بنے خاں! استاد بنے خاں!" تارا بیگم حیرت سے بو[لی]

"لیکن' لیکن یہ تو۔"

تارا بیگم کے مزید کچھ کہنے سے پہلے میں نے جلدی [...] کہا "بانو کے آجانے کے بعد بنے خاں کا اڈے سے وا[...] نہیں رہے گا۔"

تارا بیگم کی ابھی ابھی نظریں بنے خاں پر بکھری [...] تھیں۔

"اور کوئی پیچیدگی ہو تو بتائیے؟" اپنے لہجے میں بر[...] مجھے خود گراں گزری' سو میں نے توقف کیا اور نرمی سے [...] "بانو کی آئندہ زندگی کے لیے بطور مہر بنے خاں ایک جائداد بھی لکھ سکتے ہیں جس کی معقول آمدنی مستقلاً [...] تحویل میں اور تصرف میں رہے اور کوئی بات؟" میں نے [...] بیگم سے پوچھا۔

"اللہ' یہ کیسی آزمائش ہے۔" تارا بیگم ناتوانی سے [...]

"مجھے معلوم ہے' آپ بندی کا امتحان لے رہے ہیں۔ [...] نے بہت دکھ جھیلے ہیں سرکار!"

"ہمیں بھی اندازہ ہے لیکن یہ سمجھیے' اب دکھوں [کے] خاتمے کا دن آ گیا ہے' سارے امتحان ختم ہوا چاہتے [ہیں۔] جانتے ہیں' آپ کا تردد بہت فطری ہے۔ ہمارا مطا[...] درخواست' کچھ بھی کہیے بہت اچانک ہے' اور ہمیں [...] کا بھی احساس ہے کہ ہم کسی راج سنگھاسن سے نہیں [...] کی چوکی سے اٹھ کے آئے ہیں۔ نوابوں کو آپ نے [...] آزما لیا' اب کچھ گلی کوچوں والوں کا بھی تجربہ کر لیجیے۔ [...] رعایت کے لیے آپ سے نہیں کہہ رہے' بیگم صاحب[ہ] قیمت بتائیے۔"

تارا بیگم کی آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگی۔ [...] رہا تھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ ہو۔ کہنے لگی [...]

[...] انداز قطعاً شاہانہ ہے اتنا بے رحمانہ بھی۔"

"صاف گوئی کو آپ بے رخی سمجھتی ہیں تو جس طرح آپ چاہیں' ہم اسی طرح بات کریں۔ ہمیں ہر حال میں چاندنی بانو کو یہاں سے لے جانا ہے اور آپ کا حق ہے کہ آپ ہر طرح اطمینان کر لیں۔"

"کیا اطمینان اور کیسا اطمینان' میاں' تقدیر کے آگے ساری ضمانتیں دھری رہ جاتی ہیں۔" تارا بیگم کے لہجے میں بیزاری بھی تھی' بے رخی بھی۔ "عورتیں غریب تو تقدیر کے معاملے میں ویسے ہی ہوتی ہے اور کیا آقا' کیا غلام۔ کیا راجا' کیا پرجا' موت تو سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اپنا تو یہی دیکھا ہوا ہے۔ دریا میں طغیانی آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ بنے خاں کا سمندر بھی کل اتر سکتا ہے۔"

"تو پھر باقی بانو کی تقدیر پر چھوڑ دیجیے۔ آدمی اپنی جیسی کرتا ہے' آنے والے کل کے بارے میں نہ آپ کچھ کہہ سکتی ہیں نہ ہم۔ یہاں بالا خانے پر چاندنی کو بٹھانے کے لیے آپ کل کے لیے یقین سے کیا کہہ سکتی ہیں۔ جس حد تک ہمارے امکان میں ہے' بانو کے تحفظ کے لیے ہم آپ سے کہہ ہی چکے ہیں۔"

تارا بیگم کش مکش میں پڑ گئی۔ دیر ہو گئی' وہ کچھ نہ بولی تو جمو نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا "اتنا سوچنے کو کیا ہے تارا بیگم! ایسے گاہک کدھر آتے ہیں۔ سمجھو قسمت کی بات ہے۔ اب کیا الجھن ہے۔ سارا کچھ ہم نے تم پر رکھا ہے۔ فٹا فٹ فیصلہ کرو' کھل کے بولو۔"

"کیا بولوں۔" تارا بیگم ہیجانی لہجے میں بولی "آپ ہی [...]"

"سچ تمہاری ہے' ہم تو گاہک ہیں۔"

"بندی کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔"

"کیوں؟ ہم نے تو کھلی چھوٹ دی ہے تم کو۔" جمو نے [...] راضی سے کہا "بے فکری سے زبان کھولو۔"

تارا بیگم کے ہونٹ لرزنے لگے۔

"پھر بھی کچھ بولیں' پچاس ہزار! ایک لاکھ!"

"دو لاکھ۔" میں نے بہ عجلت اضافہ کیا۔

تارا بیگم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"یہ کیا کیا ہو رہا ہے' نہیں نہیں۔" بنے خاں ہذیانی انداز میں بولا اور اٹھ جانے کے لیے مجھے جھنجھوڑنے لگا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے کسی رمز و کنایہ کا تاثر دیا اور بنے خاں سے چپ چاپ بیٹھے رہنے کو کہا۔ سب کچھ صاف تھا۔ ایسا بنے خاں جیسا شخص اس طرح کیسے مان جاتا۔ وہ بگڑنے لگا اور

میرے بجائے اس نے جمو سے تلخ و تند لہجے میں واپس چلنے کے لیے اصرار کیا۔ جمو نے توجہ نہیں دی اور اپنی جگہ جما بیٹھا رہا تو بنے خاں خود اٹھ گیا۔ جمو نے اس کی کلائی پر پنجہ ڈال کے ایک جھٹکے سے بٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ بنے خاں زیادہ مچلے اور بپھرے' جمو نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا "تارا بیگم! کیا وچار ہیں؟ اتنے دھن سے اپنی بانو تو دکان بڑھا کے دانے ٹھکاؤ' باقی پھر ہریالی ہے۔"

تارا بیگم نے جھرجھری سی لی۔

"اب کیا ہے؟" جمو نے ترخ کے کہا۔

"کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں۔" تارا بیگم ہڑبڑا کر بولی۔

"کل دو خون ہو گئے ہیں' آگے دو چار اور بھی لٹ سکتے ہیں۔" جمو نے منہ بگاڑ کے کہا "کیا سمجھتی ہو' کل سے شہر میں ہلڑ مچا ہوا ہے۔ سارے میں آگ لگی ہے۔"

"معلوم ہے۔" تارا بیگم مایوسی سے بولی۔

"معلوم ہے تو پھر۔۔۔؟"

"بانو سے بھی کچھ پوچھنا ہوگا۔"

"اس سے پوچھ کے بالا خانے میں بٹھایا ہے کیا؟"

"وہ میری بیٹی ہے۔"

"پھر ماں کی طرح سوچو' اپنا توشہ بھی ہزاروں میں ایک ہے۔" جمو نے بنے خاں کی ران پر ہاتھ مار کے کہا "پورا اصیل ہے۔"

"جانتی ہوں خدا نظر بد سے بچائے۔" تارا بیگم کے لہجے میں مصنوعی شیدائیت تھی "ہزاروں میں کیا' لاکھوں میں ایک ہے۔"

"پھر دیر کس بات کی ہے؟"

"اب ایسا تو نہیں ہوتا صاحب!"

"ہم لوگ اتنا نہیں سوچتے۔"

"لیکن یہ تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔"

"سوچ لو' لکشمی بار بار گھر نہیں آتی۔"

"کچھ وقت تو دیجیے۔"

"پھر وقت نکل نہ جائے۔"

میں نے جمو کو روکا اور تارا بیگم سے پوچھا "کتنا وقت لیں گی آپ؟"

"بندی اس وقت کیا کہہ سکتی ہے۔"

"ہمیں کل یہاں سے چلے جانا ہے۔"

"اور کل کا بھاؤ پھر کل ہی دیکھیں گے۔" جمو نے بپھر کے کہا۔

"بندی ایک بات پوچھنے کی جسارت کرے۔" تارا بیگم

اٹک اٹک کے بولی "آپ کے خیال میں بندی کو باتو پر کتنا اختیار ہے۔"

"کیا مطلب؟" جمرو نے چونک کے کہا۔

"میرا مطلب ہے 'کتنا اختیار ہونا چاہیے۔" تارا بیگم نے وضاحت کی اور تیورا کے بولی "بندی کو انکار کا اختیار ہے نا؟"

"کیا گھما پھرا کے بولتی ہو تارا بیگم! پھر تم سے اتنا سہارنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہاں' آپ انکار کر سکتی ہیں۔" میں نے جمرو سے صبر و ضبط کی التجا کی اور تارا بیگم سے کہا "انکار کا کوئی جواب تو ہوگا۔"

"بتانا ضروری تو نہیں ہے سرکار!"

"لیکن وجہ جانے بغیر شاید ہم یہاں سے نہ جائیں۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"کیا اتنا کافی نہیں کہ بندی ابھی بانو کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتی۔"

"ہاں' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور میں نے جز بز ہو کے کہا "ٹھیک ہے' پھر ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔"

"نہیں تارا بیگم! ایسے نہیں' بالکل نہیں۔" جمرو جھنجھلی آواز میں بولا "ہم جائیں گے' پھر کوئی اور بات ہے' تم ہم لوگوں سے سودا کرنا نہیں چاہتیں۔ تم کو بول دیویں کسی بھی طرح سے ہم آ سکتے تھے پھر بولی نہیں لگاتے اور طریقے بھی ہم کو آتے ہیں' سمجھیں!"

"جس لہجے میں آپ نے بات کی ہے' بس اسی تک رکھیے استاد!" تارا بیگم کی آواز میں برہمی کی لرزش نمایاں تھی۔

"تم بھی صاف بات نہیں کر رہی ہو' اس واسطے ایسا بولتے ہیں۔" جمرو نے بپھر کے کہا "من میں کوئی تنکا ہو تو نکال باہر کرو تارا بیگم! ایک بات پر دھیان رکھنا۔ جو اتنی بڑی ڈھیر چلا رہا ہے وہ اس چیز کو بھی تم سے زیادہ سنبھال کے' سینت کے رکھے گا۔"

تارا بیگم سنتی رہی۔ ادھر بنے خاں مسلسل پیچ و تاب کھا رہا تھا "شہزادے بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" تارا بیگم نے طنز آمیز لہجے میں بنے خاں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں' میں کیا؟" بنے خاں بوکھلائے ہوئے انداز میں ہاتھ پھیلا کے رہ گیا اور خالی خالی نظروں سے میری اور جمرو کی شکلیں دیکھنے لگا۔

"استاد بنے کے بولنے کو اب کیا دھرا ہے تارا بیگم!" جمرو نے زہریلی آواز میں کہا "بولی بڑھوانے کا خیال ہ
صاف بول دیو۔ تم کو ہم سے زیادہ پتا ہے کہ اب نیلامی کا
نہیں ہے اور لکھنؤ کے راجوں نوابوں میں کتنا دم ہے۔
باپ دادا کی جاگیر کے پیچھے پڑا ہے تو ٹٹول لو۔ مل جائے تو
بار اس حاتم کی اولاد کا دیدار اپنے کو ضرور کروا دینا۔"

تارا بیگم بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

جمرو کے اشارے پر ہم سب اٹھ گئے۔

تارا بیگم کو ہمارے اس طرح اٹھ جانے کی توقع تھی۔ وہ بے تاب ہو گئی "آپ' آپ جا رہے ہیں؟"

"جانا ہی ٹھیک ہے۔" دروازے کی طرف جاتے
جمرو نے لوٹ کے کہا "اپنا بھیجا جلدی گھوم جاتا ہے۔"

"لیکن' لیکن یہ کیا... نہ شربت نہ قہوہ' نہ... کم
ایک گلوری تو...!"

"آئیں گے پھر' دیکھو شاید جلدی۔" جمرو نے
بھناتے ہوئے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ
زینے سے اترتے ہی بنے خاں ہم دونوں سے چمٹ گیا
کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ بری طرح وہ اپنا سر
سینے سے رگڑنے لگا۔ اوپر تارا بیگم کے بالا خانے
دریچوں' چلمنوں سے ہم اوجھل نہیں ہوئے تھے۔ جمرو
کسی طرح بنے کو سنبھالا اور اس کا بازو پکڑ کے تقریباً
بالا خانے سے دور لے گیا۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر
گلی سے نکل آئے۔ روشنیاں اور کم ہو گئی تھیں۔ کئی
بالا خانے پر ابھی تک محفل جمی ہوئی تھی۔ اکا دکا
کھلی تھیں۔ بازار سے نکلتے ہی پان کی پہلی دکان پر زور
کیا اور تب سب کی نظریں بے اختیار بنے خاں کے
جا ٹھہریں۔ دکان کی تیز روشنی میں اس کے چہرے کی
نمایاں ہو گئی۔ زورا سے گڑگڑانے لگا۔ بنے خاں
آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں' ہونٹ سسک رہے
نہ جانے کیا کہا تھا کہ بنے خاں بے تحاشا میرے
لگ کے بڑبڑانے لگا۔ یہ محض ممنونیت کا اظہار نہیں
اپنے احوال سے خود بھی واقف نہیں ہوتا۔ بنے
وحشت یقیناً کسی گزشتنی کا غبار تھی۔ ہر آدمی فسانے
پھرتا ہے' کبھی ایک تنکا' ہوا کا ایک جھونکا آئینے
گراں ہو جاتا ہے۔ پان والا بھی تنگ ہو گیا تھا۔
زورا' بنے خاں کو تھپکنے' تسلیاں دینے لگے۔ بہت
انہوں نے اسے قابو میں کیا۔ تانگا قریب ہی
گلوریاں ساتھ لے کے ہم نے تیزی سے تانگے کا رخ
اڈے پر رت جگے کا منظر تھا۔ رنگ برنگی جھنڈ

ساری گلی سجی ہوئی تھی۔ اڈے کی عمارت کی دیواروں اور منڈیروں پر چراغ روشن تھے۔ عمارت کے باہر اور اندر خاصی تعداد میں لوگ انتظامات میں مصروف تھے۔ "دیکھا استاد!" جمرو نے بنے خاں کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "ایسا میلا تو اپنے استاد بتھل کے واں بھی نہیں ہوتا۔"

بنے خاں نے کوئی جواب نہیں دیا تو جمرو نے پچکارتے ہوئے کہا "بس ابھی سارا بھول کے راجا بن کے گدی پر بیٹھنا۔ اس کے بعد کو ادھر کو دیکھیں گے۔ سنا ہے' کبن خاں کے اڈے پر بہت الٹا سیدھا ہوا ہے۔ کئی حرام کے جنے بنانے لگے ہیں۔"

بنے خاں کی خاموشی پر جمرو نے اسے کہنی ماری "ایسا کیا استاد! بولتی سسری کیوں بند ہو گئی' اب ادھر سے لوٹ آؤ بھیا اور دیکھنا' تارا بیگم کو آج نہیں تو کل بلانا ہے۔ ادھر کی بات بس [illegible] کی سمجھو۔"

بروقت تمام بنے خاں نے پژمردگی سے کہا "نہیں جمرو! ایسا تو اچھا ہی ہوا' اس نے منع کر دیا۔ میں تو... میں تو..." اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ کہنے لگا "بس اتنا' اتنا بہت ہے۔"

بنے خاں نے ایک نظر میری طرف دیکھا' کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا' سر جھکائے ہوئے آگے چوکی کی طرف چلا گیا۔ شمشاد خاں اور بتھل اڈے کے کئی آدمیوں کے ہجوم میں گدی پر بیٹھے تھے۔ کچھ وقت ان کے ساتھ گزار کے ہم اوپر اپنے کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی زورا اور جمرو نے مجھے دبوچ لیا اور میرے ہاتھ اور پیشانی چومنے لگے۔ وہ تو جیسے اس جنت کے منتظر تھے۔ مجھے ان کی دیوانگی کا سبب معلوم تھا۔ ان کی شدت کم کرنے کے لیے یہی مناسب تھا کہ میں ان سے کسی ندامت اور انکسار کا اظہار نہ کروں۔ یہی ہوا۔ جلد ہی انہیں قرار آ گیا۔ ان سے نجات ملی تھی کہ کچھ ہی دیر میں بنے خاں کمرے میں آ گیا۔ دیوانگی کے آثار ابھی تک اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے' میرے پاؤں پکڑ کے کہنے لگا کہ تارا بیگم کی طرف سے اقرار میں جواب آئے تو میں بے شک مسترد کر دوں۔ میں نے پوچھا "آخر کیوں؟"

وہ کھنکتی آواز میں بولا "یہ میری مرضی ہے۔"

میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم زبان دے کے آئے ہیں۔ بنے خاں کو یاد تھا کہ جمرو نے تارا بیگم پر اچھی طرح [illegible] کر دیا تھا "آج کی بولی آج پر ہے۔ کل کے بارے میں ہم نہیں کہہ سکتے۔" میں نے کہا۔ اگر تارا بیگم مان جاتی ہے تو آج اور کل سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بات تو اصل میں جمرو نے تارا بیگم پر زور ڈالنے کے لیے کہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ آدمی کی قیمت ہر رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی کا تو کوئی مول ہی نہیں ہوتا اور وہ تو چاندنی بانو ہے۔ اس رقم سے کوئی مصور یا بت تراش چاندنی بانو کا پیکر نہیں تراش سکتا۔ بنے خاں سنتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے محض رقم کی فکر ہے؟ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے بتائے کیا چاندنی اسے مطلوب نہیں؟ یہ محض اتفاق ہے کہ اس کے بجائے میں بولی لگانے پر قادر ہوں۔ میں نے طرح طرح سے بنے خاں کا تکدر دور کرنے' اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس رقم کے چلے جانے سے میں قلاش نہیں ہو جاؤں گا اور مجھے یوں بھی روپے پیسے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ بنے خاں نے بہت پہلو بدلے' انگلیاں توڑتا' ہونٹ چباتا رہا۔ ادھر جمرو اور زورا نے دلیلیں تراشنی شروع کر دی تھیں۔ بنے خاں کشمکش رنج کی حالت میں واپس چلا گیا۔

○☆○

صبح سب کی آنکھ دیر سے کھلی۔ ناشتے ہی کا وقت ملا' پھر بنے خاں کی چوکی پر بیٹھنے کی رسم ادا کرنے کا سمے آ پہنچا۔ ہم تینوں نیچے آئے۔ عمارت میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہر سو شور گونج رہا تھا۔ سامنے چوکی کے ایک طرف مٹھائی اور پھولوں کی ٹوکریاں رکھی تھیں۔ لوبان اور اگر بتیوں کی خوشبو ساری عمارت میں بسی ہوئی تھی۔ چوکی پر شمشاد خاں اور بتھل کے درمیان چکن کے سفید کرتے' پاجامے' عنابی واسکٹ میں ملبوس بنے خاں' سر پہ کیسرے رنگ کا صافہ باندھے بیٹھا تھا' گلے میں سونے کی زنجیر' کان میں دریا' ہاتھ میں چاندی کا کڑا' کمر کے گرد منقش چری پیٹی' برات کے دولہا جیسا' صرف شیروانی کی کسر تھی۔ چہرے پر ابھی تک آگ دہک رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کے کچھ مضطرب ہو گیا۔ ہمارے پہنچنے کی دیر تھی کہ شمشاد خاں نے بتھل سے جلدی کی درخواست کی۔ سورج خوب چڑھ چکا تھا' زوال کے بعد لکھنؤ میں چوکی نشینی کی رسم معیوب سمجھی جاتی تھی۔

بتھل کے سامنے رکھی ہوئی کوری ہانڈی میں دودھ بھرا تھا' ہانڈی کے اطراف دو عدد کلھڑ رکھے تھے۔ ہانڈی سے دودھ لوٹ کے بتھل کو پہلے شمشاد خاں کی طرف کلھڑ بڑھانا تھا' پھر شاید ایک گھونٹ بھر کے بنے خاں کے سپرد کر دینا تھا۔ ایک دو گھونٹ پی کے بنے خاں کو کلھڑ کا دودھ ہانڈی میں لوٹ دینا تھا پھر ہانڈی کا دودھ مختلف جگہوں پر رکھے ہوئے شربت سے بھرے بڑے بڑے برتنوں میں شامل کیا جاتا تھا۔ یہ شربت سارے مجمع میں تقسیم ہوتا تھا لیکن شربت کی تقسیم سے پہلے

بنے خاں کو اپنا چاقو شمشاد خاں کے پیروں پر رکھنا تھا' جواب میں شمشاد خاں کو اپنا چاقو بنے خاں کے حوالے کرنا تھا۔ سلگتے ہوئے لوبان کے برتن میں لوہے کی ایک سلاخ بھی نظر آرہی تھی۔ ممکن تھا کہ اس جلتی ہوئی سلاخ سے بنے خاں کے بازو یا گردن پر داغ ڈالا جائے۔ شمشاد خاں اور بٹھل کو اپنے خون سے بنے خاں کو تلک لگانے کی رسم بھی انجام دینی تھی۔ اس کے جواب میں بنے خاں کو کوئی نس کھول کر اپنا خون لوبان کے برتن میں ٹپکانا تھا۔ مختلف جگہوں پر چوکی سنبھالنے کی اپنی اپنی رسمیں ہوتی تھیں۔ بکروں کا صدقہ' لنگ' امام ضامن وغیرہ۔ کسی جگہ اڈے کے ہر آدمی کی طرف سے چوکی کے دادا کی خدمت میں نقدی کے علاوہ خون کی نذر بھی پیش کی جاتی تھی۔ لکھنؤ کی بات تو ویسے بھی جداگانہ تھی۔ مجھے کچھ زیادہ علم نہیں تھا کہ یہاں اور کیا کیا رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔

عمارت میں خاموشی چھا گئی تھی۔ بٹھل نے ہانڈی سے دودھ لوٹ کے کٹورے شمشاد خاں کی طرف بڑھایا' شمشاد خاں نے ایک گھونٹ بھر کے بٹھل کو واپس کردیا۔ بٹھل نے بھی گھونٹ بھر دودھ پیا اور کٹورا بنے خاں کے سپرد کیا ہی چاہتا تھا کہ اس کا ہاتھ ٹھہر گیا۔ اسی دم دائیں طرف' چوکی سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر ایک پستہ قد' کٹے پھٹے چہرے کے آدمی نے کھڑے ہو کے بلند آواز میں بٹھل اور شمشاد خاں کو مخاطب کیا اور انہیں یاد دلایا کہ وہ ایک اہم رسم کی ادائی سے کوتاہی کر رہے ہیں۔ انہیں عمارت میں موجود لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ کوئی دوسرا تو اڈے کی چوکی کا طلب گار نہیں ہے؟

یکایک ہر طرف شور مچنے لگا۔ شمشاد خاں بھڑک اٹھا۔ "کیا؟ کیا! کیسی بات کرتا ہے خنزیر کی اولاد! کیا تو' تو چوکی پر آنا چاہتا ہے؟ تجھ کو... تجھ کو..." شمشاد خاں کے جملے پر عمارت میں قہقہے گونجنے لگے۔

وہ شخص نہیں بیٹھا' کسی قدر کھسیا کر بولا "میں تو ریت کی بات کرتا ہوں استاد!"

شمشاد خاں کی گالی گفتاری عمارت میں اٹھنے والے شور میں گم ہو گئی۔

بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے سب کو خاموش کیا اور اونچی آواز میں کہا "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ ابھی کوئی بنے خاں کی جگہ اڈے کی چوکی واسطے اپنے آپ کو آگے کرتا ہے تو بول دے۔"

شمشاد خاں کی ناراضگی اس لمحے پراگندگی اور حیرانی سے دو چار ہوئی جب ٹوکنے والے آدمی کے قریب بیٹھا ہوا سانولی رنگت اوسط قد' تیکھی دست' و بازو کا ایک پختہ [illegible] نوجوان کھڑا ہوا' سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ عمارت میں سناٹا ہو گیا "تو' تو اپنا رجن!" شمشاد خاں [illegible] ہوئی آنکھوں سے بولا "کیا بات ہے؟ اب تجھ کو بھی [illegible] سو جھی ہے؟"

بٹھل نے مسکراتے ہوئے شمشاد خاں کو تسلی سے [illegible] رہنے کو کہا اور رجن نامی نوجوان سے پوچھا "تو ادھری [illegible] چاہتا ہے رے۔"

رجن نے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ [illegible] کا سینہ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں [illegible] چمک تھی۔

"ٹھیک ہے۔" چند لمحوں کے سکوت کے بعد بٹھل آہستگی سے کہا اور بنے خاں کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"اچھی طرح سوچ لے رجن! بولتا ہوں' اندر جا [illegible] ایک بار شیشہ دیکھ لے۔" شمشاد خاں کی آواز میں بہت [illegible] تھی۔ "یہ مسخری بہت مہنگی پڑے گی تجھ کو ایمان سے۔"

رجن نے شمشاد خاں کی بات سنی ان سنی کر دی۔ [illegible] خاں سے برداشت نہیں ہوا' مشتعل ہو کے بولا "کیا منہ [illegible] کیا تھا تیرا' یا نشہ کر کے آیا ہے۔"

بٹھل نے آنکھوں آنکھوں میں شمشاد خاں کو سمجھ[illegible] کی کوشش کی کہ اب اس غیظ و غضب سے کچھ حاصل [illegible] ہوگا۔"

رجن سر اٹھائے' سینہ پھلائے کھڑا رہا۔

بٹھل کے حکم پر چوکی کے سامنے کا حصہ خالی کرا[illegible] جگہ پہلے ہی بہت تنگ تھی۔ لوگوں کے پیچھے ہٹنے سے [illegible] سی ہو گئی لیکن جلد ہی سکون ہو گیا۔ بنے خاں نے صاف [illegible] دیا اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا چاقو اچھالتا ہوا خالی [illegible] والے دائرے میں آگیا اور دوسری جانب سے رجن بھی [illegible] بنے خاں کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

عمارت میں سب ہی کی سانسیں جیسے رک گئی [illegible] شمشاد خاں چوکی کے کنارے پر آگیا۔ وہ مسلسل [illegible] پھنکار رہا تھا۔ بٹھل بھی اپنی جگہ سے اٹھ کے شمشا[د خاں] کے برابر بیٹھ گیا۔

بنے خاں کی تقلید میں رجن نے بھی اپنا چاقو [illegible] آگے کر دیا۔ بٹھل نے دونوں چاقو ایک نظر دیکھے [illegible] رجن کی طرف پھر بنے خاں کی طرف اچھال دیے [illegible] نے چابک دستی سے چاقو اچک لیے۔

"بولتا ہوں مان جا' گینڈ روالی بات نہ ہو جائے سالے۔"

شمشاد خاں نے دہاڑتے ہوئے رجن کو تنبیہ کی۔

رجن کی بے اعتنائی پر شمشاد خاں تلملا کے رہ گیا۔

بنے خاں اور رجن نے روایتی انداز میں دائرے کا ایک چکر پورا کیا اور دونوں نے ٹھہر کے خوں بار نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیا۔ رجن ہاتھ ملانا چاہتا تھا لیکن بنے خاں نے توجہ نہیں دی اور چاقو لہراتا ہوا دو قدم آگے بڑھ گیا۔ اس کی چستی سے میری طرح جمرو اور زورا کو بھی اطمینان ہوا ہوگا۔ رجن نے بنے خاں کے مقابلے میں احتیاط کا ثبوت دیا بلکہ کسی حد تک جھجک کا۔ بنے خاں آہستہ آہستہ فاصلہ کم کرتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور اس نے آناً فاناً ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو بدل کے اپنی برتری کی دھاک بٹھانا چاہی۔ رجن اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے نرغے سے پہلو بچا کے دوسری طرف ہو گیا۔ بنے خاں نے بھی پیش قدمی جاری رکھی اور دوبارہ گھیرا تنگ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ رجن غالباً یہی چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ بنے خاں ارد گرد اس کے پیچھے ہٹنے کے لیے کوئی جگہ نہ چھوڑے اور دائیں بائیں نکلنے کی کوئی گنجائش نہ رہے' اس نے اپنی گزشتہ روش ترک کی اور پھرتی سے اچھل کے بنے خاں سے مڈبھیڑ کی ٹھان لی۔

دونوں کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ بنے خاں نے غلط اندازہ لگایا تھا' اس کا خیال تھا کہ رجن کو وہ اور پیچھے ہجوم کی طرف لے جائے گا۔ رجن کے اس اچانک اقدام کا نتیجہ بنے خاں کے لیے مہلک ہو سکتا تھا۔ وہ اتنی جلدی الٹے قدموں پیچھے نہیں ہو سکتا تھا حالانکہ اس کے عقب میں دائرہ خالی پڑا تھا۔ بس بنے خاں کا دماغ ایک سو تھا' یکایک وہ بیٹھ گیا۔ اب اسے بڑی تن دہی سے کام لینا تھا' اس کے ہاتھ رجن کی ٹانگوں کی طرف بڑھے' ٹانگیں گرفت میں آجانے کی صورت میں رجن کا توازن بگڑ جانا لازم تھا۔ اسے مجمع کی جانب پیٹھ کے بل گرنا چاہیے تھا مگر رجن کو جیسے اس اندیشے کا احساس تھا۔ اس نے حواس مجتمع رکھے اور جست کے انداز میں بیٹھے ہوئے بنے خاں کا جسم پھلانگ لیا۔ اسی کشمکش میں وہ گرتے گرتے بچا اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ اگر کہیں رک کے اور پلٹ کے بنے خاں پر وار کرنے کا ارادہ اس کے ذہن میں آجاتا تو اسے مہلت نہ ملتی کیوں کہ اس اثنا میں بنے خاں کھڑا ہو چکا تھا اور اس کا رخ رجن کی طرف تھا۔ بنے خاں نے بس ایک لمحے کا توقف کیا ہوگا کہ بجلی کے مانند پھر اسی طرف بڑھا۔ رجن بھی پر تول چکا تھا۔ دائرہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ دونوں کو دوبدو ہونے میں چشم زدن کا عرصہ لگا لیکن قریب آکے کوئی داؤ آزمانے کے بجائے رجن پھر جھکائی دے کے نکل گیا۔ کئی بار اس نے یہی کیا' سامنے ہو کر ایک دم کسی جانب نکل جاتا۔ اس صورت حال سے دیکھنے والوں کا یہی تاثر ہونا چاہیے تھا کہ رجن پر اپنی کم تری کا کوئی احساس غالب ہے' اس نے نادانی میں بنے خاں سے تیغ آزمائی کا دعوا کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے' بعض لوگ اسے بنے خاں اور رجن کی ادلی بدلی ملی بھگت بھی سمجھ رہے ہوں۔ یہ بدگمانی بہرحال زیادہ دیر قائم رہنے والی نہیں تھی۔ ابھی تک یہی کہا جا سکتا تھا کہ رجن سامنے کے داؤ سے پہلوتہی کر رہا ہے اور کسی ایک موقع کی تلاش میں ہے اور بنے خاں کو مشتعل کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے یا اسے بنے خاں کی کسی کمزوری کا علم ہے۔ اسے اپنی استقامت کی کوئی خوش فہمی ہے اور وہ بنے خاں کو پہلے خوب تھکا دینا چاہتا ہے۔ اس طوالت سے رجن کو ایک اور فائدہ بھی تھا کہ چشم دید گواہ شاہد رہیں' اس نے یہ معرکہ کسی فریب سے سر نہیں کیا ہے' مقابلہ تو اس ناتواں نے خوب کیا ہے۔ اس طوالت میں بنے خاں کی توہین کا پہلو بھی مضمر تھا۔

عمارت میں گاہے بہ گاہے بے چینی کی بھن بھناہٹ ہوتی اور خاموشی چھا جاتی۔ بنے خاں کی پیشانی پر رجن کی اس آنکھ مچولی سے شکنیں پڑنے لگی تھیں۔ اسے بھی رجن کے کس بل سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے تھا۔ دونوں ایک ہی اڈے سے وابستہ تھے' عمر میں بھی کوئی ایسا فرق نہیں تھا۔ کمین خاں اور شمشاد خاں کی تربیت سے رجن نے بھی استفادہ کیا ہوگا۔ یہ کلیہ بنے خاں کو اچھی طرح ذہن نشین ہوگا کہ ناپختہ کار مقابل پر ذرا سی رعایت واجب نہیں اور دو فریقوں میں ایک کو فتح ہوتی ہے' دوسرے کو شکست۔ دونوں کے پاس چاقو تھا۔ ہتھیار سمیت زور اور سادے زور میں فرق ہے۔ ہتھیار بھی کبھی بہک بھی جاتا ہے۔ ذرا سی کوتاہی ہو جائے تو بس! ضروری نہیں کہ ازالے کا وقت مل جائے۔

رجن کی پھرتی کسی طور پر بنے خاں سے کم نہیں تھی۔ وہ بنے خاں کو ادھر سے ادھر گھماتا رہا۔ بنے خاں نے ہر بار ہوش مندی کی۔ اسے معلوم ہوگا کہ حریف کسی بھی لمحے ارادہ بدل سکتا ہے اور یہی ہوا۔ رجن نے سامنے آکے کسی طرف نکل جانے کا تماشا نہیں کیا بلکہ جھکی دے کے بنے خاں کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پر پنجہ ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ اچانک جھپٹ پڑا تھا۔ بنے خاں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور اپنی کلائی رجن کے پنجے میں آسانی سے تھمادی جیسے جان

بوجھ کے۔ رجن کو اندازہ تھا کہ جواباً بنے خاں اس کے چاقو والے ہاتھ پر پنجہ ڈالنے کے لیے مضطرب ہوگا۔ چنانچہ جسم ترچھا کر کے اس نے چاقو والا ہاتھ دوسری طرف پھیلا لیا۔ ایک ہاتھ مخالف سمت پھیلا کے دوسرے ہاتھ سے مقابل کا چاقو والا ہاتھ قبضے میں رکھنے کے لیے بڑی مشاقی اور زور کی ضرورت پڑتی ہے۔ رجن کے پنجے میں جیسے ہی بنے خاں کی کلائی آئی' وہ کلائی کو جھٹکا دینے کے لیے زمین سے اچھل گیا' دوسری جانب بنے خاں نے اسی وقت اپنا دوسرا ہاتھ رجن کے قریب کیا۔ یہ ایک اضطراری اقدام بھی تھا لیکن اس کا ارادہ رجن کے چاقو والے ہاتھ پر قبضہ کرنے کا نہیں تھا۔ رجن کا پھیلا ہوا ہاتھ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ اس کے لیے اسے تیزی سے گھوم جانا چاہیے تھا۔ وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ اپنا ہاتھ رجن کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش میں کھینچا تانی جاری رکھے اور ساتھ ہی چکر کھانے شروع کر دے۔ فریق وہیں گھبرا جاتا ہے جب جواب اس کی توقع کے برعکس ہو۔ رجن ادھر بنے خاں کی کھینچا تانی سے اس کی کلائی... پر اپنے پنجے کی گرفت اور مضبوط کرتا' ادھر اپنا چاقو والا ہاتھ بنے خاں کی دسترس سے بچانے کے لیے بنے خاں کے ساتھ گھومتا رہتا اور یا تو کسی ناگہانی کے اندیشے میں بنے خاں کا ہاتھ آزاد کر دیتا یا دوسرے تیسرے چکر میں اچانک ٹھہر کے اپنا چاقو والا ہاتھ آگے کر دیتا دوسرے لفظوں میں گھومتے گھومتے دفعتاً بنے خاں سے بھڑ جاتا۔ بنے خاں نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ اس نے گھوم کے رجن کا چاقو والا ہاتھ قبضے میں لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے رجن کی تھوڑی کو نشانہ بنایا۔ رجن سے ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ اس کے اچھلتے ہی بنے خاں نے اس کی تھوڑی پر ضرب لگائی۔ عجلت میں ضرب پھسلتی ہوئی لگی۔ رجن نے بنے خاں کا ارادہ بھانپ کے فوراً ہی اس کی کلائی چھوڑ دی اور بنے خاں کے سامنے اپنا چاقو والا ہاتھ لہرایا۔ بنے خاں کو اس افتاد کی وجہ سے قدم بھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ ضرب سے رجن کا توازن بگڑ سکتا تھا لیکن وہ فاصلہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں دوبارہ دور جا کھڑے ہوئے۔

بنے خاں نے اب اتنی جلدی نہیں کی۔ ابتدا میں تیزی کا مطلب مقابل کو دباؤ میں رکھنا ہوتا ہے۔ بنے خاں کی سرخروئی اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد یہ معاملہ نمٹا دے۔ رجن کو اتنی نہیں ہوگی جتنی بنے خاں کو اپنی عزت کی فکر ہوگی۔ ابتدا میں تیزی کا سبب غم و غصہ بھی ہوگا۔ عین وقت پر یہ رخنہ اندازی بڑی نازیبا تھی۔ شمشاد خاں اور اڈے کے بہت سے لوگوں کے سان و گمان میں نہ ہوگا کہ ان کے اڈے کا ایک آدمی اس طرح چوکی کی دعوے داری کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا۔ اڈوں پر عموماً ایسا ہوتا نہیں۔ دو دن سے انتظامات ہو رہے تھے۔ لوگ ہمارے آنے سے پہلے بھی یہی سمجھتے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ شمشاد خاں' کبن خاں مرحوم کی جانشینی کے لیے بنے خاں کو تیار کر رہا ہے۔ تیاری صرف بل کی نہیں ہوتی۔ بل بے شک بہت بنیادی چیز ہے لیکن اصل بل تو دماغ کا ہوتا ہے۔ دماغ متناسب نہ ہو تو دست و بازو کی طاقت میں بھی آدمی کو کھرا ہونا چاہیے۔ لوگوں کو قابو میں رکھنے' مشکل وقت پر مناسب فیصلے کرنے اور اڈے پر بل اور ہتھیار کی تربیت کا کام آسان نہیں ہوتا۔ اثر و رسوخ' سب کا خیال ہوتا ہے۔ کبن خاں کے بعد شمشاد خاں اسی لیے اڈے پر آ کے بیٹھا تھا۔ اب اگر اڈے کے برگزیدہ استاد کی خواہش یہی تھی اور بات طے ہو چکی تھی تو اڈے کے تمام لوگوں کو اس کا احترام کرنا چاہیے تھا۔ کم سے کم کچھ عرصے کے لیے بنے خاں کے جوہر آزمانے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ نا اہل استاد ویسے بھی کتنی دیر تک برقرار رہ سکتا ہے۔

اڈے کے کئی آدمی بل میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے ہو سکتے ہیں مگر چوکی پر کبھی تو نہیں بیٹھ سکتے۔ باقی سال زور والے ایک مرتبہ کسی کو چوکی پر بٹھا کے اسی کو واجب عزت سمجھتے ہیں۔ آج کا ناپختہ کار آدمی محنت اور جستجو اور زور آزمائی کی مسلسل مشق سے کل کسی لائق ہو سکتا ہے تو کیا اسے سینہ پھلا کے چوکی کا دعوے دار ہو جانا چاہیے۔ مگر ہے' اڈے کے چند لوگ بنے خاں کو ناپسند کرتے ہوں اور اس کی جگہ رجن کو چوکی پر دیکھنے کے طلب گار ہوں لیکن ظاہر ہے' انہیں اس خواہش کے اظہار کے لیے کسی نے روکا تو نہیں ہوگا۔ ان کی خاموشی رضامندی کے مترادف تھی۔ رجن اور اس کے چند ہم نواؤں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے تھی کہ اڈے کے بیشتر آدمی ذہنی طور پر بنے خاں کو چوکی کا مختار سمجھ چکے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو چوکی نشینی کی رسم میں یہ میلا ٹھیلا اور دھوم دھڑکا نظر نہ آتا۔ رجن کو عواقب پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔ بنے خاں کو زیر کرنے کی صورت میں وہ اڈے کا دادا تو بن جائے گا لیکن اتنے آدمیوں کی ناپسندیدگی کے ماحول میں وہ چوکی پر کس طرح اطمینان سے بیٹھ سکتا ہے۔

شمشاد خاں کی آنکھوں میں شعلے بھرے تھے۔ اتنی دیر میں رجن نے اپنی چابک دستی اور چستی کا مظاہرہ خوب کیا تھا۔ اس کا طور طریق بڑی حد تک دفاعی مگر سوجھ بوجھ کی علامت تھا۔ شمشاد خاں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رجن کے لیے آخری درجے کا کوئی فیصلہ کیوں کر سنائے۔ بٹھل' تھے کی نے ہونٹوں میں دبائے ساکت بیٹھا تھا۔ دائرے میں بنے خاں اور رجن ایک دوسرے کو زچ کرنے کے لیے مختلف داؤ آزما رہے تھے اور کسی کو اب تک کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ دونوں بہت محتاط تھے۔ احتیاط تو ایک لازمہ ہے مگر حد سے زیادہ کوئی چیز بھی شاید اچھی نہیں ہوتی' عمارت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ جمو اور زورا کے چہرے بھی سوج گئے تھے۔ بنے خاں نے پھر جرأت کی۔ وہ دائرے کے وسط میں بت کے مانند کھڑا ہو گیا۔

عمارت میں ایک غلغلہ بلند ہوا۔ دوسری جانب رجن کے پھڑکتے' تھرکتے ہوئے پاؤں بھی رک گئے۔ اس نے چند لمحے خاموشی سے بنے خاں کے تیور کا جائزہ لیا۔ یہ ایک نہایت مشکل مرحلہ تھا۔ اسے جلد از جلد کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ بنے خاں کے دونوں ہاتھ بھی دستبرداری کے انداز میں لٹکے ہوئے تھے۔ رجن موقع سے فائدہ اٹھا کے ایک دو جست میں بنے خاں کے سر پر پہنچ سکتا تھا۔ اس نے توقف کیا اور تحمل سے ایک قدم بڑھایا پھر آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس نے اپنے اور بنے خاں کے درمیان کا مختصر فاصلہ طے کیا۔ بنے خاں نے اسے پاس آنے دیا۔ قریب آ کے گز بھر کی دوری پر رجن ٹھہر گیا۔ دونوں لمحوں تک ایک دوسرے سے آنکھیں چار کیے بے حرکت کھڑے رہے۔ کسی ایک کو پہل کرنی تھی۔ معاً بنے خاں نے جنبش کی اور اپنا چاقو والا ہاتھ رجن کی طرف پھیلا دیا۔ بنے خاں کے ہاتھ اٹھانے میں لپک نہیں تھی۔ رجن فوراً نہیں سمجھ پایا کہ بنے خاں کی جانب سے اپنا ہاتھ گرفت میں دینے کی پیشکش رضاکارانہ ہے۔ اس نے بجا طور پر اسے بنے خاں کا کوئی حیلہ سمجھ کے خود کو بچاتے ہوئے اپنا چاقو والا ہاتھ بنے خاں پر جھپٹایا۔ بنے خاں ہر طرح تیار تھا۔ اپنا جسم دور رکھے رکھے وہ آہستگی سے کسی قدر ترچھا ہو گیا اور اس نے سبھی کو حیران کر دیا جب اچانک فرش پر گر کے اس نے پوری طاقت سے رجن کے پیر اپنے پیروں سے نشانہ بنائے۔ رجن نے بھی ابتدا میں اسی قسم کا سلوک کیا تھا۔ رجن کے پیر فرش سے اکھڑ گئے اور وہ متزلزل ہو گیا۔ ایسی حالت میں اڈے کے کسی بھی آدمی کا رد عمل یہی ہوتا کہ پہلے تو وہ زمین پر قدم جمانے کی تگ و دو کرے اور جسم کا زاویہ بدل کے ممکن ہو تو جواب میں فرش پر گرے ہوئے مقابل پر چاقو تان لے۔ بنے خاں نے کچھ سوچ کے ہی یہ خطرہ مول لیا تھا۔ گرنے کے بعد اس نے فوراً اٹھ جانے کے لیے خود کو آمادہ کر رکھا تھا۔ رجن نے قدم اکھڑ جانے کی بد حواسی میں جیسے ہی چاقو والا ہاتھ بنے خاں کے جسم پر جھکایا' بنے خاں نے جھٹ کروٹ بدل لی اور نشانے سے ہٹ کے اتنی تیزی سے اٹھا کہ رجن کی کلائی اس کے پنجے میں تھی۔

عمارت میں پھر شور بلند ہوا۔ سبھی نتیجے کے منتظر تھے اور گنتی کے چند لوگوں کو چھوڑ کے سبھی بنے خاں کی کامیابی کے متمنی تھے۔ لگتا تھا' بنے خاں کی نگاہیں رجن کے چاقو کی نوک سے بندھی ہوئی ہیں۔ اس نے پہلے کروٹ بدل کے اپنا رخ بدلا اور سامنے کے بجائے بائیں جانب سے پنجہ ڈالا۔ بنے خاں نے صرف ایک کروٹ پر اکتفا کیا' دوسری اس کے لیے مہلک بھی ہو سکتی تھی۔ یہ وقت رجن کے لیے سخت آزمائش کا تھا۔ اسے تمام تر قوت سے اپنا جسم پیچھے ہٹانا چاہیے تھا۔ یوں تو بنے خاں آدھا اٹھ چکا تھا' باقی آدھا وہ رجن کے پکڑے جانے والے ہاتھ کے زور پر اٹھا۔ ایسے پیچیدہ داؤ پیچ کے لیے بہت تجربہ چاہیے۔ تجربہ تو خیر ہر قدم' ہر مرحلے پر شرط ہے۔ پہلے رجن بے توازن ہوا تھا' دوسرے اپنا ہاتھ گرفت میں چلے جانے سے وہ بوکھلا گیا۔ یہ موقع بنے خاں کے لیے بالادستی کا تھا۔ کسی داؤ کے نتیجے میں متعدد صورتیں ذہن میں رکھنی پڑتی ہیں' جیسے درپے پینترے' آدمی کو بجلی بننا پڑتا ہے۔ اٹھتے ہی بنے خاں کو چاقو والے ہاتھ سے رجن کو مزید منتشر کرنا چاہیے تھا۔ اس کا یہی ارادہ ہوگا مگر رجن کے لیے جیسے زندگی کا یہ آخری معرکہ تھا۔ ایک لمحے کا حجاب مقابل کے عزم تازہ کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے ہی بنے خاں اپنے پیروں پر استوار ہوا' رجن ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی اس نے پیر پھیلا دیے اور مصرع طرح' پر پھڑکتی ہوئی گرہ لگانے کے مانند بنے خاں کا داؤ اسی پر لوٹانے کی کوشش کی یعنی بنے خاں کی ٹانگوں پر پیر مارنے کی۔ رجن کے لیے یہی ایک بہتر صورت تھی تاہم بنے خاں نے صبر و ضبط کا ثبوت دیا اور رجن کی کلائی پر اپنے پنجے کی گرفت بھرنے کی ضد نہیں کی۔ ضد کے لیے سو مرگوں کا خمار لازم ہے' بنے خاں نے اسی دم رجن کی کلائی چھوڑ دی اور پلک جھپکتے میں اس سے دور ہو گیا۔ پیچھے ہٹ کے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر بنے خاں کو آندھی کی طرح بڑھنا اور رجن کو اٹھنے کا وقت نہیں دینا تھا۔ رجن کو بھی اپنی نسبتاً کمزور صورت حال کا احساس تھا' سو وہ فرش سے اٹھا ہی نہیں' گیند کی مانند لڑھکتا ہوا اپنی جگہ سے دور ہوتا گیا۔ جتنی دیر میں بنے خاں اس تک پہنچے' ایک محفوظ فاصلے پر جا کے وہ یک لخت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کی پیشانیوں سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ دور کھڑے کھڑے انہوں

KHAN STATIONARY AND LIBRARY
NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH:5556532
PROP: ALI KHAN

نے سانسوں کی ہمواری کا وقفہ کیا اور بنے خاں نے پیش قدمی کے بجائے رجن کو بڑھنے کا اشارہ کیا۔ رجن نے بھی دیر نہیں کی اور چاقو گھماتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ سے بڑھا اور کچھ آگے آ کے اس نے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو جھٹک دیا۔ چاقو گرنے کی آواز کے ساتھ عمارت میں حیرت آمیز سسکیاں سی گونجیں رجن کے دونوں ہاتھ اب خالی تھے۔ استغنا کے اس اظہار سے مقابل پر اپنا غلبہ و اثر جتانا مقصود ہوتا ہے' یہ ایک آزمودہ حربہ ہے مگر ہر دفعہ کارگر نہیں ہوتا۔ رجن کی یہ بے جگری اس کے اعتماد کا مظہر تھی تو ذہنی پراگندگی کی غماز بھی تھی۔ اس کا ایک ہی معقول جواب تھا۔ بنے خاں نے وہی کیا جو اڈے سے متعلق کسی بھی کج کلاہ استاد کا شیوہ ہو سکتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر نمودار ہوئی اور اس نے بھی کسی لمحے کے بغیر اپنا چاقو ترک کر دیا۔

پھر تو دونوں ایسی شدت سے ایک دوسرے کی جانب لپکے جیسے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائیں گے۔ آمنے سامنے آ کے انہوں نے طرح دی اور ایک دوسرے کے شانوں پر شانوں سے ضربیں لگائیں۔ دونوں ہی لڑکھڑا گئے اور گرتے گرتے بچے۔ تیز رفتاری سے آمنے سامنے ایک دم طرح دینا اور ضرب لگانا آسان بھی نہیں تھا۔ مقصد میں ناکامی پر پلٹ کے وہ بازوؤں کا زور لگانے لگے' اور بنے خاں نے اچھل کے رجن کے پیٹ میں گھٹنا مارنا چاہا۔ لگتا تھا' دونوں پاگل ہو گئے ہیں۔ مکوں سے' گھٹنوں سے ضربیں' پسلیوں سے تڑتے ہتڑ' گردن توڑ دینے' پیر کچل دینے اور اٹھا کر پٹخ دینے کی کوششیں۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے فرش پر آئے۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ پہلوؤں یا سڑک پر لڑنے والے دشمنوں کی طرح ایک دوسرے پر ٹوٹتے رہے۔ یہ اکھاڑا نہیں تھا نہ ہی کسی گلی کے چوک میں وہ دست و گریباں تھے۔ اڈے کے آدمی اپنے زور' ہنرمندی' خصوصاً چاقو پر گرفت سے برتری کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا۔ دونوں کی کہنیاں چھل گئی تھیں اور کپڑے پھٹ گئے تھے' اس سے پہلے کہ انہیں ٹوکنے کے لیے بچھل اور شمشاد خاں کی آواز بلند ہو' انہیں خود ہی ہوش آ گیا کہ وہ وقت ضائع کر رہے ہیں' یہ اڈے کی روایت سے اجتناب ہے اور اس طرح انہیں کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔ مشکل یہ تھی کہ کسی ایک کی جانب سے گرفت کمزور کرنے پر اسی کو ضرر پہنچنے کا احتمال تھا مگر بنے خاں نے حوصلہ کیا۔ اس نے رجن کی گردن سے بازو ہٹائے تو موقع غنیمت جان کے رجن بھی اڑنے سے باز رہا۔

دونوں بے حال ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کے تسلط سے نجات پاتے ہی پہلے رجن کھڑا ہوا پھر بنے خاں۔ رجن نے مجمع میں بیٹھے ہوئے اپنے کسی حمایتی کی طرف نگاہ اٹھائی تھی کہ ایک چاقو ہوا میں لہرایا۔ جسم کو ایک ذرا خم دے کے رجن نے یہ چاقو اچک لیا اور پھلکے کو بوسہ دیا۔ بنے خاں کچھ سوچتا رہا اور اس نے پہلی بار استفہامی تیور سے شمشاد خاں اور بچھل کو دیکھا اور اس کی مضطرب نظریں ہم تینوں پر آئیں۔ ہم نے آنکھوں آنکھوں میں اسے عزم و ہمت کی تلقین کی۔ شمشاد خاں کی طرف سے کوئی تائیدی اشارہ ہو گا کہ بنے خاں نے جھک کر اپنا چاقو فرش سے اٹھا لیا۔

اب تک کا حاصل اتنا تھا کہ مجموعی طور پر بنے خاں کا پلہ بھاری رہا تھا مگر پاسنگ بھر۔ رجن نے زیادہ تر احتیاط و ہوشیاری کی تھی۔ ایک قدم بڑھ کے کترا جانا اور دوار روکتے کوئی شوشہ طرازی کر کے بنے خاں کو مشتعل کرنا۔ اشتعال میں لغزش کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ایک مخمص معلوم ہوتا تھا' سفلہ بھی۔ اس چلتر پن سے مقابل کو بہت بیزاری ہوتی ہے اور غصہ آنے لگتا ہے۔ غصہ ہیجان خود ایک قوت ہے مگر زہر بھی ہے اور یہ زہر دوسرے کے لیے جتنا کاری ہو سکتا ہے' اتنا ہی اپنے لیے بھی ہوتا ہے' بیزاری کے غصے میں آدمی سے کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اٹھ سکتا ہے۔ ادھر اپنا دفاع کرتے رہنا بھی معمولی بات نہیں۔ پل کے پل دفاع بھی ناممکن ہے۔ یوں سب سے آخری دفاع تو شکست آمادگی ہے۔ کسی مجمع ہی میں رجن نے اتنا بڑا دعوا کیا ہو۔ بنے خاں نے اب تک اسے کوئی موقع نہیں دیا تھا تو رنج مایوس بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اسے کوئی اطمینان تھا کہ ہمیشہ بہت دور اور بہت قریب ہوتا ہے۔ بہت دیر ہو گئی اور اس سے یہ مراد تھی کہ کسی کے حق میں بھی فیصلہ ہو ہے۔ جو لوگ بنے خاں سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ان کا اضطراب اور فزوں ہو گیا تھا۔ بہرحال کسی کے بس میں کچھ نہیں تھا' سب کچھ آنے والے لمحوں کے پارے میں مقید تھا۔ دونوں طرف سے ابھی تک کوئی ایسا داؤ نہیں کیا گیا تھا جس کا جواب دفاع میں نہ ہوتا۔ شاید شروع ہی سے رجن اور بنے خاں نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔

بنے خاں نے پہلے اپنا حلیہ درست کیا۔ بالوں میں انگلیاں پھیریں' لباس کی شکنیں ٹھیک کیں' گریبان چاک ہو گیا تھا' دامن کھینچ کے اسے ہموار کیا۔ اس کے اطوار سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب اسے کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ اچھی علامت تھی۔ رجن خوں بار نظروں سے اسے دیکھ رہا۔ بنے خاں کے حرکت کرنے پر اس نے بھی اپنی جگہ سے جنبش کی۔ بنے خاں نے اچانک رفتار پکڑ کے فاصلہ کم کیا۔ ظاہر ہے' یہ دیکھ کر رجن کو دائیں بائیں ہو جانا تھا پھر دونوں نے دائرے میں نہایت تیز رفتاری سے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ ان کے چاقو والے ہاتھ متوازی تھے۔ دو تین چکروں کے بعد یکایک درمیان میں رخ بدل بدل کے وہ ایک دوسرے پر جھپٹنے لگے۔ کسی سے بھی پہلو بچانے میں ذرا سی چوک ہو جاتی تو چاقو اس کے کولھے اور پسلیاں کاٹ دیتا۔ اس داؤ میں بے پناہ چستی اور چابک دستی کی ضرورت ہوتی ہے' اور اصرار جاری رہے تو یہ کسی فیصلے ہی پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں تھکے ہوئے تھے لیکن ان پر جنون طاری تھا۔ بنے خاں نے ابتدا کی۔ رجن کو بھی اپنا چاقو والا ہاتھ سیدھا یا متوازی رکھنا تھا۔ ایک دوسرے کے قریب آ کے بھی انہوں نے ایک محفوظ دوری قائم رکھی۔

اس تکرار میں بنے خاں سے وہ کوتاہی ہو گئی جس کا ہیجان دریے خطر تھا۔ اس لغزش کی پاداش واجب تھی۔ جس پر بنے خاں کا پیر رپٹا' اپنی جھونک میں اس کے پیر بیزار ہو گئے۔ اس دوران وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جلدی جلدی چاقو بھی منتقل کرتے رہے۔ یہ منتقل مقابل سے فاصلہ ہونے ہی پر مناسب ہوتا ہے۔ رجن کا سامنے کیا چاقو بردار ہاتھ بنے خاں کی پسلیوں کے نزدیک آیا تو بنے خاں نے پہلے ہی چاقو دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا تھا۔ وہ آگے ہو چکا تھا کہ طرح دیتا' پہلو بچاتا اور بیٹھ جاتا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ ادھر ادھر ہونے کے بجائے وہ رجن کا بڑھا ہوا ہاتھ پسلیوں اور بازو کے درمیان جکڑ لے۔ یہ جکڑ اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ مقابل کسی طرح اپنا ہاتھ کھینچ نہ پائے۔ پسلیوں کی جکڑن بازو کی پکڑ کے مقابلے میں قوی ہوتی ہے چنانچہ بہت احتیاط' بہت قدرت درکار ہوتی ہے۔ مقابل کی طرف سے ہاتھ کھینچ لینے میں کامیابی کا مطلب صاف ہے' چاقو بازو یا پسلیاں کاٹتا ہوا گزر جائے گا۔ بنے خاں کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہو گا کہ اس نے خود کو ایک خطرناک حالت سے دوچار کر لیا ہے۔ رجن کا ہاتھ اس نے جکڑ لیا تھا۔ یہ نازک گرفت مضبوط کرنے کے لیے اپنا ہاتھ موڑ کے گرہ لگاتا تھا اور بیک وقت' بیک وقت دو کام کرنے تھے' اپنے جسم کو جھٹکا دینے اور اپنے کھلے چاقو بردار ہاتھ سے رجن کو نشانہ بنانا تھا۔ کیونکہ اب اس کا جسم بھی اس کی رسائی سے دور نہیں تھا مگر بنے خاں کو دوہرا حملہ پہلے تو اپنے آپ کو قبضے میں رکھنا ہوتا ہے۔ اپنے آپ پر مستقل نگاہ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ کچھ دیر' کم از کم اتنی دیر کے لیے جب تک مقابل سے تیغ آزمائی ہو' خود کو ایک ہی منظر سے' سامنے کے منظر سے پابندہ کے رکھنا پڑتا ہے۔ رجن تو بس بنے خاں کی ایک گرہی ہم گشتگی کی تاک میں تھا اور اسے آنے والے لمحے کی بے اعتباری کا خوب احساس تھا۔ سوا اس نے موجود لمحہ ہی ستاروں کی مہربانی جانا اور کوئی بھول' کوئی نادانی نہیں کی۔ بنے خاں نے ادھر پسلیوں اور بازو کے درمیان اس کا چاقو والا ہاتھ جکڑا' ادھر رجن نے بندر کی طرح اچھل کود شروع کر دی۔ پسلیاں اور بازو بچانے کی فکر نے بنے خاں کو سرگرداں کیا۔ اس کا ارادہ ڈگمگا گیا۔ اس کے بازو اور پسلیوں کی گرفت سے باہر رجن کا ہاتھ انگلیوں میں دبے ہوئے چاقو کی حرکت میں آزاد تھا۔ رجن اپنا چاقو گھما سکتا تھا۔ اس کے چاقو کی نوک بنے خاں کی کمر یا پسلیوں میں چبھی تھی یا بنے خاں پر اس ضرر کا اندیشہ غالب آ گیا تھا کہ وہ حواس کا تناسب برقرار نہ رکھ سکا۔ غالباً بنے خاں نے ساری توجہ رجن کا ہاتھ جکڑنے پر مرکوز رکھی۔ اپنے کھلے ہوئے چاقو بردار ہاتھ کی طرف سے غفلت یا بے پروائی اسے مہنگی پڑنی چاہیے تھی۔ رجن نے بنے خاں کے چاقو والے ہاتھ پر پنجہ ڈال کے اسے اور دگرگوں کیا۔ بنے خاں کا کھلا ہوا ہاتھ رجن کے تصرف میں جانا آخری کیل ٹھکنے کے مصداق ہوا۔ اتنی ہنرمندی اور کرشمہ سازی نہیں تھی' یہ محض رجن کی مستعدی کا ثمر تھا کہ ہیجان و اضطراب سے دوچار بنے خاں کے ہاتھ میں چاقو قائم نہ رہ سکا۔

شمشاد خاں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ رجن کا ہاتھ ابھی تک بنے خاں نے جکڑ رکھا تھا۔ ایک پل کی تاخیر ہو گئی۔ ایک پل کی تاخیر بھی پہاڑ کے مساوی ہوتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے ایک تیز جھٹکے سے رجن کے ہاتھ سے بھی چاقو گر گیا تھا مگر سبھی گواہ تھے کہ کون اپنے چاقو سے پہلے دستبردار ہوا ہے۔ عمارت میں موت جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا پھر لگا جیسے کسی نے ساری دیواریں ہٹا دیں' سارے روزن کھول دیے۔ ایسا شور و غوغا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دائرہ تنگ ہو گیا۔ چاروں طرف سے ہجوم امڈ پڑا تھا۔ سبھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شمشاد خاں اور اڈے کے معتبر' با اثر آدمیوں کی تنبیہہ و تلقین سے لوگ کسی حد تک پرسکون ہوئے۔ دائرے کے وسط میں' ہجوم کے درمیان گھرے ہوئے' بت کے مانند فرش پر ایستادہ بنے خاں کی بس ایک جھلک دکھائی دی تھی' پھر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ رجن کے ساتھیوں نے رجن کو کندھوں پر اٹھا لیا تھا اور

تحسین و آفریں کے نعروں سے عمارت گونج رہی تھی۔ رجن
سب کو سر جھکا جھکا کے سلام کر رہا تھا۔ لوگ کندھوں پر
اٹھائے اٹھائے اسے چوکی کے پاس لے آئے۔

شمشاد خاں کی آنکھوں میں دہکتی آگ اس کے زرد
چہرے پر اور نمایاں ہو گئی تھی۔ ٹھسل نے اس کا بازو تھام کے
ایک طرح اس کی لگام کھینچے رکھی۔ چوکی پر بیٹھے ہوئے اور
لوگوں کا حال بھی شمشاد خاں کی کیفیت سے مختلف نہیں تھا۔
ہم تینوں چوکی سے اتنی دور نہیں تھے' جمرو کے کھسک جانے پر
کچھ اور قریب ہو گئے۔ اب وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ رہ رہ
کے بنے خاں کا خیال آتا۔ وہ یقیناً عمارت کے اندرونی حصے یا
بالائی منزل کی طرف چلا گیا ہوگا۔ اسے اس وقت گداز کی
بڑی ضرورت تھی۔ میری طرح زورا بھی اس کے پاس جانے
کے لیے بے کل تھا۔ جمرو نے ہم دونوں کو اٹھنے نہیں دیا۔
ویسے بھی اتنے لوگوں کو پھلانگ کے بنے خاں تک پہنچنا
آسان نہیں تھا۔

رجن کو چوکی کے نزدیک اتار کے اس کے ساتھیوں نے
پھر نعرے لگانے شروع کر دیے۔ رجن کو بنے خاں کی جگہ
بٹھا دیا گیا۔ کسی شخص نے چوکی پر چڑھ کے پھولوں کا ہار اس
کے گلے میں ڈال دیا۔ کسی نے بلائیں لیں اور پیشانی کو بوسہ
دیا۔ اس کے ساتھی وفورِ مسرت سے دیوانے ہو رہے تھے'
انہیں کوئی احساس نہیں تھا کہ چوکی پر اور اطراف میں بیٹھے
ہوئے بے شمار لوگوں کو ان کی نخوت آمیز مستی گراں گزر رہی
ہوگی۔ چوکی پر موجود ایک سن رسیدہ شخص نے رجن کے سر پر
صافہ باندھ دیا۔ رجن کا چہرہ دمک رہا تھا' لرزتے ہونٹ
پھڑکتے ہوئے نتھنے۔ بار بار وہ سر گھما کے ادھر ادھر دیکھتا تھا۔

ٹھسل نے دیر نہیں لگائی۔ دودھ سے کلھڑ بھر کے اس
نے رجن سے گھونٹ لینے کو کہا۔ شمشاد خاں نے بظاہر
بردباری کا ثبوت دیا مگر اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اسے اب
چوکی سے اٹھ جانے کی جلدی ہے۔ رسموں کی ادائی کا آغاز
ہوا تو بہت سے لوگ اٹھ کے عمارت سے باہر چلے گئے۔ پیچھے
دروازے کی طرف سے کسی کے سسکنے کی آواز آئی تھی۔
سب نے پیچھے مڑ کے اس شخص کو دیکھنا چاہا مگر اسے فوراً باہر
لے گئے۔ ٹھسل کی ترغیب پر رجن نے چاقو شمشاد خاں کے
قدموں میں رکھ دیا۔ شمشاد خاں کی آنکھیں بھینچ گئیں تاہم
جواباً اس نے بھی خاموشی سے اپنا چاقو رجن کے آگے بڑھا
دیا۔

ابھی کئی رسمیں باقی تھیں۔ میرے جسم میں کانٹے سے
چبھ رہے تھے۔ دماغ بہت الجھا ہوا' دل بہت گھبرا رہا تھا۔ کیا

اچھا تھا کہ ہم وہاں سے اٹھ جاتے' یہ سب کچھ تو
پڑتا۔ یکایک جیسے کسی نے مجھے ٹوکا' میں سیدھا نہ بیٹھا
میری سوالیہ نظریں ٹھسل کی جانب گئیں۔ وہ اپنے
مصروف تھا۔ میں نے جمرو سے کچھ کہنا چاہا مگر اس
کے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

جمرو اور زورا نے میری پنڈلیاں جکڑ لیں "کیا
لاؤلے؟" جمرو نے بے تابی سے پوچھا۔

سبھی کی نگاہوں کا ہدف میں بن گیا تھا۔ شمشاد
ٹھسل کو میری طرف متوجہ کیا۔ ایک لمحے کے لیے
پیشانی پر لکیریں کھنچ گئیں' پھر اس نے سر کو ہلکی
دے کے دھمکتی آواز میں پوچھا "کیا ہے رے؟"

"استاد!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "تم نے
کے وقت پوچھا تھا کہ کوئی اور تو اڈے کی چوکی کا
نہیں ہے؟"

شمشاد خاں کی حالت اضطراری ہو گئی "ہاں
تھا۔" ٹھسل کے بجائے وہ پٹ پٹاتی پلکوں سے بولا۔

"ابھی کوئی اور رستم کا جنا ہے ادھری؟" ٹھسل
آواز سے پوچھا۔

"ہاں استاد!" میں نے سانس بھر کے کہا "ہو
کوئی۔"

ہر جانب کھلبلی مچ گئی۔ لوگ اٹھ اٹھ کے
لگے۔ رجن کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔

"کون' کون ہے وہ؟" شمشاد خاں مضطرب ہو کے کہا۔

جواب میں میرے تامل پر ٹھسل نے کسی قدر
سے پوچھا "تو تو ادھری بیٹھنا چاہتا ہے؟"

ٹھسل نے پہلے شمشاد خاں کی طرف پھر رجن
دیکھا۔ رجن کے چہرے پر جسم کا سارا خون سمٹ
کی شعلہ بار نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں "کیا بو
ٹھسل نے متردد لہجے میں شمشاد خاں سے پوچھا۔

"ہم' ہم کیا بولیں۔" شمشاد خاں تذبذب

"اپنے کہنے کو کیا ہے۔ ٹھیک ہے' سولہ آنے ٹھیک
بھائی!"

عمارت میں دائیں سمت بیٹھا ہوا بھاری
ایک شخص اٹھا اور چیخ کر بولا "ایسا کیسے استاد!
کا نہیں ہے۔"

"کیا! ایسا کہا تو نے؟" شمشاد خاں بھڑک کے
پیچھے کا سوچ کر زبان ہلایا کر بھئی۔ یہ کدھر لکھا
باڑے کا جانور ہی چوکی پر آئے گا۔ کبھی بیٹا

کا ہوں۔ بے' ٹھیک ہے ہمیں پیدا ہوا تھا پر یہ رجن'
استاد!" شمشاد خاں کی آواز میں تلخی بھری ہوئی تھی۔
ان کی چال بھی تو لکھنؤ میں گڑی ہوئی نہیں ہے۔ باتیں کرتا
سسرا! تھوڑی دیر میں بولے گا' خاندان بھی جان عالم پیا کا
چاہیے۔"

ہر سو سرگوشیاں بھنبھنانے لگیں۔

"اور ادھر کلکتے میں استادوں کا استاد اپنا ٹھسل بھائی
سا لگتا ہے۔ اڈے کی چوکی بازو پہ چلتی ہے راجا!"
شاد خاں نے بازو دکھا کے کوئلہ رو بنسی نامی شخص سے کہا
اور میں راج گدی پر بیٹھنے کو ایسے ہی کیڑا کلبلاتا ہے تو
کھڑا ہو جائے۔"

"مگر رجن استاد کو ابھی سامنا نہیں کرنا چاہیے۔"
ل نرمی سے بولا۔

"نہیں' نہیں' میں اس کو بھی دیکھ لیتا ہوں۔" رجن نے
ہاں ہاں کے کہا "یہ تمہارا اچھا ہے نا استاد ٹھسل؟"

"پر سامنے میں نہیں آ رہا تیرے۔"

"ہم بھی تنہا حسرت نکال لو۔"

"ابھی تیری حالت ٹھکانے پر نہیں ہے رے۔"

"ہاں گیہ" شمشاد خاں اپنا سینہ کوٹنے لگا "استاد ٹھسل
کے ایسا بولتا ہے مردار! کم نصیبے! دماغ لوٹ گیا ہے تیرا؟
لگتا ہوں ٹھسل میں رہ' کھال میں رہ۔"

"استاد ٹھسل کیا خاص اوپر سے بھیجا گیا ہے۔" رجن

"زبان کو لگام دے رجن! حرام کی اولاد۔" شمشاد خاں
کے بولا "تیرے ایک بات بھی منہ سے نکلی تو زبان گدی
سے کھینچ لوں گا۔ استاد ٹھسل اپنے مہمان ہیں سور کے
بچے!"

"ہاں ہاں' بڑے نمک حلال مہمان۔"

شمشاد خاں نے اٹھ کے رجن کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا
ٹھسل آڑے آ گیا۔ ایک ثانیے ٹھہر کے اس نے رجن
"زیادہ کیوں بولتا ہے بادشاہ سلامت! اپنے کو بتا' کب
تک چاہتا ہے؟"

"جب تم بولو مہاراج!" رجن بگڑی ہوئی آواز میں بولا
"ابھی کیوں نہیں' جو ہونا ہے سالا' ابھی دودھ
کا پانی ہو جائے۔"

"اتنی جلدی نہیں۔" ٹھسل نے آہستگی
"دو تین دن ذرا پٹھوں کی مالش کروا لے۔ بہت اچھل
رہا ہے تو رے۔"

"ہاں' بعد میں مت بولنا کہ استاد ٹھسل اور شمشاد خاں
نے الٹی چھری چلائی تھی۔" شمشاد خاں بھڑکتی آواز میں بولا۔
"تم کو ہمارا چوکی پر بیٹھنا پسند نہیں ہے استاد تو صاف
بول دو۔"

"ابھی کچھ بولنے کا تو نے کدھر کو رکھا ہے خاں بیمار؟"
طنز' غصہ' ہیبت' شمشاد خاں کا لہجہ ساری آلائشوں
سے لبریز تھا۔ کہنے لگا "اور چوکی کی کیا بات کرتا ہے بھنیا
کے۔ چوکی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ جیسا تو بنے کے وقت
مرکھنے بیل کی طرح بیچ میں آیا تھا' ویسا کوئی اور بھی آ سکتا
ہے۔"

"اگلے جمعے کے دن میں بہت دیری ہے استاد!" ٹھسل
نے کھردری' اچٹتی آواز میں رجن سے کہا "اس ٹائم تک
اپنے کو ٹھہرنا نہیں ہے۔ ایک دو دن کی بات الگ ہے۔ اس
بیچ کوئی فیصلہ کرلو اور اپنی چھٹی کرو۔ تخت پر جا بیٹھ تم جمعے کے
دن براجمان ہو جانا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے ٹھسل بھائی! بیچ میں اپنا جی بہت
بھاری ہے' خواہ مخواہ تمہارا رستہ کھوٹا کیا۔ پر اب زیادہ
نہیں' بس دو ایک دن اور۔" شمشاد خاں التجائی انداز میں
بولا اور اس نے خشمگیں نظروں سے رجن کو گھورتے ہوئے
پوچھا "بول رے' پھر کیا وچار ہے تیرا؟"

"اپنا کیا وچار۔" رجن نے منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیا
"جیسا تم بولو' ہم تو ابھی تیار ہیں۔ ہاتھ پیر سارے سلامت
ہیں اپنے۔"

ٹھسل نے ہاتھ اٹھا کے کہا "کل سویرے کا بول دیں
پھر؟ ہاتھ پیر کھولنے اور پانی دیکھنے کو پورا دن پڑا ہے۔ باقی تو
ٹھیک ہی بولتا ہے۔ اوپر سے نیچے تک سارا بندھا ہوا ہے۔"

"جمعے کا دن کوئی اوپر کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ پرانے وقت
سے چلا آ رہا ہے' اس واسطے سب مانتے ہیں۔" شمشاد خاں
تیکھے لہجے میں بولا۔ "پر اس کو کل ہی تاج پہنا دیں گے۔"

شمشاد خاں کی ہدایت پر پہلوان طرز کا ایک بزرگ
شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے نعرہ بلند آواز میں اعلان کیا کل
صبح رجن استاد اور بابر استاد کے درمیان چوکی نشینی کا فیصلہ
ہو جائے گا۔

اعلان کرنے والا آدمی خاموش ہوا تو رجن جلی ہوئی
آواز میں بولا "اور کوئی ادھر ادھر چھپا ہو' نقارہ پٹوا دو۔ دنیا
بہت بڑی ہے' مل جائیں گے بہت سے تیس مار خاں۔ ایک
ساتھ سب کو سامنے کر دینا۔"

شمشاد خاں کے تن بدن میں آگ بھڑک' ٹھسل نے بڑی

مشکل سے اسے سنبھالا۔

دوپہر ہوگئی تھی۔ کھانا کب کا تیار تھا۔ اڈے کے آدمیوں نے دسترخوان بچھا دیے لیکن عمارت میں نفری بہت کم رہ گئی تھی۔ بہت سے لوگ پہلے ہی چلے گئے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی کھانا کھائے بغیر باہر نکل گئے۔ موت کے کھانے پر اسی طرح کی خاموشی ہوتی ہے۔ بنے خاں عمارت میں موجود نہیں تھا۔ اس کی تلاش میں ہم تینوں بھی باہر آگئے۔ گلی میں ایک اژدھام تھا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کئی آدمیوں نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ وہ عزم اور حوصلے کی تلقین کے علاوہ میری سرخروئی کی دعائیں کرنے لگے۔ انہی سے معلوم ہوا کہ بنے خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اسی وقت کہیں چلا گیا تھا جب اس کے ہاتھ سے چاقو گر جانے پر عمارت میں واویلا ہوا تھا اور لوگ بے قابو ہو گئے تھے۔ کسی کو بھی بنے خاں کی خبر نہیں تھی۔

آغا پا کی رہنمائی میں شام تک ہم بنے خاں کی ٹوہ میں مارے مارے پھرتے رہے۔ جانے وہ کون سی کھوہ میں جا چھپا تھا۔ شام کو ہم اڈے واپس آئے تو شمشاد خاں بہت فکر مند دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بھی کئی آدمیوں کو مختلف سمتوں میں [illegible]ہوا تھا۔

جمو اور زورا' سلمیٰ کی وجہ سے بے چین ہو رہے تھے۔ کل پہلے پہر کے بعد سے اب تک ہمارا اس کے پاس جانا نہیں ہوا تھا۔ اڈے پر کچھ دیر ٹھہر کے ہم شمشاد خاں کے بھائی عزیز خاں کے گھر چلے آئے۔ یہاں سلمیٰ بھی واقعی کچھ کم مضطرب نہیں تھی۔ مطلوب صورتیں بھی کیسی باد بہاری ہوتی ہیں۔ ہمیں دیکھ کے اس کا چہرہ چہکنے لگا۔ زورا اور جمو اس کے لیے موتیا کے گجرے لے گئے تھے' میزبانوں کے لیے مٹھائی کی ٹوکری بھی۔ جمو نے عزیز خاں کے گھر والوں سے معذرت کی کہ ہماری روانگی میں دو ایک دن کی تاخیر ہوگئی ہے مگر وہ تو جیسے اس حادثے کے آرزو مند تھے۔ خوش چہرگی پر خوش شعاری مستزاد ہے اور لوگ کہتے ہیں' خوش شعاری اصل میں ہوش مندی ہے۔ دو دن میں سلمیٰ نے کیسا جادو کر دیا تھا کہ سبھی اس کے گرویدہ نظر آتے تھے۔ کل اور آج انہوں نے اسے لکھنؤ کی خوب سیر کرائی تھی۔ عزیز خاں کے گھر والوں کو اڈے سے وابستہ آدمیوں اور سلمیٰ کے تعلق کی نوعیت بوجھنے کی جستجو یقیناً ہوگی۔ ہم سے تو وہ کچھ پوچھ نہیں سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے' انہوں نے سلمیٰ سے سن گن لینے کی کوشش کی ہو یا کسی ناگفتنی کے خیال سے وہ محتاط ہی رہے ہوں۔ بہرحال سلمیٰ کو بھی بات کرنے کا سلیقہ تھا۔

عزیز خاں کے ہاں خاطر مدارات میں ہم اتنے [illegible] تھے کہ رات کو کھانا کھایا ہی نہیں گیا۔ حالانکہ شم[illegible] نے ہمارے انتظار میں سب کو روکا ہوا تھا۔ اڈے پر [illegible] لوگ موجود تھے لیکن ایک ویرانی سی چھائی ہوئی تھی [illegible] ویرانی تو دل سے ہوتی ہے۔ رات کے کھانے کے بعد [illegible] سرود کی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ تماشا گر واپس چلے [illegible] دیواروں کے سروں اور منڈیروں پر ابھی تک چراغ [illegible] سے رکھے تھے لیکن روشنی کے بغیر۔ روشنی نہ ہو تو [illegible] ٹھیکرے ہیں' نابینا آنکھوں کے مانند۔ بنے خاں کی [illegible] سے شمشاد خاں بہت متوحش تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ [illegible] کا زیادہ وقت اڈے پر ہی گزرتا تھا اور اپنی بڑی بہن [illegible] بھی اس کا آنا جانا مستقل رہتا تھا۔ آغا پا ہمیں وہاں [illegible] گیا تھا۔ بنے خاں نے تاکید کی ہوگی' بہن کے گھر [illegible] سراغ لگالیا۔ وقتے وقتے بعد اڈے کے آدمیوں کی [illegible] بہن کو فکر لاحق ہوئی ہوگی چنانچہ اسے زبان کھو[illegible] اڈے سے نکل کے بنے خاں سیدھا بہن کے گھر [illegible] کچھ اسباب سمیٹ کے اور یہ بتا کے کہ وہ کچھ عرصے [illegible] لکھنؤ سے باہر جا رہا ہے' وہ فوراً بہن کے گھر سے [illegible] ہو گیا تھا۔ اگر ہم اس کے تعاقب میں اسی وقت [illegible] ہو جاتے' جب اسے ہجوم کی افراتفری میں خاموشی [illegible] جانے کا موقع مل گیا تھا تو کہیں نہ کہیں اس کا [illegible] ہو جاتا۔ رجن سے تو ہم بعد میں بھی نمٹ سکتے تھے۔ [illegible] کو اپنی ہزیمت کی توقع نہیں تھی۔ شکست تو [illegible] سورماؤں کو ہو جاتی ہے۔ اڈے کے آدمی کو اتنا شیش[illegible] ہونا چاہیے۔ رات گئے ایک آدمی نے بتایا کہ [illegible] کے وقت بنے خاں کو چار باغ اسٹیشن کے نزدیک [illegible] نے دیکھا تھا۔ لوگ اپنی اپنی بولیاں بولتے رہے کہ [illegible] جگہ فلاں مقام پر دیکھا گیا ہے۔ کسی نے خود اسے [illegible] تھا۔ بہن کے گھر سے معلومات اور چار باغ اسٹیشن [illegible] خاں کی موجودگی کی اطلاع سے یہی قیاس کیا جا [illegible] اب لکھنؤ میں نہیں ہے۔ جتنا وقت گزرتا جا رہا [illegible] خاں کے چہرے پر چھایا ہوا دھواں گہرا ہوتا جا رہا [illegible] محض بھل کی وجہ سے چوکی پر بیٹھا وضع نبھا رہا [illegible] بھی اڈا چھوڑ کے نکل گیا ہوتا۔ بنے خاں کے دو [illegible] ساز دوست بھی لازماً اسی کے ساتھ تھے۔ وہ بھی [illegible] نہیں آئے تھے۔ کاش بنے خاں کچھ دیر اور [illegible] کہاں معلوم ہوا ہوگا کہ رجن نے ابھی چوکی [illegible] ہے۔ ابھی اسے کل صبح میری دیوار راستے سے ہٹانا [illegible]

اڈے سے اپنے جانے کے بعد کے واقعات کی بھنک بھی بنے خاں کے کانوں تک پہنچ جاتی تو وہ ارادہ بدل دیتا اور شہر بدری کا یہ انتہائی قدم نہ اٹھا پاتا۔ لکھنؤ کے لوگ اپنے شہر کے ویسے بھی بڑے شیدائی ہیں' کسی اور جگہ ان کا جی کم ہی لگتا ہے۔

ہم اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا ہی چاہتے تھے کہ اڈے کے ایک آدمی نے آکے سرگوشیانہ انداز میں مجھے بتایا کہ مبارک میاں نامی کوئی شخص مجھ سے ملنے کے لیے اجازت کا خواہاں ہے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ اس نام کا تو کیا' لکھنؤ میں کسی نام کا میرا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ جمو اور زورا نے مشورہ دیا کہ اندر بلانے کے بجائے باہر چل کے ہی اسے دیکھا جائے۔ اندر شمشاد خاں' بھل اور اڈے کے دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ دروازہ عبور کرنے سے پہلے جمو نے تارا بیگم کے فرستادے کا شبہ ظاہر کر دیا تھا اور وہ وہی تھا' تارا بیگم کا سازندہ۔ اس نے مودبانہ سلام کیا اور نیچے لہجے میں بولا "تارا بیگم کل کسی وقت غریب خانے پر سرکار کی منتظر رہیں گی۔ کوئی مصروفیت درپیش ہو تو پرسوں سہی۔ بڑی نوازش ہوگی' اگر پہلے اطلاع مل جائے۔"

میں نے جمو کی طرف دیکھا اور اسی نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے' آنے سے پہلے ہرکارہ بھیج دیں گے۔

جمو نے بند مٹھی سے مبارک میاں کے ہاتھ میں کچھ نقدی منتقل کر دی۔ مبارک میاں نے بھی شمار نہیں کی' جیب میں رکھ کے سر خم کیا اور واپس چلا گیا۔

اس کے چلے جانے پر ہم تینوں وہیں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھا کیے پھر جمو ہنکارا بھر کے بولا "کیا خیال ہے؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا "اب تارا بیگم کے راضی ہونے نہ ہونے سے کیا حاصل۔"

جمو کے پاس حجت کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس نیرنگی صبح و شام کے سامنے سبھی بے اختیار ہیں۔ وہ شانے سکوڑ کے رہ گیا۔

ہم تینوں واپس چوکی پر نہیں گئے' بالائی منزل پر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ جمو اور زورا بھی بکھرے بکھرے دکھائی دیتے تھے۔ بیداری بھی کبھی کیسا [illegible] کرتی ہے' آدمی اپنے آپ کو برا لگتا ہے۔ زورا بستر [illegible] بدلتے بدلتے اوب گیا تو اٹھ کے کمرے میں ٹہلنے لگا پھر ٹہلتے ہوئے بولا "دادا! ابھی ایک بات بولے۔"

میں نے اپنا بوجھل سر ہلا کے پوچھا "کیا ہے؟"

باخبری

لاشعور میں دبے ہوئے خون، احساسات اور محرکات کو بے نقاب کرنے والی عجیب و غریب کتاب

قیمت 25 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
پوسٹ بکس 944 ... کراچی 74200
فون: 5882552-5895313 فیکس: 802551

kitabiat@hotmail.com
kitabiat@yahoo.com

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD, DHABRA BAZAR
RAWALPINDI

"یہ اپن کا بنے دادا کیسا آدمی تھا؟" زورا نے بے ربط لہجے میں شکایت کی "ابھی چپچپے اتنا لوگ چھوڑ کے چلا گیا۔" میں کیا کہہ سکتا تھا۔ زورا کہنے لگا "اپن سوچتا ہے، آج کا دن بنے دادا کو اس کتے کا بچہ رجن کے آگے جانے کا نہیں تھا۔"

"پھر کون سا دن رکھنے کا تھا دادا؟" جمرو نے اچکتی آواز میں دخل دیا۔

"نہیں جمرو بھائی! مسخری نہیں۔ ماں قسم، رات اوری بائی جی کے کوٹھے پر بنے دادا نہیں جاتا تو سویرے ایسا نہیں ہوتا۔"

زورا کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ رات تارا بیگم کے بالا خانے پر جا کے بنے خاں کو ایک سلسلۂ خیال کے سحر سے دو چار ہونا پڑا۔ چاندنی بانو کے سامنے میں نے اس کے چہرے پر بہت سے رنگ دیکھے تھے۔ حسرت، امید، اشتیاق اور جنوں کے رنگ۔ وہاں سے آگے تو اس کی آنکھیں مسلسل خواب دیکھتی رہی ہوں گی۔ بس ایسے ہی کسی خواب آفریں، خواب انگیز لمحے کا فسوں اسے زیر و زبر کر گیا۔ رات ہی تارا بیگم آمادہ ہو جاتی تو بنے خاں کا عالم دگر ہوتا۔ شاید پھر اسے اس طرح روپوشی کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہی اس وقت اڈے کی مسند پر بیٹھا ہوتا اور اڈے کی عمارت میں جانے کیسی دھوم مچی ہوتی۔

جمرو بھی اٹھ کے بیٹھ گیا اور خود کلامی کے انداز میں بولا "تارا بیگم کو بھی تو پتہ چل گیا ہوگا کہ بنے خاں آج چوکی پر نہیں بیٹھ پایا۔"

"ایک دم دادا!" زورا کی آواز میں تیزی آگئی "رات نہیں دیکھا! بولی کے ٹیم کیسا چکری دیتا تھا بائی جی۔ ابھی سر میں بیچے کو آتا ہی نہیں تھا۔ اپن بولتا ہے، رات بھر نیند نہیں آیا ہوگا۔ اڈے پر بنے دادا کے الٹ جانے کا سن کے ہی آدمی ایدر آیا 'ابھی سونا بھرا پوٹلی ہاتھ سے نکل نہ جائے۔'"

"اور اس مکھن لال مبارک میاں نے تو بنے خاں کو پوچھا ہی نہیں۔" جمرو لنک کر بولا "سیدھا اپنے لاڈلے نواب کو پوچھتا ہوا آیا۔"

"بات بھی تو راجا دادا نے چلایا تھا۔ اس کے پاس ہی آدمی بھیجنے کا تھا۔"

"ادھر تارا بیگم نے سارا دن آس پاس نواب لوگوں کو ٹٹولا، کھکوڑا ہوگا۔"

"اکھا دن آجو باجو نواب لوگ کا تول کانٹا کیا ہوگا، پر ڈھیری کا بات ہے جمرو بھائی!" زورا نے کڑوی آواز میں کہا "ابھی سالا نواب لوگ پہلا ماٹک کیدر رہے۔ ایدر راجا دادا نے بولی بھی آسمان پر جا کر لگایا۔"

وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کی تائید و تردید کرتے رہے۔ میں بستر پر پڑا سنتا رہا۔ میں نے ان سے بحث نہیں کی کہ یہ قیمت بھی کوئی قیمت ہے، لوگ تو تخت و تاج ترک کر دیتے ہیں اور زندگی نذر کر دیتے ہیں۔ ایک آدمی کی قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ اس کا تعین تو کوئی طلب گار ہی کر سکتا ہے۔ کوئی کتنا ہی پری پیکر، گل اندام ہو، اور جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، سانچے میں ڈھلا ہو، قیمت تو مطلوب کی ہوتی ہے اور مطلوب کے لیے ملکوتی صفات لازم نہیں۔ اس کی قیمت نہ ظاہری اوصاف میں یکتائی سے مشروط ہے نہ باطنی حسن کی فضیلت سے۔ یہ تو سینے میں جاگزیں اور آنکھوں میں ہو جانے کا معاملہ ہے۔ ہر شخص کا اپنا ایک پیمانہ ہے۔ جو پیمانے پر پورا اتر جائے، یا کسی خنجر نگاہ کا کرشمہ ہے جو اس زد پر آجائے۔ دو آدمیوں کے مابین یک نفسی و یکجائی کی رمز کوئی تیسرا کیا جان سکتا ہے۔ کبھی تو خود مطلوب کو خبر نہیں ہوتی، کون دروازے پر کھڑا دستک دے رہا ہے اور کتنا اہم مدعی، کتنا بڑا فریادی ہے۔ یہ رقم تو کچھ بھی نہیں تھی۔ جس طرح جمرو اور زورا کے کسی مطلوب کی قیمت وہی سمجھ سکتے ہیں، بنے خاں نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح چاندنی بانو کی قدر قیمت کا تعین بھی بنے خاں ہی کر سکتا تھا۔ وہ کوئی نواب زادہ شہزادہ ہوتا تو سارا لاؤ لشکر نذر کر سکتا تھا، اور یہ تو محض ایک اتفاق ہے، خوش نصیبی کا اتفاق ہے کہ بنے خاں کا مطلوب ارزاں نیلام میں دستیاب ہو سکتا تھا، لیکن جہاں بولی کا امکان نہ ہو وہاں طلب گار کا سونا چاندی کس کام کا، اس کے جواہرات تو سنگ پتھر، اس کے محل دو محلے تو کھنڈروں کے مانند ہیں۔

آخر رات کے آخری پہر انہیں نیند نے آلیا۔ کاذب کے وقت کہیں میری آنکھ بھی لگ گئی۔

○☆○

صبح بنے خاں کا دست راست مرزا دلبر شاہ آیا تو ہم کب تک اپنے آپ سے بیگانہ رہتے۔ اس کی صدا پر ہم تینوں ہڑبڑا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نو بج رہے تھے۔ سورج دیواروں سے اتر آیا تھا۔ مرزا نے بتایا کہ نیچے عمارت میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے ہیں اور ان کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ رجن بھی اپنے ساتھیوں سمیت آچکا ہے۔ بچھل اور شمشاد خاں ہمارے منتظر ہیں۔ مرزا دلبر نے ناشتے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ جیسے تیسے نہا دھو کے ہم نے کپڑے تبدیل کیے، جلدی جلدی ناشتا کر کے نچلی منزل پر چلے آئے۔

عمارت میں کل سے بڑا ہجوم تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی، سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کے بے تحاشا شور مچنے لگا۔ چوکی کے وسط میں بچھل اور شمشاد خاں حاکمانہ تیور سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اڈے کے اور آدمی بھی چوکی پر موجود تھے۔ دودھ کے کٹورے، لوبان کا برتن، ہار پھول وغیرہ کوئی چیز بھی آج بچھل کے آگے نہیں تھی۔ چوکی کے دائیں طرف چار زانو نشست میں رجن خاموش بیٹھا تھا۔ چہرے کی تابانی و تر و تازگی درون خانہ اعتماد کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ وہ سفید لباس میں ملبوس تھا۔ کرتے کے گلے سے سونے کی زنجیر جھانک رہی تھی۔ زنجیر میں تعویذ بھی پیوست ہوگا۔ چمکتا ہوا چاندی کا کڑا کلائی میں جھول رہا تھا۔ یہ کڑا کل اس کے ہاتھ میں نہیں تھا، بازو سے بندھا ہوا کالی دھجی کا امام ضامن آستین سے جھلک رہا تھا۔ اردگرد بیٹھے ہوئے ساتھیوں نے میری طرف اشارہ کیا تو اس نے سر گھمایا۔ اس کی آنکھوں میں طرح طرح کی کیفیتیں نمودار ہوئیں، غصہ، حقارت اور اضطراب کی لہریں۔ پھر اس نے میری جانب سے نگاہ پھیر لی۔ ہم تینوں کو جگہ دینے کے لیے لوگ پہلے ہی پیچھے ہٹ گئے تھے۔ شمشاد خاں کی ہدایت پر ہم رجن کے عین مقابل چوکی کے بائیں طرف بیٹھ گئے۔ چوکی کے سامنے دائرے کی جگہ آج کھلی رکھی گئی تھی اور لوگ دائرے میں بڑھنے سے لوگوں کو روک رہے تھے۔

ہمیں آئے ہوئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک معمر قسم کے شخص نے کھڑے ہو کے خاموشی کی تاکید کی۔ اس کی ہمنوائی میں آگے پیچھے کئی آدمی کھڑے ہو گئے۔ ان کی کوششوں سے مجمع بڑی حد تک پرسکون ہو گیا۔ تب بزرگ آدمی نے مختصر لفظوں میں آج کے اجتماع کی غرض و غایت بیان کی اور نیم تنبیہی، نیم التجائی آمیز لہجے میں کہا کہ لوگوں کی خاموشی دونوں فریقوں کے لیے بہتر ہوگی۔ کوئی نازیبا صدا بلند کرنے، ناشائستہ کلمہ ادا کرنے والے کو عمارت سے نکال دیا جائے گا۔ رسی سے دائرے کی حدیں قائم کر دی گئیں اور بچھل نے پہلے رجن سے، پھر مجھ سے ہماری آمادگی کی بابت پوچھا۔

ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے۔ حسب روایت میں نے جیب سے چاقو نکال کے اڈے کے استاد شمشاد خاں کے قدموں میں رکھ دیا۔ شمشاد خاں نے میرا چاقو سینے سے لگایا اور اپنا چاقو بچھل کی طرف بڑھا دیا۔ بچھل نے اسے میرے حوالے کر دیا۔ رجن نے بھی یہی کیا۔ ہم دونوں دائرے میں آگئے۔ رجن نے اپنی کمر کے گرد پٹکا باندھ لیا تھا۔ ایک نظر بچھل کی طرف دیکھ کے میں نے چاقو کھول لیا۔ بچھل نے جواب میں ہاتھ کو خفیف سی جنبش دی۔ میں نے سر جھکا کے گویا اپنی تفہیم کا اظہار کیا۔ یہ رمز و کنایہ مقابل پر دباؤ ڈالنے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ رجن نے بھی اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کے اس کا حوصلہ بلند کیا۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ "جلد از جلد" ہو کے تو لمحوں میں کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ حالانکہ تک ہی کی چاہتا تھا کہ اسے دیر تک کھلایا جائے۔ وہ میرے لیے اب ایسا اجنبی نہیں رہا تھا۔ کل میں اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا، البتہ وہ مجھ سے بالکل ناواقف تھا۔ ممکن ہے، کل سے اب تک اس نے میرے بارے میں کچھ سنا ہو لیکن لکھنؤ میں لوگ ہی کتنے مجھے جانتے تھے۔ شاید کوئی بھی نہیں۔ بچھل کا نام بے شک بہت سے لوگوں نے سنا تھا اور بچھل سے میری نسبت کی وجہ سے رجن کو بھی محتاط ہونا چاہیے تھا۔ خصوصاً ابتدا میں تو کچھ زیادہ ہی۔ اسے اس حقیقت کا بھی خوب احساس ہوگا کہ اس کے اور بنے خاں کے درمیان معرکہ آرائی کے بعد میں نے خود کو پیش کیا ہے تو یہ کسی بوتے اور برتے ہی پر کیا ہوگا۔ اس نے پہل نہیں کی۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو منتقل کرنے کی مشق سے اجتناب کیا۔ شروع میں اپنی چابک دستی اور مشاقی سے بے خبر رکھنا میرے لیے سود مند تھا۔ مجھے اپنے زخم خوردہ ہاتھ کا بھی خیال رکھنا تھا، اس پر زیادہ زور نہیں دینا تھا۔ گو زخم بڑی حد تک ٹھیک ہو چکا تھا لیکن ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔

پہلے وہ مجھ سے دور دور رہا پھر میرے فاصلہ کم کرنے پر وہ بھی کسی قدر نزدیک آگیا اور جیسے ہی وہ چاقو لہراتا دو بدو ہوا، میں نے اپنے خالی ہاتھ کے بجائے چاقو بردار ہاتھ اس کے چاقو بردار ہاتھ کی طرف دراز کیا۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا، کسی طور مقابل کے چاقو والے ہاتھ کا پنجہ گرفت میں لے کے بے بس کر دینے پر زور اور وقت صرف کیا جاتا ہے لیکن اصل میں مجھے اپنے خالی ہاتھ سے اس کے شانے پر ضرب لگانی تھی۔ میرا چاقو والا ہاتھ اپنی جانب جھپٹتا دیکھ کے وہ ہوشیار بلکہ منتشر ہوا۔ مجھے اس کی تمام تر توجہ اس کے اور اپنے چاقو والے ہاتھ پر مرکوز رکھوانی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے سارا دھیان میرے اور اپنے چاقو والے ہاتھوں کی نقل و حرکت پر دیا۔ اٹھے ہوئے میرے خالی ہاتھ پر نہیں۔ دوسرے ہی لمحے میں نے خالی ہاتھ سے اس کے شانے پر پوری قوت سے ضرب لگائی۔ شانے پر گردن کے قریب

ترچھے ہاتھ کی ضرب صحیح لگ جائے تو کچھ دیر کے لیے سر سے پیر تک جسم مفلوج رہتا ہے۔ رجن کے حواس بھی یک جا نہیں رہے‘ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ فرش پر بیٹھ جائے‘ کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ضرب سے اس کے قدم بھی... لڑکھڑائے تھے۔ اسے اپنے چاقو والے ہاتھ کا بھی ہوش نہیں رہا۔

وہیں کھیل ختم ہو جاتا۔ اس اثنا میں کہیں بھی میں اس کا جسم اپنے چاقو سے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن ایک تو وہ فرش پر بیٹھتے ہی یا ڈگمگا کے گرتے ہی دور ہو گیا‘ دوسرے میں نے اسے دانستہ دور ہو جانے کا موقع دیا۔ میری خواہش تھی کہ بنے خاں پر کل اس نے جس داؤ سے برتری حاصل کی تھی‘ اسی کا آج اعادہ ہو۔ رجن اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑا ہوا اور اوسان میں دکھائی دیا تو میں نے بنے خاں کی طرح چاقو والا ہاتھ عمودی یعنی سیدھا رکھ کے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

اب تو اسے اپنی جگہ سے حرکت کرنی ہی تھی اور میری پیروی میں چاقو والا ہاتھ جسم کے درمیان سیدھ میں اٹھائے رکھنا تھا۔ اس داؤ میں دائرے کے چکر کاٹتے رہنا ایک لازمہ ہے۔ کسی جگہ میرے قریب آنے پر اس کے پاس دو ہی راستے تھے کہ وہ طرح دے کے دائیں بائیں ہو جائے یا آمنے سامنے ہونے کا فیصلہ کر لے۔ دائرے کے چکروں کے دوران بجا طور پر ہر فریق کی جانب سے کسی بھی لغزش اور نافہمی کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ گو مجھے رجن کی طرف سے کسی غیر متوقع حربے کا اندیشہ مطلق نہیں تھا‘ لیکن بہرحال اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور بٹھل کے بقول‘ مقابل کسی درجے کا ہو‘ کھلے چاقوؤں میں آنکھیں پوری طرح کھلی رکھنی چاہئیں۔ کسی وقت بھی اس کے دماغ میں کوئی خلاقی نمو پا سکتی تھی اور کسی وقت بھی مجھ سے حساب کتاب جیسی کوئی بھول چوک ہو سکتی تھی۔ ہزیمت کے شبے میں آدمی کا دماغ بھٹک سکتا ہے اور کوئی اوچھی حرکت بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ آہستہ آہستہ میں اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ خاصا پھرتیلا تھا۔ پینترا بدلنے میں اسے بڑی مشاقی تھی۔ کچھ دیر یہی صورت رہی۔ میرا فاصلہ کم کرتے رہنا‘ اس کا طرح دینا اور جھکیاں دیتے ہوئے ادھر ادھر ہو جانا‘ مگر کب تک وہ یہ آنکھ مچولی کرتا رہتا۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کے سامنے صف آرا فریقوں میں سے کسی ایک کو تماشائیوں کا لحاظ بھی آجاتا ہے‘ اس عجلت یا مروت کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ رجن کی طرف سے تو آخر دم تک اس غلطی کا ارتکاب ممکن نہیں تھا کہ ہجوم میں کتنے تماشائی اس کے ولد اور ولدار تھے۔

میرے تخمینے سے وقت کچھ اوپر ہو رہا تھا۔ یقیناً رجن کے نزدیک میری منشا کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا سوائے نامراد بنے خاں کے کے آخری داؤ والی صورت حال کی تکرار سے پہلو تہی کر رجن کا وار رہنا چاہیے تھا۔ پہلے ہی ہلے میں جب میں نے اس قریب سے شانے پر ضرب لگائی تھی‘ اسے میرے بارے میں رائے قائم کرنے یا یوں کہا جائے کہ رائے بدلنے کا اچھا موقع مل تھا۔ اس کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ کل وہ بیشتر اپنا دفاع ہی کرتا رہا تھا لیکن کل اس کے دفاع میں اور غضب شامل تھا‘ آج اضطراب آمیز ہوش مندی تھی۔ اس نے جیسے اپنی جانب سے پیش قدمی کا ارادہ کر دیا تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ اور سوچنا چاہیے اصرار سے کچھ دیر لگ سکتی تھی اور رجن اس عزت وار نہیں تھا۔

ایک مرحلے پر فاصلہ خاصا کم رہ گیا تو میں نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ رجن نے چاقو والا ہاتھ سیدھ میں ہوا تھا۔ میرے اس غیر متوقع اقدام پر وہ ششدر بھی متذبذب بھی۔ پر سامنے سب کچھ صاف تھا۔ اس حسن اتفاق بھی کہتے ہیں۔ اس نے یہی بہتر جانا کہ بردار ہاتھ جوں کا توں سیدھا رکھے اور اب کوئی بدلے۔ میں اسے اپنی ذہنی ابتری اور خر دماغی کا تاثر تھا۔ رجن کا چاقو عمودی تھا۔ درمیان میں فاصلہ بہت اور میں بڑھا چلا آرہا تھا۔ کوئی دیوانہ ہی اس مضحکہ خیز کا متحمل ہو سکتا تھا۔ بظاہر اس میں میرے ضرر کا ممکن تھا تو رجن کا ایک کٹنا بھی نہیں تھا۔ فاصلے کی باعث یہ میرے لیے ایک پیچیدہ مشکل منزل تھی مگر میزان کر کے ہی قدم اٹھایا تھا۔

ہونٹ بھینچ کے اور آنکھوں میں آگ بھر کے میری طرف زقند بھری۔ ہر سلیم العقل یہی کرتا اور اپنی تمام صلاحیتیں مجتمع کر کے اس کرشمۂ قسمت‘ اس لمحے سے بہرہ مند ہوتا۔ کچھ اور سوچنے کے لیے میں ہی نہیں دیا تھا‘ اسے اپنی جانب امڈتا دیکھ کے میں قدم منجمد کیے‘ اب اس کے لیے ٹھہر جانا‘ خود کو رو ثانی کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ اتنی قربت میں اسے کو بھی زاویہ بدلنے کی توفیق نہ ہوتی‘ اور اس ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ سامنے اپنا کوئی زیاں آرہا تھا۔ اس کے عمودی چاقو بردار ہاتھ کی زد سے لیے مجھے بروقت چند انچ دائیں جانب اپنا جسم ہٹانا تھا۔

نشانہ بالکل ٹھیک تھا۔ میرے جسم کے بائیں حصے کی پسلیوں چاقو پیوست ہونا چاہیے تھا۔ گز بھر کی دوری پر میں تیزی سے جسم دائیں طرف ہٹایا تو خلا ہو گیا‘ جیسے ہی کا وار اٹھا ہاتھ اس تکونی خالی جگہ یعنی میری پسلیوں کے قریب سے گزرا اور میرے اٹھے ہوئے ہاتھ کے نیچے آیا‘ میں اسے بازو یا پسلیوں کے درمیان جکڑ لیا۔ ردعمل کا مجھے احساس تھا۔ وہ چاقو انگلیوں میں گھما سکتا تھا مگر تبھی جب کوئی سلٹ ملتی یا میں اپنے دوسرے چاقو بردار ہاتھ سے کی طرح غافل رہتا۔ بیک وقت میرے دوسرے ہاتھ نے اس کی گردن کے قریب چاقو کی نوک چھوئی اور میں خود کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے بازو اور پسلیوں کے درمیان جکڑے ہوئے اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پنجے لینے کی کوشش کی اور مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

رجن کی ساری توجہ اپنی گردن کے قریب چاقو کی نوک پر مرکوز تھی۔ بازو کی گرفت ڈھیلی کر کے اور ہاتھ موڑ کے میں نے جھٹ اس کی کلائی پر پنجہ ڈالا تھا۔ اس احتیاط کی اگرچہ کوئی ضرورت نہیں تھی کہ رجن کو چند لمحوں میں اپنا چاقو ترک دیتا تھا مگر میری خواہش تھی کہ رجن اپنے ہاتھ میں چاقو برقرار رکھے۔ اسے ثابت و سالم تو واپس نہیں جانا چاہیے کم از کم کوئی نقش تو یادگار میں اس کے چہرے پر کندہ اس کی گردن پر اپنے چاقو کی نوک کی بیچ تنگی میں اسی نے شدت اختیار نہیں کی تھی لیکن رجن نے جلد ہی اخذ کر لیا اور چاقو‘ ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا۔ اس کے باوجود کی پیشانی پر درمیان میں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی ڈالی جا سکتی تھیں۔ اس کی ناک بھی بمبئی کے تیواڑی کی طرح چہرے سے جدا کی جا سکتی تھی‘ اور کچھ نہیں تو چاقو کی نوک اس کی گردن میں ذرا گہری کر سکتا تھا مگر وہ تو اپنے چاقو سے دستبردار ہوا بلکہ اس نے ہاتھ پیر بھی ڈھیلے۔ مزاحمت کے دوران کوئی داغ کندہ کرنے کی بات تھی۔ مجھے خود کو روکتے ہوئے بہت بیزاری ہوئی۔

میرے اندازے سے چند لمحے زیادہ صرف ہوئے۔ اس کو اپنے دیکھے ہوئے پر یقین کرنے کے لیے۔ بہرحال کچھ چاہیے تھا۔ سب کچھ دیکھتے دیکھتے‘ جیسے پلک جھپکنے کے میں ہوا۔ میرے جسم نے خودکار انداز میں ایک ساتھ کام کیے تھے۔ رجن کے بڑھنے پر خود کو روکا‘ دائیں طرف خالی ہاتھ نے اس کا چاقو بردار ہاتھ جکڑا‘ میرے چاقو ہاتھ نے اس کی گردن حصار میں لی۔ بٹھل کا کہنا تھا کہ کی گرفت اپنی جگہ‘ لیکن اصل بات تو اس کے استعمال کے نظم و ضبط میں ہے‘ چاقو تو کوئی بھی گھونپ سکتا ہے۔ صحیح مہارت اور مشاقی یہ ہے کہ چاقو مقابل سے کتنے فاصلے پر رکھنا ہے؟ کیا مقصود ہے؟ محض مس کرنا ہے‘ ہلکی لکیریں ڈالنی ہیں‘ لباس چاک کرنا ہے یا نشانے کے لیے کوئی مخصوص جگہ مطلوب ہے؟ ایک دفعہ بٹھل نے حیدر آباد میں ایسے ہی ایک موقع پر مجھے سوت کے چاقو چلانے کا اشارہ کیا تھا سو میں نے شاہ کبیرا کا ازار بند کاٹ دیا تھا۔ اڈے کے دادا کی اس سے بڑی رسوائی کیا ہو سکتی ہے۔ شاہ کبیرا کے جسم کے کسی حصے سے چاقو مس تک نہیں ہوا تھا۔ رجن سے بھی کچھ ایسا ہی سلوک کیا جا سکتا تھا لیکن اس نے اپنا جسم ہی ڈھا دیا۔

عمارت میں شور کے سوتے پھوٹ پڑے۔ میں نے ٹھوکر سے رجن کا گرا ہوا چاقو اس سے دور کیا اور اس کی گردن سے ہاتھ اٹھا کے اپنا چاقو جمرو اور زورا کی طرف اچھال دیا۔ دونوں نے ہاتھ بلند کیے تھے لیکن جمرو نے چاقو اچک لیا۔ اچھا ہوا جو میرے ہاتھ میں چاقو نہیں رہا ورنہ انگلیاں بہت اینٹھ رہی تھیں۔ رجن کو دیکھ کے بنے خاں کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا تھا۔

جھٹکا دینے پر رجن مجھ سے الگ ہوا اور فرش پر لڑھک پڑا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کے میں نے چوکی کی طرف قدم بڑھائے۔

ادھر سے جمرو اور زورا نے‘ ادھر سے شمشاد خاں اور اڈے کے کئی آدمیوں نے چوکی سے اتر کے مجھے دبوچ لیا۔ ہر طرف سے لوگ امڈنے لگے۔ ہر کوئی چیخ رہا تھا‘ والہانہ نعرے لگا رہا تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھ چومنے شروع کر دیے۔ جمرو اور زورا نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ شمشاد خاں نے میری ٹانگ جکڑ لی۔ وہ میرے پیر چومنے سے لگا تا‘ آنکھوں سے مس کرتا۔ اسی طرح وہ لوگ مجھے بٹھل کے سامنے لے آئے۔ بٹھل نے چمکتی آنکھوں سے ایک بار نظر پھیر کے مجھے دیکھا۔ جانے کیوں اس سے نگاہیں ملا کے مجھے وحشت ہونے لگی۔ بٹھل بھی سر جھکا کے حقہ گڑگڑانے لگا۔

سبھی جیسے پاگل ہو گئے تھے۔ ہر ایک چوکی کی طرف آنے کے لیے بے قرار تھا اور وہ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ بہت ہاتھ پیر چلا کے بہت چیخ و پکار کے بعد جمرو‘ زورا اور اڈے کے آدمیوں نے مجھے ان سے بچایا اور بٹھل کے پاس بٹھا دیا۔

چوکی کے آدمی کھڑے ہو ہو کے نظم و ضبط کے احکام صادر کرتے رہے‘ پھر انہیں کسی کمرے سے لاٹھیاں منگوانی پڑیں‘ لاٹھیاں لے کر چند آدمی چوکی سے اترے تب جا کے

کچھ سکون ہوا۔ خاموشی ہوتے ہی شمشاد خاں نے باآواز بلند ہجوم سے کہا کہ شہر میں جتنی مٹھائی تیار ہو، جتنے ہار پھول جہاں کہیں نظر آئیں، اڈے پر سمیٹ لائیں، صدرو باورچی سے دیگیں چڑھوائی جائیں اور رتجگے کی منادی کردی جائے۔ یہ فرمان جاری کرتے کرتے شمشاد خاں کی آواز بھرّانے لگی، آگے اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔ جھل نے تھپکی دے کے اسے پاس بٹھایا تو وہ جھل کے گلے سے لگ گیا اور بری طرح رونے لگا۔

بار بار عمارت میں اٹھتے شور سے میرا جی گھبرانے لگا تھا۔ چوکی سے ہٹ جانے کا محل نہ تھا۔ سب کی نظریں مجھ پر منڈلا رہی تھی۔ میں تماشا بنا بیٹھا تھا پھر آدھ گھنٹا بھی نہیں گزرا ہوگا کہ لوگ مٹھائی کے ٹوکرے اٹھا لائے اور انہوں نے پھولوں کی پتیاں مجھ پر اور جھل پر نچھاور کردیں۔ شمشاد خاں کی دیکھا دیکھی اڈے کے آدمیوں نے اتنے ہار پھول میرے اور جھل کے گلے میں ڈال دیے کہ ہمارے چہرے ہی چھپ گئے۔

دھوپ عمارت کے صحن میں اتر آئی تھی۔ لوگ وہاں ٹھنسے بیٹھے رہے۔ انہوں نے چوکی کے قریب آنے کے لیے نذریں گزارنی شروع کردی تھیں۔ میں نے جمرو کو اٹھنے کا اشارہ کردیا تھا اور ہم اٹھا ہی چاہتے تھے کہ سامنے دروازے سے آغا پیا لپکتا جھپکتا، راستہ بناتا، ہجوم پھلانگتا ہوا چوکی پر آیا اور اس نے میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے شمشاد خاں کے کان میں جلدی جلدی کچھ کہا "ہائیں!" شمشاد خاں اچھل پڑا اور بے طرح گالیاں بکنے لگا "وہ چھنال زادی ادھر اپنی ماں کے یاروں کے پاس بھی پہنچ گئی۔"

"کیا ہے استاد؟" جھل نے چونک کر پوچھا۔

"دیکھا تم نے، اس تارا بیگم سسری نے اپنے میکے والوں کو جا کے بول دیا ہے۔ جھل بھائی! ابولتا ہے، خدائی فوج دار تھانے دار چوہان جی باہر کھڑے ہیں، ایک نمبری حرام خور، اس کو کوئی اور گھر دکھائی نہیں دیا۔"

تارا بیگم اور پولیس کے نام پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے بے تابانہ اور جمرو اور زورا کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھی سکڑ گئی تھیں۔

"بلوا لو پھر اندر۔" جھل نے تیوری چڑھا کے کہا۔

"ہاں ہاں، جھل بھائی!" شمشاد خاں مایوسی سے بولا۔ "ظالم کی اولاد وقت دیکھتے ہیں نہ موقع۔ اس رنڈی کو اچھی طرح بول دیا تھا کہ اپنا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

آغا پیا منتظر تھا۔ اس کے ٹوکنے پر شمشاد خاں نے جھنجلا کے کہا کہ چوہان کو زینے کے بیرونی دروازے سے بالائی منزل پر بٹھایا جائے۔ اڈے کے ایک بزرگ سرگوشیوں میں ہدایات دے کے شمشاد خاں فوراً اٹھ گیا۔ جھل نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ انہوں نے نہیں پوچھا لیکن ہم وہاں کیسے بیٹھے رہ سکتے تھے۔ ہم اٹھ گئے۔ لوگوں نے پیچھے ہٹ ہٹ کے ہمیں راستہ پیا کی آمد اور کچھ بعد دیگرے ہم سب کے بالائی کرنے پر عمارت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

زینے کا ایک دروازہ عمارت کے اندر بھی کھلتا نے آغا پیا کو زینے میں روک لیا اور تھانے دار چو کی وجہ پوچھی۔ آغا پیا نے سنسناتی آواز میں بتایا، وہ ہمارے لیے ناقابل فہم بھی تھا، ناقابل یقین کے کہنے کے مطابق کوئی سات بجے تانگے میں تارا بیگم اڈے پر دہائیاں دیتے آئی تھی۔ رات کے اس کے بالا خانے پر ڈھاٹے باندھے ہوئے کچھ آئے۔ ان کے پاس خنجر اور تمنچے تھے۔ انہوں موجود تمام افراد کو ایک کوٹھری میں بند کردیا کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ وہ چاندنی بانو کو اٹھا کر کاذب کے وقت بازار میں گہرا سناٹا ہوتا ہے۔ کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ تارا بیگم بار بار میرا تھی۔ شمشاد خاں نے اس کے ساتھ آنے سازندے کو، بالائی منزل بھیج دیا کہ وہ اپنی لے، میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرام کر رہا خاں کے علاوہ صبح اڈے پر موجود چند اور آدمیوں بیگم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ رات کے ان سب کے درمیان اڈے پر بیٹھے رہے ہیں۔ نے اس واقعے کی بابت ہمیں کچھ بتانا نامناسب ضروری سمجھا۔ عمارت میں لوگ جمع ہوچکے تھے دیر میں رجن سے میرا آمنا سامنا ہونے والا تھا تھا کہ تارا بیگم کے بیان کی روداد میرے لیے ہوسکتی ہے۔ تارا بیگم کو کوئی غلط فہمی تھی تو شم اپنی دانست میں رفع کردی تھی۔

آغا پیا کی زبانی یہ ماجرا سن کے سب گنگ اس سے کچھ اور جاننا چاہتا تھا مگر جمرو کی سرز ہوگیا۔ ہم نے تیز قدموں سے زینہ عبور کیا۔

بھاری تن و توش، مناسب قد و قامت، گالوں، چھوٹی چھوٹی آنکھوں، بادامی رنگ کا ادھ چوہان دو سپاہیوں، ایک نوجوان ماتحت افسر کے

کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے دائیں بائیں جھل اور شمشاد خاں تھے۔ کمرے میں ہمارے داخلے پر چوہان کی بھویں کھنچ گئیں۔

"یہی ہے وہ، جس کا آپ نام لیتے ہیں۔" شمشاد خاں نے میری جانب انگلی اٹھا کے مضطربانہ لہجے میں کہا "یہی ہے اپنا یار۔ جھل بھائی سمیت یہ تینوں ہمارے مہمان ہیں چوہان جی!"

چوہان تند نظروں سے ہمیں دیکھتا اور سرہلاتا رہا "تم کہتے ہو، رات کو یہ تینوں بلکہ چاروں یہیں تھے۔" وہ دھمکتی آواز میں بولا۔

"جی، جی ہاں جناب! یہاں کہا ہے۔" شمشاد خاں نے تنک کے کہا "ادھر سارے لوگ جانتے ہیں۔ سبھی، سبھی۔"

"اور یہ بنے خاں بہادر کہاں ہے؟"

شمشاد خاں نے ایک لمبی سانس کھینچ کے مختصراً اسے کل کے حادثے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ کل صبح سے بنے خاں کا کوئی علم نہیں۔

تھانے دار ایک نظر اپنے ماتحت افسر کو دیکھ کے چپ ہوگیا اور کچھ دیر کے مراقبے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوکے بولا "تو تمہارا ہی نام بابر ہے؟"

میں نے سر جھکا کے تائید کی۔

"تم ہی نے پرسوں رات تارا بیگم کے بالا خانے پر چاندنی بانو کے سودے کی بات کی تھی؟"

"جی ہاں۔" میں نے اٹھی ہوئی آواز سے کہا۔

"اچھا۔" چوہان کے لہجے میں طنز نمایاں تھا "خوب! نشے میں سودے کی بات کی تھی؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"ہم تم سے پوچھتے ہیں۔" وہ نخوت سے بولا۔

"جو آپ کو معلوم ہوا ہے، وہی ٹھیک ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا تھا لیکن وہ سنبھل گیا اکھڑے لہجے میں بولا "تارا بیگم نے بتایا، تم نے دولاکھ روپے بولی لگائی تھی۔"

"آپ نے ٹھیک سنا۔"

"دولاکھ!" اس نے معنی خیز انداز میں دہرایا "خاصی رقم ہوتی ہے۔" میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ ڈھٹائی سے "نشہ کرکے تو بالا خانے پر نہیں گئے تھے؟"

"یہ تو تارا بیگم ہی صحیح بتاسکتی ہے۔"

میرے جواب سے وہ جز بز ہوا۔ "دولاکھ! ایک ساتھ!" اس کی آواز میں تیکھاپن "اتنی بڑی رقم بھی دیکھی ہے تم نے؟"

میرا دماغ گھوم گیا تھا لیکن میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔

"کیا پوچھتے ہیں ہم؟" وہ درشتی سے بولا "اونچا سنتے ہو کیا؟"

"بہتر ہے، آپ کام کی بات کیجے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکل گیا۔

اس نے کرسی پر کئی پہلو بدلے اور جھڑکتی آواز میں بولا "کام ہی کی غرض سے یہاں آئے ہیں صاحب زادے! جو پوچھ ہم پوچھتے ہیں، تمہارے لیے اچھا ہوگا کہ ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

"بشرطیکہ آپ ٹھیک ٹھیک سوال بھی کریں۔"

اس نے پلکیں جھپکائیں، اس کے ہونٹ بھی سکڑ گئے "کب سے تارا بیگم کو جانتے ہو؟"

"پرسوں رات سے۔"

"گویا پرسوں پہلی بار چاندنی بانو کو دیکھا تھا؟"

"یہی نتیجہ نکلتا ہے۔"

"اور، اور پہلی ملاقات میں بولی لگادی؟"

"آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں نہیں۔" وہ کسمسا کے بولا "ہم کو کیا ہوسکتا ہے۔ لکھ لاؤ۔"

"تارا بیگم کا بالا خانہ ایک دکان ہے۔ کوئی بھی بولی لگا سکتا ہے۔" میں نے ترشی سے کہا "دولاکھ کیا، اس سے دگنی چوگنی رقم بھی لگائی جاسکتی تھی۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔" چوہان نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور مچل کے بولا "یہ رقم تمہارے پاس موجود ہے؟"

"بہتر ہے، آپ اس سوال پر نظر ثانی کرلیں ورنہ نامناسب جواب کا الزام عائد مت کیجے گا۔"

"کچھ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔"

شمشاد خاں مداخلت کرنا چاہتا تھا، جھل نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا۔

"معلوم ہوتا ہے، اڈے والوں نے اب دوسرے کام بھی شروع کردیے ہیں۔ زمانہ ہی بدل گیا ہے۔" چوہان زہریلے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے بولا اور شمشاد خاں سے پوچھنے لگا "سنا ہے، آج سے یہی نواب زادے چوکی کے استاد ہیں۔"

"جی ہاں چوہان جی!" شمشاد خاں نے تیزی سے کہا "اور ایسے نہیں، رجن حرام کے جنے کو ناکوں چنے چبوا کے،

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH:5556532
PROP: ALI KHAN

پوری طرح الٹا کے۔"

"سنا ہے ہم نے بھی۔ باہر لوگوں میں اسی کا چرچا تھا۔ کہتے تھے' چاقو اشاروں پر چلتا ہے۔"

"خدا کی قسم چوہان جی! آپ دیکھتے تو کہتے۔" شمشاد خاں تڑپ کے بولا "چاقو اچھالنا کسے کہتے ہیں' کمال کیا ہوتا ہے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں' کیوں نہیں۔" چوہان نے مصنوعی طور پر آنکھیں پھاڑ کے کہا "تیور بتا رہے ہیں' دل کے بھی متوالے لگتے ہیں۔"

"وہ تو سارا معاملہ ہی الٹا ہو گیا' بگڑ گیا تھا' رجن کہتے کی اولاد ایک دم بیچ میں آ گیا۔ میں نے تو چوکی چھوڑ دی تھی۔ خدا معلوم پھر اڈے کا کیا حشر ہوتا۔ اپنے بابر میاں نے لاج رکھ لی۔" شمشاد خاں نے مداہنت کی کوشش کی۔

تھانے دار چوہان نے شمشاد خاں کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ اس کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں' کہنے لگا "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"اب تو بمبئی میں رہتے ہیں۔"

"وہاں بھی اڈا گیری کرتے ہو؟"

"اب کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کیوں؟ چھن گیا؟"

"چھوڑ دیا۔"

"کیوں؟"

"جی نہیں لگتا تھا۔"

"پھر آج کل کیا کرتے ہو؟"

"ایسے ہی۔" میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا "بس گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔"

"کوئی جاگیر وغیرہ بنالی ہے کیا؟"

"یہی جانئے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تو اسی طرح حسیناؤں کی بولیاں لگاتے پھرتے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کتنی بار جیل گئے ہو؟"

"اڈے کے آدمی شمار نہیں کرتے۔"

"کبھی آدمی وادمی بھی مارا؟"

"آپ کب سے پولیس میں ہیں؟"

"کیوں؟" وہ برہمی سے بولا اور شانے پھیلا کے کہنے لگا "یہ شمشاد خاں سے پوچھو۔"

"پشتی' جدی پولیس والے ہیں چوہان جی۔" شمشاد خاں نے توصیفی انداز میں بولا "بڑا نام ہے ان کا۔"

"پھر ایسا سوال یہ کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا "شاید پہلی بار کوئی کیس ہاتھ لگا ہے۔"

چوہان کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں' آواز اکڑ گئی "کون ہے' شمشاد خاں۔ تم نے ہمارا پورا تعارف نہیں کرایا۔"

شمشاد خاں مجھے سمجھانا چاہتا تھا کہ میں نے اس کی بات قطع کر کے کہا "اس کی ضرورت نہیں' نظر آ رہا ہے۔"

"کیا کیا نظر آ رہا ہے؟" چوہان پیچ و تاب کھا کے بولا "زبان کو لگام دے کے رکھو استاد! ایک لڑکی اغوا ہو گئی ہے یہ نہایت سنگین واقعہ ہے۔ خبر ہے' تارا بیگم نے اپنے بیان میں کیا لکھوایا ہے۔ اس نے لکھوایا ہے کہ چاندنی بانو کے اغوا میں تمہارا ہاتھ ہو سکتا ہے۔"

"ساتھ میں یہ بھی تو بتایا ہے کہ ہم نے چاندنی بانو کی بولی لگائی تھی۔"

"ہاں بتایا ہے۔" چوہان پھنکارتی آواز میں بولا "یہ بھی کہ اس نے انکار کر دیا تھا۔"

"لیکن شاید وہ یہ بتانا بھول گئی ہو کہ کل اس نے ایک قاصد بھی ہمارے پاس بھیجا تھا' آگے بات کرنے کے… کس سلسلے میں؟ یہ آپ اندازہ لگانا چاہیں تو لگا سکتے ہیں۔"

"مگر تم وہاں نہیں گئے؟"

"قاصد کل رات ہی یہاں آیا تھا۔"

"اور صبح لڑکی اغوا ہو گئی' واہ! کیسا دل چسپ اتفاق ہے۔ ایک رات تم بالا خانے جاتے ہو' سودے کی بات کرتے ہو' دوسری رات لڑکی اغوا ہو جاتی ہے۔ تارا بیگم کی پوری زندگی کوٹھے پر گزری ہے۔ سارا بازار ایک… قائم ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا۔" چوہان… چلاتے ہوئے بولا "بولی تو جرم ڈھانپنے کے لیے بھی لگائی جا سکتی ہے۔"

"جو آپ کہنا چاہتے ہیں' کھل کر کہیے۔"

"ہم تمہیں چاندنی بانو کے اغوا کے شبے میں… کر سکتے ہیں۔"

"اور آپ کر بھی کیا سکتے ہیں؟ پھر دیر کا ہے کی ہے؟… حجت کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے تلخی سے کہا "یہ بات سمجھ لیجیے تھانے دار صاحب! فرض کیجیے' جس… آپ کو تلاش ہے' اگر ہم وہ نہ نکلے تو آپ کو بہت… ہو گی۔ بعد میں کچھ مت کہیے گا۔ ہمیں صرف اڈے… مت سمجھو۔ تھوڑی بہت الف بے تے ہم کو بھی آتی… دو لاکھ کی بولی لگا سکتے ہیں' وہ اور بھی جگہوں پر اپنا دل… کے لیے ڈھیریاں لٹا سکتے ہیں۔"

… تم ہم سے یہ کس طرح کی زبان میں بات کر رہے… لہجے میں چوہان کی آواز بگڑ گئی "یہ تو سراسر دھمکیاں…"

"آپ کو سیدھی زبان نہیں آتی' ہم کوئی آپ کے زر خرید غلام نہیں ہیں۔ جرم بھی ثابت نہیں ہوا' نہ آپ… کر سکیں گے۔ پولیس افسر آپ ہوں گے تو مجرموں کے…"

"شمشاد خاں' شمشاد خاں!" چوہان مشتعل ہو کے بولا "یہ کیا ہو رہا ہے' تمہارے سامنے ہم سے بدکلامی؟ اس سے کہو کہ ہم اس طرز گفتگو کے عادی نہیں۔ اونچی آواز… پسند نہیں' ہم زبان کتر لیتے ہیں۔ اس سے کہو کہ… افسروں سے بات کرنے کی تمیز سیکھے۔"

چوہان کے چہرے پر آگ دہکنے لگی تھی۔ ہاتھ پیروں میں لرزش سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا ماتحت افسر اور سپاہی بھی اشارے کے منتظر تھے کہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں'… بار چوہان کی طرف دیکھتے' اس کے سامنے لب کشائی کی… نہیں ہوئی ورنہ اب تک خاموش نہ رہتے۔ بہرحال… شمشاد خاں کی سمجھ میں کچھ آ گیا تھا کہ میری زبان درازی کا کیا سبب ہے۔ صاف لگ رہا تھا کہ چوہان کوئی ارادہ کر کے ہی آیا ہے' اڈے پر نشان لگا کے۔ اس نے کسی اور طرف… کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ مجھے خود اپنا یہ لہجہ' یہ جیل… سودے… زہر لگ رہی تھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔… بالا خانے پر چاندنی بانو کی قیمت لگائی تھی اور مجھی کو… کرنی چاہیے تھی۔ دوسروں کی دخل اندازی سے… کا اطمینان نہ ہوتا۔

"سرکار! ایک بات کہوں' گستاخی معاف۔" شمشاد خاں… سے اٹھ کے لجاجت آمیز جرات سے کہا "انہیں… کے لوگوں کی طرح مت دیکھیے۔ بات آپ ہی کی… کے شبے میں ہو گی۔ رات بھر یہ چاروں مہمان اڈے کے لوگوں کے… رہے ہیں۔ ایک دو نہیں' بہت سے گواہ ہیں۔ صبح تو مرزا دلبر نے انہیں جگایا ہے۔ میری بات مان لو… آپ غلط جگہ آ گئے ہیں' ان کی کوئی بات بری لگی ہو'… گستاخی ہو گئی ہو تو میں…"

"… کوئی گستاخی نہیں کی ہم نے۔" میں نے شمشاد خاں کو… نہیں کہنے دی اور زور دے کے کہا "الٹا چوہان… ہماری توہین کر رہے ہیں۔ کیا سمجھا ہے انہوں نے…

… اس کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔" چوہان بھڑک کے بولا۔

"دماغ آپ کا ٹھکانے پر نہیں ہے صاحب! آپ یہاں تفتیش کرنے آئے ہیں یا فیصلہ سنانے۔ جائیے' کسی اور جگہ جائیے۔ اس طرح آپ اپنا وقت بھی خراب کر رہے ہیں' ہمارا بھی۔"

اس نے پہلی بار متوحش انداز میں اپنے ماتحت افسر کی طرف دیکھا۔ ماتحت افسر نے دبے لہجے میں اسے مشورہ دیا کہ ہم سے یہاں کوئی بات کرنا فضول ہے۔ بس ایک ہی معقول صورت ہے کہ ہمیں تھانے لے جایا جائے۔ خود بہ خود ہوش ٹھکانے آ جائے گا۔ چوہان نے اس کی ہمنوائی میں سر ہلایا اور کہنے لگا "تم سے اب تھانے چل کر بات ہو گی۔"

"وہاں پھانسی پر لٹکائیں گے کیا! تھانے کے بعد بھی ایک جگہ ہوتی ہے' اور ہر جگہ آپ کی عمل داری نہیں ہے۔"

فضل کی خاموشی میرے لیے تائید کے مانند تھی۔ اس کے اشارے پر میں نے اپنے لہجے میں کسی قدر ترمیم کی۔ اتنا ہی بہت تھا۔ سو میں نے تحمل سے کہا "چوہان جی! آپ سنجیدہ معلوم نہیں ہوتے۔ اگر آپ کو واقعی چاندنی بانو کی بازیابی کے لیے ایسی بے کلی ہے تو مناسب ہو گا' کسی اور طرف بھی نظر کریں۔ شاید آپ کو سراغ مل جائے۔"

"ہم کو گائیڈ کرتے ہو۔" وہ جلی ہوئی آواز میں بولا "ہمیں اپنا کام اچھی طرح معلوم ہے۔"

"لیکن راستے نہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تو تم ہم کو سمجھاؤ گے راستے؟"

"جستجو شرط ہے۔"

"کون' کون سا راستہ؟" وہ بظاہر بے دلی بلکہ حقارت سے بولا۔

"تارا بیگم کے بالا خانے کا۔"

"کیا!" اس کا منہ بن گیا' پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں تاہم اس کے تیور میں مدافعت آ گئی تھی "پولیس سب سے پہلے وہیں گئی تھی۔" اس نے بے اعتنائی سے کہا۔

"وہیں سے آپ کو سراغ مل سکتا ہے۔"

"وہاں سے۔" وہ سر جھٹک کے بولا "مجرم اپنی نشانی چھوڑ جائیں گے؟"

"سب سے بڑی نشانی تو خود تارا بیگم ہے۔"

"تارا بیگم! کیا بکتے ہو؟"

"دیکھیے' اس طرح کے لہجے میں آپ ہم سے مجرم ثابت ہونے کے بعد بات کیجیے گا۔"

"کیا!" وہ جھنجلا گیا "کیا اب تم ہمیں بات کرنے کا سلیقہ

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
PROP: ALI KHAN

بھی سکھاؤ گے؟"

"ہم اپنی زبان میں بات کریں تو پھر آپ کو بھی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم ہو کون؟ بیچتے کیا ہو۔"

میرے جی میں تو کچھ اور آیا تھا لیکن میں نے خود پر جبر کیا "ہم کوئی بھی ہوں لیکن وہ نہیں ہیں جن کے لیے آپ بے قرار ہو رہے ہیں۔"

چوہان کے ماتحت کا پارا چڑھ گیا۔ اس سے برداشت نہیں ہوا' اس نے چوہان سے اجازت لیے بغیر کھردرے لہجے میں مجھے تنبیہہ کی کہ میں اپنی کھال میں رہوں اور اوقات سے بڑھ کے بات نہ کروں۔

"آپ بھی ذرا زمین دیکھ کے بات کیجیے جناب' اور آگے کچھ کہنے سے پہلے کان کھول کر سن لیجیے' اور آخری بار اس کے بعد جو مرضی ہو کیجیے گا۔ استاد شمشاد خاں کی بات پر آپ نے غور نہیں کیا یا یقین نہیں کیا لیکن آپ کے پاس ذرائع کی کمی نہیں۔ اپنے طور پر' آپ یہاں اڈے پر موجود لوگوں سے ٹوہ لے سکتے ہیں کہ پچھلی رات ہم نے کہاں گزاری ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ چاندنی بانو کو کون لے گیا' اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ہم کوئی ٹھیکے دار نہیں ہیں۔ ایک دوسرا جواب بھی ہے۔ پہلے یہ شبہ کچھ دیر کے لیے سہی' ذہن سے نکال دیجیے کہ وہ ہمی سے ہو سکتے ہیں۔ جو میں کہتا ہوں' اچھا ہوگا' اسے توجہ سے سنیے اور ہو سکے تو درمیان میں دخل مت دیجیے۔ ایک ہی بات ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ تارا بیگم نے چاندنی بانو کے لیے ہماری نذر یا قیمت سن کے بے شک انکار کر دیا تھا لیکن اس کے انکار میں زور نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے سوچنے کا موقع دیا جائے۔ اسے چاندنی بانو کا عندیہ بھی لینا ہوگا۔ اتنی بڑی بولی سن کے اس کا پریشان ہو جانا لازم تھا۔ ہم نے خود بھی اسے سوچنے کی مہلت دی تھی اور باور کرایا تھا کہ اپنی آمادگی کی صورت میں وہ ہمیں جلد سے جلد مطلع کرے۔ ہو سکتا ہے' اس نے کل سارے دن بالاخانے پر آنے والے چاندنی بانو کے طلبگار راجاؤں' نوابوں سے رابطہ کیا ہو۔ ہم جیسا گاہک ہاتھ سے نکل جانے کے اندیشے میں اس نے انہیں بہت کم وقت دیا ہوگا۔ ان لوگوں کی طرف سے اسے کوئی امید افزا یا دوسرے لفظوں میں سنہرا جواب نہیں ملا تو اس نے فی الفور ہمارے پاس قاصد روانہ کیا۔ ہم رات ہی' اسی قاصد کے ہمراہ چاندنی بانو کو لانے کے لیے بالاخانے جا سکتے تھے لیکن جس شخص کے لیے ہم نے چاندنی بانو کی بات کی تھی' وہی کہیں گم ہو گیا تھا۔

اب ہمارے وہاں جانے سے کیا حاصل۔ بہتر ہے 'بچے
لوگوں کو جا کے ٹٹولے جن سے کل تارا بیگم نے چار وقت ہی
کے لیے بات کی تھی۔ ہمیں معلوم ہے' وہاں آپ کی
اتنی آسان نہیں ہوگی' اجازت لینی پڑے گی' سات
کرنے پڑیں گے۔ اس طرح آپ منہ اٹھا کے وہاں
جا سکیں گے جس طرح یہاں ہم چور اچکوں' اٹھائی گیروں
پاس آگئے ہیں۔"

میری توقع کے مطابق اس مرتبہ چوہان ایسا بر
ہوا۔ وہ منہ پھلائے' منہ سجائے کچھ سوچتا اور
گھورتا رہا' پھر چونک کے آمرانہ لہجے میں بولا "ہم
جا سکتے ہیں۔ ہمارے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ
سکتا۔ سب ہمیں جانتے ہیں کہ ہم کسی لاٹ صاحب
نہیں کرتے۔"

اتنی دیر میں آغا پایا بھٹل کے لیے چوہان نے
دلبر اور اڈے کے دوسرے آدمی مٹھائی کے طشت
وغیرہ لے آئے۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ہو گئی
کے آدمیوں کے واپس جاتے ہی چوہان اکھڑی ہوئی
بولا "ٹھیک ہے' دوسری طرف بھی ہم دیکھیں گے
رہے استاد! ہم کسی وقت بھی واپس آسکتے ہیں۔"

میں نے سکون کی سانس لی اور کہا "آپ کو زحمت
کی کیا ضرورت ہے۔ کسی کو بھی بھیج دیجیے گا' ہم خود
گے لیکن ایک درخواست ہے جناب! زیادہ وقت
مہربانی ہوگی۔ ہمیں یہاں سے جلد از جلد روانہ
آپ نہ آئے تو ہم آج شام یا کل صبح کسی وقت چلے

"تم لوگ ابھی کہیں نہیں جاؤ گے۔"

"ہم ولایت نہیں جائیں گے جناب! ہمیں
میں رہیں گے اور اپنے اتے پتے سارے دیتے جا
یہاں استاد شمشاد خاں بھی ہماری ضمانت کے
ہیں۔"

"بالکل' بالکل۔" شمشاد خاں نے سینے پر ہاتھ

"ایک میں ہی نہیں' سارا اڈا' اڈے کا ایک ایک

"ہمیں صرف تمہارے مہمانوں سے واسطہ

چوہان حتمی لہجے میں بولا "یہ کہیں نہیں جائیں گے

"میں آپ سے منت کرتا ہوں چوہان جی! ان
نہ رکنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" شمشاد
سے بولا "ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ایک تو
راستے کا پتھر بن گیا۔ یہ بے چارے تو آگے جا
معلوم ہوا تو میں ضد کر کے اسٹیشن سے یہاں

الو کا پٹھا' بھٹل بھائی کی بات مان لیتا تو یہ سارا
کا ہے کو ہوتا لیکن ہونی کو 'سچ بولتے ہیں' کون ٹال
سکتا ہے۔ آپ کو خود اندازہ کرنا چاہیے کہ یہ گڑی بھی کسی
وجہ ہے۔ میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں۔ شہزادے بابر
نے اپنے لیے نہیں' بنے خاں فراری' کے لیے چاندنی
بانو کی بات کی تھی۔ بنے خاں اس پر مرمٹا تھا لیکن وہ سور کا
بچہ ایسا غائب ہوا کہ پھر دکھائی ہی نہیں دیا' سمجھ میں آنے والی
بات نہیں۔ پر ہوا یہی ہے بنے خاں میں بھی کوئی لڑکی اٹھا کے
لے جانے کا دم نہیں ہے مگر کیا پتا' غیرت مند کی اولاد تھا'
عشق میں اندھا ہو گیا ہو۔ وہ خریدی ہوئی چاندنی کے لیے تیار نہیں
تھا۔ بنے خاں کو بھی ڈھونڈیے۔ یہ لوگ میرے مہمان ہیں
اور مجھ کو جی جان سے پیارے ہیں۔ میرے منہ میں خاک'
اگر ان پر جرم ثابت ہو جائے اور یہ آپ کو ادھر دکھائی نہ دیں تو
آپ مجھ کو لے چلئے گا۔ میں جرم قبول کر لوں گا۔ یہ واپس
آجائیں گے۔ لکھنؤ میں ان سے ایسا برتاؤ ہوا۔"

"ٹھیک ہے' مگر جب تک ہماری اجازت نہ ملے" چوہان حاکمانہ لہجے میں بولا "انہیں یہاں ٹھہرے رہنا ہوگا۔"

"اس سے بہتر ہے کہ آپ فوراً ہمیں عدالت میں پیش کر دیں۔" میں نے اچٹتی آواز میں کہا۔

"وقت آنے پر تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔"

"مگر ہم بہت دیر تک یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

"کیوں؟ تم کو تو یہاں کا اڈا سنبھالنا ہے۔"

"اڈے پر اب استاد شمشاد خاں ہی بیٹھیں گے۔"

"پھر رجن استاد سے پچھیا کرنے کی ضرورت تھی؟"

"رجن نے حرامی پن کیا تھا۔" شمشاد خاں نے غصے اور نفرت سے لبریز آواز میں کہا "رجن ادھر چوکی پر بیٹھ جاتا تو برباد ہو جاتا۔" شمشاد خاں نے از سر نو وہ حالات بیان کیے جن کے سبب مجھے رجن کے خلاف چاقو اٹھانا پڑا تھا۔

چوہان نتھنے پھلائے' ہونٹ بھینچے گپ چپ بیٹھا رہا' پھر اس نے اپنے ماتحت افسر سے انگریزی میں پوچھا کہ ہم لوگ تو مختلف کہانی سنا رہے ہیں' وہ کیا سمجھتا ہے۔

"جناب! میری رائے میں تو حفظ ماتقدم کے طور پر انہیں تھانے لے چلنا چاہیے۔" ماتحت افسر نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "یہ کہانی سوچی سمجھی ہوئی بھی ہو سکتی ہے۔"

چوہان کا منہ کچھ کڑوا ہو گیا "میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"تو پھر یہاں ان کے ٹھہرے رہنے کی کیا ضمانت ہے؟ یہ بھاگ بھی سکتے ہیں۔"

چوہان نے کچھ تامل کے بعد اپنے ماتحت سے کہا "بھاگ کر کہاں جائیں گے' شمشاد خاں تو موجود ہے ہی' ہم اسے کھینچ دیں گے۔"

"شمشاد خاں لڑکی کو بازیاب کرانے میں کسی حد تک ہماری مدد کر سکتا ہے۔" ماتحت افسر مودبانہ لہجے میں بولا "ابھی تو بات اپنی حد تک ہے لیکن لڑکی جلد ہی بازیافت نہ ہوئی تو اوپر بھی پہنچ سکتی ہے اور سنگین صورت اختیار کر سکتی ہے۔ اہم بات لڑکی کا سراغ ملنا ہے۔"

"لیکن شاید ہمیں یہاں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ تم نے نوجوان استاد کی گفتگو پر غور نہیں کیا۔ یہ اڈے کا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ لکھنؤ کے اڈے سے اسے دلچسپی ہوتی تو یہ خود یہاں ٹھہرنے پر اصرار کرتا۔"

"ٹھیک ہے جناب لیکن بیچ میں لڑکی بھی تو آئی ہے۔ ایسے حالات میں ان کا شہر میں قیام کرنا کیونکر مناسب ہو سکتا ہے۔" ماتحت افسر نے زیرلبی سے کہا "یہ عاجزی بھی ہو سکتی ہے۔"

چوہان کچھ منتشر سا نظر آنے لگا' پھر بولا "لیکن یہ کیسا حیرت ناک واقعہ ہے کہ ایک نوواقف کی خوشنودی کے لیے کوئی اتنی بڑی رقم داؤ پر لگا دے۔"

"یہ کمال کا ستم بھی تو ہے جناب!"

"مگر بولی لگائی گئی تھی۔ تارا بیگم کا بیان ہے۔"

"بولی لگانا اور بولی ادا کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ بولی کی ادائی کا مرحلہ کب آیا تھا اور آتا بھی کب تھا جناب! کیا اتنی بڑی رقم یہ ساتھ لیے پھرتے ہیں؟"

میرے جی میں آئی' اسے بتاؤں کہ رقم موجود ہے تو اس کا بندوبست ثانوی چیز ہے لیکن میں خاموش ہی رہا۔

چوہان نے گویا میری طرف سے جواب دیا "بات کی ہونے پر رقم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ جب تک لڑکی تارا بیگم کی تحویل میں رہتی۔"

"لیکن جناب! جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے' بولی تو ارتکاب کیے جانے والے جرم کی ڈھال کے طور پر بھی لگائی جا سکتی ہے۔"

"پھر انہیں بولی لگانی ہی نہیں چاہیے تھی۔ بولی لگانے کے باعث تو ہم آسانی سے ان تک پہنچ گئے۔ لڑکی انہیں مطلوب تھی تو انہوں نے اتنی عجلت کیوں کی۔ کچھ روز کا وقفہ دے کے' لکھنؤ سے کچھ دن باہر رہ کے یہ چپ چپاتے واپس آتے اور یہ قدم اٹھا لیتے۔"

"میرا خیال ہے' ہمیں ٹٹولنا چاہیے کہ ان کے پاس رقم کی ادائی کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ اس نکتے سے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔"

"یہ کوئی ایسا نکتہ نہیں۔" چوہان نے رکھائی سے کہا "یہ رقم کا انتظام کرسکتے ہیں۔"

"بہت بڑی رقم ہے جناب!"

خاموش رہنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ بٹھل نے اس اثنا میں آنکھیں میچ کے مجھے کوئی اشارہ کیا' میں کچھ اخذ نہیں کرسکا کہ یہ ان کی گفتگو میں مداخلت سے باز رہنے کی ہدایت ہے یا مداخلت کرنے کی۔ میری دانست میں ابھی مجھے ضبط ہی کرنا چاہیے تھا۔ میں بہرا بنا بیٹھا رہا۔

چوہان کو کشمکش سے دوچار دیکھ کے ماتحت افسر نے کہا "مجھے تو یہ لوگ بہت پراسرار لگتے ہیں۔ اگر واقعی یہ سچ ہے کہ انھوں نے چاندنی بانو کے لیے اس رقم کی پیش کش کی تھی تو آگے کا تخمینہ بھی لگایا جاسکتا ہے' اور آپ ہی کے بقول ایک نوواقف کے لیے یہ اس خطیر رقم کی سخاوت کرسکتے ہیں تو یکی کچھ' یہیں تک تو ان کے پاس نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک معما ہے جناب! مجھے تو یہ سب کچھ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔"

"ہوسکتا ہے' ہوسکتا ہے۔" چوہان متردد لہجے میں بولا "بہرحال آگے دیکھتے ہیں۔"

"فرض کرو' چاندنی بانو بازیاب ہوجاتی ہے اور بنے خاں بھی مل جاتا ہے۔" چوہان نے مجھے مخاطب کرکے پوچھا "تو تمھاری بولی قائم رہے گی؟"

"یہ بنے خاں پر منحصر ہے' اگر بنے خاں چاندنی بانو کے برآمد ہونے کے بعد بھی اس کا طلب گار ہے تو ہم اپنی زبان پر قائم ہیں۔"

"دیکھا آپ نے!" ماتحت نے بہ عجلت انگریزی میں کہا "اب پیشکش مشروط ہوگئی ہے۔ شاید اس لیے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

میں نے چاہا کہ کہوں' ظاہر ہے' اب صورت حال بدل گئی ہے لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔

چوہان نے غالباً اپنے ماتحت کی دل جوئی کے لیے اسی کا سوال دہرایا "رقم کا انتظام کتنی دیر میں ہوجائے گا؟ تم اتنی بڑی رقم ساتھ لیے تو نہیں پھرتے ہوگے؟"

"میں نے سوچا' کہوں' اس کا جواب وہی ہے جو ابھی خود اس نے اپنے ماتحت کو دیا تھا لیکن اپنی انگریزی کا اظہار سردست مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا "بمبئی کے ایک بینک میں رقم محفوظ ہے۔ وہاں سے منتقل ہونے میں چند روز لگ جائیں گے۔"

"پیشگی کے پیسے' پچیس تیس ہزار روپے تو ڈالے جاسکتے ہیں۔" بٹھل نے پہلی بار زبان کھولی۔

"اوہ!" چوہان دیدے پھاڑ کے رہ گیا۔

میرا خیال تھا کہ چوہان پولیس کا آدمی ہے' شک وغیرہ اور خاصہ ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ رقم دکھائی جا... اس نے خواہش نہیں کی۔

"شمشاد خاں نے مٹھائی اور شربت کی طرف توجہ دلائی لیکن اس نے کوئی رغبت ظاہر نہیں کی۔

"بہرحال ابھی تین چار روز تمھیں یہیں ٹھہرے رہنا..."

"یہ حکم کس بنیاد پر ہے؟" میں نے الجھ کے کہا۔

"واقعے کی نوعیت کی بنیاد پر۔" وہ چڑ... "مشتبہ لوگوں کو پابند کرنے کا ہمیں اختیار ہے اور... لیے بھی یہی بہتر ہے۔"

"لیکن ہم بھی آپ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔"

"صرف تمھارے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"ہمارا اعتبار کیجیے۔ کوئی کسر رہ گئی ہو تو میں... کرتا ہوں۔" میں نے پژمردگی سے کہا "یقین کیجیے... اور مبالغہ نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادا معاملہ... بتایے' بنے خاں' ایک نوجوان جس کے سامنے... تھی' اس لڑکی چاندنی بانو کے بغیر بہت ادھورا رہتا... ایک آدمی دوسرے آدمی کے بغیر بہت ویران... صاحب! بنے خاں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ... حاصل کرسکے۔ یہ اتفاق تھا کہ چاندنی اس قسم کی... تھی جنھیں اس طرح کا کچھ بدل دے کے' کچھ... حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ادھر میرے پاس اپنی ضرورت... زائد روپے تھے۔ یہ رقم چلے جانے سے مجھے کوئی... مگر بنے خاں کو چاندنی مل جاتی۔ کسی کو اس کا... جائے تو اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے مگر آپ... سمجھیں گے' میں سمجھا نہیں پاؤں گا۔ بس اتنی کا... جناب! بنے خاں' رجن سے بھی کمزور نہ ہوگا۔ ... ہی حاضر نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے' وہی چاندنی بانو کو... لیکن اس واقعے سے ہم لوگوں کا کوئی تعلق نہیں...

"ہم سمجھ رہے ہیں لیکن گواہ و شہادت' دیکھ... قانونی واجبات ہیں۔" چوہان کی آنکھوں میں نم... ہویدا ہوئی۔ پہلی بار مجھے اس کے لہجے سے جذب... احساس ہوا۔ کہنے لگا "آگے بیانات کے ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"مگر کبھی' جب ہم کسی طور ملوث..." میں نے بٹھل کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔

"چوہان بھی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ شمشاد خاں نے بہت اصرار کیا لیکن چوہان نے مٹھائی کا ایک دانہ' شربت کا ایک جرعہ لینا گوارا نہیں کیا۔ سبھی اس کے ساتھ اٹھ گئے اور پیچھے پیچھے گلی تک آگئے۔

رسمی سلام دعا کے بعد وہ رخصت ہوگیا۔ جمرو اور زورا نے زور سے میرے بازو پکڑ لیے۔ چوہان کو مڑتے دیکھ کر وہ سیدھے ہوگئے۔ مجھے سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ چوہان نے میری جانب انگلی اٹھائی تھی۔ کچھ توقف کے بعد اٹھتے قدموں سے میں اس کے پاس پہنچا۔ پہلے تو وہ میری صورت دیکھتا رہا' پھر یکایک میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "کب جانا چاہتے ہو تم؟"

میں نے جلدی سے کہا "آج شام یا کل صبح کسی وقت۔"

مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ چوہان نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا ہے' گو میں نے جواب اپنی زبان میں دیا تھا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ آگے کوئی وضاحت کرتے ہوئے میری زبان لڑکھڑا گئی۔

وہ مسکرانے لگا اور میرا شانہ تھپکتے ہوئے بولا "میری نگاہ نے دھوکا نہیں کھایا۔ جب انسپکٹر رضوی سے اپنی گفتگو کے دوران تمھارے چہرے کے رنگوں سے مجھے شبہ ہوا تھا' آخر تم ہی سے ایک غلطی ہوگئی۔ مبالغے اور معمے کی بات تو میرے اور رضوی کے درمیان ہوئی تھی بھائی!"

ایک لمحے کے لیے مجھ پر سناٹا سا چھا گیا۔

"لیکن ایک حیرت ابھی باقی ہے۔ تم' تم ان لوگوں کے درمیان کیوں ہو۔" وہ کھرائی ہوئی آواز میں بولا "میری مراد ہے' اڈے کے اس ماحول میں۔"

میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے سوچتا رہا کہ اسے کیا بتاؤں۔

"یہ جاننے کا اشتیاق رہے گا' خیر پھر کبھی سہی۔ ہوسکے تو یہاں سے جانے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملنا۔ اگر اب ممکن نہ ہو تو جب بھی یہاں آؤ۔ یقیناً تمھاری رواداری میرے تجربے میں اضافے کا سبب ہوگی۔"

"جی جی۔" میں نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔

"اور اس بڈھے توتے شمشاد خاں سے کہنا' وہ کہہ رہا تھا کہ تم یہاں نہ ہوتے تو وہ خود کو پیش کردے گا اور سارا جرم اپنے سر لے لے گا۔ اس سے کہنا کہ وہ جرم تو ضرور قبول کرلے گا' لڑکی کہاں سے ہمارے حوالے کرے گا۔"

مجھے بھی ہنسی آگئی۔ میں نے بہ مشکل کہا "آپ نہایت مہربان پولیس افسر ہیں۔ مجھے معاف کردیجیے' میرے دل میں آپ کے لیے بڑی بدگمانیاں۔"

"میری کمر پر دھپ مار کے وہ مجھے گلے سے لگالیتا لیکن شاید اسے اپنے منصب کا خیال آگیا۔ ادھر گلی میں بہت سے لوگ ہماری جانب نگراں تھے۔ چوہان نے رسمی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ شام کو جب انسپکٹر رضوی کے آنے پر اپنا بیان لکھوا دینا۔ اس کے بعد تم جب چاہو یہاں سے..."

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ پلٹ کے تیز قدموں سے آگے چلا گیا۔

اب کے انھوں نے انتظار کیا کہ چوہان اور اس کے ساتھی گلی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہوجائیں۔ ان کے دور ہوتے ہی زورا' جمرو اور شمشاد خاں نے مجھے بری طرح بھینچ لیا۔ ان کی حیرت آمیز مسرت نہایت فطری تھی۔ مجھے بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اس خوش وضعی سے یہ مرحلہ گزر جائے گا۔ ایک دفعہ پولیس کے نرغے میں آجانے کے بعد بچ نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں چند روز تو کیا بہت دنوں تک روک سکتے تھے۔ خانہ پری کے لیے انھیں کچھ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اڈے کے آدمی پہلے زد پر آتے ہیں۔ پھر وہی کچھ ہوسکتا تھا کہ الجھتے الجھتے بہت سی گرہیں پڑ جاتیں مگر میں نے کوئی معرکہ سر نہیں کیا تھا۔ میرے لیے تو یہ محض آموختہ تھا۔ بٹھل کو کئی بار میں دیکھ چکا تھا۔ پپو کے قتل کے دن' رات کو بمبئی پولیس سے اور تبت سے واپسی پر کلکتہ پولیس سے اس نے اسی طور نجات حاصل کی تھی' اسی تاویل و حجت سے۔ چند روز پہلے سکندر آباد اسٹیشن پر یہی کچھ ہوا تھا۔

پولیس کی آمد' عمارت میں موجود ہجوم کے لیے بے قراری کا باعث ہونی چاہیے تھی۔ لوگ وہم و قیاس کے جال بنتے جارہے ہوں گے۔ گلی میں اسی لیے بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے کہ پولیس کی واپسی کا منظر بہ چشم خود دیکھ سکیں۔" تو انسپکٹر چوہان نے خیال آرائیوں اور سخن طرازیوں کا باب ہی بند کردیا۔ رخصت ہوتے وقت مجھ سے اس کے سلوک کے سبھی گواہ تھے۔ اب انھیں قرار آگیا ہوگا۔

دیگیں پک چکی تھیں۔ کھانے کی خوشبو عمارت میں بسی ہوئی تھی۔ اتنی جلدی اتنا بڑا انتظام بجائے خود ایک کارنامہ تھا۔ جیسے ہی ہم چوکی پر آکے بیٹھے' دسترخوان بچھا دیے گئے۔

کچھ لوگوں کو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے باہر جانا پڑا۔ شمشاد خاں نے اعلان کردیا تھا کہ آج اڈے پر آنے والے ہر شخص کو مہمان کے طور پر برتا جائے گا۔ کھانا، مٹھائی، مشروبات، جس کی جو خواہش ہو، اسے سیر کردیا جائے، چار بجے شام تک کھانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ دسترخوان بار بار اٹھائے اور بچھائے جاتے رہے۔ لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ عصر کے بعد شیرینی، شربت اور قہوے کا دور چلا۔ واللہ اعلم مگر آغا پا نے مجھے بتایا کہ رجن بھی بنے خاں کی طرح خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔ باہر چند لوگوں نے اس سے تاسف کا اظہار کیا تو جواب میں اس نے کسی تکدر اور تردد کے بغیر کہا کہ اس نے کچھ کھویا نہیں، پایا ہے۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں، وہ استاد بٹھل کے شاگرد سے زیر ہوا ہے۔ اور اسے اطمینان ہے کہ لکھنؤ کے اڈے پر پہلی مرتبہ کوئی استاد آیا ہے۔ اڈے کی چوکی کی یہ مضبوطی اس کی دخل اندازی کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے اور اگر وہ چوکی پر نہیں ہے تو کیا ہوا، بنے خاں بھی تو نہیں ہے۔ آغا پا کے مطابق رجن کہتا تھا کہ اس کشیدہ و برگشتہ ماحول میں اسے استاد بٹھل کے پاس جانے کی جرات نہیں لیکن یہاں نہ سہی، اس کی خدمت میں سلام پیش کرنے اور اس کے پیروں پر سر رکھنے وہ ضرور جائے گا۔ اسے تو کسی ایسے ہی استاد کی تلاش تھی۔ یہ سن کے مجھے کچھ یہ گمان ہوا کہ آغا پا بھی رجن کے لیے نرمی کا ایک گوشہ رکھتا ہے اور اس کی عرض احوال میں رجن کے لیے کوئی سفارش پنہاں ہے۔

چوکی سے اٹھنا مشکل ہوگیا تھا، بطور خاص میرا۔ شام کے وقت تو قطار لگ گئی، ایک ہٹتا نہیں تھا کہ دوسرا آجاتا تھا۔ سلام کرتا، کیلے کے پتوں میں لپٹے ہوئے تازہ پھولوں کے ہار کھول کے بٹھل اور شمشاد خاں کے علاوہ میرے گلے میں ڈالتا، مٹھائی کا دونا آگے رکھتا اور لوٹ جاتا، کوئی سکوں سے بھری ہوئی ریشمی کپڑے کی تھیلی میری طرف چپکے سے بڑھا دیتا، کوئی ہاتھ چومنے لگتا۔ اڈے کا ایک بزرگ آدمی سامنے آنے والے شخص کا سرسری طور پر تعارف کراتا۔ میرا اور بٹھل کا سر ہلانا، نذر گزار کی نذر قبول کرنے اور اس کا نام ذہن نشین کرلینے سے عبارت تھا۔ مجھے تو اس فضول معمول سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ زورا اور جمرو بھی میری وجہ سے بندھے بیٹھے تھے۔ میں نے اشاروں میں جمرو سے التجا کی کہ وہ کسی طرح مجھے ان رسموں سے چھٹکارا دلائے۔ اسی نے میری مشکل حل کی اور شمشاد خاں کے کان میں کوئی عذر کرکے یکایک اٹھ کھڑا ہوا، پھر میں نے بھی پلٹ کے شمشاد خاں اور بٹھل کی طرف نہیں دیکھا اور چوکی سے اتر آیا۔

عمارت کے اندرونی حصے سے گزرتے ہوئے ہم بالائی منزل کے کمرے میں آکے بستروں پر دراز ہوگئے۔ زورا اور جمرو کو بے چینی ہونے لگی کہ کچھ دیر کے لیے کیوں نہ سلمٰی کو دیکھ آئیں، بعد میں وقت ملے نہ ملے۔ پورا ایک دن ہوگیا تھا لیکن بستر پہ آکے کچھ اور کسل مندی ہوگئی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہی سلمٰی کے پاس چلے جائیں، میری طرف سے اسے پوچھ لیں۔ دونوں چلے گئے۔ نیچے جاکے انھوں نے میری دلبستگی کے لیے آغا پا کو بھیج دیا۔

آغا پا ایک خوش طبع شخص تھا اور ایران و توران کی باتیں کرتا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے مزے دار قصے کہانیاں اسے ازبر تھیں۔ میں نے اسے بھی واپس کردیا۔ آدمی کا جی اپنے آپ سے باتیں کرنے کو بھی تو دل چاہتا ہے۔ نچلی منزل سے اٹھنے والے شور سے کمرا بھی محفوظ نہیں تھا۔ طرح طرح کی آوازیں دور جاکے ایک آواز، ایک طرز ہوجاتی ہیں اور [illegible] گراں نہیں گزرتیں۔ نیند تو بالکل نہیں آئی لیکن بہت سکون محسوس ہوا۔ ہر بار ایک زنداں وار زنداں سے رہائی کا ایک سکون۔ آدمی کو نوشتے پر یقین نہیں ہے، بار بار کی آزمائش کے باوجود ہر آزمائش نئی لگتی ہے۔ یہ چند دن بھی یونہی گزرنے تھے، خواہ مخواہ ضائع ہوگئے۔ وہی بات ٹھیک ہے، گوشہ گیری میں بڑی امان ہے۔ مجھے کسی مناسب وقت کا انتظار تھا۔ میں نے بٹھل سے حتمی بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میں نے طے کیا تھا کہ اس سے کہوں گا، وہ چاہے تو فیض آباد میں زریں کے پاس ٹھہر جائے یا بمبئی میں ابا جان کے پاس چلا جائے۔ اب ہمیں کہیں اور نہیں جانا۔ گھر سے قدم نکالنا ہمیں راس نہیں۔ ہر جگہ ایک نئی افتاد جیسے ہماری منتظر ہے، اور اب اتنے شہر، اتنے گلی کوچے دیکھ لیے ہیں کہ اب کسی سے کوئی امید نہیں۔ آگے جہاں بھی، جن نئی جگہوں پر جائیں گے، کوئی ضمانت نہیں کہ مولوی صاحب وہاں سے اور طرف کا قصد نہ کرچکے ہوں۔ میں بٹھل کو ٹالتا رہا [illegible] کے لیے نت نئے عذر تراشتا، دلیلیں کھوجتا رہا مگر مجھے کوئی نیا عذر، نئی دلیل سجھائی نہیں دی۔ بٹھل سے تو پہلے ہی بہت کچھ کہہ چکا تھا، ناراضی اور تلخی کی حد تک میں اصرار کیا تھا، ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ۔ یہی ایک [illegible] کہ فیض آباد اور بمبئی جانے کے بعد کسی دن تن تنہا [illegible] ہوں اور اپنا آزار خود بھگتوں۔ کبھی واپس آگیا تو ٹھیک [illegible] لوگ صبر کرلیں گے۔ صبر کتنا ہی جبر ہو، آدمی عادی [illegible]

ہے۔ ویسے بھی میں کسی کے لیے کتنا زندہ ہوں یا ایک دوسری صورت بھی تھی کہ اپنے آپ کو ترک کرکے ان کے حوالے کردوں۔ ان کا ارادہ میرا ارادہ ہو۔ آدمی غلامی بھی تو کرتا ہے، معذور بھی تو ہوجاتا ہے اور مال و زر کی طرح اپنے طلب گاروں میں خود کو تقسیم بھی تو کردیتا ہے۔ موت کے بعد ترکے کے سزاوار بھی تو یہی ہوتے ہیں۔ کوئی ایک فیصلہ تو کبھی نہ کبھی مجھے کرنا ہی ہے۔ اب شاید میرا ارادہ، میرا عزم میرے اختیار میں نہیں رہا لیکن جتنا میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا، دھند اتنی ہی تیز ہوجاتی۔ ظاہر ہے، میں کہیں نہ کہیں منہ چھپالوں گا تو کتنے لوگ ویران ہوجائیں گے۔ ایک کے بعد ایک چہرہ۔ کیسے کیسے میرے دل ساز و دلنواز ہیں۔ میں خود کو ان کے سپرد کردوں تو یہ سپردگی کتنی حقیقی اور گہری ہوگی۔ میں ان میں شامل ہوکے کس قدر شاد رہا ہوں۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ پہلے بھی میں نے بہت جتن کیے ہیں۔ کیا حاصل ہوا؟ میں اپنے عزم اور ارادے کی بات کرتا ہوں مگر یہ میرے اختیار میں ہے کہاں۔ کوئی اور فیصلہ کرنے کی سکت مجھ میں کتنی ہے پھر شاید جو ہورہا ہے، یہی مناسب ہے، آدمی تقدیر و مقدور کے سوا کیا کرسکتا ہے۔

اندھیرا چھا گیا تھا۔ وقت کی کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ بیداری کی غفلت نیند سے زیادہ نادم کرتی ہے۔ جمرو اور زورا کے آجانے پر میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ دوسروں کا اتنا خیال بھی خود کو ترک کردینے کے مترادف ہے۔ یہ سب کچھ تو میں کرتا ہی رہا ہوں۔ اس مروت سے ان کی سیری ہوجاتی ہے تو بھلا یہ کیا میرے امکان میں ہے۔

آغا پا بالائی منزل پر میرے کمرے کے اردگرد منڈلاتا رہا تھا، چوکیدار کی طرح۔ میرے آرام کی خاطر وہ کمرے میں داخل نہیں ہوا اور روشنی بھی نہیں کی۔ اسے کیا معلوم تھا ایک پل کے لیے بھی میری آنکھ نہیں لگی ہے۔ عمارت میں ہر سو چراغاں ہورہا تھا۔ کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں چراغ نہ جل رہا ہو۔ اندر نچلی منزل پر تو جشن کا منظر تھا۔ باہر گلی میں نوبت بج رہی تھی۔ لنگر جاری تھا۔ آغا پا نے بتایا کہ کھانے کے بعد، پہلے زنانے اٹکھیلیاں کریں گے، پھر مجرے کی محفل آراستہ کی جائے گی۔ عرصے بعد کہیں اڈے کی رونق بحال ہوئی ہے، کلن خاں کے رخصت ہونے کے بعد اڈا ہی اجڑ گیا تھا۔ بٹھل اور شمشاد خاں گاؤ تکیے سے کمر لگائے چوکی پر بیٹھے تھے۔ ہم بھی وہیں چلے گئے۔ انھیں ہمارا ہی انتظار تھا۔ چوکی پر دسترخوان بچھادیے گئے۔ بریانی، پتلے شوربے کا قورمہ، ماش کی بھریری دال، فیرنی، نان اور چپاتیوں کا اہتمام تھا۔ بھوک ایسی کھلی نہیں تھی لیکن کھانوں کی خوشبو بھی اشتہا آمیز کرتی ہے۔ خوشبو بے جواز نہیں تھی۔ تمام چیزیں ذائقے دار تھیں۔ کھانے کے لیے بھی ایک ماحول چاہیے۔ لگتا تھا، عمارت میں موجود ہجوم آنے والے کل سے بے نیاز ہے، آنے والے کل کے معمول سے بہت بیزار، آج ہی سارا کچھ سمیٹ لینا چاہتا تھا۔

سب نے عجلت کی اور نو بجے تک دسترخوان اٹھادیے گئے۔ عمارت کے وسط میں چاندنیاں بچھادی گئیں اور زنانوں نے کھیل تماشا شروع کردیا۔ ہنساتے ہنساتے انھوں نے سب کو لوٹ پوٹ کردیا۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ لوگ زنانوں کو دیکھ کے بے قابو کیوں ہوجاتے ہیں اور ان سے ناروا قسم کی چھیڑ خانیاں کیوں کرنے لگتے ہیں۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی دوسری مخلوق ہے، یہ لوگ انسانوں کے گھر پیدا نہیں ہوئے۔ مجھے تو ہمیشہ ان پر ترس ہی آیا۔ یہ تو سراسر آدمیت کی توہین ہے۔ آدمی کی کسی پیدائشی خامی میں اس کی کیا خطا! پیدائشی اندھوں، گونگوں اور بہروں کا تو کوئی مذاق نہیں اڑاتا، پھر ان لوگوں سے ایسا سلوک کیوں کیا جاتا ہے۔ شاید اس میں کچھ ان لوگوں کا بھی قصور ہے۔ یہ اپنے آپ کو تماشا بنواتے ہی کیوں ہیں۔ اندھے، لولے، لنگڑے لوگ سولہ سنگھار کرکے اپنے آپ کو رسوا تو نہیں کرتے۔ وہ بھی تو کسی طور زندگی بسر کرتے ہی ہیں لیکن کیا بھیک مانگنا سوانگ بھر کے پیٹ پالنے سے بہتر ہے۔

گیارہ بجے کے قریب ان کی نوٹنکی بند ہوئی اور قہوے کے دوران مجرے کی محفل کا آغاز ہوا۔ دو نوجوان خوش اندام لڑکیاں، ایک کم سن دوسری نسبتاً پختہ کار رات کے دو بجے تک ناچتی گاتی رہیں۔ اچھا خاصا گالیتی تھیں۔ ناچ بھی خوب آتا تھا۔ دیکھنے میں شگفتہ و تابندہ تھیں۔ کچھ آرائش و زیبائش کی بات بھی تھی لیکن دو دن پہلے تارا بیگم کے بالا خانے پر ہم نے چاندنی بانو کا رقص دیکھا تھا اور اس کی آواز سنی تھی۔ گانے والے کا کمال یہ ہے کہ آواز بجائے خود ساز ہو، ساز مستزاد ہوں۔ کہتے ہیں، آواز وہی ہے جو دل چھولے اور رقص کے لیے لوگوں کا کہنا ہے کہ بدن میں لہروں جیسی بے ساختگی ہو، بجلی کی چمک اور شاخوں کا لوچ ہو۔ یہ لڑکیاں چاندنی کا عشر عشیر بھی نہیں تھیں تاہم تماش بین بے حال ہوتے رہے۔ سکوں اور روپیوں کی بارش ہوتی رہی۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ یہ رات تمام ہو لیکن شمشاد خاں نے بٹھل کے اشارے پر روشنیاں گل کرنے کا حکم صادر کردیا پھر بھی لوگ ڈھائی تین بجے تک بیٹھے رہے۔

مجھے حیرت تھی کہ لوگ بنے خاں کو کتنی جلد، کتنی آسانی سے فراموش کیے بیٹھے ہیں، یہ سارا اہتمام تو اصل میں اڈے کے نئے استاد بنے خاں کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی اب تک کوئی خبر نہیں تھی اور کسی کو اس کی اب کوئی فکر بھی معلوم نہیں ہوتی تھی، شمشاد خاں تک کو۔ کچھ عجیب سی بات تھی۔ اس بے اعتنائی کی وجہ بظاہر بنے خاں کی اچانک روپوشی ہی ہو سکتی تھی جسے لوگ بنے خاں کی زود حسی و زود رنجی، رنگ دلی اور کم ہمتی پر محمول کر رہے ہوں گے۔ ایک اور وجہ بھی تھی۔ غیر متوقع، رجن نے سامنے آکے سب کو مضطرب کر دیا تھا۔ کو دوسرے دن وہ پسپا ہو گیا لیکن یہ ایک دن بڑے تلاطم اور انتشار کا دن تھا۔ اس صدمے سے جس شخص نے انہیں نکالا، وہ بنے خاں سے زیادہ فضیلت کا مستحق تھا اور یہ تبدیلی شمشاد خاں کی مرضی و معیار کے مطابق تھی تو اس سے بڑی سرخوشی کیا ہو سکتی تھی۔ وہ تو شمشاد خاں کی طرف دیکھتے تھے۔ شمشاد خاں ایک زمانے سے ان کا مرکز نگاہ تھا۔ اڈے کے معاملات میں اس کی منشا ان کے لیے اعتبار کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک اور سبب بھی ہو سکتا تھا۔ شاید لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ بعد از خرابی بسیار آخر اڈے کو کمین خاں مرحوم کا جانشین مل گیا، اب اڈے پر نئے استاد کا قیام مستقل رہے گا۔

تین بجے کے قریب ہمیں بھی اپنے کمرے میں جانے کا موقع مل گیا اور جلد ہی نیند نے آلیا۔ آغا پاپا کو ہم نے تاکید کر دی تھی کہ صبح آٹھ بجے ہمیں جگا دے۔ ٹھیک آٹھ بجے آغا پاپا اور مرزا دلبر نے دروازے پر دستک دی۔ ناشتے کا انتظام بھی انہوں نے وہیں کر دیا۔ نیند آنکھوں سے پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی یا بیداری میں کچھ کسر رہ گئی تھی کہ آغا پاپا نے یہ بتا کے ہم تینوں کو سیدھا کر دیا کہ رات سادہ لباس والے پولیس کے کئی آدمی محفل میں موجود تھے۔ گزشتہ رات کئی بار مجھے خیال آیا تھا کہ کسی وقت بھی انسپکٹر چوہان کا ماتحت رضوی ہمارے بیانات لینے آسکتا ہے۔ رضوی کے نہ آنے کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ چوہان نے یہ رسم بھی غیر ضروری سمجھی ہے یا اسے کسی اور طرف کوئی نشان نظر آگیا ہے۔ یہاں سے مایوس ہو کے پولیس کو زیادہ فعال و مستعد ہو جانا چاہیے تھا۔ پہلے تو انہوں نے سیدھے تارا بیگم کے بالا خانے کا رخ کیا ہو گا اور ان دل پھینک نواب زادگان کی سن گن لینے کی کوشش کی ہو گی جو چاندنی بانو کے والہ و شیدا تھے اور جن سے تارا بیگم نے میری بولی کے بعد رابطہ کیا ہو گا۔ بہرحال آغا پاپا کی اطلاع صرف میرے لیے نہیں، جمو اور زورا کے لیے بھی طمانیت و تقویت کا باعث تھی۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی کہ پولیس ہماری نگرانی کر رہی ہے۔ لازماً انہوں نے اڈے کے بعض کمزور آدمی بھی مخبری کے لیے مامور کیے ہوں گے۔ زورا کا خیال تھا کہ بنے خاں کے تھندار ساتھی ابھی تک اڈے پر واپس نہیں آئے۔ کوئی بعید نہیں کہ بنے خاں ہی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے چاندنی بانو کو اغوا کر لیا ہو۔ یہ ایک ناقابل یقین جرات تھی مگر سنا ہے، شکست خوردگی بھی ایسے ہی جنون سے دوچار کر دیتی ہے۔

رات محفل کے اختتام پر شمشاد خاں نے اڈے کے منتخب آدمیوں کو صبح اڈے پر جمع ہونے کی ہدایت کی تھی۔ ہم نیچے آئے تو خاصے لوگ موجود تھے۔ چوکی پر ہمارے بیٹھتے ہی بجھل نے حقے کی نے ترک کی اور سپاٹ آواز میں انہیں مخاطب کیا "ہماری بات ذرا دھیان سے سنو۔ اپنے کو آگے جانا ہے۔ بیچ میں اڈے پہ الٹ پلٹ نہیں ہو جاتی تو ہم پہلے ادھری سے نکل جاتے۔ ہمارے پیچھے پہلے کی طرح استاد شمشاد خاں چوکی کو دیکھے گا۔ کسی آدمی کے تیار ہو جانے پر استاد شمشاد خاں کی مرضی ہے۔ اس کو چوکی پہ جگہ دے کہ نہیں۔ رجن کی طرح کوئی حرام کا جنا بھی سامنے آیا تو استاد شمشاد خاں ہم کو خبر کر دے گا اور مہینے کے اندر اندر، ہمارا نہیں ہوا تو جیسا کہ اڈے کی ریت ہے، ویسا ہی ہو گا۔ ایک ٹائم میں دو یا دو سے زیادہ سر اٹھانے والے پنجہ کر کے چوکی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ سن لیا سب نے؟"

شمشاد خاں سر جھکائے سنتا رہا۔ بجھل کے چپ ہو جانے پر چند لمحوں بعد اس نے دل گیر آواز میں کہا "ٹھیک ہے، جو استاد بجھل بھائی کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ ہم نے ان کو روکا تھا پر کیا پتہ تھا، سب الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ اپنے کو معلوم ہے، بجھل بھائی کو آگے جانا ہے۔ کچھ بولنا بیکار ہے۔ اپنا منہ بھی نہیں پڑتا لیکن ایک بات سارے سن لیں، بجھل بھائی کے کہنے پہ ہم یہاں ضرور بیٹھیں گے پر اڈا باہر استاد کے نام پہ چلے گا۔" شمشاد خاں کی آواز بھرا گئی "سب جانتے ہیں، ہم نے ادھر سے ہٹنے کا طے کر لیا تھا۔ رجن کتے نے سارا کھیل الٹا کر دیا۔ اب اڈے کے آدمیوں سے ہمارا کہنا ہے، نیا آدمی جلدی سے تیار کرو اور بس ہماری چھٹی کر دو۔ زیادہ دن نہیں بچے اپنے پاس۔ چوکی پر کوئی رجن جیسا کی اولاد، سور کا بچہ پھر سامنے آجائے گا۔ پھر مت کہنا ایک بات!" شمشاد خاں کی غمناک آواز میں تندی آگئی "ایک بات کان کھول کے سن لو سب۔ باہر استاد کی

مشکل ہے، ٹھیک ہے، لیکن رجن کی طرح کوئی دوسرا الو کا پٹھا آگے آیا تو باہر میاں اور بجھل بھائی کتنے ہی دور ہوں، اپنے بھائی شمشاد خاں کے پکارنے پر ضرور لکھنؤ آئیں گے اور کمال نوچ لیں گے اس مستانے کی۔ شمشاد خاں اور بمن خاں کی چوکی پر وہ کسی پاپی کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی یہ بات پکی سمجھو۔"

بجھل چوکی پر نہیں ٹھہرا۔ اس کے ساتھ بھی نیچے آگیا اور گلی میں دور تک ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ تانگے، سامان اور ہجوم دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے ہجوم سے چند قدم الگ لے جا کے جمو سے تصدیق چاہی "کیا ہم یہاں سے جا رہے ہیں؟"

"کیوں؟ کیا ہے لاڈلے؟" جمو عجیب سی زبان میں شوخی سے بولا "ابھی اور ادھری ٹھہرنے کو مانگتا کیا!"

"یہ بات نہیں۔" میں نے الجھ کے کہا۔

"پھر کیا ہے۔ بڑی مشکل سے سالی گردن چھٹی ہے۔ اب ادھر رکھا بھی کیا ہے۔"

"کچھ دیر بعد ہم اسٹیشن نہیں پہنچ سکتے۔"

جمو چونک کے بولا "بات کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میری نظریں بجھل پر جھنکنے لگیں۔

"ادھر کوئی کان لگائے نہیں ہے، صاف بتا۔"

"جمو بھائی! ایک بات کا خیال آتا ہے۔" میں نے اکھڑی آواز میں کہا "اگر زورا کا کہنا... صحیح ہے تو تارا بیگم تو برباد ہو گئی۔ بنے خاں نے چاندنی بانو کو اغوا کیا ہے تو چاندنی تو اسے مل گئی۔ اب ہمیں جا کے تارا بیگم کو کچھ دینا چاہیے۔ مطلب یہ کہ سب ہماری... ہماری وجہ سے۔"

"ہا!" جمو سر جھٹک کے بولا "کیا بولتا ہے۔ زورا دادا، سالا کوئی جیوتشی پیر فقیر ہے۔ وہ تو جو منہ میں آئے، اگل دیتا ہے۔ مانو اگر ایسا نہیں ہوا تو! تو ہم تارا بیگم کے آگے ڈھیری ڈال آئیں؟ اور وہ! وہ بنے خاں، تیس مار خاں۔ اتنا پاگل نہیں تھا۔"

"اور فرض کرو زورا کی بات صحیح نکلی؟"

"تو ہم ٹھیکے دار ہیں کیا؟ ہم لوگوں پر بھی تارا بیگم کا حق نہیں بنتا۔" جمو نے ناگواری سے کہا "پولیس ادھر پیچھے لگی ہے۔ ایسے میں کوٹھے پہ جا کے الجھنا ڈالیں ہم۔ سیدھے سبھاؤ بچ نکلنا ہی ٹھیک ہے۔" جمو مجھے سمجھانے لگا کہ سفر کے سارے انتظامات ہو چکے ہیں۔ گاڑی کی روانگی کے وقت ہی ہم اڈے سے نکلے ہیں۔ زورا، مرزا دلبر کے ساتھ سلمٰی کو لینے جا چکا ہے۔ یہ کم جوئی بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ بات پہنچی تو نہیں رہے گی۔ بجھل کو خبر ہوئی تو الگ ناراض ہو گا۔ کہنے لگا کہ چاندنی بانو کون سی تارا بیگم کی پلوٹھی زاد ہے۔ کہیں سے، کسی سے خرید کے ہی تارا بیگم نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ یہ عورتیں اپنی تربیت یافتہ لڑکیوں کو بیٹی ہی کہتی ہیں۔ اس رات بالا خانے پر جتنی لڑکیاں ہم نے دیکھی تھیں، سب تارا بیگم کی بیٹیاں تو نہیں تھیں۔ چاندنی بانو سے جتنا حاصل کرنا تھا، تارا بیگم نے کر لیا ہے۔ میں خاطر جمع رکھوں کہ چاندنی بانو کے چھن جانے سے تارا بیگم غارت نہیں ہو جائے گی۔

جمو کی بات سمجھ میں آرہی تھی لیکن جی نہیں مانتا تھا۔ ادھر بجھل، شمشاد خاں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ چکا تھا۔ جمو مجھے اپنے بازو میں بھر کے دوسرے تانگے میں سوار ہو گیا۔ تانگوں اور سائیکلوں کا ایک قافلہ اسٹیشن تک ہمارے ساتھ چلا۔ اسٹیشن پر پہلے سے کافی لوگ پہنچ چکے تھے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ ٹکٹ، ڈبے اور نشستوں کا بندوبست اڈے کے آدمیوں نے کر لیا تھا۔ زورا پہنچ چکا تھا۔ سلمٰی بھی ڈبے میں بیٹھی تھی۔ سلمٰی کو برقع میں دیکھ کے مجھے کھٹکا ہوا۔ سادہ لباس والے، ظاہر ہے، یہاں بھی موجود ہونے چاہئیں۔ وہ کہیں بدگمان نہ ہو جائیں۔ میں نے جمو کو بتایا تو اس نے بھی تائید کی۔ سلمٰی کو نقاب اٹھائے رکھنے کی ہدایت بہت ناروا معلوم ہوتی تھی اور ہرچند چاندنی بانو کو اس طرح لے جایا بھی نہیں جا سکتا تھا مگر پولیس کا کچھ ٹھیک نہیں، وہ کوئی بھی رخنہ ڈال سکتی تھی۔ جمو نے جانے کس طرح سلمٰی کو نقاب ہٹانے پر آمادہ کیا۔ ڈبے کے سامنے اڈے کے آدمیوں کا ہجوم تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کا چہرہ دیکھا ہو گا۔ سلمٰی برقع میں نہ ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی یا پہلے سے نقاب کھلا ہوتا تو بھی کچھ نہیں تھا۔ اب اچانک نقاب اٹھا لینا اور چہرے کی نمائش کرنا سلمٰی کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہو گا لیکن پولیس کے اطمینان کے لیے یہی ایک چارہ تھا۔

زیادہ دیر نہیں لگی کہ انجن نے سیٹی بجا دی۔ شمشاد خاں بار بار ہم چاروں سے آکے گلے ملتا رہا۔ اس نے میری پیشانی چومی، ہاتھ چومے اور شکستہ آواز میں بولا "جمو کے تو جلدی شکل دکھا دینا، زیادہ بار کے لیے نہیں کہتا، اب وقت بہت کم ہے اپنے پاس۔"

گاڑی حرکت میں آنے تک سب ہمارے ڈبے سے چمٹے رہے۔

○☆○
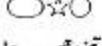
بارہ بج چکے تھے۔ تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ لکھنؤ شہر سے نکلتے ہی گاڑی نے رفتار پکڑ لی۔ ڈبے میں ہمارے سوا کوئی

مسافر نہیں تھا۔ سو ہمیں اپنے آپ میں گم ہونے کی آزادی تھی۔ یہی ہوا۔ اتنی ہاؤ ہو کے بعد کسی گوشۂ سکوں میں آجانے سے آدمی خالی خالی ہوجاتا ہے۔ گزرے ہوئے مناظر کی بازگشت آدمی کو متلاطم کیے رہتی ہے۔ کچھ دیر کا سکوت تھا۔ فاصلے ذہن پر چھائے ہوئے مناظر دھندلے کرتے جاتے ہیں یا چھلنی کرتے جاتے ہیں۔ وقت بجائے خود ایک فاصلہ ہے مگر بعض نقش جو پتھر ہوجاتے ہیں' مٹائے نہیں مٹتے' نہ زمانی فاصلے سے نہ مکانی دوریوں سے۔

سلمیٰ نے بتھل کے کہنے پر برقع اتار دیا تھا اور بدن پر شال لپیٹ لی تھی۔ اس کے چہرے پر شادابی نظر آرہی تھی۔ شادابی' خوشی کی علامت ہے۔ خوشی اس یقین کی کہ قسمت نے آخر کار کسی منزل پر پہنچا دیا ہے۔ اس نے بتایا کہ میزبانوں نے اسے قیمتی کپڑوں کے دو جوڑے تحفے میں دیے ہیں اور سونے کی چار چوڑیاں بھی۔ میزبانوں نے کھانے پینے کا بہت سارا سامان بھی ساتھ کردیا تھا۔ لکھنؤ سے فیض آباد کا سفر چند گھنٹوں کا ہے۔ یہ پسنجر گاڑی تھی۔ بقول شخصے' پیوں پیوں چل رہی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رکتی۔ آدھ گھنٹے میں ملهور' پندرہ بیس منٹ بعد ہگور اور اس کے چند منٹ بعد سفید آباد آگیا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں گاڑی بارہ بنکی پہنچ گئی۔ یوں بھی ڈیڑھ ہی بج رہا تھا۔ جمرو' زورا اور بتھل ہلکی نیند لے چکے تھے یا ایسے ہی میری طرح آنکھیں میچے نشستوں پر پڑے رہے تھے۔

بارہ بنکی اسٹیشن پر جمرو نے سلمیٰ کے میزبانوں کا دیا ہوا توشہ کھولا اور زورا فضول میں پلیٹ فارم سے کچھ اور چیزیں لے آیا۔ رکابیاں موجود نہیں تھیں۔ سب نے انہی برتنوں میں کھایا جو شمشاد خاں کے عزیزوں نے ساتھ کیے تھے۔ بہت خوش مزہ کھانا تھا۔ پراٹھے' مرچ قلیہ' بھنا ہوا گوشت' شامی کباب اور سوجی کا حلوہ' چائے پی کے سب پھر ادھر ادھر نشستوں پر دراز ہوگئے۔ فرسٹ کلاس کے یہی ٹھاٹ باٹ ہیں۔ پیسے کا بھی کیا کرشمہ ہے۔ آدمی کتنی چیزیں حاصل کرسکتا ہے۔ آرام' خلوت' جلوت۔ کہتے ہیں' آدمی کی خواہشوں کے سامنے پیسہ ہمیشہ کم پڑجاتا ہے' اور کہتے ہیں' آدمی خواب نہیں خرید سکتا' خیال نہیں خرید سکتا' پر اور ہزار چیزوں کے حصول کی مقدرت' جو پیسہ پیدا کرتا ہے۔ کتنی محرومیوں کی اشک شوئی' کتنی پشیمانیوں کی تلافی ہوجاتی ہے۔ اسی لیے لوگ دیوانگی ..... سے پیسے کا تعاقب کرتے ہیں' پیسے سے آدمی کے دس ہاتھ ہوجاتے ہیں۔

سلمیٰ کھڑی بنی کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے مناظر دیکھ رہی تھی۔ میں بھی نیچے آکے اس کے سامنے کی نشست پر مقابل بیٹھ گیا۔ اتنے دن ہوگئے تھے' سلمیٰ سے رسمی سلام کلام کے علاوہ فراغت سے کبھی بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ممکن ہے' وہ مجھے کوئی بد دماغ شخص سمجھتی ہو۔ میرے جی میں آئی کہ اس کی نشست پر جاکے اس سے باتیں کروں' پوچھوں کہ کوئی کسک' کوئی ملال' کسی قسم کا اندیشہ تو نہیں ہے اس کے دل میں' اور ہوسکے تو اسے تسلی دوں کہ اب بیتے ہوئے کا اعادہ نہیں ہوگا۔ وہ بھی گزرا ہوا اندوہ بھول جانے کی کوشش کرے۔ ایک بار جو اس نے کھڑکی سے نگاہیں ہٹائیں اور میری آنکھوں کو اپنی جانب نگراں پایا تو وہ سٹپٹائی' پھر اس کے ہونٹوں پر ایک شائستہ مسکراہٹ آ گئی' اس نے پیر اور سکیڑ لیے' پھر اسی نے جرات کی اور مندانہ لہجے میں بولی "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا "ہاں' ہاں' بالکل۔" اس کے ٹوکنے پر مجھے احساس ہوا کہ اوپر کی برتھ سے نیچے آکے کسی پہلو قرار نہیں رہا تھا۔ آدمی کو اپنی بے کلی کی کبھی خبر نہیں ہوتی۔"

اس نے دھیمی آواز میں جھجکتے ہوئے کہا "چائے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔"

"ہاں' ان لوگوں نے گلوریاں بھی رکھی تھیں۔" کھنکتی ہوئی آواز میں بولی "میں تو بھول ہی گئی۔"

"ضرور۔" میں نے بظاہر اشتیاق سے کہا۔

وہ شال سنبھال کے اپنی نشست سے اٹھی اور ٹٹولنے لگی۔ نئی بنارسی ڈبیا میں بہت سی گلوریاں تھیں۔ سلمیٰ نے میرے پاس آکے ڈبیا میری طرف بڑھائی۔ میں نے ایک ساتھ دو گلوریاں کھائیں۔ واقعی منہ میں بس گئی۔ اس خدمت سے سلمیٰ کا چہرہ اور دمکنے لگا' گل رنگ ہوگئے۔ بعض لوگ کسی سے سلوک کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ سلمیٰ بھی زریں کی بہن معلوم ہوتی تھی۔ اس کے تکلف آمیز اطوار میں بڑی بے ساختگی تھی۔ تکلف تصنع سے عاری ہو تو بہت دل آویز ہوتا ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

زنبیل میں ڈبیا رکھ کے وہ اپنی نشست پر جا بیٹھی۔ دیر میں صفدر گنج اسٹیشن آگیا پھر سید خان پور' دریاباد۔ بنے خاں میرے سامنے آکے کھڑا ہوگیا۔ میں نے اسے سر سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن بنے خاں آنکھوں سے دور نہیں ہوتا تھا بار بار اس کا خیال کھٹکنے لگتا۔ معلوم نہیں۔ اچھا ہوا یا برا' لیکن میں

خاں ہی چاندنی بانو کو لے گیا ہے تو اس نے عواقب پر اچھی طرح غور کرلیا ہوگا۔ میری دانست میں اس کے اور چاندنی بانو کے درمیان پہلے سے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ ایسی صورت میں اسے چاندنی پر اپنی چاہ کے اظہار میں کیسی دشواری پیش آسکتی ہے۔ کیا معلوم کہ چاندنی بانو کو بالا خانے کی زرق برق زندگی بہت مرغوب ہو اور کسی چار دیواری کی سادہ زندگی کا تصور اس کے ذہن میں نہ ہو یا اس کی مراد ہی نہ ہو۔ ضروری نہیں کہ بالا خانے پر بیٹھی ہوئی ہر عورت بالا خانے سے مطمئن ہو۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ شمع محفل سے چراغ خانہ کا درجہ افضل ہے' محفل کی زیب و زینت کی نسبت گھر کی سادگی میں بہت عزت اور طمانیت ہے' اور ایسا تمنائی' ایسا شیدائی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ بنے خاں کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوں گے کہ ابتدائی دنوں میں چاندنی بانو کو کچھ باور کرانے کے لیے سائے اور سکون میں رکھ سکے۔ اس نے لکھنؤ میں کسی جگہ چاندنی بانو کو چھپا رکھا ہے تو آخر کب تک اسے روپوش رکھا جاسکتا ہے مگر بنے خاں بھی کہاں تک ہاتھ پیر توڑے' چوڑیاں ڈالے بیٹھا رہے گا۔ کسی وقت بھی پولیس انھیں سونگھتی ہوئی اس کے سر پر پہنچ سکتی ہے۔ یہی ممکن ہے کہ لکھنؤ سے بہت دور کسی بڑے شہر میں وہ گھر بسانے کی کوشش کرے اور کوئی خزانہ اس کے ہاتھ لگ جائے ورنہ چاندنی بانو تو شیشے کی طرح نازک ہے۔ تارا بیگم نے اپنی پلکوں پر اس کی پرورش کی ہے۔ وہ تو ذرا سی دھوپ سے کمھلا جائے گی۔

کیا سمجھ میں آتا تھا کہ بنے خاں اتنا دیوانہ نہیں ہوا ہوگا اور یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی تھی کہ تارا بیگم نے چاندنی کے دلدادہ نواب زادگان کو بہت کم مہلت دی تھی۔ ایک دن میں جواب مانگا ہوگا۔ کسی بھی نواب راجا کے لیے اتنی خطیر رقم ادا کرنے کے بجائے کرائے کے شوره پشتوں کا بندوبست کرنا آسان تھا۔ بنے خاں نے بہت عجلت کی۔ اسے کچھ تو تحمل کرنا چاہیے تھا۔ بے شک کوئی ضمانت نہیں تھی کہ خریدی ہوئی چاندنی بنے خاں کو دل و جان سے قبول کرلے۔ روپے پیسے سے آدمی خریدا جاسکتا ہے' اس کا دل و دماغ نہیں۔ پیسہ کسی حد تک چاندنی بانو کو مطیع رکھ سکتا تھا۔ اطاعت اور بے بسی' بندگی اور چیز' اور رہا خاطر اور چیز۔ اصل چیز تو خود سپردگی ہے۔ چاندنی پر مکمل اختیار کے باوجود یک جائی و یک جہتی لازم نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ پیمانے کے مطابق پیسے کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ جو لوگ جاہ و چشم ترک کرکے گوشہ نشین ہوجاتے ہیں' انہیں پیسے کی بے مائیگی بے ہنری کا ضرور کوئی عرفان ہوتا ہوگا' ریشم' پھول' شیشہ' جواہر' ہاتھی' گھوڑے' خدام' دیوان' من و سلویٰ پیسے سے حاصل کیے جاسکتے ہیں مگر کسی کی طلب ان سے سوا' ان سے دگر ہو تو۔

آدمی اپنے آپ سے بھی تو ہذیان بکتا ہے۔ لکھنؤ مسلسل دور ہو رہا تھا۔ اپنی دل جمعی کے لیے ورق پلٹ دینا ہی بہتر تھا مگر کتاب ہی کے ورقے آسانی سے پلٹے جاسکتے ہیں' اور یہ تو گزشتہ ورق کے نوشتے کی سرایت کاری اور اثر گیری پر منحصر ہے کہ کب تک طاری رہے' کب تک نقش غالب اور زہر قائم رہے۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں نے بنے خاں کو دیکھ کے چاندنی بانو کے لیے بات کی تھی۔ تارا بیگم کا بالا خانہ اجڑ جائے گا اور چاندنی بانو کسی ناکردنی' ناگفتنی سے دو چار ہوجائے گی' یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ممکن ہے' اب تارا بیگم مجھے کوسنے دے رہی ہو اور چاندنی بانو آہ و بکا کررہی ہو مگر میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو کیا کرسکتا تھا۔ میں نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ ممکن ہوا تو چاندنی بانو کو کچھ عرصے کے لیے فیض آباد لے جائیں گے۔ زریں کی حویلی میں وہ گھر کے لطف و لذت سے آشنا ہوگی اور بنے خاں' ایسے طلب گار کی پاسبانی اور سایہ داری کا اسے کچھ اندازہ ہوگا۔ آدمی کو سمجھنے میں دیر تو لگتی ہے۔ خدا جانتا ہے' اس کی بولی لگا کے مجھے عجیب مسرت ہوئی تھی۔ واقعی وہ ایسی ہی لڑکی تھی کہ جو کچھ بھی امکان میں ہو' اس پر نچھاور کردیا جائے۔ دکان پر رکھی ہوئی چیز کی قیمت کتنی ہی اونچی ہو' وہ کبھی اس وجہ سے بے وقار ہوجاتی ہے کہ اس کی کوئی قیمت متعین ہے اور ادا کی جاسکتی ہے۔ چاندنی بانو بالا خانے پر نہ ہوتی تو اس پر جاگیریں قربان کی جاسکتی تھیں۔ میں نے بنے خاں کو چاندنی بانو کے سامنے بے بسی اور بے چارگی کی حالت میں دیکھا تھا۔ راج کرشنا جیسا کوئی مہربان بنے خاں کے لیے دفینہ چھوڑ جاتا تو وہ سارا کچھ داؤ پر لگا دیتا۔ صاحب نظر اور جوہر شناس ہی نہیں' قیمت تو صحیح وہی ادا کرسکتا ہے جسے کہیں' کسی موڑ پر اپنا مطلوب' اپنا مقصود نظر آجائے' اور ضروری نہیں کہ ہر شخص دوسرے کے ارادے اور جستجو سے متفق ہو۔ ہر شخص صحرا نوردی کا متحمل نہیں ہوسکتا' ورنہ جوئے شیر نکالنے کے عزم سے بہرہ مند' اس کے لیے بہت نرالیں ہیں۔

سوا تین بجے گاڑی رودولی اسٹیشن پر ٹھہری۔ فیض آباد کا فاصلہ اب ڈیڑھ گھنٹے کے قریب رہ گیا تھا۔ میری نظر سلمیٰ پر گئی۔ پلیٹ فارم اس کی نشست کے سامنے آیا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے سلمیٰ نے کھڑکی کی جالی نیچے کردی۔

... BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
...
BROP ALI KHAN

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سچی کہانیاں

مرزا امجد بیگ کی یادداشتیں
شیطان صفت
سبز قدم

ریٹائرڈ ڈی ایس پی ملک صفدر حیات کی ڈائری
دستِ انتقام
اسیرِ ہوس

قانونی پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات۔ زن، زر اور زمین کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی پیشہ ورانہ زندگی کی پیچیدہ کیسوں کی روداد، جرم و سزا کی وہ کہانیاں جو انسانی حرص و ہوس کا آئینہ ہیں

قیمت فی کتاب -/50 روپے ڈاک خرچ فی کتاب -/23 روپے

چاروں کتابیں ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ -/29 روپے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز
رمضان چیمبرز بلوریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat@yahoo.com
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

میں نے سوچا' بعد میں موقع ملے نہ ملے۔ میں اسے کچھ زریں کے بارے میں بتا دوں تاکہ نئے گھر اور نئے ماحول میں وہ کوئی اجنبیت محسوس نہ کرے گو اس تمہید و تاکید کی ایسی ضرورت نہیں' زریں کا دل تو ایک دریا کے مانند ہے' جس کا پانی ہر دم رواں' شفاف اور شہد آگیں ہو۔ وہ تو کوئی گلستاں ہے جہاں ہر موسم میں پھول کھلے رہتے ہیں۔ وہ تو ایسا شجر ہے جس کے ثمر اور جس کا سایہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ تو سر تا سر پھول' سراپا خوشبو ہے۔ اس کے لطف و التفات کے بیان کے لیے لفظ کم پڑ جاتے ہیں۔ میں سلمیٰ کو یہی کچھ بتانا چاہتا تھا کہ کسی لمحے زریں کی تیز آواز اور سرد لہجے سے وہ آزردہ نہ ہو۔ حالانکہ یہ تجربہ شاید سلمیٰ کو کبھی نہ ہو' لیکن ایک رعایت آدمی کو اس کے درون خانہ تموج' نادیدہ فشار کی ضرور دینی چاہیے اور آئینے کی بھی۔ کبھی اپنی سماعت اور نگاہ کے غبار میں دوسرے کے مطالب اور مفہوم اخذ کرنے کی چوک ہو جاتی ہے۔ سلمیٰ خود ایک معاملہ فہم' نرم خو' بے باک اور خوش سلیقہ لڑکی ہے۔ زریں بھی اس سے مل کے بہت خوش ہو گی۔ اچھا تھا کہ سلمیٰ پوری طرح مطمئن ہو کے حویلی میں قدم رکھے۔ جان لے کہ کسی ایسی ویسی جگہ نہیں' وہ ہمارے گھر جا رہی ہے۔ وہ بچھل کا اور میرا ہی گھر ہے' زریں تو بچھل کی چہیتی بیٹی ہے۔ سگے سے بڑا وہ ہوتا ہے جو چہیتا ہو۔ ایک وہی ہے جو بچھل پر حکم چلاتی ہے اور وہ تعمیل کے لیے آمادہ رہتا ہے۔

رودلی اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرے چند لمحے ہوئے تھے کہ بچھل اوپر کی برتھ سے نیچے آ گیا۔ وہ جاگتا رہا تھا کیونکہ اس نے نیچے بیٹھتے ہی پان کی فرمائش کی۔ اسی اثنا میں زورا پلیٹ فارم سے تازہ چائے لے آیا تھا۔ رودلی پر تازہ دم ہونے کا وقت گزار کے گاڑی پھر چل پڑی۔ چائے کا کلھڑ ختم کر کے اور گلوری منہ میں دبا کے بچھل سلمیٰ کی نشست پر چلا گیا اور اس کے پاس بیٹھا دیر تک جانے کیا نکتہ پردازیاں کرتا رہا۔ زریں ہی موضوع سخن ہو گی۔ وہی ہدایت نامہ جو میں سلمیٰ کو تعلیم کرنا چاہتا تھا اور ارادہ باندھتا' جمع کرتا رہ گیا تھا گاڑی کے شور میں بچھل کی دھیمی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دیواکوٹ بھی گزر گیا' سالار پور کے بعد اب فیض آباد ہی آتا رہ گیا تھا۔ گاڑی منزل پر پہنچنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ ہوں گے کہ زورا اور جمرو بکسے کھولنے اور سامان لوٹنے پلٹنے لگے۔ دونوں نے اپنا سامان الگ اٹیچی میں رکھ لیا۔ تمنچے' کارتوس اور چاقو بھی۔ مجھے بے چینی ہوئی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ ہم سے جدا ہو کے فیض آباد سے آگے جا رہے ہیں یا مجھے اور بچھل کو فیض آباد میں نہیں رکنا ہے۔ میں چپ چاپ دیکھتا رہا۔ ظاہر ہے' میری حیثیت کسی مجہول اور راضی بہ رضا شخص کی تھی۔ مجھے کچھ بتانا اور مشورہ کرنا ضروری نہیں تھا اور اصلاً تو یہ سب کچھ میری وجہ سے تھا' یہی کیا کم تھا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ میرے علم میں جمرو اور زورا کو آگے کوئی ایسا کام درپیش نہیں تھا۔ بچھل کو ویسے بھی فیض آباد رکنا چاہیے تھا۔ فیض آباد اسٹیشن تک آ کے زریں کو دیکھے بغیر آگے چلے جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ زریں سے رخصت ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ بمبئی میں اس کے متعدد شکایتی خط آئے تھے۔ منیر علی کو ابا جان نے بمبئی میں روکے رکھا تھا۔ خانم بھی خود گزیدہ نواب عالم تاب کی مسیحائی کے لیے حیدر آباد کے وہیں رہ گئی تھی۔ عیسان اور جہانگیر کے علاوہ زریں کے ساتھ منیر علی کا پورا کنبہ تھا مگر بچھل وہاں نہیں تھا اور میں بھی وہاں نہیں تھا۔ زریں کو تو ہم دونوں ہی سے نسبت تھی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ زریں کو بمبئی بلا لیا جائے۔ وہاں وہ سب سے مل لے گی یا پھر سب کو فیض آباد چلنا چاہیے۔ زریں نے فرخ' فریال' فاریہ اور اکبر کو نہیں دیکھا تھا۔ جولین سے بھی وہ نہیں ملی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ شہ پارہ' گیتا اور گیتا کی ماں رانی نے زریں کے تذکرے ہی سنے تھے اور زریں نے ان کے۔ بمبئی جا کے فرصت ہی نہیں ملی۔ پہلے کانٹے گیا پھر پیرو۔ ابا جان محل خرید کے نوک پلک کی درستی میں لگ گئے اور اچانک مارٹی چلا گیا۔ اس دوران حیدر آباد سے نواب ثروت کا خط آ گیا اور ہمیں حیدر آباد جانا پڑ گیا۔ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہوا کہ نہ زریں کو فیض آباد سے بلایا جا سکتا تھا نہ اس کے پاس جانا ممکن ہوا۔

ٹھیک پانچ بجے گاڑی فیض آباد شہر میں داخل ہوئی۔ جمرو اور زورا اپنا کام کر چکے تھے۔ سبھی ڈبے سے اتر گئے اور اسٹیشن سے باہر نکلنے کے بجائے انہوں نے انتظار گاہ کا رخ کیا۔ لکھنؤ سے آنے والی یہ گاڑی یہیں ختم ہو جاتی تھی ان کے لیے دوسری گاڑی سے آگے جانے والوں کو انتظار گاہ میں ڈیرہ ڈالنا پڑتا تھا۔ ہمیں وہاں بٹھا کے جمرو اور زورا باہر نکل گئے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ بچھل کا شہر جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ زورا اور جمرو کو آگے سفر کرنا ہوتا تو بچھل ان سے رخصت ہو جاتا۔ گویا زریں کے پاس سلمیٰ کو پہنچانے کی ذمہ داری زورا اور جمرو کے سپرد کی گئی تھی۔ مجھے یہ بات عجیب لگی۔ ہر چند دخل در معقولات سے خود کو باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوا اور مجھے اپنی آواز

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY

ش پر بھی قابو نہیں رہا۔ میں نے جھمل سے کہا ’’ہمیں کہاں کہاں
تا ہے؟‘‘

’’آگے رے۔‘‘ وہ بے نیازی سے بولا۔

’’آگے کہاں؟‘‘

اس نے سر اٹھا کے غنودہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا ’’تو نے سنا نہیں، توتے بولتے ہیں، جدھری دانا پانی زور کرے۔‘‘

’’اس میں دانے پانی کی کیا بات ہے۔‘‘ میں نے جھنجلا کے کہا ’’میری مانو تو ہمیں سیدھے حویلی چلنا چاہیے۔‘‘

’’نہیں رے، اُدھری ابھی نہیں۔‘‘

’’ابھی کیوں نہیں؟‘‘

’’اُدھری بہت بیڑیاں ہیں اس کے پاس۔ بھری بیٹھی ہوگی۔ اپنا من بھی نہیں کرے گا جلدی لوٹنے کو۔ اکٹھے ہی جائیں گے اب۔‘‘

’’یہاں تک آ کے حویلی نہ جانا۔۔۔! وہ کیا کہے گی کہ ہم اسٹیشن سے لوٹ گئے۔‘‘

’’بول دیا ہے ان سے، سمجھا دیں اس کو۔‘‘

’’لیکن یہ تو ہم بھی وہاں جا کے اسے بتا سکتے ہیں۔‘‘ میں نے ناگواری سے کہا ’’بیچ میں ہر جگہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ بعد میں پھر آنے میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے، ایک دو دن ٹھہر کے بھی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔‘‘

’’نہیں رے۔‘‘ وہ بیڑی سلگانے میں مشغول ہو گیا۔

’’دو تین دن ممکن نہیں بنتے عشرے بعد سہی۔ لکھنؤ میں بھی تو آخر ہم رکے تھے۔‘‘

’’اُدھری کی اور بات تھی رے۔‘‘

’’اور مراد آباد میں؟‘‘

’’اُدھری بھی کام سے تھے۔‘‘ وہ تنک کے بولا۔

’’مگر اب کون سا کام ہے؟‘‘

’’ابھی آگے جا کے نہیں دیکھنا کیا۔‘‘ اس کے لہجے میں ترشی آ گئی۔

’’کیا دیکھنا ہے؟‘‘ میں نے زہرخند سے پوچھا۔

’’تجھ کو پتہ نہیں؟ کیا بیچ میں چھوڑ دیں پھر۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے، ابھی کچھ باقی رہ گیا ہے۔ ٹھیک سے بیٹھا رہ۔‘‘

’’کوئی فائدہ نہیں۔‘‘ میں نے جلی ہوئی آواز میں کہا۔

کوئی جواب دینے کے بجائے وہ اضطراری انداز میں سر ہلاتا رہا۔

’’اب چھوڑو سب۔‘‘ میری آواز ڈوبنے لگی ’’سب بیکار ہے۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ کب تک کہاں تک۔۔۔‘‘

’’ابھی تھوڑا ساتھ ہے رے۔‘‘

’’ٹھیک ہے لیکن، لیکن۔۔۔‘‘ سلمیٰ کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ کے مجھے خود کو روکنا پڑا تاہم چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں جھمل کو قائل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ میں نے کہا کہ ہمیں بمبئی سے چلے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ اس دوران ہمیں زریں کی کوئی خیر خبر نہیں ملی ہے۔ جا کے پوچھتے ہیں، حویلی کا کیا حال ہے۔ خدانخواستہ درمیان میں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہو تو ہم تو لاعلم ہی رہیں گے۔ ممکن ہے، زریں کو ہماری ضرورت ہو۔

میری التجا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بیڑی پھونکتا رہا اور کہنے لگا ’’اُدھری بمبئی سے چلتے ٹائم بڑے صاحب منیر علی کو بولا تھا، اپنے کو پلٹنے میں دیر ہو جائے تو آپ فیض آباد چلے جانا۔‘‘

’’اور اگر وہ نہ پہنچے ہوں؟‘‘

’’تو ابھی اپنے دونوں شکر سے اُدھری جا رہے ہیں۔‘‘

’’لیکن وہاں ہمارے جانے میں کیا حرج ہے؟‘‘

’’ہے رے۔ جان کے بولتے ہیں۔‘‘

’’میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔‘‘

’’تو اتنا چیں چیں مت کیا کر۔ تجھ کو اپنے سے زیادہ فکر ہے اس کی؟‘‘

میرے پاس شاید کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی بیزاری و برہمی سے ظاہر تھا کہ وہ کوئی دلیل سننا نہیں چاہتا۔ میں نے خواہ مخواہ اتنی حجت کی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اس سے کچھ کہنا اپنا ہی سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ جو اس نے طے کر لیا ہے، وہی اٹل ہے۔ کرنے کو میں بھی بہت باتیں کر سکتا تھا، ایک بار میرے جی میں آئی تھی کہ اس سے کہوں، ٹھیک ہے، تجھے نہیں جانا اور ایسا ہی ہے تو میں زورا اور جمرو کے ساتھ چلا جاتا ہوں مگر سلمیٰ سامنے بیٹھی تھی، وہ نہ ہوتی تو بھی شاید میرا منہ نہ پڑتا۔

بے شمار موقعوں کی طرح میرے پاس یہی چارہ تھا کہ خود کو سرزنش کروں، مجھے آخر اتنی بے کلی کیوں ہے۔ ہو سکتا ہے، میں ہی کچھ غلط سمجھ رہا ہوں۔ کوئی بات ضرور ہوگی جو وہ حویلی جانے پر رضامند نہیں ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یقیناً اسے مجھ سے زیادہ زریں کی فکر ہونی چاہیے۔ مجھے اپنے سوا کسی کی فکر ہی کتنی ہوتی ہے۔ ممکن ہے، وہ زریں سے کوئی وعدہ کر آیا ہو۔ حویلی میں تو اس کا جی بہت ہی لگتا ہے۔ اس نے تو اپنی عمل داری، اپنے اڈے ہی کو خیرباد کہہ دیا ہے

جہاں ہر وقت اس کے خادموں، غلاموں کی ایک فوج اس کی ایک جنبش نگاہ پر سر پیش کرنے کو تیار رہتی ہے۔ جمرو اور زورا ہمارے لیے ٹکٹوں کا بندوبست کرنے گئے تھے۔ جمرو نے آ کے بتایا کہ اگر تاخیر نہ ہوئی تو ہماری مطلوبہ گاڑی ڈیڑھ گھنٹے بعد فیض آباد پہنچ جائے گی۔ زورا انتظار گاہ کے خدمت گار سے چائے کے لیے کہہ آیا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے چائے ختم کی، جھمل نے زورا اور جمرو کو گھر جانے کی ہدایت کی۔ وہ اور ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن جھمل نے منع کر دیا۔ دونوں بادل ناخواستہ کرسیوں سے اٹھے۔ سلمیٰ بھی کھڑی ہو گئی۔ جھمل نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا، کمر پہ تھپکی اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ سلمیٰ کی آنکھیں بھر آئیں۔ ’’تاتا، جا ری اب، اُدھر جا کے سب بھول جانا۔‘‘

سلمیٰ کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ ہم ساتھ ہوتے تو کم از کم اس کی یہ کیفیت نہ ہوتی۔ ’’اُدھری بٹیا ہے اپنی، بولا نا تجھ کو تیری بہنا، بس اس کے پاس جا کے سارا دُھل جائے گا۔ دیکھنا!‘‘ جھمل نے سلمیٰ کو سمجھانے کی کوشش کی، کہنے لگا ’’اور جی نہ لگے تو اپنے لوٹنے تک پتھر رکھ لینا پھر کچھ اور دیکھیں گے ری۔‘‘

دروازے سے نکلتے ہوئے سلمیٰ نے پلٹ کے پھر ہماری طرف دیکھا ’’بیلیا رکھ لی ہے پاس؟‘‘ جھمل نے بھاری آواز میں پوچھا ’’کبھی اُدھری دکن جانا ہوا تو ماردیں گے منہ پہ مال زادوں کے۔‘‘

سرنگوں سلمیٰ آگے چلی گئی۔ جھمل انتظار گاہ کے دروازے تک اسے رخصت کرنے آیا۔ میں ان تینوں کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

سورج زرد پڑ چکا تھا۔ اسٹیشن کے اطراف لوگوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ اتفاق سے کوئی تانگہ موجود نہیں تھا مگر جلد ہی ایک سواری آ کے اتری اور انہیں تانگا مل گیا، معمر کوچوان جمرو کو دیکھتے ہی اچھل پڑا اور پوچھا ’’جمرو بھیا‘‘ جمرو بھیا کی گردان کرتا ہوا تھرکنے مٹکنے لگا ’’اپنی انکھیاں کا دیکھ رہی ہیں بھیا!‘‘

جمرو بھی اسے پہچان گیا تھا۔ جمرو کا چہرہ بجھا ہوا تھا لیکن تانگے والے کے جوش و خروش کے جواب میں اس نے بھی مصنوعی تپاک کا اظہار کیا۔

تانگے کے وسط میں پچھلی نشست پر پردہ لٹکا دیا گیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے سلمیٰ کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ سلمیٰ کے بیٹھتے ہی تانگے والے نے سامنے کی طرف بھی پردہ کھینچ دیا۔

مجھ سے گلے مل کے جمرو اور زورا بھی تانگے پر سوار ہو گئے۔ زورا اگلی نشست پر کوچوان کے پہلو میں بیٹھا اور جمرو، پردہ کمر کے پیچھے کر کے پچھلی نشست پر سلمیٰ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ زورا نے مجھے بتایا کہ بس تھوڑے دنوں کی جدائی ہے۔ جھمل نے تاکید کی ہے کہ چند روز فیض آباد ٹھہر کے وہ کلکتے پہنچ جائے اور جمرو چاہے تو اسے بھی ساتھ لے آئے۔

جمرو آخر تک ہاتھ ہلاتا رہا۔ جب تانگا نظروں سے اوجھل ہو گیا تب میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور آہستہ۔۔۔۔ قدموں سے انتظار گاہ میں لوٹ آیا۔ جھمل آنکھیں موندے کرسی پر دراز تھا۔ میں بھی قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ٹھیک سات بجے ہماری گاڑی آ گئی تھی۔ راستے کی خرابی کی وجہ سے بار بار رکتی رہی۔ دوسرے دن صبح گھنٹے بھر مغل سرائے اسٹیشن پر ٹھہر کے ہم دوسری گاڑی میں سوار ہو گئے۔

○☆○

الٰہ آباد سے بنارس اور غازی پور ہوتے ہوئے ہم صوبہ بہار میں آ گئے اور گیا کے علاوہ دولت گنج، سمستی پور، مظفر پور، پٹنا، دربھنگا، آرا، بھاگل پور، چمپارن، موتی ہاری، سہرسا، رانچی، ہزاری باغ اور جھریا۔ تقریباً سارے چھوٹے بڑے شہروں میں مولوی صاحب کے اسم کا ورد کرتے ہوئے بنگال کے صنعتی شہر آسن سول چلے آ گئے۔ صبح کہیں، شام کہیں، کبھی ایک دن، کبھی دو دن یا تین چار دن کا پڑاؤ۔ کبھی ریل میں، کبھی لاری اور تانگے کے ذریعے۔ جتنی بڑی بستی اتنا ہی وقت۔ بستیوں اور مسلمانوں کی آبادی کی نسبت سے صرف ہونے والے وقت کی کمی و بیشی مشروط تھی۔ بعض جگہوں پر مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی مگر مسلمان ہر جگہ موجود تھے۔

کئی دن سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ آسن سول آ کے ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ کلکتہ یہاں سے قریب تھا۔ سوچا تھا، کسی مناسب وقت جھمل کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ کہیں اور جانے کے بجائے کچھ دن کے لیے کلکتے چلیں۔ چند روز آرام کر کے پھر اس طرف آئیں گے لیکن پھر یہ سوچ کے رہ گیا کہ کلکتے پہنچنے تک درمیان کی بستیوں میں زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے۔ ممکن ہے، اس دوران میں طبیعت قابو میں آ جائے۔ جھمل کو اپنی حالت بتا کے میں اسے اور پریشان ہی کروں گا حالانکہ صورت یہ تھی کہ قدا در کہیں بیٹھ کے اٹھتا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا۔ مختصر فاصلوں کی مسافت سے بھی پنڈلیوں میں کھولن ہونے لگتی۔

کلکتے سے سوا سو میل دور' دامودر ندی کے کنارے سے نزدیک' چھوٹا ناگ پور' کمشنری کے پلیٹو کے مغربی کنارے پر واقع' ریلوے کے بڑے مرکز' بجلی کے تار' شیشے' المونیم چینی کے برتن' سائیکل اور پارچہ بافی کے کارخانوں سے گھرے ہوئے شہر آسن سول کی آبادی لاکھ سے اوپر ہی ہوگی۔ اطراف میں کوئلے کی کانیں پھیلی ہوئی ہیں۔ دوسرے شہروں کی نسبت یہاں موسم خوش گوار تھا۔ آسن سول میں دینی مدارس کی تعداد چند ہی تھی' ہمیں وہاں سے مایوس ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہاں' ایک مدرسے میں ایک نورانی صورت' درویش مثال بزرگ قاری فرمان احمد سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے ہمیں شہر کے ایک معزز رئیس سید محمود علی سے مل لینا چاہیے۔ ان کی حویلی کے مہمان خانے میں اطراف واکناف سے آئے ہوئے مہمان ٹھہرتے ہیں۔ رئیس سید محمود علی بہت اثر ورسوخ کے آدمی ہیں' مزاج بھی مختلف ہے' علم وادب کے قدردان' موسیقی کے رسیا' بڑی سوجھ بوجھ کے' خوش خلق اور وضع دار شخص ہیں۔ شہر میں ان کا گھر تہذیبی ادارہ ہے' محفلوں کا مرکز' قاری فرمان احمد کی رطب اللسانی سن کے میری طرح بجھل کے دل میں بھی سید محمود علی سے ملاقات کی خواہش نمو پذیر ہوئی ہوگی۔

صبح وقفے وقفے سے ہونے والی بارش ٹھہر گئی تھی لیکن آسمان بادلوں سے اٹا ہوا تھا۔ کوئی بھروسا نہیں تھا کہ بادل پھر برگشتہ ہو جائیں اس لیے ہم نے اپنے ٹھکانے پر جا کے دوسرے کپڑے بدلنے کا ارادہ ترک کیا۔ پانچ سے کچھ اوپر وقت ہوا ہوگا۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اوسان درست کرنے کے لیے ہم نے سرراہ واقع چائے کے ایک ہوٹل میں منہ ہاتھ دھویا' کنگھی کی' لباس کی شکنیں درست کیں اور چائے پی کے گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سڑکیں ابھی تک گیلی تھیں۔ بارش سے عمارتیں دھلی دھلی لگ رہی تھیں۔ چھوٹے شہر میں فاصلے ایسے طویل نہیں ہوتے۔ چند ہی منٹ میں گھوڑا گاڑی عام سڑک سے مڑ کے ایک کشادہ اور صاف ستھری گلی میں داخل ہوگئی۔

کوچوان سید محمود علی سے واقف تھا۔ اس نے عمارت کے عین سامنے گاڑی روک دی۔ باہر سے چار دیواری کے اندر عمارت کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ اردگرد بھی نئے پرانے' چھوٹے بڑے مکانات بنے تھے۔ کوچوان نے اتر کے پھاٹک جیسے دروازے کا کنڈا ایک بار ہی کھٹ کھٹایا تھا کہ دربان باہر آگیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے رہے۔ وہی ہمارے پاس [illegible] اور قاری فرمان احمد کا نام سن کے اس کے چہرے پر امڈتی شکنیں صاف ہو گئیں۔ وہ فوراً اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آکے خندہ پیشانی سے ہمیں اندر چلنے کی ہدایت کی۔ چار دیواری کے اندر تازہ رنگ وروغن سے آراستہ درمیانے درجے کی ایک دو منزلہ عمارت ایستادہ تھی۔ اسے بنگلا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا' نہ قدیم طرز کی حویلی۔ چار دیواری سے عمارت کی راہداریوں تک کے فرش پر سبزہ بچھا تھا اور کنارے کنارے کیاریوں میں پھلواری سجی ہوئی تھی۔ اطراف میں ادھر ادھر تناور درخت اٹھے ہوئے تھے۔ چار دیواری سے عمارت کا فاصلہ کہیں کم تھا' کہیں زیادہ۔ پھاٹک کے دائیں جانب سبزے کے وسیع حصے پر سنگ مرمر کا چبوترا تھا اور بید کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ عمارت سے مکین کی خوش ذوقی اور نفاست جھلکتی تھی۔ دربان ہمیں وہاں بٹھا کے واپس چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسی اثنا میں ایک دوسرا معمر باریش ملازم لپکتا ہوا باہر آیا اور اس نے مودبانہ لہجے میں کہا کہ مالک کو اطلاع کر دی گئی ہے' ذرا دیر [illegible] انتظار کی زحمت ہوگی۔ اس نے ہم سے شربت وغیرہ کے [illegible] پوچھا۔ بجھل کے انکار پر وہ سر جھکائے آہستہ قدموں سے چلتا ہوا راہداری میں گم ہو گیا۔

بظاہر عمارت کے مکین سید محمود علی اور مولوی صاحب [illegible] شناسائی کی کوئی توقع نہیں تھی' خانہ پری کی بات تھی۔ ورنہ [illegible] کی ہماری پاس کیا بچی تھی۔ بے شمار دروازے پر دستک دے [illegible] چکے تھے۔ سائل خوش گمانی نہ کیا کریں تو ہر کس وناکس کے آگے ہاتھ کیوں پھیلائیں۔ کوئی ایک صدا تو کارگر ہو [illegible] ہے۔ ہمیں چبوترے پر بیٹھے دس منٹ سے زیادہ ہو گئے [illegible] صاحب برآمد نہیں ہوئے۔ بجھل گم صم بیٹھا تھا۔ میرے [illegible] سارے جسم میں ٹوٹن ہو رہی تھی۔ بہتر یہی تھا' مجھے مجھل [illegible] اپنی حالت بتا دینی چاہیے تھی۔ یہاں آنے کے بجائے [illegible] میں آرام کرنا ہی مناسب تھا۔ یہاں ہم پھر کسی اور وقت آسکتے تھے۔ ایک پہلو بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ [illegible] سے کوئی مسوس رہا تھا۔

یوں یہ ایک خوش گوار شام کہی جا سکتی تھی۔ فضا [illegible] تھی' ہوا بھیگی بھیگی اور ٹھنڈی ٹھنڈی' سبزے اور [illegible] سوندھی مہک ہر سو رچی ہوئی تھی' پرندے آشیانوں کے لیے شور مچا رہے تھے مگر سارے موسم پابند ہو[illegible] ورنہ ان کی کیفیتیں سب پر ایک جیسی مرتب ہوتی [illegible] مجھے مسلسل کرسی پر کسمساتا دیکھ کے بجھل نے [illegible] پوچھا "کیا ہے رے؟"

میں ہڑبڑا سا گیا "کچھ نہیں' کچھ نہیں۔"

"لوٹ چلیں پھر؟"

"نہیں نہیں' ابھی ___" میری آواز میرے قابو میں نہیں تھی' پھر میں نے منتشر لہجے میں کہا کہ ہاں ٹھیک ہے' واپس چلیں' یہاں پھر آجائیں گے۔"

"کچھ الٹا ہے کیا؟"

"ہاں!" میں نے کمر سیدھی کرکے کہا "بس دل کچھ گھبرا رہا ہے لیکن' لیکن چاہو تو کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔"

"نہیں رے' چلتے ہیں۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا مگر ایک قدم بھی نہ بڑھ سکا تھا کہ چبوترے کے عقب میں واقع راہداری میں کھن کھناتی آواز سن کر رک گیا' دوسرے لمحے جو شخص ہمارے سامنے تھا' وہ مکان کے مالک کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ پچاس سے اوپر کی عمر' قد متناسب' نہ اتنا زیادہ نہ کم' گٹھا ہوا جسم' ناک نقشہ ترشا ہوا' گداز ہونٹ' سرخ سپیدی ہوئی اور کسی قدر سیاہی مائل رنگت' ہلکی ہلکی مونچھیں' سفید کرتے' پاجامے اور سلک کی واسکٹ میں ملبوس' سلیم شاہی جوتا' ٹیڑھی مانگ' سامنے سے سر کے بال اڑجانے کی وجہ سے پیشانی چوڑی ہو گئی تھی۔ کسی زمانے میں خاصا وجیہہ ہوگا۔ چہرہ دمکتا ہوا' بڑی بڑی آنکھوں میں گہری چمک۔ آسودہ حالی کی چمک دمک ہی اور ہوتی ہے۔ تیز قدموں سے سید محمود علی چبوترے پر آئے اور پرتپاک انداز میں ہم سے مخاطب ہوئے' کھنکتی آواز میں بتایا کہ وہی سید محمود علی ہیں۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ مصافحے کے بعد بجھل نے زحمت دینے کی معذرت چاہی اور آمد کا مدعا بیان کیا یعنی آموختہ دہرایا۔

سید صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے "مولوی شفیق! نام تو کچھ سنا ہوا' آشنا آشنا سا لگتا ہے۔" وہ بدبداتے ہوئے بولے "ذرا حلیہ اور وضع قطع تو بتائیے۔"

بجھل نے میری طرف دیکھا' مجھ سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے ہمت مجتمع کی اور مولوی صاحب کے بارے میں مزید کچھ تفصیل بتائی۔

"ہاں' ہاں کچھ یاد آتا ہے' یاد آتا ہے جناب!" سید محمود علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا "ایک صاحب' بے شک' بے شک' یقیناً ان کا یہی نام ذہن پر نقش ہے مگر اب تو زمانہ ہو گیا انہیں دیکھے ہوئے۔" مولوی صاحب کے بارے میں انہوں نے کرید کرید کے مجھ سے دوبارہ استفسار کیا' میری تصدیق پر وہ تیزی سے سر ہلانے لگے اور بولے "وہ مدرس اور مبلغ ہی نہیں' وہ عالم آدمی ہیں۔ جی ہاں' یہاں تشریف لا چکے ہیں' ایک بار نہیں' شاید دو تین بار ___ اچھی یاد اللہ تھی ان سے۔ اب تو بہت وقت ہو گیا۔"

اتنی ہی بات سے ظاہر ہو گیا کہ ہمیں یہاں سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے لیکن اس طرح تو اب اٹھا نہیں جا سکتا' بجھل نے بھاری آواز میں پوچھا "کے برس لگ بھگ؟"

"اچھا وقت ہو گیا' صحیح تو کچھ نہیں بتا سکتا۔" سید محمود علی نے جھجکتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے' دس سال سے زیادہ ہی گزرے ہوں گے۔ ان کا پتا محفوظ تھا۔ خیر خیریت کو عرصہ ہو گیا یاد آتا ہے' ایک دو مرتبہ انہیں خط بھی لکھے' کوئی جواب نہیں آیا مگر اب کہاں' کہاں ہیں قبلہ؟" سید صاحب نے فکر مندی سے پوچھا۔

"اپنے کو پتا ہوتا تو آپ کے در پہ کیوں آتے۔"

"جی' جی ہاں۔" سید صاحب جھجک کے بولے "آپ ان کے آبائی شہر مراد آباد بھی گئے؟ وہیں سے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

"وہ ادھری آئے تھے' ابھی تھوڑے دن ہوئے' اپنا اتا پتا کسی کو بول کے نہیں گئے۔" بجھل نے گہری سانس بھر کے کہا۔

ابتدا ہی میں بجھل اپنی آمد کی غرض وغایت بتا چکا تھا لیکن مختصر بیان سے سید محمود علی کی سیری نہیں ہوئی تھی' تجسس آمیز لہجے میں بولے "مگر ایسی' ایسی کیا' میرا مطلب ہے' آخر آپ کو ان کی اس قدر تلاش کیوں ہے؟"

"لمبی بات ہے صاحب!" بجھل نے منہ بنا کے کہا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ انہیں بتایا کہ میں مولوی صاحب کا عزیز ہوں' کچھ خاندانی جائداد کی تقسیم وغیرہ کے سلسلے میں مجھے مولوی صاحب کی تلاش ہے۔ یوں سمجھا جائے کہ مولوی صاحب کا حصہ انہیں لوٹانا ہے' وغیرہ وغیرہ یہ کہانی اسے حفظ ہو گئی تھی۔

"یعنی مولوی صاحب قبلہ کی کسی جائداد کے امین یہ خوش اطوار نوجوان بابر میاں ہیں؟" سید صاحب پلکیں پٹ پٹا کے بولے۔

"ٹھیک' بالکل ایسا ہی۔" بجھل نے بے اعتنائی سے کہا۔

"یقیناً بڑی جائداد ہی ہو سکتی ہے جو آپ قریے قریے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟" سید صاحب نے ہونٹ سکیڑ کے پوچھا۔

"بڑی ہے صاحب' اچھی بڑی۔"

سید صاحب نے ہنکارا بھرا اور متانت سے بولے۔ "مولوی صاحب یہاں کا راستہ تو شاید بھول ہی گئے۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔ بڑے درویش صفت آدمی ہیں، حدیث و فقہ کے عالم، شعر و سخن کے دل دادہ، وہ ایک روشن خیال علامہ ہیں "اپنی بات منوانے اور دوسروں کی بات سننے کا حوصلہ رکھنے والے۔"

"پچھلی بار وہ اکیلے آئے تھے یا کوئی...؟" سید صاحب نے سانس لینے کے لیے توقف کیا تھا کہ بجھل نے پوچھا۔

"نہیں، بالکل تنہا، بالکل تنہا۔" سید صاحب نے بے عجلت کہا "آپ کی مراد ان کی بیگم سے تو نہیں ہے؟ اس وقت تو جیسا کہ انھوں نے فرمایا تھا، ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کیا بعد کو حضرت نے...؟ کاش یہ ممکن ہوا ہو۔" سید صاحب کے لہجے سے بے تابی ہویدا تھی۔

"نہیں صاحب ابھی وہ پورے کے پورے ہیں۔"

سید صاحب کی سمجھ میں دیر سے آیا اور انھوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا "جی ہاں، واقعی شادی کے بعد تو آدمی آدھا ہی ہو جاتا ہے مگر آپ کی مراد۔" وہ سنجیدہ ہو کے بولے "پھر آپ کی مراد کس سے ہے؟ بھلا کون ان کے ساتھ ہوتا؟"

"ان کی بٹیا۔"

"ان کی بیٹی۔" سید صاحب نے چونک کے پوچھا "مگر انھوں نے تو شادی! آپ فرما رہے ہیں کہ...."

بجھل نے ہاتھ اٹھا کے صراحت کی "انھوں نے ایک کو منہ بولی بنا لیا ہے۔"

"ہوں، اوں۔" سید صاحب چڑ مراتی آواز میں بولے "کب ہے یہ دل خوش کن واقعہ پیش آیا؟"

"برس بیت گئے۔" بجھل نے آہستگی سے کہا۔

"یہ اچھی بات ہوئی، وہ اکیلے بھی بہت تھے۔" سید صاحب نے تبصرہ کیا "ویسے جناب کو ان کے بارے میں معلومات خاصی ہیں۔"

"اپنے کو کوئی اور کام نہیں ہے۔"

"کتنے برس ہو گئے قبلہ کی تلاش میں؟"

"اب گنتی یاد نہیں رہی۔"

سید صاحب کے چہرے پر ہمدردی اور فکر کا تاثر ابھرا اور انھوں نے نسبتاً دھیمی آواز میں کہا "معاف کیجیے، آپ صاحبان کے تعارف میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔" وہ اشتیاق اور کسی قدر لجاجت سے بولے "مناسب ہو تو کچھ اور بتائیے۔"

"کیا بولیں صاحب۔" بجھل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ بمبئی میں کچھ جائداد وغیرہ ہے، اس کی آمدنی پر گزارا ہے۔"

"ماشاء اللہ لیکن جناب بمبئی کے مستقل رہنے والے تو نہیں معلوم ہوتے۔"

"اب تو ادھری ہیں، پہلے فیض آباد میں ہوتے تھے اور جانے کدھری۔ اپنا دانہ پانی بہت مستی کرتا ہے۔"

"خوب۔" سید صاحب نے شگفتگی سے پوچھا "اس سول پہلی بار آنا ہوا؟"

بجھل نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

"یہاں کہاں قیام ہے؟"

"ادھری نزدیک ایک جگہ پر بکسا دھرا ہے۔" بجھل نے سپاٹ لہجے میں کہا اور رخصت کی اجازت چاہی۔

سید صاحب بے قرار ہو گئے۔ "ایسا کیسے جناب! آپ نے غریب خانے کو عزت بخشی ہے، کاش میں آپ کے کسی کام آ سکتا لیکن اس طرح، اس طرح آپ یہاں سے کم از کم میرے گھر سے تو نہیں جا سکتے۔ واہ صاحب، اتنی دور سے تشریف لائے ہیں، کچھ میزبانی کا موقع تو اس عاجز کو دیجیے۔" انھوں نے اونچی آواز میں نصیر یا نامی کسی ملازم کو پکارا۔

"آپ کا تاثر بہت الٹا کیا، اتنا بہت ہے صاحب! اب اجازت دو۔" بجھل نے میری ناسازیٔ طبع کا عذر کیا اور کہ بہ صورت دیگر ہم کچھ اور بیٹھتے۔

سید صاحب کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی "کیا بات ہے ارے رے؟ آپ نے پہلے کیوں نہیں فرمایا۔ حد ہے جناب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟" انھوں نے مضطرب لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے شکستہ آواز میں انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ "سفر کی تھکن غالب ہے۔ ایسے ہی بس جسم ٹوٹ رہا ہے۔ کچھ آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

سید صاحب نے بے تابانہ کرسی سے اٹھ کے میری کلائی تھام لی۔ ان کے ٹھنڈے ہاتھ سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا بدن تو جل رہا ہے "حیرت ہے صاحب، آپ اس طرح خود کو تھکائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ آپ کو تو تیز بخار ہے۔ محض آرام نہیں، آپ کو تو دوا کی شدید ضرورت ہے۔"

"ادھری سے نکل کے کسی وید حکیم کو پکڑتے ہیں۔"

"وید حکیم یہیں آ جائے گا۔ آپ ذرا ٹھہریے یہاں سے قریب ہے۔ انگریزی ڈاکٹر، میرے دوست کشن تواڑی۔ کتنے ہی مریض ہوں، پیغام ملتے ہی آ جائیں گے۔ ہاتھ میں شفا ہے۔ تانتا بندھا رہتا ہے مریضوں کا دور سے لوگ آتے ہیں۔" ابن نامی ملازم آس پاس کہیں بھٹک رہا تھا کہ طلبی پر حاضر ہو گیا۔

بجھل نے اس زحمت سے سید صاحب کو روکنے کے لیے بہت کچھ کہا لیکن انھوں نے ایک نہ سنی۔ ابن کو جب تک ڈاکٹر بلانے کی ہدایت نہ کر دی، انھیں چین نہ آیا۔ "کب سے یہ کیفیت ہے؟"

"رات سے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "لیکن صبح کچھ بڑھ گئی۔"

"اور آپ چلتے رہے!"

"یہ ولایتی نہیں ہے، نہ ادھری لکھنؤ کا راجے نواب کا جنا، بھوسا چنے بہت چبائے ہیں اس نے۔" بجھل نے میری سخت جانی کا انھیں یقین دلانا چاہا لیکن سید صاحب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

دائیں جانب راہداری سے خالص مقامی لباس پہنے ہوئے ایک ادھیڑ عمر ملازمہ شربت، مٹھائی اور نمکین چیزوں کا نفیس قسم کی طشتریوں سے بھرا ہوا طشت لے کے حاضر ہوئی۔ طشت جھالروں والے گیروی رنگت کے ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ ملازمہ نے کرسیوں کے وسط میں رکھی ہوئی گول میز پر خوش نما طشتریاں سجا دیں۔ اس دوران میں سید صاحب اس سول کے موسم کی نیرنگی کے بارے میں بتاتے رہے۔ اچھا ہوا انھوں نے مجھ سے کھانے پینے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ بجھل نے سموسے، مٹھائی کا دانہ اور لال رنگ سے آمیز کیا ہوا دودھ کے شربت کا گلاس زہر مار کیا۔ مجھے معلوم تھا اسے اس وقت کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ زندگی کا بڑا حصہ تو آدمی کا وضع نبھانے میں صرف ہو جاتا ہے۔

سید صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے "انھیں ابن کو حکم دیے ہوئے دس بارہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر کا بیگ تھامے، بند 'کرتے اور ٹوپی میں ملبوس، چھریرے جسم کا نوجوان ابن سامنے سے حاضر ہو گیا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر کشن تواڑی ہی ہو سکتا تھا۔ وہ سانولی رنگت کا پستہ قد، گول مٹول اور درمیانی عمر کا شخص تھا۔ دور ہی سے جانے کیا کیا بکتا ہوا آیا "سب خیر تو ہے بھیا صاحب۔"

سید صاحب اور ڈاکٹر کے مراسم بے تکلفانہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی رسمی تپاک کے بغیر سید صاحب نے میری طرف اشارہ کیا اور متردد لہجے میں کہا کہ میرے عزیز مہمان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میری نبض ٹٹولی اور ابن کو حکم دیا کہ مجھے فوراً مہمان خانے کے کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔ مہمان خانہ گھر کے خاص دروازے کے بائیں جانب تھا۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے پر اچانک اٹھ جانے سے میرا سارا جسم ڈگمگا گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ مہمان خانہ زیادہ دور نہیں تھا مگر اتنی سی مسافت میں سانس پھولنے لگی۔ وہ مجھے ایک صاف شفاف سجے ہوئے کمرے میں لے آئے اور نہایت صاف ستھرے بستر پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر نے کسی تاخیر کے بغیر مختلف آلات میرے جسم پر آزمانے شروع کر دیے۔ درمیان میں وہ مجھ سے طرح طرح کے سوال بھی کرتا رہا۔

"کیا صورت ہے؟" ڈاکٹر کے خمٹنے پر سید صاحب نے بے تابی سے پوچھا۔

"تیز بخار ہے 'ٹائی فائڈ' کا اٹیک۔" ڈاکٹر کشن نے منہ بناتے ہوئے کہا "آرام، پرہیز اور دوا کی ضرورت ہے۔"

"اور تو سب ٹھیک ہے۔" سید صاحب الجھ کے بولے "میرا مطلب ہے، ایسی تشویش کی کوئی بات تو نہیں؟"

"بیماری کا پہچانا کرو تو گلے میں اٹک جاتی ہے بھیا صاحب! یہ ٹائی فائڈ ہے ٹائی فائڈ" نزلہ زکام کھانسی نہیں۔"

"ابھی آپ اتنا کرو ڈاکٹر صاحب! اپنے کو کلکتے پہنچنے تک کی کوئی دوائی دے دو، ادھری بھی ہمارا گھر ہے۔" بجھل نے نرمی سے کہا "کلکتہ ادھری سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ہم کو بھی معلوم ہے، پر آپ کو اس سے کوئی دشمنی لگتی ہے کیا؟" ڈاکٹر تلخی سے بولا۔

بجھل چپ ہو گیا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے آہستہ سے پوچھا "کتنے دن لوگے آپ؟"

"کیا بول سکتے ہیں، یہ تو اس جوان پر ہے، دوا کے ساتھ بیمار کا زور بھی چلتا ہے۔ زیادہ تو نہیں لگنا چاہیے۔ آٹھ دن یا زیادہ بھی۔ ابھی اس وقت ٹھیک سے کچھ نہیں بول سکتے۔ ٹائی فائڈ تھوڑی نخرے والی بیماری ہے جی" ڈاکٹر اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے بیگ سے انجکشن نکال کے میرے بازو میں گھونپ دیا اور مختلف رنگوں کی گولیاں کھانے کو دیں۔ میری کمر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دوا پینے کے بعد میں نے اٹھنا چاہا مگر ڈاکٹر نے مجھے جھڑک دیا اور خاموشی سے لیٹے رہنے کی تاکید کی۔

"سید صاحب! ایک بات تھوڑی تسلی سے سن لو۔" بجھل نے دبی دبی آواز میں کہا "اپنے کو ادھری اپنے نزدیک کوئی ٹھکانا دلا دو، آٹھ دس دن کے لیے، چاہیے کتنے کا ہو۔"

"واہ صاحب! یہ گھر، یہ مہمان خانہ ہم نے کس لیے کس کے لیے بنایا ہے۔" سید صاحب ناگواری سے بولے

"ٹھکانے آپ کو مل سکتے ہیں' اس سے بہت اچھے لیکن ہم آپ کو صاف بتائیں' یہاں جیسا آرام کہیں نہیں ملے گا۔ میں پوچھتا ہوں' اس میں حرج ہی کیا ہے۔ درست ہے' ہماری آپ کی پہلی مڈبھیڑ ہے لیکن پہلی نہ ہو تو دوسری بھی ممکن نہیں ہوتی۔ اجنبی سہی مگر آدمی کا آدمی سے ایک رشتہ تو سدا رہتا ہے۔ بہتر ہوگا' آپ سب کچھ ہم پر چھوڑ دیجیے' ملازم کو بتا دیجیے سامان کہاں رکھا ہے' وہ لے آئے گا۔ آپ بابر میاں کو دیکھیے' انشاءاللہ جلد افاقہ ہوگا' ڈاکٹر کشن نام ہی کے نہیں ہاتھوں کے بھی کشن کنہیا ہیں۔"

"ہاں ہاں' ہم گوپیوں والے۔ بس ہم کو مرلی بجانا نہیں آتا۔" ڈاکٹر نے انگلیاں نچا کے کہا اور بچھل سے بولا "بابا! آپ کیوں چنتا کرتے ہو' ادھر مزے سے ریشمان کرو' وشرام کرو' اپنے بھیا صاحب کو مہمان پالنے کا بہت شوق ہے۔"

"بے شک' بے شک۔" سید صاحب سینے پر ہاتھ رکھ کے بولے "میزبانی میری عادت ہے۔ یہاں مہمان خانے میں کوئی مہمان نہیں ہوتا تو سچ پوچھیے' عجیب اداسی سی رہتی ہے۔ یہاں دس بارہ افراد کے قیام کی گنجائش ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ ان دنوں کم ہی لوگوں کا اس طرف آنا ہوا اور نہ برکت ہی برکت رہتی ہے۔ مہمان خانہ بسا رہتا ہے۔ بہاول پور ریاست کے ایک بزرگ البتہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بھی کل صبح رخصت ہو جائیں گے۔ اب تو خیریات ہی دوسری ہو گئی' ویسے بھی جناب! ہم آپ کو ایسے تو نہیں جانے دیتے۔ کم از کم ایک رات کے لیے تو آپ ہماری درخواست رد نہیں کر سکتے تھے۔"

"آپ بھیا صاحب کو نہیں جانتے بابا!" ان کا دل کسی دن ضرور چیک کرنا ہے' اتنا بڑا ہونے پہ ڈاکٹری میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب دل رہا ہی کہاں ہے۔" سید صاحب نے بظاہر سرد آہ بھر کے کہا۔

"رہے بھی کیسے' پاس رکھو جبھی تو بھیا صاحب!" ڈاکٹر کشن اور کہنا چاہتا تھا کہ سید صاحب نے بہ عجلت کہا "تم نے پرہیز کے لیے کچھ نہیں بتایا مرلی منوہر۔"

"دلیہ اور ایک دم ہلکا پھلکا' بہت نرم' دوائی کے ساتھ ابن مستانے کے ہاتھ پورا چارٹ بنا کے بھیج دوں گا۔" ڈاکٹر نے بیگ بند کیا' مجھے تھپکی دے کے اور منتظر مریضوں کی کثرت کا عذر کر کے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ بچھل نے چند قدم لپک کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سید صاحب بھی سمجھ گئے "تم جاؤ کنہیا!" انہوں نے ڈاکٹر سے کہا اور اشاروں سے بچھل کو کچھ تلقین کرنی چاہی۔

"اب تو نوکری بھر موتی چور' چھوٹے میاں جی اچھے ہو جائیں' پھر کھائیں گے۔" ڈاکٹر مچلتے ہوئے لہجے میں بولا اور بچھل کو تحمل کا درس دینے لگا۔ اس نے از خود وعدہ کیا کہ صبح و شام میری خبر گیری کے لیے آتا رہے گا۔ بچھل کو اس نے شکریے کا موقع نہیں دیا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ دونوں میرے پلنگ کے نزدیک کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سید صاحب ڈاکٹر کشن کی طبی مہارت کے مختلف واقعات سناتے رہے۔ کہنے لگے کہ برسوں سے ان کی دوستی ہے۔ خاصا منہ پھٹ اور کسی قدر مسخرا شخص ہے۔ یہاں تو اس نے احتیاط کی' بے تکان گالیاں بکتا ہے۔ دل کا بہت اچھا ہے۔ الٰہ آباد سے تعلق ہے' برسوں پہلے آسن سول آ کے مطب شروع کیا تھا' اب فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر وہ اپنے بارے میں بتانے لگے کہ آسن سول کے گرد و نواح میں ان کی تھوڑی بہت زمیں داری ہے' کچھ زمین بردوان میں بھی ہے۔ شہر کی میونسپلٹی میں بھی ان کا عمل دخل ہے۔ بیشتر وہ رفاہی فلاحی کاموں میں مصروف رہتے ہیں' ہفتے عشرے میں ایک دو دن کے لیے زمینوں کی نگرانی کے سلسلے میں دورے کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں ان کے مراسم اعلیٰ حکام' تاجر' زمیں دار اور معززین سے بڑے گہرے ہیں۔ شاید ہی کسی اہم تقریب میں انہیں مدعو نہ کیا جاتا ہو۔ وہ رنگ و نسل' فرقہ و مسلک میں رعایت کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تعلق ہر طرح کے لوگوں سے ہے اور اطراف و اکناف میں ان کی عزت کی وجہ بھی یہی ہے۔

"اور ادھری گھر میں......" بچھل نے پہلو بدل کے پوچھا "گھر میں بیوی بچے...؟"

سید صاحب نے گہری سانس بھری' چہرے پر کئی رنگ آئے' کہنے لگے کہ گھر کے معاملے میں وہ زیادہ خوش قسمت نہیں ہیں۔ دو مرتبہ شادی کی' دونوں بیویاں گزر گئیں۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹی' تین بیٹے ہوئے تھے۔ ایک بیٹے کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ باقی دو ولایت تعلیم حاصل کرنے گئے تھے لیکن وہاں کی زندگی ایسی مرغوب ہوئی کہ یہاں آنا نہیں چاہتے۔ سال دو سال بعد چکر لگاتے ہیں اور جلد ہی لوٹ جاتے ہیں۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بیٹی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور بھوپال میں آسودہ زندگی گزار رہی ہے' کبھی کبھی میکے آ جاتی ہے۔

"پھر تو گھر میں بچھو بڑھ گئے ہوں گے۔"

"جی' جی ہاں' مگر نہیں ایسی تنہائی تو نہیں' گھر تو اللہ رکھے بھرا ہوا ہے' نوکر چاکر ہیں' دوست احباب کا جمگھٹا رہتا ہے۔ ایک بوڑھی رشتے دار خاتون بھی ساتھ ہیں' جی لگا رہتا ہے۔"

"پھر کانٹا کھینچ لیا کیا؟"

"جی' جی کیا فرمایا آپ نے؟"

"تیسری کوئی نہیں کھوجی پھر؟ شکر ہے۔" بچھل کا لہجہ طنز سے عاری تھا "اچھا کیا۔"

"ایک ثانیے کے تردد کے بعد سید صاحب چہک کے بولے "تیسری بھی ممکن تھی' بس یوں سمجھیے ستارے نہیں ٹکرائے' ہو نہیں پائی' ہو بھی سکتی ہے۔ آپ فرمایئے' آپ نے تو اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں؟"

"کچھ بولنے کا ہو تو منہ کھولیں۔"

"کتنے بچے وغیرہ...؟"

"بہت سارے۔"

"ماشاءاللہ "کتنے؟" سید صاحب نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کیا بولیں' گنتی یاد نہیں۔"

"یہ بھی خوب رہی۔" سید صاحب نے قہقہہ لگایا اور سنجیدگی سے بولے "زیادہ بچے رحمت بھی ہیں' زحمت بھی اور کی کچھ بیوی کا ہے۔ آج تک سمجھ میں نہیں آیا' ہونے یا نہ ہونے میں کون سی صورت زیادہ اچھی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"اپنے کو سچ پوچھو تو کچھ پتا نہیں۔"

"آپ کا تجربہ کیا ہے؟"

"کبھی فرصت ہی نہیں ملی صاحب۔"

"آپ کے چہرے پر بہت تجربے لکھے ہیں۔"

"اپنے کو پتا نہیں' آپ پڑھے لکھے آدمی ہو۔"

"لگتا ہے زندگی بہت جھیلی ہے آپ نے۔"

بچھل بے حرکت بیٹھا رہا۔

"یہ بابر میاں! آپ نے بتایا ہی نہیں کہ ان سے آپ کی کیا عزیزداری ہے...؟"

"بس یوں ہی کچھ۔"

"وہ تو نظر آ رہا ہے پھر بھی...."

"چھپا چھپانا ضروری ہے کیا؟"

"نہیں' بے شک نہیں۔"

"پھر جو آپ سمجھو' وہی ٹھیک ہے۔"

"مناسب ہے۔" سید صاحب خفیف سے ہو گئے اور کہنے لگے "ہماری گفتگو سے بابر میاں بے آرام ہو رہے ہوں گے' آیئے باہر چلتے ہیں۔"

میں نے بہ دقت کہنے کی کوشش کی کہ وہ میری فکر نہ کریں' بہتر ہے' یہیں بیٹھیں۔

لیکن سید صاحب اٹھ گئے "ملازم نصیر بابا کمرے کے باہر رہیں گے۔ دوسرے ملازموں کو بھی ہدایت کر دی گئی ہے۔ کسی فوری ضرورت کے لیے مہمان خانے میں ایک مختصر سا باورچی خانہ بھی ہے۔ نصیر بابا کو اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔" انہوں نے میری جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور تسلی دیتے رہے۔

"مہمان ادھری آ کے تو پیچھے کا سارا بھول جاتا ہوگا؟" بچھل نے چٹکی بھرنے والے انداز میں کہا۔

"نہیں صاحب! اپنی اپنی مصروفیت میں گھرے ہوئے لوگ آتے ہیں۔ میری تو بس یہی تمنا رہتی ہے کہ یہاں سے کوئی ناخوش نہ جائے مگر یہ کوئی بہت بڑا شہر تو ہے نہیں' آس پاس اچھے شاداب مقامات ہیں لیکن بمبئی' کلکتے' دلی کی رنگینیاں تو یہاں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں' لوگ میری عزت افزائی کے لیے اس طرف کا رخ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کام کی غرض سے' کچھ خاص تعلق خاطر کی وجہ سے' بعض حضرات سکون کی تلاش میں غریب خانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ابھی چند ماہ پہلے ندوے کے ایک عالم کتاب لکھ رہے تھے' انہیں خلوت کی ضرورت تھی۔ یہاں تشریف لے آئے' مہینے ڈیڑھ مہینے قیام رہا۔ انہی دنوں دوسرے کمرے میں سنگیت سمراٹ استاد شاد خان ٹھہرے ہوئے تھے۔ صبح و شام کمرے میں بند ہو کے ریاضت کرتے تھے۔ افسر' مصور' شاعر' کم کم کے لوگ' تفصیل کیا عرض کروں۔"

"ادھری ہر ایک کو کھلی چھٹی ہے کیا؟"

"ہر ایک کو نہیں' معاف کیجیے یہ سرائے یا ہوٹل نہیں ہے۔ یہ تو محبت کی ایک رسم ہے' محبت کا ایک سلسلہ ہے جو جاری ہے' جاری رہے گا۔"

"ادھری کوئی کانٹا تو رکھا ہوگا آپ نے؟"

"آنکھ سب سے بڑی ترازو ہوتی ہے' نظر آ جاتا ہے جناب! اتنی پرکھ ہوتی ہے۔" سید صاحب نے اعتماد سے کہا۔

"اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

سید صاحب سے فوراً کوئی جواب بن نہ پڑا۔ بے رخی سے بولے "آدمی بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔"

"ہم تو دکھائی نہیں دینے چاہئیں صاحب! کسی ترازو پر

پورے نہیں اترتے۔"

سید صاحب کے جسم پر تموج سا نمودار ہوا "آپ نظر آرہے ہیں جناب! یہ کسر نفسی بھی خوب ہے' جانے دیجیے۔ سمجھیے آپ ہمیں اچھے لگے' دوسروں سے الگ۔" انہوں نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "دھوپ میں تو سفید نہیں ہو رہے۔"

"پر ابھی پورے پکے بھی نہیں ہوئے۔"

"ابتدا تو کب سے ہو چکی ہے' باقی کتنے دن کے ہیں۔"

"کبھی کوئی نوکیلی والا بھی ٹکرایا ہوگا؟"

سید صاحب کی پلکیں مرتعش ہو گئیں' اضطراری لہجے میں بولے "جی ہاں' مگر ایک دو بار ہی جی پر بار ہوا۔ اصل میں کوئی آدمی اتنا مکمل نہیں ہوتا مگر آپ" "آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ایسے ہی صاحب! اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔"

"کچھ مت سوچیے اور آئیے' باہر کھلی ہوا میں بیٹھتے ہیں۔ موسم بڑا سہانا ہے' بارش کی بھی اپنی مستی ہوتی ہے۔"

بخار اور سر درد کی شدت کی باوجود مجھے ان کی باتوں سے لطف آرہا تھا۔ باہر سے ابن کے آجانے پر سید صاحب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ابن دوا کی شیشی بلکہ شیشیاں اور گولیاں لایا تھا۔ اس کے پاس پرہیز کا مکمل گوشوارہ بھی تھا۔ چارٹ پر ایک نگاہ ڈال کے سید صاحب سرہلاتے رہے اور بجھل کی کمر پر ہاتھ رکھے اسے باہر لے گئے۔ کمرے میں کچھ دیر سناٹا سا ہو گیا۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں کہ کسی کی چاپ سے کھل گئیں۔ وہ ملازم نصیر بابا تھے۔ دبے قدموں چلتے ہوئے وہ میرے سرہانے آ کے بیٹھ گئے اور سر دبانے لگے۔ میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اتنے عمر رسیدہ شخص کو یہ زحمت دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے بہت منع کیا' وہ نہیں مانے۔ ان کے ہاتھ سخت کھردرے تھے لیکن دباؤ میں بڑی نرمی تھی۔ انگلیاں بھی بولتی ہیں۔ گونگے بھی تو اپنے دکھ' اپنی خوشی کے اظہار پر قادر ہوتے ہیں۔ مجھے قرار سا آگیا۔ ایسی غفلت طاری ہوئی کہ رات گئے آنکھ کھلی۔ ڈاکٹر نے دواؤں میں یقیناً کوئی نیند آور دوا بھی شامل کی ہوگی۔

سید صاحب نے کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا بلکہ واقعے سے کچھ کم ہی بیان کیا تھا۔ کسی بڑے ہوٹل میں یہ اہتمام اور اسپتال میں یہ نگہداشت ممکن نہ ہوتی۔ مطب جانے سے پہلے ڈاکٹر کشن معائنہ کرنے آیا اور مطب ختم کرکے رات کو ایک بار پھر چکر لگایا۔ سید صاحب بھی دن میں متعدد بار کم وقت کے لیے سہی مگر پوچھ گچھ کے لیے آتے رہے۔ بوڑھی ملازمہ استل گھر سے ہلکی پھلکی غذائیں اور پھلوں کا تازہ رس لاتی رہی۔ ابن اور دوسرے ملازم بشارت اور نذرو بھی بہت مانوس ہو گئے تھے۔ نصیر بابا نے مچھر دانی لگا کے اپنی چارپائی راہداری میں دروازے کے ساتھ بچھالی تھی۔ وہ میری ایک صدا' ایک آہٹ پر مستعد ہو جاتے تھے۔ بجھل نے حسب عادت ملازموں کے انکار کے باوجود جانے کتنی رقم ان میں تقسیم کی تھی اور انہیں باور کرا دیا تھا کہ سید صاحب کو ان عطیات کی بھنک نہیں پڑنے دی جائے گی۔ مال و زر تو متزلزل ہے' روپے کا ریشم آدمی کو زیادہ آسودہ رکھتا ہے۔ بجھل کا بیش تر وقت میرے پاس کمرے میں گزرتا یا پھر وہ سید صاحب کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے باہر چلا جاتا۔ کوئی اور ہوتا تو جانے کن کن موضوعات پر نصیر بابا سے اس کی کھسر پھسر ہوتی رہتی۔ نصیر بابا نے اس کے لیے حقے کا انتظام کر دیا تھا۔ ان دونوں کے تعلقات دیکھ کے لگتا تھا کہ برسوں سے آشنائی ہے۔

چوتھے دن کہیں بخار کا زور ٹوٹا' پانچویں دن میں اس قابل ہو گیا کہ کمرے سے باہر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی آرام کرسیوں پر بیٹھ سکوں۔ پانچ چھ روز میں تقریباً سارے ملازم بجھل کے مصاحب ہو چکے تھے۔ بجھل کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ان کی خاطر مدارات سے تنگ آجاتا۔

سید صاحب کے ہاں آئے ہوئے چھ دن ہو چکے تھے' لگتا تھا جیسے مہینے گزر چکے ہیں۔ چھٹے دن میری طبیعت خاصی بحال ہو گئی تھی۔ نصیر بابا بہت خوش تھے۔ وہ صبح مہمان خانے کے عقب میں پھیلے ہوئے سبزہ زار میں چہل قدمی کے لیے مجھے لے گئے۔ بڑی دل کش جگہ تھی۔ چار دیواری کے ساتھ پھلوں اور پھولوں کے اونچے نیچے درخت' وسط میں قالین کے مانند سبزہ' کیاریوں میں آراستہ بڑے بڑے رنگ برنگے گلاب' ایک گوشے میں مغل طرز کی جالیوں کی دیوار کے پیچھے ملازم کے مکانات تھے۔ بیلوں نے آدھی دیوار ڈھانپ رکھی تھی۔ شام کو سنگترے کا رس اور سبزی کے کباب کھانے اور دوا کی خوراک نگلنے کے بعد سبزہ زار میں جانے کو میرا جی مچلنے لگا۔ چھ دن کی قید کے بعد آج رہائی ملی تھی۔ میں تو اس مکان سے دور بازار اور گلیوں میں جانا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر کشن نے راہداری کے سوا کہیں اور چلنے پھرنے کی سختی سے ممانعت کی تھی۔ اس کے احکام کی تعمیل ہی کا اثر تھا کہ اب جسم قابو میں محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے تنبیہہ کی تھی کہ ذرا سی تکان سے بخار لوٹ سکتا ہے مگر راہداری سے چند قدم کے فاصلے پر سبزہ زار تھا۔ میں نے نصیر بابا سے وہاں چلنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا پھر جلد ہی کچھ اپنی مجبوری کے احساس' کچھ میری خوشنودی کی خاطر آمادہ ہوگئے۔ شام کے وقت سبزہ زار کا سماں اور فرحت انگیز تھا۔ نصیر بابا کے پاس باتوں کی کمی نہیں تھی' اتنے قصے کہانیاں یاد تھیں اور زندگی کے معمولات کے ایسے تجربے ازبر تھے کہ آدمی بس سنتا رہے۔ باتوں باتوں میں پتا ہی نہیں چلا' ہم دور آگئے۔ صبح اس طرف نہ آسکے تھے۔ چلتے چلتے یکایک نصیر بابا کو خیال آیا اور وہ منتشر ہوگئے۔ "واپس چلتے ہیں میاں! ادھر سے زنان خانے کا حصہ شروع ہو جاتا ہے۔"

میں مہمان خانے کی سمت پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ سامنے دائیں ہاتھ کی جانب عمارت کے تکونی گوشے میں پہلی منزل پر واقع محرابی دریچے کے پٹ کھلنے اور پردہ کھسکنے کی آواز پر میرے قدم ٹھٹک گئے۔ آنکھیں بھی سماعت رکھتی ہیں۔ غیر ارادی طور پر میری نگاہ نے دریچے کا تعاقب کیا۔ کوئی شاعر ہوتا تو برملا شاید یہی کہتا' جیسے ماہتاب دریچے میں اتر آیا ہو۔ وہ ایک جھماکا سا تھا۔ چمکتا ہوا سرخ و سپید کتابی چہرہ' تیکھے نقش و نگار سانچے میں ڈھلے ہوئے بڑی بڑی آنکھیں' بے ترتیب سیاہ بال' کرتا سفید تھا' دوپٹا سبز رنگ کا' کانوں میں چھوٹے آویزے جھول رہے تھے۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں ایک لمحے کے لیے چار ہوئی تھیں کہ چشم زدن میں وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔

نصیر بابا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا' آہستگی سے میرا ہاتھ تھام کے وہ مہمان خانے کی جانب مڑ گئے۔ معمول کی طرح میں نے بھی ان کی پیروی کی۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ واپسی کا باقی رستہ خاموشی سے گزرا۔ نہ نصیر بابا نے کوئی کلام کیا نہ مجھ میں ان سے پوچھنے کی جرأت ہو سکی۔ منظر کی تبدیلی سے مراد منظر کی روپوشی نہیں ہے۔ بعض منظر آنکھوں میں جذب ہو جاتے ہیں' کیمرے سے کھنچی گئی تصویر کی طرح۔ میرے سبزہ زار جانے سے پہلے سید صاحب بجھل کو کہیں لے گئے تھے' وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مجھے واقعی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں آ کے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ ملازمہ استل اور نصیر بابا نے حسب معمول کسی چیز کی ضرورت کے لیے مجھ سے استفسار کیا اور میری طرف سے معمول کا جواب سن کے چلے گئے۔ میں کمرے میں تنہا دیر تک آنکھیں موندے لیٹا رہا اور جب بستر جسم میں چبھنے لگا تو باہر راہداری میں آ کے آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ شام اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔ منع کرنے کے باوجود ملازم ابن نے میرے پیر دبانے شروع کر دیے۔ خدمت گاری بھی شاید جزو جاں بن جاتی ہے۔ ابن میری صحت کی بحالی پر خدا کا شکر ادا کرتا اور مسرت کا اظہار کرتا اور سادگی سے کہنا لگا کہ اسے میرے اچھے ہو جانے کی جتنی خوشی ہے' اتنا ہی یہ سوچ کے وحشت ہوتی ہے کہ چند دن بعد میری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی تو میں اور بجھل یہاں سے چلے جائیں گے۔ بجھل کو سارے ملازم بابا کہتے تھے۔ ابن بطور خاص اسے بابا صاحب' بابا سرکار کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔ ابن کی آواز میں کوئی کھوٹ نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ مہمان تو آئے دن یہاں آتے ہی رہتے ہیں' بڑے بڑے اونچے لوگ لیکن ہم دونوں جیسے آج تک نہیں آئے۔ میرا تو خیر کیا ذکر تھا' میں تو ان کے لیے مسلسل بوجھ بنا ہوا تھا اور میں تو اتنے دن بستر پہ کروٹیں بدلتا' ایذا ہی رہا تھا۔ بجھل ہی سے ان کی راہ و رسم ہوئی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ ابن سے زنان خانے کے مکینوں کے بارے میں کچھ ٹوہ لوں۔ سید صاحب نے گھر میں رشتے کی ایک عمر رسیدہ خاتون ہی کا ذکر کیا تھا' باقی ملازماؤں کا البتہ انہوں نے مبہم انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ اور بھی لوگ ہیں۔ ممکن ہے' زنان خانے میں مہمان خواتین بھی ٹھہرتی ہوں' سید صاحب کی عزیز رشتے دار خواتین۔ میں نے ابن سے کچھ نہیں پوچھا اور خود کو روک لیا کہ مجھے آخر کیا جستجو ہے۔ وہ لڑکی کوئی بھی ہو' مجھے اس سے کیا سروکار؟ میں نے کسی حد تک خود کو مطمئن کر لیا تھا لیکن جانے کیوں وہ دریچہ میری آنکھوں سے دور نہیں ہوتا تھا۔ اس تردد کا کچھ جواز بھی تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر اضطراب آمیز یاسیت چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بے تاثر نہیں تھیں۔ سوچتی ہوئی' کھوئی ہوئی آنکھیں۔ میں اس کیفیت کو کوئی نام دینے میں الجھتا رہا۔

بجھل کوئی آٹھ بجے واپس آیا۔ اس رات اس نے کمرے میں کھانا کھایا۔ معلوم ہوا کہ سید صاحب کسی خاص دوست کے ہاں مدعو ہیں۔ بجھل کا توشہ تو خاص الخاص تھا' میرے پرہیزی کھانے میں بھی کچھ کم اہتمام نہیں تھا۔ مرغ کا شوربہ' مونگ کی دال کی پتلی کھچڑی' چپاتی' سلاد' دہی اور پھلوں کا رس' میٹھا دلیا بھی۔ مجھے رات کی خوراک پلانے اور بجھل کے لیے تازہ حقہ لانے کے بعد روشنی کم کر دی گئی۔ نصیر بابا سب سے آخر میں رخصت ہوئے۔ وہ دروازہ پوری طرح بند نہیں کرتے تھے تاکہ کسی ضرورت کے لیے ہماری آواز باہر راہداری میں دروازے کے ساتھ بچھی ہوئی ان کی چارپائی تک پہنچ جائے۔ تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر جالیاں لگی تھیں۔ ہمارے کمرے میں آمد و رفت کے راستے پر دو

دروازے آگے پیچھے نصب تھے' دوسرا جالی دار تھا۔ چاروں طرف سبزے کی کثرت کی وجہ سے کیڑے مکوڑوں کی بہتات ہو سکتی تھی مگر نصیر بابا کے کہنے کے مطابق ہفتے میں ایک بار ولایتی کیڑے مار دوا کے چھڑکاؤ اور کھڑکیوں پر دروازوں پر کھنچی ہوئی جالیوں سے عمارت کا اندرونی حصہ محفوظ رہتا تھا۔

اس وقت دیواری گھڑی نے گیارہ کا گجر بجایا تھا۔ بٹھل حقہ کشی میں مصروف تھا۔ کہتے ہیں' نیند کے لیے چشم بستگی شرط نہیں' نیند کا اپنا تیور ہے' کھلی آنکھوں میں بھی اتر آتی ہے۔ میرا ذہن جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا اور نیند جیسے چھیڑ خانی کر رہی تھی۔ اچانک جالی والا دروازہ چرچرایا۔ دوپہر ہی نصیر بابا نے ابن کو ہدایات کی تھی کہ وہ دروازے کے قبضوں میں تیل ڈال دے' بہرحال کسی طور تو یہ تکلیف دہ آواز بند ہو۔ ہلکی روشنی کے باوجود پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ وہ نصیر بابا تھے' چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔

"بابا!" انہوں نے سرگوشی میں بٹھل کو پکارا "سو تو نہیں گئے؟"

"نہیں بھایا' نندریا تو بجنی سمان ہے۔ اپنے سے بہت کھیلن کرتی ہے پر ایک دن تو..." بٹھل نے گونجتی آواز میں کہا "تم بولو' آگے پیچھے سب ٹھیک ہے تو کھینچ لاؤ اس کو۔"

"یہی پوچھنے کے لیے آیا ہوں۔" نصیر بابا کے لہجے میں سراسیمگی عیاں تھی "میں نے اس کو بول دیا ہے' اچھی جی دار ہے' پر ڈر رہی ہے بہت۔ میں نے بڑی کمر تھپکی' دلاسے دیے کہ بڑے صاحب جلدی نہیں آئیں گے' محفل میں گئے ہیں۔ اسے بھی معلوم ہے' کبھی کبھی تو سویرے ہی پلٹتے ہیں۔"

"اس کو بولا نہیں' بڑے صاحب بیچ میں آ جائیں تو کیا ہے' دیکھ لیں گے پھر۔" بٹھل نے بے پروائی سے کہا۔

"میں نے بولا تھا' وہ تو کانپ گئی۔ آنے سے انکار کرنے لگی' میں نے سمجھایا پھر یہ وقت نکل جائے گا' اچھی طرح سوچ لو' تیار ہو گئی۔"

"پھر دیری کا ہے کرت ہو؟" بٹھل نے پوربی لہجے میں کہا۔

"یہیں' یہیں... میرا مطلب ہے' یہیں لے آؤں۔" نصیر بابا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

"اور کدھری پھر؟" بٹھل نے تندی سے کہا۔

"کوئی دوسرا کمرا کھول دیتا ہوں' یہاں تو اپنے میاں..."

"نہیں' ادھری لے آؤ۔ بڑے صاحب گھر لوٹیں گے تو اس ٹائم ادھری رخ نہیں کریں گے۔"

"اور کیا پتا کس حال میں ہوں۔"

"یہ تو تم اچھا جانتے ہو۔"

نصیر بابا یہ کہہ کے کہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آتے ہیں' اسی لمحے کمرے سے چلے گئے۔ مجھ سے بستر پر لیٹا نہ جا سکا۔ میں نے طے کیا تھا کہ بٹھل سے سوال کم ہی کروں گا' جواب اس کی مرضی پر ہوتا ہے' خواہ مخواہ پھر مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے لیکن میں خود کو نہ روک سکا "کون آ رہا ہے؟ یہ کیا ہے؟" میں نے جھنجلاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دیکھتے ہیں رے ابھی۔" وہ حقے کا کش لیتے ہوئے بولا۔

"کون ہے وہ؟ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟"

"ابھی سارا تیرے سامنے آ جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے ترشی سے کہا "مگر گ

میں ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

یہی بہتر تھا کہ آنے والے لمحوں کا انتظار کیا جائے۔ شاید وہ مجھے اب تک بچہ سمجھتا ہے یا اسے میری دماغی حالت پر شبہ ہے' اس کی دانست میں' میں ایک بے توازن لڑکا ہوں' اسی لیے وہ مجھ سے صحیح طرح بات نہیں کرتا۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کوئی سرا مجھے تھائی نہیں دے رہا۔ کون اسے باور کراتا کہ جتنا وہ مجھ میں شامل ہے' میں بھی اس سے کچھ سروکار رکھتا ہوں۔ اسے بالکل احساس نہیں کہ اس کے رویے سے دوسرے کو کتنی اذیت ہوتی ہے اور دوسرا کوئی اور نہیں' وہ میں ہوں۔"

نصیر بابا کو گئے دیر ہو گئی۔ گھڑی نے ساڑھے گیارہ کا بجایا۔ یقیناً زنان خانے سے کوئی آ رہا ہے۔ وہاں سے مردان خانے کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے۔ میری نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایسی خاموشی تھی کہ قدموں کی ہلکی چاپ بھی کمرے میں در آئے۔ بٹھل دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ ملال اس کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے حقے کی خرخراہٹ کمرے میں گونجتی رہی۔ میں پلنگ کے سرہانے سے کمر ٹکائے بت بنا بیٹھا رہا۔ گھڑی کی ٹک ٹک سے بیزاری ہونے لگی تھی۔

چند منٹ اور گزر گئے۔ میں نے پلنگ کے پاس رکھی ہوئی میز سے جگ اٹھا کر آدھا گلاس پانی پیا اور اسی طرح وقت گزارنے اور حواس یکجا رکھنے کی کوشش کی۔ بارہ سے اوپر ہو گئے۔ اب رات بہت ہو گئی تھی اور کسی کی آمد کا امکان کم ہوتا جا رہا تھا مگر بارہ نہیں بجے تھے کہ راہ داری میں سرسراتی چاپوں کا گمان ہوا۔ عام دروازہ کھلا تھا۔ لمحے بھر بعد جالی والے دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نصیر بابا نے دروازے

جھانک کر پہلے اطمینان کیا' پھر دبے قدموں آ کے بھنچی ہوئی آواز میں کہا "بابا! میں آ گیا ہوں۔"

"ہاں ہاں دیکھ لیا ہے۔" بٹھل بھی بستر پر بیٹھ گیا۔

"آ جاؤ آ جاؤ۔" نصیر بابا نے اپنے پیچھے سرمئی چادر میں لپٹی ہوئی عورت کے شانے پر ہاتھ رکھ کے تقریباً اسے دھکیلا۔ اس کی حالت اضطرابی' سیمابی سی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر آئی۔ انہوں نے پلٹ کے جھٹ عام دروازے کی چٹخنی چڑھا دی "بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ۔ تسلی سے۔" نصیر بابا کی آواز دھڑک رہی تھی۔ "یہ ہیں اپنے بابا صاحب اور یہ' یہ چھوٹے صاحب بابر میاں۔ میں نے تم کو ان کے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ اب گھبراؤ بالکل نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں گھبرانے کی۔"

وہ پہلے تو سکڑی سمٹی دروازے کے پاس کھڑی رہی پھر نصیر بابا کی مسلسل تلقین و تاکید پر اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جھجکتے' الجھتے قدموں سے کونے میں رکھے ہوئے صوفے پر ایک جانب بدن چراتے ہوئے بیٹھ گئی۔ اس نے چادر کے آنچل سے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا' چادر سے پیشانی بھی چھپی ہوئی تھی۔ بٹھل کی طرف سے روشنی تیز کرنے کی ہدایت پر نصیر بابا کو کسی قدر تامل ہوا تھا لیکن انہوں نے تعمیل کر دی۔ روشنی بھی حیرت' خوف اور رنج و الم کچھ کم کرنے کا سبب ہوتی ہے۔

"اب ادھری آ گئی ہو تو آرام سے بیٹھو۔" بٹھل نے بستر سے اٹھ کے نرمی سے کہا اور صوفے کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا "ادھری تمہارے آ جانے سے لگتا ہے نصیر بابا نے کم ہی بولا ہے۔"

وہ صوفے پر دبکی بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ "بولو بیٹا۔" نصیر بابا نے پچکارتے لہجے میں کہا "اپنے کو جتنا پتا تھا' بابا صاحب کو بتا دیا ہے لیکن اصل بات تو تمہاری ہے۔ تم ہی اپنی زبان سے بولو تو اچھا ہے۔"

وہ کوئی لڑکی ہی تھی۔ اس کا سر اور جھک گیا اور ہونٹ لرزنے لگے پھر جانے اسے کیا ہوا' وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ ادھر سے نصیر بابا لپک کے اس کے پاس پہنچے' ادھر سے بٹھل نے اٹھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ اور بکھر گئی۔ نصیر بابا جلدی سے پانی کا گلاس لے آئے اور مشفقانہ انداز میں بولے کہ وہ حوصلہ رکھے اور یقین کرے کہ ہمدردوں میں آئی ہے۔ خیال رہے کہ اسے زنان خانے میں' جتنی جلدی ہو سکے' واپس پہنچنا ہے۔ اگر اس نے یوں ہی چپ سادھے رکھی اور روتی رہی تو کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا' یہ وقت نکل جائے گا۔"

نصیر بابا کے اصرار پر اس نے بہ مشکل گھونٹ بھر پانی پیا۔ اس کی چادر اس دوران میں چہرے سے ہٹ گئی تھی۔ اس نے دوبارہ چہرہ ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جس کی ایک جھلک میں نے سرِشام زنان خانے کے دریچے میں دیکھی تھی۔ چودہ' پندرہ سے زیادہ اس کی عمر نہیں ہوگی۔ اکہرا ہوا قد' شفق رنگ رخسار' ستواں ناک اور ترشے ہوئے ہونٹ۔ اسے دیکھ کے بے اختیار مجھے نیساں یاد آئی۔ نیساں کے چہرے پر بھی ایسی ہی دل آویز معصومیت تھی۔ وہ بھی ایسی ہی نازک تھی' پھول کی پتیوں کی طرح۔ خال و خد میں دونوں کے فرق تھا جو فرق پھولوں میں ہوتا ہے۔"

"یہ تو ایک دم مورتی کی طرح ہے۔" بٹھل نے بے ساختہ کہا۔

"سچ بابا صاحب! کیا بولوں' دونوں بہنوں کو اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ شہزادیاں ہیں شہزادیاں' ایک کو اٹھاؤ' دوسری کو بٹھاؤ۔ پر نصیب بھی تو اچھا لکھا ہوتا۔" نصیر بابا آہ بھر کے بولے۔

دوسری بہن کے ذکر پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ دریچے والی لڑکی کہیں اس کی بہن تو نہیں؟ دونوں میں ایک شباہت ضرور ہے۔ میں بستر سے اٹھ کے بٹھل کے پاس جا بیٹھا۔

"کیا نام ہے ری تیرا؟"

"لڑکی کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔

"بولو بیٹا بولو' بابا صاحب کیا پوچھتے ہیں' اطمینان رکھو' تم اپنوں میں ہو' یہاں کوئی غیر نہیں ورنہ میں تم کو یہاں کیوں لاتا۔" نصیر بابا شکایت آمیز مہربانہ لہجے میں بولے۔

بٹھل نے دوبارہ لڑکی کا نام پوچھا تو اس نے زیرلبی سے یاسمن بتایا۔

"یاسمن!" بٹھل نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا "کیا بولتے ہیں اس کو' کوئی پھول نا۔"

"ہاں' چنبیلی۔" میں نے کہا۔

" بٹھل نے اپنا بھاری سر ہلایا "اور بڑی کا؟" اس نے یاسمن سے پوچھا۔

"فروزاں۔" وہ پژمردگی اور ناتوانی سے بولی۔

بٹھل نے اس بار مجھ سے فروزاں کے معنی نہیں پوچھے۔ نصیر بابا کچھ کہنا چاہتے تھے کہ بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے انہیں روک دیا اور تھمی ہوئی' تھپکتی ہوئی آواز میں یاسمن سے کہا کہ جس استقامت سے اس نے یہاں آنے کا عزم کیا ہے' یہی عزم و جرات اسے اور فروزاں کو کرنا ہے۔ ہو سکتا

ہے، یہاں آنے کے بعد ہم سے مل کے، ہمیں دیکھنے کے بعد اسے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ اس کے خیال میں ہم وہ لوگ نہ ہوں جن کی اسے تلاش ہے۔ اسے ہماری توثیق و استطاعت پر کوئی شبہ ہے یا ہم اسے معتبر و محترم لوگ نظر نہیں آرہے ہیں تو ہماری جانب سے کوئی اصرار بھی نہیں۔ یہ بات اسے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خود اس نے ہمارے دروازے پر دستک دی ہے، ہم اس کے پاس نہیں گئے ہیں۔ تاہم یہاں آکے اسے کوئی پچھتاوا ہو رہا ہے تو نصیر بابا موجود ہیں، وہ اسی وقت واپس جاسکتی ہے اور وہ خاطر جمع رکھے، ہم اس کی آمد اور اس معاملے کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ ہمیں تو جلد از جلد یہاں سے چلے جانا ہے اور شاید دوبارہ اس شہر میں واپسی ممکن نہ ہو۔

یہ کیسی باتیں ہو رہی ہیں؟ میں ان تینوں کو بے چارگی سے دیکھتا گیا۔ سب سے بڑی بے چارگی تو دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے متصف ہونے کے باوجود کچھ نہ سنائی اور دکھائی دینا ہے۔ میرا سر دھنک رہا تھا۔ یاسمن نامی یہ لڑکی کون ہے؟ بچھل کو اتنی رات کو اس کے یہاں آنے میں کیا رمز ہے؟ اس قسم کی صراحتوں کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے؟ نصیر بابا نے لڑکی کے بارے میں کیا واقعہ بچھل پر منکشف کیا ہے۔ آخر اس پاکیزہ صورت، نازک و اندام، ناتواں لڑکی پر افتاد کیا پڑی ہے؟ صرف اس قدر واضح ہوسکا کہ سید صاحب ملازموں اور زنان خانے کے مکینوں کی لاعلمی میں وہ یہاں آگئی ہے۔ ظاہر ہے، کسی بڑی وجہ کے بغیر وہ یہ قدم نہیں اٹھاسکتی تھی۔ کچھ بچھل کا سرد و گرم تخاطب بھی سمجھ میں آرہا تھا۔ اسے بہرحال عجلت ہونی چاہیے تھی کہ اس طرف کسی کے جھکنے سے پہلے مناسب ہوگا، وہ زنان خانے واپس چلی جائے۔ بچھل کے سامنے زمانے کے پست و بلند سے ناواقف، زندگی کی نیرنگیوں سے ناآشنا، ایک ناپختہ کار لڑکی بیٹھی تھی۔ اجنبی مردوں کے درمیان اس طرح روبرو ہونے کا تجربہ یاسمن کو پہلے بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا یہ امتناع نہایت فطری تھا۔ اپنے حواس کی یک سوئی اور ارادے کی استواری کے لیے اسے کچھ وقت تو لگنا چاہیے تھا، دونوں صورتوں میں جیسا کہ بچھل نے اس سے کہا تھا کہ بصورت دیگر وہ کسی بھی لمحے زنان خانے واپس جانے کا فیصلہ کرسکتی ہے مگر اب آجانے کے بعد یہ فیصلہ اتنا آسان بھی نہیں تھا، وہ بیٹھی رہی۔ اس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ اس کی سرخ آنکھوں اور جلتے بجھتے چہرے سے کیا جاسکتا تھا۔

"اتنے دنوں میں کتنے بڑے بڑے لوگ مہمان خانے میں آئے میں نے تم کبھی کچھ بولا۔ اب آدمی دیکھ کے ہی بات کی ہے بٹیا رانی!" نصیر بابا لجاجت سے بولے۔

"میں کیا کہوں۔" یاسمن کی چیختی آواز سینے میں گھٹ رہی تھی۔

"بابا صاحب کو بولو کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے، کیا ہوتا رہا ہے۔" نصیر بابا دل دہی کے لیے اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

"آپ نے نہیں بتایا؟" وہ کرب سے بولی۔

"لیکن تم بھی تو اپنی زبان سے۔۔۔"

بچھل نے نصیر کو پھر روک دیا۔ "نہیں، اس کو پیچھے کا بولنے کی ضرورت نہیں، ہم سارا جان گئے ہیں۔" وہ ہونٹ بھینچ کے بولا "ہم کو اتنا بول دی، آگے کیا مرضی ہے؟ ہم سے آگے کی بات کرو۔"

یاسمن کے گلابی چہرے پر دھواں سا چھا گیا۔ "میں کیا بتاؤں، مجھے کچھ نہیں معلوم، بس کسی طرح ہمیں یہاں سے۔۔۔ یہاں سے۔۔۔" اس سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" بچھل کی آواز پگھلنے لگی۔ "ادھری آس پاس رشتے ناتے کا کوئی ہو تو بولو؟"

یاسمن نے سر اٹھا کے ڈبڈبائی آنکھوں سے بچھل کی طرف دیکھا اور چادر سے چہرہ چھپا کے بری طرح بلکنے لگی۔

"نا، نا۔" نصیر بابا نے بے تابانہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر[illegible] شانوں پر تھپکیاں دیں اور بچوں کی طرح بہلانے پھسلانے لگے "اپنے آپ کو سنبھالو میری بٹی! میری گڑیا! تم تو بڑی ہمت والی ہو۔ یہ رونے کا وقت نہیں، کوئی دور نزدیک کا ہو تو [illegible] صاحب کو بولو۔"

یاسمن بہت منتشر ہوگئی جیسے کسی آزمائش سے دوچار ہو یا کسی عذاب سے گزر رہی ہو۔ بہ مشکل اس نے خود کو ہموار کیا اور اٹکتی، لڑکھڑاتی زبان سے بتایا کہ اس کے والد جمال الدین سیفی کے کئی قریبی دوست، پٹنے، لکھنؤ، ریاست حیدر آباد اور دلی وغیرہ میں ہیں لیکن کوئی رشتے دار ہندوستان میں نہیں ہے۔ اس کے عالم و فاضل، محقق و مجتہد دادا [illegible] الدین نوری کا تعلق ایران سے تھا۔ نوجوان دادا [illegible] بدخواہوں نے ان کے ایک مقام پر انھیں عتاب شاہی [illegible] اتنا ہیبت زدہ کیا کہ وہ فرار ہوکے ہندوستان آگئے۔ [illegible] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انھیں فارسی زبان اور ادبیات کی درس و تدریس کی عارضی ملازمت مل گئی پھر وہ حیدر آباد چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ہندوستان میں ان کی [illegible] اولادیں ہوئیں، صرف ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہی زندہ [illegible]

دونوں کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا۔ گو عرصہ ہوا، انھیں اطلاع مل گئی تھی کہ توقع کے برعکس ان کے مقابلے پر دربار نے کشادہ قلبی وسیع النظری کا ثبوت دیا اور انھیں فضیلت سند سے نوازا ہے۔ دادا بہت پہلے اپنے آبائی وطن واپس جاسکتے تھے لیکن ریاست حیدر آباد میں انھوں نے بڑی عزت و مرتبت حاصل کرلی تھی۔ وہ یہاں بہت خوش تھے۔ ہندوستان انھیں ایسا پسند آیا تھا کہ ترکِ وطن کا فیصلہ کرلیا تھا۔ البتہ چند ماہ کے لیے ایران جاکے انھوں نے اپنے ہم پیشہ دیرینہ رفیق کار کے تعلیم یافتہ صاحب زادے سے بیٹی کی شادی کردی تھی۔ بیٹی وہیں رہ گئی اور اپنے شوہر کے ساتھ عراق، پھر روس میں جا بسی۔ روس میں آباد ہونے سے پہلے یاسمن کی پھوپی اور پھوپا سے خوب رابطہ تھا۔ شادی کے بعد ایک مرتبہ پھوپی عراق سے اپنے میکے ہندوستان بھی آئی تھی۔ دادا نے بیٹی کی شادی کے سلسلے میں ایران کے دورے میں اعلیٰ درباری و سرکاری عہدے پر فائز ایک رشتے دار کی صاحب زادی سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بات پکی کرلی تھی چنانچہ کچھ عرصے بعد اپنی پسند کی بہو لانے کے لیے انھیں دوبارہ ایران جانا پڑا۔ بیٹے کی شادی کو سال بھر سے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ زندگی کا باب ختم ہوگیا۔ ریاست حیدر آباد میں دادا نے ایک چھوٹی سی حویلی بنالی تھی۔ والیٔ دکن حضور نظام نے ان کے علمی و تحقیقی کام کی ستائش میں شہر کے قریب زرعی زمین کا ایک قطعہ بھی عطا کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی انھیں ریاست کی طرف سے اعزاز و انعام ملتے رہے تھے۔ یاسمن اور فروزاں حیدر آباد میں پیدا ہوئی تھیں، ان کا ایک بھائی شیر خواری کے زمانے میں انتقال کرگیا تھا۔ دونوں بہنیں کبھی ایران نہیں گئی۔ ان کے والد جمال الدین سیفی بھی ہندوستانی بودوباش کے دل دادہ تھے اور اپنے دانش ور باپ کے سچے پیروکار تھے۔ وضع دعوت میں یکتا، نہایت خوش گفتار، خوش شعار، ان کا بیش تر وقت مطالعے میں گزرتا تھا۔ سیاحت کا شوق تھا اور ہندوستان کی قدیم تہذیب پر تحقیق کررہے تھے۔ بڑی بہن فروزاں نے مشرقی علوم کی پہلی سند حاصل کرلی تھی۔ باپ اپنی بیٹیوں کے اتالیق بھی تھے۔ اردو اور انگریزی کے لیے انھوں نے گھر پر استاد رکھے تھے۔ دونوں بہنوں کو خود بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ حیدر آباد میں ان کا گھرانا آسودہ، عزت مندانہ زندگی گزار رہا تھا کہ نواب بھوپال کی پیش کش پر جمال الدین سیفی بھوپال آگئے۔ وہاں ان کا زیادہ جی نہ لگا تو ملازمت ترک کیا پھر لکھنؤ چلے آئے اور لکھنؤ سے پٹنہ۔ پٹنے میں ان کی ملاقات سید صاحب سے ہوئی اور دونوں میں جلد ہی گہرے مراسم ہوگئے۔

نصیر بابا بچھل کے لیے حقہ اٹھا لائے تھے لیکن بچھل نے ایک کش نہیں لیا۔ ہم تینوں خاموش بیٹھے یاسمن کی ٹوٹی پھوٹی آواز میں اس کی روداد سن رہے تھے۔ کہتے ہیں، عورت کے آنسوؤں میں بڑی تپش ہوتی ہے۔ ایسی کم سن، سادہ و معصوم لڑکی کے آنسو تو برداشت ہی نہیں ہو رہے تھے۔ بار بار یاسمن کی آنکھیں امڈ آتی تھیں۔ بار بار اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب جاتی تھی۔ اس کے اسلوب میں یکسانی تھی نہ ترتیب لیکن اس ہذیانی و ہیجانی بیان میں بہت سوزش تھی۔ نصیر بابا کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ یاسمن نے ابھی تک اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کسی حد تک بتایا تھا اور کسی غیر معمولی حادثے یا سانحے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے ماں باپ میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا مگر اس قسم کے تماشے تو آئے دن زندگی نہ جانے کتنے لوگوں سے کیا کرتی ہے۔ صرف اسی قدر ہوتا تو یاسمن کے لہجے میں ایسی دل گیری و دل سوزی نہ ہوتی۔ آگے یقیناً بہت کچھ مختلف تھا۔ اسے جاننے کی جستجو کے باوجود مجھے اس کی گرانی و سنگینی کا اچھی طرح احساس تھا۔ سننے والے کی مستعدی اور شمولیت سے بھی کہنے والے کا حوصلہ کچھ سوا ہوتا ہے۔ اس دوران میں یاسمن کی دھند کچھ کم ہونی چاہیے تھی۔ ہم کتنے ہی اجنبی ہوں لیکن تماشائی تو نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کہنے لگی کہ پٹنے میں سید صاحب کے مشورے پر اس کے والد نے حیدر آباد جاکے دادا کی حویلی اور زرعی زمین کا سودا کرلیا۔

"بس رہی، بس کر۔" بچھل نے بھاری آواز میں کہا۔

بچھل کی اس اچانک مداخلت پر وہ حیران و پریشان ہوئی۔ چادر میں لپٹے اس کے سراپا میں تموج سا نمودار ہوا۔

"اور وہ، وہ کون تھا بھایا؟" بچھل نے نصیر بابا سے پوچھا "اس کے باپ کے ساتھ والا جوان! کیا نام بولا تھا اس کا؟"

"کون، کون بابا صاحب؟" نصیر بابا گڑبڑا گئے۔

"وہی، جس کا تم بولتے تھے، اس کے باپ کا خاص چیلا، نام بھی بولا تھا تم نے۔"

"وہ، وہ ظفر میاں، ہاں بابا صاحب۔" نصیر بابا ہکلانے لگے "اس بے چارے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی یہ۔"

"اس کا کوئی اتا پتا ہے تمہارے پاس؟"

"مل جائے گا، ضرور مل جائے گا۔" نصیر بابا سینے پر ہاتھ رکھ کے بولے۔

بچھل نے ہنکار بھر کے سر ہلایا اور نصیر بابا کو ہدایت کی

کہ وہ یاسمن کو واپس لے جائے۔

"جی' جی بابا صاحب!" نصیر بابا بدحواسی سے بولے اور پٹ پٹاتی پلکوں سے بجھل کو دیکھنے لگے۔

مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی لیکن میری لب کشائی کا کوئی محل ہی نہ تھا۔ نصیر بابا دیر تک گم صم سے رہے۔ انہیں گمان ہوگا کہ شاید بجھل کوئی اور حکم صادر کرے۔ بجھل نے حقے کی منال ہونٹوں سے لگالی تھی۔ ناچار نصیر بابا نے یاسمن کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ یاسمن کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا تاہم نصیر بابا کے ٹوکنے پر اس نے جلدی جلدی چادر درست کی اور صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بجھل نے بھی کرسی ترک کردی۔ صوفے سے اٹھ کے یاسمن دروازے کی طرف چلی گئی تھی کہ نصیر بابا نے اسے ٹھہرے رہنے کی تاکید کی۔ ان دونوں کے پیچھے پیچھے بجھل بھی آہستہ آہستہ دروازے پر جا پہنچا اور یاسمن کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ چٹخنی گرا کے نصیر بابا محتاط انداز میں دروازے سے سر نکال کے باہر جھانکنے لگے۔ یاسمن ابھی کمرے میں ہی تھی کہ بجھل نے اس کے سر پر ہاتھ پھیلا دیا۔ یاسمن کا سر اور جھک گیا۔ بجھل نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دھیمی آواز میں بولا "اب جا کے آرام کرو' بڑی کو بھی سمجھا دینا۔"

یاسمن کی آنکھیں چھلک گئی تھیں' اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ بجھل نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور تادیر اسے تکتا رہا' پھر یکایک اس نے ہاتھ بڑھا کے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"نا' ناری نا' بٹیا! ایسے نہیں' بالکل نہیں' آگے اچھے کا آسرا رکھ' ابھی ہم ادھری ہیں اور اب شاید جلدی جانا نہ ہو۔"

نصیر بابا نے دروازے سے باہر جھانکنے ہی پر اکتفا نہیں کی' راہ داری میں جا کے بھی اطمینان کرلیا کہ یاسمن محفوظ طریقے سے زنان خانے واپس جا سکتی ہے۔ وہ اسے فوراً باہر لے گئے۔ میں جالی کے دروازے سے کھمبوں اور دیواروں کی آڑ میں چھپتے چھپاتے انہیں جاتے دیکھتا رہا' پھر وہ اندھیرے میں گم ہو گئے۔

کمرے میں جی نہیں لگا تو میں راہ داری میں آگیا۔ ہر سو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ سناٹا اور بڑھا رہی ہے۔ بے ارادہ دروازے کے آس پاس بھٹکتے بھٹکتے میرے قدم خود بہ خود عقبی سبزہ زار کی طرف بڑھنے لگے۔ راہ داری کے سرے پر پکے فرش سے نیچے سبزے پر پاؤں رکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اس وقت اگر کسی کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو؟ میرا دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ واپس اپنے کمرے تک آکے میں نصیر بابا کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ انہیں گئے ہوئے دیر ہو گئی تھی یا مجھے گزرتے وقت کی رفتار کا شعور نہیں رہا تھا۔ مجھے نصیر بابا کا انتظار تھا اور یہ بلاغت یا احتیاط بھی میرے ذہن سے اوجھل ہو گئی تھی کہ اتنی رات کو کھلی راہ داری میں نصیر بابا سے سرگوشیاں کسی طور مناسب نہیں۔ راہ داری میں قدموں کی آہٹ پر میں چونک پڑا۔ نصیر بابا ہی ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ اندھیرے سے نکل کر کوئی سامنے آتا' میں کمرے میں آکے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

ادھورا علم بہت خوار کرتا ہے۔ پورے علم کی آسودگی ہی کچھ اور ہوتی ہے یا پھر آدمی سرے سے کچھ جانتا ہی نہ ہو' اندھوں اور بہروں کی طرح' اور شاید نہ جاننا ہی جاننے سے بہتر رہتا ہے۔ مکمل آگہی کے بعد قرار و سکون کی کیا ضمانت ہے' یہ تو آگہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ بجھل جاگ رہا تھا۔ کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ ایک کوشش کر کے دیکھوں لیکن کسی ترشی و تلخی کے اندیشے نے مجھے باز رکھا۔ اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہو رہی تھی۔ صبح اذانوں کے وقت غنودگی طاری ہوئی تھی کہ کمرے میں ہونے والی کھڑکھڑاہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ صبح سویرے ورزش بجھل کا معمول تھا۔ نصیر بابا بھی نماز کے لیے جاگ گئے تھے۔ علی الصباح نصیر بابا نے بجھل کو بتا دیا تھا کہ رات کے آخری پہر سید صاحب کی واپسی ہوئی ہے۔ بہ ظاہر اس اطلاع کا مقصد یہ معلوم کرنا بھی تھا کہ بجھل کے ناشتے کا اہتمام کہاں کیا جائے۔ میرا اپنا ناشتا اسی کمرے میں آجاتا تھا۔ بجھل روزانہ سید صاحب کے ساتھ کھانے کے خاص کمرے میں ناشتا کیا کرتا تھا۔ سید صاحب کی عدم موجودگی میں کھانے کے کمرے میں بجھل کے تنہا ناشتا کرنے کی تک نہیں … روشنی بڑھتے بڑھتے دوسرے ملازموں کی آمد بھی شروع ہو … تھی۔ کسی نے بستر درست کیا' چادریں بدلیں' کسی نے … کی' پھر ابن اور اہتسل ناشتے کے طشت لے آئے … کھانے کو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی لیکن ڈاکٹری ہدایت … مطابق دوا کی خوراک سے پہلے کسی قدر شکم پری لازم … طرح طرح کی چیزیں طشت میں سجی ہوئی تھیں۔ میں … تھوڑا سا دلیا لیا' دو ایک انگریزی بسکٹ اور پیالی بھر … کے بعد کسی اور چیز کی طرف رغبت ہی نہیں ہوئی۔ بجھل … خاصا الجھا ہوا لگتا تھا۔ اس نے بھی بس ناشتے کی رسم … پراٹھے اور آلو کی ترکاری کے چند لقمے اور دو ہی … چمچوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ اس دوران ڈاکٹر …

شور مچاتا کمرے میں داخل ہوا اور میری طرف آنے کے بجائے وہ بجھل کے سامنے رکھے ہوئے ناشتے کے طشت پر جھپٹ پڑا "اچ چھا' تو آج یہاں میلا لگا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے' اپنے مہاراجا سید میاں تو رات کی تھکن اتار رہے ہوں گے۔ صاحب بہادر ڈی سی کی دعوت تھی' مذاق نہیں۔ بڑی رنگ دار محفل ہوگی' بڑے بڑے تیس مار درباری آئے ہوں گے۔ جلدی چھٹی کہاں ملتی" وہ چہکتی آواز میں خود کلامی کر رہا تھا' پھر بابیت سے بولا "جانا تو ہم کو بھی تھا' پر کیا بولیں' رات کو ادھر تالی بجاتے تو سویرے ادھر کلینک میں ہاہاکار مچی ہوتی۔ یہ ڈاکٹری بھی سسری گلے کا پھندا ہے' گھر کا نہ گھاٹ کا' ہاں۔ اپنے سید بادشاہ کو دیکھو' من موجی' جدھر منہ اٹھا' چل پڑے۔ بہت چاؤ تھا میاں جی کو' چھوٹا بیٹا ڈاکٹری پڑھ لے۔ میں نے بولا 'بھیا' اس کو آدمی ہی رہنے دو' آدمی ہونا تم کو برا لگتا ہے کیا؟ بات متھے میں آگئی۔ میری حالت زمانے سے دیکھ ہی رہے ہیں۔" بجھل چپ چاپ سنتا رہا۔ ڈاکٹر کو احساس ہوا تو چونک کے بولا "کیا بات ہے بابا صاحب! آج آپ کا من بھی تھوڑا ٹھیک نہیں لگتا۔"

"اپنے کو کیا ہوتا!" بجھل نے سیدھے ہو کے کہا "آدمی کی کھال کدھری ہے اپنے پاس۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے" ڈاکٹر اچھل کے بولا "یہ کیا کہ تک ہوا اور ذرا ٹیڑھی چلی اور آچ چھیں' آچ چھیں۔ کیا بولوں' کیا کیا کانچ کا بنا' نواب کا سگا اپنے پاس آتا ہے۔ لکھنؤ تو ویسے ہی بدنام ہے۔"

بجھل نے ازراہ مروت اس کی ہنسی میں ساتھ دیا۔ میرا خیال تھا' موقع دیکھ کے بجھل' سید صاحب کے بارے میں ڈاکٹر سے شاید کوئی سلسلہ جنبانی کرے۔ اس نے چپ سادھے رکھی۔ پھلوں اور بسکٹوں سے اچھی طرح شغل کرنے کے بعد ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دوا میں کی' تبدیلی اور غذا میں رعایت کردی تھی۔ گزشتہ کل کا فرمودہ اسے حفظ تھا کہ بیماری پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا ہے۔ لیکن کھوئی ہوئی توانائی کی بحالی کے لیے آرام' مقوی غذائیں اور دوائیں از بس لازم ہے۔ میں نے اسے یقین دلانا چاہا کہ اب مجھے ذرا سی بھی کمزوری محسوس نہیں ہو رہی ہے' میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔ اس نے منہ بنا کے مجھے جھڑک دیا' کہنے لگا کہ بڑی اچھی بات ہے لیکن جیسا وہ کہتا ہے' مجھے تعمیل کرتے رہنا ہے۔ وہ مجھے مختلف مریضوں کے تجربات سنانے لگا' مجھے آج نہ وہ اچھا لگ رہا تھا' نہ اس کی باتیں متاثر کر رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا' اسے نکال باہر کروں۔ معمول کے خلاف اس نے آج زیادہ وقت صرف کیا' بڑی مشکل سے وہ ٹلا۔

اس کے جانے کے کچھ دیر بعد' ساڑھے دس بجے کے قریب بجھل نصیر بابا کو ساتھ لے کے جانے کہاں نکل گیا' دونوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ مجھے بتانا ضروری بھی کیا تھا۔ بعد میں ابن سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی جلد واپسی ممکن نہیں ہے۔ جاتے وقت بجھل نے ابن سے کہا تھا کہ دیر ہو جائے تو سید صاحب دوپہر کے کھانے پر اس کا انتظار نہ کریں۔ میرے پاس اپنے آپ کو چٹکیاں بھرنے' نوچنے کھسوٹنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے ساتواں دن تھا۔ بجھل کئی بار گھر سے باہر جا چکا تھا لیکن جلدی واپس آگیا تھا۔ ایک دو مرتبہ سید صاحب اسے اپنی زمینیں دکھانے لے گئے تھے اور صبح سے شام ہو گئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بجھل کے سر میں کیا سمائی ہوئی ہے۔ اس وقت وہ نصیر بابا کے ساتھ بے سبب تو کہیں نہیں گیا ہوگا' مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا' آنے والا وقت بہت کانٹے بکھیر سکتا ہے' دیکھیں' کیا رنگ دکھائے۔ ہمارے ساتھ جگہ جگہ یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ آزمودہ کاروں کا یہ قول ہی شاید معتبر ہے کہ آدمی کو پہلے اپنے راستوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ آدمی کی اپنی مجبوریاں' محرومیاں کم نہیں ہوتیں۔ کاش فیض آباد اسٹیشن پر بجھل میری بات مان لیتا۔ درمیان میں خاصا وقت گزر گیا تھا۔ زریں ہمارے لیے بہت بے تاب ہو رہی ہوگی۔ وہ بھی تو ہماری ذمے داری ہے۔ اتنے طویل سفر کے بعد فیض آباد میں چند دن قیام سے زریں کا اطمینان بھی ہو جاتا' ہمیں بھی آرام کا کچھ وقت مل جاتا۔ کچھ دنوں بعد بھی ہم سفر پہ روانہ ہو سکتے تھے۔ کون سی گاڑی نکلی جا رہی تھی اور مولوی صاحب کو ہماری کون سی خبر تھی کہ دیر ہو جانے وہ کسی اور شہر کا قصد کرلیں گے۔ بجھل سے زیادہ مولوی صاحب کے سراغ کی جستجو مجھے ہونی چاہیے۔ فیض آباد سے دوبارہ سفر پہ نکلتے وقت جمرو اور زورا بھی ہمارے ساتھ ہوتے اور بیماری کی صورت میں ہمیں سید صاحب کا زیر بار احساں ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اتنے عرصے ساتھ سفر کرتے ہوئے جمرو اور زورا کی رفاقت کی عادت ہو گئی تھی۔ بجھل بے شک میرے ساتھ تھا لیکن لگتا تھا' وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے' میں تو اس کے ساتھ ہوں' وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔

کمرے میں دن بھر ابن' نذرو' اہتسل اور دوسرے ملازموں کا تانتا بندھا رہا۔ دوپہر کا کھانا بھی ایسے ہی واپس چلا گیا۔ مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔ سہ پہر کو سید صاحب

میری پرسش کے لیے آئے تھے' میری صحت کی بحالی پر انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا' بٹھل کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو انہوں نے کوئی تردد نہیں کیا۔ میں نے اخلاقاً ان سے کچھ دیر ٹھہرنے کی درخواست بھی کی لیکن میرے آرام کا عذر کر کے وہ جلدی میں رخصت ہو گئے۔ کمرے میں ابن سے تنہائی کا موقع ملا تھا' میں ادھر ادھر کی باتیں کر کے کوئی ٹوہ لے سکتا تھا۔ میں نے خود کو روکے رکھا' مبادا مجھ سے کوئی چوک ہو جائے اور تلافی مشکل ثابت ہو۔ ضروری نہیں کہ ابن اور نصیر بابا میں کوئی فرق نہ ہو۔ ملازم تو دونوں ہیں مگر آدمی تو ایک نہیں۔ بعض ملازم کتوں کی صفات رکھتے ہیں۔

"چار بجے' پھر پانچ بج گئے۔ دن بھر میرا مشغلہ کبھی بستر پر آ کے جسم ڈھیر کر دینا کبھی کمرے سے باہر آ کے راہداری میں ٹہلتے رہنا تھا۔"

دھوپ آسمانوں میں لوٹ چکی تھی کہ بٹھل اور نصیر بابا کی صورتیں دکھائی دیں۔ دونوں کے چہروں سے تکان عیاں تھی۔ میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ آتے ہی بٹھل غسل کے لیے چلا گیا اور نئے کپڑے پہن کے راہداری میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا حقہ کھینچنے لگا۔ ملازمہ اشتل نے پھلوں کا طشت کمرے سے اٹھا کے اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ کل کی طرح سبزہ زار میں چہل قدمی کا وقت گزر چکا تھا۔ آنے کے بعد نصیر بابا بھی کہیں کھو گئے تھے۔ شاید زنان خانے کی طرف نکل گئے تھے یا ہو سکتا ہے' اپنے ہی کسی کام میں الجھ گئے ہوں۔ ملازموں کے اپنے بھی تو کچھ کام ہوتے ہیں۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں کسی ملازم کے ذریعے باقاعدہ انہیں طلب کروں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ ملازموں میں سب سے پہلے اشتل مجھے نظر آئی' اسی سے میں نے کہا تھا۔ چند منٹ بعد ہی نصیر بابا حاضر ہو گئے۔ وہ بہت اجڑے اجڑے لگ رہے تھے۔ اشتل سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ملاقاتیوں کی خصوصی نشست گاہ میں سید صاحب اور ان کے چند خاص دوستوں کی محفل جمی ہوئی ہے۔ نصیر بابا کا آنا مشکل ہو گا مگر وہ آ گئے۔ بٹھل کمرے کے باہر موجود تھا۔ نصیر بابا اس کے سامنے آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ نصیر بابا کو کوئی حکم صادر کرے' میں نے انہیں عقبی سبزہ زار کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ متذبذب ہوئے تھے لیکن انکار کی جرات نہ ہو سکی "سید صاحب کی طرف تو آپ کی ضرورت نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ادھر کا انتظام کر کے آیا ہوں" نصیر بابا کی آواز پر ضعف طاری تھا "بولو میاں! کیا خدمت ہے؟"

"میرے ساتھ آیئے" میں نے نیم حکمیہ لہجے میں کہا

"عشا کے بعد کھانے کا وقت ہو جائے گا" وہ ہوئے بولے۔

"عشا میں ابھی وقت ہے اور کھانے میں تو کبھی بہت بھی ہو جاتی ہے پھر ابھی تو سید صاحب کے مہمانوں کی کا دور چل رہا ہو گا" راہداری کا مختصر فاصلہ عبور کر کے ہم زار میں آ گئے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ "آپ تھکے ہوئے ہے" میں نے قریب ہی ایک سنسان گوشے میں رکھی ہوئی کی بینچ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا اور کسی تمہید کے بغیر "کیا ہوا' جہاں آپ گئے تھے' کوئی کامیابی ہوئی؟"

وہ میری صورت دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے گھبرائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ملازموں کو تیور شناسی کی مہارت ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ انہوں نے سرگوشیانہ میں کہا "ہاں میاں! ملاقات ہوئی۔"

"کیا' کیا ہوا پھر؟" میں انہیں اپنی بے خبری کا تاثر نہیں چاہتا تھا اور اپنی دانست میں اسی طور ان سے کچھ سکتا تھا۔

ان کی ہراساں نظریں اطراف میں منڈلاتی رہیں جگہ ٹھیک نہیں ہے' سنا ہو گا میاں آپ نے' دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔"

"اس وقت یہاں کون پھٹک سکتا ہے' فکر مت میں نے انہیں دلاسا دیا "ہاں' تو آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"بات ہو گئی لیکن وہ تو امید کھو بیٹھا تھا" وہ میرے ہو کے رازدارانہ انداز میں بولے "ہاتھ پیر ہی چھوڑ بیٹھا بابا صاحب نے اسے بہت کچھ بولا تب جا کے ہامی

"کیسی ہامی؟"

"یہی کہ وہ ہر طرح سے تیار ہے' تیار تو خیر وہ پہلے تھا۔"

"مجھے پوری بات بتایئے۔"

"لمبا قصہ ہے میاں!"

"بھئی کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ بابا صاحب کے مجھے دیکھ کے یا یوں کہو کہ بابا صاحب کی مضبوطی دیکھ حوصلہ پکڑا ورنہ وہ تو... وہ تو۔"

نصیر بابا کے جوابات میرا تجسس اور اضطراب کر رہے تھے۔ یہی بہتر تھا کہ پہیلیاں بجھا کر کچھ اخذ کر کوشش کے بجائے میں اپنی تاریکی کا اعتراف کر لوں اس میں ان کے محتاط ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ضروری

کہ بٹھل کی طرح وہ مجھے بھی رازداری کا سزاوار اعتبار سمجھیں۔ یہ امر ان کے سر میں گرہ بھی ڈال سکتا تھا کہ بٹھل نے اب تک مجھے اس معاملے میں شریک نہیں کیا ہے۔ میں انہیں کس طرح باور کراتا کہ بٹھل کی پردہ پوشی مصلحت کوشی نہیں ہے' یہ دانستہ خطا نہیں ہے "یاسمن بی بی سے بات ہوئی؟" مجھے کچھ اور سجھائی نہیں دیا تو میں نے انہیں ٹھوکا دیا۔

"وقت کدھر ملا' ہاں' آنے کے بعد اتنی تسلی ضرور دے آیا ہوں کہ ظفر میاں سے ملاقات ہو چکی ہے۔ زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا" وہ چپکے سے بولے۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں' اس طرح مجھے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں نے گویا سپر ڈال دی اور منت کی "نصیر بابا! مجھے شروع سے سب کچھ بتایئے۔"

میری توقع کے مطابق ان کی آنکھیں حیرت سے بھر گئیں "بابا صاحب نے کچھ نہیں بتایا؟"

"شاید میری بیماری کی وجہ سے" میں نے کسمسا کے کہا "لیکن اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ہو گا یوں مجھے کچھ نہ جاننا' فکر و تشویش کا باعث بن رہا ہے۔"

"میاں! یہ تو لمبی داستان ہے!" وہ ہونٹ سکیڑ کر بولے۔

"کچھ تو یاسمن بی بی کی زبانی مجھے سن گن مل چکی ہے۔ مجھے تفصیل سے بتایئے' ممکن ہے' میں بھی کوئی مشورہ دے سکوں" یاسمن کا ذکر میں نے عمداً کیا تھا تاکہ وہ جان سکیں' بٹھل کو مجھ سے کچھ چھپانا مقصود ہوتا تو وہ یاسمن کو میری موجودگی میں نہ بلاتا۔ گزشتہ رات' جیسا کہ خود نصیر بابا نے بٹھل سے معلوم کیا تھا' وہ کسی دوسرے کمرے میں بھی یاسمن کو بلا سکتا تھا۔

"کیا بولوں میاں! دہراتے ہوئے کلیجا منہ کو آتا ہے۔ اللہ جانتا ہے سوچتا ہوں تو سر چکرانے لگتا ہے" نصیر بابا کی آواز بھرا گئی۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔"

"میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے لیکن کیا کروں' یہ اندھیر دیکھا نہیں جاتا..."

"بات کیا ہے بابا!" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"آپ نے سن ہی لیا تھا اس بچی کی زبانی تھوڑا بہت ماجرا۔ اسے دیکھ بھی لیا ہے۔ دونوں ایسی ہیں کہ ذرا چھو لو تو میلی ہو جائیں" وہ ڈوبتی آواز میں بولے۔

"یاسمن بی بی نے اپنے والد کے پلٹا آنے تک کا احوال بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ سید صاحب کی ایما پر ان کے والد نے حیدر آباد جا کے ساری زمین' مکان وغیرہ کا سودا کر لیا تھا۔"

"وہ بڑے نیک آدمی تھے' بہت پڑھے لکھے' اللہ والے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کی صورت اب تک آنکھوں میں گھومتی ہے۔ بہت نور تھا چہرے پر ان کے۔ ماتھا چمکتا تھا' منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ہر وقت کھلے کھلے' ہم جیسے چھوٹے لوگوں کی بہت پوچھ گچھ کرتے تھے۔ مجھ سے تو خاص لگاؤ تھا' بس میاں!" نصیر بابا کا گلا رندھنے لگا۔

نصیر بابا سے بات کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ وقت کم تھا اور یہ جگہ بھی مناسب نہیں تھی تاہم پھر کب وقت ملتا۔ یاسمن کی طرح ان کے بیان میں بھی بڑی سوزش تھی' بار بار مغلوب ہو جاتے تھے۔

کہنے لگے' سید صاحب نے علامہ پروفیسر جمال الدین سیفی کو حیدر آباد کی جائداد سے ملنے والی رقم سے پٹنے کے نواح پھلواری شریف میں ایک زرعی زمین دلا دی اور کچھ ہی دنوں میں خطیر منافع کے عوض اسے فروخت کرا دیا۔ دو ایک اسی نوع کے سودوں میں سید صاحب کے مشوروں اور اعانت سے پروفیسر کو اچھا منافع ہوا۔ پروفیسر نے روپے پیسے کی کبھی ایسی جستجو نہیں کی تھی' علم ہی ان کے لیے سب سے بڑا سرمایہ رہا تھا۔ گھر میں ویسے بھی کسی چیز کی تنگی نہ تھی' عزت آبرو سے گزر بسر ہوتی تھی۔ پہلی بار حصول زر کی تدبیر اور اس کی کرشمہ سازی کا عرفان ہوا تھا۔ دولت میں غالباً علم سے زیادہ کشش ہوتی ہے۔ طاقت کی فضیلت تو مسلمہ ہے۔ پروفیسر اپنے مربی سید صاحب کی فہم و فراست سے بہت متاثر تھے۔ سید صاحب کی طرز تپاک' حسن خلق' زندہ دلی اور دریا دلی مستزاد صفات تھیں۔ چھٹیوں میں سید صاحب نے پروفیسر کو خاندان سمیت آسن سول مدعو کیا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے کی اس مہمانی اور میزبانی سے دونوں گھروں کو قریب آنے کا موقع ملا اور رسم و راہ کچھ ایسی بڑھی کہ ذرا وقت گزر جاتا تو کبھی سید صاحب' پٹنے کا رخ کرتے' کبھی پروفیسر آسن سول آ کے دم لیتے۔ یہاں زنان خانے میں ملازماؤں اور ایک پختہ کار خاتون کے سوا کوئی نہ تھا' پروفیسر صاحب نے اپنی بیگم سے سید صاحب کا پردہ بھی ختم کرا دیا تھا۔ پھر سید صاحب نے اپنے دوست پر ایک احسان یہ کیا کہ آسن سول سے دس میل کے فاصلے پر ایک بڑے زرعی قطعہ اراضی کی بات پکی کرا دی۔ سنتے ہیں' اس خریداری میں کم پڑنے والی کچھ رقم سید صاحب نے بطور قرض حسنہ عطا کی تھی اور طے یہ پایا تھا کہ پہلی فصل کی آمدنی سے یہ قرض ادا کر دیا جائے گا۔

پروفیسر نے یہ قطعہ اپنی بیگم کے نام سے خریدا تھا۔ وہ

پٹنے میں پڑھاتے تھے۔ سید صاحب کی کوشش سے آسن سول کے ایک مکتب میں بھی فارسی زبان کی تدریس کے لیے انہیں چند گھنٹوں کی تقرری مل گئی۔ یوں آسن سول میں ہر ہفتے پروفیسر کی آمد یقینی ہوگئی مگر آتی قربتوں کے بعد تشنگیاں اور سوا ہو گئیں۔ سید صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ آسن سول میں کرائے پر اٹھا ہوا اپنا ایک پختہ اور وسیع مکان خالی کرا کے پروفیسر کو پیش کر دیا۔ سید صاحب کی خواہش تو یہ تھی کہ ان کی اپنی اقامت گاہ میں کچھ کم گنجائش نہیں ہے' پروفیسر کا کنبہ چار افراد پر مشتمل ہے' کیوں نہ پروفیسر ان کے بڑے مکان کے ایک حصے میں منتقل ہو جائیں۔ پروفیسر اس پیش کش پر آمادہ نہ ہوئے' ہاں آسن سول میں مستقل سکونت کے لیے تیار ہو گئے اور سید صاحب کا خالی مکان اس شرط پر قبول کرلیا کہ زرعی زمین سے سال بہ سال ہونے والی آمدنی سے مکان کی رقم ادا کی جاتی رہے گی۔ سید صاحب نے دو قدم آگے جا کے یہ سلوک کیا کہ ایک جزوی' علامتی قسم کی رقم کے بدلے مکان کی رجسٹری پروفیسر کے نام کرا دی۔ کاغذات میں بعد کی قسط وار ادا کی جانے والی کثیر رقم کی شق بھی درج نہیں کی گئی تھی۔ سید صاحب کا یہ بے پناہ اعتماد بظاہر بے جواز بھی نہیں تھا کہ پروفیسر بہ باطن ایک اصول پرست' راست باز اور دیانت دار آدمی تھے۔ زرعی زمین سے ہر سال معقول آمدنی کا امکان تھا۔ چند سال میں اس رقم کی ادائگی پروفیسر کے لیے کوئی وقت طلب یا صبر آزما مرحلہ نہ ہوتا۔

پروفیسر کا خاندان پٹنے سے ہجرت کر کے آسن سول میں آباد ہو گیا۔ پروفیسر اب ہفتے میں تین دن کے لیے پٹنے چلے جاتے' چار دن آسن سول میں قیام کرتے تھے۔ عدم موجودگی میں بیوی اور بیٹیوں کی خبر خبر کے لیے سید صاحب آسن سول میں موجود ہی تھے۔ دن میں ایک مرتبہ پروفیسر کے گھر پھیرا لگانا سید صاحب نے شعار بنا لیا تھا۔ انہوں نے وہاں اطاعت پیشہ ملازم بھی رکھوا دیے تھے۔ امور خانہ داری میں ماہر ایک تجربہ کار ملازمہ بھی تعینات کی تھی۔ سید صاحب کی تجویز تھی کہ کچھ عرصے بعد پروفیسر زرعی زمین پر ایک چھوٹا سا گھر بنا کے مستقلاً وہیں اقامت اختیار کرلیں' اس سحر کار مرغزار میں انہیں یک سوئی سے تصنیف و تالیف کے مواقع میسر آئیں گے۔ ساتھ ساتھ زمینوں کی نگہداشت بھی ہوتی رہے گی۔ پروفیسر پھر درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر دیں۔ ایک زمانے سے تخلیقی و تحقیقی کام کے لیے پروفیسر کو اس فراغت کی تمنا تھی۔ آسن سول میں ان کی شامیں سید صاحب کی معیت میں گزرتیں۔ سیاحت کا پہلے سے شوق تھا' سید صاحب انہیں آسن سول سے دور لے جاتے' کبھی پہاڑی مقامات پر' کبھی شہروں کی طرب گاہوں میں' کبھی دونوں شکار پر نکل جاتے' جنگلوں کی سیر کرتے۔ آسن سول شہر ہی میں نہیں' گرد و نواح میں دور و نزدیک سید صاحب کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ بیشتر شاموں میں یا تو وہ خود کہیں مدعو ہوتے یا ان کے اپنے گھر ضیافتوں کا اہتمام ہوتا۔ کئی قریبی دوستوں کی محفلوں میں وہ پروفیسر کو بھی لے جانے لگے۔

پروفیسر کے لیے یہ دنیا نئی تھی۔ یہ دنیا افسانوی نہیں تھی' اس میں خواب کم' تعبیریں بہت تھیں۔ ممکن ہے شروع شروع میں انہیں اجنبیت محسوس ہوئی ہو لیکن رفتہ رفتہ وہ بدلی ہوئی زندگی میں شامل نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے روایتی لباس درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا۔ وہ سرخ و سپید رنگت' اٹھتے ہوئے قد' متوازن دست و بازو کے ایک وجیہہ اور جامہ زیب شخص تھے۔ پینتالیس سے زیادہ کے نہ ہوں گے' دیکھنے میں بہت کم کے لگتے تھے۔ نئی وضع قطع میں اور پر وقار ہو گئے تھے۔ جہاں جاتے' نگاہوں کا مرکز بن جاتے۔

دو دوستوں کی اس باہمی شیدائیت کو ڈیڑھ دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ لگتا تھا' دونوں میں کوئی ازلی رشتہ ہے' بھائیوں میں بھی ایسی یگانگت' مروالفت کیا ہوگی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا' آدھی رات کا وقت تھا۔ سید صاحب کو پروفیسر کی طبیعت اچانک خراب ہو جانے کی اطلاع ملی۔ سید صاحب کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے عزیز از جان دوست کے علاج معالجے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ پروفیسر کو افاقہ ہو گیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ کئی حکیم ڈاکٹر بدلے گئے۔ کوئی کچھ تشخیص کرتا تھا' کوئی کچھ۔ پروفیسر نے خود بھی خاصی زور آزمائی کی۔ کبھی ان کی حالت درست ہو جاتی' کبھی بہت بگڑ جاتی۔ طرح طرح کے ٹوٹکے بھی آزمائے گئے' اور درود و وظائف کا سلسلہ جاری رہا اور حاصل یہ نکلا کہ دعا اور دوا کی ارزانی سے مرض بڑھتا گیا۔ سید صاحب' پروفیسر کو کلکتے کے بڑے اسپتال لے جانا چاہتے تھے مگر اس کا موقع نہ آیا' ایک رات پروفیسر نے ساری اذیتوں سے نجات حاصل کرلی۔

ایک دو مہینے کے الٹ پھیر میں ایک ترو تازہ' تنومند شخص یوں چپکے سے چلا گیا۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا مگر یقین تو ایک جبر ہے' سب کو کرنا پڑتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کسی کو یہاں نہیں رہنا۔ چلتے نظر آتے ہیں' سب چپ جانے' مٹ جانے کے لیے ہیں۔ کوئی کتنا ہی عزیز' رگ جاں سے قریب ہو' ہر ایک کو ہر ایک سے جدا ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی مر جاتے ہیں' ایک خلقت کے جو کام آتے ہیں۔ جن کی ضرورت ہوتی ہے' وہ بھی مر جاتے ہیں۔ کوئی کتنا ہی گل بوٹے کھلائے' نقش رہ جاتے ہیں' نقش گر چلے جاتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے' موت' زندگی کی توہین ہے اور حیف کہ زندگی اسی ذلت سے دوچار رہے گی۔ کاش یہ حقیقت آدمی تسلیم کرلے کہ زندگی حادثہ ہے' موت کوئی حادثہ نہیں۔

پروفیسر کی بیوی اور بیٹیاں خاصی ہوش مند تھیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی کا قیام یہاں مستقل نہیں ہے لیکن جو چوک ہر ایک سے ہو جاتی ہے' ان سے بھی ہوئی۔ پروفیسر کے اس طرح چلے جانے سے ان کے رگ و پے میں درد بیٹھ گیا۔ مرنے والا تو مر کے ہمیشہ کے لیے قرار سے ہو جاتا ہے' اس کے پرسان حال جو بار بار مرتے ہیں' مرتے رہتے ہیں اور مر بھی نہیں پاتے۔ پروفیسر نے نزع کے عالم میں.... وصیت لکھی تھی اور سید صاحب کو اپنے گھر والوں کا ولی مقرر کیا تھا۔ بیوی اور بیٹیوں کو انہوں نے وصیت کی تھی کہ سید صاحب کو اپنا رہبر سمجھیں۔ کئی مہینے ماں بیٹیوں کا قیام اپنے شوہر اور باپ کے گھر رہا۔ پروفیسر واپس نہیں آئے۔ بالآخر سید صاحب کے اصرار پر وہ ان کے گھر چلی آئیں۔

پروفیسر کے پس ماندگان میں ایک اور شخص بھی تھا' ایک نوجوان' پروفیسر کا عزیز ترین' لائق ترین شاگرد' مسمی ظفر احمد خاں۔ اس کے والد پٹنے میں ریلوے کے افسر تھے۔ شاہ جہاں پور سے تعلق تھا۔ پٹنے میں مستقل تبادلے کی وجہ سے اسی شہر میں سکونت ہو گئی تھی۔ ریل گاڑی کے حادثے میں باپ کے ختم ہو جانے کے بعد ماں اور بہن کا واحد کفیل ظفر احمد خاں تھا۔ ظفر نے اپنے آبائی شہر شاہ جہاں پور جا کے چھوٹی بہن کی شادی خالہ زاد بھائی سے کر دی۔ ماں' بیٹی اور داماد کے پاس ہی رک گئی تاکہ بیٹا دل جمعی سے اعلیٰ تعلیم مکمل کر سکے۔ پٹنے سے واپس آ کے ظفر اپنی تعلیم میں منہمک ہو گیا۔ وہ انگریزی ادب کا طالب علم تھا اور کوئی بڑا سرکاری امتحان پاس کر کے سرکاری افسر بننے کا آرزو مند تھا۔ پٹنے میں اسی دوران میں اس کی ملاقات نابغہ روزگار پروفیسر جمال الدین سیفی سے ہوئی۔ انہی کے توسط سے اسے فارسی ادبیات سے شغف ہوا۔ معلوم نہیں' وہ فارسی ادب سے زیادہ متاثر ہوا یا جمال الدین سیفی کی دل آویز شخصیت سے' پروفیسر کی شاگردی میں آنے کے بعد وہ انہی کا ہو رہا۔ اس کی ترجیحات ہی بدل گئیں۔ پروفیسر بھی اس کی سعادت مندی'

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY

مسائل اور حل

آج کی زندگی مسائل سے گھری ہوئی ہے۔ ازدواجی مسائل' جنسی مسائل' پیشہ ورانہ مسائل الغرض تمام مسائل ہر لمحہ ہمارے تعاقب میں رہتے ہیں۔ ان سب کی نشاندہی اور ان کے سوال اور ان کے حل۔

ایک ایسی کتاب جو آج کے ہر فرد کی ضرورت ہے۔

قیمت 30 روپے — ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں۔

خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

kitabiat@hotmail.com
kitabiat@yahoo.com

مستعدی، علم کی جستجو اور جستجو میں شدت کے اوصاف کے اسیر ہو گئے تھے۔ وہ ہر وقت اسے خود سے قریب رکھتے تھے۔ ابتدا میں ظفر کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا' بعد میں پروفیسر نے اسے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ ذہین' ایماندار' معاملہ فہم اور خوش مزاج ظفر نے اولادِ نرینہ سے پروفیسر کی محرومی کا ازالہ بڑی حد تک کر دیا تھا' سو پروفیسر کے ہاں اپنی دختر دل پذیر فروزاں اور شاگرد عزیز ظفر کو یک جا کر دینے کی خواہش کی بالیدگی غیر فطری تھی نہ غیر منطقی۔ ان کی بیگم بھی شوہر کے اس خواب میں شریک تھیں اور ظفر کے لیے تو اس رفاقت کا تصور ہی ایک اعزاز تھا۔ وہ کیا' کوئی بھی اس کی جگہ ہوتا تو اپنی خوش بختی پہ ناز کرتا۔ فروزاں حسن و جمال کی ایک مثال تھی' وہ تو ایک شاہ کار تھی۔ صورت و رنگ' خال و خد میں یکتائی کے علاوہ ذہانت و فطانت سے آراستہ۔ بہت سی خوبیاں تو اسے ورثے میں ملی تھیں۔

آسن سول منتقل ہو جانے کے بعد پروفیسر کے خاندان کے ساتھ ظفر بھی یہاں آ گیا۔ حالانکہ اپنا ادھورا نصاب پورا کرنے کے لیے اسے بار بار پٹنے جانا پڑتا تھا۔ جیسے ہی تعلیمی امور سے فراغت ملتی' وہ آسن سول کا رخ کرتا۔ تعلیمی سال مکمل کر کے وہ مستقل آسن سول آ گیا۔ وہ پروفیسر کے گھر کا ایک جزو تھا۔ سید صاحب سے روز افزوں رسم و راہ کی وجہ سے پروفیسر کا گھر میں قیام کچھ کم ہونے لگا تھا مگر ایک جواں مرد گھر کا ایک فرد ظفر گھر میں موجود تھا' اس کی موجودگی پروفیسر کو گھر کی فکر سے آزاد کر دیتی تھی۔

اپنے مرشد کے منظور نظر ہونے کی نسبت سے سید صاحب ظفر کی نظروں میں نہایت واجب احترام تھے۔ ہر چند دونوں میں علیک سلیک کے سوا ربط و ارتباط کی کوئی خوش گوار صورت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ اس بے تکلفی میں ظفر کی جانب سے کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ تھی' سید صاحب ہی کھنچے کھنچے سے رہتے تھے۔ ظفر کے لیے لیے دیے سے رہتے تھے۔ گو ان کی زبان سے پروفیسر یا ان کی بیوی' بیٹیوں کے سامنے کبھی کوئی ناروا' نازیبا کلمہ ادا نہیں ہوا تھا نہ انہوں نے بالمشافہ ظفر سے خلوت و جلوت میں کسی موقع پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا تاہم وہ اس سے کچھ اس طرح پیش آتے تھے جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو' جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ سلام کے جواب میں ان کے ہاں لپک اور چمک کا فقدان ہوتا تھا۔ کسی خدمت کی پیش کش پر وہ بالعموم معذرت کر لیتے تھے۔ ان کی یہ بے نیازی' بے اعتنائی ظفر کو بہت کھٹکتی تھی۔ پروفیسر کے رخصت ہو جانے پر سید صاحب ان کی بیگم اور بیٹیوں کو صبر کی مسلسل تلقین کرتے رہے۔ ظفر کو بھی اس دل جوئی اور تلقین کی بڑی ضرورت تھی۔ سید صاحب کو خوب معلوم تھا کہ ظفر کے لیے یہ صدمہ اتنا ہی کاری ہے جتنا پروفیسر کے اہل خانہ کے لیے۔ بزرگ ہونے کی حیثیت سے سید صاحب نے ایک مرتبہ بھی اس سے کچھ نہیں کہا' ایک بار بھی اسے گلے نہیں لگایا۔ جب تک پروفیسر کی بیوہ اور بیٹیاں گھر میں رہیں' سید صاحب کی مغائرت میں کسی معاندت کا احساس ظفر کو نہیں ہوا تھا' بعد میں دھندلے لفظ روشن ہوتے گئے۔

ظفر نے پروفیسر کی سوگوار بیوہ اور بیٹیوں سے منت کی تھی کہ وہ اپنے گھر ہی رہیں' ظفر بکھرا ہوا گھر سنبھالنے کی استطاعت رکھتا ہے مگر سید صاحب کے سامنے اس کی حیثیت ہر اعتبار سے فروتر تھی۔ پروفیسر کے گھر والے سید صاحب کے بے شمار احسانات' خسروانہ سلوک اور مراسم کی مروت سے زیربار تھے۔ وہ تینوں ان دنوں ذہنی انتشار سے بھی دوچار تھیں۔ انہیں ظفر پر پورا اعتماد تھا لیکن سید صاحب کو انکار کر دینے کی جرات بھی نہ تھی۔ پروفیسر کی وصیت بھی ابھی تازہ تھی۔ پروفیسر کے کنبے میں اب ظفر کا بھی شمار ہونے لگا تھا۔ سید صاحب کے علم میں تھا کہ پروفیسر نے اپنی بیٹی فروزاں اور ظفر کے لیے کیا طے کیا ہوا ہے۔ انہیں اپنے گھر پروفیسر کی بیوی اور بیٹیوں کو لے جاتے وقت تکلفاً اور رسماً ظفر کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہنا چاہیے تھا' انہوں نے یہ رواداری نہیں کی۔ ظفر کا تو ویسے بھی اس طرح سید صاحب کے گھر جانا مناسب نہیں تھا۔ پروفیسر کی بیوی نے البتہ ظفر کے لیے سید صاحب کو اشارہ کیا تھا۔ سید صاحب نے انہیں مطمئن کر دیا کہ ظفر ان سے کہاں دور ہو رہا ہے۔ کیا پروفیسر کا گھر بند کر دیا جائے؟ گھر کے کسی ایک فرد کو تو وہاں رہنا چاہیے۔ یہ عذر معقول تھا۔ پروفیسر کی بیگم ہر حال میں اپنے مرحوم شوہر کا گھر قائم رکھنا چاہتی تھی۔

سید صاحب کے ہاں پروفیسر کے گھر والوں کے منتقل ہو جانے کے بعد صبح و شام ان کی پرسش احوال ظفر کے لیے فرض کا درجہ رکھتی تھی۔ شروع کے چند دن تو خیر سے گزر گئے۔ کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ وہ بلاناغہ دن میں دو مرتبہ سید صاحب کے گھر جاتا رہا۔ آنے والے دن اس کے لیے بڑی آزمائش کے تھے۔ ایک روز دربان نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ ظفر نے ناراضی کا اظہار کیا تو وہ دو ملازمین دربان کی تائید میں کمربستہ ہو گئے۔ سید صاحب سے ملنے کی التجا پر جواب دیا گیا کہ وہ جب چاہیں گے' خود اس سے مل لیں گے۔

وہ رنج و غم' غصہ و غضب کی حالت میں گھر واپس آیا۔ یہاں سید صاحب کا ایک فرستادہ بے دخلی کا حکم نامہ لیے پہلے سے موجود تھا۔ ظفر اس ذلت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت سید صاحب کے گھر کا رخ کیا۔ اسے باریابی کی اجازت نہیں ملی۔ اس کے تو اوسان ہی جاتے رہے۔ پھر اس نے پروفیسر اور سید صاحب کے ایک مشترکہ ملاقاتی ٹھاکر جگن ناتھ کے گھر جا کے دستک دی۔

اس اقدام سے اتنا ضرور ہوا کہ سید صاحب ملاقات کے لیے آمادہ ہو گئے لیکن وہ اسے ایک بدلے ہوئے آدمی نظر آئے' جیسے ان کا ظفر سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو' وہ اسے پہچانتے ہی نہ ہوں۔ انہوں نے ظفر کو الگ گھر کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ ظفر نے فریاد کی کہ وہ یہ کیا کہہ رہے ہیں' پروفیسر کا گھر ان کا نہیں' پروفیسر کا ہے جو اس کے معنوی باپ اور مرشد تھے۔ پروفیسر نے اسے اپنے گھر مستقل قیام کی ہدایت کی تھی بلکہ اسے مجبور کیا تھا' وہ اسے دل و جان سے عزیز رکھتے تھے۔ سید صاحب نے سنی ان سنی کر دی اور کہنے لگے' یہ گھر بے شک پروفیسر کا ہے لیکن ظفر کا نہیں ہے۔ ظفر کا تعلق پروفیسر سے تھا اور پروفیسر اب موجود نہیں ہیں۔ مرحوم کی وصیت کی رو سے وہ ان کے سارے معاملات کے امین ہیں۔ وہ جو بہتر سمجھتے ہیں' وہی کریں گے۔ ظفر نے فروزاں سے اپنے رشتے کی بات یاد دلائی۔ سید صاحب نے کم مہری سے کہا کہ وہ کس برتے پر اس رشتے کا دعوے دار ہے۔ اسے میراں کرتا نہیں آ گیا!؟ اسے اپنی حیثیت کا عرفان ہونا چاہیے۔ ظفر نے عاجزی کی کہ اسے مقامی کالج میں بہت اچھی ملازمت مل رہی تھی۔ وہ تو پروفیسر نے اسے روک رکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ابھی وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ سید صاحب نے اسے دھتکار دیا کہ پہلے وہ کسی لائق تو ہو جائے' تب آ کے ان سے بات کرے۔ اس دوران میں فروزاں کے لیے انہیں بہتر رشتہ مل گیا تو وہ ظفر کا انتظار بھی نہیں کریں گے۔ ظفر نے بہت دہائیاں دیں مگر سید صاحب تو پتھر کے ہو گئے تھے۔ پروفیسر کی بیگم سے ملاقات کی درخواست بھی انہوں نے سختی سے ٹھکرا دی۔

ظفر ایک ذکی الحس' سلیم الطبع' سریع الفہم نوجوان تھا۔ اسے تخمینہ لگانے میں دیر نہیں لگی اور نہ یہ سمجھنے میں کہ مزید دلیل و حجت کا کچھ حاصل نہیں ہے۔ سید محمود علی نے نظم و ترتیب کا پورا خیال رکھا ہے۔ سب کچھ ایک سلسلے سے ہے مگر اب وہ کیا کرے' وہ کہاں جائے؟ کس دہلیز پہ جا کے زنجیر کھٹکھٹائے۔ سید صاحب نے اسے خوب آئینہ دکھایا ہے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں' وہ تو خود کو جانتا ہی نہیں' وہ کیسا بے دلیل ہے۔ وہ تو ریت کے گھروندے میں رہتا تھا۔ اس کے وجود کی استواری تو پروفیسر کے ستون سے مشروط تھی۔ اس نے اسی دن پروفیسر کا گھر چھوڑ دیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا کہ سید صاحب کے نمک خوار وہاں موجود تھے۔ اس کا ذہن معطل ہو چکا تھا۔ ہر جانب اندھیرا نظر آتا تھا۔ یہ ناگہانی تو پروفیسر کی موت سے بڑا سانحہ تھی۔ اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کے سید صاحب کے دوستوں کے گھر جا کے عرض گزاری کی پھر اس نے کسی قانون داں سے مشورہ کر کے پولیس کی مدد حاصل کی۔ پولیس کا بڑا عہدے دار سید صاحب کے گھر سے شرم سار واپس آیا۔ سید صاحب نے پروفیسر کی وصیت کی نمائش کے علاوہ ان کی بیگم اور بیٹیوں کے بیانات بھی پولیس افسر کے گوش گزار کرا دیے تھے۔ سید صاحب کے گھر سے واپس آ کے اس نے الٹی ظفر کو سرزنش کی اور یہ فہمائش بھی کی کہ بہتر ہے' وہ سید محمود علی جیسے عزت دار' حیثیت مند شخص سے نبرد آزمائی کا خیال دل سے نکال دے ورنہ اسے کھاتا ہو جائے گا۔ نوجوان ظفر نے خود کو کبھی ایسا بے دست و پا' بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی۔ بدحواسی میں ایک روز اس نے سید صاحب کے مکان پر دھرنا دے دیا۔ نتیجے میں اسے ایک اذیت سے گزرنا پڑا۔ کرائے کے غنڈوں نے اس پر لاٹھیاں برسائیں اور ناتوانی کی حالت میں شہر کے کنارے پھینک آئے۔

کوئی بھی کہیں بھی اس کی بات سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ لگتا تھا' سارا شہر سید صاحب کے طلسم میں ہے۔ ظفر نے صرف کتابیں پڑھی تھیں' آدمی نہیں دیکھے تھے۔ کتابوں کے دل دادہ اس نوجوان کو پہلی بار تجربہ ہوا کہ آدمی وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔ جو اس کا چہرہ' ہاتھ پیر' جثہ و قامت دکھائی دیتے ہیں۔ آدمی تو وہ ہوتا ہے جو کبھی دو آدمیوں کے برابر ہوتا ہے' کبھی تین' چار یا اس سے زیادہ' بہت زیادہ۔ اور آدمی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ آدمی آدھا بھی ہوتا ہے اور نہ ہونے کے برابر بھی ہوتا ہے۔ قیافے' نظر اور تجربے سے آدمی کی پیمائش محض خوش گمانی ہے۔ آدمی کے سامنے تو سمندر بھی ہیچ ہے۔

ظفر نے سید صاحب کے ملازموں کا تعاقب شروع کیا۔ ایک ایک سے ہاتھ جوڑ کے منت کی کہ وہ اس کا ایک خط ہی پروفیسر کی بیگم تک پہنچا دیں۔ پہلے تو وہ تیار نہیں ہوئے مگر نذرانے بھی ان سے مسترد نہ ہو سکے۔ ظفر کے بعد دیگرے

خط ان کے حوالے کرتا رہا' کسی کا جواب نہیں آیا۔ ملازم یہ خط اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے اور آقا اپنے غلاموں کو ظفر کے نذرانوں سے کہیں زیادہ انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ ملازم باہر جا کے ظفر کو باور کراتے رہے کہ وہ اس کا ہر خط بہ حفاظت بیگم صاحب تک پہنچا دیتے ہیں۔ جواب دینا نہ دینا ان کی مرضی پر ہے۔ کسی ملازم نے ظفر کے کانوں میں یہ زہر بھی گھولا کہ بیگم صاحب اس کے خطوط پڑھے بغیر تلف کر دیتی ہیں اور اس بات پر برگشتہ ہوتی ہیں کہ آخر وہ یہ خط و صول ہی کیوں کرتے ہیں' وہ ظفر سے کوئی تعلق ہی کیوں رکھتے ہیں۔ سید صاحب کے مکان کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ ظفر بھی قد و قامت میں کوتاہ نہیں تھا لیکن یہ دیواریں پار کرنے کے لیے بہت مختصر اور ناکافی قامت تھا اس کا۔

نصیر بابا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ایسا متعین نہیں تھا لیکن کسی بھی لمحے کوئی ہرکارہ ہمیں تلاش کرتا ہوا اس طرف آسکتا تھا۔ بہرحال مجھل کمرے میں موجود تھا۔ اتنے دنوں تک سید صاحب کے ساتھ تینوں وقت' ناشتے اور کھانے میں وہی شریک ہوتا رہا تھا' میری ڈھنڈھیا نہیں پڑے گی۔ مجھ بیمار کا کھانا تو کمرے میں آجاتا تھا۔ مجھل کے سامنے ہی میں نصیر بابا کولے کے عقبی سبزہ زار کی طرف چلا تھا' اسے اندازہ ہوگا کہ نا وقت مجھے نصیر بابا کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے۔ وہ ملازموں سے کمرے میں میری عدم موجودگی کا کوئی بھی عذر کر سکتا تھا۔ مجھے ایسی کوئی بے چینی نہیں تھی لیکن نصیر بابا کو بار بار کسی کے آجانے کا خوف گھیر لیتا تھا' میں نے بے وقت انھیں روکے رکھا تھا۔

نصیر بابا کی ڈھلتی آواز میں نفرت اور بیزاری شامل ہو گئی تھی۔ سید صاحب کے ذکر پر وہ اپنا منہ نوچنے اور گالوں پر طمانچے مارنے لگے۔ کہنے لگے کہ یہاں سارے ملازم آدمی کی نہیں' جانوروں کی نسل سے ہیں۔ سب کو بس دم ہلانا آتا ہے۔ وہ بھی کبھی انہی میں سے تھے۔ وہ بھی بہت بڑے کتے تھے۔ سید صاحب کی نظروں میں تو ان کی یہی حیثیت ہے۔ نصیر بابا نے بتایا کہ وہ ایک زمانے سے سید صاحب کی خدمت کر رہے ہیں۔ میرٹھ میں گوروں کے خلاف شورش نے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بلوائیوں نے ان کے گھر کو آگ لگا دی۔ بوڑھے ماں باپ' دو جوان بہنیں' ایک چھوٹا بھائی' ان کی بیوی اور تین بچے آگ کی نذر ہو گئے۔ ادھر مشتعل گوروں نے اندھا دھند گرفتاریاں شروع کر دیں۔ کبھی کسی موقع پر جوش میں آکے نصیر بابا نے گوروں کو ہندوستان سے نکالنے کی تحریک میں اپنا نام بھی سرفروشوں میں لکھوا دیا تھا۔ کسی غدار نے وہ فہرست گوروں کو فراہم کر دی۔ نصیر بابا بھی زد پر آگئے۔ وہ عدالت میں داد و فریاد کرتے رہے۔ گورے حاکم نے انھیں تین سال کے لیے جیل بھیج دیا' ابھی تین مہینے ہوئے تھے کہ ایک روز سیاسی قیدیوں نے باہر کے کارکنوں کی مدد سے جیل میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس افراتفری میں نصیر بابا کو جیل سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ میرٹھ میں اب کیا رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آبائی شہر خورجہ میں رشتے داروں کے پاس بھی نہیں جا سکتے تھے' مختلف شہروں میں حلیہ بدل بدل کے منہ چھپاتے' پھرتے رہے' طرح طرح کے کام کیے اور بھاگتے بھاگتے آخر سول آگئے اور آخر انھیں سید محمود علی کے ہاں پناہ مل گئی۔ سید صاحب بھی اس زمانے میں اوسط درجے کے آدمی تھے۔ چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے لیکن صبح و شام تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ان کے پاس زر کی افراط ہونے لگی۔ انھوں نے یہ قلعہ مثال مکان بنوا لیا۔ نصیر بابا سید صاحب کے سب سے پرانے ملازم ہیں۔ اپنے حالات سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ سفید و سیاہ کی تمیز ہی جاتی رہی تھی۔ کہتے ہیں' کانٹوں والے پودے ابتدا میں اکھاڑ پھینک دیے جائیں تو تناور درخت کیوں بنیں۔ کانٹوں کا یہ درخت نصیر بابا کے سامنے پروان چڑھا ہے' وہ اس کے سائے کے ساتھ کانٹوں کے بھی عادی ہو گئے تھے۔ سب کچھ ان کے سامنے گزرا ہے اور یہ روز روز بڑھتا' پھیلتا رہا ہے۔

نصیر بابا جکڑی ہوئی آواز میں کہنے لگے کہ وہ کیا کیا دہرائیں۔ زنان خانے کی ساری ملازمائیں چن چن کے رکھی گئی ہیں۔ وہ ساری عورت ذات پر تہمت ہیں۔ ان کی سربراہ بوڑھی خاتون رئیس بیگم سید صاحب کی کوئی رشتے دار نہیں' اول درجے کی قطامہ ہے' کسی کٹنی کی مانند۔ سید صاحب جانے کہاں سے اسے لائے تھے۔ یقیناً کسی بالا خانے سے تعلق ہونا چاہیے۔ اس وقت سید صاحب کی پہلی بیوی زندہ تھی' رئیس بیگم کی آمد کے سال بھر کے اندر اندر چند روز کی بیماری کے بعد حیرت انگیز طور پر اس کا انتقال ہو گیا۔ سید صاحب کے دونوں بیٹے نینی تال کے انگریزی اسکول میں پڑھتے رہے ہیں' وہاں کی تعلیم کے بعد انھیں ولایت بھیج دیا گیا۔ بیٹی اپنے گھر کی ہو گئی تھی۔ پہلی بیوی کی موت کے ایک دو سال بعد سید صاحب آگرے کی ایک طوائف زادی' دراز قد' سانولی رنگت' تیکھے نقوش کی ایک نازک اندام کے ایسے شیدا ہوئے کہ منہ مانگی رقم پر گھر لے آئے۔ وہ...

خوش شعار' پاکیزہ اطوار لڑکی تھی' عزت مندانہ زندگی کی طلب رکھتی تھی۔ نماز روزے کی پابند ہو گئی تھی مگر ایک روز وہ بھی اچانک بیمار پڑ گئی۔ سید صاحب علاج کرانے کے لیے اسے الٰہ آباد لے گئے۔ رئیس بیگم بھی ہم راہ تھی۔ پندرہ بیس روز بعد دونوں واپس آئے تو وہ عفیفہ ساتھ نہیں تھی۔ بتایا گیا کہ اس کا وقت آگیا تھا۔ بڑے بڑے انگریزی ڈاکٹروں نے کوشش کی لیکن جس کا بلاوا آجائے' اسے کون روک سکتا ہے۔ اصل بات کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ اس واقعے کے بعد سید صاحب نے کسی عورت کو بہ حیثیت بیوی گھر پر نہیں رکھا۔ ہاں عورتیں آتی جاتی رہیں' آتی جاتی رہتی ہیں کبھی چند روز' ہفتے دو ہفتے' مہینے دو مہینے کے لیے۔

شہر اور اطراف میں دور و نزدیک سید صاحب کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ بہت سے ہم مزاج وقفے وقفے سے ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں' پرشکوہ دعوتیں' راگ رنگ کی محفلیں' جام و مینا کے دور' ان کی دنیا ہی الگ ہے۔ ہندوستان بھر سے رقص و سرود کی ماہر حسین و جمیل عورتیں اہتمام سے ان محفلوں میں بلائی جاتی ہیں' کبھی اس اقبال مند کے گھر' کبھی اس منصب دار کے ہاں۔ سید صاحب کے ہاں بھی کوئی مہمان خاندان سمیت آکے ٹھہرتا ہے اور اس میں کوئی دوشیزہ یا رشک آئینہ عورت سید صاحب کی نگاہ کو بھا جاتی ہے تو رئیس بیگم کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ وہ شیشے میں اتارنے کا اپنا ہنر آزماتی ہے۔ رئیس بیگم ناکام کبھی نہیں ہوتی۔ وہ اور اس کی کنیزیں' زنان خانے کی مخصوص ملازمائیں سب مل کے جوڑ توڑ' ترغیبوں' تحائف اور ان سب سے بڑھ کر خوابوں اور خیالوں کا ایسا جال بچھاتی ہیں کہ سید صاحب کی مطلوبہ کے لیے گریز کا راستہ نہیں رہ جاتا۔

مہمان خانے پر کثیر مصارف ہوتے ہیں' وقت بھی کم صرف نہیں ہوتا لیکن میزبانی و مدارات کے اس سلسلے کا حاصل بے اندازہ ہے۔ یہاں بڑے مختلف لوگ آکے ٹھہرتے ہیں۔ علوم و فنون کے ماہر جید و مستند عالم دین' بڑے سرکاری عہدے دار' کلاہ بردار زمیں دار اور زردار تاجر اور وہ لوگ جو سید صاحب کو زیادہ مرغوب ہیں۔ کسی بہت خصوصی مہمان کے لیے زنان خانے سے متصل عمارت کے وسطی حصے میں انتظام کیا جاتا ہے۔ ہر مسلک اور فرقے کے لوگوں سے سید صاحب کا تعلق ہے۔ مسجدوں میں چندہ ان کے ہاں سے جاتا ہے۔ دسہرے کی تقریبات میں بھی وہ بغل میں کیا کرتے' خود بھی شریک ہوتے ہیں' بڑے دن کے جشن میں تو جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ وہ اور ان کے بعض خاص دوست اپنی پسندیدہ عورتوں کا تبادلہ بھی معیوب نہیں سمجھتے۔

نصیر بابا کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری رگوں میں جلن ہونے لگی تھی۔ نصیر بابا کہہ رہے تھے' انھیں یقین ہے' یہ پروفیسر کی موت کا وقت نہیں تھا۔ وہ تو بڑے صحت مند' بہت زندہ دل آدمی تھے۔ ان کے گھر سید صاحب نے آزمودہ ملازم تعینات کیے تھے۔ پروفیسر کے پاس زرعی زمین کی صورت میں ایک بڑا اثاثہ تھا۔ سید صاحب سے سودا کیے ہوئے مکان کی دو ایک قسطیں بھی پروفیسر زرعی زمین کی آمدنی سے ادا کر چکے تھے۔ کمال و زر کی بات تو ثانوی ہے۔ پروفیسر کی بیوی خانم فرخ ایک پری پیکر' ماہ جمال خاتون تھی۔ کسی ملکہ کے مانند' اس کے چہرے پر وقار تھا۔ اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندتی رہتی تھی۔ اس کا سراپا کسی لچکتی شاخ کے مثل تھا۔ اس کی شہابی رنگت' شفق سے مشابہ تھی۔ فارسی لب و لہجے میں وہ ہندوستانی بولتی تھی اور یوں اس کی طرز گفتار اور دل کش اور دل نشیں ہو جاتی تھی۔ ہر لباس اس پہ خوب سجتا تھا۔ وہ اپنی دو بیٹیوں کی ماں کے بجائے بڑی بہن نظر آتی تھی۔ بڑی بیٹی فروزاں ہو بہو اس کی مثال ہے۔

سید صاحب کے گھر میں آنے کے بعد وہ تینوں ابتدائی چند دنوں تک بڑی آزردہ دل گرفتہ رہیں مگر یہاں ان کی دل بری و دلداری کا سارا اہتمام کیا گیا تھا۔ رئیس بیگم ان کے لیے پلکیں بچھاتی تھی۔ رئیس بیگم کے اشارے پر دیگر ملازمائیں باندیوں کی طرح خدمت بجالانے کو مستعد رہتی تھیں۔ خود سید صاحب ہمہ وقت ان کی دل داری و دل جوئی کے لیے مضطرب رہتے تھے۔ یکایک جب ظفر کی آمد بند ہو گئی تو ماں اور بیٹیوں کی تشویش لازم تھی۔ ظفر تو ان کے لیے پروفیسر کی امانت' یادگار اور نشانی کی طرح تھا۔ ظفر تو ان کی امید تھا۔ سید صاحب نے ظفر کی اس روپوشی پر حیرت و تکدر کا اظہار کیا۔ خانم کو بتایا گیا کہ ظفر تو گھر میں بھی نہیں' پھر بتایا گیا کہ وہ تو اپنا سامان اور کتابیں اپنے ساتھ لے گیا ہے اور گھر میں موجود چوکی دار سے بھی کچھ کہہ سن کے نہیں گیا۔ خانم کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس نے مختلف ملازموں سے گلی کوچے ظفر کا سراغ لگانے کی منت کی۔ ہر ایک ناکام واپس آکے خانم اور اس کی بیٹیوں کو وحشت زدہ کرتا رہا۔ سید صاحب مسلسل انھیں تسلی دیتے رہے کہ جلد یا بہ دیر ظفر کے بارے میں اچھی خبر آئے گی۔ وہ خاطر جمع رکھیں' ظفر کی تلاش میں کوئی کسر نہ رکھی جائے گی۔ انھوں نے ہر جگہ کہہ رکھا ہے'

یہاں تک کہ پولیس کی بھی مدد لی ہے۔ وہ پٹنے میں رہ چکی تھیں اور انہیں پروفیسر اور ظفر کے بعض ملاقاتیوں کے نام یاد تھے۔ ان کے اصرار پر ملازم پٹنے روانہ کیے گئے' ایک بار نہیں' کئی بار دوسرے تیسرے روز بظاہر وہ پٹنے سے واپس آ کے مایوسی کا اظہار کر دیتے تھے۔

شاہ جہاں پور میں مقیم ظفر کی ماں اور بہن کی بابت بھی خانم تھوڑا بہت جانتی تھی۔ ظفر اکثر ان کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ گھر کی الماریوں' کونے کھدروں میں شاہ جہاں پور سے آنے والے ظفر کے خطوط تلاش کرائے گئے یعنی خانم کو ایسا تاثر دیا گیا۔ سید صاحب نے خانم اور اس کی بیٹیوں کے اطمینان کے لیے ایک آدمی بھی شاہ جہاں پور روانہ کیا۔ جو کبھی وہاں نہیں تھا۔ دس پندرہ روز کے غیاب کے بعد آ کے اس نے بھی خانم کو کوئی فرحت اثر خبر نہیں سنائی۔ ظفر کے لیے سب سے دل فگار فروزاں تھی۔ وہ کسی سے کچھ کہتی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے پر بادل سے چھائے رہتے تھے۔ بہت دنوں بلکہ مہینوں تک انہیں ظفر کا انتظار رہا۔ وہ سید کے گھر سے مانوس ہونے لگی تھی۔ کسی مرد کے بغیر وہ تین جوان عورتیں اپنے گھر میں تنہا رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ادھر سید صاحب نے ان کی خوشنودی کے لیے ہر جتن کیا تھا۔ رئیس بیگم کی ترغیب پر خانم گھر کے معاملات میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی کیونکہ اس کی رائے کو فوقیت دی جاتی تھی۔ سید صاحب بھی کبھی کبھار خانم سے ایرانی کھانوں کی فرمائش کرتے اور داد و تحسین کا حق ادا کر دیتے۔

کچھ عرصے بعد سید صاحب نے گھر کی یکسانی سے اکتا کے پہاڑی مقامات پر جانے کا اعلان کیا۔ رئیس بیگم' نصیر بابا اور چند ایک ملازماؤں کے ساتھ یہ لشکر پہلے دار جلنگ گیا' وہاں کے سبزہ زاروں' کوہساروں کا نظارہ کیا' مشرقی بنگال میں سندر بن کی سیر کی۔ کلکتہ شہر میں گھومے پھرے۔ ایک ڈیڑھ مہینے مسلسل روبہ روئی کے اس سفر میں رہی سہی اجنبیت بھی ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ کلکتے میں زیورات اور ملبوسات کی خریداری میں سید صاحب نے ہزاروں صرف کر دیے۔ اس سفر سے خانم اور بیٹیوں پر لازماً خوش گوار احساس مرتب ہونے چاہیے تھے۔ گھر واپس آ کے یقیناً اچانک نہیں' مناسب وقت دیکھ کے رئیس بیگم نے خانم کے کان میں شوشہ طرازی ہوگی کہ کیوں نہ وہ اور سید صاحب یہ رسمی دوریاں مٹا دیں۔ نصیر بابا کا کہنا تھا کہ خانم اس کے لیے جلد آمادہ نہیں ہوئی ہوگی مگر رئیس بیگم ایک دست کار' شیشہ باز ہے' پتھر پگھلانے کے فن سے واقف۔ اس کی دلیلیں بھی توانائی سے عاری نہیں تھیں۔ ظفر جا چکا تھا' آمنے سامنے گرد و پیش میں سید صاحب کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ دو بیٹیاں اس کی ذمے داری تھیں۔ خود اس کے آگے زندگی پڑی تھی۔ اتنے دنوں تک وہ سید صاحب کی شیفتگی و وارفتگی کا مشاہدہ کر چکی تھی۔ رئیس بیگم اس بار بھی اپنی سحر کاری میں ناکام نہیں ہوئی۔ ایک رات وہ خانم کو عمارت کے وسطی حصے میں لے گئی۔ سید صاحب کے علاوہ وہاں ایک مولوی' نصیر بابا اور ایک اور شخص پہلے سے موجود تھے۔ دستخطوں کے لیے کاغذ تیار تھا۔ منٹوں میں رسم ادا ہو گئی۔

رئیس بیگم کے مشورے پر سردست یہ واقعہ بیٹیوں سے چھپایا گیا' دوسرے ملازموں سے بھی مخفی رکھا گیا۔ خانم نے اس اخفا پر تعجب کا اظہار کیا تھا مگر عذر پیش کیے گئے کہ فروزاں اور یاسمن ابھی ناپختہ اور حساس ہیں۔ ہو سکتا ہے خانم اور سید صاحب کے اس محترم و مقدس رشتے کی قبولیت کے لیے ابھی وہ ذہنی طور پر تیار نہ ہوں۔ کچھ عرصے اور گزر جانے پر مرحوم باپ کے نقش ضرور دھندلے پڑ جائیں گے کہ وقت سب سے بڑا مسیحا ہے۔ ابھی اس افشا سے ان پر کوئی منفی اثر پڑا تو اندمال کی ساری کوششیں اکارت جائیں گی اور باہر کے لوگ یا ملازم سید صاحب اور خانم کی اس [illegible] سے آشنا ہوئے تو فروزاں اور یاسمن سے بھی [illegible] نہیں رہے گا۔ بے شک یہ مبارک و مسعود کام [illegible] جا سکتا تھا لیکن خانم کو ذاتی طور پر گداز اور یقین کی ضرورت ہے اور جب کسی کام میں بہتری کا پہلو مضمر ہے تو [illegible] سہی' اسے انجام دینے میں دیر کیوں کی جائے۔ آخر ایک [illegible] تو کبھی کو معلوم ہو جانا ہے۔ ان توجیہوں نے خانم کو [illegible] قائل نہیں کیا مگر سید صاحب کی زیرکی' دور اندیشی اور [illegible] پردہ داری تو مسلم تھی۔ وہ خاموش رہی' نصیر بابا کہہ رہے تھے' خود انہیں بھی بڑی حیرت ہوئی تھی' بہت دنوں بعد ان پر پردہ داری کے راز منکشف ہوئے۔ نصیر بابا کے کہنے کے مطابق اس وقت ایک بے نام خوف کے ساتھ انہیں [illegible] بھی ہوئی تھی کہ خانم کے غم کا اس طرح کچھ مداوا تو ہو [illegible] نصیر بابا خود کو ملامت کرتے تھے' کہنے لگے' وہ یہ بھول [illegible] خانم کی غم ناکی کا ذمے دار کون ہے۔ تاہم نصیر بابا نے [illegible] باندھی کہ اب شاید سید صاحب کی زندگی کا رخ بدل جائے [illegible] خانم فرخ واقعی مبارک ثابت ہو۔ ایسی [illegible] بیوی کے بعد اب انہیں کسی اور طرف نہیں دیکھنا چاہیے [illegible] سید صاحب نے بڑی احتیاط کی' کسی کو ہوا نہ [illegible] خانم اور بیٹیوں کے الگ الگ کمرے پہلے سے مخصوص [illegible]

رئیس کی بیگم بیٹیوں کو سنبھال لیتی تھی اور خانم اپنے نئے مجازی خدا کے پاس خلوت میں چلی جاتی تھی۔ ان دنوں سید صاحب کا عجب عالم تھا۔ پیر جیسے زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے' گالوں سے سرخی پھوٹتی تھی' آنکھیں تاب دار ہو گئی تھیں۔ رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔ لباس پر یوں بھی توجہ دیتے تھے' ان دنوں تو رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا تھا۔ لگتا تھا' جیسے انہوں نے دنیا تسخیر کر لی ہو۔ کئی مہینے اس سرشاری میں گزر گئے اور خانم شکوہ کناں ہونے لگی کہ اس طرح چوری چھپے سید صاحب کے پاس آنا اسے اچھا نہیں لگتا۔ وہ بیٹیوں کے سامنے خود کو مجرم محسوس کرتی ہے۔ اسے ملازموں کے سامنے بھی شرمندگی سی ہوتی ہے۔ یہ کیسا ستم ہے' وہ سید صاحب کی بیگم' اس گھر کی مالکہ ہے اور اپنے استحقاق کی دعوے دار نہیں ہے۔ اب سب کو بتا دینا چاہیے۔ خانم کو' اولاد نرینہ کی بڑی تمنا تھی۔ پروفیسر کے زمانے میں گزر جانے والے بیٹے کی موت کی تلافی اس طرح ہو سکتی تھی۔ نصیر بابا کہتے تھے' اولاد سے تو تجدید پیمان ہوتی ہے۔ اس سے بندھن مضبوط ہوتے ہیں۔ در پردگی کے ان تعلقات میں اولاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات خانم کے لیے بڑی سوہان روح تھی۔

سید صاحب کی پردہ پوشی کی رمز بھی اس وقت کھلی جب ان کا چھوٹا بیٹا اسد علی لندن سے وارد ہوا۔ بیٹے آئیں یا بیٹی اور داماد' رئیس بیگم سید صاحب کی اولاد کی آمد پر پروانہ وار نثار ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی خاطر تواضع سے ان کی ماں کی کمی دور کر دیتی تھی۔ سید صاحب نے بڑی ہدایتیں دی تھیں مگر ایک روز زنان خانے کے جھروکے میں اسد علی نے فروزاں کا جلوہ کر لیا۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ والد صاحب سے سلسلہ جنبانی کی جرأت نہیں تھی۔ اس نے رئیس بیگم سے فروزاں کی بات چھیڑی اور خوب منت سماجت کی۔ رئیس بیگم نے جواب میں کسی لمحے توقف نہیں کیا' معذرت کر دی کہ اسد علی اس قسم کی کوئی آس نہ لگائے تو بہتر ہے۔ فروزاں اپنے والد مرحوم پروفیسر کے ایک شاگرد ظفر سے منگ چکی ہے اور فروزاں خود بھی اس رشتے کی مدعی ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ظفر کے آنے کی دیر ہے' فروزاں اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ یاسمن ابھی شادی کی عمر کو نہیں پہنچی ہے لیکن یاسمن کے لیے بھی پروفیسر اپنی زندگی میں رشتہ تلاش کر چکے تھے۔ یہ سن کے اسد علی پر جھنجلاہٹ طاری ہوئی۔ وہ ضد کرنے لگا کہ بابا چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس نے نصیر بابا سے بھی ایک روز جھجکتے ہوئے سید صاحب سے بات کرنے کی درخواست کی۔ نصیر بابا نے موقع غنیمت جان کے ایک شام سید صاحب کو اسد علی کی خواہش سے آگاہ کر دیا۔ سید صاحب کی برہمی پر انہیں تعجب ہوا۔ انہوں نے نصیر بابا کو تاکید کی کہ وہ اسد علی کے دل سے یہ خیال نکالنے کی کوشش کریں اور نہ مانے تو واضح طور پر جتا دیں کہ اس کے بابا اس بارے میں قطعاً مجبور ہیں' انہیں اپنے دوست پروفیسر جمال الدین سیفی سے کیے ہوئے وعدے کا پاس ہے۔ اسد علی سے رئیس بیگم نے جو کچھ کہا ہے' وہی صحیح ہے۔ اس کے لیے ایک سے ایک ماہ جبیں لڑکی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ نصیر بابا نے آقا کے حکم کی تعمیل کی' حالانکہ ان کے خیال میں ولایت میں پڑھنے والا اسد علی فروزاں کے لیے کوئی نامناسب لڑکا نہیں تھا۔ ادھر سید صاحب ظفر کا باب تو ہمیشہ کے لیے بند کر ہی چکے ہیں۔ اب ان کے ذہن میں کیا ہے؟ اسد علی کے لیے فروزاں جیسی رشک ماہ اب لڑکی انہیں ملنی مشکل ہے۔ آج نہیں تو کل' انہیں اپنے ہاتھوں سے فروزاں کی شادی کرنی ہی ہے۔ شاید خانم بھی منع نہ کرے۔ اسد علی نے بہت ہاتھ پیر مارے' بڑی سرکشی کی' اور ایسا دل گرفتہ ہوا کہ سفر ادھورا چھوڑ کے ولایت واپس چلا گیا۔

ادھر خانم نے شدت سے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا کہ فروزاں اور یاسمن نے نیا گھر اور نیا ماحول اچھی طرح قبول کر لیا ہے۔ اب کوئی ہرج نہیں۔ سید صاحب اور ان کی ماں کی شادی کی نوید سے انہیں ایسا صدمہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے وہ کچھ سکون ہی محسوس کریں۔ انہیں بھی تو اپنی ماں کا بہت خیال ہے۔ اس طرح انہیں اس گھر پر اپنے حق کا اعتماد بھی ہوگا۔ گھر میں نصیر بابا اور رئیس بیگم' خانم اور سید صاحب کے خفیہ رشتہ ازدواج کے گواہ تھے۔ خانم نے ان سے بھی داد خواہی کی کہ وہی سید صاحب کو ہموار کریں۔ ایک نہایت متبرک تعلق' راز کیوں رہنے دیا جائے۔ اچھا ہوگا کہ اسے ایک مسلسل احساس ندامت سے نجات دلائی جائے۔ فروزاں اور یاسمن اب ایسی نادان بھی نہیں ہیں۔ سید صاحب نے حسب سابق کچھ اور مہلت مانگی اور اس مہلت میں ایک دن خانم کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اسے پروفیسر جتنا وقت بھی نہیں ملا۔ وہی ڈاکٹر' حکیم اور ویدوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ختم۔ مختصر' ہفتے ڈیڑھ ہفتے کی کشمکش یا زور آزمائی کے بعد خانم بھی پروفیسر کے پاس چلی گئی۔

فروزاں اور یاسمن کو سکتہ ہو گیا تھا۔ ان کی ویرانی کا حال بیان کرتے ہوئے نصیر بابا ہڑکنے لگے۔ ان دونوں نے سب سے کنارہ کر لیا تھا اور اپنے کمرے میں محبوس ہو گئی تھیں۔ رئیس بیگم واری صدقے جاتی تھی۔ سید صاحب ان

کے لیے آسمان سے تارے لانے کے دعوے کرتے۔ صبر کی تلقین کرتے کرتے ان کی آواز ڈوب جاتی تھی اور ان کی آنکھیں سیلاب ہو جاتی تھیں۔ سب موت و حیات کا فلسفہ بیان کرتے تھے۔ کہتے تھے' زندگی تو خدا کی امانت ہے' موت سے کسے مفر ہے۔ کوئی یہاں قیام کرنے والا نہیں۔ یہ سب تو پیدا کرنے والے کی مشیت ہے' جسے چاہے' جب چاہے' پاس بلالے۔ اس موقع پر خدا کے حوالے خاصے کارآمد ہوتے ہیں۔ کئی دن تک گھر میں کلام پاک کا ورد ہوتا رہا اور مرحومہ کی روح کو ثواب پہنچایا جاتا رہا' اس کی منزلیں آسان کی جاتی رہیں۔ گھر کے سارے افراد اشک شوئی کے لیے فروزاں اور یاسمن کے اردگرد رہتے تھے مگر صرف آنکھیں ہی تھوڑی روتی ہیں۔

نصیر بابا کا سر بھی اب گھومنے لگا تھا۔ دست و بازو کی طرح کے حواس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جیل سے فرار ہوکے انھیں یہ سب کچھ دیکھنا تھا تو جیل ہی اچھی تھی۔ کاش وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ جل مرتے۔ ایک دفعہ کی آگ' زندگی بھر کی آگ سے چھٹکارا دلا دیتی۔ ان کی زندگی تو ایک اتفاق ہے۔ بلوائیوں کے بلا بولتے وقت وہ گھر پہ ہوتے تو ان کا انجام بھی ماں باپ' بیوی بچوں جیسا ہوتا۔ اب انھیں یہ مستعار زندگی واپس کردینی چاہیے۔ بے اختیار زندگی تو موت سے بدتر ہے۔ موت کی سزا میں ایسی بے سکونی نہ ہوگی۔ نمک کا حق آخر کس قدر ہوتا ہے' ظرف سے سوا تو نہیں۔ کیا عجب کہ ایک یہ آخری اقدام عاقبت سنوارنے کا سبب بن جائے مگر اس سے پہلے انھیں فروزاں اور یاسمن کے لیے کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ انھیں ظفر کو تلاش کرنا چاہیے۔ کچھ عرصے پہلے تک تو وہ درماندہ' درد آشنا' شکستگی سے دو چار شہر میں نظر آجاتا تھا۔ اب جانے کہاں کھو گیا ہے۔ بہت سوچ سمجھ ہی کے قدم اٹھانا ہوگا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ خنجر لے کے نکل کھڑے ہوں' انھیں فروزاں اور یاسمن کے لیے بہتر عواقب کی ضمانت درکار تھی۔ وہ مسلسل تگ و دو میں رہے اور کچھ نہ کرسکے۔ انھیں اپنے آپ سے وحشت ہونے لگی تھی' وہ کیسے ادھورے' کتنے تنہا اور لاچار آدمی ہیں۔ انھوں نے تو بس ایک تماشائی' ایک معمول کی زندگی گزاری ہے۔ انھوں نے بس سانس لینے کی آسائش پر قناعت کرلی ہے۔

ایک روز انھیں آسن سول میں ظفر نظر آگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حرف مدعا زبان پر لاتے' ظفر نے ان کے پیر پکڑ لیے اور وہی دیوانگی کرنے لگا کہ ایک بار' صرف ایک بار اسے خانم اور فروزاں یا یاسمن سے ملنے کا موقع فراہم کردیا جائے۔ اسے دیکھ کے نصیر بابا کا جی چاہا کہ وہ گلے سے لگا کے بین کریں مگر وہ بت بنے رہے۔ زیاں کے بہت سے اندیشوں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ نصیر بابا نے خانم کے سانحے سے اسے آگاہ نہیں کیا اور نہ کچھ اور بتایا۔ ظفر کے ہوش و حواس کی موزونیت پر انھیں شبہ تھا۔ ظفر شہر میں تھا' کسی اور ملازم سے بھی اس کی مڈبھیڑ ہوسکتی تھی۔ اس کے سامنے ظفر سے ذرا سی لغزش ہوجاتی تو نصیر بابا کے لیے زندگی اور مشکل ہوجاتی۔ انھوں نے ظفر سے یہ بھی نہیں کہا کہ اس کے بھیجے ہوئے خط خانم اور اس کی بیٹیوں کے پاس پہنچ ہی نہیں پائے۔ ہاں' انھوں نے ظفر سے ایک اور خط لکھنے کی گزارش کی۔ اس خط کی انھیں بڑی ضرورت تھی۔ ظفر کی تحریر سے حرماں نصیب فروزاں اور یاسمن کے ہاں امیدیں روشن ہوسکتی تھیں۔ شام کو اسی جگہ انھوں نے ظفر سے دوبارہ ملنے کا وقت طے کیا۔ گھر سے باہر نکلنے کا موقع اور عذر تلاش کرنے میں انھیں دیر ہوگئی۔ ظفر بے قراری سے ان کا منتظر تھا۔ نصیر بابا نے خط وصول کرکے کچھ حوصلہ کیا۔ انھوں نے دبے لفظوں میں ظفر کو عزم و استقامت کی نصیحت کے علاوہ خبردار بھی کیا کہ اب ان کے سوا وہ سید صاحب کے کسی ملازم سے کوئی علاقہ نہ رکھے۔ مناسب ہوگا کہ اب وہ آسن سول آیا ہی نہ کرے اور اس خط کے جواب کے لیے بھی اتنا متوحش نہ ہو۔ ذرا تحمل کرے اور بہتری کی توقع رکھے۔ اب گزشتہ کی طرح نہیں ہوگا۔ دیر سے سہی' امید ہے' اس خط کا جواب ضرور آئے گا۔ نصیر بابا نے اسے یقین دلایا کہ وہ خود اس سے رابطہ کریں گے اور واضح رہے' ان دونوں کی ملاقات کی بھنک بھی کسی کو پڑ گئی تو دونوں کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ ظفر نے آسن سول سے آدھ گھنٹے کی مسافت پر دھن باد شہر کا پتا دیا۔ اس کی عاجزی پر نصیر بابا کا دل بھر آیا۔ ایک بار تو ان کے جی میں آئی کہ وہ اسے سارا احوال بتادیں۔ انھوں نے خود کو روکا۔ ظفر بہرحال ایک نوجوان تھا۔ جوانی جلد ہی آگ پکڑ لیتی ہے۔ وہ بہت پاگل بھی ہوسکتا تھا۔ پھر فروزاں اور یاسمن کے چہرے نصیر بابا کی آنکھوں میں در آئے۔ درمیان میں وہ ستم رسیدہ بھی تو ہیں' صرف ظفر اور نصیر بابا کا معاملہ تو نہیں۔

خط جیب میں رکھ کے وہ واپس گھر آگئے۔ جیسے انھوں نے کوئی چوری کی ہو' چوری پکڑی نہ جائے' ان کا دل دھک دھک کرتا رہا۔ زنان خانے میں ان کی آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ خود ہی دستکیں دیتے اور کھنکارتے ہوئے ادھر جاتے تھے۔ خط کی وجہ سے ان پر احتیاط کا احساس اور غالب

آگیا تھا۔ رئیس بیگم اور دیگر ملازمائیں ان دنوں بہ طور خاص فروزاں اور یاسمن کی نگہداشت اور دلداری کے لیے ان کے گرد موجود رہتی تھیں۔ ایسے میں فروزاں اور یاسمن کے کمرے کا رخ کرتے ہوئے نصیر بابا کے قدم اٹکتے تھے۔ انھیں تین دن تک موقع نہیں ملا اور تین دن تک انھیں نیند بھی نہ آئی۔ اصل میں خط سپرد کرنا دوسرا مرحلہ تھا' اس سے پہلے فروزاں اور یاسمن کو تحمل و ہوش کا درس دینا ضروری تھا۔ چوتھے دن انھوں نے ہمت باندھی۔ ایک بے ضرر سی ترکیب ان کے منتشر دماغ میں آئی تھی۔ یاسمن اور فروزاں کے کمرے کے باہر کھڑے ہوکے انھوں نے ملازمہ اسٹل سے کہا کہ وہ فروزاں اور یاسمن میں سے کسی کو ذرا باہر بلادے۔ مولوی معظم علی نے رد بلا اور سکونِ قلب کے لیے ایک آزمودہ اور آسان سا وظیفہ تجویز کیا ہے۔ اللہ نے چاہا' اس کے ورد سے دونوں بہنوں کی تشفی ہوگی۔ سادہ مزاج نصیر بابا پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حفظ ماتقدم کے طور پر نصیر بابا نے یہاں تک خیال رکھا تھا کہ قریبی مسجد کے مولوی معظم علی کی خدمت میں حاضر ہوکے مذکورہ وظیفہ لکھوا لائے تھے اور ان کے سامنے اسے حفظ بھی کرلیا تھا۔ یاسمن فوراً باہر آگئی۔ اس پژمردگی سے نصیر بابا کو سلام کیا اور سر جھکائے کھڑی رہی۔ اسٹل سامنے نہیں تھی۔ نصیر بابا نے وظیفے کا پرزہ یاسمن کے حوالے کیا اور سرگوشیانہ انداز میں جلدی جلدی کہا کہ یاسمن ذرا توجہ سے' اس سے ملنے کے لیے انھوں نے اس پرزے کا سہارا لیا ہے' کوئی اہم چیز اسے سپرد کرنی ہے' لیکن اس سے پہلے ضروری بات بھی کرنی ہے اور بات تفصیلی ہے اس لیے یہاں بیان نہیں کی جاسکتی۔ یاسمن اور فروزاں پہلے کی طرح زنان خانے میں گھومنا پھرنا شروع کردیں تو ان تک رسائی آسان ہوجائے۔ یاسمن مبہوت ہوگئی۔ اس نے پھٹے ہوئے دیدوں سے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہے؟ نصیر بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے دلاسا دیا کہ وہ پریشان نہ ہو' اور خیال رہے کہ آنے والے دنوں میں دونوں بہنیں غیر ضروری عجلت اور بدحواسی سے اجتناب کریں۔ جو بھی بات ہے' ان کی خیر خواہی سے متعلق ہے اور جو ان کے تعاون کے بغیر ممکن بھی نہیں ہے۔ بس انھیں اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا' زبان بند رکھنا اور محتاط رہنا ہے۔ حیرت زدہ یاسمن نے پوچھا' پھر کب وہ اس سے ملیں گے؟ نصیر بابا نے بتایا کہ وہ زنان خانے کا پھیرا لگاتے رہیں گے ورنہ قریب تو رہیں گے ہی۔ ان کی کوشش ہوگی کہ جلد ہی انھیں کوئی موقع مل جائے اور وہ صراحت سے اسے یا فروزاں کو کچھ باور کراسکیں۔

وہ یاسمن کو حیران و پریشان چھوڑ کے وہاں سے چل دیے۔

نصیر بابا کا قیاس درست نکلا' فروزاں اور یاسمن نے اسی دن سے اپنے کمرے میں بند رہنے کا طور ترک کردیا۔ لیکن چار دن ایسے ہی گزر گئے۔ یاسمن اور فروزاں سے کئی بار نصیر بابا کا آمنا سامنا ہوا مگر تنہائی میں بات کرنے کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ وہ مسلسل اسی فکر میں لگے ہوئے تھے اور انھیں ملال ہو رہا تھا کہ یاسمن اور فروزاں ان سے کہیں زیادہ مضطرب ہو رہی ہوں گی۔ پانچویں دن شام کا وقت تھا' سید صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ نصیر بابا عقبی سبزہ زار کے اس حصے کی طرف چلے گئے جو خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ فراغت کے اوقات میں عادت کے مطابق وہ کیاریاں درست کرنے لگے۔ یاسمن نے جھروکے سے انھیں دیکھ لیا۔ زنان خانے کی صورت حال بھی موافق ہوگی جبھی لمحوں میں وہ نصیر بابا کے پاس پہنچ گئی۔ نصیر بابا نے کیاریوں سے پھول توڑ کے چھوٹا سا گلدستہ بنایا اور ہر طرف سے مطمئن ہوکے ظفر کا مڑا تڑا رقعہ گلدستے کے ساتھ یاسمن کو پیش کردیا۔ "یہ ظفر میاں کا خط ہے بی بی!" انھوں نے دھڑکتی آواز میں کہا "پڑھ کے فوراً جلا دینا۔" ظفر کے نام پر یاسمن دنگ رہ گئی۔ نصیر بابا نے مختصر وقت میں جتنا کچھ ممکن تھا' بہ عجلت تمام یاسمن کو آگاہ کیا اور کہا کہ اب سارا معاملہ ان دونوں پر ہے کہ وہ کس ہوش مندی اور حوصلہ مندی سے آنے والا وقت بسر کرتی ہیں۔ انھیں سید صاحب' رئیس بیگم اور ملازموں کے سامنے اپنی حالت کی بحالی اور اوسان کی درستی کا تاثر دینا ہے تاکہ نگراں ملازموں کی بھیڑ اطراف سے چھٹ جائے۔ رئیس بیگم کی شیدائیت اور فدائیت کے جواب میں انھیں بھی اس کے ساتھ تپاک سے پیش آنا ہے۔ انھیں گھر کے ہر فرد کو یہ جتانا ہے کہ اپنی ماں کے سانحے پر انھوں نے صبر و شکر کرلیا ہے۔ سب اللہ کی جانب سے ہے اور وہ اس گھر کا حصہ ہیں' ان کا مستقبل تو اسی گھر سے وابستہ ہے۔ نصیر بابا نے یاسمن سے کہا' انھیں معلوم ہے کہ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن ظفر کا خط پڑھنے کے بعد ان پر گزرنے والی کیفیت بڑی مختلف ہوگی۔ بہت اندھیرا اور حبس انھیں یہاں محسوس ہوگا۔ ان پر ایک ایک لمحہ عذاب ہوسکتا ہے۔ انھیں اپنے اردگرد ہمہ دم مستعد پرسان حال' اپنے خدمت گاروں سے بڑی گھن آئے گی اور ڈر بھی لگے گا۔ وہ جان لیں' یہی وقت ان کی آزمائش کا ہے۔ نصیر بابا ادھر اپنی کوششوں میں لگے رہیں گے مگر دیر

ہو سکتی ہے' بہت دیر بھی ہو سکتی ہے پھر بھی انہیں امید ہے' کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔ وہ ظفر سے مسلسل رابطہ رکھیں گے۔ اس خط کا جواب بھی اسے پہنچا دیں گے۔ جواب صرف دو سطری ہونا چاہیے۔ صرف خط کی رسید اور اپنی خیریت سے ظفر کو مطلع کرتا ہے اور لکھتا ہے' اس سے پہلے اس کا کوئی خط فرزاں اور یاسمن کو نہیں مل پایا ہے' تفصیلی جواب وہ بعد میں لکھیں گی۔ اپنی ماں کے بارے میں بھی انہیں ایک لفظ نہیں لکھنا۔ سرگراں ظفر سے کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اٹھ سکتا ہے۔ فرزاں اور یاسمن کو یقین کرنا چاہیے کہ وہ اس گھر میں تنہا نہیں ہیں۔ ایک بوڑھا آدمی نگران کا بھی خواہ' ان کا غمگسار نصیر بابا زندہ ہے۔ اسے موت بھی آنے لگی تو وہ یوں انہیں بے آسرا چھوڑ کے نہیں جائے گا۔ نصیر بابا نے عزم سے کہا' ایک فیصلہ تو ہر وقت ان کے پاس محفوظ ہے۔ وہ بھروسا رکھیں۔

ہکا بکا یاسمن سنتی رہی۔ نصیر بابا نے اسے اپنے پاس مزید نہیں ٹھہرنے دیا اور آئندہ بھی چاروں طرف سے مطمئن ہو کے اپنے قریب آنے کی تاکید کی اور کہا کہ دونوں بہنوں اور نصیر بابا کے درمیان غیر معمولی ربط و ضبط کا کسی کو احساس نہ ہونے پائے۔

ظفر کا خط ملنے کے بعد یاسمن کو پر لگ کے اپنی بہن فرزاں کے پاس پہنچنے کی وحشت ہونی چاہیے تھی مگر اس نے صبر و تحمل کا ثبوت دیا' کوئی جلدی نہیں کی۔ وہ شدید کشمکش اور شش و پنج سے دوچار نظر آتی تھی۔ اسی حالت میں وہ نصیر بابا کے پاس سے ہٹ گئی اور آہستہ قدموں سے دور ہوتی گئی۔ نصیر بابا بھورے ہونٹوں سے بولے کہ انہیں اتنے ہی لفظ آتے تھے۔ ان کی زبان ہی ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ یاسمن کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کے ان کا سینہ کٹ رہا تھا۔ "شکر ہے' یاسمن نے ان سے سوال جواب نہیں کیے' وہ خاموشی سے چلی گئی۔" کسی گوشے سے اچانک کسی کے نمودار ہو جانے کا خدشہ نصیر بابا کو اور ہولائے ہوئے تھا۔ یاسمن کے جاتے ہی انہیں ایک اور وسوسے نے آگھیرا کہ ان سے کوئی چوک تو نہیں ہو گئی؟ ظفر کا خط پڑھنے کے بعد تو دونوں بہنوں پر ایک باب حیرت کھل جائے گا۔ اب تک یہ گھر ان کے لیے ایسا زنداں نہیں تھا' اب تو سب کچھ انہیں بدلا ہوا نظر آئے گا۔ نصیر بابا نے کتنی آسانی سے ہدایتیں جاری کر دیں' یہ سوچے سمجھے بغیر کہ سامنے کون ہے' وہ تو شیشے کی طرح نازک تھیں۔ کس حد تک ان کے دکام کی گراں باری کی متحمل ہو سکیں گی' انہیں یہ زمانہ سازی' یہ سوانگ اور بہروپ کہاں آتا ہے۔ انہیں کبھی اتنے چہروں کے لوگوں سے کب واسطہ پڑا ہو گا۔ وہ تو بڑے صاف و شفاف اطوار کی لڑکیاں ہیں۔ انہیں تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا ہو گا کیونکہ انہیں کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہو گی۔ نصیر بابا کو یہ فکر کھائی جا رہی تھی کہ فرزاں اور یاسمن پر خوف و وحشت کے علاوہ مایوسی اور اداسی کا غلبہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ' وہ... ایک اختیار تو ان کے ہاتھ میں بھی ہے' مایوسی میں آدمی زیادہ کم زور ہو جاتا ہے۔ اے خدا انہیں ہمت و استقامت دے' اے خدا انہیں اپنی امان میں رکھ۔ نصیر بابا نے ظفر کا خط نہیں پڑھا تھا۔ ظاہر ہے' ظفر نے اپنی بے بسی و بے چارگی کا حال رقم کیا ہو گا۔ کاش ظفر کی تحریر ہی جوت جلائے رکھے۔ نصیر بابا کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یاسمن کو گئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ ان کے قدم بے اختیار زنان خانے کی طرف اٹھ گئے۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں تھیں۔ نصیر بابا ادھر ادھر کا چکر لگاتے ہوئے واپس آ گئے۔ اس رات وہ صبح تک دعائیں مانگتے رہے۔

مہمان خانے میں ان دنوں ایک دو مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ نصیر بابا سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ مہمانوں کو جیسے تیسے ناشتے سے نمٹا کے انہوں نے فوراً زنان خانے کا رخ کیا۔ انہوں نے پھر ایک گلدستہ تیار کیا اور اپنی ہی تاکیدیں بھول گئے۔ یاسمن کو انہوں نے کسی ملازمہ کے ذریعے کمرے سے بلوایا۔ اسے دیکھ کے جیسے ان کی سانسیں بحال ہوئیں۔ ایک رات میں یاسمن کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے گلدستہ اس کے حوالے کر کے تھپکیاں دیں اور اس سے پہلے کہ یاسمن کی آنکھیں چھلکنے لگتیں' وہ واپسی کے لیے مڑ گئے۔

تین چار دن تک ان سے خود اپنی عاید کردہ احتیاطوں پر عمل نہ ہو سکا۔ عام روش کے برعکس وہ کثرت سے زنان خانے جاتے رہے اور دوسرے ہی دن انہیں چند لمحوں کے لیے یاسمن سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے اسی ارادہ و عزم کے سابق درس کی تکرار کی۔ یاسمن نے اسی دن ظفر کے خط کا جواب ان کے سپرد کر دیا۔ نصیر بابا کو خط لکھنے کی حد تک اچھی اردو آتی تھی مگر انہوں نے سرِراہ ایک اجنبی روک کے عام سے کاغذ پر چند سطری تحریر لکھوائی۔ اس کو اردو نہیں آتی تھی۔ نصیر بابا جو بولتے گئے وہ انگریزی میں لکھتا گیا۔ کسی اور اجنبی سے نصیر بابا نے ظفر کا پتہ لفافے میں درج کرایا اور یاسمن کے خط کے ساتھ اپنا رقعہ لفافے میں رکھ کے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ انہوں نے مرسل کا نام بھی لفافے پر نہیں لکھا' نہ اپنے خط میں۔ ان کے مختصر خط کا متن بہت سادہ تھا۔ انہوں نے لکھوایا تھا کہ دوسرا خط آنے تک ظفر اپنی جگہ ٹھہرا رہے جب اسے بلایا جائے' تبھی آئے اور اگر اپنی مرضی سے آئے تو ان سے ملنے کی کوشش قطعاً نہ کرے۔ اسے امید رکھنی چاہیے شاید وہ جلد ہی اچھی خبر سے اسے مطلع کر سکیں۔

وعدے کے مطابق ظفر کو انہوں نے جواب بھیج دیا تھا لیکن وہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ اچھی خبر سے جلد مطلع کرنے کا یہ دوسرا وعدہ کس طرح اور کب پورا کر سکیں گے۔ پہلی بار خط کا جواب مل جانے کے بعد ظفر کے وقف و تامل پر انہیں شک تھا' اور تحریر اگر فرزاں کی ہے تو ظفر کے حال کا تو خدا حافظ۔ کئی روز گزر گئے۔ یاسمن نے اشارتاً ان سے ایک بار ظفر کا ذکر چھیڑا۔ نصیر بابا نے کچھ نہیں چھپایا' صاف بتا دیا کہ انہوں نے ظفر کو حسن باد میں روکے رکھا ہے' اس کا اس شہر میں آنا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے اسے خط لکھنے سے بھی منع کر دیا ہے۔ وہ ڈاک کے ذریعے تو کوئی خط یہاں بھیج ہی نہیں سکتا۔ جب تک وہ یہاں نہ آئے' خیریت نامے کا امکان نہیں۔ وہ حسن باد اتنی دوری پر نہیں ہے' کسی دن کسی بہانے وہ خود اس سے ملنے وہاں جا سکیں گے۔ یاسمن ان سے اصرار یا ضد کرنے کا ناز نہیں کر سکتی تھی حالانکہ اس ناز برداری کی نصیر بابا کو بڑی حسرت تھی۔ دونوں بہنیں ان کی ہدایت کے عین مطابق غم فراموشی اور زندگی میں رغبت کے وظیفے پر بہ تدریج عمل کر رہی تھیں۔ سید صاحب' رئیس بیگم اور ملازم' فرزاں اور یاسمن میں اتنی سرعت سے امید کی بحالی اور زندگی کی طرف مراجعت کے آثار پر بہت شاداں تھے۔ سید صاحب تو جب وہ سامنے آتیں' بقول شخصے' دیدہ و دل فرش راہ کر دیتے۔ رئیس بیگم ان کے اشارے سو گھتی پھرتی تھیں۔ ملازمہ کے خیال میں فرزاں اور یاسمن میں یہ قرار اور استغنا مولوی معظم علی کے عطا کیے ہوئے وظیفے کی کرامت تھی۔ سید صاحب اسے رئیس بیگم کی مشاقی کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس حسن خدمت کے اعتراف میں ایک جڑاؤ گلوبند رئیس بیگم کے زیب گلو کیا۔ فرزاں اور یاسمن نے سیاہ لباس کے بجائے رنگ برنگے کپڑے پہننے شروع کر دیے تھے۔ وہ گھر میں اپنی ماں خانم کے نقش خود ہی مٹا رہی تھیں۔ کوئی ان کے سامنے مرحومہ کا ذکر کر بیٹھتا تو وہ چپ سادھ لیتیں جیسے ان کی ماں کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں آنسوؤں سے عاری کر لی تھیں۔ عمر ان کی زیادہ نہیں تھی' تجربہ بھی کچھ نہیں تھا لیکن پہلی شرط تو آدمی کا عقل و ہوش سے آراستہ ہونا ہے۔ کتابیں تو وہ مستقل پڑھتی رہی تھیں۔ کتاب پڑھنے والا آدمی زیادہ دیکھتا' زیادہ سنتا ہے۔ جو استاد نہیں کہہ پاتے' وہ کتابیں سکھا دیتی ہیں۔ سید صاحب نے بھی اپنے گھر میں ان کے لیے کتابوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

وقت گزرنے پر نصیر بابا کے سر میں جالے پڑنے لگے۔ انہوں نے اپنی دانست میں کئی دروازے کھول دیے تھے مگر اب کتنی چیزیں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ ظفر سے رابطہ ہو جانے' گھر میں فرزاں اور یاسمن کے گرد یاس بانوں کا حصار ٹوٹ جانے سے یہ مراد کہاں تھی کہ حصار ٹوٹ گیا' یاس بانوں کو موت آ گئی۔ اب کچھ بھی نصیر بابا کی دسترس سے دور نہیں' کچھ وقت اور جاتا' کسی خوشگوار دن اور مبارک ساعت میں فرزاں اور یاسمن کو ایک اشارے کی ضرورت پڑے گی اور منزلیں سر ہو جائیں گی۔ درمیان میں حائل پتھروں اور کانٹوں کا نصیر بابا کو اندازہ نہیں تھا۔ اونچی اونچی دیواروں' پتھروں سے بھرے ستونوں پر استوار چار دیواری' مسلح دربان اور نمک کا احترام کرنے والے' خدا سے زیادہ ناخداؤں پر اعتبار کرنے کی سرشت رکھنے والے غلاموں سے آگے' دور دور تک سید صاحب کا سکہ چلتا تھا۔ نصیر بابا سید صاحب کے ہم مشربوں میں ایک ایک سے واقف تھے' کیسے کیسے بلند اقبال' زور و اثر والے ان میں شامل تھے۔ وقت گزرا جا رہا تھا' دیر ہو جانے سے اور پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ زنان خانے جا کے فرزاں اور یاسمن کے سامنے نصیر بابا کا سر جھک جاتا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ان کے چہرے پر بکھری آرزوئیں نصیر بابا کو بہت آزردہ' بہت ڈراسیمہ کرتی تھیں' سوچتے سوچتے ان کے اعصاب جواب دینے لگتے تھے۔ ان کی منشا کی تعمیل میں فرزاں اور یاسمن نے خود پر کیسا جبر کیا ہے۔ بہروپ بھرنے والوں کے سامنے بہروپ بھرنا ایک اذیت ناک مشقت ہے۔ کب تک وہ اس سوگ' اس تماشے پر قادر رہیں گی۔ کسی دن ان کا پیمانہ چھلک سکتا ہے۔ خواب اور تعبیر میں اتنی فصیل نہیں ہونی چاہیے۔

نصیر بابا کو رئیس بیگم کی طرف سے بڑی فکر تھی۔ وہ بزعم خود اس خوش گمانی سے سرشار تھی کہ ماں کی موت سے فرزاں اور یاسمن کے نہاں خانے میں جو اندھیرا رہ گیا تھا' اسے اس نے اپنی حکمت سے اجالے میں بدل دیا ہے۔ یہ پہلا مرحلہ تھا۔ پہلے مرحلے کی تکمیل کے بعد اب وہ دوسرے مرحلے کے تیز و تند' دشنہ و خنجر صیقل کر رہی ہوگی۔ دوسرا

مرحلہ خانم کی طرح اس کی بیٹی فروزاں پر اپنے جوہر آزمانے کا ہے۔ سید صاحب نے ابھی سے بے مہری کا اظہار شروع کر دیا ہوگا۔ بے شک اب کے رئیس بیگم ناکام ہو جائے گی کہ اس کے سامنے خانم نہیں، فروزاں ہے۔ سادہ شعار خانم کو رئیس بیگم کی صورت شناسی سے زیادہ دیکھنے اور سمجھنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ خوش قسمتی سے خانم کی بیٹی فروزاں کو رئیس بیگم کی سیرت آشنائی کا موقع فراہم ہو گیا ہے۔ مگر اس گھر میں تو رئیس بیگم کی موجودگی کا ایک ہی جواز ہے۔ اس کا تمام عزو افتخار اس کے کار فسوں کے سبب سے ہے۔ وہ ایسی آسانی سے پسپائی قبول نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ اسے اس کی عادت نہیں ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے آقا، اپنے ولی نعمت کی نظروں میں سرخروئی کے لیے پھر وہ کون سا حیلہ تراشے، کون سا پینترا بدلے، وہ انگلیاں ٹیڑھی کرنا بھی جانتی ہوگی اور فروزاں کا آبگینہ تو اس کی ماں سے زیادہ نازک ہے۔ وہ کہاں تک اپنی سپر کا بوجھ اٹھا سکے گی۔

وقت چپکے سے اور گزر گیا۔ نصیر بابا نے گھر سے باہر جا کے ظفر کے نام ایک اور خط کسی سے لکھوایا۔ انھیں اس کا بھی بہت خیال تھا۔ پہلے کی بات اور تھی، ظفر ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھا تھا۔ نصیر بابا نے اس کی آنکھوں میں دوبارہ خواب جگا دیے تھے، اب اس کا حال دگر ہوگا۔ نصیر بابا نے تصدیق نہیں کی تھی مگر انھیں یقین تھا کہ فروزاں نے ان کی ہدایت سے بیش و کم ظفر کو کچھ نہیں لکھا ہوگا لیکن جتنا بھی لکھا تھا، ظفر کے لیے یہ ایک مقصود و مطلوب کی تحریر تھی۔ ظفر کے روز و شب تو پھر اس کے بس میں نہ رہے ہوں گے۔ نصیر بابا کا خط ملنے کے دوسرے ہی دن ظفر آسن سول آ گیا۔ شہر سے دور ایک غیر آباد مقام کی سنسان مسجد میں ان کی ملاقات ہوئی۔ انھیں دیکھ کے ظفر نے سوالوں کی یورش کر دی۔ نصیر بابا اس سے اتنا ہی کہہ سکے کہ وہ ایک آدھے، ادھورے آدمی ہیں، اپنی بساط کے اعتبار سے معذور بھی۔ جسمانی نقص سے آلودہ ہی معذور نہیں ہوتا، غلام بھی معذور ہوتا ہے۔ بے اختیار بھی معذور سے کم نہیں ہوتا۔ دنیا میں بہت سے آدمی اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے، وہ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ نصیر بابا کو اپنی بے امانی، بے سروسامانی، جسم و جاں کی ناتوانی کا ایسا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے ظفر سے کہا کہ وہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے، صرف اس قدر کہ اسے ان کی طرح آسمان سے لو لگانی چاہیے۔ وہ آسمان نشیں بھی تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کیا ظفر بھول گیا، اس نے بھی تو کوئی کوشش نہیں چھوڑی تھی، قانون، پولیس، سفارشیں، دہائیاں۔ اس دن ظفر، نصیر بابا کے بجھے ہوئے چہرے اور کملائی ہوئی باتوں سے بہت نا آسودہ ہوا مگر نصیر بابا، ایک تہی دست اسے دے بھی کیا سکتے تھے۔

نصیر بابا خاکے بناتے اور فسانے وضع کرتے رہے کہ ایک دن، کاش ان کے پاس جادو کی چھڑی آ جائے۔ وہ سید صاحب، رئیس بیگم، ملازم، دربان اور چار دیواری سے پار ممکنہ تعاقب کاروں کی بصارت اس چھڑی سے زائل کر دیں یا پھر ایسا ہو، کسی دن سید صاحب زمینوں کے دورے پر زیادہ وقت کے لیے گئے ہوئے ہوں تو خنجر بدست نصیر بابا زنان خانے میں داخل ہو جائیں، پھر کوئی بھی ان کے آڑے آئے گا یا وہ سید صاحب کی شکاری بندوق پر قبضہ کر لیں۔ بس انھیں اتنا وقت چاہیے کہ سید صاحب کے والا مرتبت احباب افسران عالی مقام کی قلم رو سے وہ پرے ہو جائیں۔ ان سے کوئی لغزش سرزد نہ ہو، فروزاں اور یاسمن کو کوئی گزند نہ پہنچ سکے۔ درمیان میں کہیں کسی جگہ وہ ملوث ہو گئیں تو وہ تو چھوئی موئی کے مانند ہیں۔ گھر کی بات اور ہے، باہر کی زندگی دوسری ہے۔ نصیر بابا کو اپنے آپ پر شک ہونے لگتا کہ ان سے کوئی نادانی تو نہیں ہو رہی؟ انھیں یہ گمان ہوتا جیسے سید صاحب ان سے کچھ محتاط ہو گئے ہیں۔ گھر کے ملازموں کی نظریں بھی انھیں کبھی کبھی بدلی ہوئی لگتیں۔ انھیں ہر دم کھٹکا لگا رہتا کہ کسی کو ذرا بھی ان پر شک ہو گیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے اور نصیر بابا، فروزاں اور یاسمن کا سامنا کرتے ہوئے پہلو کترانے لگے۔ بس ایک بدترین فیصلے کا عزم انھیں توانا رکھتا تھا اور وہ تنہائی میں اپنے اس عزم کی تجدید کرتے رہتے تھے۔ انھیں صرف، فروزاں اور یاسمن کے لیے ایک گوشۂ اماں کا یقین چاہیے تھا۔ اپنی کوئی فکر انھیں مطلق نہ تھی۔ اس کے بعد سارے بہتان، ساری سزاؤں کے لیے گریباں چاک کرنے کی ہمت ان کے اندر موجزن تھی۔ پھر انھیں موت آ جائے یا ان کے لیے موت تجویز کر دی جائے۔ انھیں معلوم تھا کہ ایسی موت زندگی سے نہایت اعلا ہوگی۔

اور پھر خدا نے، ان کے بقول "بابا صاحب" کی صورت میں ایک صاحب دل بھیج دیا۔ اس دوران حسب معمول کئی مہمان آئے، بڑے بڑے صاحبان زر اور صاحبان وزر، بات کے دھنی، قول و فعل کے پکے۔ نصیر بابا سے وہ مانوس بھی تھے، ان کا بڑا احترام کرتے تھے مگر کسی کے سامنے زبان کھولنے کی توفیق نصیر بابا کو نہ ہو سکی۔ جانے کیوں

کو دیکھ کے انھیں ایسا لگا جیسے انھیں بس اسی کا انتظار تھا پھر انھوں نے دیر بھی نہیں کی۔

سبزہ زار کی بینچ پر بیٹھے ہوئے ہمیں خاصا وقت ہو گیا تھا۔ نصیر بابا کا گلا ویسے بھی خشک ہونے لگا تھا اور اب کچھ کہنے کو بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے ان کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دی تو وہ سسکنے لگے۔ میں نے ان کا بازو پکڑ کے انھیں اٹھا دیا۔ میرے جسم میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ بچھل تو چوسر اور شطرنج کی طرح سوچ بچار میں لگا رہے گا۔ جی کرتا تھا، میں ہی جا کے سید محمود علی کو دیکھوں۔ میں بھی کوئی فیصلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں، میرے یہ ہاتھ پیر کس کام کے ہیں۔ سبزہ زار سے اٹھ کے ہم راہ داری میں آ گئے۔ یہاں تیز روشنی تھی۔ بچھل نہ کمرے کے باہر موجود تھا نہ کمرے کے اندر۔ نصیر بابا مجھ سے الگ ہو کے عمارت کے وسطی حصے کی جانب چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کسی گوشے سے ابن نمودار ہو گیا۔ مجھ سے کمرے میں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ سینے میں بڑی گھٹن ہو رہی تھی۔ ابن نے کھانے کے لیے پوچھا تو میں نے منع کر دیا۔ میرے لہجے میں ترشی پر وہ چونک پڑا اور معذرتی انداز میں بولا کہ پہلے بھی وہ دو مرتبہ آ چکا ہے۔

بچھل نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں دیر سے کھاؤں گا اور جب ضرورت ہوگی، اسے طلب کر لیا جائے گا۔

بچھل کے بارے میں استفسار پر ابن نے بتایا کہ چند منٹ پہلے وہ کھانے کے کمرے کی طرف گیا ہے۔ سید صاحب کے مہمانوں کو رخصت ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے، اس لیے آج کھانے میں دیر ہو گئی۔ اس گھر میں اب کچھ کھانے پینے کو دل ہی نہیں کرتا تھا، اتنا کچھ جانتے ہوئے جانے کس طرح بچھل شکم پری کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے تھا مگر آج کی بات تھوڑی ہے، اسے تو پہلے ہی سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اور کھانا ترک کر دینے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ جگہ کس کی تھی، یہ سازو سامان، یہ خدمت گار۔ ابن کے ساتھ میں بھی غیر ارادی طور پر کھانے کے کمرے تک چلا آیا لیکن دروازے میں داخل ہوتے ہی میرے قدم ٹھٹک گئے۔ مجھ سے ابھی شاید اس شخص کا سامنا نہ ہو سکے۔ بچھل کی طرح مجھ سے یہاں نہیں بیٹھا جائے گا۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ واپس چلا جاؤں۔

ابن نے اندر جا کے بتا دیا کہ میں باہر ٹھہرا ہوا ہوں۔ اسی لمحے اندر سے سید صاحب کی حلاوت آمیز آواز گونجی "ارے بھئی، آئیے آئیے بابر میاں! باہر کیوں رک گئے۔ مبارک ہو، آج تو مٹھائی کھلانے کا دن ہے۔ واہ وا! ماشاء اللہ۔"

سید صاحب اندر سے اٹھ کے میرے سامنے آ گئے۔ انھیں دیکھ کے آنکھوں میں دھند اتر آئی تھی۔ سید صاحب نے میرا بازو تھاما تو سارا جسم متزلزل ہو گیا۔

چند لمحوں کے لیے دماغ سن ہو گیا تھا۔ اس کشادہ اور مرصع طعام گاہ میں پہلی بار میرا آنا ہوا تھا۔ یہاں مغربی و مشرقی، دونوں طرز کے انتظامات تھے۔ کمرے کے وسط میں وسیع میز کے اطراف کرسیاں رکھی تھیں اور سامنے کی دیوار کے ساتھ تخت بچھا تھا۔ چھت کے بیچ میں فانوس لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر ابھرے ہوئے گل بوٹے کندہ تھے اور ان میں شیشے جڑے تھے۔ فرش پر قالین چسپاں تھا۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ صوفے پیوست تھے "کہیے، اب کیا حال ہے۔ آج تو شہزادے بہتر دکھائی دیتے ہیں۔" سید صاحب مسکراتے ہوئے مجھے تخت تک لے آئے "بسم اللہ کیجیے۔ آج واقعی بڑا وقت ہو گیا ہے۔ کیا بتائیں، بیٹے سے ایک پرانے واقف کار سرکاری افسر جب بھی اس طرف آتے ہیں، غریب خانے ضرور تشریف لاتے ہیں، اور جناب اچانک آ دھمکتے ہیں۔ ساتھ میں ان کے دو تین احباب بھی تھے۔ محفل جم گئی۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے گزارش بھی کی مگر وہ کہیں اور مدعو تھے۔" انھیں فوراً خیال آیا "ارے، وہ آپ کا تو پرہیزی کھانا چل رہا ہوگا۔ آپ نے کھانا کھا لیا؟"

مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔

"کہاں کھو گئے؟" سید صاحب نے شائستگی سے مجھے ٹوکا دیا۔

"جی!" میں نے سٹپٹا کے کہا "جی نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"رات کو تو کچھ نہ کچھ ضرور کھانا چاہیے اور بھوک نہ لگنا عالی جناب! اچھی نشانی نہیں ہے۔ دوا تو چل رہی ہے نا؟"

میں نے بمشکل اقرار میں سر ہلایا۔

"ولایتی دوا سے پہلے کچھ کھانا کھا لینا بہتر ہوتا ہے، میرا خیال ہے، ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جائیے۔ یہاں بھی چند ایسی چیزیں ہیں جو آپ اطمینان سے کھا سکتے ہیں۔"

"رہنے دو صاحب!" بچھل نے دخل دیا "بھوک سے کھائے تو ٹھیک ہے۔"

"یہ بھی مناسب ہے۔" سید صاحب نے برملا اس کی تائید کی اور اچھا ہوا کہ ان کی توجہ بچھل کی جانب ہو گئی "تو پھر آپ نے کیا کیا رکھا یہاں؟"

"اتنے میں کیا دیکھیے' سارا ٹائم چکر میں رہے۔"

"میرے ساتھ چلیے' یہاں اردگرد کے علاقے' خصوصاً چائے باسا اور پورولیا شہر میں مسلمانوں کی مدرسوں سے تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ قبلہ مولوی شفیق اس طرف کہیں ہوتے تو مجھے ضرور خبر ہوتی اور وہ اتنے قریب رہ کے یہاں کیوں نہ آتے۔"

"ان کو آنا ہی نہیں تھا۔ ادھری اتنے دن بند رہ کے گانٹھ پڑنے لگی تھی۔ کھلے میں جاکے تھوڑے ہاتھ پاؤں بھی کھلے۔ آدمی کو جانور سے زیادہ ہریالی کی ضرورت پڑتی ہے' چرتا نہیں تو کیا ہوا' آدمی بھی جنگل کا جانور ہے۔"

"بے شک' سبزہ زندگی ہے۔" سید صاحب چہکتی آواز میں بولے "اور یہاں کے کیا کہنے' یہاں تو زمین سے سبزہ ابلتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں' زمین سونا اگلتی ہے' یہاں کی زمین سونا نہیں' ہیرے موتی اگلتی ہے۔"

"اپنے کو ادھری منہ مارنے کو چھوٹا موٹا ٹکڑا مل جائے گا؟" بٹھل نے دھیرے سے پوچھا۔

سید صاحب اچھل پڑے "کیوں نہیں' چھوٹا موٹا کیا' آپ اشارہ کیجیے' بلکہ پہلے ارادہ تو کیجیے' لیکن... لیکن...." وہ جھجکتے ہوئے بولے "اور جگہوں کے مقابلے میں یہاں زمین کسی قدر مہنگی ہے۔"

"اب مہنگا سستا کیا دیکھنا' آپ جو پھوکٹ میں ملوگے۔"

سید صاحب نے قہقہہ لگایا "ہاں ہاں' آپ نے صحیح کہا' بالکل صحیح کہا۔" پھر وہ سنجیدہ ہوکے بولے "آپ فرمائیں تو کھوج لگاؤں؟"

"یہی بول رہے ہیں۔"

"ذرا سوچ لیجیے' بڑا فیصلہ ہے۔ کہاں بمبئی' کہاں یہ گاؤں آسن سول۔"

"ادھری آپ جو ہو۔"

"میں' میں کیا' ذرہ نوازی ہے آپ کی۔"

"سارا آپ پر ہے' ادھری پاس رکھنا چاہتے ہو کہ نہیں۔"

"اس سے بڑی خوشی کی بات میری لیے کیا ہو سکتی ہے۔ میں کل ہی نگاہ دوڑاتا ہوں' کچھ عرصہ گزرا' کسی نے مجھ سے کہا بھی تھا بلکہ یاد آیا' لیجیے' کل رات ہی دعوت میں کلکٹر صاحب اپنے کسی عزیز کی زمین کا ذکر کررہے تھے۔"

میں تخت کے پاس صوفے پر بیٹھا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا اور میری آنکھیں جل رہی تھیں کہ بٹھل یہ کس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ وہ تو اس طرح سید صاحب سے شیرو شکر ہے جیسے کوئی اور بات ہی اس کے دماغ میں نہ ہو۔ جیسے نصیر بابا نے جو کچھ مجھے بتایا ہے' بٹھل اس سے نا آشنا ہو۔

"آپ کا کیا خیال ہے بابر میاں؟" یکایک سید صاحب نے میری جانب پہلو بدل لیا "آپ کو یہ علاقہ کیسا لگتا ہے؟"

"جی' جی ہاں' اچھا ہے۔" میں نے ہکلاتی آواز میں کہا "بہت اچھا ہے۔"

"آپ کیا کہتے ہیں؟ لگتا ہے' بابا صاحب نے تو یہیں ڈیرے ڈالنے کی ٹھان لی ہے۔"

میں بٹھل کی تائید کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

"ایک اہم بات تو رہ گئی۔" سید صاحب نے شائستگی سے پوچھا "کم از کم کتنی زمین کی بات کی جائے؟"

"جتنی آپ ٹھیک جانو۔"

"یہ تو مرکز ڈالنے والی بات ہے صاحب! اب بات ہزاروں تک جاتی ہے' کہیں کہیں تو اس سے زیادہ' بہت زیادہ' مجھے ایک اندازہ تو ہونا چاہیے۔"

"اپنے کو پتہ نہیں' آپ جیسا بولو۔"

"اس طرح کیسے؟" سید صاحب کسی قدر بے چینی سے بولے "میری تو یہی خواہش ہوگی کہ آپ کی یہاں سب سے بڑی زمین ہو' کچھ مزا تو آئے۔"

"پھر آپ بڑی کی بات کرلو' جتنی چاہے بڑی' بعد کو تو چھوٹی رہ جاتی ہے۔ مٹھی بھی شاید بڑی پڑ جائے۔"

"نہیں صاحب' یہاں میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ جو آپ فرما رہے ہیں' وہ تو ہونا ہی ہے' سب یہیں دھرا رہ جائے گا۔ وہ جو کہتے ہیں' جب لاد چلے گا بنجارہ مگر یہ زندگی کیا کوئی خواب ہے؟ یہ کوئی جھوٹ ہے؟ یہ بھی تو ایک سچ ہے اور جب تک ہے' اس کا پورا سواد کیوں نہ لیا جائے' اگر سواد دستیاب ہو سکتا ہو۔ زندگی میں رس بھی بہت ہے۔ کسی کو نظر نہ آئے اور کوئی منہ پھیرے رکھے تو اسے کیا کہیں گے آپ؟ کیا اس آنے والی زندگی کے لیے سامنے کی اس زندگی پر خاک ڈال دی جائے؟ نہیں صاحب نہیں' یہ بات اپنے پلے آج تک نہیں پڑی۔"

"پر اپنے ترت بھاؤ میں تھوڑا دوسروں کا بھی دھیان رہے۔"

"کیا مطلب؟ معاف کیجیے' میں سمجھا نہیں۔" سید صاحب کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"جانے دو صاحب!"

"نہیں نہیں' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کیا بولیں۔ دیکھا ہے' اپنی رنگ بازی بھی دوسروں کو

بھی الٹی سیدھی چل جاتی ہے۔ کبھی کسی سے سنا تھا' کشتی کی طرف بھاگتے بھگاتے بیچ میں پڑنے والوں کا دھیان نہیں رہتا اور جدھر رو کڑے سے پوناتر ہوتا ہے' ادھری کسی کا گلا ضرور دبا ہوتا ہے۔ دھن کے بنا تو تنگی بھی نہیں ہوتی۔ ایک کے بعد ایک' ایک سے بڑھ کے ایک۔ آدمی کو پھر نکٹ پار کا پیتا نہیں۔"

"آہا ہا۔" سید صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ نیاز مندانہ انداز میں بولے "واقعی جس نے کہا ہے' اچھا کہا ہے۔ جہاں تک ناچیز کا معاملہ ہے' کوشش تو یہی رہتی ہے' اپنے عیش و عشرت میں کسی دوسرے کا ضرر نہ ہو۔ آپ یہاں دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"اچھی طرح سے دیکھ رہے ہیں۔"

"بس ہنس کھیل کر گزار لیتے ہیں' اور ہے بھی کیا' چند روزہ زندگی ہے جناب! اپنا تو اصول ہے' جو ملے اسے ٹھکراؤ نہیں' جو نہ ملے' اس کی جستجو کرو' ہاتھ پاؤں چلاؤ' دماغ لڑاؤ' پھر بھی نہ ملے تو راستہ بدل لو۔ معلوم ہے' کوئی یوں آ کے تو جھولی میں ڈالنے سے رہا۔"

"ایسے کتنی بار راستہ بدلی کیا ہے؟"

"جی!" سید صاحب پلکیں جھپکانے لگے "سچ پوچھیے تو ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی۔"

بٹھل نے کوئی تبصرہ نہیں کیا' شکر ہے' بات آگے نہیں بڑھی ورنہ سید صاحب کچھ کھٹک گئے تھے "ہم کیا بات کررہے تھے؟" انہوں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

بٹھل کے یاد دلانے پر ان کی آواز دمک اٹھی "ہاں' میں کہہ رہا تھا جناب! ایسے نہیں' میرے لیے کوئی حد مقرر کر دیجیے۔ تاکہ میں اس کے اندر یا اس کے آس پاس ہی حساب کتاب پھیلاؤں۔"

"آپ کے لیے کوئی نہیں' جو حد آپ چاہو۔"

"یہ کیسی بات کررہے ہیں آپ؟ شاید آپ سنجیدہ نہیں معلوم ہوتے۔"

"ہزر کی بات بولتے تھے آپ! اپنے پاس اس کی کتائی نہیں ہے۔"

"ماشاء اللہ' خدا کا فضل و کرم کہیے۔ یہ بات ہوئی نا۔" سید صاحب کی آواز میں حیرت شامل تھی۔ ان کی نظریں بٹھل پر مرکوز ہو گئیں "دیکھیے' میں دیکھتا ہوں۔" وہ تذبذب سے بولے "لیکن اچھا ہوگا' آپ بھی ساتھ ایک نظر ڈال لیں۔"

"آپ سے اچھی نہیں ہے اپنی۔ دوری پاس کی' سبھی میں انیس ہے پا ٹیڑھی ہو وہ۔"

"کسر نفسی تو کوئی آپ سے سیکھے۔" سید صاحب مسکرانے لگے "میرا کہنا تھا' اب تو بابر میاں بھی رو بہ صحت ہیں' آج کی طرح آپ کل بھی نکل سکتے ہیں۔"

"پہلے آپ پکی کرلو' اور آپ کے ہوتے اپنے کو کیا دیکھنا۔"

"مجھ پر اتنا اعتبار مت کیجیے' میں بھی انسان ہوں۔"

"آپ جیسا ابھی تک نہیں دیکھا۔"

ایک لمحے کے تردد و توقف کے بعد سید صاحب کھل کھلا پڑے "خدا میری لاج رکھے' آپ مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔"

"ابھی تو کانٹوں کی بات ہے' آگے دیکھو صاحب!"

شیرینی کے پیالے پر یک لخت سید صاحب کا ہاتھ رک گیا' پھر انہوں نے جلدی سے چمچہ منہ میں رکھ لیا "تیار ہیں صاحب! چلیے یوں ہی سہی' آپ جان انگے۔"

کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہا تھا کہ زمین کی بات چھیڑنے اور طول دینے میں بٹھل کی کیا منشا ہو سکتی ہے مگر یہ تو ایک طویل مرحلہ تھا۔

"ایک بات بولیں مہاراج! اپنے کو جلدی ہے' ابھی آگے بھی جانا ہے۔" بٹھل نے رکھائی سے کہا "یہ سامنے رکھنا۔"

"آگے جانا ہے مگر ابھی تو آپ...!"

"وہ تو آپ ادھری ہو' جب بولوگے' لوٹ آئیں گے' ادھری دن ہو گئے۔ تھوڑا گھر بار بھی دیکھنا ہے۔"

"مگر ابھی آپ کو جانا نہیں چاہیے۔ آپ بھول گئے۔ ڈاکٹر کشن نے کیا کہا تھا' بابر میاں کو پورے ہفتے آرام کرنا چاہیے۔"

"یہ تو ٹھکرا ہے صاحب۔"

"یہ ایک بڑی بیماری سے اٹھے ہیں۔ ابھی دوا جاری ہے' ٹائیفائڈ تھا انہیں۔" سید صاحب زور دے کے بولے "ٹائیفائڈ کے بعد کم از کم ہفتے بھر مکمل آرام ضروری ہے۔"

"نہیں صاحب! میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا۔ کم از کم چند دن تو اور ٹھہریے۔ باقی آپ کی مرضی' میرا ارادہ تو بابر میاں کی صحت کی بحالی پر چھوٹا موٹا جشن منانے کا تھا۔"

بٹھل نے بحث نہیں کی' کہنے لگا کہ وہ اپنی یہ حسرت بعد میں بھی پوری کرسکتے ہیں۔ زمین وغیرہ کی کوئی بات طے پا گئی تو ہمیں واپس آنا ہی ہے۔ یہ جشن اس وقت تک کے لیے موخر کیا جاسکتا ہے۔

"ارے صاحب!" سید صاحب مچل کے بولے "کل پہ اتنا اعتبار کون کرے' کل کس نے دیکھی ہے۔ خوشی کے لمحے ارزاں ہوں تو لوٹ لینے چاہئیں۔ زیادہ بڑی نہیں' چھوٹی سی محفل رکھیں گے۔ اس بہانے یہاں کے بعض خاص لوگوں سے آپ کا تعارف بھی ہو جائے گا۔"

"آپ کے بعد اب کسی سے جان پہچان کیا کرنا۔"

"یہ تو آپ کی نوازش ہے۔" انکساری میں سید صاحب کا جسم سمٹ گیا "دراصل میں وہ لوگ ابھی شہر میں ہیں۔" وہ رازداری سے بولے۔

"کون صاحب؟" بھٹل نے چونک کے پوچھا۔

"ارے جناب وہی' جو کل رات ہربرٹ اینڈریو کمشنر صاحب بہادر کی دعوت میں خاص طور سے بلائے گئے تھے۔ یاد رکھے جانے والے لوگ ہیں' اپنے فن میں طاق' ہر لحاظ سے یکتا و یگانہ۔ ساری رات جادو جگائے رکھا' رات بھر بجلی چمکتی رہی۔ ابتدا ہی میں مجھے آپ کے صاحب ذوق ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ خود آپ نے بھی فرمایا تھا کہ سر تال سے دل چسپی ہے' نرت کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ کل رات آپ بہت یاد آئے۔ بس کیا بتائیں' کیسی محفل رہی۔ کم کم ایسا دیکھا ہے۔ کمشنر صاحب بھی دنگ رہ گئے۔ چیدہ چیدہ لوگوں کا اجتماع تھا۔ خوب جماؤ رہا۔ کمشنر صاحب کو آج دلی جانا تھا۔ میں نے گزارش کی تھی' آج رات غریب خانے کو عزت دی جائے۔ افسوس کا اظہار کرنے لگے کہ دلی میں طلبی ہے' رک نہیں سکتے۔ خاک سار سے تو بہت خوش ہیں۔ ایک بار بس شکار کھلوایا تھا' اہتمام البتہ خاصا کرلیا تھا' بساط سے کچھ زیادہ۔ جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا تھا۔ یہ گورے بھی کمال کے نشانے باز ہوتے ہیں۔ اچھی دھاچوکڑی رہی۔ رات کو جنگل میں محفل سجی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن' ایسی یاد اللہ ہوئی کہ کیا عرض کروں۔ اس طرف دورہ ہوتا ہے تو ضرور طلب کرتے ہیں۔ پوچھتے رہتے ہیں' کوئی پریشانی تو نہیں ہے' کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ خادم نے اپنا کوئی کام ان سے نہیں کرایا ہے۔ ہاں' ایک بار مجبور ہو گیا۔ ادھر قریب کے علاقے رام گڑھ میں ایک بڑے زمیں دار لالہ بشن داس رہتے ہیں۔ حالات آدمی کے ایک جیسے نہیں رہتے۔ قرض لینے کی نوبت آ گئی۔ پرکھوں کی زمین گروی رکھنا پڑ گئی پھر کسی طرف سے کوئی انتظام ہوا تو قرض خواہ کی نیت میں بل آ گیا' ہیر پھیر کرنے لگا' آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ مقصد وقت گزارنا تھا کہ لالہ کے پاس آنے والی رقم باقی نہ رہ سکے۔ وقت گزر گیا تو عدالت میں فیصلہ لالہ کے خلاف ہو گیا۔ آپ تو واقف ہی ہوں گے' ہر جگہ در پردہ الگ کھیل چلتا ہے۔ لالہ بشن داس کو کسی نے بتایا کہ گورے کمشنر سے سید محمود علی کی بڑی صاحب سلامت ہے۔"

ملازموں نے تخت پر بچھے ہوئے دسترخوان سے قابیں اٹھانی شروع کر دی تھیں۔ سید صاحب منتشر ہو گئے اور ناگواری سے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ بہ عجلت اپنا کام نمٹائیں پھر انہوں نے بھٹل سے معذرت کی کہ وہ بیٹھے کیا ذکر لے بیٹھے' ہمیں بے لطفی ہو رہی ہوگی۔ بھٹل نے ان کی توقع کے مطابق جواب دیا کہ ان کی تدبیر آمیز باتوں سے کوئی کیسے بے لطف ہو سکتا ہے' وہ سلسلۂ کلام جاری رکھیں' اور ہمیں جانا کہاں ہے۔ ملازموں نے قابیں اٹھا کے قہوے کا طشت تخت پر رکھ دیا اور سلیقے سے ہم تینوں کے لیے چھوٹی پیالیاں قہوے سے بھر دیں۔

"بس جناب!" سید صاحب قہوے کے گھونٹ سے حلق تر کر کے بولے "ایک دن کیا دیکھتا ہوں' لالہ غریب خانے میں موجود ہیں۔ ضرورت بھی آدمی کو کہاں کہاں لے جاتی ہے۔ راجوں مہاراجوں سے تعلق ہے لالہ کا۔ اصطبل' جانور خانہ' بہت لاؤ لشکر ہے۔ میں نے کہا' مجھے بلا لیا ہوتا' آپ نے کیوں زحمت کی' مجھے شرمندہ کیا۔ کہنے لگے 'غرض اپنی تھی بھیا۔' مدعا بیان کیا' کام پیچیدہ تھا' عدالتی فیصلہ ہو چکا تھا۔ اوپر کی عدالت میں جانے اور وہاں سے کوئی فیصلہ ہونے میں بال سفید ہو سکتے ہیں۔ میری عجب مشکل تھی۔ لالہ کو انکار کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ لالہ جیسے ذی حیثیت آدمی کا گھر آ کر دست سوال دراز کرنا' آپ سوچیے' کیسے مخمصے میں پڑ گیا ہوں گا۔ ڈر تھا کہ اگر کہیں لاٹ صاحب گورے بہادر کے دماغ میں نہ آئی؟ مجھ سے بیان کی کوتاہی ہو گئی؟ پھر لالہ کے سامنے کیا منہ لے کے جاؤں گا۔ خیر صاحب' کمشنر صاحب اس وقت پٹنے میں تھے۔ پٹنے جا کے ڈرتے ڈرتے خدمت میں حاضری کا خواستگار ہوا۔ باریابی میں دیر نہیں لگی۔ بے کم و کاست مدعا حضور والا کے گوش گزار کر دیا۔ کمشنر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ منع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے کہا' اگر معاملے میں پڑنے سے آپ کی ذات پر کوئی حرف آتا ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ کہنے لگے 'سید' تو پرامز' کوئی وعدہ نہیں۔ فائل یہیں چھوڑ جاؤ' ہم دیکھتے ہیں۔' میں نے واپس آ کے یہی بات لالہ سے بیان کر دی۔ ہفتہ بھی پورا نہیں گزرا ہوگا کہ ایک روز لالہ گھوڑے پر سوار' ڈھول تاشے کے ساتھ مٹھائی اور ہار پھولوں کے ٹوکروں سے لدے پھندے گھر وارد ہوئے' گلے سے لگا لیا۔ منہ چوما' کہنے لگے 'سید! تم نے تو کمال کر دیا۔ وہ بدذات جیوتی رام حویلی آ کے کاغذات واپس کر گیا' اور کہہ گیا کہ پیسے جب چاہیں' بھجوا دیں۔' میں نے بھی اسی وقت منیم جی اور وکیل کے ساتھ ہرکارے دوڑا کے رقم بھجوا دی اور رسید حاصل کر لی۔ دیکھا آپ نے' گورے بہادر کا اقبال' اللہ اللہ۔ گورے بات کم' کام زیادہ کرتے ہیں۔ اور صاحب' کرشمہ کرتے ہیں' کرشمہ۔ سارے میں اس واقعے سے ناچیز کی رسوائی ہو گئی۔ اس کے بعد نہ پوچھیے' یہاں کے افسران جو پہلے ہی کم مہربان نہ تھے' ان کی شیدائیت کا حال کیا بیان کروں۔ بس جناب' بھرم رہ گیا۔" سید صاحب نے قہوے کی پیالی خالی کر کے بھٹل سے کہا "اتنی سمع خراشی سے مراد بھی کہ جان پہچان بڑے کام آتی ہے۔ رکھنی پڑتی ہے سلام دعا' غرض اور بے غرضی' دونوں صورتوں میں۔ اس سے زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ شہر میں کہیں بھی اس عاجز کا نام لیجیے' اور...." سید صاحب کانوں پر ہاتھ رکھ کے خود کو سرزنش کرنے لگے "بڑے بول سے توبہ' اللہ مجھے معاف کرے۔"

بھٹل سنتا رہا اور قہوے کی چسکیاں لیتا رہا "کچھ جان کے ہی ہم بھی وارد ہوئے ہیں۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"یہ تو آپ کی محبت ہے جو اتنی عزت دے رہے ہیں۔"

"کوئی کیا دے سکتا ہے' یہ تو آدمی خود لیتا ہے۔"

"ہاں جناب! کیا اچھی بات کہی آپ نے' عزت ایسی سڑک پر پڑی تو نہیں مل جاتی۔"

"اور ذلت کا بھی تھوڑا یہی چکر ہے۔"

سید صاحب کا جسم تن سا گیا' زبان میں بھی لکنت آ گئی۔ "یقیناً' سب کچھ' سب کچھ آدمی کے اعمال پر موقوف ہے۔ عزت' ذلت دونوں اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہیں' اور عزت کی کمائی بڑی مشقت چاہتی ہے۔ ذلت کے لیے ایک غلطی بہت ہوتی ہے۔ آپ تو کتنی دل پر لگنے والی باتیں کرتے ہیں۔"

"پر دل ہی نہ ہو...."

"ہاں ہاں جناب!" سید صاحب سر ہلانے لگے "دل کا ہونا بھی لازم ہے۔ دل ہونے کا مطلب صاحب دل ہونا نہیں ہے۔ لگتا ہے' ہماری آپ کی خوب چھنے گی۔"

"دیکھو صاحب' آپ پچھتاتے ہو کہ نہیں۔" بھٹل مسکرایا۔

"نہیں' نہیں' میری طرف سے بے فکر رہیے۔ خوب گزرے گی۔ بس کل سے کام شروع' انشاء اللہ کوئی نگینہ قطعہ ہی ڈھونڈیں گے۔"

"دوری پہ ہو تو بھی چلے گا۔ دور آنے جانے کا مزا اور ہوتا ہے۔"

"بالکل' سفر کا اپنا ایک لطف ہے' میری زمین شہر میں ہے ہی کتنی' نہ ہونے کے برابر' بیشتر تو ادھر ادھر بکھری پڑی ہے۔"

"کچھ دام درم کی ضرورت بھی تو پڑے گی آپ کو' بولو تو رسی ڈوری کھینچیں۔"

"دام درم کس لیے؟" سید صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

"تھوڑا سا چارہ ڈالنے' بات پکی کرنے کو۔"

"یہاں زبان چلتی ہے' اور کہیں ضرورت پیش آئی تو اتنا تو یہ خادم بھی انتظام کر سکتا ہے' لیکن ایک بات طے سمجھیے' بات پکی کرنے سے پہلے ایک نظر آپ کا دیکھنا ضروری ہے اسی لیے گزارش کر رہا ہوں' ابھی آپ جانے کی جلدی نہ کیجیے۔"

"اپنی زبان کو ہماری زبان سمجھو۔"

"پھر بھی' دیکھیے روپے پیسے کا معاملہ ہے' اپنے اطمینان کے لیے مجھے آپ کی تصدیق کی ضرورت ہوگی۔ بہتر ہے' آپ بھی اچھی طرح دیکھ بھال لیں۔"

"ہم نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" سید صاحب زچ ہو کے بولے۔

"خدا میری عزت رکھے۔ میں کل ہی نکلتا ہوں مگر.... اس محفل کا کیا رہا؟"

"وہ آپ کی مرضی پہ ہے۔"

"کل تو ذرا مشکل ہے' پرسوں پر رکھیں؟"

بھٹل نے اقرار کیا' نہ انکار۔

"معاف کیجیے' آپ کی جلدی نے میرے ارادے منتشر کر دیے۔ خیال تھا' یار میاں چلتے پھرتے لگیں تو کسی روز شکار پر چلیں۔ مجھے یاد ہے' آپ نے شکار کا شوق ظاہر کیا تھا۔"

"پر صرف جانوروں کا۔"

سید صاحب ہلے تو سٹپٹائے' پھر ہنس کے بولے "جانوروں ہی کی بات کر رہا ہوں۔"

"کبھی انسان کا بھی کھیلا؟"

سید صاحب کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی "آپ نے کھیلا؟" ان کے لہجے میں واضح طور پر تلخی آ گئی۔

"ہاں صاحب' جب بھی موقع لگے' کھیلتے ہیں اور ہم ہی

کتابیات پبلی کیشنز

نے کیا کھیلا' جدھری دیکھو' کھیلا جاتا ہے۔ آدمی' آدمی کے پیچھے ہے۔ سب سے آسان شکار تو انسان کا ہوتا ہے۔ جال پھندے' ہتھیار کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسان تو سارے پالتو ہوتے ہیں' پالتو کا شکار آسان ہوتا ہے۔ برا تو نہیں مانے آپ؟"

"نہیں' نہیں۔" سید صاحب کے چہرے پر سکون کے آثار ہویدا ہوئے "آپ سے ملاقات میرے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔"

"ابھی تو شروع ہوئی ہے۔"

"اور' آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" سید صاحب کے قہقہے سے طعام گاہ گونج اٹھی "نشانہ کیسا ہے آپ کا؟" مضطربانہ انہوں نے پوچھا۔

"چوک بھی جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' کمال کا ہے۔"

"کام چل جاتا ہے' نشانے پر آنے والے سے بھی غلطی ہوجاتی ہے۔"

"ایسا لگتا ہے' آپ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔"

"پھر کیا ہیں؟"

"کچھ اور۔"

"کچھ اور کیا صاحب؟ بولو۔"

"ارے بھائی کیا' بہت زمانہ دیکھے ہوئے' گرم و سرد آشنا۔" وہ ہنچکچاتے ہوئے بولے۔

"اور لگتے کیا ہیں؟"

"لگتے! بہت اچھے لگتے ہیں۔" سید صاحب کتراتی ہوئی زبان سے بولے "سیدھے سادے' بھولے بھالے لگتے ہیں' اور کیا کہا جائے' آپ نے تو جناب بات پکڑلی۔"

دیواری گھڑی کے ڈائل کے وسط میں چھوٹا سا دروازہ کھلنے پر کھٹاک کی آواز آئی' دروازے سے انگشت بھر چڑیا جھپاک سے برآمد ہوئی اور سر خم کرکے چہکنے لگی۔ ٹھیک گیارہ مرتبہ وہ چہکی۔ سید صاحب چونک پڑے اور معذرت کرتے ہوئے تخت سے اٹھ گئے "وقت خاصا ہوگیا۔" انہوں نے متانت سے کہا "آپ بھی آرام کیجیے۔"

ہم دونوں بھی کھڑے ہوگئے۔

دروازے سے باہر نکلتے نکلتے سید صاحب کو خیال آیا "ارے بابر میاں! حد ہوگئی جناب! یاد ہی نہیں رہا کہ آپ نے تو ابھی تک کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔ کچھ کھائے بغیر نہ سوئیے گا' ہلکی غذا ضرور لیجیے یا پھل وغیرہ۔"

میں نے سر جھکالیا۔

نصیر بابا اور ابن دوسرے ملازموں کے ساتھ کمرے کے باہر مستعد کھڑے تھے' ہمیں دیکھ کے وہ ایک طرف ہوگئے۔ سید صاحب شب بخیر کہتے ہوئے زنان خانے کی طرف چلے گئے۔ ابن میرے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے بے حد فکر مند معلوم ہوتا تھا۔ بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔ ایسے میں بھوک لگتی بھی کیا۔ دماغ ہی حاضر نہ ہو یا جکڑا ہوا ہو تو سارا جسم پابند ہوجاتا ہے۔ کمرے میں آکے میں بستر پہ لیٹ گیا اور سب کچھ ذہن سے محو کردینے کی کوشش کرتا رہا لیکن سید محمود علی کا چہرہ بار بار آنکھوں میں گھومنے لگتا تھا۔ آدمی کی کتنی پرتیں ہوتی ہیں۔ کیسی دیدہ دلیری سے وہ باتیں کر رہا تھا اور بھٹل بھی کیسی ڈھٹائی سے سنتا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو گمان ہوتا تھا' جیسے نصیر بابا کو کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ عموماً اسی طرح کے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اگر یاسمن کو میں نے خود نہ دیکھ لیا تو شاید مشکل سے یقین آتا۔ طعام گاہ میں کئی بار سینے میں غبار اٹھا تھا کہ میں بھی سید سے کچھ کہوں مگر بھٹل کی طرح مجھے اپنی زبان اور لہجے پر قابو نہ رہ پاتا۔ اس کے سامنے تو بیٹھنا ہی مجھے دوبھر ہو رہا تھا۔ بہرحال بھٹل کی کٹ ججتی اور طول کلامی بے سبب نہیں تھی' اور کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے سر میں کیا تدبیریں سمائی ہوئی ہیں۔ یہ کوئی ایسا آسان کام تو نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے ہم نامعلوم عرصے تک بے اختیار ہوسکتے ہیں۔ بھٹل کو بھی اس کا خوب احساس ہوگا۔ مجھے کوئی کام نہیں تھا یا میرا وجود بھی تک محدود تھا لیکن بھٹل کی تو بڑی ذمے داریاں تھیں۔ اس کے نز بہت سے طلب گار تھے۔ ایک زریں ہی نہیں' اور بھی بہت سے' ایک میں بھی تو تھا۔

ابن میرے اردگرد منڈلا رہا تھا اور کسی اشارے کا منتظر تھا۔ نصیر بابا سے سارا ماجرا سن کے اب کسی ملازم کی طرف طبیعت راغب ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ ابن کو نظروں سے دور کرنے کے لیے میں نے تیار کھانوں کی بابت پوچھا اور مرغ کا سادہ شوربہ لانے کی ہدایت کی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ آگیا۔ طشت میں اور بھی چیزیں سمیٹ لایا تھا۔ میں نے اسے جلد ہی فارغ کردیا۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی' اس کے جاتے ہی نصیر بابا کمرے میں آگئے اور دروازہ بند کرکے بھٹل کے پلنگ کی پائنتی پہ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی' پھر بھٹل کی بدلی آواز گونجی "سویرے ہی ان کو تیاری کا بول دینا۔"

"کل' کل ہی۔۔۔؟" نصیر بابا سنسناتی آواز میں بولے "کل یا پرسوں' بولنا' گنے پاتے' کاغذ نشانیاں ساتھ رکھ لیں۔ زیادہ انبار نہیں' دو تین جوڑی کپڑے لاسکیں تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو ایسی ہی چلی آئیں۔"

"مگر وہ حرافہ جو ناگن کی طرح پھن پھیلائے بیٹھی ہے۔" نصیر بابا کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"دیکھ لیں گے اس کو بھی۔"

"ایک وہی نہیں' اور بھی سور کھانے والے پہرے پر ہیں۔"

"پتہ ہے۔" بھٹل نے تنک کے کہا "گھوڑا گاڑی میں تو دیری نہیں لگے گی؟"

"نہیں' آسانی سے مل جاتی ہے۔" نصیر بابا بھنچے ہوئے ہونٹوں سے بولے۔

"ابن یا ندرو کو باہر بھیج کر گاڑی بلوالینا' پوچھیں تو ہمارا بول دینا۔ تم کو ادھری رہنا ہے۔"

نصیر بابا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ جلدی جلدی سر ہلاتے رہے "اور' اور بیچ میں بڑے صاحب آگئے تو۔۔۔؟"

"ان کو کون روک سکتا ہے؟ آنے دو پھر۔۔۔"

"خدا خیر کرے۔" نصیر بابا کی آواز کانپ رہی تھی۔ "پولو تو ابھی نکل لیں پھر۔"

"نہیں نہیں' یہ مطلب نہیں' جو آپ نے سوچا ہے' وہی ٹھیک ہے۔ یہ اپنے ہاتھ پاؤں' دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں ہے۔"

"کھونٹے پر باندھ کے رکھو' تم کو دیکھ کے تو وہ آدھی ہوجائیں گی۔"

"بس اللہ ساتھ خیریت کے معاملے نمٹا دے۔ میں تو ساری زندگی شکرانے کے نفل پڑھتا رہوں گا۔" نصیر بابا بسکی بکی آواز میں بولے۔ پھر کچھ توقف کے بعد ہڑک اٹھے "اور اور دروازے پر بھی دو رستم سہراب ڈٹے ہوئے ہیں۔ ایک کے پاس دو نالی ہے' دوسرا لاٹھی لیے بھنکتا رہتا ہے۔"

"پڑھیں گے کوئی منتر بابا!"

"بعض دفعہ خیال آتا ہے' میں نے آپ کا رستہ بھی کھوٹا کیا' یہ یہاں کس چکر میں پھنسا دیا ہے۔ خدانخواستہ کچھ اونچ نیچ ہوجائے تو۔۔۔"

"اب تو پھندا ڈال ہی دیا ہے۔"

"مناسب سمجھیں تو کوئی اور وقت رکھ لیں' کچھ دنوں بعد ذرا اور دیکھ بھال کے۔۔۔"

بھٹل ہنکاری بھر کے حقہ پینے لگا۔ نصیر بابا بت بنے بیٹھے رہے۔ وقفے وقفے سے بھٹل کے حقے کی گڑگڑاہٹ کمرے میں گونجتی یا پھر نصیر بابا کی تیز سانسوں کی آواز' اور کمرے میں سناٹا چھا جاتا۔ گھڑی کی ٹک ٹک تو خاموشی کا جزو بن چکی تھی۔ روشنی کم کرکے نصیر بابا دبے پاؤں کمرے سے چلے گئے۔

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ بھٹل بھی دیر تک حقے سے شغل کرتا رہا۔ صبح' وہ حسب معمول جلدی اٹھ گیا تھا۔ نصیر بابا نے آٹھ بجے کے قریب بتایا کہ سید صاحب باہر جا رہے ہیں' انہیں بھٹل ہی کے کام سے باہر نکلنا ہے۔ آج بھی ناشتے میں وہ شریک نہیں ہوں گے' دوپہر کے کھانے پر بھی شاید ملاقات نہ ہوسکے۔ ہاں' اگر کوئی پیغام ہو تو بارہ بجے تک وہ گھری پر ہیں گے۔

بھٹل نے آنکھیں میچ لیں "ٹھیک ہے بابا!"

"اور ابھی ایک نئی بات ہوئی۔" نصیر بابا نے بھٹل کے اور قریب ہوکے سرگوشی کی "بڑے صاحب بولتے تھے کہ میں آپ دونوں پر ذرا نگاہ رکھوں۔ کہاں آتے جاتے ہیں' انہوں نے یہ بھی کہا کہ خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ کی جائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" نصیر بابا کا چہرہ جل بجھ رہا تھا۔

بھٹل سن کے چپ رہا' پر اس نے نصیر بابا کو تاکید کی کہ جیسے ہی سید صاحب باہر جائیں' اسے مطلع کردیا جائے۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر کشن آگیا۔ پورے ہفتے' کل پہلی بار دوا میں تواتر نہیں رہا تھا۔ رات کی خوراک کا تو ناغہ ہوگیا تھا لیکن طبیعت بہتر تھی۔ نبض دیکھ کے اور سینے پر آلہ رکھ کے ڈاکٹر مطمئن ہوگیا۔ آج اس کی آمد بہت گراں گزر رہی تھی۔ کل کی طرح بھٹل کے لیے ناشتا کمرے میں آچکا تھا۔ ڈاکٹر کشن نے آج پھلوں کے رس پر قناعت کی اور جلد ہی چلا گیا۔

میری نظریں گھڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی دس بجے' دیر نہیں ہوئی تھی کہ نصیر بابا بولائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور ہانپتی آواز میں بولے "وہ چلے گئے ہیں اور شام تک آنے کا کہہ گئے ہیں۔"

بھٹل نے انہیں تسلی سے بیٹھ جانے کو کہا اور چائے دانی سے چائے انڈیل کے اپنے لیے چائے بنائی۔ نصیر بابا کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا' ایک جاتا تھا "آج تو بدلی گھری ہے سارے میں۔" بھٹل نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں' لیکن گھرے گھرے بادل نہیں ہیں۔" نصیر بابا حواس باختگی سے بولے "اور کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا' کب چھلک پڑیں۔"

"ادھری دونوں کو بول دیا ہے؟"

کتابیات پبلی کیشنز

"ہاں ہاں' کہہ آیا ہوں' بڑی گھبرا رہی ہیں' بالکل پیلی پڑ گئی ہیں۔"

بچھل نے چائے نوشی اور حقہ کشی میں وقت صرف کر دیا' پھر کہیں گھڑی پر نظر ڈال کے کرسی سے اٹھا۔ گیارہ بجا چاہتے تھے۔ اتنی دیر میں ابن بھی آ گیا تھا۔ بچھل نے اسے تانگا لگانے اور بطور خاص عمارت کے اندر تانگا ٹھہرانے کی ہدایت کی۔

ابن نے فدویانہ انداز میں پوچھا "باہر جانے کا ارادہ ہے بابا؟؟"

"ہاں رے۔" بچھل نے ناگواری سے کہا۔

"دوپہر کا کھانا..."

"کھائیں گے رے ادھری لوٹ کے۔"

ابن چند لمحے متذبذب ہوا تھا مگر اس نے مزید کوئی صراحت نہیں چاہی اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی بچھل نے مجھے مخاطب کیا "تو بابا کے ساتھ اوپر جا کے دیکھ' خالی مت جانا۔"

اس کا اشارہ میں سمجھ گیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سنسناتی آواز میں کہا۔ بچھل کو مجھ سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جیسے ہی نصیر بابا کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا' میں نے جلدی سے اٹیچی کھولی۔ سیدھے بچھل کا کھٹکے والا یہ اصلی رام پوری چاقو لکھنؤ میں مجھے شمشاد خاں نے دیا تھا۔ دونوں باہر میرے منتظر تھے۔ بچھل وہیں ٹھہرا رہا۔ میں آہستہ قدموں نصیر بابا کے پیچھے پیچھے عقبی راستے کی طرف چل پڑا۔ ہمارا رخ زنان خانے کی طرف تھا۔

○☆○

دور ایک کیاری میں مالی پودوں کی تراش خراش کر رہا تھا۔ اس نے نصیر بابا کو سلام کیا' نصیر بابا نے بدحواسی سے ہاتھ اٹھا کے اس کے سلام کا جواب دیا اور وحشت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھیں میچ کے انہیں صبر و سکون کی تلقین کرنی چاہی۔ ان کا قابو میں رہنا پہلی شرط تھا۔ میں نے اپنی رفتار کچھ کم کی اور نرمی سے انہیں سمجھایا کہ زنان خانے میں داخل ہو کے انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ متذبذب انداز میں سر ہلاتے رہے اور اضطراب سے بولے "آخر' آخر رئیس بیگم نے کوئی حجت کی؟"

"تو تو پھر کیا ہو گا' مجھے ایسے ہی اندر جانا پڑے گا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"سوچ لو میاں۔" وہ سراسیمگی سے بولے "وہاں کوئی ایک تو نہیں ہے۔"

"آپ حوصلہ رکھیے' دیکھتے ہیں' کیا ہوتا ہے۔" میں نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن خود میری حالت ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اب واپس بھی نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ آنے والے لمحوں کے لیے میں خود کو استوار کرتا رہا۔ نصیر بابا کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ کبھی وہ ہڑبڑا کے پیچھے دیکھتے' کبھی دائیں بائیں' کبھی اوپر عمارت کے در و بام کی طرف۔ میں نے ان کی کمر پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ وہ گہری سانس بھر کے رہ گئے اور ہونٹ کاٹتے ہوئے کچھ فاصلہ اور کم کیا۔ زینے کے پاس آ کے ان کے قدم ٹھٹکنے لگے۔ میں نے زور سے ان کا ہاتھ تھام کے سیڑھیاں طے کرنے کا اشارہ کیا "آپ کا کام زیادہ نہیں ہے مگر اس مختصر عرصے میں آپ کو بہت احتیاط کرنی ہے' آگے سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔" میں نے سرگوشی میں ان سے کہا۔ ان کی پھٹی پھٹی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زینہ چڑھتے ہوئے وہ بالکل گم صم ہو گئے تھے۔ میں نے بھی دبے قدموں ان کی پیروی کی۔ اوپر دروازہ بند تھا۔ انہوں نے دھڑکتے ہاتھ سے کھٹ کھٹایا۔ میں ان کی آڑ میں ساکت کھڑا رہا۔ دروازہ بند نہیں تھا' تیسری بار ذرا تیز دباؤ سے کھل گیا۔ اوپر جا کے انہوں نے پلٹ کے ایک نظر مجھے دیکھا اور اوجھل ہو گئے۔ دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا رہ گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ واپس آنے میں انہیں دیر لگ سکتی ہے۔

یہ ایک روشن اور صاف ستھرا زینہ تھا۔ نہ اتنا کشادہ نہ اتنا تنگ۔ دونوں جانب سہارے کے لیے لکڑی کی بلیاں لگی ہوئی تھیں۔ میری ہدایت کے مطابق' اندر جا کے نصیر بابا کو کسی طرح رئیس بیگم کو دروازے تک لانا تھا۔ مجھے قطعاً توقع نہیں تھی کہ جو کچھ میں نے انہیں باور کرایا ہے' وہ اس اعتماد سے رئیس بیگم سے کہہ سکیں گے۔ ان کی حالت تو اندر جا کے اور ابتر ہو سکتی ہے۔ زبان کہیں لڑکھڑا نہ جائے۔ رئیس بیگم کسی بھی لہجے میں پڑ سکتی ہے۔ نصیر بابا ہی کے بقول' وہ اول درجے کی قطامہ ہے۔ حالانکہ شبہے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ شاید یہی بہتر تھا کہ نصیر بابا کے پیچھے میں بھی زنان خانے میں داخل ہو جاتا۔ میں نے رئیس بیگم کی شکل نہیں دیکھی تھی' ظاہر ہے' وہ خادماؤں سے مختلف کے ٹھسے کی عورت ہوگی۔ میں اسے فوراً پہچان لیتا مگر ضروری نہیں تھا کہ زنان خانے میں پہلے رئیس بیگم ہی سے واسطہ پڑتا' کوئی خادمہ بھی ہو سکتی تھی' خادمہ یا خادمائیں۔ نصیر بابا کے ساتھ ایک اجنبی مرد دیکھ کے ان میں سے کوئی بھی بوکھلا سکتی تھی۔

وہی ہوا' جس کا مجھے اندیشہ تھا' ابھی نصیر بابا کو گئے ہوئے چند ثانئے گزرے ہوں گے کہ تڑاق سے دروازہ کھلا اور ان کا زرد چہرہ دکھائی دیا "میاں' میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" وہ اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولے اور جھٹ دو سیڑھیاں اترے میرے پاس آ گئے۔

"یہ کیا بات ہوئی' پھر تو کچھ بھی نہیں ہوگا" آپ کا کام ہی کتنا ہے' اسے میرے پاس لانا ہے۔ باقی تو مجھے سنبھالنا ہے۔ جایئے جایئے' ذرا ہمت پکڑیے۔ یہ موقع نکل گیا تو جانے کب...."

"شاید مجھ سے... مجھ سے..." ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"کمال ہے' آپ عجیب آدمی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا' وہ دروازے پر نہیں آئے گی' نہ آئے۔ میں نے آپ سے کیا کہا ہے' میں اندر چلا جاؤں گا۔ اب سب کچھ طے ہو گیا ہے تو آپ... ادھر نیچے بابا انتظار کر رہے ہیں' تانگا بھی آ تا ہو گا۔ یہاں تک آ کے آپ بالکل الٹی بات کر رہے ہیں' کہاں تو اپنی جان' اپنے آپ کو داؤ پر لگا دینے کو..." میں نے برہمی سے کہا "آپ اوپر جاتے ہیں یا میں ہی جاؤں۔ ٹھیک ہے' آپ میرے پیچھے پیچھے آیئے۔ اتنا تو کر سکتے ہیں آپ کہ ان دونوں کو لے کے باہر چلے جائیں۔ اندر سب عورتیں ہیں اور کوئی' کوئی غلط کام کر رہے ہیں آپ..."

میری تلخی و تندی کا اثر ہوا۔ ان کے ڈھلکے ہوئے شانے سیدھے ہوئے' آنکھوں میں خاص قسم کی چمک ہویدا ہوئی۔ میں نے انہیں مزید تردد و تکدر کا موقع بھی نہیں دیا "جلدی کیجیے' اوپر سے کوئی بھی آ سکتا ہے۔ نیچے کا دروازہ بھی کھلا ہے۔ جایئے' جایئے۔" میں نے انہیں تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا۔ وہ پھر کچھ نہیں بولے۔ دو سیڑھیوں کے فاصلے پر دروازہ تھا۔ وہ دوبارہ اوپر چلے گئے اور اس بار انہوں نے پلٹ کے میری جانب نہیں دیکھا۔ انہوں نے دروازہ بھی بند کیا' کنڈی نہیں لگائی ورنہ آواز آتی۔

کئی منٹ گزر گئے' دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ انتظار کا یہ وقت کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا تاہم دیر ہو جانے کا مطلب تھا کہ اب کے نصیر بابا ایسے ہی واپس نہیں آئیں گے۔ میں پوری طرح مستعد کھڑا تھا۔ نیچے کھلے ہوئے دروازے پر بھی نگاہ رکھنی تھی۔ ادھر سے کوئی ملازم اوپر آ سکتا تھا لیکن اس سے نمٹنا ایسا مشکل نہیں تھا۔ یہی اچھا تھا کہ کسی کے اس طرف بھٹکنے سے پہلے میں اوپر چلا جاؤں۔ جانے کتنا وقت گزرا' دس منٹ یا اس سے زیادہ یا اس سے

کم۔ یکایک اوپر قدموں کی چاپ سے میرا جسم غیر شعوری طور پر اکڑ سا گیا۔ میرے سارے حواس دروازے پر مرکوز تھے۔ وہ نصیر بابا ہی تھے۔ دروازے کا پٹ کھول کے انہوں نے تنی ہوئی، جکڑی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا "میاں! بیگم شکریہ ادا کرتی ہیں، کہتی ہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مہمانوں کی خدمت سے ہمیں دلی خوشی ہوتی ہے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہوگا، سید صاحب واپس آجائیں، شام تک انتظار کرلیں۔"

میں نے نصیر بابا کو تاکید کی تھی کہ اندر جاتے ہی وہ رئیس بیگم کو میری آمد کی اطلاع دیں اور کہیں کہ صبح و شام اتنے دنوں تک اس کی اور زنان خانے کی خادماؤں کی مہمان نوازی پر ممنونیت کے اظہار کے لیے میں حاضر ہوا ہوں اور اپنی دلجمعی کے لیے کچھ نذرانے پیش کرنا چاہتا ہوں، انہیں قبول کیا جائے گا تو عزت افزائی ہوگی۔ میرا بار کچھ کم ہوگا۔ میری بیماری کے دوران مسلسل نگہداشت اور پرہیزی کھانوں کے اہتمام میں خادماؤں نے بڑی زحمت اٹھائی ہے۔ کوئی کسی اپنے ہی کے لیے اتنا کرسکتا ہے۔

رئیس بیگم کوئی عام عورت نہیں تھی، کوئی خانہ دار، روایتی عورت۔ اس کے ہاں عام عورتوں ایسا اکراہ و امتناع نہیں ہونا چاہیے تھا، مجلسی قسم کے ادب و آداب اسے بہت آتے ہوں گے۔ امید یہی تھی، یہ پیغام سن کے وہ ضرور متجسس ہوگی۔ ممکن ہے، جواب کے لیے خود دروازے پر آجائے یا اندر مہمانوں کے کسی کمرے میں مجھے بٹھانے کی ہدایت کرے اور خود ہم کلام ہو۔ کوئی بھی صورت ہو، مراد اسی قدر تھی کہ نصیر بابا اسے کسی طور مجھ سے نزدیک لے آئیں یا اس کے پاس مجھے لے جائیں۔ انہوں نے یہ پہلا مرحلہ سر کرلیا تھا۔ دروازے کے پٹ سے ان کا آدھا جسم باہر نکلا ہوا تھا۔ مجھے ان کی استقامت پر حیرت ہوئی۔ رئیس بیگم کو دیکھ کے ان کے سینے کا غبار متلاطم ہوا ہوگا۔ ان کے پُر تکلف لب و لہجے اور دروازے پر ترچھے کھڑے ہونے کے یہی معنی نکلتے تھے کہ رئیس بیگم ان کے قریب ہی کہیں ہے۔ میں نے ایک پل کی دیر نہیں کی۔ ادھر نصیر بابا نے ہاتھ اٹھا کے مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا، وہ فوراً دروازے سے ہٹ گئے۔ جیب سے چاقو نکال کے میں نے درمیان کا فاصلہ جست کے انداز میں طے کیا۔ دوسرے لمحے میں اندر تھا۔ وہ سازو سامان سے مرصع ایک چوڑی اور لمبی راہداری تھی۔ درمیان میں بھی ایسے راستے نکلتے تھے۔ دونوں اطراف منقش محرابوں کے پیچھے کچھ دوری پر کمرے بنے ہوئے تھے۔ جو عورت نصیر بابا سے گز بھر کے فاصلے پر کھڑی تھی، وہی رئیس بیگم ہو سکتی تھی، متوازن بدن کی ایک عورت۔ نہ اتنی فربہ نہ ایسی نازک اندام۔ قامت بھی متناسب، عمر چالیس کے لگ بھگ۔ ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ ہو۔ رنگت بادامی، چھوٹی گہری چمکیلی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے، کشیدہ بھویں، پتلے اور ترشے ہوئے ہونٹ، کانوں میں جھمکے آویزاں، گلے میں موتیوں کا ہار سجا ہوا، طلائی چوڑیوں سے بھری ہوئی کلائیاں، بالوں میں جوڑا، گول چہرے کے گداز میں نقش و نگار مدغم ہوگئے تھے۔ سلیقے کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سادگی پہننے کا سلیقہ ہر کسی کو نہیں آتا۔ گھر میں اور خصوصاً اس وقت لباس اور آرائش کا یہ تیور طبعی نفاست اور آسودہ تنی کا غماز تھا۔ کسی وقت نہایت دلکش ہوگی، لگتا تھا، وہ تو شاید اب بھی اسی گمان میں ہے۔ اس خوش گمانی کی آئینہ بھی تردید نہیں کرتا، آئینے میں ایک خوئے مروت بدرجہ اتم ہوتی ہے۔

اچانک مجھے سامنے دیکھ کے وہ بری طرح اچھل پڑی جیسے بچھو ڈنک مار جائے۔ آنکھیں پھیل گئیں، کھلے ہوئے منہ سے گھٹی ہوئی چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے جھپٹ کے اس کا اور اپنا درمیانی فاصلہ عبور کیا اور اس سے پہلے کہ وہ کسی طرف پناہ حاصل کرلے، اس کے منہ پر پنجہ کس دیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں کھلا چاقو دیکھ کے اس کا بدن پھڑ پھڑا کے رہ گیا۔ میرے پنجے کی گرفت سخت تھی "چپ چاپ کھڑی رہو۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔ اپنی آواز مجھ کو اجنبی لگی، بری لگی۔ میرے ہاتھ پاؤں ہی اینٹھ رہے تھے۔ کسی عورت کو قابو میں کرنے کا یہ دوسرا اتفاق تھا۔ اس نے تھوڑی سی مزاحمت کی۔ چاقو کی نوک اس کی گردن کے پاس تھی۔ اس کا بدن ڈھلک گیا۔ نصیر بابا کے دیدے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ چہرے کے رنگ بدل رہے تھے۔ میں نے جھڑکتی آواز میں انہیں ٹوکا "نزدیک کا کوئی کمرا کھول دو اور ان سب کو وہیں پہنچا دو، ایک ایک کو۔"

نصیر بابا ہڑبڑا کے ایک طرف دوڑ پڑے، پہلے ادھر ادھر منڈلائے پھر انہوں نے دائیں جانب کی محرابوں کے وسط میں قریب کا ایک کمرا کھول دیا۔

نیم جاں رئیس بیگم کا سینہ دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کی اور دبے لہجے میں کہا "دھیان سے سنو! تم سے مجھے کوئی غرض نہیں، جو میں کہتا ہوں، اس پر عمل کرتی رہو تو اپنے حق میں بہتر کروگی۔ تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچے گی۔ زنان خانے میں موجود ساری خادماؤں کو تمہیں چپ چاپ کمرے میں بیٹھے رہنے کا

ہے۔ فکر نہ کرو، مجھے یہاں ڈاکا نہیں ڈالنا، نہ کسی کو ختم کرنے کا ارادہ ہے۔ میرا کام کچھ اور ہے، اور مجھے زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔"

میں نے اس کے نرم ہونٹوں اور گالوں سے ہاتھ اٹھالیا۔ اس کی آنکھیں لوٹی جارہی تھیں۔ بدن پر رعشہ سا طاری تھا۔ ایسی ناگہانی سے اسے کہاں واسطہ پڑا ہوگا۔ جانے کیوں دوبارہ اس کا بدن چھونے سے مجھے جھجک ہو رہی تھی مگر پس و پیش کا محل نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ کو ترک کیے رہنا تھا۔ اپنی پسند و ناپسند، مرضی و منشا سے بیگانہ۔ ناچار اس کی بانہہ پکڑ کے میں اسے نصیر بابا کے کھولے ہوئے کمرے کی جانب لے آیا۔ اس نے ذرا بھی تامل نہیں کیا، کسی معمول کی طرح تعمیل کی۔ میں نے اس کا بازو آزاد کردیا۔

اوپر طول و عرض کے اس آراستہ و پیراستہ کمرے میں دونوں طرح کی نشست تھی۔ فرشی بھی، کرسیوں کی بھی۔ سامنے دیوار سے پیوست تخت پر قالین اور گاؤ تکیے، دونوں اطراف کی دیواروں کے ساتھ رکھی ہوئی قیمتی کرسیوں کے بیچ بیچ میں چینی کے بڑے گلدان، کھڑکیوں پر پھول دار ریشمی پردے، تخت سے اوپر اور کھڑکیوں کے درمیان خوش نما مناظر کی روغنی تصویریں۔ چھت سے جھولتے ہوئے فانوس سے لٹکے ہوئے شمع دان، جگہ جگہ دیواروں سے جڑے ہوئے۔ فرش کے وسط میں بھی قالین بچھا ہوا تھا۔ راہداری سے کھلنے والے دروازے سے ملحق دیواروں پر لکڑی کے بڑے جالی دار چوکھٹوں میں نصب آئینے آویزاں تھے۔ چھت کے کنارے کنارے کندہ کیے ہوئے گل بوٹوں کی پٹی کمرے کی سجاوٹ دو چند کرتی تھی۔ اچھا خاصا روشن کمرا تھا۔ چھوٹی موٹی محفلوں کے لیے موزوں تر۔ نصیر بابا نے سوچ سمجھ کے اس کا انتخاب کیا ہوگا۔ تخت کے برابر بھی ایک دروازہ تھا۔ نصیر بابا واپس جانا چاہتے تھے، یہ دروازہ اندر سے بند کروا کے ہی میں نے انہیں واپسی کی اجازت دی۔ ان کے جاتے ہی میں رئیس بیگم کو تخت تک لے آیا مگر یہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ دروازے سے سامنے کا تخت صاف نظر آتا تھا۔ آنے والا رئیس بیگم کو اس ناگفتہ بہ صورت حال سے دوچار دیکھ کر دروازے ہی سے لوٹ سکتا تھا۔ دوبارہ مجھے دروازے کے پاس آنا پڑا۔ رئیس بیگم کو سامنے کرکے اس کی آڑ میں کھڑے رہنے میں قباحتیں تھیں۔ یوں آنے والی خادماؤں کو کوئی بھی اشارہ کرنے کا موقع اسے مل سکتا تھا۔ اس کے پہلو میں کھڑے رہنا ہی میرے لیے بہتر تھا۔ اس اثنا میں وہ کسی قدر سنبھل چکی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ آنے والی خادماؤں کو وہ اتنی خستہ و شکستہ حالت میں نظر نہ آئے۔

راہداری میں لپکتے جھپکتے قدموں کی آہٹ پر میں سیدھا ہوگیا۔ دفعتاً تیزی سے دو خادمائیں اندر آئیں۔ ان کی نظر پہلے رئیس بیگم پر پڑی، پھر مجھ پر اور پھر میرے ہاتھ میں کھلے چاقو پر۔ ان پر جیسے بجلی گری۔ سسکاری بھر کے انہوں نے پلٹ جانا چاہا۔ دروازے پر نصیر بابا دیوار بنے ہوئے تھے "خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔" میں نے بظاہر گرجتی آواز میں کہا "کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو....." میں نے چاقو بلند کیا اور رئیس بیگم کی گردن کو نشانہ بنانے کا تاثر دیا۔

مگر میرے ٹھوکے سے رئیس بیگم کا سراپا زیر و زبر ہوگیا۔ وہ ہذیانی انداز میں بولی "ہاں ہاں، جیسا یہ کہتے ہیں، ویسا ہی کرو، ویسا ہی کرو۔"

دونوں لڑکیاں حواس باختگی سے میرے پاس آگئیں۔ میں نے انہیں دروازے کے دوسری جانب اپنے عین مقابل بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ ایک دوسرے سے چپکی کھڑی ہوئی، اپنے آدھے چہرے دوپٹوں سے چھپائے کرسیوں کے پاس ایک کونے میں دبک گئیں۔ دونوں بیس اکیس کے لگ بھگ ہوں گی۔ نقش و نگار سجل، ایک کا رنگ کھلتا ہوا چمپئی، دوسری کا سرمئی سرمئی تھا۔ دونوں تیکھی اور چھریری تھیں اور چوڑی دار پاجامے، کرتے اور دوپٹوں میں خاصی جاذب نظر لڑکیاں تھیں۔ ایک کا قد نکلتا ہوا تھا، دوسری کا کچھ دبا ہوا۔

تھوڑی دیر میں تین اور خادمائیں نصیر بابا کمرے کے زنداں کی طرف ہنکا کے لے آئے پھر تین اور، دو اور، اور ایک اور۔ نصیر بابا انہیں رئیس بیگم کے بارے میں کوئی ایسی وحشت اثر اطلاع پہنچاتے ہوں گے کہ وہ بولائی ہوئی تیز رفتاری سے کمرے میں داخل ہوتیں، اپنی جھونک میں کئی قدم اندر آنے کے بعد یکایک سامنے کا منظر ان کی بینائی خیرہ کرتا، وہ لڑکھڑاتیں، ان کی چیخیں بلند ہوتیں اور ایک دم ٹھٹھر جاتیں۔ اس ناقابل تصور واقعے سے گریز کے لیے ان کے قدم پلٹتے۔ دروازے پر نصیر بابا کی موجودگی انہیں اور بے حواس کرتی۔ ادھر میں، میرا چاقو اور رئیس بیگم ان کے پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ وہ کونوں میں ڈھیر ہو جاتیں۔ مجھے دوسری بار ان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ رئیس بیگم نے میری مشکل آسان کردی۔ ان کے داخل ہوتے ہی رئیس بیگم پہلی دو خادماؤں کی طرح انہیں بے حس و حرکت اس گوشے میں بیٹھے رہنے کی تاکید کرتی رہی جو میں نے تجویز کیا تھا۔ اس تاکید میں کرب بھی شامل تھا، یہ التجا آمیز بھی

تھی۔

نصیر بابا نہ ہوتے تو میرا کام یقیناً دشوار ہو جاتا مگر ناممکن نہیں تھا۔ کمرے میں آ کے بھاگنے کے لیے ایک جرات مطلوب تھی، جرات اور ہوش مندی دونوں۔ نصیر بابا دروازے پر فصیل بن کے ایستادہ نہ ہوتے تو ان خادماؤں کو دوسری طرح مجھے قابو میں کرنا پڑتا۔ دروازے سے میں بے حد قریب تھا۔ وہ ساری عورتیں تھیں اور ان میں بیشتر نوجوان اور ناپختہ کار لڑکیاں۔ وہ چھوٹی موٹی تو ایک دھمکی، ذرا سی اونچی آواز، ذرا سی دست درازی کی تاب نہ لا پاتیں۔ رئیس بیگم، ان کی ولی نعمت میرے حصار میں تھی، چاقو سے بڑا ہتھیار۔ رئیس بیگم پر ذرا سا دباؤ بڑھا کے انھیں پابند کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال وہ نوکر تھیں۔ نوکر کو ویسے ہی اطاعت واجب ہے، یہ خوبی نہ ہو تو کوئی نوکری کیوں ہو۔ چیخ و پکار کے سوا ان کی طرف سے کوئی اور خدشہ نہیں تھا۔ چیخ سے نصیر بابا دیوانے ہو جاتے۔ انھیں جلد از جلد زنان خانے کے مختلف حصوں سے ساری خادماؤں کو ترغیب دے کر اس کمرے میں جمع کرنا تھا اور باری باری، ٹکڑیوں ہی کی شکل میں اس صبر آزما وظیفے کی انجام دہی ممکن تھی۔ اول پہر تھا، ہر کوئی اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہوگی۔ کسی ایک جگہ ان کے اکٹھے ہونے کا امکان نہیں تھا۔ آخر میں ایک بوڑھی عورت کو پہنچانے کے بعد نصیر بابا نے سر کی جنبش سے مجھے مطمئن کیا کہ اب زنان خانے میں کوئی اور باقی نہیں رہ گیا۔ باہر نکل کے انھوں نے احتیاطاً دروازہ بھی بند کر دیا۔

ان کی تعداد گیارہ تھی۔ گھر میں ایک مرد سید صاحب، تین خواتین، فروزاں، یاسمن اور رئیس بیگم کی خدمت گزاری کے لیے یہ تعداد حیران کن تھی اور ضروری نہیں تھا کہ ان کی یہی نفری ہو۔ عمارت کے عقبی سبزہ زار کے ایک حصے میں ملازموں کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ہو سکتا تھا، ابھی کچھ اور اپنے گھروں میں موجود ہوں۔ کام کے اوقات بھی تو مقرر ہوں گے۔ اطاعت گزاروں کی کثرت سے مراد اظہار امارت ہے۔ اظہار کے بغیر امارت بے لطف رہتی ہے۔ جتنے زیادہ خدمت گار، اتنا بڑا آقا، اتنا بڑا بادشاہ۔ بڑے گھر میں سب سے سستے ملازم ہوتے ہیں۔ بڑے گھر کا ساز و سامان زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور سید صاحب کے گھر میں مخدوموں کی تعداد کتنی ہی کم ہو، مہمان خانہ تو ہر وقت آباد رہتا تھا۔ ملازموں کی وہاں بھی ضرورت پڑتی تھی۔ مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کے لیے کھانا زنان خانے میں تیار ہوتا تھا۔ سید صاحب کو بزم آرائی کا بھی بڑا شوق تھا۔

کمرے میں موجود خادماؤں میں ایک سن رسیدہ، دو ادھیڑ عورتوں، گیارہ بارہ سال کی ایک بچی کے سوا باقی ساری نوجوان لڑکیاں تھیں، آگے پیچھے کی عمروں کی۔ تمام کی تمام قاعدے قرینے کا سادہ و شوخ لباس پہنے ہوئے تھیں۔ انھیں منتخب کرتے وقت لگتا تھا، شکل و صورت کی دلربائی، نقش و نگار کی رعنائی اور قالب و قامت کی زیبائی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ خوش خرامی و خوش کلامی پر بھی توجہ دی گئی ہوگی۔ رئیس بیگم ان کی نگراں تھی، معلم بھی ہوگی۔ اسے بہت سے آداب آتے تھے، ہر طرح کے آداب۔ ان سب کے چہروں پر ترو تازگی و شادابی تھی۔ سب نئی نئی معلوم ہوتی تھیں، تازہ تازہ۔ ریشم، شیشہ، پھول، زرنگار در و بام اور آرائش و زیبائش کی دیگر چیزوں کی طرح خوش جمال مکین بھی گھر کی زیب و زینت اور فزوں کرتے ہیں۔ وہ کسی حسن کار سنگ تراش کے تراشیدہ مجسموں کی طرح تھیں، چلتے پھرتے مجسمے۔ ان میں سے دو تین خادمائیں میں نے مہمان خانے میں دیکھی تھیں۔

کمرے پر سناٹا چھایا تھا۔ نصیر بابا کو گئے ہوئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کرسی کھسکا کے آگے کی اور رئیس بیگم سے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ اس نے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں اور ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا، چند لمحے توقف کیا، میری پیشکش کی تصدیق کے لیے شاید، پھر وہ جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جیسے کوئی بہت دور سے دھوپ میں ہانپتا کانپتا چل کے آیا ہو اور اسے سایہ مل جائے، کچھ یہی حال اس کا ہوا۔ اس نے ساری کے پلو سے، ڈھک لیا اور اپنے مقابل بیٹھی خادماؤں کی طرح آدھا چہرہ ڈھانپ لیا۔ میں بھی کرسی سنبھال سکتا تھا۔ میرے سامنے سب کی سب بے بسی و بے چارگی کی حالت سے دوچار عورتیں تھیں۔ عورت اور مرد کی مٹی میں ضرور کوئی فرق ہوتا ہے۔ عورتیں کسی اور مٹی کی بنی ہوتی ہیں۔ یہ محض مردوں کا فرسودہ اور چوں کہ ایک طرفہ ہے اس لیے مستند نہیں۔ کہیں بھی طے نہیں ہوا کہ جسمانی طور پر عاجز عورتیں ذہنی طور پر بھی لاغر ہوتی ہیں۔ مجھے محتاط ہی رہنا چاہیے تھا۔ ان میں ایک باراں دیدہ رئیس بیگم بھی تھی۔ میں نے پہلے ہی کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ بھاری گل دانوں کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے اشتعال کے لیے کام کر سکے۔ میرا چاقو گو اب رئیس بیگم سے دور تھا مگر ہتھیار گل دانوں کے مساوی ہوتا ہے، اس کی اپنی ایک کرشمہ کاری ہے۔ ان کی مالکن تو میرے ہتھیار کی زد پر تھی۔

نصیر بابا نے بتایا تھا، گزشتہ رات انھوں نے فروزاں اور یاسمن کو آج کے لیے تیار رہنے کی نوید دے دی تھی۔ ساری رات دونوں بہنوں نے بے کلی میں گزاری ہوگی۔ نیند بھی کیا آئی ہوگی۔ خادماؤں کی موجودگی میں، معلوم نہیں، وہ ضروری کپڑے، زیور اور دیگر چیزیں کس قدر سمیٹ پائی ہوں۔ اس کا موقع تو انھیں اب ملا ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ چند ہی چیزوں پر اکتفا کریں۔ نصیر بابا انھیں زیادہ مہلت بھی نہیں دیں گے۔ سب پر خاک ڈالیں۔ اتنا بہت ہے کہ بہ سلامت یہاں سے نجات پانے کی کوئی سبیل نکل آئی ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ رئیس بیگم کے پاس پہنچنے اور اسے میرے قریب لانے سے پہلے نصیر بابا، فروزاں اور یاسمن کے پاس ہو کر آئے تھے یا نہیں۔ رئیس بیگم کو میری تحویل میں دینے کے بعد دو خادماؤں کو یہاں لانے کے لیے کئی بار عمارت کے اندرونی حصے میں گئے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے فروزاں اور یاسمن کو آگاہ کر دیا ہے تو اب تک دونوں کو اپنا مختصر سامان اٹھا کر کے تیار ہو جانا چاہیے۔ نصیر بابا نے اگر اس سارے کام سے فراغت کے بعد ان سے رابطہ کیا ہے تو بڑی نادانی کی ہے۔ مجھے بھی اپنی کشاکش میں خیال نہیں رہا کہ ان سے کہہ سکتا، جس وقت وہ نچلی منزل پر جانے کے لیے کمربستہ ہوں، مجھے بھی مطلع کرتے جائیں تاکہ میں کچھ دیر بعد اسیر خادماؤں کو آزاد کر سکوں۔ اسیر صرف وہی نہیں، میں ان سے کہیں زیادہ یہ عذاب بھگت رہا ہوں۔ کاش نصیر بابا کو زنان خانے سے رخصت ہوتے وقت میری طرف آنے اور مجھے اس اذیت سے نجات دلانے کا خیال آ جائے۔ وہ سیدھے چلے گئے تو مجھے پھر کتنی دیر یہاں ٹھہرے رہنا ہوگا۔ مزید پندرہ منٹ یا گھنٹا۔ اس سے زیادہ وقت فروزاں اور یاسمن کو نیچے لے جانے میں نصیر بابا کو صرف نہیں کرنا چاہیے۔ نچلی منزل پر بچھل ان کا منتظر ہوگا۔ تانگا بھی آ چکا ہوگا۔ ابن کہتا تھا، تانگا قریب ہی مل جاتا ہے۔ مجھے پھر زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ اس دوران کوئی بھی زنان خانے کا رخ کر سکتا ہے۔ فروزاں اور یاسمن کو لے جانے کے بعد نصیر بابا زنان خانے کا خاص دروازہ کھلا ہی رہنے دیں گے۔ دوسری جانب، عقبی سبزہ زار کے جس راستے سے میں اور نصیر بابا یہاں داخل ہوئے تھے، وہ بھی کھلا ہوا ہے۔

مگر میرا کیا ہے! میں تو آنے والے یا آنے والوں سے بھی نمٹ لوں گا، میرا وہ کیا کر لیں گے۔ سارا معاملہ تو فروزاں اور یاسمن کا ہے۔ وہ کسی طور اس چار دیواری سے دور ہو جائیں۔ رئیس بیگم اور ان حیران و پریشان خادماؤں کو پابند کرنے کا مرحلہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا نچلی منزل پر اتنے لوگوں کے درمیان سے فروزاں اور یاسمن کو بہ عافیت باہر نکال لے جانے کا ہے۔ سید صاحب کی عدم موجودگی میں، بچھل اور نصیر بابا کی معیت میں زنان خانے سے دو عورتیں تانگے میں باہر جا رہی ہیں، کہاں جا رہی ہیں؟ تانگے میں فروزاں اور یاسمن کے ساتھ صرف نصیر بابا ہوتے تو یہ واقعہ اتنا تجسس انگیز نہ ہوتا۔ ظاہر ہے، زنان خانے کی خواتین کبھی نہ کبھی باہر بھی جاتی ہوں گی اور ان کے ساتھ کوئی مرد ملازم بھی ضرور ہوتا ہوگا۔ فروزاں اور یاسمن کے ساتھ گھر کے سب سے پرانے نمک خوار، وفا شعار، سید صاحب کے معتمد خاص نصیر بابا ہیں۔ بے شک مختصر سامان بھی ان کے پہلو میں ہے لیکن یہ سامان یقیناً اتنا کثیر نہیں ہوگا کہ کسی قسم کا شک نمو پا سکے۔ ہاں، تانگے میں بچھل کی ہمراہی ملازمین کے لیے کشاکش اور تردد کا باعث ہو سکتی ہے۔ نصیر بابا کے گداز کے لیے بچھل کی رفاقت بھی ضروری ہے۔ دور کسی محفوظ مقام پر پہنچنے تک نصیر بابا کو بچھل کی سپر، اس کی دیوار چاہیے۔ فروزاں اور یاسمن برقع میں روپوش ہوں گی۔ ملازم انھیں پہچان تو نہیں پائیں گے مگر حیوانوں اور انسانوں کی فوقیت کا کوئی ایک سبب تو نہیں ہے۔ وہم و گمان آدمی کا طرۂ امتیاز ہے۔ کسی کے بھی دماغ میں کانٹا چبھ سکتا ہے۔ کانٹے تو یوں بھی خود رو ہوتے ہیں۔

عمارت کے بڑے دروازے پر دو دربان تعینات ہیں، ان میں ایک مسلح بھی ہے۔ ابن، نذرو، بشارت اور کئی دیگر ملازم نچلی منزل میں منڈلاتے رہتے ہیں۔ لازم نہیں کہ بچھل کو کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے، کوئی بھی عین وقت پر رخنہ انداز ہو سکتا ہے۔ بچھل کو ان مزاحمتوں اور مدافعتوں کا اچھی طرح احساس ہوگا اور اس نے تمام عواقب و نتائج، ہر پہلو پر خوب سوچ سمجھ ہی کے یہ عزم کیا ہوگا۔ گھر کے سارے ملازم سات آٹھ دنوں میں بچھل سے خاصے مانوس ہو چکے ہیں۔ برملا کہتے ہیں، پہلے ایسا کوئی صاحب دل مہمان یہاں نہیں آیا ہے۔ بچھل نے درپردہ ان کا خیال بھی بہت رکھا ہے۔ ہر ایک کو اس کی خدمت سے بڑھ کے نوازا ہے۔ بچھل پر انگلی اٹھاتے ہوئے، ان کے رگ و پے میں بڑی اینٹھن ہوگی۔ مروت سے بڑی زنجیر نہیں ہوتی۔ سب ہی بچھل کا ورد کرتے ہیں۔ اس کے سامنے سر اٹھانے اور زبان کھولنے کی جرات مشکل سے ہونی چاہیے لیکن یہ حقیقت بھی بچھل کے ذہن سے اوجھل نہ ہوگی، اس نے انھیں اتنا نمک نہیں کھلایا ہے، جتنے وہ سید صاحب کے نمک آشنا ہیں۔ اگر واقعی کسی کا دماغ پھر گیا تو

مجبوراً بھٹل کو دوسرا طریقہ یا اپنا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ نوبت نہ آئے تو اچھا ہے ورنہ بات بہت بگڑ جائے گی اور دور بھی چلی جائے گی۔

میرا دماغ پراگندہ ہو رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے سر میں بھن بھنا رہے تھے۔ شک کرنے کا کوئی ایسا جواز تو نہیں ہے۔ تانگے میں دو خواتین اور نصیر بابا کے ساتھ بھٹل کی ہم نشینی کے کوئی بھی معنی لیے جا سکتے ہیں۔ سنا ہے' دل اور آنکھوں کا گہرا تعلق ہے۔ دل صاف نہ ہو تو بینائی بھی آلودہ ہو جاتی ہے۔ بھٹل کے لیے ان کے دل میں یوں کوئی آلودگی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تاثر بھی قائم کیا جا سکتا ہے کہ جس طرف نصیر بابا اور دونوں خواتین کا قصد ہے' اتفاق سے وہی راستہ بھٹل کو بھی مقصود ہے۔ میں بھی تو بھٹل کے ہم راہ نہیں ہوں۔ ان کی دانست میں مجھے اس وقت مہمان خانے میں واقع اپنے کمرے میں ہونا چاہیے۔ ہمارا سامان بھی یہیں رکھا ہوا ہے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی گھر میں موجودگی دوسرے کی واپسی کی ضمانت ہے۔

رئیس بیگم اور اس کی حاشیہ بردار خادمائیں مسلسل میری نگاہوں کی گرفت میں تھیں لیکن آدمی کی صرف دو آنکھیں نہیں ہوتیں۔ زنان خانے کے اس کمرے میں میرا وجود ایک سراب کی مانند تھا۔ میں تو نچلی منزل پر بھٹک رہا تھا۔ میں تو جانے کہاں کہاں بکھرا ہوا تھا۔ یکایک اس خیال نے مجھے اور متلاطم کیا کہ تانگا طلب کرنے کا حکم تو بھٹل نے دیا تھا۔ اس نے ابن کو خاص طور سے عمارت کے اندر تانگا ٹھہرانے کی ہدایت کی تھی۔ ابن نے فدویانہ انداز میں استفسار کیا تھا کہ کیا دوپہر کھانے کے وقت تک بھٹل کی واپسی ممکن ہو جائے گی۔ بھٹل نے سرسری سہی مگر جواب اقرار میں دیا تھا۔ بھٹل کے اچٹتے لہجے سے ابن کسی قدر متذبذب ہوا تھا اور ایک اچھے اطاعت شعار کا جو وتیرہ ہوتا ہے' اس نے خاموشی کو ترجیح دی تھی۔ گویا زنان خانے سے دو خواتین کے باہر جانے کے معاملے میں کسی نہ کسی طرح بھٹل کی منشا شامل ہے۔ آج تک زنان خانے سے بھٹل کے کسی رابطہ ضبط کا کوئی شاہد نہیں تھا پھر اچانک یہ رسم و راہ کس طرح صورت پذیر ہوئی؟ اب جو کچھ بھی ہو۔ میں نے خود کو مجتمع رکھنے کی کوشش کی۔ جب سامنے کا صاف نظر نہ آتا ہو تو آدمی کو پلکیں بھینچ لینا چاہیے۔

نصیر بابا کو گئے ہوئے دس منٹ کے قریب ہو چکے ہوں گے۔ مجھے کچھ دیر اور یہاں ٹھہرے رہنا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہو۔ میری جانب سے تو شاید کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ رئیس بیگم سر جھکائے گم گم بیٹھی تھی۔ سامنے ایک دوسرے میں پیوست خاداؤں کی سراسیمگی کا وہی عالم تھا۔ کسی کی نظریں کبھی مجھ سے چار ہو جاتیں تو اس کا سراپا بری طرح لرز جاتا' وہ اپنے آپ میں اور سمٹ جاتی۔ اب انہیں بڑی حد تک اس جبر و بندش کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ فروزاں اور یاسمن کی تخصیص سے انہیں کھٹک جانا چاہیے۔ فروزاں اور یاسمن کہیں چھپ تو نہیں گئی ہوں گی۔ نصیر بابا کو انہیں یہاں لانا ہوتا تو اتنی دیر نہ لگتی اب تک وہ یہاں آچکی ہوتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ رئیس بیگم اور خاداؤں کا یہ شبہ پختہ ہو رہا ہوگا کہ ان کی اسیری کا سلسلہ فروزاں اور یاسمن سے وابستہ ہے۔ ممکن ہے' فروزاں اور یاسمن کا فرار ان کے تصور سے بعید ہو۔ اس کے بجائے کچھ اور خدشے در آئے ہوں' کچھ مذموم و مکروہ اندیشے۔ آدمی کا دماغ بہت بے مہار ہوتا ہے اور ایسی صورت میں تو اور بھی بے سمت' بے کنار۔ آئینے پر دھند جمی ہو تو شکلیں کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں۔ ان کے علم میں ہے کہ زنان خانے میں ایک اور مہمان' میرا ساتھی اور ملازم بھٹل بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کی نظر میں اسے سرغنہ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ ہو سکتا ہے' ہر طرف سے آسودہ ہو کے بعد میں وہ بھی نصیر بابا کی اعانت سے زنان خانے میں داخل ہو چکا ہو اور... اندھیرے میں کیا کچھ ہوتا ہے' اختیار چھن جاتا ہے۔ اندھیرے میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ بہرحال کچھ اور دیر کی بات ہے۔ کچھ دیر میں ان کی یہ دھند چھٹ جائے گی اور انہیں اپنے ذہنی فشار' اعصابی ابتری سے نجات مل جائے گی۔

زنان خانے سے میرے جانے کے بعد ان پر سکتہ و سکوت طاری نہیں رہے گا۔ وہ بلکتی اور بلبلاتی ہوئی سب سے پہلے فروزاں اور یاسمن کی خلوت گاہ پر یورش کریں گی اور عمارت کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں گی۔ کوئی نچلی منزل کی طرف دوڑے گی اور ملازموں کو اس سانحے کی خبر دے گی اور ملازم جب فروزاں اور یاسمن کی روانگی کا احوال گوش گزار کریں گے تو سارے میں کھلبلی مچ جائے گی۔ ایک جانب نصیر بابا کے تانگے کے پیچھے' دوسری جانب بڑے صاحب کی تلاش میں ہرکارے دوڑائیں گی پھر میرے لیے کیا مناسب ہے؟ دانائی شاید اسی میں ہے کہ میں تادیر یہیں رہوں اور انہیں اپنی نظروں کے حصار میں محبوس رکھوں۔ اس طرح بھٹل اور نصیر بابا کو زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کا موقع مل جائے گا۔ ہرچند یہاں زیادہ دیر ٹھہرے رہنے سے کسی دخل اندازی کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں۔ عمارت

ہے۔ بھٹل اور نصیر بابا کے نکل جانے کے بعد بچھڑتی بڈی کا کوئی مخلص خاطر جمع رکھنے کے لیے یا اس دوران میں یوں ہی اپنے کسی معمول کے مطابق زنان خانے کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ دروازہ کھلا ہے اور کوئی آواز' جھنکار بھی نہیں ہے۔ خالی کمرے سونگھتا ہوا وہ بے قرار اس کمرے تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ وہ سب کے سب تو یہاں نہیں آسکتے۔ زنان خانے میں ہر ملازم کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی۔ نصیر بابا کے علاوہ ایک دو ہی اصیل اس رتبے سے نوازے گئے ہوں گے۔ کسی کے اچانک آجانے کی افتاد کے تو ہمہ جاں' ہمہ دم تیار تھا۔ یہ بڑا نازک لمحہ ہوگا تاہم دروازے سے قریب رہنے کی حکمت یہی تھی کہ کسی آہٹ یا دستک پر' ممکن ہو تو از خود دروازہ کھول سکوں اور کوئی ایسا حربہ آزمایا جائے کہ آنے والے کو ہوش و حواس بحال رکھنے کی مہلت نہ مل سکے اور وہاں نچلی منزل پر تعینات ملازم بھی مہمان خانے میں مجھے ایک نظر دیکھ کر تسلی کرنا ضرور چاہیں گے۔ مجھے وہاں نہ پا کر ان کے ماتھے ٹھنکیں گے اور کمرے میں ہمارا سامان جوں کا توں دیکھ کے ان کے اضطراب کا پارا اتنا بلند نہیں ہوگا لیکن انہیں پورا سراغ حاصل کیے بغیر سکون نہیں آئے گا۔ اچھا یہی ہے کہ بھٹل جلد سے جلد واپس آجائے۔ اس کی جلد واپسی سے بہت کچھ سنبھل جائے گا' سنبھلے گا نہیں تو ایسا شدید بھی نہیں ہوگا۔

رئیس بیگم کی آواز پر میں چونک پڑا۔ پہلے تو مجھے اپنے کانوں پر کسی واہمے کا گمان ہوا۔ وہ مجھی سے مخاطب تھی۔ کسی دور اندیش مخبر کی طرح اس نے اتنی دیر میں خود کو ہموار کر لیا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد یہ حوصلہ بیدار ہوتا ہے۔ اس کے شائستہ لہجے میں نہایت عاجزی تھی۔ کہنے لگی "بندی جان سکتی ہے کہ ہم نے کیا قصور کیا ہے' یہ ہمیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟"

میرے ہونٹوں پر زہر پھیل گیا۔ جی میں آیا' زور سے ایک طمانچہ مار کر کسی کو شکل دکھانے کے لائق نہ رہے۔ وہ قطامہ اپنا قصور پوچھ رہی تھی۔ میں بل کھا کے رہ گیا۔ یہ وقت فرد جرم عائد کرنے اور جرح بازی کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے بھینچے ہوئے ہونٹوں سے کہا "سب معلوم ہو جائے گا' تھوڑی دیر میں۔"

اس نے پھر کچھ نہیں کہا' پھر چند لمحوں بعد ناتوانی سے بولی "بندی کا حلق خشک ہو رہا ہے' کچھ پانی اگر..."

"پانی یہاں کہاں ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ وہ چاروں طرف دیدے گھما کے رہ گئی۔ بے چارگی و بے بسی کی تمام علامتیں اس کے چہرے پر سمٹ آئیں۔ میں اسے پانی کہاں سے فراہم کرتا۔ وہ کیا ستم ظریفانہ مطالبہ کر رہی تھی "بندی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دوا جاری ہے۔" وہ اکھڑی زبان سے بولی۔

مجھے معلوم تھا' وہ حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔ مجھے پہلے ہی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہیے تھا۔ میرے جواب سے اس کی ہمت سوا ہو رہی تھی۔ ابھی زبان کھلی ہے' بعد میں ہاتھ پیر بھی کھلنے لگیں گے۔ نصیر بابا کی زبانی اس کی شیشہ بازی سے مجھے آگاہی نہ ہوئی ہوتی تو بڑی وحشت ہوتی۔ وہ سارے واقعات رات بھر میری آنکھوں میں گھومتے رہے۔ میرا بس چلتا تو اسی وقت زنان خانے کی سیڑھیاں پھلانگ کے اس کے سر پہ جا پہنچتا' رات بھر میرا خون جلتا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اس سے کیا سلوک کروں۔ اس سے پہلے ایسی دو عورتوں سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ ایک وہ بدکار نسترن تھی۔ اس کمینی نے کورا کو مجھ سے جدا کرنے کے لیے جال پھیلایا تھا۔ سات سال بعد جب میں جیل سے لوٹا تو اتفاق سے دوبارہ وہ مجھے ریل کے ڈبے میں نظر آگئی۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی۔ اس بار اس کے ساتھ خوش نما زریں تھی۔ لگتا تھا' خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔ زریں کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ نسترن سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ نسترن کو میں چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیتا' زریں کے خیال نے میرے ہاتھ باندھے رکھے۔ بعد میں بس مجھے نسترن کے چنگل سے زریں کو چھڑا لینے کا وقت ہی مل سکا۔ نسترن جانے اب کہاں ہو؟ خدا اسے غارت کرے۔ کاش وہ ایک بار اور ٹکرا جائے پھر چمپا بیگم کے لیے بھی میرے سینے میں ایسی ہی آگ بھڑکی تھی۔ اس نے نی کو بالا خانے پر بٹھا دیا تھا۔ چمپا بیگم نے اپنی زندگی کا طور ہی بدل لیا۔ اس نے اپنا سب کچھ ترک کر دیا۔ پیچھے مڑ کے ہی نہیں دیکھا۔ وہ تو سراپا توبہ بن گئی' ایک مسلسل پشیمانی اور عجز و انکسار' اظہار ندامت کے لیے اس نے میرا تعاقب جاری رکھا' جاری رکھے ہوئے ہے۔ کون یقین کرے گا کہ جو عورت' نی کو بالا خانے تک لے گئی تھی' وہی اب نی کے گھر میں اس کی بہنوں کے ساتھ رہتی ہے۔ چمپا بیگم تو بالکل پگھل گئی تھی۔ اس کے اندر اتنی سیاہی نہیں بسی تھی' کوئی کرن ضرور چھپی تھی اور اسے بس کسی کا انتظار تھا۔ مجھے معلوم تھا' اس عورت رئیس بیگم کا سرشت میں کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ پیسے کے بغیر کتنے لوگ یوں گھروں' گلیوں اور بازاروں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ سب ان کے ختم ہو جانے اور ختم

کرونے کی آرزو کرتے ہیں اور دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہر کوئی چمپا بیگم نہیں ہوتا۔ جو نہیں ہوپاتا' پھر اسے برتنا بھی دوسرے طریقے سے چاہیے۔

آدھے گھنٹے کے قریب وقت ہو چکا ہوگا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن میں تو ایک ایک پل گن رہا تھا۔ مجھ پر تو یہ عرصہ مہینوں اور برسوں کی طرح گزرا تھا۔ رئیس بیگم اور خادماؤں سے زیادہ خوار تو میں خود تھا۔ اس کے بدلے مجھل میرے ذمے کوئی اور کام لگا دیتا تو ایسی بیزاری اور وحشت نہ ہوتی۔ میں کچھ بھی طے نہ کر سکا کہ مجھے اور کتنی دیر یہاں ٹھہرے رہنا ہے۔ مجھل اور نصیر بابا اب تک خاصی دور جا چکے ہوں گے۔ عمارت سے باہر نکلنے میں انہیں ناکامی ہوتی تو نصیر بابا مجھے اس محبس سے رہائی دلانے کسی طرح لوٹ کے ضرور آتے۔ یہ وقت تو بہرحال جیسے تیسے گزر گیا ہے' باقی بھی گزر جائے گا' آگے بھی کیا ہوگا' آگے کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سے میرے جاتے ہی ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ زنان خانے سے بلند ہونے والے شور سے نچلی منزل کے ملازم سرگرم ہو جائیں گے۔ میں تو مہمان خانے ہی میں ہوں گا۔ وہ مجھے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ ابتدا ہی میں مجھے ان سے دو ٹوک بات کرنی ہوگی۔ انہیں باور کرانا ہوگا کہ میں یہیں موجود ہوں اور مجھل بھی واپس آ رہا ہے۔ مجھل کی واپسی تک مجھ سے کوئی سوال جواب نہ کیا جائے۔ کمرے میں جاتے ہی احتیاطاً مجھے منجھا سامان سے نکالنا ہوگا۔ شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ اب ان سے مراسم کی نوعیت یکسر مختلف ہوگی۔ ان کی نگاہیں بدلی ہوئی ہوں گی۔ وہ مجھ سے خوف زدہ بھی ہوں گے اور مجھے نظروں سے دور بھی نہیں رکھیں گے' اگر اس دوران میں بھولے بھٹکے سید صاحب گھر آ گئے یا انہیں ڈھنڈوا کے بلوا لیا گیا تو ان کا قہر و غضب بے پناہ ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے' وہ پولیس طلب کر لیں۔ مجھل کی واپسی تک مجھے بہت صبر و تحمل کرنا ہوگا۔ مجھل کو بھی میری وجہ سے جلد واپسی کی فکر ہوگی۔ مجھے اس سے کچھ پوچھنے' سمجھنے اور بوجھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اس نے کہا اور میں چل پڑا۔ میری طرح اسے بھی کچھ کر گزرنے کی بے چینی ہوگی جو اس نے آگے پیچھے کا مجھے کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا' غالباً دانستہ۔ اس نے باقی مجھ پر چھوڑ دیا تھا کہ پیش آنے والے نشیب و فراز کے مطابق میں خود ہی فیصلے کرتا رہوں۔ احکام سے آدمی پابند ہو جاتا ہے۔ اس نے ایسی ہدایتیں جاری کرنا عرصے سے بند کر دیا تھا۔ لکھنؤ میں رجن کا سامنا کرتے ہوئے بھی اس نے مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا تھا بلکہ رجن سے زور آزمائی کے لیے میں کھڑا ہوا تو اس نے مجھے نہیں روکا۔ چاندنی بانو کے لیے میری بولی پر بھی اس نے کوئی باز پرس نہیں کی۔ شمشاد خاں کے اڈے پر پولیس آئی تو وہ خاموش بیٹھا رہا۔ میں خود ہی پولیس افسر سے الجھتا رہا۔ بے شک اس نے دخل دینا کم کر دیا تھا لیکن وہ میری سنتا بھی بہت کم تھا۔ میں نے کتنی عاجزی کی کہ فیض آباد تک آئے ہو تو کچھ دن کے لیے یہیں ٹھہر جاؤ' زریں کو دیکھے ہوئے دن ہو گئے۔ وہ بہت ناراض ہوگی۔ مجھل نے میری ایک نہ سنی۔ اگر ہم وہاں رک جاتے تو اس طرف آنا ٹل بھی سکتا تھا مگر وہی بات' جیسا لوگ کہتے ہیں' دانے دانے پر مہر ہوتی ہے' لمحے لمحے پر بھی یہی قول صادق آتا ہے۔ آدمی سوچتا کچھ ہے' ہو کچھ جاتا ہے۔ طبیعت کی خرابی' سید کے ہاں قیام' نصیر بابا سے ملاقات' یہاں دو ستم رسیدہ لڑکیوں کو ہماری ضرورت تھی' کیسی شدید ضرورت جیسے کسی نے دھکیل کے ہمیں یہاں بھیجا ہو۔ ہمارا یہاں آنا اچھا ہی ہوا' ہمارے لیے نہیں تو ان دونوں کے لیے۔ ہم نہ آتے تو ان کی مسیحائی کو کون آتا اور کب آتا۔ ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان کے والدین کا ہوا تھا۔ اب وہ کسی گوشۂ اماں میں چلی جائیں گی۔ ہمارا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اطراف و جوانب میں سید کا زور و اثر بے اندازہ ہے۔ وہ ہمارے راستے میں بڑی رکاوٹیں کھڑی کر سکتا ہے اور جانے کتنی مدت لگ جائے مگر ہمارے پاس روز و شب کی کیا کمی ہے۔

کچھ وقت اور بیتا ہوگا کہ راہ داری کی طرف سے کسی کے تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی کسی کا نام لے رہا تھا۔ آواز مردانہ تھی اور گھبرائی ہوئی۔ زنان خانے کی ویرانی دیکھ کے اس کا یہی حال ہونا چاہیے تھا۔ سامنے بیٹھی ہوئی خادماؤں میں ایک تموج سا نمودار ہوا۔ رئیس بیگم کے ڈھلکے ہوئے شانے بھی اکڑ گئے۔ چاہیں اور قریب آگئیں [illegible] میں نے جھٹ رئیس بیگم کا بازو پکڑ کر اسے کرسی سے اٹھایا اور دوبارہ چاقو اس کے نزدیک کیا۔ خادماؤں کی سسکاریاں نکل گئیں۔ میں انہیں خاموش رہنے کی تلقین کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے خود کو روک لیا۔ میری آواز باہر بھی جا سکتی تھی۔ بہ عجلت دروازہ کھول کے میں نے رئیس بیگم کو سامنے رکھنے کے بجائے اپنے پیچھے' دائیں ہاتھ کے پہلو میں [illegible] جانب کیا اور خود دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ رئیس [illegible] بالکل چھپ گئی تھی۔ آنے والے کو دور سے اندر کمرے [illegible] فوراً کچھ نظر نہیں آ سکتا تھا تاوقتیکہ وہ کچھ آگے آکر [illegible] کی تصدیق نہ کرے۔ بہ صورت دیگر کسی خادمہ کی [illegible]

اسے باہر سے نظر آ جاتی تو اندر آنے کے لیے اس کی بے تابی دوچند بھی ہو سکتی تھی۔ نہیں معلوم' اسے کوئی نظر آیا یا کھلے دروازے نے اسے مہمیز کیا۔ ہر دو صورت میں اس کا اندر آنا یا جھانکنا لازم تھا۔ دروازے پر آکے اس نے اضطراری انداز میں ہنکاری بھری کچھ بڑبڑایا۔ میں اسی لمحے کا منتظر تھا۔ جیسے ہی اس نے اندر جھانکا اور قدم بڑھائے' میں نے چشم زدن میں دروازے کی اوٹ سے نکل کے اس کی گردن پر پنجہ ڈالنا چاہا۔ عین موقع پر وہ ترچھا ہو گیا اور اس کی کلائی میری گرفت میں آ گئی۔ ہاتھ کی ذرا سی ڈھیل دے کے طاقت سے جھٹکا دیا جائے تو بازو اپنی جگہ نہیں رہتا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ اس صدمے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا' پاگل سا ہو گیا پھر میں نے اچھل کے اس کے کولھے پر پیر سے ضرب لگائی تو وہ اوندھے منہ قالین پر جا گرا اور ڈکرانے لگا۔ اس نے میرا چاقو دیکھ لیا تھا۔ مجھ سے دور رہنے کے لیے اسے فوراً کسی محفوظ گوشے کی ضرورت تھی' اس لیے وہ شدید تکلیف کے باوجود اٹھ پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ دہائی دے' میں نے اسے خادماؤں کے ساتھ خاموشی سے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ اس صورت حال میں یہ رعایت اس کے لیے بڑی جاں فزا ہوگی۔ وہ ہڑبڑا کے کراہتا' لوٹتا پوٹتا ہوا خادماؤں کی طرف جا پہنچا۔ ہیبت سے اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ رئیس بیگم پر بھی اس نے نگاہ رکھی تھی۔ چند ثانیوں کے لیے مجھے اس سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ موقع غنیمت جان کے وہ فرار کی احمقانہ کوشش کر سکتی تھی مگر وہ تو اور کونے میں دبک گئی جیسے دیوار میں سما جائے گی۔

آنے والے شخص کا نام کچھ اور ہوگا' سب اسے بانکا کہتے تھے۔ عمر تیس سے اوپر' دبلا پتلا' اوسط قد' رنگت صاف تھی' بڑی بڑی نشیلی سی سرمہ بھری آنکھیں' پیچھے کی طرف الٹے اور سلیقے سے کنگھی کیے ہوئے لمبے بال اب بے ترتیب ہو گئے تھے۔ لٹیں ماتھے اور چہرے پر بکھر گئی تھیں۔ چکن کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا۔ اچھی شکل وصورت کا تھا مگر کچھ آواز میں بل تھا' کچھ اعضا میں' چلتے چلتے اور باتیں کرتے کرتے اچانک لہرا جاتا۔ کئی بار مہمان خانے میں میرے لیے کھانے کا طشت لے کے آیا تھا۔ مہذب اور جاں نثار قسم کا شخص تھا۔ ابن کہتا تھا' اس کے ہاتھوں' انگلیوں میں جادو ہے۔ ایسی مالش کرتا ہے کہ آدمی مدہوش ہو جائے' سارا جسم جھن جھنا جائے۔ بانکے نے متعدد مرتبہ میرے جسم کی مالش کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی' میں منع کر دیتا تھا۔ وہ خادماؤں سے زیادہ ہراساں ہو گیا۔ دیر تک ہانپتا کانپتا رہا۔ میرے جی میں آیا' اس سے پوچھوں' نصیر بابا کہاں ہیں۔ کچھ تو سن گن ملے گی لیکن رئیس بیگم اور خادماؤں کو اس کے کسی جواب سے تقویت مل سکتی تھی۔ میں چپ رہا اور میں نے دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔

بانکے کے بعد کوئی اور بھی آ سکتا تھا۔ میں دروازے کے قریب ہی رہا۔ کوئی پانچ منٹ اور گزرے ہوں گے کہ ایک اور ادھیڑ عمر عورت کو مجھے خادماؤں کے پاس بٹھانا پڑا۔ راہ داری میں وہ مضطربانہ صدائیں لگاتی ہمارے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ سیدھی اندر چلی آئی' مجھے کچھ زیادہ زحمت نہیں کرنی پڑی۔ دروازے کے پہلو سے اچانک اپنے سامنے میرے نمودار ہو جانے پر وہ چکرا گئی۔ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا' جسم ڈگمگا گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کے خادماؤں کی طرف دھکیل دیا۔ وہ لڑھکتی پڑھکتی ان پر جا گری۔ کچھ خادماؤں نے اس نیم جاں کو سہارا دیا اور جگہ بنا کے اسے سمیٹ لیا۔

رئیس بیگم سمیت ان کی تعداد اب چودہ ہو گئی تھی۔ مزید دیر ہو جانے سے یہ تعداد بڑھ سکتی تھی۔ میں اکیلا تھا اور میرے پاس صرف چاقو تھا۔ اتنی بڑی نفری میں کسی کی غیرت بیدار ہو سکتی تھی۔ مجھے خون خرابہ بھی نہیں کرنا تھا۔ کسی نو وارد سے نمٹنے کے لیے ذہن میں پہلے جیسی الجھن نہیں رہی تھی۔ وقت کچھ اور گزر گیا تھا' پون گھنٹے کے لگ بھگ لیکن کچھ طے نہیں تھا۔ آدمی خود پر گزرنے والی کیفیات سے وقت کی پیمائش کرتا ہے' تند ہو تو لمحے پہاڑ بن جاتے ہیں' لطف و کرم پر مائل ہو تو مانند حباب' مانند ہوا ہے۔ میں نے کچھ اور توقف کیا۔ اتنی تن دہی سے کھڑے کھڑے ٹانگیں جکڑنے لگی تھیں۔ مسلسل بخار سے ابھی میں اٹھا ہی تھا۔ دوا جاری تھی اور ڈاکٹر کشن نے زیادہ تھکاوٹ سے منع کیا تھا۔ مزید دس منٹ اور گزرے ہوں گے کہ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور آدھا جسم باہر نکال کے راہ داری میں نگاہ دوڑائی۔ سکوت طاری تھا۔ دروازہ بند کر کے میں اندر آگیا اور میں نے باہر نکلنے کا ارادہ کر لیا پھر ایک خیال نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم روک لیے۔ ایسے ہی چلے جانے کے بجائے اگر میں انہیں کشمکش و پیچ سے دوچار کر کے جاؤں تو کیا حرج ہے۔ مجھے رئیس بیگم سے کہنا چاہیے کہ کچھ دیر کے لیے مجھے باہر جانا ہے' جو جہاں موجود ہے' وہیں ٹھہرا رہے۔ کسی نے اپنی جگہ سے جنبش کی تو ۔۔۔ میری مراد یہ تھی کہ میرے جانے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے میں انہیں پس و پیش ہو' ان کی داد فریاد' ہاؤ ہو میں کچھ تاخیر ہو جائے۔ یہ تب ہی ممکن تھا کہ

انہیں میرے واپس آجانے کا یقین ہو اور اگر ایسا نہیں ہوا پھر معاً ایک اور تدبیر میرے دماغ میں کوندی اور مجھے منتشر کر گئی۔ کیوں نہ میں ان سب کو یہیں چھوڑ کے رئیس بیگم کو ساتھ لے کے باہر نکلوں۔ میری خواہش پر رئیس بیگم انہیں متنبہ کرتی جائے گی کہ اس کی واپسی تک سب یہیں موجود رہیں' کوئی بھی باہر نکلنے کی جرات نہ کرے۔ رئیس بیگم کا یہ انتباہ ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ میں رئیس بیگم کو بے سدھ کر کے کسی اور کمرے میں محبوس کردوں۔ خادمائیں یہاں اس کی واپسی کا انتظار کھینچتی رہیں گی اور رئیس بیگم کسی اور کمرے میں بے خبر پڑی ہوگی۔ یوں کچھ اور وقت مل جائے گا مگر کتنا کیا پھر مجھے نیچے چلے جانا چاہیے؟

○☆○

میں زنان خانہ مقفل نہیں کرسکتا۔ میرے باہر جاتے ہی کوئی بھولا بھٹکا ادھر آنکلا اور مختلف کمروں کی طرف تاک جھانک کرتا ہوا رئیس بیگم کے کمرے تک پہنچ گیا اور محصور خادماؤں تک! تو کیا حاصل ہوگا' کتنی دیر کی رعایت' اور اگر رئیس بیگم کو دوسرے کمرے تک لے جانے کے دوران میں ہی کسی نے اوپری منزل کا رخ کرلیا تو میری کیا ترجیح ہونی چاہیے؟ مجھے رئیس بیگم کو سنبھالے رکھنا ہے یا آنے والے شخص کو روکنا ہے؟ رئیس بیگم کو چاقو کی زد پر دیکھنے کے باوجود وہ شخص پسپا نہیں ہوا' خود کو ترک کرنے یا تعمیل حکم پر آمادہ ہونے کے بجائے الٹے قدموں بھاگ کھڑا ہوا تو مجھے رئیس بیگم سے ہاتھ اٹھا کے اس شخص کا تعاقب کرنا چاہیے؟ وہ تو نیچے جاتے ہی غل مچادے گا۔ مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اختیار واپس کر کے میں اپنی راہ لوں۔ جلد یا بدیر مجھے یہی کرنا ہے۔ اس کشاکش میں چند منٹ اور گزر گئے اور دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ انہیں متذبذب رکھنے کے لیے جاتے جاتے یہ تنبیہ و تاکید مجھے ایسی سطحی اور غیر ضروری نہیں لگی کہ میں تھوڑی دیر بعد ان کے درمیان واپس آرہا ہوں۔ میری واپسی تک وہ اپنی جگہ قائم رہیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ باقی اب ان پر تھا کہ میرے غلبہ و تسلط سے نجات پانے میں وہ کتنا وقت لیتی ہیں' خود سے کس قدر جحت کرتی ہیں۔

تبھی سبزہ زار کی جانب کھلنے والے دروازے کا زینہ اتر کے میں تیز قدموں سے نیچے آگیا۔ وہاں دور دور تک کوئی شخص نہیں تھا۔ کھلی ہوا میں آکے پسینہ آگیا اور ایسا لگا جیسے کسی بڑی مہم سے لوٹا ہوں' میں اندھیرے سے اجالے میں آگیا ہوں' آسمان پر بادل اتنے گہرے نہیں رہے تھے لیکن دھوپ بھی نہیں تھی۔ میں نے اپنی رفتار دھیمی کی۔ سارا جسم کھنچنے لگا تھا۔ مجھے دیکھ کے بشارت اچھل گیا اور ٹھٹک سا گیا

''آپ کدھر تھے چھوٹے صاحب؟'' اس نے دور ہی سے متردد آواز میں پوچھا۔

''کیوں! کیا ہوا؟'' میں نے درشتی سے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ مل کھا گیا ''وہ' وہ ابن آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔''

''ابن کہاں ہے؟'' میں نے نسبت ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''آپ کے کمرے کی طرف۔''

بشارت میرے ساتھ رہا' کچھ دور' چند قدم کا فاصلہ طے کر کے میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ وہاں نذرو' ابن اور ایک اور ملازم جس کے نام سے میں واقف نہیں تھا' منڈلا رہے تھے۔ تینوں میری جانب الم پڑے۔ ''کہاں' کہاں تھے آپ؟'' ابن نے وحشت سے پوچھا۔

''زنان خانے کی طرف۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔

''وہاں! آپ وہاں تھے۔'' وہ اٹکتی آواز میں بولا۔

''ہاں!'' میں نے بے اعتنائی سے کہا ''وہیں۔''

ان کے چہروں سے ظاہر تھا' میرے جواب سے ان کی تشفی نہیں ہوئی ہے۔ اچھے ملازموں کو چہروں اور لہجوں کی پہچان خوب ہوتی ہے۔ ابن کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن چپ رہا۔

''بابا کب گئے ہیں؟'' میں نے سرسری طور پر پوچھا۔

''انہیں تو دیر ہوگئی۔''

''کب تک آنے کو کہہ گئے ہیں؟''

''جلدی ہی کا بول گئے تھے۔'' ابن کی آواز کھوئی ہوئی تھی۔

ایک بات تو واضح ہوگئی تھی کہ بجھل اور نصیر بابا کو فروزاں اور یاسمین کو یہاں سے لے جانے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی ہے لیکن اس وقت ابن اور دیگر ملازمین کو کوئی تکدر ہو نہ ہو' مہمان خانے سے اتنی دیر میرے غائب رہنے نے انہیں ضرور متوحش کیا تھا۔ آج تک چوں کہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے ہی اپنا تجسس دور کرنے کے لیے بانکے کو زنان خانے بھیجا ہو اور وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا یا آنہیں سکا تھا۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ابن کی جانب سے مشروب اور پھل وغیرہ کی پیش کش پر میں نے صرف پانی طلب کیا۔ اس نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے اور مجھے پیش کرنے میں خاصی مستعدی دکھائی۔ آنے والا وقت میرے لیے ایک تجربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آنے والے وقت میں بجھل اور مجھ سے ان سعادت آثار خدمت گزاروں کا کیا طور ہوگا؟ انہیں یک بیک اپنی وضع بدلنے میں کس قدر دشواری ہوگی۔ سر جھکانا ان کا پیشہ ہے' کچھ ہی دیر جاری ہے۔ عجب ندامت آمیز تلخی اور کدورت آمیز پشیمانی کا سا عالم ہوگا ان کا۔

کمرے میں گھڑی موجود تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گویا بجھل اور نصیر بابا کو گئے ہوئے سوا گھنٹے کے قریب ہو رہا تھا۔

ابن کمرے کی چیزیں درست کرنے لگا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ جب بھی آتا' کبھی بستر کی چادر' میز پوش' پردے ٹھیک کرنے لگتا۔ کبھی کرسیوں' میزوں اور صوفوں کی صفائی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ آج اس کے اس مشغلے میں پہلے جیسی دل جمعی نہیں ہے۔ میں نے بستر پر جماہی لی تو وہ مردشناس سمجھ گیا کہ مجھے خلوت کی ضرورت ہے۔ چپکے سے وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ ''سنو!'' میں نے اسے پکارا تو وہ سٹ پٹاتے ہوئے لوٹ آیا۔ ''میں یہیں کمرے میں موجود ہوں' کہیں باہر نہیں جارہا۔'' وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھا کیا ''کچھ دیر میں بابا آجائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''جی' جی اچھا۔'' وہ گومگو کی حالت میں بولا۔ اس نے کچھ توقف کیا پھر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مسہری سے اتر کے میں نے سامان سے تمنچا نکالا اور بستر پر تکیے کے نیچے ڈھیر ہوگیا۔ بس کچھ دیر کا سکوت اور ٹھہراؤ پھر زنان خانے سے شور بلند ہوگا اور جیسے در و دیوار متحرک ہوجائیں گے' سارے گھر کا موسم بدل جائے گا۔ میرا اندازہ صحیح تھا' رئیس بیگم اور خادمائیں ابھی تک میری واپسی کی منتظر ہوں گی۔ میری نظریں گھڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک گونج رہی تھی۔ صدائیں ایک جیسی اور دھیمی ہوں تو خاموشی اور گہری کردیتی ہیں۔ وقت دھڑک رہا تھا۔ میرا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ میں نے خود کو ٹٹولا اور مجھے طمانیت ہوئی۔ اس دھڑکن میں خوف کی آمیزش نہیں تھی۔ آنے والے وقت کی نگاہیں کیسی ہی بے مہر ہوں' وہ دونوں تو یہاں سے چلی گئیں۔ کچھ تو اس جزا کی سزا ہمیں بھگتنی ہے۔ میں نے خود کو آسان کرنے کی کوشش کی' آنکھیں بند رکھنے اور جسم کی گرہیں کھولنے کی کوشش۔ نہ آنکھیں بند ہوتی تھیں نہ جسم کھلتا تھا۔ وقت کم رہ گیا تھا۔ اس اثنا میں بدلتے رویوں اور تیوروں سے مزاحمت اور مدافعت کے لیے مجھے اپنا ردعمل متعین کرلینا چاہیے تھا۔ سید محمود علی کی عدم موجودگی میں گھر کے کارندے رئیس بیگم کے احکام کی پیروی کریں گے اور رئیس بیگم غصہ و غم میں انہیں کوئی بھی مجھوم قسم کا حکم دے سکتی ہے۔ میرے لیے غالباً یہی ایک طریق سود مند تھا کہ بجھل کے آنے تک بہرصورت منضبط اور متحمل رہوں۔ چاقو' تمنچے یا اڑے کے کسی زورِ عمل کی نمائش سے وہ اور بدک سکتے' بھڑک سکتے ہیں۔ بجھل کے آنے کے بعد تو میرا کام ختم ہی ہوجائے گا۔

دروازے کے باہر اٹھنے والے شور سے میں چونک پڑا۔ باہر سے بھاگتے ہوئے آدمی کی بے ہنگم چاپیں ایک دم تیز ہوگئیں' دروازہ تڑاخ سے کھلا اور حواس باختہ بشارت نامی ملازم اندر آیا' جیسے مجھے ختم کردینے کے درپے ہو۔ آیا وہ بہت زور شور سے تھا لیکن مسہری کے پاس آکے اس نے بر وقت خود کو تھام لیا تھا۔

میں اٹھ کے بیٹھ گیا ''کیا ہے؟'' میں نے ناگواری سے پوچھا۔

''آپ' آپ زنان خانے میں تھے؟'' اس کی آواز قابو میں نہیں تھی۔

''ہاں۔'' میں نے سہلا کے کہا۔

''بانو صاحب' بانو صاحب کیا بولتی ہیں؟'' وہ خفقانی لہجے میں بولا۔

میں کوئی جواب دینے والا تھا کہ دروازے کے باہر پھر شور اٹھا۔ بڑے دروازے پر تعینات بندوق بردار دربان پاگلوں کی طرح تڑ تڑا بڑبڑاتا ہوا کمرے میں آگیا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا ادھیڑ آدمی تھا ''بانو صاحب بولتی ہیں' اس آدمی کو باہر مت جانے دو۔ نکلے تو' نہیں تو۔'' وہ وحشیانہ انداز میں بولا ''کوئی اکڑ پھکڑ کرے تو گولی ماردو۔''

میں بستر پر بیٹھا رہا۔

دربان نے بندوق تان لی۔ اس کا رخ میری طرف تھا۔ میں نے ہاتھ اوپر نہیں اٹھائے ''میں یہیں بیٹھا ہوں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز کھسیا گئی ''تم بالکل فکر نہ کرو' جاؤ بڑے دروازے پر جا کے چوکسی دو' نہیں تو پھر یہیں آرام سے بیٹھو۔ بندوق دیکھ لینا' ٹھیک طرح چلتی ہے کہ نہیں۔''

وہ تملا کے رہ گیا۔ اس نے بندوق نیچی نہیں کی۔ اتنی دیر میں ابن اور نذرو بھی ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے' بولائے ہوئے اندر آگئے۔ ان کے پیچھے بانکا بھی لپکتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا اور لہراتی آواز میں بولا ''ہاں ہاں' بانو

صاحب بولتی ہیں' مالک کے آنے تک اس کمینے ناشکرے کو
رسی سے' زنجیر سے باندھ کے رکھو۔ کہیں بھاگ نہ جائے۔
اس نمک حرام نے ہم لوگوں کو بڑا ستایا ہے۔ کوئی کسر نہیں
چھوڑی۔ کیا کیا بولوں تم کو۔ خدا خیر کرے' بانو صاحب کی
حالت تو بہت خراب ہے۔" اس نے پنجہ پھیلاتے اور
جھرجھری لیتے ہوئے کہا "اس کے پاس بہت بڑا چاقو ہے۔"
ان پانچوں نے مسہری کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ابن کی
نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ تاہم وہ انہی کے ساتھ تھا "چاقو
کدھر ہے؟" دربان دہاڑتے ہوئے بولا اور بندوق سے نشانہ
لینے کی دھمکی دینے لگا۔

"چاقو ہے میرے پاس؟" میں نے جیب تھپ تھپاتے
ہوئے کہا "پہلے میری بات دھیان سے سن لو۔ تم لوگوں سے
اپنا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ ہم نے اچھا وقت
گزارا ہے۔ تمہیں اصل بات معلوم نہیں ہے۔ معلوم
ہوجائے گی تو پچھتاوا ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے۔۔۔"

"ہم کو اس سے غرض نہیں۔" نذرو برہمی سے بولا "ہم
تمہارے نوکر نہیں ہیں' جس کے ہیں' اس کے حکم پر چلنا
ہے۔"

"تو مالک کو آنے دو۔ وہ اب نہیں تو۔۔۔"
دربان نے بھی مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ کڑکتی
آواز میں بولا "چاقو کدھر ہے؟"

"دیکھو! تمہیں یہی حکم ملا ہے نا کہ مجھے یہاں سے جانے
نہ دو یا کچھ اور؟" میں نے نرمی سے کہا "بھروسا رکھو' میں
یہیں موجود ہوں اور رسی' زنجیر اور جکڑنے کا شوق ہے تو
ٹھیک ہے' یہ بھی پورا کرلو لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ تم پانچ
ہو' میں اکیلا۔ تمہارے پاس بندوق بھی ہے۔ میں تمہارا
گھیرا توڑ کے کس طرح جاسکتا ہوں' جانا چاہوں تو تم مجھے روک
بھی نہیں سکتے تھے۔ میں کب کا جاچکا ہوتا۔ اپنا کام ختم کرکے
زنان خانے سے سیدھا چلا جاتا۔ یہاں اپنے کمرے میں کیوں
واپس آتا۔ ہمارا سامان بھی یہیں رکھا ہے۔ مجھے بابا کا انتظار
ہے اور تمہارے مالک کا بھی۔ ان سے ملاقات کیے بغیر ہم
نہیں جائیں گے۔ بات مت بڑھاؤ۔ اطمینان سے اپنے اپنے
کام پر جاؤ یا پھر ادھر ہی میرے پاس بیٹھو۔ ذرا صبر و ضبط سے
کام لو۔"

دربان نے سنی ان سنی کردی "چاقو نکالو۔" وہ پھنکارتی
آواز میں بولا اور میرے کچھ اور نزدیک آگیا۔
جیب سے چاقو نکال کے میں اس کے حوالے کرسکتا تھا
لیکن میں نے دانستہ تامل کیا کہ کچھ رد و قدح' حیل و حجت کے
بعد انہیں چاقو حاصل کرنے کی سرخوشی زیادہ ہوگی۔ اس
طرح وقت گزارنا بھی مقصود تھا۔ دربان کوئی مشاق اور
آزمودہ کار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ سید محمود علی نے بڑے
دروازے کے لیے دس آدمیوں کے بعد ہی اسے منتخب کیا
ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ ملازمین میں ایسی درجہ بندی نہیں ہے
تاہم اس وقت دربان نے اپنے ساتھیوں کے حاکم یا سردار کی
حیثیت اختیار کرلی تھی۔ ہتھیار پاس ہو تو آدمی کا غمزہ ہی کچھ
اور ہوجاتا ہے۔ آدمی بے پناہ' بے شمار ہوجاتا ہے۔ دربان
نے مجھے کوئی مہلت نہیں دی اور اپنا ارادہ تبدیل کرکے ابن
کو میری جیب سے چاقو نکالنے کا کام سپرد کیا۔ ابن کے انکار پر
اس نے بری طرح اسے لتاڑا۔

ابن کے چہرے پر جال پھیل گیا تھا۔ وہ جھجکتے ہوئے
میری طرف بڑھا۔ اس کی نگاہوں میں تاسف بھی تھا'
معذرت بھی تھی۔ دربان نے بندوق سے میرا نشانہ لے رکھا
تھا۔ مجھے بے حرکت ہی رہنا چاہیے تھا۔ وہ اڈے کے آدمی
نہیں تھے جو کوئی وار کرتے ہوئے اوچھے پن سے اجتناب
کریں۔ اڈے کے آدمی کو خیال رہتا ہے کہ پھر مقابل کو
جواب میں ہر طرح کی آزادی مل جاتی ہے۔ مقابل سے پھر
کسی قاعدے اور ضابطے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ وہ
سارے گھریلو ملازم تھے' صرف ان کا سرغنہ' دربان ان سے
خاصا مختلف تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ زندگی میں کبھی نہ کبھی
اڈے پاڑے سے وابستگی رہی ہے۔

تجمل کہتا تھا' عام لوگوں کے نرغے میں اڈے کے
آدمیوں سے زیادہ احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے احساس
تھا' آقا کی خوشنودی' اس کی نظروں میں سرخ روئی کی تمنا میں
کسی کی بینائی بھی متاثر ہوسکتی تھی۔ ایک دوسرے پر سبقت
لے جانے اور کوئی معرکہ سرانجام دینے کا سودا کسی کے بھی
سر میں سما سکتا تھا۔ رئیس بیگم کو اپنی آتش غضب سرد کرنے
کا وقت نہیں ملا ہوگا۔ وہ مجھ پر یورش کا حکم دیتے ہوئے ان
کے لیے حدود کا تعین نہیں کراپائی ہوگی۔

چاقو حاصل ہونے کے بعد ان کی رگوں میں خون کی
گردش کچھ اعتدال پر آسکتی تھی۔ میرے پاس کوئی چارہ بھی
نہیں رہا تھا کہ مزید چوں و چرا کیے بغیر ابن کو جیب سے چاقو
نکالنے دوں لیکن یکایک میرے دماغ میں آیا کہ ان پانچوں سے
کسی اور طرح بھی نمٹا جاسکتا ہے۔ کچھ اور سوچنے کا وقت
نہیں تھا جیسے ہی ابن مسہری کے دائیں طرف میرے کرتے کی
جیب میں ہاتھ ڈالنے کے لیے آیا' میں نے دروازے کی
طرف دیکھتے ہوئے ہانک لگائی "دروازے پر کون ہے۔"

ایک فرسودہ سا حربہ تھا لیکن شاید ہر ایک کا آزمودہ ہے اور
عموماً کارگر ہوتا ہے۔
دربان کی جگہ کوئی بھی ہوتا' ایک لمحے کے لیے اس کی
توجہ دروازے کی جانب مبذول ہوجاتی۔ میں مسہری پر بیٹھا
تھا۔ دربان مسہری کی پائنتی سے جڑا کھڑا تھا۔ اس کی بندوق
کی نال میرے سینے سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ بندوق
اتنے قریب نہیں رکھنا چاہیے۔ میری نگاہ نال پر جمی ہوئی
تھی۔ ہاتھ اور نگاہ میں ایسے وقت تجمل کے بہ قول' بہت
تال میل ہونا چاہیے' ہاتھ نگاہ کا پابند رہے' ہاتھ نگاہ بن
جائے۔ بیک وقت ان سب کی نظریں دروازے پر مرکوز
ہوگئیں' ذہنی طور پر بھی میری ہانک کا مفہوم اخذ کرنے کی
کوشش میں وہ منتشر ہوئے۔ اسی دم بستر پر بیٹھے بیٹھے زقند
بھرنے کے انداز میں' میں اپنی جگہ سے بلند ہوا۔ بندوق کی
نال پکڑنے اور ضرب لگانے کے لیے میں نے بایاں ہاتھ خالی
رکھا تھا۔ بندوق کی نال پکڑنے اور لگانے میں پل بھر کا وقفہ
ہوگا۔ مسہری پر کھڑے ہوجانے سے مجھے دربان پر موقع کی
فوقیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس کے سر پر ضرب لگاتے ہوئے
میں نے پوری قوت جمع کی تھی۔ وہ بلک اٹھا' معاً کسی تاخیر کے
بغیر میں نے اس کے پیٹ پر گھٹنا مارا۔ اس دوسری چوٹ کی وہ
تاب نہ لاسکا' بندوق پر اس کی گرفت متاثر ہونی چاہیے
تھی۔ باقی چاروں مجھے روکنے کے لیے مسہری پر چڑھنے لگے۔
میں ان کی پروا کرتا تو دربان کو سانس لینے کی فرصت مل جاتی۔
ان چاروں کے مسہری پر چڑھنے سے پہلے بندوق کی نال
پکڑے پکڑے کود کر میں مسہری سے نیچے آگیا۔ دربان بے
حال ہوچکا تھا۔ نیچے آکے میں نے الٹے ہاتھ سے اس کے منہ
پر طمانچہ رسید کیا تو وہ بندوق پر اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکا۔
اگرچہ وہ چاروں مجھ سے لپٹ گئے اور چھینا جھپٹی کرنے لگے۔
بندوق قبضے میں آجانے کے بعد ان چاروں کو سنبھالنا دشوار
نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے بندوق کی نال اور بٹ سے ان پر بے
دریغ ضربیں لگائیں تو افراتفری کی صورت ہوگئی۔ وہ دور دور
ہونے لگے۔ میں نے فوراً دروازے کا رخ کیا تاکہ کوئی باہر نہ
جاپائے۔

ان کی پیشانیاں سکڑ گئی تھیں اور چہروں کے رنگ
بدل گئے تھے۔ بندوق کے نشانے پر دربان سمیت وہ چاروں
ایک طرف ہوگئے "دیوار کی طرف منہ کرلو۔" میں نے بلند
آواز سے کہا۔

انہوں نے فوراً تعمیل کی اور صوفے کے پاس دیوار کی
طرف منہ کیے ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہوگئے "وہ
پانچ تھے' ان کے معطل ہوجانے کے بعد رئیس بیگم کے
احکام پر عمل کے لیے شاید اب تین چار ہی باقی رہ گئے ہوں۔"
دروازہ بند کرکے میں نے گلاس میں بچے ہوئے پانی کے چند
گھونٹ سے حلق تر کیا اور دروازے کے قریب کرسی کھینچ
کے بیٹھ گیا۔ انہیں کھڑے کھڑے چند منٹ گزرے ہوں گے
کہ میں نے انہیں بیٹھ جانے کی ہدایت کی۔ بیٹھے ہوئے آدمی
کو فعال ہونے میں کھڑے ہوئے آدمی کی نسبت کچھ دیر لگتی
ہے۔

ڈیڑھ بج رہا تھا۔ تجمل کو آجانا چاہیے تھا۔ مہمان
خانے سے ابن' نذرو' بشارت' بانکے اور دربان کے نہ پہنچنے پر
رئیس بیگم اور دیوانی ہوگئی ہوگی۔ اس نے یقیناً دو آدمیوں کو
سید کی تلاش میں یا اس کے کسی صاحب حیثیت دوست کے
پاس مدد کے لیے باہر بھیجا ہوگا۔ پہلے نہیں تو اب اسے کسی کو
یہ خدمت سونپنی ہوگی بشرطیکہ کوئی چاق و چوبند ملازم اسے
آسانی سے دست یاب ہوجائے۔ بعض خاداؤں کو مردان
خانے میں آمدورفت کی اجازت ہے' وہ گھر سے باہر نہیں
جاسکتیں مگر بھاگ دوڑ کرنے والے کسی ملازم یا ان پانچ گم
شدگان کے سراغ میں زنان خانے سے باہر نکل پڑی ہوں گی
اور اب یہاں آیا ہی چاہتی ہوں گی۔ میں ان کا منتظر تھا۔ ان
کا کیا' کسی کا بھی۔

زنان خانے کے زنداں کی بات اور تھی۔ بانکے کے سوا
وہاں ساری عورتیں تھیں۔ ان سے نبرد آزمائی کا مجھے کوئی
تجربہ نہیں تھا۔ وہاں بند کمروں میں اتنی عورتوں کے سامنے
میرا دم گھٹ رہا تھا۔ وقت گزرنے کا عمل بھی وہاں نہایت
سست تھا اور مسلسل یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں [illegible] اور نصیر
بابا ناکام نہ ہوگئے ہوں۔ یہاں میں نسبتاً بہتر حالت میں اور
بہتر زاویے سے تھا۔ آگے پیچھے کمرے کے دو دروازے تھے'
ایک باہر کی طرف جالی کا' دوسرا اندر کی جانب [illegible] دروازہ۔
جالی کے دروازے پر کوئی چٹخنی یا کنڈی نہیں تھی۔ میں نے
اندر کا دروازہ دوبارہ کھول دیا۔ جالی کے دروازے سے باہر کا
منظر اتنا صاف تو نہیں البتہ نظر ضرور آتا تھا۔ باہر سے جالی
کے پار کمرے کا اندر کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا جب کمرا
خوب روشن ہو۔ وہ پانچوں پہلے اکڑوں بیٹھے تھے' بعد میں چپکے
چپکے انہوں نے آلتی پالتی کی نشست اختیار کرلی۔ زنان خانے
سے دہائیاں دیتی ہوئی رئیس بیگم اور خاداؤں نے میری
نسبت کچھ ایسی شدت انہیں باور کرائی تھی کہ کسی اور طرف
دیکھنا اور سمجھنا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ حالانکہ کمرا
کھلا ہوا تھا' میں بستر پر دراز تھا۔ ان کی اچانک آمد پر میں نے

کسی اضطراب کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ انہیں جتا بھی دیا تھا کہ میں یہیں موجود ہوں۔ بہرحال میرے لیے تو ان کی سرکشی اور بدحواسی کا اچھا ہی نتیجہ برآمد ہوا۔ اب یہ احساس انہیں بھی شاید ہو رہا ہو۔

ان میں سے صرف ابن نے ایک بار سر گھمانے کے دزدیدگی سے میری طرف دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے کرسی تعینات دیکھ کے اس نے فوراً گردن سیدھی کرلی اور سرگوشی میں اپنے ساتھیوں کو کوئی فہمائش بھی کی۔ ظاہر ہے' احتیاط کی۔ ان کمسپرساں' بے چارگاں کو دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے دس منٹ ہو چکے ہوں گے۔ ابھی تک باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رئیس بیگم پر تو ایک ایک پل قیامت کی طرح گزر رہا ہوگا۔ میرے احوال کی تفتیش کے لیے اب تک کسی کو آجانا چاہیے تھا۔ وہ پانچوں بھی پہلو بدل رہے تھے مجھے ان کی یہ ہیئت کذائی بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی مگر اس کے سوا تدارک بھی نہیں تھا۔ یہاں سے ہمارے رخصت ہو جانے کے بعد جانے کون کون سید محمود علی کے عتاب کا نشانہ بنے۔

ابن کو کسمساتا دیکھ کے مجھے خیال آیا کہ ان میں سے کسی کو بحال کر دینے میں بظاہر کسی ضرر کا احتمال نہیں۔ میں نے ابن کو پکارا' وہ بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ میں نے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا تو اسے یقین نہیں آیا پھر وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے' پھٹی پھٹی آنکھوں اور آہستہ قدموں سے مجھ سے کچھ فاصلے پر آکے کھڑا ہو گیا۔ "اپنے ساتھیوں کو پانی پلاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور پھل وغیرہ بھی انہیں دے دو۔"

وہ حیرانی کے ایک عالم سے گزرا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ خاموشی سے وہ جگ اور گلاس اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔ کسی کو پیاس لگی ہو یا نہیں' ہر ایک نے جلدی جلدی خود کو سیراب کیا' البتہ پھلوں کے طشت کو ہاتھ نہیں لگایا اور انہوں نے اپنے منہ دیوار کی طرف کیے رکھے۔ جگ اور گلاس میز پر رکھ کے ابن واپس اپنی جگہ چلا گیا مگر میری آواز پر پلٹ آیا۔ عین اس وقت مہمان خانے کی راہداری میں آہٹیں گونجیں۔ میں نے کرسی چھوڑ دی۔ وہ دو لڑکیاں تھیں' چادر میں لپٹی ہوئی۔ جالی کی دیوار کی وجہ سے ان کے چہرے صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ بڑی برق رفتاری سے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی آئی تھیں اور میرے کمرے سے کچھ فاصلے پر آکے ٹھہر گئیں۔ ابن کو میں نے روک لیا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا کہوں' خود دروازے پر جاؤں یا ابن کو بھیجوں یا ابھی انتظار کروں۔ لڑکیاں یہاں تک آچکی تھیں لیکن وہ کسی ایسے کمرے میں بے دھڑک کس طرح داخل ہو سکتی تھیں جو مجھ سے وابستہ ہو۔ انہیں تو دستک دیتے ہوئے بھی ہول آرہے ہوں گے۔ میں نے ابن کو دروازے پر جانے کا اشارہ کیا۔ یہ بے اعتباری بے جواز نہیں تھی مگر میں خود کو قائل نہ کر سکا کہ ابن جالی کے کھلے دروازے سے بھاگ سکتا ہے۔ شکر ہے' ابن نے مجھے شرم سار نہیں کیا۔ وہ جالی کے قریب گیا اور فوراً واپس آگیا۔ اس نے سرگوشیانہ لہجے میں مجھے بتایا کہ زنان خانے کی دو خادمائیں جوہی اور نیم باہر کھڑی ہیں۔

یہ تو میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ ان کے نام معلوم ہو جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ابن میرے دوسرے حکم کے لیے مستعد تھا۔ میری خاموشی پر وہ ایک طرف ہو گیا اور اس مرتبہ اپنے ساتھیوں کے پاس نہیں گیا۔ باہر دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کو ٹوک اور ٹھوک رہی تھیں۔ ان میں سے کسی کو دروازے کے قریب بھٹکنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔ ابن کو باہر بھیج کے کسی حیلے حوالے سے انہیں اندر بلانے کی کوشش کا کچھ حاصل بھی نہیں تھا اور یوں ابن کی دعوت پر شاید ہی اندر آتیں۔ ابن کو دیکھتے ہی وہ طرح طرح کے سوال شروع کر دیتیں' میری موجودگی میں ان کے سوالوں کے جواب ابن کے لیے آسان نہیں تھے۔ وہ کشمکش سے دوچار باہر کھڑی رہیں۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی حالت ہوگی ان کی۔ دیر ہو گئی تو کسی ایک نے ہمت کی اور دبی ہوئی جھجکتی ہوئی سی آواز میں اس نے پہلے نذرو' بشارت کا نام پکارا۔ پھر بانکے اور ابن کا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے کمرے میں جھانکنے کی کوشش بھی کی۔ اندر کمرے میں اندھیرا ہی نظر آرہا تھا۔ اس سکوت کے باوجود انہیں کمرے میں داخل ہونے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ میں اگر اندر ہوں تو مجھے خاموش ہی رہنا چاہیے۔ زنان خانے کا آموختہ انہیں ازبر ہوگا۔ ضروری نہیں کہ زنان خانے سے وہ سیدھی یہاں چلی آئی ہوں۔ پہلے انہوں نے بڑے دروازے پر جاکے وہاں رہ جانے والے واحد دربان سے میرے بارے میں تصدیق کی ہوگی اور عمارت کے مختلف گوشوں میں' مجھے ابن' نذرو اور بشارت وغیرہ کو تلاش کرتے ہوئے میرے کمرے کا رخ کیا ہوگا۔ یہاں آکے ان کی حیرتیں اور دبیز' اور شدید ہو جانی چاہئیں۔ اتنے سارے لوگ پھر کون سی کھوہ میں جا چھپے! زمین کھا گئی یا انہیں آسمان نے نگل لیا؟ چند منٹ بعد اتمام حجت کے طور پر انہوں نے دوبارہ اپنے ہم قبیلوں کے نام پکارے۔ ان

آواز کی لرزش نمایاں تھی۔ دو چار قدم بڑھ کے انہوں نے دروازے پر دستک دینے کی جسارت قطعاً نہیں کی' اس سے زیادہ ایثار انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خادم کے ترک و ایثار کے لیے مخدوم کا صدق و صفا شرط ہے۔ آخر انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا اور تیز قدموں سے زنان خانے کی طرف لوٹ گئیں۔ اچھا ہوا' وہ واپس چلی گئیں۔ کسی تدبیر سے انہیں اندر بلا کے نفری بڑھانے سے بہتر میرے لیے یہی تھا کہ وہ خالی ہاتھ زنان خانے واپس چلی جائیں۔ رئیس بیگم کی خدمت میں حاضر ہوکے جانے اب وہ کیسی فسانہ طرازیاں کریں۔ ظاہر ہے' اسے اور سنسان اور ویران ہی کریں گی۔

○☆○

تین بجے کے قریب بھجل واپس آگیا اور میں نے جانا' میرے سر سے کوئی پہاڑ ہٹ گیا ہے' میرے جسم سے بندھی ہوئی رسیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس کے آنے سے پہلے کہیں سید محمود علی نہ آجائے۔ میں اس سے کسی بحث مباحثے' عناد و فساد میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ بھجل کے آنے تک سید کو بھی کھینچ یا بندوق کے زیر رکھ لوں۔ بھجل اتنا تھکا ہوا نہیں لگتا تھا۔ کمرے کا ماجرا دیکھ کے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ "یہ کیا ہو رہے؟" وہ ٹھٹک کے بولا۔

"میں نے انہیں بتایا تھا کہ مجھے تمہارا انتظار ہے۔ ہمیں ابھی یہاں سے نہیں جانا' یہ نہیں .... دربان نے بندوق تان لی۔"

بھجل نے ہنکاری بھری۔ "اس نے کچھ زیادہ ہی کھایا ہے۔" وہ بھڑک کے بولا "جاؤ رے" تمہاری ضرورت ادھری زیادہ ہے۔"

اس نے جب ہاتھ جھٹک کے انہیں باہر جانے کے لیے کہا تب ان کی سمجھ میں آیا۔ وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن باہر نہیں نکلے چونکہ دربان دروازے کی جانب بڑھتے بڑھتے ٹھہر گیا تھا۔ وہ بھجل کے آگے ہاتھ جوڑ کے کھڑا رہا' سبھی نے اس کی تقلید کی۔ "تو فکر مت کر' مالک کے آنے میں ابھی کوئی دیر نہیں ہے پھر کھولنے پڑ جائیں گے۔" بھجل نے خفگی سے کہا۔

مجھے حیرت ہوئی' بھجل نے دربان کی بندوق میرے ہاتھ سے اچک کے اس کی طرف اچھال دی۔ بندوق زمین پر گر جاتی مگر دربان نے پھرتی سے جھک کے اس پر قبضہ کرلیا اور اپنی جگہ جما ہوا پھیلی ہوئی آنکھوں سے بھجل کو دیکھتا رہا۔ بھجل کے ٹوکنے پر وہ حرکت میں آیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ سر جھکائے زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پانی پی کے بھجل مسہری کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا حقہ ٹھنڈا پڑا تھا۔ سرپوش ہٹا کے اس نے انگلی سے چلم کی راکھ کریدی پھر بیڑی سلگا کے لمبے لمبے کش کھینچنے لگا۔ وہ اپنے ساتھ کاغذ کا ایک تھیلا لایا تھا۔ تھیلے پر روغنی دھبے پڑے تھے۔ "بڑی دیر لگا دی تم نے؟" میری آواز دھیمی تھی۔

"ہاں رے' ادھری گاڑی ٹائم پے نہیں تھی' سسری' بڑھوا نے گردن میں رسی الگ سے ڈال رکھی تھی' گاڑی چلنے پے ہی پھندا ہٹایا۔"

"وہ بھی ان کے ساتھ تھا' وہ وہ ظفر؟"

"ابھی اس کو اپنے کھونٹے پر ٹکنا چاہیے' بعد کو مل جائے گا ان سے۔"

"کس طرف بھیجا ان کو؟"

"دکن میں وہی ابھاگن ہے۔" وہ بدبداتے ہوئے بولا "دوری کا رستہ ان چھوئی موئیوں کے لیے ٹھیک نہیں رہتا۔"

میں سمجھ گیا' ابھاگن سے اس کی مراد زریں سے تھی۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہم نے سلمیٰ کو وہاں بھیجا تھا' اب یہ تینوں' فروزاں' یاسمن' اور نصیر بابا وہاں چلے گئے۔ منیر علی کا خاندان' نیساں اور اکبر پہلے ہی وہاں تھے۔ خانم بھی شاید اس دوران میں حیدرآباد واپس آچکی ہو۔ جگہ کی کوئی کمی تو نہیں تھی وہاں۔ بھجل ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' ابھی انہیں زریں ہی کے پاس جانا چاہیے تھا۔ بمبئی کا ماحول ان کے لیے بہت اجنبی ہوتا اور شاید زریں کی طرح ان کی دیکھ بھال بھی کوئی نہ کر پاتا۔ پذیرائی اور نگہداشت میں خاصا فرق ہے۔ زریں تو کسی دریا کے مانند ہے' اس کے پاس بہت سایہ' بہت ٹھنڈک' بہت ریشم ہے' وہ بھی تو ایسے وقت سے گزری ہے۔ دوسروں کا دکھ خوب سمجھتی ہے۔

میں بھجل سے اور بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کاغذ کا تھیلا میری طرف سرکا دیا "کچھ کھا لے رے۔" وہ بوجھل آواز میں بولا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"ادھری اب دانہ دنکا بند ہی جان۔ بیچ میں دونے والا دکھائی پڑ گیا۔ جلدی کر' پھر ٹائم ملے نہ ملے۔"

"تم نے کچھ کھایا؟"

"ادھری اڈے پے چائے کی پیالی پی تھی' انگریزی بسکٹ بھی ساتھ تھے۔"

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"تھوڑا سا چکھ لے، پکا پکا ہے سارا، بعد کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم بھی ساتھ دو۔"

میں نے تھیلے سے دونے نکال کے پھلوں کے لیے رکھی ہوئی رکابیوں میں منتقل کیے۔ تازہ کچوریوں، سوجی کے حلوے، ترکاری اور [illegible] کے سموسوں سے نصف تھیلا بھرا تھا۔ ابھی سب چیزیں نرم گرم تھیں۔ دیسی گھی کی خوشبو الگ سے پہچانی جاتی ہے۔ سارے کمرے میں پھیل گئی۔ ایک دو کچوریاں، تھوڑا سا حلوہ میں نے ...ل کی وجہ سے زہر مار کیا اور اس نے میری وجہ سے۔

ساری چیزیں تقریباً بچ گئی تھیں۔ جی ٹھکانے پر نہ ہو تو کیسی خوش منظری اور کیا خوش ذائقی۔ ...ل آنکھیں موند کے کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے بہت الجھن ہو رہی تھی۔ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے ایک بار میں نے دروازے پر جا کے جالی کے پار دیکھا۔ دور راہ داری میں نذرو اور بشارت گھومتے نظر آئے۔ انھیں یقیناً ہماری نگرانی پر متعین کیا گیا ہوگا۔ پھر تو بڑے دروازے پر بھی خاصا اہتمام ہوگا۔ میں نے ...ل کی نقل میں بستر پر لیٹ جانا چاہا لیکن آدمی آدمی میں مٹی مٹی کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی جیسے میرا جسم نوچنے لگا۔ بیماری کے دوران میں روز و شب اس کمرے میں رہتے ہوئے گوشے گوشے سے واقفیت ہو گئی تھی۔ یہی کمرا جو کل تک بلکہ صبح تک راحت و آرام کا سبب بنا ہوا تھا، اب اس کے در و دیوار کاٹ کھانے کے درپے تھے۔ کچھ واضح نہیں تھا کہ اس قفس سے کب اور کس طرح رہائی نصیب ہوگی۔ سید محمود علی ہمارے گلے میں ہار پھول ڈال کے ہمیں رخصت نہیں کرے گا۔ ...ل کو بھی کچھ اس کا احساس ہوگا، وہ گم سم سا لگ رہا تھا۔

پانچ بجے گھڑی کی آواز پر ...ل نے آنکھیں کھولیں، گھڑی پر اچٹتی سی نظریں ڈالیں اور بازو جھٹکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں روشنی کم ہو گئی تھی۔ وہ باہر جانے لگا تو میں نے بے تابانہ پوچھا "کہاں، کہاں جا رہے ہو؟"

"ادھری ہوا بھاری ہے، تھوڑا تازگی کو دیکھتے ہیں۔" وہ منہ بنا کے بولا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی باہر آ گیا۔ ہم دونوں کمرے کے پاس رکھی ہوئی آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ واقعی باہر کی ہوا کمرے سے بہت مختلف تھی، نرم اور خنک۔ دیواروں میں ہوا بھی تو قید ہو جاتی ہے، آزاد ہوا کی بات ہی اور ہے۔ نذرو اور بشارت ابھی تک راہ داری میں موجود تھے۔ وہ ہمارے پاس نہیں آئے تھے اور کچھ آڑ میں ہو گئے تھے۔ آسمان سے ابھی تک بادل نہیں ہٹے تھے لیکن بارش کے آثار بھی نہیں تھے۔ کئی بار میں نے ...ل کو کریدنے، ٹٹولنے کا ارادہ کیا لیکن اسے دیکھ کے ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ خود میرے ذہن میں واضح نہیں تھا کہ کون سی عقدہ کشائی مجھے مطلوب ہے۔ شاید مجھے کسی دل گدازی کی ضرورت تھی اور خدشہ تھا کہ بصورت وہ اس صلاحیت سے عاری ہے۔ اس کی حالت بھی مجھ سے جدا نہیں، مسائل اور مسوال ایک ہی کشتی میں سوار ہوں تو کوئی کیا سوال کرے اور کوئی کیا جواب دے۔

ہمیں باہر آئے دس منٹ سے زیادہ نہیں گزرے ہوں گے کہ سید محمود علی ایک درمیانہ عمر ایک پختہ عمر کے دو بھاری بھرکم آدمیوں کے ساتھ راہ داری میں نظر آیا۔ اس کے ساتھیوں کے تن و توش سے آسودہ حالی نمایاں تھی۔ ایک سفید دھوتی اور سلک کے کرتے میں ملبوس تھا، دوسرا سفید پاجامے اور ململ کے کرتے میں۔ اس کے گلے میں سونے کی زنجیر بھی پڑی تھی۔ کرتے کے بٹن بھی سونے کے تھے۔ دونوں کی رنگت تپتے تانبے جیسی تھی۔ دولت اور اختیار کی تمازت چہرے اور آنکھوں سے چھلکتی ہے۔ ان کے پیچھے کچھ فاصلے سے نذرو، بشارت، ابن اور دربان کے علاوہ چند اور آدمی تھے۔ کندھے سے لٹکنے کے بجائے بندوق دربان کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ سید اور اس کے ہم راہیوں کی رفتار تیز تھی۔ ہمیں سامنے دیکھ کے انھوں نے لمحے بھر تامل کیا اور سید نے ہاتھ اٹھا کے اپنے عقب میں آنے والوں کو روک دیا۔ پھر تینوں اس تیزی سے ہماری طرف بڑھے اور ہمارے سامنے آ کے ٹھہر گئے۔ میری توقع کے مطابق سید محمود علی کے چہرے سے شعلے لپک رہے تھے۔ تا دیر وہ خوں بار آنکھوں سے ...ل کو دیکھا کیا۔ اس کے نتھنے اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ اس کے ایک ساتھی نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔

"کہاں ہیں وہ؟" سید نے کوئی تمہید ضروری نہیں [illegible]۔ شدت غضب سے اس کی آواز بھرا گئی۔

"کس کو پوچھتے ہو صاحب؟" ...ل نے سادگی سے کہا۔

"تھوڑا رسان سے بات کرو۔"

"کہاں ہیں وہ؟ وہ تینوں؟" سید محمود علی نے حلق [illegible] میں تکرار کی۔

"وہ تو دور چلے گئے۔" ...ل نے گہری سانس بھری۔

"کہاں، کہاں؟" سید پھر چیخ کے بولا اور چیخنے لگا "تم پوچھتے ہیں؟"

"کیا بات کرتے ہو صاحب! آپ کو کیسے بول دیں۔"

"تو تم نہیں بتاؤ گے؟"

"کیسی الٹی بات کرتے ہو آپ۔" ...ل نے ترشی سے کہا "ہم نے ادھری سے ان کو نکالنے میں ٹھیکا دیا ہے، ہمی سے ٹھکانا پوچھتے ہو۔"

"یعنی تم ہی نے انھیں یہاں سے بھیجا ہے۔" سید نے بھڑک کے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ہذیانی انداز میں بولا "دیکھا، دیکھا تم نے! یہ کیا بکتا ہے۔ یہ..."

سید کے معمر ساتھی نے کہنی مار کے تحمل کا مشورہ دیا اور سلجھی ہوئی آواز میں ...ل سے مخاطب ہوا "تم نے ایسا کیوں کیا شری مان جی؟"

"اپنا کیا صاحب! ان کی مرضی یہی تھی۔ ان لوگوں نے ہم سے بنتی کی تھی۔ ہم نے سارا آگا پیچھا جان کے ان کو ادھری سے نکال دیا۔"

سید محمود علی پھر اکھڑ گیا مگر اس کے پختہ کار ساتھی نے اسے خاموش کروا کے ...ل سے کہا "تم اس گھر کے مہمان ہو یا مالک؟"

"کام کی بات کرو صاحب! ہم نے پٹی نہیں باندھ رکھی ہے۔ کالا پیلا اچھی طرح سے ٹیپتا ہے اپنے کو۔"

"تم کو اس کا انجام معلوم ہے۔" معمر آدمی کی آواز بھی بگڑ گئی "ادھر تمھارا بڑا مان کیا گیا، تم مہمان رہے ہو۔ تمھارے لیے اچھا ہوگا کہ تم سیدھی طرح بتا دو، کدھر ان لوگ کو چھپایا ہے یا بھیجا ہے۔"

"آگے کا پورا جان کے ہی ایسا کیا ہوگا صاحب!" ...ل نے سپاٹ لہجے میں کہا "ایک بات بولیں، آپ ان کے سنگی ساتھی ہو، آپ بیچ میں نہ آؤ تو ٹھیک ہے۔ سید صاحب سے ہم بات کریں گے۔ سارا سمجھا دیں گے ان کو۔"

"یہ اس طرح نہیں مانیں گے۔" سید اپنے آپے میں نہیں تھا، پھنکارتا ہوا بولا "مجھے تو یہ اور قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے انھی کی زبان میں بات کرنی چاہیے۔ بھوا! تم نہیں جانتے، یہ جو اس رستم کے ساتھ چھوٹا سورما کھڑا ہے، اس حرام زادے نے گھر کے اندر گھس کے، پردہ دار عورتوں میں گھس کے کیا حرم زدگیاں کی ہیں۔ بہت لوٹ مار مچائی ہے اس نے۔ کمزور عورتوں پر ہاتھ اٹھایا ہے، مارا پیٹا ہے ان کو۔ یہ چاقو لے کے گیا تھا وہاں، اور اور... کیا کیا بتاؤں تمھیں۔ اوپر جا کے خود بانو سے پوچھو اور دیکھو، اس غریب کی کیا حالت ہے۔ اس حرامی پلے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" سید نے میری طرف ہاتھ اٹھا کے قہر آلود لہجے میں کہا "زندگی میں اتنا بڑا دھوکا نہیں ہوا، یہ مر رہا تھا سور کا بچہ۔ میں نے اسے روکا، اس کا علاج کرایا، سبھی نے اس کی خاطر [illegible] کی۔ ہر ایک آگے پیچھے پھرتا تھا۔ اس کتے نے کیا سلوک کیا۔ ہا!" وہ مجنونانہ انداز میں سر ہلانے لگا۔

میری رگیں چٹخنے لگی تھیں۔ جی میں آیا، اسے زور کا طمانچہ ماروں یا گدی سے پکڑ کے زمین پر پٹخ دوں لیکن ...ل نے مجھے نہیں اٹھنے دیا۔ اس نے سلگتی آواز میں کہا "اپنے کو آپ سے زیادہ آتی ہے صاحب! چھان کے بولو تو اچھا ہے۔"

"تم نے کدھر رکھا ہے لڑکی لوگ کو؟" سید صاحب کے دوسرے ساتھی نے پہلی بار مداخلت کی "دیکھو، ابھی کچھ نہیں گیا۔ تم کو نہیں پتا، آگے تمھارے لیے کتنی بڑی مصیبت پڑ سکتی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، اس طرح شریف گھرانے سے عورت اٹھا کے لے جاؤ اور کچھ نہ ہووے؟ اں؟"

"سید صاحب ابھی ایسا بولتے تو ان کو اور جواب دیتے۔ شریف وریف کی بات جانے دو صاحب اور زیادہ اونچا بھی مت بولو۔"

"نہیں نہیں۔" معمر آدمی نے ہونٹ سکوڑ کے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو سید! یہ ایسے نہیں سمجھیں گے۔ ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہیے۔"

"میں تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا، یہ اور قسم کے جانور ہیں۔" سید نخوت سے بولا "یہ پکے جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہیں، ایک نمبر کے..."

"کیا چاہتے ہو تم؟ تمھارے ساتھ اب کیا کیا جائے؟" معمر آدمی نے حقارت بھری آواز میں کہا "جو ہم کو پسند نہیں، اس پر مجبور مت کرو۔ بھگوان کی سوگند، بہت برا ہو جائے گا تمھارے لیے، پچھتاؤ گے۔ آگے ہم نہیں ہوں گے، جو ہوں گے، وہ بالکل دوسرے لوگ ہیں، بالکل جنگلی، دیکھو! ہمارے ہاتھ پیر وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔ تم ہم لوگوں کو نہیں جانتے۔"

"جانتے ہیں صاحب! اوپر سے نیچے تک جانتے ہیں۔ آپ سارے راجے مہاراجے لوگ ہو، بادشاہ سلامت۔"

معمر آدمی ہونٹ کاٹنے لگا اور شانے اچکا کے بولا "انسپکٹر بوس کو بلاؤ سید! وہ ان طرم خانوں سے مل کے بہت خوش ہوگا۔ اس نے بڑے سے بڑے جانور کو سدھایا ہے، یہ دو کوڑی کے کیا بیچتے ہیں۔ دو چار جھٹکوں میں پورا دکھائی سنائی دینے لگے گا۔"

"اور وہ، وہ اپنا پالتو، وہ مرکھنا سانڈ، ناتھو کس دن کام آئے گا۔" ادھیڑ عمر سفاکی سے بولا "اسی سے کام بن جائے گا"

ہیں تو بوس کتنی دور ہے۔ ناتھو کو میں نے پہلے ہی بلا بھیجا ہے' آتا ہی ہوگا۔"

"بات مت بگاڑو۔" معمر آدمی نے بھل کو تنبیہہ کی۔ "ابھی ساری گھر کے اندر ہے۔"

"بات تو آپ بگاڑ رہے ہو۔"

"ہم بگاڑ رہے ہیں۔" معمر آدمی جھنجلایا۔

"ہم تو لوٹ کے گھر آگئے ہیں۔"

"تو کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ہم جا بھی سکتے تھے پر ہم کو سید صاحب سے کچھ بولنا تھا۔"

"کیا بولنا تھا؟"

"ان کی باتوں میں مت آؤ بسودا!" سید چین چنا کے بولا "ان کے یہاں موجود ہونے میں بھی کوئی پھیر ہے۔ ان بدمعاشوں نے پورا جال پھیلایا تھا' پوری سازش کی تھی۔ زمینوں کی بات کرنے کے لیے مجھے گھر سے باہر بھیجا۔ ایک آدمی نے اوپر جا کے چاقو کے زور پر عورتوں کو ایک کمرے میں بند کیا' دو سرا لڑکیوں کو لے کے نکل گیا۔ وہ نمک حرام نصیر' وہ کھوسٹ' اس کو تو میں دیکھ لوں گا۔ مٹی پلید کی اس نے آخر میں۔ ان حرام زادوں نے اسے دام میں پھنسایا۔ بڈھا' معصوم لڑکیوں کو حیلے بہانے سے باہر لے گیا۔ یہ دونوں ساتھ جاتے تو ان کو ڈر تھا کہ زنان خانے سے شور اٹھے گا اور یہ ذرا سی دور پہنچ پائیں گے اور ان کے پیچھے لوگ لگ جائیں گے۔ یہ ایک بڑا والا نصیر بابا کے ساتھ تھا۔ دونوں ساتھ ہوتے تو اندھے چوکی دار بھی نہ جانے دیتے" اور دونوں ساتھ ہو کیسے سکتے تھے۔ زنان خانے میں ایک کو عورتوں پر قبضہ جمانا تھا۔ وہ وہاں کنڈلی مار کے بیٹھا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ دوسرا لڑکیوں کو دور لے جا چکا ہوگا تو وہ باہر نکلا اور واپس اپنے کمرے میں آگیا۔"

"پر لوٹ کے ادھر کیوں آگیا؟" بھل نے کسیلے لہجے میں کہا۔

"پھر نکل نہیں سکتا تھا۔" سید نے بھنا کے کہا "کمرے میں سامان بھی پڑا تھا۔ زنان خانے سے عورتوں نے چیخ پکار مچادی تھی۔ اس سے پہلے نکلنے کی کوشش کرتا تو کتنی دور جا پاتا' شور سنتے ہی لوگ اس کے پیچھے بھاگ پڑتے۔ ملازم پہلے ہی اس کے دیر تک کمرے سے غائب رہنے پر کھٹک گئے تھے۔"

بھل نے یا میں نے جرح نہیں کی کہ جناب! زنان خانے سے چیخ پکار تو بہت بعد میں اٹھی تھی۔ اس سے پہلے اتنا وقت تھا کہ بڑے دروازے سے نکلنے کی کوشش کی جا سکے۔ زنان خانے سے بلند ہونے والے شور کے بعد نمک خواروں نے بندوق ترک کر دی تھی۔ بندوق ہاتھ میں آجانے کے بعد ان کی حالت ایسی کی جاسکتی تھی کہ کوئی اپنے پیروں سے اٹھ کے باہر نہ جا سکے پھر بے ہتھیار ایک ہی دربان بڑے دروازے پر رہ گیا تھا۔ اس سے نمٹنا آدمی کے لیے کیا مشکل تھا جو کمرے میں پانچ ملازم بے دست و پا کر چکا ہو لیکن ہمیں کسی تاویل و تکرار میں پڑنے کی ضرورت کیا تھی؟ جو کچھ رئیس بیگم' خادماؤں اور خدام نے اسے باور کرایا تھا' جو اس شاطر و عیار کا اپنا وہم گمان تھا' اس سے ہمیں کیا سروکار۔

"ایک کا یہاں ٹھہرے رہنا اور دوسرے کا لوٹ آنا بھی سازش کا ایک حصہ ہے۔ اس میں بھی کوئی بڑی عیاری ہے۔" سید کی زبان اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ وہ گالیاں بکتا رہا اور کہنے لگا کہ ہمیں اس کی حیثیت اور مرتبت سے پوری طرح آگہی نہیں ہے۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کے بارے میں لن ترانیاں کرنے لگا پھر نفرت بھرے لہجے میں اپنے ساتھیوں سے بولا "یہ غنڈے وقت گزاری کر رہے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔"

پختہ عمر شخص نے بہ مشکل سید کی زبان کو لگام دی اور بھل سے بولا "ہاں' یہ کیوں نہیں گئے تم ادھر سے؟"

"تم سے کیا بولا؟" بھل نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا "ہم کو سید صاحب سے تھوڑی بات کرنی تھی۔"

"کیسی بات؟"

"اکیلے میں کریں گے۔"

"اکیلے میں کیوں؟ ہم میں اور سید میں کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ بولو کیا بات ہے۔"

"اس حرام الدہر کے دماغ میں کوئی اور بدمعاشی ہے۔" سید دہکتی آواز میں بولا۔

"کوئی پیسے ویسے کی بات ہے؟" درمیانہ عمر کے آدمی نے چلبلے پن سے پوچھا "ایسا ہے؟"

"کتنا دے سکو گے؟"

"اچھا اچھا پیسہ چاہیے' پہلے کہہ رہا ہوتا' یہ بات ہے۔" معمر آدمی کی آواز میں طنز اور تمسخر کی آمیزش تھی۔ "کتنا پیسہ بولو۔"

"بولی تو آپ لگاؤ' دونوں پریاں ہیں۔ لگتا ہے اوپر سے اتری ہیں۔ وہ جو بولتے ہیں اوپر والے نے اپنے ہاتھ سے بنا ہے۔ دور دور تک ان جیسی نہیں ملیں گی۔"

سید آگ بگولا ہو گیا اور مغلظات بکنے لگا۔

پختہ عمر آدمی نے پوچھا "اب تمہارے پاس ہیں دونوں' دام بھی تم ہی بتاؤ گے۔ بولو کتنا چاہیے۔"

"کتنا ہے آپ لوگوں کے پلے؟"

"ہم لوگ کی بات چھوڑو' تم نے سپنے میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ سیدھی طرح بولو کتنا چاہیے؟"

"جانے دو صاحب! آپ نہیں دے سکو گے۔ آپ کو آدمی کا مول کرنا نہیں آتا۔"

"دیکھا تم نے بسودا!" سید تمتما کے بولا۔

"دیکھ رہا ہوں۔" پختہ عمر آدمی کی آنکھیں لال ہو گئیں "ٹھیک ہے سید! یہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں' دیکھ لو ان کو۔"

"کوئی بات وات نہیں کرنا اسے' ہم کو گھما رہا ہے یہ۔ سارے بہانے ہیں۔ یہ کیا بات کرے گا ہم سے' بس وقت کاٹنا چاہتا ہے۔ اس کو صاف بتا دو کہ پہلے لڑکیوں کے بارے میں بتائے۔ بات بعد میں ہوگی۔" سید نے فیصلہ سنا دیا "اب دیر مت کرو' بہت ہو چکا' بہت ہو چکا۔ یہ ایسے زبان نہیں کھولیں گے۔" اچانک اس نے پلٹ کے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمیوں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ان کی تعداد پہلے سے بڑھ گئی تھی اور وہ منتظر ہی تھے کہ دوڑ پڑیں۔

"وہ گینڈا ناتھو بھی آگیا ہے۔" ادھیڑ آدمی جوش میں اچھل پڑا "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' اب وہی ان لوگوں کو دیکھے گا۔ بہت چربی چڑھائی ہے اس نے۔"

وہ سارے زیادہ دور نہیں تھے۔ ان کے درمیان منڈے ہوئے سر' گول چہرے' سرمئی رنگت' موٹی گردن' گٹھے ہوئے' تنے ہوئے جسم' اوسط قد کا ایک آدمی بھی تھا۔ سیدھے کان میں چاندی کی دریا' ہاتھ میں چاندی کا کڑا' گردن میں سوت سے بنا ہوا' لال اور پیلے رنگ کا گنڈا۔ خاکی رنگ کے کرتے پاجامے میں ملبوس تھا۔ پینتیس سے زیادہ عمر نہیں ہوگی۔ وہ دونوں ہاتھ جسم سے دور کیے' سرہلاتا' کسی قدر مستانہ انداز میں جھومتا ہوا ان تینوں کے سامنے آکے ٹھہر گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شرارے کوند رہے تھے۔ یہی ناتھو ہوگا۔ اس کے دائیں بائیں کم و بیش اس کی وضع قطع کے دو آدمی بھی اڈے سے متعلق معلوم ہوتے تھے' عمریں کچھ اس سے کم۔ ناتھو نے پہلے ادھیڑ آدمی کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا پھر معمر بسودا اور سید کو۔ "ناتھو' ناتھو! آگیا راجا۔ اتنی دیر لگا دی تم نے۔" ادھیڑ آدمی نے ناز برداریانہ لہجے میں کہا۔

"دیر کہاں مہاراج! سندھیلہ ملتے ہی چل پڑے۔ آپ بلاؤ اور ہم دیر کر دیں۔ کیوں سوچا آپ نے ایسا۔" ناتھو کی آواز اس کے بھاری جثے کی نفی کرتی تھی۔ پتلی سی کھنکتی ہوئی آواز۔ کہنے لگا "ہم تو دیر سے ادھر کھڑے ہیں کہ مہاراج اب دیکھتے ہیں' اب دیکھتے ہیں۔ یہی سوچ کے ٹھہرے رہے کہ ابھی اپنے کی ضرورت نہیں۔"

"ناتھو! یہ جو تم دو آدمی دیکھ رہے ہو۔" ادھیڑ آدمی نے بے صبری سے کہا "یہ کتے اپنے گھر' اپنے سید صاحب کے گھر سے دو عورتیں اٹھا کے لے گئے ہیں۔ تم کو ان حرام زادوں سے پوچھنا ہے۔ یہ ان کو کدھر لے گئے ہیں' کدھر رکھا ہے اور اب کیا مرضی ہے ان کی۔"

"عورت لے گئے ہیں' ہائیں؟" ناتھو کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "ایسا کیسے؟" ناتھو نے اپنے گال باری باری چھوئے اور حیرت سے بولا "پر لاکھی بابو! پھر یہ ادھر کیوں ہیں؟"

ادھیڑ آدمی یعنی لاکھی بابو نے کہا "یہ انہی سے پوچھو' پکے حرامی لگتے ہیں۔" وہ سنسنائے "ہم پولیس بلا سکتے ہیں لیکن ابھی نہیں' بعد میں ضرورت پڑی تو دیکھیں گے۔"

ناتھو نے پھرتی سے اپنا رخ بدلا اور سکڑی ہوئی آنکھوں سے ہمیں گھورتا رہا "نائیں مہاراج! کوئی دھوکا تو نہیں ہو گیا۔ یہ ایسے نہیں لگتے۔"

"جو ہم بولتے ہیں' اتنا ہی جانو۔" لاکھی بابو نے بگڑ کے کہا "دیر مت کرو' ہماری بھاشا یہ نہیں سمجھتے۔ ذرا اپنی بھاشا سمجھاؤ۔"

ناتھو کے چہرے پر فکر و تردد کا غبار ہویدا ہوا۔ چند قدم چل کے وہ بالکل ہمارے مقابل آگیا۔ "کیوں بھیا! یہ ہم کیا سنتے ہیں؟" وہ دیدے گھما کے بولا۔

بھل بے حرکت کھڑا رہا۔

"ہمارے بارے میں ان کو کچھ بتلایا مہاراج؟" ناتھو نے پلٹ کے لاکھی بابو سے پوچھا۔

"تم خود بتا دو۔" لاکھی بابو نے اچٹتی آواز میں کہا۔

"ہوں۔" ناتھو نے لمبی سانس کھینچی "کیا وچار ہے بھیا؟ ٹھیک ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے نیم سنجیدہ' نیم تہدیدی انداز میں بولا "پہلے ہم اپنے بارے میں بول دیں۔ نام تو سن لیا ہوگا ہمارا۔ چھٹ پن میں پٹنا سے آئے تھے پر ادھر لوگوں نے آسن سول کا راجا بنا کے بیڑی ڈال دی۔" چند لمحے اس نے سکوت کیا پھر کہنے لگا "اور کام کے بارے میں کیا بولیں' وہ ابھی تم جان لو گے' بہت الٹی کھوپڑیاں کے ہیں' سیدھوں کے ساتھ سیدھے' ٹیڑھوں کے ساتھ بہت ٹیڑھے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بھل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی

...وشش کی۔ جمل نے نظریں جھکالیں "ذرے سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جب اٹھ جاتا ہے تو سسرا پھر رکتا نہیں پھر اپنے بس میں کچھ نہیں رہتا' سمجھے۔"

جمل خاموش رہا۔

"دیکھو سنا' ہم کیا بولتے ہیں' ہم سے عمریا میں بڑے ہو' کچھ ہمارا دھیان کرو' اپنے سے اوپر والے پہ ہاتھ اٹھانے کا پاپ ہم سے ناہیں کرواؤ۔"

"تم سامنے سے ہٹ جاؤ استاد!" جمل نے پہلی بار آہستگی سے زبان کھولی۔

ناتھو کی آنکھیں چڑھ گئیں "سامنے سے ہٹ جائیں۔" اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہاتھ نچا کے کہا "پھر کیا کریں' پھر بولو گے' ادھر سے چلے جائیں۔ ہمارے ہوتے ہماری کمریا' ہمارے گھر سے عورت اٹھا کے لے جاؤ' ہم تالی بجائیں پھر؟" اس کی آواز تیز ہو گئی "پتا ہے' یہ کون لوگ ہیں۔ یہ بڑے مان سمان والے لوگ ہیں۔ اتنی دیر سے کیا' بہت ہے۔ یہ تو آگ لگا دیں گے۔ ہم پہ بھروسا کرتے ہیں جو ہم کو بلوایا ہے۔"

جمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ناتھو خاصا جز بز ہوا۔

"کیا بولتے ہیں' ہم' اونچا سنتے ہیں کیا؟ ہماری بات کا جواب دو۔ یہ مون برت کاہے کا نہیں ہے۔"

لاکھی بابو کو تاؤ آگیا "کیا ناتھو! کیوں دیر لگا رہے ہو' باتوں کا سمے نہیں ہے' باتیں تو ہم کر چکے ہیں۔"

"آپ شانت رہو' ناتھو کو بلایا ہے تو اس کو اپنا کام کرنے دو۔" ناتھو نے اپنے مربی کو نرمی سے ٹال دیا اور سکون سے جمل کو مخاطب کیا "مہاراج! لاکھی بابو کو جلدی ہے۔ ہم نمک آکر کے کھاتے ہیں' ان کا بھی کچھ دھیان کرنا ہے۔" اس نے تند و ترش لہجے میں جمل کو آگاہ کیا کہ کسی کارروائی' نازیبائی کے بغیر ہم اسے لڑکیوں کے بارے میں بتا دیں تو مناسب ہو گا۔"

"ہم کو جو بولنا تھا' بول دیا ہے۔" جمل نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا بول دیا ہے۔" ناتھو گرج کے بولا "ان کو چھوڑ دو' اب ہم سامنے ہیں۔"

"اپنے پاس نیا کچھ نہیں ہے۔"

میری حیثیت تماشائی کی ہو گئی تھی۔ ناتھو نے مجھ پر اب تک کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بس ایک غلط انداز نگاہ ڈال کے رہ گیا تھا مگر یکایک اس کے دونوں ساتھی میرے دائیں بائیں آ کے کھڑے ہو گئے اور اسی دم ناتھو نے جمل کو طمانچہ مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ مجھے معلوم تھا' اس کے جواب میں وہ کیسی ندامت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ ناتھو کا ہاتھ بلند ہوا' ادھر پلک جھپکنے کی مہلت میں اس کی کلائی جمل کے پنجے میں جکڑ گئی۔ ناتھو کو اس کی توقع نہیں تھی۔ میرے سوا کسی کو بھی نہ ہوگی۔ جمل کے پنجے میں ایسی گرفت تھی کہ اضطراری طور پر اچھلنے اور جسم کی ساری قوت صرف کرنے کے باوجود وہ اپنا ہاتھ نہ چھڑا سکا۔ جمل نے زیادہ دیر نہیں لگائی' دوسرے ہاتھ سے اسے چانٹا رسید کر دیا۔ چانٹے کی ضرب کے ساتھ ہی جمل نے اس کی کلائی سے پنجہ ہٹا لیا۔ جمل نے طمانچے کی شدت کے لیے ہاتھ ڈھیلا ہی رکھا ہو گا۔ ناتھو لڑکھڑا گیا۔ جمل نے اسی پر اکتفا نہیں کی' کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے ناتھو کی پنڈلی کے عین وسط میں ٹھوکر ماری۔ پنڈلی کی ہڈی ضرور مجروح ہوئی ہو گی۔ ناتھو توازن قائم نہ رکھ سکا' ڈگمگاتا ہوا فرش پر لڑھک گیا۔

ناتھو کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ لمحوں میں گزرنے والے اس منظر سے سید محمود علی' اس کے دونوں اقبال مند ساتھی اور ان کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگ سیدھے ہو گئے۔ اپنے چشم دید کے لیے حیرت و تجسس کی ایک مہلت انہیں مطلوب تھی۔ ادھر ناتھو کا شرمساری کم کرنے کے لیے اٹھ جانا ضروری تھا۔ اس کے دونوں حاشیہ بردار مجھے چھوڑ کے جمل پر ٹوٹنا چاہتے تھے کہ اس نے کراہتے ہوئے انہیں جھڑک دیا اور بمشکل تمام اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اٹھتے اٹھتے اس نے جیب سے چاقو نکالا اور کڑکا دبا کے کھول بھی لیا۔ پنڈلی کی تکلیف سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ ہونٹ کے گوشے سے خون کی دھار پھوٹ آئی تھی۔ وہ بالکل ایک بدلا ہوا آدمی نظر آتا تھا۔ کھڑے ہوتے ہی شعلہ بار آنکھوں سے وہ دوبارہ جمل کے قریب ہو گیا اور ڈھٹائی سے بولا "بہت تیزی دکھائی تم نے بھیا! مزہ آیا۔ کوئی اور ہوتا تو بدھائی ضرور دیتے' پر کام کرتے' کیا کریں۔ ادھر دوسرے کام سے آئے ہیں' رام کسم' یہ چکو پورا کا پورا دستے سمیت اندر اتار دیں گے۔ ہم کو بولو کدھر لے گیا اپنی ناری لوگ کو؟" اس نے چاقو لہراتے ہوئے کہا اور جمل کے چاقو سیدھا کر لیا' [illegible] کی طرح سیدھا' نشانہ لینے کے انداز میں' تاکہ جمل سامنے سے آنے کی جرات نہ کرے۔ آہستہ آہستہ اس نے فاصلہ کم کیا اور چاقو کی نوک جمل کے پیٹ میں گڑو دی۔ اب دونوں میں کوئی بھی حرکت کرتا تو چاقو جمل کے پیٹ میں پیوست ہو جاتا۔ جمل بس کچھ جیتے ہے

اپنا دفاع کرسکتا تھا اور پیچھے اتنی گنجائش نہیں تھی۔ پیچھے
ایک ہی کمرے کی دیوار تھی۔
ہر طرف سکوت ہو گیا تھا' موت کا سا سکوت۔ لاکھی بابو
نے ایک بار کھنکار کے ناتھو کو کوئی اشارہ کرنا چاہا' شاید احتیاط
اپنی دیوانہ واری کے باوجود ناتھو کو بھی احساس ہو گا کہ
بٹھل کو یا مجھے ختم کر دینے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اسے اپنا
ارادہ متوازن رکھنے کی دشواری پیش آ رہی ہو گی۔ وہ اس...
شہر کا راجا تھا اور خود بھی داؤ پر آ چکا تھا۔ اپنی سرفرازی کے
لیے اڈے کے آدمی کو بار بار ایسی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا
ہے۔ بار بار اس امتحان کے لیے اسے تیار رہنا چاہیے۔ وہ یا
تو کسی ایسے معاملے میں نہیں پڑتا جہاں ذلت و رسوائی کا
اندیشہ ہو' پڑتا ہے تو مقابل کو اچھی طرح پرکھ کے۔ ناتھو اب
یہاں سے واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایسے مخمصے پر دیوانگی کا
غلبہ ہونا چاہیے۔ اس حالت میں کوئی بھی رکیک حرکت اس
سے بعید نہ تھی۔ اسے دو مقاصد بیک وقت حاصل کرنے
تھے' اپنے محترم و مکرم داعیان کو مطمئن کرنا اور اپنا اعتماد قائم
رکھنا۔ دونوں لازم و ملزوم تھے۔ ہم سے کسی معقول جواب
سے زیادہ اسے اپنی فکر ہونی چاہیے تھی۔ ہم سے کچھ حاصل
کرنے کی ناکامی اتنی ہتک آمیز نہیں جتنی خود اس کی ہزیمت۔
اس کی کوشش ہوگی کہ کچھ اور نہیں تو جسمانی طور سے ہمیں
پسپا کر دیا جائے۔ یہ اندازہ تو اسے اب تک ہو جانا چاہیے تھا
کہ ہم سے کچھ جاننے کی جستجو میں وہ ناکام ہی رہے گا۔
بٹھل بغور ناتھو کو دیکھتا رہا' کچھ اس ہنر سے بھی مقابل
متذبذب ہو سکتا ہے۔ میں اچانک پہلو سے اچھل کے ناتھو کو
زیر و زبر کر سکتا تھا' تائید کے لیے میں نے بٹھل کی طرف
دیکھا۔ اس کی خاموشی صبر و ضبط ہی سے تعبیر کی جا سکتی تھی۔
ناتھو ایک ہاتھ پھیلائے' آگے کی طرف جھکا ہوا' دوسرے
ہاتھ سے چاقو' بٹھل کے پیٹ میں کھبوئے پوری طرح چوکنا
تھا اور [illegible] گھڑکیوں' دھمکیوں کا راگ الاپ رہا تھا کہ
بٹھل فروزاں اور یاسمین کی واپسی کا اقرار کر لے ورنہ.....
سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ بس ایک ہی صورت تھی
کہ بٹھل کسی طور ناتھو کی توجہ منتشر کرے اور اس ایک لمحے
کی رعایت میں کوئی تدبیر کرے۔ بٹھل نے ایسا کچھ نہیں کیا۔
"ٹھیک ہے استاد!" اس نے حتمی لہجے میں کہا "تم نہیں
مانتے۔"
ناتھو یہ سن کے اور بے چین ہوا۔ اس کی آنکھوں کی
وحشت اور فزوں ہو گئی "سے تم کو ہم نے پورا دیا۔"
"تم کو بولا تھا استاد! بیچ میں مت پڑو۔"

"کیا ہو گیا!" ناتھو کا چہرہ اس کا اپنا نہیں رہا۔
بٹھل نے مزید سلسلۂ کلام منقطع کیا اور معاً اپنا بایاں
ہاتھ اس اہتمام سے بند کیا کہ ساتھ ہی ایک قدم پیچھے ہٹ
جائے۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر ناتھو کی نگاہ جانی چاہیے
تھی۔ بٹھل کے پیچھے ہٹنے سے چاقو بھی قدم بھر کے فاصلے پر
ہو گیا۔ بٹھل کا مقصد چاقو کے نشانے سے ہٹنا نہیں تھا' چاقو پر
قبضہ کرنا تھا۔ بایاں ہاتھ اوپر کرنا' پیچھے ہٹنا اور لٹکے ہوئے
دائیں ہاتھ سے ناتھو کی کلائی جکڑنا' تینوں جنبشوں میں ایک
آن کی فصل ہوگی۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا جیسے یہ ہوا
ہی نہ ہو بلکہ نظر کا دھوکا ہو۔ چاقو والے ہاتھ کی کلائی جکڑتے
ہی اس نے ناتھو کے منہ پر بائیں ہاتھ سے ضرب لگائی۔ اسے
طمانچہ نہیں کہنا چاہیے۔ اس نے نیچے سے ناتھو کا منہ
ڈھانپ دیا۔ اس کی انگلیاں' ناتھو کی ناک' آنکھوں اور
گالوں میں کھب گئی ہوں گی۔ ناتھو کراہنے لگا' بٹھل نے اچھل
کے اس کے دنگسوں میں گھٹنا مارا۔ چاقو کی فکر تو بعد کی بات
تھی' پہلے اسے خود کو سنبھالنا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کے بٹھل کی
دسترس سے دور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی کلائی بٹھل کے
شکنجے میں کسی ہوئی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ
سے اپنے چہرے پر قابض بٹھل کا ہاتھ ہٹانے کے لیے بہت
زور کیا لیکن بٹھل کے گھٹنے کی ضرب سے وہ دوہرا ہو گیا۔ اس
کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ چاقو اس کے ہاتھ سے
چھوٹ گیا۔ چاقو گرتے ہی بٹھل نے اسے پرے دھکیل دیا۔
دفعتاً اس کے دونوں ساتھی بٹھل کی طرف کو دوڑے' میں
نے فوراً پیچھے سے دونوں کے بال پکڑ لیے اور ان کے سر باہم
ٹکرا دیے اور ہاتھ پیر سے دونوں کو پے در پے اتنی ضربیں
لگائیں کہ انہیں اپنے آپ کو یکجا کرنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔
دربان اور دوسرے آدمیوں کی دخل اندازی کا بھی مجھے خیال
تھا۔ میرے پاس تمنچا بھی تھا' چاقو بھی لیکن ان میں سے کوئی
ہمارے قریب نہ پھٹکا۔
بٹھل نے فرش پر گرا ہوا چاقو اٹھا کے ایک نظر اس کی
ساخت کا جائزہ لیا اور چپاکا دستے میں سمو دیا۔ ناتھو اور اس
کے ساتھی دور ہٹ چکے تھے۔ دربان بندوق تانے ہوئے
تھا۔ سید اور اس کے بے قرار دوست مشورے میں مصروف
تھے اور ان کی نظریں ہم ہی پر منڈلا رہی تھیں۔ اس دوران
ناتھو بھی کسی قدر اپنے اوسان بحال کر چکا تھا۔ بٹھل نے
چاقو اس کی طرف اچھال دیا۔ ناتھو بری طرح چونک پڑا۔
اسے یقین نہیں آ رہا ہو گا مگر چاقو اس کے سامنے [illegible] تھا۔ اس
سے چند انچ کی دوری پر۔ اس نے جست اسے اٹھا لیا اور کھٹکا

دبا کے اسے پھر کھول لیا۔ وہ اپنی جگہ سے نشانہ لے کے
بٹھل پر چاقو پھینک سکتا تھا۔ اڈے کے مستند آدمی ایسا نہیں
کرتے مگر ناتھو کی حالت بڑی متغیر تھی۔ منہ کھلا ہوا' آنکھیں
پھٹی ہوئیں۔ یہ اڈے کا کوئی معرکہ نہیں تھا جہاں مقابل
ایک دوسرے پر چاقو کے داؤ آزماتے ہوئے بے قاعدگی سے
پہلو تہی کریں۔ ناتھو کو اپنا چاقو واپس مل چکا تھا اور اس کے
پراگندہ دماغ میں کچھ بھی سما سکتا تھا۔ مجھے اس کی جانب سے
چاقو اچھال کے نشانہ لینے کے مذموم حربے کی ایسی تشویش
نہیں تھی۔ جھٹکتے ہوئے چاقو سے بچنے بلکہ چاقو گرفت میں لینے
کی مشاقی بٹھل کو بدرجۂ کمال تھی۔
ناتھو نے جھرجھری لے کے اپنی جگہ سے حرکت کی۔
اس کا رخ پھر ہماری جانب تھا۔ ہمارے اس کے درمیان اتنا
فاصلہ نہیں تھا۔ چند قدم بعد وہ بٹھل کے روبرو تھا۔ اس
مرتبہ اس نے چاقو گھمایا پھرایا نہیں۔ بٹھل سے فٹ ڈیڑھ
فٹ کے فاصلے پر آ کے وہ منجمد کھڑا ہو گیا۔ لمحے گزر گئے۔
دونوں کے درمیان خاموشی رہی اور دونوں ایک دوسرے کو
دیکھا کیے۔ یکایک سید اور اس کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں
میں ملی جلی آوازوں کی ایک ہوک سی اٹھی جب انہوں نے یہ
دیکھا کہ ناتھو نے اپنا کھلا چاقو بٹھل کے پیروں میں ڈال دیا
ہے اور جھک کے اس کے پیر پکڑ رہا ہے۔
بٹھل نے ناتھو کا بازو پکڑ کے اسے اٹھایا' اس کی کمر پہ
ہاتھ رکھا اور اپنی آستین سے اس کے ہونٹوں سے بہنے والے
خون کی دھار صاف کی۔ ناتھو ہونٹ بسورنے لگا۔ اس کی
آنکھیں ڈوب گئی تھیں۔ وہ بٹھل سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن
بٹھل نے آنکھوں کے اشارے سے اسے دور ہو جانے کے
لیے کہا۔ ناتھو نے اپنا سر بٹھل کے سینے پر رگڑا اور الٹے
قدموں پیچھے ہٹا اور مڑ کے بڑے دروازے کی طرف چل پڑا۔
لاکھی بابو نے اسے یوں جاتے دیکھ کے کئی بار پکارا لیکن اس
نے جیسے سنا ہی نہیں۔
دربان کو یقیناً کسی نے حکم دیا ہو گا' یکایک اس کے ہوائی
فائر سے ساری عمارت گونج اٹھی۔ یہ ہمارے لیے سید اور
اس کے حواریوں کی جانب سے ایک انتباہ تھا۔ فائر کی آواز
سن کے راہداری کے آخری سرے سے گزرتے ہوئے ناتھو
پلٹا اور بے تحاشا بھاگتا ہوا دربان کے پاس آ گیا۔ اس نے
جھپٹ کے دربان سے بندوق چھین لی۔ سید اور اس کے
دوست شور مچانے لگے۔ ناتھو نے بندوق کے سرے دونوں
ہاتھوں میں جکڑ کے گھٹنے کی ضربوں سے اسے دولخت کر دینا
چاہا۔ بندوق ثابت و سالم رہی البتہ ناکارہ ضرور ہو گئی ہو گی۔

ناتھو نے دربان کو بندوق واپس کرنے کے بجائے راہداری
کے پہلو میں سبزہ زار پر پھینک دی اور اپنے ساتھیوں کے
ساتھ واپس ہو گیا۔
سید محمود علی اور اس کے ہم مشرب دیکھتے ہی رہ گئے۔
ناتھو کے اوجھل ہو جانے کے بعد دیر تک جھنجھناہٹ رہی پھر
معمر بسودا نے جھجکتے ہوئے بٹھل سے پوچھا "تم کون لوگ
ہو؟" اس کی آواز سنسنا رہی تھی۔
"اب بھی کچھ جاننا پوچھنا رہ گیا ہے بسودا!" سید نے
ترختی آواز میں کہا "تمہیں نظر نہیں آ رہا' ہم تو پہلے ہی کہتے
تھے۔"
"ہم نے پولیس بلائی ہے۔" لاکھی بابو نے دھمکی آمیز
لہجے میں ہمیں مطلع کیا۔
"ٹھیک ہے صاحب!" بٹھل نے تلخی سے کہا "بلوالی
ہے تو ہم کیا بولیں۔"
"او رپولیس ناتھو راجا نہیں ہے۔"
"اس کو پہلے بلوا لیتے پھر۔"
"ہاں ہاں' ٹھیک بولتے ہو' غلطی ہو گئی۔ ناتھو حرامی تو
گیدڑ نکلا۔" لاکھی بابو نے دھتکارتی آواز میں کہا "ہا! کیسا
راجا بنا پھرتا ہے کتے کا بچہ۔"
"کب تک آ جائیں گے تمہارے بینڈ باجے والے؟"
بٹھل نے کھلی آواز میں پوچھا۔
"کیوں' کیوں' جلدی ہے تم کو؟" بسودا اچک کے بولا۔
"ادھری سے اب جانا بھی ہے داوا۔"
"کدھر! کدھر جانا ہے؟" بسودا ڈگڈگی بجانے والے
انداز میں ہاتھ گھما کے بولا "ایسے ہی چلے جاؤ گے؟"
"پھر کیسے وداع کرو گے! ہار پھول ڈالو گے؟"
"ہار پھول نہیں تو ہتھکڑی ضرور پہنائیں گے۔ بینڈ بھی
بجوا دیں گے۔"
"نہیں بسودا! بس کرو' اب پولیس ہی ان سے بات کرے
گی۔ کیوں ان کے منہ لگ رہے ہو۔" سید نے برہمی کے
ساتھ بسودا سے مزید سلسلہ جنبانی سے پرہیز کی درخواست
کی۔
"ہم کو تم سے بات کرنی ہے صاحب!" بٹھل نے نرم
آواز میں سید سے کہا "ہمارے ساتھ تھوڑے ٹائم کے لیے
اندر چلو۔"
"اب بات کرنے کو کیا رہ گیا ہے۔" سید کے لہجے میں
غصے اور بیزاری کے علاوہ یاسیت بھی عیاں تھی۔
"ابھی بہت ہے' تمہارے بھلے کا ہے۔"

"میرے بھلے کا!" سید نے بپھر کے کہا "میرا گھر ڈاکا ڈالو' میرے بھلے کی بات کرو۔ خوب۔"

"تم سے کہا نا کہ پہلے لڑکیوں کے بارے میں بتاؤ۔" لاکھی بابو... گرج کے بولا۔

"انہی کے بارے میں کچھ بولنا ہے۔"

"دیکھو' ایک بات کان کھول کے سن لو! ہم کو پہلے دونوں لڑکیاں چاہئیں' آج ہی' کوئی دوسری بات نہیں ہوگی تم سے۔ پہلے بھی صاف کہا ہے۔" لاکھی بابو کی آواز بے لچک تھی۔

"وہ لوٹ کے آنے کو نہیں گئی ہیں۔"

"لوٹائے گا تو تمہارا۔۔۔" لاکھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس نے خود کو روکا اور کھسیا کے بولا "واپس تو ان کو لانا ہوگا۔"

"آؤ صاحب! گھبرانے کی ضرورت نہیں' کچھ کام کی بات ہی کرنا ہے۔" ہنسل نے دوبارہ سعید محمود علی کو مخاطب کیا اور ایک بار پھر کمرے میں چلنے کی دعوت دی۔

ساری بات اب پولیس کے سامنے ہوگی۔ پولیس کے آنے میں اب دیر نہیں ہے۔" سید کے بجائے لاکھی بابو نے دو ٹوک انداز میں ہمیں بتایا کہ پہلی مرتبہ جب ناتھو' ہنسل کے سامنے تک نہیں پایا تھا' تبھی انہوں نے پولیس کے لیے ہرکارہ دوڑا دیا تھا۔

انہوں نے پولیس طلب کرلی تھی۔ انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ تینوں کا حال پہلے سے مختلف تھا۔ ناتھو کے چلے جانے کے بعد ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے ان کے لہجوں میں فرق آگیا تھا۔ ساتھ ہی ان کی خشونت و وحشت بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ بار بار ایک دوسرے سے سر جوڑے سرگوشیاں کرنے لگتے۔ قریب کھڑے ملازموں کو ڈانٹتے ڈپٹتے۔ وہ انہیں حکم پہ حکم دے رہے تھے۔ سید نے اپنی خاص بندوق بھی اندر سے منگوالی تھی اور دربان کے حوالے کردی تھی۔ راہداری میں ملازموں نے جلدی جلدی مزید کرسیاں رکھ دی تھیں۔ ایک گول میز بھی وسط میں سجادی گئی تھی۔ خاصی دیر بعد میں اور ہنسل بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے' پھر انہوں نے جیسے ہم سے ترک تعلق کرلیا۔ کوئی بات نہیں کی مگر انہیں قرار نہیں تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ تینوں کسی ایک فیصلے پر متفق نہیں ہو پا رہے ہیں۔ کوئی ایک رائے قائم کرتا تو دوسرا نکتہ چینی کرنے لگتا۔

یہ وقفہ میرے لیے بڑا غنیمت تھا۔ ۔۔ل کی مثال بھی سامنے تھی۔ اس اثنا میں' میں خود کو ترک کرتا رہا۔ کسی نے کہا ہے' خود کو ترک کردینا بھی آزادی ہے' خود کو دوسروں کے حوالے کردینا بھی آزادی کے مترادف ہے۔ خود اختیاری کے علاوہ اختیار کھو دینا بھی مانند آزادی ہے۔ آنے والے وقت سے نبرد آزمائی کے لیے میں نے خود کو بڑی حد تک آزاد کرلیا۔ اب مجھے پیش آیندہ کی کدورت و عداوت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔ شاید نوشتہ ہی سب سے معتبر چیز ہے' یہی ہوتا آیا تھا۔ کتنا ہی بچ بچ کے' پھونک پھونک کے قدم رکھو' کتنا ہی اپنے آپ کو چھپائے ہوئے کنارے کنارے چلو' راستے میں دوسرے تو بے شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے جو کہنی مارتے ہیں' اچانک سامنے آجاتے ہیں اور دیوار بن جاتے ہیں۔ دوسرے راہگیروں کی کج روی کی کیا ضمانت۔ آدمی کو اپنے لیے کتنی زندگی ملتی ہے۔ کسی نے پیمائش نہیں کی' ایک چوتھائی بھی نہیں شاید۔ کاش آدمی کا واسطہ آدمی سے نہ پڑا کرتا' بہت سے جانوروں کی طرح۔

نذرو نے اندر آتے ہوئے آکے سید کے کان میں سرگوشی کی' سید نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا۔ تینوں اور مضطرب ہوگئے۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ بشارت بھاگا بھاگا آیا' اس نے پولیس کی آمد کی اطلاع دی۔ سید اور بسودا کو وہیں روک کے لاکھی بابو خود پولیس کے استقبال کے لیے لپکا۔

وہ تازہ تازہ وردیوں میں ملبوس چار آدمی تھے جو فوجیوں کی طرح ٹھک ٹھک کرتے تیز رفتاری سے راہداری میں بڑھتے دکھائی دیے۔ سب سے آگے کوئی بڑا افسر معلوم ہوتا تھا۔ بھاری بھرکم جسم' اونچی پکی عمر' بڑی بڑی مونچھیں' ستواں سی ناک اور چمکیلی آنکھیں' گہری بادامی رنگت' ابھرا ہوا چہرہ' پیٹ آگے نکلا ہوا' قد درمیانہ' کلّے ٹھسے سے رعب اور دبدبے کا شخص تھا' تجربہ کار بھی لگتا تھا۔ اس کا ماتحت ہر لحاظ سے اس کی ضد تھا۔ عمر کم' جسم چھریرا' رنگت کالی' قد اٹھتا ہوا' آنکھیں چھوٹی اور چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ ان کے پیچھے بندوق بردار سپاہی تھے۔ دونوں افسر بھی ۔۔۔ لیس تھے۔ سید' لاکھی بابو اور بسودا سے ان کی پرانی آشنائی ظاہر ہوتی تھی۔ لاکھی بابو نے جلد از جلد ہماری طرف انگلی اٹھاکے بڑے افسر کی توجہ مبذول کی۔ افسر کی رعونت آمیز نگاہیں ہم پر جم گئیں۔ ہنسل نے اسے سلام کیا۔ اس کی تقلید میں مجھے بھی ہاتھ اٹھانا پڑا۔ افسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی ان تینوں نے کانا پھوسی کے انداز میں نہایت سرگرمی و مستعدی اور برہمی و برافروختگی سے روداد سنائی شروع کی۔ دونوں افسر سنجیدگی اور حیرانی سے سنتے رہے۔ درمیان میں کئی بار سر گھما کے انہوں نے ہم پر نظر کی۔ بڑے افسر نے' جیسے سب کچھ اخذ کرچکا ہو' ان تینوں کا احوال ادھورا چھوڑ کے کرسی کا رخ ہماری جانب کیا اور بلند آواز میں پوچھا "تم کو تھانے لے چلیں یا ہمیں آدمی کی طرح بات کریں؟"

"یہ تو آپ پر ہے مائی باپ!" ہنسل نے دھیمی آواز میں کہا "ہم کو آدمی مانو کہ نہیں۔"

"کدھر ہیں لڑکیاں؟" افسر نے تیزی سے پوچھا۔

"آپ بھی یہی بولتے ہو' لڑکی لے جانے والوں سے ان کا اتا پتا پوچھتے ہو؟"

"دیکھا! دیکھا تم نے گھوش بابو!" بسودا اور لاکھی بابو نے بیک وقت تلملا کے کہا۔ گھوش بابو نے انہیں مداخلت سے روکا اور ہنسل سے بولا "دیکھو! ہم بات کرتے ہیں۔"

"ہم کو بھی یہ اچھا لگتا ہے۔" ہنسل نے سر ہلا کے کہا۔ گھوش کی آنکھوں میں چنگاریاں سی لپکیں "تم کو بھی اچھا لگتا ہے۔" اس کی آواز غصے سے لبریز تھی "پھر کیا چاہتے ہو؟"

"ہم بھی زیادہ بات کرنا نہیں چاہتے۔" ہنسل نے صلح کی لہجے میں کہا "ہم کو آپ کا انتظار تھا۔"

"ہمارا انتظار تھا؟" افسر نے طنزیہ دہرایا۔

"ہاں صاحب! آپ حاکم آدمی ہو' آپ کی ان کی کتنی ہی پرانی جمی ہوئی ہو' آنکھ اور کان تو پاس ہی رکھے ہوں گے' کہیں دیے ہوں گے۔ ہماری آپ کی پہلے سے کوئی گانٹھ بھی نہیں پڑی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" افسر نے درشتی سے پوچھا۔

"ہم نے ان لوگ سے کئی بار بولا' ہم کو سید صاحب سے اکیلے میں بات کرنے دو' ہماری بات پلے نہ پڑے تو ہم ادھری سے بھاگے نہیں جا رہے۔ انہوں نے دھیان نہیں دیا۔ اب آپ آگئے ہو۔ ان کو بولو' اس میں ہرجا کیا ہے۔"

گھوش نے کوئی اور سوال کرنے سے پس و پیش کیا۔ پہلے سے بسودا' لاکھی بابو اور سید محمود علی نے اس کے کان بھرنے چاہے لیکن افسر نے ہاتھ اٹھا کے انہیں خاموش کردیا اور ہنسل سے بولا "کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

"وہ تو سید صاحب ہی سے بولیں گے' بعد میں ان پر ہے' چاہیں تو تھانہ پہنچا دیں۔"

"ہم کو نہیں بتاؤ گے؟" افسر نے حاکمانہ تیور سے کہا "ہم سے بھی اکیلے میں بات کرسکتے ہو۔"

"نہیں صاحب! اچھا ہے' زور مت دو۔ ہم کوئی الٹی بات نہیں کر رہے۔"

"ایک بات اچھی طرح سمجھ لو' ہم دوسری قسم کے پولیس والے ہیں۔"

"سارے وردی والے ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"ہم نہیں چھوڑتے پاپی کو' آخر تک پہنچاتے ہیں۔"

"اچھا ہے صاحب! پاپی کو گھر تک پہنچانا چاہیے۔"

"دو جوان لڑکیوں کا کڈنیپ' گھر میں گھس کے چاقو کے بل پر زورا زوری' نوکر لوگ سے ہاتھا پائی۔ گھر کے اندر کا نہیں معلوم' کتنا گھنایا' روپیہ پیسہ دبایا اور کس عورت کو ریپ کیا۔ ہوش ہے' کتنے کیس بنتے ہیں تم پر؟"

"ہے صاحب! پولیس چاہے تو دن کو رات سے' پورب کو پچھم سے پلٹ دے۔ ہم انکاری نہیں۔ ابھی خون کا کیس بھی لگاؤ تو انکاری بھی نہیں۔ پتہ ہے' آپ کو کیا کیا آتا ہے۔ ہتھکڑی' حوالات' ڈنڈا ڈولی' کچہری' جیل' سولی' سارے کی جانکاری ہے۔"

"لگتا ہے' پولیس سے ناتا پڑتا رہتا ہے۔"

"پرانی صاحب سلامت ہے۔ جب لڑکی لوگ کو لے جا رہے تھے تو پتہ تھا' آپ آسکتے ہو۔ اسی لیے ہم لڑکی لوگ کو آگے بھیج کے ادھری لوٹ آئے کہ آپ کو پیچھا کرنے میں کوئی کشٹ نہ ہو۔"

"اوہ!" افسر کا سارا جسم پھڑک اٹھا "ہمارے کشٹ کا دھیان تھا تم کو؟"

"ادھر سید صاحب سے تھوڑی بات کرنی تھی اور معلوم تھا' ہمارے ادھری لوٹ آنے پر سید صاحب آپ سے ملائے بنا جانے نہیں دیں گے۔ تھوڑا مٹھے پر زور ڈالو گے صاحب تو ساری کالک چھٹ جائے گی۔"

گھوش نے کوئی جواب نہیں دیا' اپنے ماتحت سے مشورہ کیا "ٹھیک ہے سید صاحب! آپ اس سے بات کریں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "دیکھیں کیا کہتا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں' اس کی ضرورت نہیں۔" سید محمود علی کے چہرے پر دھند چھاگئی "یہ بھی ان کی کوئی چال ہے۔ آپ ان کے جرائم اور دیدہ دلیری دیکھیے۔ یہ مجھے بہت خطرناک لوگ معلوم ہوتے ہیں' کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں یہ۔ پہلے لڑکیوں کی فکر کیجیے' جانے کہاں یہ بدمعاش انہیں لے گئے ہیں۔ وہ تو بہت معصوم' پھول جیسی بچیاں ہیں۔ جانے کیا حال ہوا ان کا۔"

"کوئی چھوٹ نہیں سید صاحب! آپ بھروسا رکھو۔ پہلے جیسا یہ کہتے ہیں' ویسا ہی کرو۔ بعد میں ہم دیکھ لیں گے۔ بڑے بڑے چھٹے ہوئے بھگتائے ہیں ہم نے۔ یہ بولنے کیا بیچتے

ہے۔" گھوش نے آہستگی سے سید اور اس کے ساتھیوں کے کچھ اور بھی گوش گزار کیا۔ ہم تک اس کی آواز نہ پہنچ سکی۔ یقیناً صبر و ضبط کا درس دیا ہوگا اور شاید یہ بھی کہا ہو کہ یوں بھی "اگر ہم نے زبان کھولنے میں دیر کی تو وقت ہی برباد ہوگا۔" گھوش کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بٹھل سے اس کی مرضی کے بغیر کچھ جاننا اتنا آسان نہیں۔

سید آمادہ نہیں تھا۔ اس نے ناراضگی اور مایوسی سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ لاکھی بابو اور بسودا نے بھی گھوش کی تائید کرتے ہوئے سید کو دلاسے دیے "گھوش بابو زیادہ سمجھتے ہیں۔ ذرا دیکھو تو آخر کیا چاہتا ہے، کیا بکتا ہے۔ ہم لوگ تو یہیں بیٹھے ہیں۔" لاکھی بابو نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"کتنا سے لوگے؟" گھوش نے اکڑی ہوئی آواز میں بٹھل سے پوچھا "ہم تو زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔"

"یہ تو سید صاحب پر ہے۔ کتنی جلدی کوڑے میں اتر آتی ہے۔"

"کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو سمجھ لینا۔" گھوش نے سختی سے کہا "تمہارا آدمی ادھر ہی بیٹھا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بٹھل نے کڑوی آواز میں کہا "آپ پھندا تیار کراؤ۔"

گھوش نے ہونٹ بھینچ لیے اور معنی خیزی سے سر ہلانے لگا۔

سید محمود علی بادلِ ناخواستہ کرسی سے اٹھا۔ بٹھل نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ دونوں اس کمرے میں چلے گئے جو گزشتہ سات آٹھ روز سے ہمارا مسکن تھا۔ جاتے وقت اس نے کئی بار شانے اچکائے اور ہونٹ سکوڑے، پھیلائے۔ اس کے ساتھی اسے تمیز کرتے رہے۔ سید کو ایک گردن زدنی شخص سے گفتگو پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ تو میرا اور بٹھل کا خون پینے کے لیے بے چین ہوگا۔

ان دونوں کے کمرے میں چلے جانے کے بعد لاکھی بابو، بسودا، گھوش اور اس کے ماتحت نے کرسیاں کھینچ کے کمرے کے اور قریب کر لیں۔ ان کے اردگرد کھڑے ہوئے ملازمین نے بھی گھیرا تنگ کر دیا۔ دربان ابھی تک بندوق کھینچے ہوئے تھا۔ دونوں سپاہیوں نے کندھوں سے بندوقیں اتار کے ہاتھوں میں دبا لیں۔ سب کی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں۔ ابتدا میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر لاکھی بابو اور بسودا نے باقی رہ جانے والی روداد گھوش کو سنانے میں بڑھ چڑھ کے بیانات دینے شروع کر دیے۔ یہ پروا کیے بغیر کہ میں ان کے سامنے بیٹھا ہوں۔ بیان کو بڑھاتا ہوا انداز کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔

انہوں نے زنان خانے میں عورتوں سے میری بدسلوکی کا ذکر کرتے ہوئے کچھ ایسے تیقن کا اظہار کیا جیسے سب کچھ ان کے سامنے ہوا ہو۔ کچھ ابن بشارت، نذرو وغیرہ نے بھی حاشیہ آرائی کی ہوگی۔ کمرے میں دربان سے بندوق چھین لینے اور بٹیا مارنے کے واقعے میں انہوں نے خوب لسانی طرازی کی۔ گھوش کے انہماک سے ان کی زبان اور رواں ہوتی رہی۔ وہ تکرار کرتے اور حیرانی کا اظہار کرتے رہے۔

"جناب! مجھے تو یہ عادی مجرم معلوم ہوتے ہیں۔" گھوش کا ماتحت زیادہ متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے دبی آواز میں اپنے افسر سے کہا۔

گھوش کچھ فکرمند سا نظر آتا تھا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا، ماتحت چپ ہو گیا۔

"آپ کا کیا وچار ہے؟ وہ اپنے سید بھائی سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟" لاکھی بابو نے کسمساتے ہوئے گھوش کو اکسایا۔

گھوش کے نتھنے پھول گئے "دیکھتے ہیں۔"

"ہم نے پیسوں کی بھی کیا بات کی تھی۔"

"پھر؟" گھوش نے چونک کے پوچھا۔

"پہلے ہم یہی سمجھے تھے لیکن وہ اس پر بھی نہیں ٹکا۔ بس ایک ہی رٹ لگائے رہا۔" بسودا نے لقمہ دیا۔

"میرا خیال ہے، میں نے اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے۔" گھوش نے بڑبڑاتے ہوئے انگریزی میں اپنے ماتحت سے کہا۔

"کہاں؟ کہاں جناب؟" ماتحت نے حیرانی سے پوچھا۔

"کچھ یاد نہیں آرہا؟" گھوش تذبذب سے بولا۔

"یاد آسکتا ہے، یاد کیجیے جناب!" ماتحت کا اشتیاق دیدنی تھا "اس سے بہت فرق پڑ سکتا ہے۔"

"یہی سوچ رہا ہوں مگر کہاں...؟"

"بہت سی جگہوں پر آپ کا تبادلہ ہوا ہے۔"

میں نے ذہن پر زور دیا۔ مجھے بھی کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ آسن سول سے کلکتہ اتنا دور نہیں ہے۔ ممکن ہے، کبھی کلکتے میں اس کا تبادلہ ہوا ہو۔ بٹھل کے اڈے کے علاقے سے وابستہ تھانے میں تو نہیں ہوا ہوگا۔ کلکتہ ایک بڑا شہر ہے۔ ہو سکتا ہے، شہر کے کسی اور علاقے میں وہ تعینات رہا ہو اور بٹھل سے کبھی اس کا آمنا سامنا ہوا ہو۔ جیل میں سات سال کے دوران بھی متعدد افسران آتے جاتے رہے تھے۔ گھوش کی شکل و صورت کا کوئی آدمی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ جس زمانے میں مجھ پر دوہرے قتل کا مقدمہ چل رہا تھا، تب مجھے ایسا کچھ ہوش نہیں تھا۔ کیا معلوم، اسی زمانے میں گھوش نے مجھے اور بٹھل کو دیکھا ہو۔ یہ بات تو طے تھی کہ اس کا ہمارا کوئی خاص ربط ضبط نہیں رہا ورنہ کم از کم بٹھل کے نقش اس کے دماغ میں دھندلے نہ ہوتے۔

نذرو اور بشارت، پھل، خشک میوے اور چائے کے طشت لے آئے تھے۔ انہوں نے سلیقے سے سامان میز پر چن دیا۔ کسی کو کھانے پینے سے رغبت نہیں ہو رہی تھی۔ بشارت نے چائے بنا کے پیالیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔ چائے کے چند ایک گھونٹ حلق میں انڈیل کے اور میوے کے دو چار دانے ٹونگ کے انہوں نے ہاتھ اٹھا لیے۔ گھوش نے جیبی گھڑی نکال کے وقت دیکھا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ملازموں نے راہداری روشن کر دی۔

بٹھل نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ نصیر بابا کی زبانی فروزاں اور یاسمن کا ماجرا میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ سب سے بڑی توانائی سچ کی ہوتی ہے۔ بٹھل نے مجھے ہدایت کی اور میں زنان خانے کی طرف چل پڑا۔ عورتیں سید ہی کی طرح قابو میں نہ آتیں تو مجھ سے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ فروزاں اور یاسمن کے کام آنے کے لیے تو میں کب سے منتظر، کب سے مضطرب تھا۔ مجھے معلوم تھا، سید کے شکنجے سے انہیں نجات دلانے کی سرخوشی بے قیمت نہیں ہوگی۔ ہمیں کوئی بہت بڑی قیمت بھی چکانی پڑ سکتی ہے لیکن مطلوبہ سرخوشی ہر قیمت سے بالا ہوگی۔ زنان خانے کے دریچے میں فروزاں کی تو میں نے ایک جھلک ہی دیکھی......... یاسمن کو بہت قریب سے دیکھا تھا، جب نصیر بابا کے ساتھ رات گئے وہ سہمی سہمی، چوروں کے مانند کمرے میں آئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے روئی تو بٹھل کی آنکھیں بھی چھلک گئیں۔ بٹھل کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔ شاید اسی لیے اس نے اسے جلدی واپس لے جانے کے لیے نصیر بابا کو اشارہ کر دیا۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ رات بھر یاسمن کا آنسوؤں بھرا چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہا۔

بٹھل کے پاس سید کو متلاطم کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ نصیر بابا سے بٹھل کی کتنی دیر میری بات ہوئی تھی۔ مسلسل بٹھل ہی سے ان کی چھنتی رہی تھی۔ کئی دنوں سے دونوں میں سرگوشیاں جاری تھیں۔ بٹھل نے خوب سوچ بچار کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا ہوگا۔ اندر کمرے میں سید کو وہ بہت کچھ باور کرا رہا ہوگا کہ اس کے اقدام میں یاسمن اور فروزاں کی منشا و ایما کس قدر شامل ہے۔ اندر وہ سید کو آئینہ دکھا رہا ہوگا۔ کبھی سید نے اپنی شکل... آئینے میں اتنی جزئیات سے نہیں دیکھی ہوگی۔ بٹھل کسی اور طرح بھی فروزاں اور یاسمن کو یہاں سے لے جانے کی تدبیر کر سکتا تھا مگر بہتر یہی تھا کہ ساتھ ہی سید کی آتشِ غضب سرد کر دی جائے۔ بٹھل کو اچھی طرح احساس ہوگا کہ اس کا واسطہ کیسے شاطر، کینہ خصلت اور درندہ صفت شخص سے ہے۔ ایسے بے حس، سنگدل، بد باطن اور بہروپیے سے نمٹنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہر آدمی کا ایک دائرہ ہوتا ہے، زندگی بھر وہ اسے سوا کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ سید نے یہی کام تو شدومد سے کیا ہے۔ اسے اپنے اثر و رسوخ کا بڑا زعم ہے اور کچھ غلط بھی نہیں۔ وہ ثبوت و شواہد کی بات کرے گا۔ بٹھل کے پاس بھی اب دلیلوں کی کمی نہیں۔ فروزاں، یاسمن اور نصیر بابا اور ہاں ظفر بھی۔ وہ چاروں اب ہماری تحویل میں ہیں بلکہ اب تو وہ اپنی تحویل میں ہیں۔

اپنے خدام کی اعانت کے بغیر تنہا سید سے اتنے سنگین جرائم سرزد نہیں ہوئے ہوں گے۔ اب تک یہ معتقد اس کے حصار میں رہے، کسی نے ان کی جاں نثاری و وفا شعاری، آزمائش سے دوچار نہیں کی۔ اپنا سب سے زیادہ وفادار، سب سے بڑا دوست آدمی خود ہوتا ہے۔ کہتے ہیں، ہر امانت جو دوسرے کے پاس ہے، دوسرے کی صوابدید پر ہے۔ دوسرا کتنا ہی معتبر اور امین ہو، پہلے اور دوسرے آدمی کی مکمل یکجائی ممکن نہیں ہوتی۔ ترکِ وفا کی توفیق ہر کس و ناکس کو سزاوار نہیں ہوتی، معدودے چند ہی اس رتبے پر فائز ہوتے ہیں اور، وہ اور لوگ ہوتے ہیں۔ دو آدمی بہرحال دو آدمی ہیں۔ سید کے تمام خدمتگار جنسِ بازار ہیں۔ اطاعتوں کی خرید و فروخت اس بازار میں عام ہے۔ نیلام چیزوں ہی کا نہیں ہوتا، کسی نے کہا ہے، ہر آدمی نیلام پر ہے۔ تیسری صورت شاذ شاذ، خال خال ہے، آدمی پر غلبہ و تسلط کی دو ہی صورتیں مستند ہیں۔ اس پر مال وزاری کیا جائے یا اسے مال و زر سے عاری کر دیا جائے۔ جو مال و زر سے مغلوب نہیں ہوتا، وہ زور و زبر، زور و جبر سے ہو جاتا ہے کیونکہ آدمی بہر انداز زندگی کا خواہش مند ہے۔ کوئی سید سے بڑا اقبال مند، طالع آزما، سید سے بڑا حاکم و جابر کمند انداز ہو تو سید کے موجودہ خدام اس کے خلاف سب سے بڑی شہادت ہیں۔ زنان خانے میں رئیس بیگم کی زیردستی کا سبب میری بالادستی تھا۔ میں تھا، میرا چاقو تھا لیکن دوسرے طور سے بھی اس سے معاملت کی جا سکتی تھی، کی جا سکتی ہے۔ وہ بے تحاشا، بے محابا اپنے نفس کی اسیر ہے۔ اب تک رئیس بیگم کا نفسِ امارہ کسی نے نہیں چھیڑا۔

...ل کے پاس سید سے کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔
...د کی اپنی دو بیویوں' فروزاں ' یاسمن کی ماں اور باپ اور
...نے کون کون۔۔۔ آمن سول میں قیام کے بعد سید کا سارا
...فر' یہ جاہ و حشمت' شان و شوکت' کہاں سے کہاں تک کا
...فر۔ کسی نے اب تک حرف زنی نہیں کی تھی۔ حرف زنی کے
...لیے جستجو اور حوصلہ بھی شرط ہے۔ سچ اگر بڑی توانائی ہے تو
جھوٹ ناتوانی کا باعث بھی ہونا چاہیے۔ دولت بہت بڑی
طاقت ہے لیکن دولت مند بہت کمزور آدمی ہوتا ہے۔ سید
محمود علی بہت عیار و مکار شخص ہے مگر یہ اس کی خامی ہے اور
ہر خامی کبھی نہ کبھی کسی زیاں پر منتج ہوتی ہے۔

مجھے امید تھی کہ بچھل سرخ رو کمرے سے واپس آئے
گا۔ گو یہ امید خواہش پر مبنی تھی لیکن خواہش یا طلب کے بغیر
کوئی بھی امید بے معنی ہے۔ خواہش اور طلب ہی سے امید
استوار ہوتی ہے اور اگر بچھل یوں ہی ناکام واپس آگیا تو اس
کا مطلب یہ بھی نہیں ہوگا کہ فروزاں اور یاسمن کو ترک
کرکے آیا ہے۔ وہ کوئی عزم کرکے ہی اندر گیا ہوگا۔

میرا سر کوئی دھنک رہا تھا' طرح طرح کے وہم' تکرار'
حجت' تاویلیں اور دلیلیں۔ میں وہاں بیٹھا قیاس آرائیاں ہی
کرسکتا تھا۔ رات پوری طرح چھاچکی تھی۔ آسمان پر طاری
بادلوں نے راہداری کے اطراف پھیلا ہوا اندھیرا شدید کردیا
تھا۔ اندھیرا گہرا ہو تو روشنی بھی گہری ہوجاتی ہے۔ راہداری
اور روشن ہوگئی تھی۔ لاکھی بابو' بسودا' پولیس افسر گھوش اور
اس کا ماتحت شروع شروع میں بہت سرگرم تھے' اب خاصی
دیر سے ان پر ایک ہیجانی خاموشی مسلط ہوگئی تھی۔ میری طرح
انہیں بھی سید اور بچھل کے باہر آجانے کا شدت سے انتظار
تھا۔ مجھے کم از کم اندر ہونے والی گفت و شنید کی نوعیت کا علم
تھا' وہ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں گے اور سرے
ڈھونڈ رہے ہوں گے اور کچھ ان کے ہاتھ میں نہیں آرہا
ہوگا۔ وقت جیسے لنگڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ گھوش نے کئی بار
گھڑی دیکھی۔ آخر ان دونوں کو اندر گئے ایک گھنٹے سے اوپر
ہوگیا تو گھوش نے ایک سپاہی دروازے پر بھیجا۔ اس نے پہلے
کان لگا کے سن گن لینے کی کوشش کی' پھر گھوش کی اجازت
سے آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے انتظار کے لیے کہا گیا'
آواز سید کی تھی۔ سپاہی کے جواب سے انہیں کچھ تسلی
ہوگئی۔ شاید یہ جان کے کہ سید ابھی زندہ ہے اور ہوش و
حواس بھی قائم ہیں۔

کچھ اور وقت گزرا تو گھوش کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کے
ساتھ اس کا ماتحت' پھر لاکھی بابو اور بسودا بھی۔ گھوش چہل
قدمی کرتا ہوا دروازے کے قریب گیا اور ٹھہرا رہا۔ اندر سے
آنے والی آوازیں یا تو مدھم تھیں یا واضح نہیں تھیں۔ گھوش
نے سپاہی کے مانند دروازے سے کان نہیں لگائے' وہاں سے
ہٹ آیا۔ سپاہی نے اس کی خواہش پر پانی پیش کیا۔ گھوش
نے کھڑے کھڑے سارا گلاس انڈیل لیا اور کچھ دیر یونہی ٹہلتا
رہا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا "یہ اندر کیا کررہے ہیں؟" وہ...
بڑبڑاتے ہوئے اپنے ماتحت سے انگریزی میں بولا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا جناب!" ماتحت نے اضطراری
لہجے میں جواب دیا "ہمیں اور کتنی دیر انتظار کرنا چاہیے؟"

کچھ توقف کے بعد لاکھی بابو' بسودا اور گھوش کا ماتحت
بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے آس پاس کھڑے ہوئے
لوگوں کے شانے ڈھلک گئے تھے۔ دربان نے بندوق نیچی کرلی
تھی۔ سپاہیوں نے بھی بندوق کی بٹیں فرش سے ٹکادی
تھیں۔ ان سب کی نظروں کا ہدف میں تھا یا کمرے کا دروازہ۔
میری حیثیت کسی یرغمالی کی تھی بلکہ اصل میں تو میں کسی
اچھوت سے بدتر تھا۔ میرے پیروں میں بیڑی نہیں تھی لیکن
میں نہ کہیں جاسکتا تھا' نہ آسکتا تھا۔ میں نے ایسی کوئی کوشش
بھی نہیں کی۔

بسودا اور لاکھی بابو' پولیس افسر گھوش کا بڑھتا ہوا
اضطراب محسوس کررہے تھے اور کچھ پشیمان سے نظر آنے
لگے تھے۔ چنانچہ اس تاخیر پر وہ تعجب کا اظہار کرنے لگے۔ ان
کی سرگرانی کا نہ جانے کیا عالم ہوتا اگر کچھ اور وقت اسی
طرح گزر جاتا۔ مگر جلد ہی دروازے پر ہونے والی آہٹ سے
وہ ہڑبڑا گئے۔ ہر شخص میں بجلی سی دوڑ گئی۔ گھوش کا جسم تن
گیا۔ اس کا ماتحت بھی کرسی پر نیم ایستادہ ہوگیا۔

جالی کا دروازہ کھلنے پر وہ دونوں برآمد ہوئے۔ آگے سید
محمود علی تھا۔ میرا دھڑکتا ہوا دل ایک لمحے کے لیے تو بند ہوگیا'
دوسرے لمحے سب کچھ عیاں تھا۔ سید کا چہرہ میرے سامنے
تھا' دھندلا دھندلا' دھواں دھواں' پیشانی پر سلوٹیں پڑی
ہوئی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں جیسے عمر بڑھ گئی ہو۔ وہ سارے
ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ لاکھی بابو' بسودا' گھوش اور اس
کے ماتحت نے سید کے قریب آنے کا انتظار نہیں کیا' آگے
جاکے اسے گھیر لیا۔ سید کی نظریں جھکی ہوئی تھیں "کیا
بات ہے؟" بسودا نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سید نے بوقت کہا "کچھ نہیں۔"

"اتنی دیر کیوں ہوگئی؟" لاکھی بابو نے بے قراری سے
سید کا بازو پکڑ لیا۔

"ہوگئی بس۔" سید نے پژمردگی سے کہا۔

"کیا' کیا کہتا ہے وہ؟"

"بتاؤں گا۔" سید نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔

"تم ٹھیک تو ہو بھیا؟" لاکھی بابو نے آشفتگی سے پوچھا۔

"ہاں۔" سید نے انہیں مطمئن کرنے کی ناکام کوشش
کی "میں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اس نے تمہیں' تمہیں۔۔۔" لاکھی بابو نے بدحواسی
سے پوچھا "کوئی چالبازی تو نہیں ہوئی؟ بولو نا بھیا۔"

بچھل دروازے سے باہر آکے میرے پاس بیٹھ گیا تھا'
میری سوالیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے آنکھیں
موند لیں پھر مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔
میری رگوں میں خون دھمک رہا تھا۔

پولیس افسر گھوش حیران و پریشان سا کھڑا کبھی سید کا چہرہ
دیکھتا' کبھی کرسی پر دراز بچھل کا "کیا کہتا ہے یہ' کچھ بتایا؟"
اس نے افسرانہ انداز میں سید سے پوچھا۔

کوئی جواب دینا سید کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے
ادھر ادھر بے چارگی سے دیکھا اور بجھی ہوئی آواز میں بولا
"معافی چاہتا ہوں گھوش بابو! آپ کو زحمت ہوئی۔ آپ کا
خاصا وقت برباد ہوا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" گھوش اچھل سا گیا۔

"مجھے' کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی۔" سید نے معذرت
خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کیسی غلط فہمی؟"

"تفصیلی بات ہے' اس وقت مجھ سے کچھ نہ پوچھئے تو بہتر
ہے۔"

"کیا بات ہے سید صاحب؟" گھوش اپنی حیرت و تشویش
پر قابو پانے سے قاصر تھا۔

"ہم غلط سمجھ رہے تھے۔" سید نے لفظ چبا چبا کے کہا۔

"لڑکیاں! لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"وہ' وہ ٹھیک جگہ چلی گئی ہیں۔"

"ٹھیک جگہ! پھر یہ' یہ سب کیا تھا؟"

"میں نے کہا نا' غلط فہمی ہوگئی تھی۔"

گھوش کو یقین نہیں آیا "صاف کہئے سید صاحب!" اس
کا لہجہ حاکمانہ ہوگیا "یہ کس طرح ہوا؟ آپ سے اس نے کیا
بات کی؟"

"مجھے حقیقت معلوم نہیں تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے'
مجھے پہلے ان سے بات کرلینی چاہیے تھی۔ آپ سب کو
پریشانی ہوئی۔" سید نے ہاتھ جوڑ لیے "مجھے معاف کردیجئے۔
یہ لوگ ایسے نہیں ہیں' جیسا' جیسا ہم سمجھے تھے۔"

"کچھ چھپاؤ نہیں سید! تم بہت دکھی لگتے ہو۔" لاکھی بابو
نے بے تابی سے کہا "ہماری پریشانی چھوڑو۔ تمہیں کیا ہوگیا
ہے؟ دیکھو' دیکھو' اگر ایسی ویسی کوئی بات ہے تو کھل کے ہم
سے کہو' ابھی گھوش بابو یہیں ہیں۔"

"جتنا میں کہہ رہا ہوں' اتنا ہی سمجھو بھائی۔" سید نے
عاجزی سے کہا۔

"کیسے سمجھ لیں' یہ کیا! تمہاری کوئی بات نہ من کو لگ
رہی ہے نہ مستک کو۔" بسودا نے شکایت کی "لگ رہا ہے'
اس نے دھمکایا ہے تم کو۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے کہنے لگا
"سمجھ لو' یہ دونوں ایسے یہاں سے نہیں جاسکتے۔ ہم ابھی زندہ
ہیں۔ ہم کو صاف صاف بتاؤ بھیا' بات کیا ہے؟"

"بات مت بڑھاؤ بسودا! اب ختم سمجھو' ختم کرو۔" سید
نے دوبارہ ہاتھ جوڑ لیے۔

"ہم انہیں تھانے لے جاتے ہیں۔" گھوش نے حکم
سنایا۔

"نہیں نہیں گھوش بابو! اس کی ضرورت نہیں ہے
اب۔ میرے ان کے درمیان سب کچھ طے ہوچکا ہے۔ یہ
میرے مہمان ہیں۔"

گھوش کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے پلٹ کے رنج اور غصے
سے اپنے ماتحت کو دیکھا' کچھ کہہ نہ سکا۔ ماتحت نے مایوسی
سے کہا "یہ حیران کن ہے جناب! نہایت پراسرار۔"

"اس نے ضرور سید کو ڈرایا دھمکایا ہے۔" گھوش نے
جھجکتے ہوئے رائے ظاہر کی "مگر ہم کیا کرسکتے ہیں؟"

"بے شک جناب! کوئی شکایت نہ ہونے کی صورت میں
ہم کیا کرسکتے ہیں۔" ماتحت نے اپنے افسر کی تائید کی۔

"مگر سید کو کہیں بعد میں پریشانی نہ ہو۔ وہ کیسا مجبور اور
ہراساں معلوم ہو رہا ہے۔ تم نے اس کا حال دیکھا؟ اب وہ
بالکل ایک بدلا ہوا آدمی نظر آتا ہے۔"

"وہ خود انہیں ہمارے سپرد کرنے پر آمادہ نہ ہو تو ہم کیا
کرسکتے ہیں جناب۔"

"ہم اپنے طور پر کارروائی کرسکتے ہیں۔"

وہ انگریزی میں باتیں کررہے تھے۔ میں نے سوچا' میں
دخل دوں۔ مجھے پہلو بدلتے دیکھ کے بچھل میری نیت بھانپ
گیا' اس نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے خاموش رہنے کی تاکید
کردی۔

لاکھی بابو اور بسودا سید کو گھوش سے کچھ فاصلے پر لے
گئے تھے اور سید کی قلب ماہیت کا سبب جاننے کی کوشش
کررہے تھے۔ ان کی گفتگو کی بھنبھناہٹ ہی ہم تک پہنچ رہی

گھوش کے اس خیال پر کہ وہ ہمیں تھانے لے جاکے طور پر کارروائی کرسکتا ہے' اس کے ماتحت نے مودبانہ مشورہ دیا "اور اگر سید محمود علی ہی ان کی حمایت پر ہوگیا جناب تو کیا ہوگا۔ سید تھانے میں بھی ان کی وکالت کرسکتا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہمیں ان کو یہاں سے لے جانے کی اجازت بھی دے گا۔"

"اس کی اجازت کے بغیر ہم انہیں یہاں سے لے جاسکتے ہیں ورنہ ہم معاملے کی تہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔" گھوش نے برہمی سے کہا۔

"وہ مشکل لوگ معلوم ہوتے ہیں۔" ماتحت زیادہ ذہین اور ہوش مند افسر معلوم ہوتا تھا۔ وہ محتاط لہجے میں بولا "تھانے میں وہ ہمارے لیے پیچیدگی کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ وہ بہت پختہ کار لوگ ہیں۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے سید محمود علی پر برتری حاصل کرلی ہے اور دیکھیے' وہ کس اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ یہ اعتماد بے جواز تو نہیں ہوگا جناب! لڑکیوں کو یہاں سے لے جانے کے معاملے میں' ہوسکتا ہے' کوئی اور کہانی' کوئی اور رمز بھی پوشیدہ ہو۔ خیال رہے کہ وہ سید کی بیٹیاں نہیں ہیں' اس کے مرحوم دوست کی بیٹیاں ہیں۔ ہوسکتا ہے' یہ اغوا نہ ہو' فرار ہو اور اس میں ان لڑکیوں کی مرضی بھی شامل ہو۔ کسی ملازم نے اب تک یہ نہیں بتایا ہے کہ انہیں زبردستی یہاں سے لے جایا گیا ہے۔ کوئی ایسی شہادت اب تک سامنے نہیں آئی۔ گھر کا ایک پرانا اور بوڑھا ملازم بھی ان کے ساتھ گیا ہے۔"

گھوش توجہ سے سنتا رہا پھر مکدر آواز میں گویا ہوا "نہیں ورغلایا بھی تو جاسکتا ہے۔"

"اس کے یہ معنی بھی لیے جاسکتے ہیں جناب کہ وہ یہاں خوش نہیں تھیں۔ ان میں ایک لڑکی بڑی عمر کی ہے۔ وہ اتنی نادان نہیں ہیں۔ وہ پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں اور جناب! یہ شخص جو ان کے ساتھ گیا تھا' واپس کیوں آگیا؟ وہ سید سے گفتگو کے لیے کیوں اس قدر مصر تھا اور اسے خلوت ہی کیوں مطلوب تھی۔ ہم اس نکتے پر غور کیوں نہ کریں کہ واقعات وہ نہیں ہیں جو ہم سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہم نے صرف ایک طرف کا بیان سنا ہے۔"

"لیکن دوسرے کوئی بیان دینا نہیں چاہتے۔"

"نہیں اب بیان دینے کی ضرورت بھی کیا ہے جناب!"

"ہمیں الگ لے جاکے سید کو ٹٹولنا چاہیے؟ سید سے پرانا تعلق خاطر ہے۔ کہیں اسے ہماری مدد کی ضرورت تو نہیں؟"

ماتحت نے اپنے افسر سے اتفاق کیا۔ گھوش نے پھر کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ لاکھی بابو اور بسودا سید سے الگ ہٹ گئے تھے' دونوں افسروں نے سید کو ان سے جدا کردیا۔ ان کا رخ عقبی سبزہ زار کی جانب تھا۔ کچھ دور تک وہ نظر آتے رہے پھر اوجھل ہوگئے۔

میں نے نہیں دیکھا' درمیان میں ان کے آقا سید محمود علی نے اشارہ کیا ہوگا' دربان سمیت تمام ملازمین رفتہ رفتہ وہاں سے ہٹ گئے۔ دونوں سپاہیوں نے بندوقیں شانے پر لٹکالیں۔ ہم سے کچھ دور لاکھی بابو اور بسودا ایک دوسرے کو قائل و معقول کررہے تھے۔

سید' گھوش اور اس کے ماتحت کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہوگی کہ تینوں عقبی سبزہ زار کی جانب سے واپس آتے دکھائی دیے۔ ہمارے روبرو ہوکے گھوش ٹھہرا رہا اور بٹھل کو خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا "آپ کو بڑی تکلیف ہوئی صاحب!" بٹھل کی آواز طنز اور تصنع سے عاری تھی۔

گھوش کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اس نے ہنکاری بھری' پلکیں جھپکائیں اور تیزی سے مڑگیا۔ لاکھی بابو اور بسودا اسے یوں جاتا دیکھ کے بے کل سے ہوگئے۔ گھوش نے پلٹ کے دیکھا نہ ان کی کسی صدا کا جواب دیا۔ وہ سنی ان سنی کرتا راہداری میں بڑھتا رہا اور دور ہوتا گیا۔ لاکھی بابو اور بسودا بھی اس کے تعاقب میں لپکتے ہوئے مدھم روشنیوں میں گم ہوگئے۔

سید محمود علی تنہا رہ گیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ کرسی پر ڈھیر ہوکے وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔ اتنی دیر میں لاکھی بابو اور بسودا پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ واپس آگئے اور کرسیوں پر ڈھے گئے۔ سید کی بے نیازی پر انہوں نے رسمی اجازت چاہی تو سید نے رک جانے کے لیے ایک لفظ نہیں کہا۔ ہاں' رسمی طور پر شکریہ ادا کیا اور معذرت کی۔ دونوں پھر وہاں نہیں ٹھہرے۔

بٹھل نے بیڑی سلگائی اور چند لمبے کش لے کے سبزہ زار پر پھینک دی اور کرسی سے اٹھ کے کچھ فاصلے پر سید محمود علی کے پاس جاکے بیٹھ گیا "ہم کو جانا ہے۔" اس نے بھاری آواز میں سید سے کہا۔

سید چونک پڑا۔ خاصے تامل کے بعد اس نے زبان کھولی "آپ سویرے بھی جاسکتے ہیں۔" اس کی آواز ٹھٹھری ہوئی تھی۔

بٹھل نے انکار کردیا "ہم کو ساری چیزیں واپس کردو

سارا گہنا' روپیہ پیسہ' زمین' مکان کے کاغذ' نکاح کا کاغذ' جو کچھ بھی ان کا ہے' ابھی اسی ٹائم۔"

سید کا سر جھکا ہوا تھا۔

"کوئی چیز رہ نہ جائے' کہیں ہم کو لوٹ کے آنا پڑے پھر۔"

"مجھے کچھ دیر لگ سکتی ہے۔" سید نے چٹختی آواز میں کہا۔

"پر زیادہ نہیں' ہم کو گاڑی پکڑنی ہے۔"

آہستہ قدموں سے سید محمود علی زنان خانے کی طرف چل پڑا۔ اس کے دور ہوتے ہی بٹھل نے مجھے کمرے سے سامان باہر لانے کی ہدایت کی۔ یہ وقت کچھ پوچھنے کا نہیں تھا۔ میں نے خود پر جبر کیا۔ اتنا ہی بہت تھا کہ ہم سلامتی سے واپس جارہے تھے۔ بکھرا ہوا سامان میں نے پہلے ہی سمیٹ لیا تھا' سامان تھا ہی کتنا۔ دو اٹیچیاں' ایک بٹھل کی' ایک میری' ایک بیگ۔ میں بہ عجلت باہر آگیا۔

ابن' سید کے حکم کے بغیر ہمارے پاس نہیں آیا ہوگا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ہمیں سلام کیا اور پوچھا کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ چائے' شربت' پھل وغیرہ؟ کھانا بھی تیار ہے؟ بٹھل نے منع کردیا۔ ابن نے حقے کی پیشکش کی تو بٹھل سے انکار نہ کیا جاسکا۔ وہ دوڑتا ہوا کمرے میں گیا۔ اس نے کمرے سے ملحق غسل خانے میں حقہ تازہ کیا ہوگا۔ حقے کا نیچا بھیگا ہوا تھا۔ فرش پر بھی بوندیں چھلک رہی تھیں۔ چلم اٹھاکے وہ ایک طرف بڑھ گیا اور منٹوں میں واپس آگیا۔ جلدی جلدی پھونکیں مار کے اس نے کوئلے دہکائے اور منال بٹھل کے آگے کردی۔ چلم ابھی پوری طرح دہکی نہیں تھی۔ بٹھل چلم سے شغل کرتا رہا اور یوں ہی حقہ گڑگڑاتا رہا پھر دھویں کے مرغولے اس کے منہ سے ابلنے لگے۔ اطراف میں خمیرے کی خوشبو پھیل گئی۔ ابن ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے بہت دیر بعد جرات کی اور منمناتی آواز میں بٹھل سے پوچھا "آپ جارہے ہو بابا؟"

"ہاں رے' آگے جانا تو ہر جگہ سے پڑتا ہے۔" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"ہم سے کوئی قصور ہوگیا ہو تو...." ابن کی زبان اٹک گئی۔

"وہ تو اب ہو رہا ہے تجھ سے۔"

ابن کی سمجھ میں نہیں آیا؟ وہ بوکھلا سا گیا اور مسمسا کے بولا "ہم حکم کے غلام ہیں۔"

"پر آدمی تو پورا ہے۔"

"جی' میں۔" وہ ہکلانے لگا۔

"تھوڑا ایدے بھی کھلے رکھا کر۔"

ابن نے سر جھکالیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"کچھ پاس بھی رکھ۔ پورا بیچ دیا کیا۔"

ابن کو کسی کے آجانے اور دیکھ لینے کی پروا نہیں تھی۔ اس نے بڑھ کے بٹھل کے پیر پکڑ لیے۔ بٹھل کا اس کے سر پر تھپکی دینا اور غضب ہوا۔ وہ تو پھڑکنے لگا "مجھ کو بھی ساتھ لے لو بابا!" اس نے بلکتی آواز میں کہا "میرا کوئی نہیں ہے یہاں۔"

"تیرا مالک ہے ادھری۔"

"نہیں بابا! اب یہاں رہنے کو من نہیں کرتا۔" وہ فریادی لہجے میں بولا "میرا ہاتھ بھی تھام لو۔ آپ کی اور چھوٹے صاحب کی خدمت کروں گا زندگی بھر۔ کبھی کوئی شکایت ہو تو جوتے مارنا' جوتے مار کے نکال دینا۔"

"ہم کو لوٹ کے گھر جانا ہے رے' پھر آنا ہوا تو دیکھیں گے یا بلوالیں گے کسی سے۔" بٹھل نے اسے تسلی دی۔ وہ یہی کرسکتا تھا۔

"نانا' بابا! منع مت کرو' منع مت کرو۔" وہ بٹھل کے پیروں سے سر رگڑنے لگا۔ بٹھل کو مکدر دیکھ کے میں نے اسے اٹھایا۔ ابن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بٹھل نے جیب سے روپے نکالے اور گنے بغیر اسے دینے چاہے۔ ابن نے ہاتھ نہیں لگایا اور گڑگڑا کے کہنے لگا کہ اسے روپے پیسے نہیں' ہمارا سایہ' ہماری سرپرستی چاہیے۔ وہ زندگی بھر ہم سے ایک دمڑی کا طلبگار ہو تو نطفہ ناتحقیق۔

"ابھی کچھ نہیں بول سکتے رے' ابھی ادھری بنا ڈالے رکھ۔" بٹھل نے منال ہونٹوں سے لگائی۔ میں نے نوٹ ابن کی جیب میں ٹھونس دیے۔ جانے کب کے رکے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔ میں نے اس کی دل جوئی کرنی چاہی اور ناچار اسے چھوڑ کر کرسی پر آبیٹھا۔ میرا بس چلتا تو فوراً ہامی بھرلیتا۔ اس نے گزشتہ دنوں ہماری بہت خدمت کی تھی مگر بٹھل نے کچھ سوچ کے ہی یہ عمل کیا ہوگا۔ سو میں اس کی سفارش بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے آنسو میرا سینہ جلاتے رہے۔

ابن کی توجہ ہٹانے اور اسے وہاں سے ہٹانے کے لیے بٹھل نے اسے کمرے میں جاکے ایک نگاہ ڈالنے کی ہدایت کی کہ کہیں ہمارا کچھ سامان وہاں رہ تو نہیں گیا ہے۔ ابن ایسا کم عقل بھی نہیں تھا۔ سمجھ گیا ہوگا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں چلا گیا۔

سید کو گئے ہوئے گھنٹے بھر سے اوپر ہو گیا تھا۔ ابن کے
...ں ملازم اس طرف نہیں آیا۔ ابن بھی تھوڑی دیر بعد
...ے کا معائنہ کرکے واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔
...ب جانب راہداری کے تھم سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔
...نے پھر جھمل سے کوئی منت نہیں کی لیکن اس کی خاموشی
...ے خود ایک التجا تھی۔

رات اور بڑھ گئی تھی۔ مینڈکوں اور جھینگروں کا شور
...ے کا احساس اور سوا کر دیتا ہے۔ ہر طرف سکوت طاری
...گھر میں کوئی موت ہو گئی ہو جیسے' ایسا سکوت۔ کل یہاں
...وقت بہت ہلچل تھی۔ بیہودی سکوت کی نسان خانے کی چیخ
...ے کوئی نسبت نہیں۔ جھمل کے پاس وقت گزاری کے
...ے حقے کا مشغلہ تھا' میرے پاس انتظار کے سوا کچھ نہیں
... انتظار سے بدترین مشغل کوئی نہیں ہوتا اور زندگی بیشتر
...نتظار ہی سے عبارت ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی انتظار' ایک
...ے بعد دوسرا انتظار۔ شام سے صبح کا' اندھیرے سے اجالے
...ا انتظار۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بڑے عرصے پر پھیلے
...وئے انتظار میں آدمی کو صبر آجاتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے
...انتظار بہت جان لیوا ہوتے ہیں۔ اب سارے مرحلے نمٹ
...جانے کے بعد سید محمود علی کا انتظار تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اس
...وقفے میں رنگے سیار کے دماغ میں کوئی اور کیفیتی نمو پا
...جائے۔ زنان خانے میں رئیس بیگم نے اس کا حوصلہ بڑھایا
...ہوگا۔ ابھی ہم اس کے گھر میں بیٹھے تھے۔ امکان تو نہیں تھا
لیکن سید پر اعتبار نہ کرنے کے جواز بے شمار تھے۔

جھمل اپنے آپ میں مگن تھا۔ میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اب سب کچھ نمٹ چکا ہے۔ آزمائش کا ایک دن گزر چکا ہے' کیسا طویل اور صبر آزما دن۔ یہ دن کوئی بھی رخ اختیار کر سکتا تھا۔ اب رفت گزشت کے مصداق سب کچھ فراموش کر دینا چاہیے۔ آنے والا وقت یقیناً ایسا کرخت اور گراں نہیں ہوگا۔ خوش امیدی کیسی ہی غیر واقعی ہو' باعث راحت ہوتی ہے۔ ہر امید اچھے برے خواب کی طرح ہوتی ہے۔ تعبیر مثبت نکل آئے یا مایوس کرے۔ تعبیر تو قریب ہے اگر خود بخود ہی سے قرار آجایا کرتا تو نجات ہی نجات تھی۔ آدمی کا سارا جسم اس کے اختیار میں ہوتا ہے' بجز دماغ کے۔ آدمی سب سے بے اختیار اپنے دماغ سے ہوتا ہے۔ لوگ دل اور دماغ الگ الگ تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں' دونوں کا مزاج ہی جدا ہے اور دونوں میں کوئی ضد سی ہے۔ کبھی دل غالب آجاتا ہے' کبھی دماغ۔ یہ ساری شاعرانہ باتیں ہیں۔ بے شک دل اور دماغ دونوں جدا جدا ہیں مگر دل کو تو بس دھڑکنا آتا ہے۔ دونوں میں اختلاف و انحراف کی کوئی ربط باہم نہیں ہے۔ یہ دماغ ہی ہے جو اپنے آپ سے ضد کرتا ہے اور آپ ہی مان جاتا ہے۔ آدمی کا کوئی ایک دماغ نہیں ہوتا یوں کہا جائے' ایک دماغ میں کئی دماغ ہوتے ہیں جو بیک وقت مختلف سمتوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ دماغ آدمی سے بہت شوخیاں کرتا ہے' ستم ناک حد تک۔ یہ آدمی کا ہر وقت امتحان لیتا رہتا ہے' رلاتا' ہنساتا' خود ہی سوال کرتا' خود ہی جواب دیتا ہے۔ پیچ چوڑا ہے' پر لا کے کبھی اس طرف کبھی اس طرف اشارہ کرتا ہے۔ جانے کب کسی دانش مند نے خواہشوں' خوش امیدیوں اور اداسیوں کے سارے معاملات دل سے وابستہ کیے تھے' باقی دماغ سے۔ یعنی کیفیت دل سے' کمیت دماغ سے مشروط ہے۔ حالانکہ اس تقسیم و تفریق کا حاصل ہی کیا' دونوں کا واسطہ آدمی سے ہے۔ دونوں کے وظائف ایک ہوں یا جدا جدا۔ ان پر قابو پالینا سب سے بڑا ہنر' سب سے بڑا اختیار ہے۔ ایسے ہنرمند اور مختار لوگ بہت کم ہوتے ہیں مگر ہوتے ضرور ہیں۔ ایک تو میرے سامنے ہی بیٹھا تھا' ہر تعبیر کے لیے آمادہ۔

کچھ دیر کے لیے' کم از کم سید کے آنے تک میں اپنے آپ کو بیگانہ رکھنے میں ناکام رہا۔ ہاتھ پیر بکھرتے رہے تھے۔ اس وقت نیند کا کوئی سوال نہیں تھا مگر ایک گہری نیند کے لیے آنکھیں مچلتی' آنکھیں ترستی تھیں۔ ایک ایسی نیند جو دل و دماغ کو فکر و تجسس' اندیشہ و وہم کی آلائشوں سے بے نیاز کردے۔ ایسی نیند تو کب کی مجھ سے دور ہو چکی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا' جھمل لاکھ حجت کرے' اس بار میں اڑ جاؤں گا کہ اب کہیں اور جانے کے بجائے ہمیں فیض آباد ہی جانا ہے۔ کچھ دن وہاں آرام کرکے ہم پھر روانہ ہو سکتے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ کسی کھوہ میں چھپے ہوئے مولوی صاحب تک ایک روز ہماری رسائی ہو جائے گی۔ میری آس ابھی نہیں ٹوٹی ہے۔ یہ جاں کاہی و جاں سوزی کسی نہ کسی دن ضرور بار آور ہوگی لیکن میں اس سے کس طرح کہوں' اپنا عذاب مجھے خود جھیلنے دو۔ اسے کیا معلوم' اس کی ہم رکابی بار بار مجھے کیسی پشیمانی اور آزردگی سے دوچار کرتی ہے۔ دوسرے کو کسی کا آزار ایک حد تک ہی جھیلنا چاہیے۔ میں نے طے کر لیا تھا' میں اب اس کی ایک نہیں چلنے دوں گا۔ آگے جانے سے قطعی انکار کردوں گا لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو ہم اس گھر' اس زنداں میں موجود ہیں۔ سب سے بڑا مرحلہ تو یہاں سے نکلنے کا ہے۔ جانے کیوں مجھے بہت بے کلی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا' ہم یہاں برسوں سے قید ہیں۔ در و دیوار زہر لگ

رہے تھے۔

ابن ہم سے اجازت لے کے چلا گیا تھا مگر جلد ہی واپس آکے کھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ جھمل تیار نہیں ہوا۔ اس کا حقہ بھی دم توڑ چکا تھا۔ اس نے نئی چلم بھرنے سے بھی منع کردیا پھر نذرو ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے جھمل کو اور مجھے سلام کرکے سید کے آنے میں تاخیر ہو جانے پر معذرت کی اور بتایا کہ اس کا مالک اب آیا ہی چاہتا ہے۔

دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے' زنان خانے کی جانب سے سید محمود علی برآمد ہوا۔ وہ اکیلا تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ جھمل کا اطمینان بے سبب نہیں تھا۔ سید کے ہاتھوں میں ایک بڑے رومال میں لپٹا ہوا کچھ سامان تھا۔ ابن اور نذرو کو اس نے چلے جانے کا حکم دیا۔ ان کے دور ہو جانے پر اس نے سامان میز پر رکھ کے رومال کھول دیا۔ یہ ایک خاصا بڑا صندوقچہ تھا' زیوروں سے بھرا ہوا "یہ سارے زیور انہی کے ہیں۔" سید ڈوبی ہوئی آواز میں گویا ہوا "یہ انہی کی تحویل میں تھے۔ معلوم نہیں کیوں' چلتے وقت وہ انہیں چھوڑ گئیں۔ چابیاں بھی ان کے پاس تھیں۔ چابیاں تلاش کرنے میں دیر لگ گئی۔ تالا توڑنا پڑا۔" صندوقچے کے نیچے ایک دبیز چرمی مسل دبی ہوئی تھی۔ سید نے وہ نکال کے جھمل کے سامنے کردی "یہ ان کے مکان اور زرعی زمین کے کاغذات ہیں۔ باپ کے مرنے کے بعد جائداد ماں اور بیٹیوں کے نام منتقل ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے نام کچھ منتقل نہیں کرایا۔"

"وہ تو تمہارا ہی ہو جاتا۔"

سید نے مضطربانہ ایک نظر جھمل کو دیکھا اور سر جھکا لیا "ماں اور بیٹیوں نے ایک مختار نامہ میرے نام کردیا تھا' ماں کی موت کے بعد وہ کالعدم ہو گیا۔ بیٹیوں کی طرف سے اس کی ترمیم اور تجدید نہیں کرائی گئی۔ یہ مختار نامہ بھی' جس کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی' کاغذات میں موجود ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔"

جھمل نے مسل میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ایک ایک کرکے کاغذات کا جائزہ لیا۔ مجھے ان کے اصلی نقلی ہونے کی ایسی تمیز نہیں تھی تاہم میں بغور دیکھتا رہا۔ ان میں جو نام درج تھے۔ باقاعدہ سرکاری مہریں کندہ تھیں۔ دستخط کے نیچے عدالتی ٹکٹ چسپاں تھے۔ کاغذ بھی عدالتی تھا۔

"اور نکاح کا پرچا؟" جھمل نے کھردری آواز میں پوچھا۔

"وہ بھی ان میں ہے' بالکل آخر میں۔" سید کے ہاتھ بھٹک رہے تھے "دیکھیے۔" اس نے مسل کے کاغذات پلٹ کے مجھے نکاح نامہ دکھایا۔ اس پر سید' فروزاں اور یاسمن کی ماں' نصیر بابا' قاضی اور کئی اور لوگوں کے دستخط تھے۔

"سب پورا ہے نا؟" جھمل نے مجھ سے پوچھا۔

"بظاہر تو مکمل ہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اطمینان رکھیے۔" سید کی آواز دھڑک رہی تھی "بالکل فکر نہ کیجیے۔"

"ابھی ہم کو وکیل ادھری بھیجنا پڑے گا' ساتھ میں اپنا آدمی بھی ہوگا۔"

"میں ہر وقت حاضر ہوں۔"

"کدھری نکل جانے کا دھیان ابھی من سے نکال دو۔"

"میں' میں کہاں' میں کہیں نہیں جا رہا' یہیں موجود ہوں جناب!"

"جدھری جاؤ گے' ہم پیچھے پہنچ جائیں گے اور تمہارے لیے۔۔۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" سید نے جھمل کو بات مکمل نہیں کرنے دی اور صندوقچے کے پہلو سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کے جھمل کے آگے کردیں۔

"یہ کیا ہے؟" جھمل نے بے اعتنائی سے پوچھا۔

"مجھے ان کے حساب کتاب کا صحیح علم نہیں ہے' اندازاً پچاس ہزار روپے دے رہا ہوں۔"

"تمہاری طرف سے کچھ نہیں مانگتے' جو ان کا ہے' اتنا ہی لوٹاؤ۔ سمجھ میں آیا؟"

"جی' جی ہاں۔" سید حواس باختہ ہونے لگا "اندازہ ہے کہ اتنا ہی ہوگا۔"

"پورا ناپ تول کے ہی دو۔"

"جی' جی۔" سید ٹھٹک کے بولا اور کھسیانا سا ہو گیا "یہ کم ہوں تو میں۔۔۔"

جھمل نے ہاتھ اٹھا کے اسے مزید کچھ نہیں کہنے دیا "تم سے بولا نا' جو ان کا ہے' بس وہی لوٹانا ہے۔" اس نے جھڑکی آواز میں کہا "دل مت سوچنا سالا' الٹ جائے گا پھر۔"

سید محمود علی نے پھر کچھ نہیں کہا۔

جھمل کا یہ طرز تخاطب میرے لیے حیران کن تھا مگر اس سے کچھ دیر پہلے کمرے میں اس کے اور سید کے درمیان ہونے والی گفتگو کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

جھمل کی ہدایت پر میں نے صندوقچہ اور نوٹوں کی گڈیاں اٹیچی میں منتقل کردیں۔ اٹیچی میں جگہ بنانے کے لیے

کچھ سامان نکال کے بیگ میں رکھا، کچھ دوسری اٹیچی میں منتقل کر دیا۔

"تانگا منگواؤ۔"

بٹھل کے کہنے کی دیر تھی کہ سید فوراً ایک جانب لپک پڑا۔ اسے کوئی ملازم قریب ہی کہیں نظر آگیا تھا جو وہ بہ عجلت واپس آگیا۔ چند لمحوں میں بشارت اور نذرو بھی آنکلے اور راہداری کے اس حصے میں ہمارا سامان لے آئے جہاں سے بڑا دروازہ نزدیک تھا۔ تانگا آنے میں بھی دیر نہیں لگی۔ سید ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ تانگے پر سوار ہونے سے پہلے بٹھل نے عین اس کے مقابل جاکے سرد لہجے میں کہا "تم کو ایسے چھوڑ کے جانے کا پچھتاوا رہے گا، پر لڑکیوں نے ہاتھ جکڑ رکھے ہیں۔ تم کو تمہاری جگہ پہنچانے کے لیے ان کو بھی الٹی سیدھی جگہ جانا پڑے گا۔"

سید محمود علی بت بنا کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"پھندا تم سے بھی دور نہیں ہے۔" یہ کہتے ہی بٹھل تانگے میں بیٹھ گیا۔

اسٹیشن اتنا دور نہیں تھا۔ سڑکیں صاف اور دھندلی دھندلی تھیں۔ سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپیں سارے راستے گونجتی رہیں۔ آدھ گھنٹے سے پہلے ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔ اسٹیشن بھی سنسان پڑا تھا۔ خوب روشنیاں تھیں مگر اونگھ سی رہی تھیں۔ ہجوم میں روشنی بھی پُرشور ہو جاتی ہے۔ کوچوان نے ہمیں بتایا تھا کہ مغل سرائے کی طرف جانے والی گاڑی دو گھنٹے بعد اور کلکتے کی طرف جانے والی ڈھائی گھنٹے بعد یہاں سے گزریں گی۔ ابھی گیارہ بجے تھے۔ ہم نئے ساز و سامان سے آراستہ فرسٹ کلاس کی کشادہ اور صاف ستھری انتظار گاہ میں آگئے۔ یہاں کوئی اور نہیں تھا۔ انتظار گاہ کے نگراں نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور بٹھل کی فرمائش پر چائے اور بسکٹ کا انتظام کر دیا۔ سہ پہر بٹھل بازار سے کچوریاں وغیرہ لایا تھا، اسی وقت ہم نے کچھ کھایا پیا تھا۔ حلق ویسے بھی سوکھ رہا تھا۔ چائے پی کے توانائی اور تازگی سی محسوس ہوئی۔ ہم دونوں باری باری منہ ہاتھ دھو کے کچھ تازہ دم ہوگئے تھے۔ [illegible] ن کو بتا کے میں تو باہر نکل آیا۔ سارا جسم ہلکا ہلکا لگ رہا تھا۔ ہوا میں نرمی اور خنکی تھی۔ لگتا تھا، جیسے جسم کے بند دریچے کھل گئے ہوں اور خوب ہوا، خوب روشنی در آئی ہو۔ آسن سول ایک بڑا جنکشن ہے۔ دیر تک میں یوں ہی ٹہلتا رہا۔

اتفاق سے اس وقت میرا رخ انتظار گاہ ہی کی طرف تھا۔ دور سے میں نے تین آدمی انتظار گاہ میں داخل ہوتے دیکھے۔ وہ مسافر نہیں معلوم ہوتے تھے۔ بھاگنے سے پلیٹ فارم پر موجود لوگ مشکوک ہو جاتے، میں نے اپنی رفتار تیز کی اور دروازے پر پہنچ کے اندر جانے سے پہلے چاقو جیب سے نکال کے ہاتھ میں دبا لیا۔ آہستگی سے میں نے دروازہ کھولا اور مجھے چاقو جیب میں واپس رکھنا پڑا۔ وہ ناتھو استاد اور اس کے ساتھی تھے۔ تینوں فرش پر بٹھل کے پیروں میں بیٹھے تھے۔ ناتھو نے اس کے پیر پکڑ رکھے تھے۔ میں قریب پہنچا تو ناتھو اور اس کے ساتھیوں نے ہاتھ جوڑ کے مجھے پرنام کیا۔ میں نے سر کی جنبش سے انہیں جواب دیا۔ ناتھو، بٹھل سے معافی مانگنے آیا تھا، کہہ رہا تھا، اس نے اپنا ایک آدمی سید محمود علی کے مکان کے باہر تعینات کر دیا تھا کہ جب بھی ہم باہر نکلیں تو اسے مطلع کر دے۔ سید کے ہاں سے آنے کے بعد وہ مسلسل اپنے آپ کو سرزنش کرتا رہا کہ اس نے بٹھل سے اتنی بدکلامی کیوں کی۔ اس سے بٹھل کو پہچاننے کی چوک کیسے ہوگئی۔ ایک بار زک اٹھانے کے بعد اس نے چاقو کھول کے دوبارہ بٹھل کے سامنے آنے کی جرات کیوں کی۔ ناتھو نے سید کے مکان میں سب کے سامنے بٹھل سے معافی طلب کرلی تھی لیکن وہ کہہ رہا تھا، اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔ دوبارہ سید کے مکان میں جانا مناسب نہیں تھا۔ بعد میں وہاں پولیس بھی آگئی تھی اور اسے یقین تھا کہ پولیس بھی شرمسار ہو کے جائے گی۔ اگر پولیس بٹھل کو تھانے لے جاتی تو ناتھو تھانے میں حاضر ہو جاتا۔ وہ بھی بٹھل کو بابا کے لقب سے مخاطب کر رہا تھا۔ پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ کہیں وہ یا اس کا کوئی ساتھی بٹھل کو پہچان تو نہیں گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔

بٹھل خاموشی سے اس کی بے قراری کی داستان سنتا رہا۔ ناتھو دہائیاں دینے لگا اور کہنے لگا کہ اسے کوئی خدمت بجالانے کا موقع دیا جائے۔ بٹھل اسے کوئی حکم دے اور مناسب سمجھے تو اپنے گھر کا پتہ بھی بتا دے۔ ناتھو کی آواز اس کے تیور میں کوئی کھوٹ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

"ابھی دور جانا ہے، دیکھو، جلدی پھر ادھر آنا ہوا تو"

بٹھل نے نرمی سے کہا "تم کو بول دیں گے۔"

"ناتھو کو اپنا داس سمجھو بابا!" ناتھو عاجزی سے اور بٹھل کی پنڈلیاں دبانے لگا "تم نے معاف کر دیا نا بابا!" وہ وہیں بیٹھا رہتا۔ بٹھل نے آرام کی خواہش ظاہر کی وہ ڈھیر سا ہو گیا اور مرجھائی ہوئی آواز میں بولا کہ گاڑی آجانے تک اسے بیٹھے رہنے کی اجازت دی جائے۔

"جا رے اب۔ آگے چھان پھٹک کے ہاتھ پیر کھولنا۔"

"یہی تو پاپ ہوا اپنے سے۔ ہماری آنکھیں نکال لو۔ یہ پورا دیکھتی نہیں تو کس کام کی۔"

"کام آئیں گی نرے، سنبھال کے رکھ۔ پہلے دیدے کو لگانے کر۔ چاقو تو دیدہ ہی تھماتا ہے۔ ہاتھ تو آگیا کا پالن کرتا ہے بھولے ناتھو!"

ناتھو نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے سنا اور اچھل پڑا "بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک بولتے ہو۔" اس نے اپنے منہ پر طمانچے مارے اور دیوانگی سے سر جھٹکنے اور تکرار کرنے لگا "اپنے داس کو معافی دیو بابا!"

"آگیا تو ادھری، اتنا بہت ہے۔ یاد رہے گا تو بھی۔"

"اپنے کو چرنوں سے دور مت کرو۔"

"آئیں گے رے ادھری لوٹ کے۔" بٹھل نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنے پیر سمیٹ لیے۔

ناتھو جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھی نے کئی بار کہنی سے اسے ٹوکا تو وہ کسمسا کے اٹھا اور ہاتھ جوڑتا ہوا الٹے قدموں دروازے تک گیا اور باہر جاتے جاتے واپس آگیا "داس کو اپنی کوئی بھینٹ دے دیو بابا!" اس نے بھکاریوں کے انداز میں کہا۔

بٹھل نے جیب سے چاقو نکال کے اچھال دیا۔

ناتھو نے مشاقی سے اسے پکڑ لیا اور آنکھوں سے لگایا، بار بار چومتا رہا "داس دیپ جلائے بیٹھا رہے گا۔" اس نے بھلی ہوئی آواز میں کہا اور انتظار گاہ سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بٹھل کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس سے پوچھنے کے لیے سر میں بے شمار باتیں گردش کر رہی تھیں لیکن میری طرح اسے بھی گزشتہ کا غبار دور کرنے کے لیے ایک عرصہ سکون و سکوت درکار تھا، سب سے دو بارہ تو سر کا ہوتا ہے۔ ابھی ہم آسن سول میں تھے۔ کسی جگہ کی نسبت سے جسم و جاں پر چھائی ہوئی دھند میں فاصلے بھی اکسیر ہوتے ہیں۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے دور ہو جانا چاہیے تھا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ اس نے بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر بعد اسے خیال آیا، اچٹتی آواز میں اس نے ٹکٹ لانے کے لیے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"رہنے دو، کچھ روپے ہیں میرے پاس، تم ہی نے دیے تھے، خرچ ہی نہیں ہوئے۔" میرے لہجے میں غیر ارادی طور ہلکی آمیزش ہوگئی "کہاں کے ٹکٹ لاؤں؟"

اس نے تامل کیا پھر بے پروائی سے بولا "آگے کے لے لے۔"

"آگے کہاں کے؟"

"ادھری سے بردوان شہری بڑا پڑتا ہے۔"

"بردوان جانا ہے؟" میں نے چلا کے کہا "وہاں کیوں؟"

"آگے اب وہی تو ہے رے۔ بیچ میں درگا پور بھی ہے، پر اس کو بعد میں دیکھیں گے۔"

"کیا اب بھی آگے ہی چلنے کا ارادہ ہے؟"

"اب ادھری ہیں تو سارا نمٹا کے چلیں۔"

"اب اکٹھے ہی چلیں گے ادھری، جس کام کے لیے نکلے ہیں، پہلے اس کو تو پورا کرلیں۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" اپنے لہجے کی تلخی پر مجھے شرمندگی بھی ہوئی۔

"تو کدھری جائے گا؟"

"ادھری تو جانا ہی ہے۔" وہ مفاہمت کے لہجے میں بولا "تجھ کو کیا اب مولوی کا دھیان نہیں ہے؟"

"یہ کون کہہ رہا ہے، میری بات سمجھتے کیوں نہیں۔"

"سمجھا رے پھر۔" اس کی تیوری پر بل پڑ گئے "لگتا ہے، آس چھوڑ دی تو نے۔ آج نہیں تو کل، کسی جگہ پر تو ٹکرے گا مولوی، پر کھوجے بنا کیسے، گھر بیٹھ کے تو نہیں آجائے گا پاس اپنے۔"

"میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔" میں نے چڑ کے کہا "میں صرف کچھ دنوں کی بات کر رہا ہوں۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا، اگر ہم کچھ دن فیض آباد ٹھہر کے روانہ ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں، ہمیں وہاں سے آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا۔ بابا جان کو جب ہم تبت سے لائے تھے، تب وہاں ٹھہرے تھے۔ درمیان میں فرصت ہی نہیں ملی اور کیا کیا حادثے ہوتے رہے۔ کبھی حیدرآباد، کبھی بمبئی، مراد آباد، لکھنؤ، دکن، پچھم، یوپی بہار اور اب بنگال۔ کتنے صوبے، شہر، قصبے۔ کچھ معلوم ہے، کتنا وقت گزر گیا؟ صرف خط لکھ دینے سے تم سمجھتے ہو، بات بن گئی، تمہاری ذمے داری پوری ہوگئی۔ وہ بھی ہمارا گھر ہے۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہم نے سلمٰی کو وہاں بھیجا ہے۔ ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ جمرو اور زورا تھے لیکن اب فروزاں اور یاسمن وہاں پہنچنے والی ہیں۔" میں نے بٹھل کو ہموار کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ میں نے کہا "فروزاں، یاسمن اور نصیر بابا کے لیے زریں کی حویلی بالکل اجنبی ہوگی۔ ہماری موجودگی ان کی اجنبیت دور کرنے میں معاون ہوگی۔ شروع شروع میں انہیں ہمارے گداز کی بڑی ضرورت ہوگی۔"

"وہ سارا دیکھ لے گی، وہ بڑی گنی ہے۔" میرے لہجے کی تپش اور نیت کے صدق کا بٹھل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ کہنے لگا کہ وہاں اور لوگ بھی ہیں۔ منیر علی کا خاندان ہے۔

جہاں گیر ہے' نیساں ہے' ملازمین ہیں۔ ہو سکتا ہے' جمرو اور زورا بھی ابھی وہیں ہوں اور خانم حیدر آباد سے آچکی ہو۔ نصیر بابا کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ زریں کے نام چند سطری خط بھی لکھوا کے نصیر بابا کے حوالے کر دیا ہے۔

میں اسے اپنی بات سمجھا نہیں پا رہا تھا وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید میرے ہی ادعا میں کوئی نقص تھا۔ میں اس سے کہہ نہیں پا رہا تھا کہ سائلوں کی طرح میرے ساتھ یوں گلی کوچوں میں اس کی خواری مجھے اچھی نہیں لگتی۔ ایک حد تک ہی آدمی' آدمی کے ساتھ چل سکتا ہے' ایک حد تک ہی کسی کو دوسرے کے بوجھ میں شریک ہونا چاہیے۔ میں غلط بھی کیا کہہ رہا تھا' میں نے دیکھا تھا' زریں کے پاس جا کے اس کے چہرے پر کیسا سکون چھا جاتا ہے۔ زریں تو واقعی کوئی شجر سایہ دار ہے۔ وہاں جا کے 'بتھل' زریں کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے۔ آدمی کو تعمیل حکم میں جہاں آسودگی ملے' اس کے لیے زریں کی حویلی ایسی ہی ایک جگہ ہے۔ وہاں جا کے وہ کوئی دوسرا آدمی ہو تا ہے۔ اس نے ازار ترک کر دیا تھا' جہاں عرصے سے اس کی حکومت قائم تھی' اس نے اپنے ساتھیوں سے کنارہ کر لیا تھا جو غلاموں کے مانند اس کی جنبش ابرو کے اسیر تھے۔ اپنے ساتھ مجھے اس کی بے آرائی کا بہ... مراحساس رہتا تھا۔ مجھے بھی تو کچھ اس کا خیال کرنا چاہیے۔ میں کچھ اس سے کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ ہی کھو گئے تھے۔ شاید مجھے اس کی دل برداشتگی اور ناراضگی کا خدشہ تھا اور خود مجھ پر واضح نہیں تھا کہ میری منشا کیا ہے۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا' میری امید میں پہلے جیسا عزم اور یقین نہیں رہا ہے۔ مولوی صاحب ہی مجھ سے دامن کش رہنا چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ جہاں جہاں ہم ان سے قریب پہنچتے رہیں گے' وہ ہم سے اور دور ہوتے جائیں گے۔ وہ ایک جگہ ٹھہرے رہتے تو ان تک پہنچنا کوئی دشوار نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے تعاقب میں ہم ناکام ہی رہے ہوں' کئی جگہ بس آگے پیچھے کی بات رہ گئی۔ ہم ان گھروں تک پہنچ گئے تھے جہاں ان کا قیام رہا۔ جیسلمیر' مراد آباد' ٹھمرا سادات' حیدر آباد۔

یا پھر یوں تھا کہ میں ہی زریں کے پاس جانے کے لیے مضطرب تھا۔ ...ں کی طرح وہ میری ذمے داری بھی ہے۔ میں اپنی تشنگی کی تلافی کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا اور جواز کے لیے بتھل کے سامنے دلیلیں وضع کر رہا تھا۔ وہ میری آس کی ناتوانی کی بات کر رہا تھا۔ آدمی اپنا حال خود ہی بہتر جانتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ درمیان میں یہ طرح طرح کے حادثے اور سانحے جو دیوار بن جاتے ہیں تو مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ میں کسی ان ہونی میں شامل نہ بھی ہوں تو الگ کیسے رہ سکتا ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے شامل ہونا پڑتا ہے۔ نصیر بابا کی زبانی فروزاں اور یاسمن کی روداد سن کے ہم اپنا ارادہ بھی لے سکتے تھے۔ ریل میں سلمٰی کا احوال جان کے کسی مجبوری کا عذر کر سکتے تھے۔ فروزاں اور یاسمن اپنے ماں باپ کی طرح سید محمود علی کی بھینٹ چڑھ جاتیں۔ ارشاد علی نے آسرا سلمٰی کا پھر کہیں اور سودا کر دیتا۔ سلمٰی کے ذریعے چرائے ہوئے ہیرے جواہر لے کے کہیں چلتا بنتا۔ یہی اس کا منصوبہ تھا۔ اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو حملہ آور کرشنا جی کو ختم کرنے کے ارادے ہی سے آئے تھے۔ کرشنا جی میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ کوئی کتنا ہی اجنبی ہو' آدمی کی ایک نسبت تو آدمی سے ہے پھر کرشنا جی نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ انہوں نے میرے لیے کیا کیا نہ کیا۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عزت دی' ساری جائداد میرے نام کر دی تھی۔ ابا جان تک ہم انہی کی کوششوں سے پہنچ پائے تھے۔ ریل ہی میں مجھے زریں ملی تھی۔ اسے اس فاحشہ کے چنگل میں دیکھ کے میں کس طرح ہاتھ پیر توڑے بیٹھا رہتا' زریں کو کیا اس کے حال پر چھوڑ دیتا۔ آدمی آئینے کا سامنا بھی تو کرتا ہے۔ راستے کے پتھروں کا آدمی کیا کرے اور موسموں کا کیا اعتبار۔ میرا ستم تو مستزاد تھا' اپنے درون خود کے فشار میں یہ پتھروں اور موسموں کا آزار' جو خود ہی مجبور معذور ہو' وہ کسی کی دادرسی کیا کرے' کس قدر کر سکتا ہے۔ دل کو میں کیا بتاتا کہ میں اس کے ساتھ ہوتے ہوئے کیا تمار رہتا ہوں۔ میرے سینے میں مسلسل ہوک سی اٹھتی ہے۔ جی چاہتا ہے' دیواروں سے سر پھوڑ لوں' اپنا منہ نوچ لوں' کہیں کسی ویرانے میں جا بسوں۔ کوئی میری پرسش کرے۔ میں کوئی پاگل تو نہیں ہوں' اپنا اچھا برا خوب جانتا ہوں' مجھے رنگوں کی تمیز ہے' خوب اچھی طرح دکھائی دیتا ہے لیکن میں کیا کروں' بہت خود کو ٹوکتا ہوں' اپنے آپ کو سمجھاتا ہوں کہ میری استطاعت بس اسی قدر ہے۔ آدمی محدود ہے۔ بس ایک دائرے میں دیکھنے' سننے اور صدا لگانے کی توفیق رکھتا ہے۔ یہ دنیا آدمی سے بہت بڑی ہے۔ اس کا کوئی شمار' کوئی حد و حساب ہی نہیں' بے شمار اس کی راہیں' بے پناہ اس کے فاصلے۔ کوئی مقدرت کے مطابق ہی بھاگ سکتا ہے۔ جیل سے آنے کے بعد میں نے کوئی کم منوایا' میں تو بھاگتا ہی رہا۔ میں جو نظر آتا ہوں' وہ کہاں ہوں۔ ایک آدمی کا اندرون دوسرے کو کتنا نظر آتا ہے۔ بتھل کو جو نظر آتا ہے' وہ اتنا نہیں ہے' جتنا میں خود سے نبرد آزما ہوں۔

میں اس سے کہنا چاہتا تھا' بے شک' زریں کے خیال سے لطف و راحت کا احساس ہوتا ہے لیکن جانے کیوں' جب وہ سامنے آتی ہے' کہیں سے کورا بھی چپکے سے اس کے پہلو میں آ کے کھڑی ہو جاتی ہے پھر میری آنکھیں اور جلنے لگتی ہیں' میرا سینہ اور گھٹنے لگتا ہے۔ بتھل سے میں کیا کہتا کہ فیض آباد میں زریں کی حویلی ہو یا بمبئی میں ابا جان کا محل' میں رما کے ساتھ کشتی میں سوار ہوں اور لہریں جھولا جھلا رہی ہوں اور رما کا نہایت بلیغ و شائستہ' دل نشیں' اثر آفریں کلام جاری ہو۔ وہ جو لین ہو جس کی معیت میں زریں جیسی چھاؤں' ٹھنڈ اور جذب و کیف ہے۔ میں کسی نہایت سراپا لطف و عنایت شخص کے روبرو ہوں یا کسی نظر فریب' خوش نما منظر کے سامنے۔ میرا دل بہت جلد گھبرانے لگتا ہے' مجھے تو خفقان سا ہونے لگتا ہے۔ میں تو مسلسل اس کی آوازیں سنتا ہوں' جیسے وہ مجھے پکار رہی ہو' میری طرح وہ بھی آزردہ ہو۔ کوچہ گردی کی اس تدبیر میں کم از کم ایک طمانیت تو ہے کہ یوں ہی کسی دن میں اس کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ گھر بیٹھ کے تو کچھ نہیں ہو گا' گھر بیٹھے تو دعائیں ہی کی جا سکتی ہیں۔ وہ تو یوں بھی میرا رواں رواں کرتا ہے۔ دعا کے لیے حرف دعا لازم نہیں۔ خاموشی کی زبان خدا سے زیادہ کون سمجھتا ہو گا۔

"کدھری کھو گیا رے۔" مجھے چپ دیکھ کے بتھل نے ٹوکا۔

"کہیں نہیں' بس یوں ہی۔" میں نے بل کھا کے کہا۔

"کیا وچار ہے تیرا؟"

"جو تم سمجھتے ہو' وہی ٹھیک ہے۔" میں نے چڑچڑاتی آواز میں کہا۔

"تو یہ اکٹ کہتا ہے' ایسا کر' تو ادھری چلا جا' بٹیا کے پاس فیض آباد میں۔"

"اور تم' تم۔"

"میں مولوی کی ٹوہ میں آگے نکلتا ہوں۔"

"اس کے الٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ادھری جا کے جلدی نکلنا نہیں ہو گا" فیض آباد اسٹیشن پہ جب ہم سلمٰی کو رخصت کر رہے تھے اور میں نے اس سے اصرار کیا تھا' تب بھی اس نے یہی عذر کیا تھا۔

"وہ کیا بیڑی ڈال دے گی؟"

"اس سے بڑی بیڑی کیا ہے' اس کی آنکھیں دیکھی ہیں' تو نہیں جانتا رے' وہ کیسی ہے؟"

"ہاں' میں کیا جانوں' تمہاری سگی ہے وہ۔"

"اور تو سب کا سوتیلا ہے۔"

"اس بات کا مجھ پر چھوڑ دو' میں اس سے بات کروں گا۔ ایک بار تو خود اس نے مجھ پر زور دیا تھا کہ مجھے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ وہ بڑی سوجھ بوجھ کی اور حوصلے والی ہے۔"

"پتا ہے' چپ ہو جائے گی پر اس کا مان تو پاس ہی رہنا چاہیے کہ جب چاہے وہ ہماری لگام کھینچ سکتی ہے۔"

اسے زریں اس قدر عزیز تھی۔ مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔

"پر تو بھی ٹھیک ہی بولتا ہے" وہ سہلا کے بولا "چل پھر' ادھری چلتے ہیں۔ دیکھ لیں گے' اس کو بھی۔"

○☆○

راستے میں موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے ریل کو کئی جگہ ٹھہرنا پڑا۔ رفتار بھی سست رہی۔ آسن سول سے مغل سرائے کا فاصلہ سوا تین سو میل ہے اور وہاں سے فیض آباد ایک سو چالیس میل کی دوری پر ہے۔ مغل سرائے میں ہم نے گاڑی بدل دی۔ بارشوں نے موسم بھی خوش گوار کر دیا تھا۔ میں تو بیشتر کھڑکی کے پاس بیٹھا رہا اور کھیتوں' باغوں' دریاؤں اور پہاڑیوں کے دلکش مناظر دیکھا کیا۔ بتھل تو تقریباً آرام ہی کرتا رہا۔ میں مختلف اسٹیشنوں پر اترکے گھوم آتا اور بتھل کے لیے ہر بار کچھ نہ کچھ لے آتا۔ پان' بیڑی' چائے' پوریاں وغیرہ۔ ریلوے کی طرف سے اول درجے کے مسافروں کے لیے کھانے کا انتظام عمدہ تھا۔ سفر کا احساس ہی نہیں ہوا۔ فیض آباد آتے آتے رات کے گیارہ بج گئے۔ وہاں بارش نہیں تھی لیکن بادل امڈے ہوئے تھے۔ سڑکیں سو چکی تھیں۔ کہیں کہیں پان بیڑی اور چائے کی دکانیں کھلی تھیں اور گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر تانگا ہمیں حویلی کے سامنے لے آیا۔ میرا تو عالم ہی دگر تھا۔ تانگا ابھی ٹھہرا ہی تھا کہ میں کود کے اتر پڑا۔ حویلی پر نیا رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ بہت دھلی دھلی' روشن روشن نظر آتی تھی۔ مکان کا مکین کے ذوق سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور خوش ذوقی و خوش سیرتی دو مختلف چیزیں ہیں۔ زریں کے ہاں دونوں خوبیاں تھیں۔ سید محمود علی کا ذوق جتنا اعلیٰ تھا' طبعاً پست بھی وہ اتنا ہی تھا۔ وہ کمینہ میرے دماغ سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ زریں کے ہاں نفاست کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ خود بھی وہ ہمیشہ نفیس لباس پہنتی تھی۔ کرتا' آڑا پاجامہ اور ستاروں بھرا دوپٹا اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ سفید رنگ اسے بے حد مرغوب تھا۔ اس کے بعد گلابی' گلابی رنگ تو خود اس کا اپنا تھا' وہ تو سراپا گلاب تھی۔

دروازے پر تعینات بوڑھا دربان ممّا تانگے کی آواز سن
...وری طرح بیدار ہو گیا۔ نام تو اس کا کچھ اور تھا' زمانے
...جت ممّا بن چکا تھا۔ سن رسیدگی کے باوجود جسم کسرتی
...جوانوں کی سی پھرتی تھی۔ شیرا کو ہٹا کے استاد جامو نے
...ے یہاں رکھا تھا۔ ہم اسے بہت پہلے سے جانتے تھے۔
...یں نے دروازے پر اس تبدیلی کے بارے میں ہمیں لکھا
...۔ ممّا بھی نشانے کا بڑا کھرا تھا۔ کسی جاگیردار کے ہاں ملازم
...کہ جاگیردار سے کسی کا قتل ہو گیا۔ ممّا نے الزام اپنے سر
...لے لیا۔ اسے پھانسی ہو جاتی لیکن شہادتیں منتشر کر دی گئی
...تھیں۔ صرف سزا ہوئی۔ مقتول کا کوئی عزیز اصل واقعے کا
...شاہد تھا۔ وہ تاک میں رہا' موقع پا کر اس نے جاگیردار کا خون
...کر دیا اور فرار ہو گیا۔ پولیس اسے کبھی نہ پکڑ سکی۔ ممّا نے
...اپنی سزا پوری کی پھر جامو کے اڈے پر آ گیا۔ حویلی کی ڈیوڑھی
...سے ملحق کمرا اس کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ عموماً رات کو وہ
...چوکسی دیتا تھا' دن میں اس کا بھتیجا نگرانی کرتا تھا۔ حویلی میں
...تواتر سے مختلف لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ ممّا ہی ان کی
خاطر مدارات کیا کرتا تھا۔ اصل میں ممّا دربان ہی نہیں'
حویلی کے بعض معاملات کا منتظم بھی تھا' تانگے سے اترنے
والے مسافروں کو پہچان کے ممّا کا عجب حال ہوا۔ اس نے
نعرے لگانے شروع کر دیے۔ دیوانہ واری سے چبوترے کی
سیڑھیاں پھلانگ کے آیا اور شور مچانے لگا "ہائیں' ہائیں'
ہم کیا دیکھتے ہیں' اپنے بابا صاحب آئے ہیں۔"
بٹھل نے بڑھ کے اسے گلے لگا لیا' پھر ممّا مجھ سے لپٹ
گیا اور اس کی آواز بھرّا گئی۔ بار بار میرے ہاتھ پکڑتا
اور سینے سے لگاتا۔ تانگے سے سامان اتارنے کا بھی اسے
ہوش نہ رہا۔ کوچوان نے اٹیچیاں نیچے رکھیں۔ ہمیں چھوڑ
کے ممّا نے تیزی سے چبوترے کی سیڑھیاں طے کیں اور
اپنے کمرے میں جا کے غائب ہو گیا۔ اس کے کمرے سے
ڈیوڑھی میں راستہ نکلتا تھا۔ اندر جا کے اس نے ڈیوڑھی کا
وسیع دروازہ کھول دیا اور اندرونی دروازے پر بے تحاشا
دستک دینے لگا۔ کسی ملازمہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا
"کیا بات ہے ممّا خیریت تو ہے؟"
"بہت خیریت ہے شکورن بی! دروازہ کھولو' دیکھو کون آیا
ہے؟" ممّا نے وارفتگی سے کہا "ارے بابا صاحب آئے ہیں
اور اپنے شہزادے گلفام' بابر میاں۔"
شکورن نے اندرونی دروازے میں نصب روزن کی
لکڑی ہٹا کے تصدیق کی۔ روزن سے اس کی آنکھیں اور
پیشانی ہی دکھائی دے سکی۔

"جاؤ بھاگوان' بٹیا کو خبر کرو' جگا دو سب کو۔" ممّا نے چیخ
کر کہا۔
"ساروں کو نہیں' صرف بٹیا کو بولو" بٹھل نے تاکید
کی۔
بٹھل کی آواز سن کے شکورن دوڑ پڑی۔ ہمارے اندر
آنے کے لیے اسے دروازہ کھولنے کا بھی خیال نہیں رہا۔
"ارے دروازہ تو کھول خوش بخت!" ممّا آواز دیتا رہا۔
"کیسی باؤلی ہے' اڑ گئی۔"
"آ جاوے گی" بٹھل نے ممّا کو تحمل کے لیے کہا اور
پوچھا "نئے مہمان کب پہنچے ادھری؟"
"نئے مہمان؟" ممّا الجھ گیا۔
"وہ دو بیبیاں اور بوڑھا۔"
"وہ... وہ تو دوپہر سے پہلے آ گئے تھے۔"
میں نے آنکھیں میچ لیں۔ بٹھل کو بھی فرحت کا
احساس ہوا ہو گا۔
"بہت تھکے تھکے لگتے تھے۔ بیبیاں بھی گھبرائی ہوئی
تھیں۔ خیر خیریت سے پہنچ گئے" ممّا نے بتایا۔
دروازہ کھلنے اور ہمارے اندر جانے کی دیر تھی کہ ساری
حویلی جاگ گئی۔
سب سے پہلے وہی مجھے نظر آئی۔ سب سے پہلے مجھے
اسی کو دیکھنے کی تمنا تھی۔ وہ اندر سے بھاگتی ہوئی آئی تھی اور
ہانپ رہی تھی۔ وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔ سفید دوپٹے سے
اس کا سر ڈھکا ہوا تھا اور بدن پر عنابی رنگ کی چادر لپٹی ہوئی
تھی۔ اس کا چہرہ دہک رہا تھا' آنکھوں میں شرارے کوند رہے
تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر وہ ٹھٹک کے رک گئی۔ اسے یقین نہ
آ رہا ہو جیسے یا اسے اندیشہ تھا کہ وقت نے ہمارے جذبہ و
احساس گرد آلود تو نہیں کر دیے ہیں۔ لمحوں تک وہ گم صم سی
رہی۔ بٹھل بھی اسے دیکھتا رہا۔ پھر چند قدم آگے جا کے اس
نے بازو پھیلا دیے۔ زریں کے بدن میں تلاطم سا اٹھا اور بے
اختیار وہ بٹھل کے بازوؤں میں آ گئی اور بٹھل نے
بدبداتے ہوئے جانے کیا کہا کہ زریں کو صبر کا یارا نہ رہا' وہ
بری طرح تھمانے لگی۔
پھر تو دیکھتے دیکھتے وہاں ایک ہجوم سا ہو گیا' شور مچ رہا
تھا۔ جہاں گیر' نیساں' زہرہ اور منیر علی کا سارا خاندان اور
ہاں' زہرہ سے پیوستہ' جھلکتے رخساروں کے ساتھ سلمیٰ بھی
وہاں نظر آئی' اس نے جھکتے آداب کیا۔ میری نگاہیں فروزاں
اور یاسمن کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ بھی ایک کونے میں
دبکی ہوئی وہاں موجود تھیں۔ انہیں اس گھر میں آئے ہوئے

ابھی ایک پہر ہی ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی
کہ وہ تجسس اور تحیر سے اس منظر کی تماشائی ہیں۔ فروزاں
سے میرا سامنا دوسری بار ہوا تھا اور اس مرتبہ بھی مجھے بس
اس کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ملا۔ جہاں گیر اور نیساں نے
مجھے گھیر لیا اور کہیں سے اچانک خانم میرے سامنے آ گئی
"ارے آپ! آپ کب آئیں آپی؟" میں نے حیرت سے
پوچھا۔
"اب تو دو مہینے کے قریب ہو رہے ہیں" وہ کھنکتی آواز
میں بولی "تم بتاؤ' تم کیسے ہو؟ کہنا تو نہیں چاہیے مگر کچھ دبلے
سے لگ رہے ہو۔"
"ہاں' بس ایسے ہی۔ بہت دنوں سے سفر میں ہوں' ادھر
گزشتہ ہفتے بیمار بھی ہو گیا تھا۔"
"خدا خیر کرے" وہ تشویش سے بولی "اب کیسے ہو؟"
"اب تو بہت ٹھیک ہوں آپی لیکن مجھے پورے ہفتے بستر
نے باندھے رکھا۔"
نیساں میرے ایک بازو پر' دوسرے پر جہاں گیر جھول گیا
تھا۔
دیر تک ہم گھیرا بنے رہے۔ زریں کو بازو میں دبوچے
ہوئے بٹھل ہر ایک کے پاس گیا اور ہر ایک سے اس کا حال
پوچھا۔ فروزاں اور یاسمن کے پاس جا کے وہ ٹھہر گیا۔ "کوئی
تکلیف تو نہیں ہوئی رستے میں؟" اس نے مشفقانہ انداز میں
پوچھا۔
"نہیں بابا!" یاسمن نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا
"بالکل بھی نہیں' بہت آرام سے آ گئے۔ یہاں سب لوگ
بہت اچھے ہیں۔"
"سب اچھے ہی رہیں گے ری" بٹھل نے پرعزم لہجے
میں کہا "اور نہ رہیں تو ہم کو صاف بولنا۔"
یاسمن کے چہرے پر رنگ آ جا رہے تھے۔ اس کے برابر
فروزاں سر جھکائے کھڑی تھی۔ بٹھل نے اس کے سر پر ہاتھ
رکھا تو اس کے ہونٹ سسکنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ اور نہ
گھبرا جائے' زریں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے
[illegible] ہاتھوں کو بوسہ دی۔ فروزاں' زریں کے پہلو میں
سما گئی۔
حویلی کا بڑا کمرا کھول دیا گیا۔ یہ ڈیوڑھی سے متصل تھا
اور طول و عرض کے اعتبار سے کسی ایوان سے مشابہ۔ عموماً
مردانہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اردگرد مہمانوں
کے لیے کمرے بنے تھے۔ حویلی کا یہ حصہ حویلی میں شامل بھی
تھا' حویلی سے الگ بھی۔ ہمیں اٹیچیاں کھولنے کی ضرورت
نہیں پڑی۔ ہم دونوں کے کپڑے تیار تھے۔ زریں نے ہماری
آمد کی امید میں کب سے اہتمام کر رکھا تھا۔ ملازمہ نے بتایا
کہ بٹھل کے لیے ہر ماہ نیا ذخیرہ آتا تھا تاکہ بٹھل جب بھی
گھر آئے' نہانے کے بندوبست میں دیر نہ لگے۔ منہ ہاتھ
دھو کے اور نیا لباس پہن کے باہر آیا تو بٹھل کا حقہ سلگ رہا
تھا۔
مردانہ بیٹھک کی تزئین و آرائش نئے سرے سے کی گئی
تھی۔ ساز و سامان اس قدر زیادہ تھا اور سادہ بھی تھا لیکن
سادگی میں سلیقہ سب سے بڑی آرائش ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ
سے مطابقت رکھتی تھی جیسے اسی جگہ کے لیے بنائی گئی ہو۔
کہیں بھی گرد کا نشان نہیں تھا۔ ہم ریل میں رات کا کھانا
کھا چکے تھے۔ انہوں نے ہم سے پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔
ہمیں آئے ہوئے ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا ہو گا۔ انہوں نے
چوکی پر دسترخوان بچھا دیا۔ ہمیں تو اس وقت معلوم ہوا جب
زریں نے دوسرے کمرے میں چلنے کا حکم صادر کیا۔ انکار کی
مجال نہیں تھی۔ بٹھل کے اٹھ جانے پر میں بھی اٹھ گیا۔
ایک جاتا تھا' ایک آتا تھا۔ وہ سب کی سب بھاگی بھاگی پھر رہی
تھیں۔ انہوں نے جانے ہمیں کیا سمجھ رکھا تھا جیسے ہم صرف
دو نہیں بلکہ بہت سے بھوکے پیاسے گھر آ گئے ہوں۔
دسترخوان پر انواع کی اتنی کثرت نہیں تھی جتنی مقدار کی۔
سارے کھانے تازہ تازہ تھے۔ بھاپ اٹھ رہی تھی اور خوشبو
کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میٹھے چاول بھی تھے۔ زریں کو یاد
تھا کہ مجھے میٹھے چاول کس قدر مرغوب ہیں۔ اس نے امی کو
نہیں دیکھا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا' امی نے خواب میں آ کر
اسے ترکیب بتائی ہو' بالکل وہی ذائقہ تھا' وہی خوشبو۔ میں
نے زریں کے خیال سے سیر ہو کے کھائے۔
کھانے کے بعد سب نے چوکی پر ہمارے گرد ہالہ سا
بنا لیا۔ نیساں اور جہاں گیر' بٹھل کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔
بہت مطلوب اور محبوب لوگوں کے لیے ایسا اشتیاق ہوتا
ہے۔ بٹھل بھی بہت ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ گھر اسی کو کہتے ہیں
جہاں آدمی بے وزن ہو جائے۔ زریں کی حویلی تو بہت پہلے تعمیر
ہوئی تھی' اسے زریں کا گھر بٹھل ہی نے بنایا تھا۔ میں بٹھل
سے یہی کچھ کہہ رہا تھا کہ ہم اس گھر کا جزو ہیں' کیونکہ یہ
زریں کا گھر ہے۔ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ ہمیں
یوں خالی ہاتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ گو ان کے لیے سب سے
بڑی سوغات ہم ہی تھے لیکن تحفہ و نذر کی اپنی ایک دلکشی ہوتی
ہے۔ اس کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کل
صبح بٹھل سے کچھ نقدی لے کے بازار جاؤں گا اور ہر ایک

لیے کچھ نہ کچھ خرید کے لاؤں گا۔
بٹھل کے استفسار پر جہانگیر نے بتایا کہ جمو اور زورا دن پہلے ہی یہاں سے گئے ہیں۔ یہاں قیام کے دوران انہوں نے کئی خط بھیجے۔ یہی جواب آتا رہا کہ ہم ابھی وہاں نہیں پہنچ سکے ہیں۔ وقفے وقفے سے بمبئی اور فیض آباد کے لیے چند سطری خیریت نامے لکھوانا بٹھل کا معمول تھا۔ یہ یک طرفہ رسم و راہ بھی خوب تھی۔ آدھا اطمینان۔ ہم صبح و شام شہر بدلتے رہتے تھے اور اپنا کوئی مستقل پتا ہی نہیں بتا سکتے تھے۔ بہرحال اس طرح فیض آباد میں زریں کو، بمبئی میں ابا جان کو ہماری خیر خبر سے کچھ تسلی ہو جاتی ہوگی۔ ان کی کوئی اچھی یا بری خبر ہمیں نہیں مل پاتی تھی۔ جہانگیر کہہ رہا تھا، پندرہ دن کا وقفہ ہو گیا اور ہماری طرف سے کوئی خط نہیں آیا تو زورا اور جمو کو بے چینی ہونے لگی۔ انہوں نے کلکتے تار بھیجا حالانکہ تار کا جواب فوراً آ گیا تھا مگر انہوں نے کلکتے جانے کا قصد کر لیا۔ اب وہ کلکتے میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے وہ کب تک یہاں ٹھہرے رہتے۔ ہم کلکتے کے قریب بہار اور بنگال کی بستیوں کی خاک چھانتے رہے تھے۔ انہیں امید ہوگی کہ اب ہم جلد ہی کلکتے پہنچنا چاہتے ہوں گے۔

جہانگیر کی زبانی معلوم ہوا کہ مہینے بھر پہلے منیر علی بھی بمبئی سے یہاں آئے تھے۔ جانے انہیں بمبئی میں کون سا اہم کام تھا جو واپسی کی ایسی عجلت تھی۔ اپنے گھر ہفتے بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ ابا جان کے بغیر انہیں چین نہیں آ رہا ہوگا۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ بمبئی میں، میں نے ان کی یک جائی اور ہم نوائی دیکھی تھی۔ ابا جان تو اب اپنی حسرتوں کی تجسیم کر رہے تھے اور منیر علی سے زیادہ معتبر و محترم، راست باز دوست انہیں کہاں میسر آ سکتا تھا۔ دولت کو دوستوں کی بڑی ضرورت پڑتی ہے، دوست، مصاحب یا غلام۔ منیر علی نے جیسلمیر میں بڑی محدود زندگی گزاری تھی۔ فیض آباد میں ماحول جیسلمیر جیسا تھا لیکن بمبئی ایک مختلف شہر تھا۔ انہوں نے پہلی بار اتنی بدلی ہوئی دنیا دیکھی تھی اور جہاں دولت ہو، وہاں تو دنیا کے تیور ہی اور ہوتے ہیں۔ دنیا کو دولت بہت مرغوب ہے اور دولت کو دنیا۔ ابا جان نے کورا کی لائی ہوئی دستاویزوں کی تحقیق و تفتیش میں برسوں ریاضت کی تھی۔ انہوں نے اپنا آبائی گھر کھویا تھا، ایک جوان بیٹی گنوائی تھی۔ ان کے دو بیٹے بھی ان کے لیے تو مر ہی چکے تھے۔ ابا جان مزید اور کچھ کھونے کا بھی حوصلہ رکھتے ہوں گے۔ اس ایثار کا انہیں کوئی تو ثمر ملنا چاہیے تھا۔ منیر علی نے جیسلمیر سے ہجرت کرکے فیض آباد میں زمینیں خریدی تھیں۔ انھیں اپنی زمینوں کی بھی فکر نہیں تھی۔ ابا جان کی جاہ و حشمت کے آگے اس جاگیر کی کیا حیثیت تھی۔ ادھر زریں کی حویلی کی طرف سے بھی وہ مطمئن ہوں گے، اس سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہتے ہیں، بچھڑنے کے بعد اپنا گھر بہت یاد آتا ہے، اپنا گھر، اپنا محلہ، اپنا شہر مگر تمام یادیں نئے ماحول اور نئی بستیوں کی پذیرائی پر منحصر ہیں اور یادوں کا تو یہ ہے، یاد رکھی جائے تو ہر بات ایک یاد ہے، بیتا ہوا ہر پل ایک یاد ہے۔ بڑے سے بڑا نقش ماند پڑ جاتا ہے اور ایک نوک خار زندگی بھر رگ جاں تلملائے رکھتی ہے۔ ہجرت بھی بہت راس آتی ہے۔ آدمی پلٹ کے دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ منیر علی گھر سے بے گھر ہماری وجہ سے ہوئے تھے اور گھر کیا، وہ تو شہر بدر ہو چکے تھے۔ روپیہ پیسا ہی نہیں، احباب، اعزا، واقف کار بھی اثاثے کے مانند ہوتے ہیں۔ منیر علی سے یہ دولت چھن گئی تھی۔ اس کے ازالے کے لیے انہیں بہت سا بہت اطمینان چاہیے تھا۔ یہاں ان کا جی لگ گیا ہے تو بڑی غنیمت کی بات ہے۔

خانم کے سوا کسی کو وقت کا احساس نہیں تھا۔ دو بج چکے تھے۔ خانم نے کئی بار اشارے کیے۔ وہ مسلسل انہیں ٹوکتی رہی کہ رات بہت ہو گئی ہے۔ ہمیں سفر کی تکان ہوگی۔ میں نے خانم سے نہیں کہا کہ یہاں آ کے تو ساری کلفت دور ہو گئی ہے۔ بٹھل بھی چپ رہا۔ میری طرح اسے بھی ان سب کے آرام کا خیال ہوگا۔ خانم کے ٹوکنے پر آخر ان سب کو اٹھنا پڑا۔

دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ نیند کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ حالت سکون میں بھی لازم نہیں کہ مہربان رہے، گھر سکون بجائے خود ایک نیند ہے، ایک نشہ ہے۔ مجھے کوئی وحشت نہیں تھی۔ گھر شاید اسی کو کہتے ہیں۔ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ نرم نرم بستر، صاف چادریں اور تکیے، سرہانے چھوٹی میز پر جگ اور گلاس، ریشمی کپڑے سے ڈھکی ہوئی پھلوں کی ایک مختصر قاب۔ اس کمرے میں میں پہلے بھی ٹھہرا تھا۔ اب تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ کسی بڑے ہوٹل کے آرام دہ کمرے کا انداز تھا۔ پھول دار قالینوں کا چمکتا ہوا فرش، دیواریں اجلی اجلی، کھڑکیوں پر رنگین پردے پڑے ہوئے۔ اطراف میں دیوار کے ساتھ گدے دار کرسیاں، دیوان اور سنگھار میز، سلیقے، شیشے کی ایک چھوٹی الماری میں کتابیں چنی ہوئی تھیں اور کپڑوں کے لیے لکڑی کی ایک بڑی الماری ایک کونے میں کھڑی تھی۔ زریں کو تو

میں ابا جان کی محل جیسی کوٹھی میں ہونا چاہیے۔ ابا جان کے وہ بہت کام آ سکتی تھی۔ میرا جی چاہا، اسے بلاؤں۔ اس سے بہت سی باتیں کرنے کو جی امڈ رہا تھا۔ وہ ابھی جاگ رہی ہوگی لیکن بس میں سوچتا رہ گیا اور جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

کسی نے مجھے جگایا نہیں تھا۔ میری آنکھ کھلی اور گھڑی پر نظر گئی تو ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ نو بج رہے تھے۔ دیر سے اٹھنے پر مجھے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے۔ نہا دھو کے میں باہر آیا تو ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ موسم بہت خوش گوار تھا اور حویلی میں خوب چہل پہل تھی۔ انہیں میرے بیدار ہونے کی خبر پہلے سے ہو گئی تھی۔ مردانہ بیٹھک میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بٹھل حاکموں کی طرح بیٹھا تھا۔ نصیر بابا اور منیر علی کا بھانجا ارشد، دونوں بیٹے تنویر اور بجو اس کے سامنے موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نصیر بابا اٹھ کھڑے ہوئے اور بے تابانہ مجھے گلے سے لگایا۔ "اچھا ہوا، آپ آ گئے، میرا دل دعائیں کر رہا تھا" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے "بابا نے تو منع کر دیا تھا۔"

"یہاں سب ٹھیک ہے نا؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے، اس کا لاکھ لاکھ احسان ہے" نصیر بابا کی آنکھیں چھلک اٹھیں "یہاں بہت سکون، بہت آرام ہے۔ یہاں تو لوگ ہی دوسرے ہیں۔ اللہ، یہ جنت آباد رکھے، اللہ سب کو خوش رکھے۔"

"اور ان کا کیا حال ہے، ان دونوں کا؟"

"وہ، وہ تو خود ان سے پوچھ لیجئے۔ راستے بھر سہمی سہمی رہیں۔ جانے نیا گھر کیسا ہو، کن لوگوں سے واسطہ پڑے۔ سارے راستے میں تسلی دیتا رہا۔ سچ پوچھیے تو خود میری حالت انہی جیسی تھی۔ جب بابا کا اور آپ کا خیال آتا تو جی کو قرار آ جاتا۔ سوچتا تھا، اگر بابا کی اور آپ کی طرح یہ لوگ نہ ہوئے اور بچوں کا دل نہ لگا تو کہاں جاؤں گا، پھر خیال آتا تھا، بابا نے صاف کہہ دیا ہے، خدانخواستہ ایسا کچھ ہوا تو وہ دوسرا انتظام کر دیں گے۔ راستے بھر میں یہی سوچتا رہا اور دل دھڑکتا رہا۔" نصیر بابا کی آواز بہک رہی تھی "اللہ نے بڑا کرم کیا میاں" وہ کہنے لگے "ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی۔ آپ وہاں اکیلے تھے۔ بابا دیر سے پہنچے ہوں گے۔ تنہا کس طرح، آپ کس طرح ان سے نمٹ رہے ہوں گے اور بابا کے پہنچ جانے کے بعد کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کے بڑے لمبے ہاتھ ہیں۔ پولیس، کچہری، تھانا، اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ تو پاگل ہو جائے گا۔"

"وہ پاگل ہی ہو گیا تھا" میں نے مسکرا کے کہا۔

خوف زدہ ہونا چھوڑیئے!
جینا شروع کیجیے!

قیمت 140 روپے ◆ ڈاک خرچ 23 روپے

خوف ایک بیماری ہے۔ ایسی بیماری جو زندگی میں زہر گھول دیتی ہے اور صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے۔

اس لئے اس کو سمجھیے اس کے اسباب معلوم کیجیے! اور اس کا تدارک کیجیے!

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

مکتبہ نفسیات
پوسٹ بکس 944 ... کراچی 74200
فون: 5802552-5886313 فیکس: 5802551
kitabiat@hotmail.com
kitabiat@yahoo.com

"آپ ہی لوگوں کا جگرا تھا میاں! میں تو اسٹیشن سے بابا کے واپس جانے کے حق میں نہیں تھا لیکن آپ وہاں رہ گئے تھے۔ مجھے ہول آ رہے تھے۔ دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ اب بھی مجھے یقین نہیں آتا' آپ نے کیا جادو کر دیا۔ اس خونخوار آدمی' آدمی کیا' اسے تو بھیڑیا کہنا چاہیے' اسے تو۔۔"
نصیر بابا کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"اب جانے دیجیے جو بیت گیا' اس کا کیا ذکر۔ سمجھیے' وہ کوئی خواب تھا' اب آگے کی سوچیے۔"

"ہاں میاں!" نصیر بابا نے گردن میں پڑے ہوئے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور کسی قدر اعتماد سے بولے "اب آگے کی مجھے فکر نہیں' میرا کام پورا ہو گیا۔ اب آرام سے موت آئے گی۔ میں سب سے بڑا گنہ گار ہوں۔ سب دیکھتا رہا اور چپ رہا۔ اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے۔ شاید اسی طرح اللہ نے میری نجات کی سبیل پیدا کر دی۔"

منیر علی کے بڑے بیٹے تنویر' چھوٹے بیٹے مجو اور بھانجے ارشد نے مجھے گھیر لیا۔ وہ منتظر تھے کہ نصیر بابا کی باتیں ختم ہوں تو اپنے تپاک کا اظہار کریں۔ وہ باری باری مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ تنویر نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر لیا تھا۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نے سرکاری ملازمت کے لیے مختلف امتحانات دیے ہیں اور جلد کسی موزوں عہدے پر تعینات ہونے کا امکان ہے۔ وہ ایک صحت مند' دراز قد' وجیہہ اور ذہین نوجوان تھا۔ چھوٹے مجو کو جب ہم جیسلمیر سے یہاں لائے تھے تو اس کی عمر بارہ سال تھی۔ اب اس نے کچھ قد نکال لیا تھا اور نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ منیر علی کے بھانجے ارشد کی حالت بھی اب درست معلوم ہوتی تھی۔ بہن کے مرنے کے بعد منیر علی اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ بی اے تک ارشد نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اچھا ابھرتے ہوئے قد کا جامہ زیب نوجوان تھا۔ جیسلمیر میں جب مولوی صاحب منیر علی کے مکان میں جا بسے تھے تو منیر علی نے کورا کے لیے ارشد کا پیغام دیا تھا۔ مولوی صاحب کے انکار اور ایک دن اچانک ان کے گھر سے چلے جانے کے بعد ارشد کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ اسے دورے پڑنے لگے تھے' ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے۔ کھانے پینے کا ہوش رہتا تھا نہ لباس کا۔ کئی کئی دن کے لیے گھر سے نکل جاتا اور چاک گریباں' برے حال احوال میں گھر واپس آتا۔ منیر علی کی مرحومہ بہن نے ان کی بیٹی زہرہ کے لیے ارشد کا رشتہ مانگا تھا اور یہی طے تھا کہ زہرہ کی شادی ارشد سے ہو جائے گی لیکن کورا کو دیکھ کے ارشد سے اپنی ماں کے پیمان کی پاس داری نہ کی جا سکی۔ ماموں نے اپنے بھانجے کا میلان دیکھ کے مولوی صاحب سے سلسلہ جنبانی کی۔ ان کے بہ قول' کیوں کہ وہ کورا (نرجس بانو) کو بھی اپنی بیٹی زہرہ کی طرح سمجھتے تھے لیکن مولوی صاحب نے اپنے محسن منیر علی سے تمام قربتوں کے باوجود انکار کر دیا۔ پھر ارشد پر ایک قیامت گزری۔ فیض آباد آ کے بھی بہت دنوں تک وہ اپنے آپ کو جھیلتا رہا اور آخر بس یا ہو گیا۔ شاید کہیں سے اسے بھنک مل گئی تھی کہ کورا کا مطلوب تو کوئی اور ہے اور اس کا مدعی تو کوئی اور ہے۔ کوئی اور کب سے اسے گلی گلی' کوچے کوچے آوازیں لگا رہا تھا۔ کسی اور کا حال ارشد سے بڑی دیوانگی کا ہے۔ ارشد اب ایک متین' بردبار شخص کی حیثیت سے میرے روبہ رو تھا۔ منیر علی کی ہدایت پر ان کی خریدی ہوئی زمین اور زریں کی آبائی جاگیر کی دیکھ بھال اس نے شروع کر دی تھی۔

ان تینوں میں بڑا انکسار تھا' خوش خلقی اور سنجیدگی۔ آخر منیر علی جیسے شریف النفس' نجیب الطرفین شخص سے ان کا تعلق تھا۔ تینوں کے ہاں میرے لیے ایسی گرم جوشی تھی' وہ میرا ایسا لحاظ کر رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بزرگ شخص ہوں' میں کوئی حاکم ہوں' اس حویلی کا مالک ہوں۔ ایک زمانے میں کچھ وقت کے لیے تو خیر میں مالک تھا بھی۔ زریں نے اپنی حویلی اور جاگیر میرے نام کر دی تھی' میں نے کاغذات لوٹا دیے تھے۔ مالک تو میں یوں بھی تھا کہ زریں مجھے بے حد عزیز تھی اور مجھے معلوم تھا' مجھ سے زیادہ وہ مجھے عزیز رکھتی ہے اور اس کی جانب سے مجھے اس کی ہر چیز پر تصرف کا حق حاصل ہے۔ کاش یہ اعتماد میں بھی اسے دے سکتا۔

وہ تینوں' تنویر' مجو' ارشد جھجکتی پلکوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ جانے کیا کچھ میرے بارے میں انہیں بتایا گیا تھا۔ میرے پاگل پن کے قصے' میری بے جگری اور دولت مندی کی داستانیں۔ ان کی آنکھیں تجسس و حیرت' شوق و مسرت سے معمور تھیں۔ انہیں یہاں آئے ہوئے اب ایک وقت ہو چکا تھا لیکن اب بھی بہت کچھ ان کے لیے کسی خواب کی طرح ہوگا۔ اس حویلی کا سلسلہ ہی جدا تھا۔ بہتمل کی مختاری' اس کے مخصوص وضع کے آدمیوں کی آمد و رفت اور نگرانی' ان کی نشست و برخاست اور وضع قطع اور میں! میری خاک بسری اور دشت نوردی کے فسانے۔ بہرحال زریں نے تو اپنی زبان بند رکھی ہوگی مگر کسی کی بات چھپتی کہاں ہے۔ آدمی میں ایک صلاحیت کم سننے اور زیادہ اخذ کرنے کی بھی خوب ہوتی ہے۔ ان تینوں کی نگاہیں مجھے اپنے چہرے پر جھجکتی اور منڈلاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اچھا ہوا' جہاں گیر درمیان میں

وہ ناشتے کے لیے سب کو بلانے آیا تھا۔

چوکی پر یہاں سے وہاں تک دسترخوان بچھا تھا اور قابیں سجی ہوئی تھیں۔ مرچ قیمہ' ترکاری' پوریاں' حلوہ' پراٹھے' سویاں' خاگینہ اور جانے کیا کیا۔ ہم سات مردوں کے علاوہ وہ بھی ایک جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ فروزاں' یاسمن' نیساں' زہرہ' خانم' سلمٰی اور سلمٰی۔ اب یہاں دو سلمائیں ہو گئی تھیں۔ ایک منیر علی کی چھوٹی بیٹی' دوسری ہمارے ساتھ حیدرآباد سے آئی ہوئی۔ زریں ان میں نہیں تھی۔ وہ ناشتے کے اہتمام میں مصروف تھی۔ خانم کے اصرار پر وہ بھی کچھ دیر میں ہمارے درمیان آ کے بیٹھ گئی۔ رات کو تو رات کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ دن کی روشنی میں ان کے چہروں کی تابانی ہی کچھ اور تھی۔ سب کھلے کھلے ہوئے تھے' تو شگفتہ پھولوں کی طرح۔ کہتے ہیں' چہرے آدمی کے دروں کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے چمک دمک رہے تھے۔ یہ شگفتگی اور تابانی ان کی قلبی طمانیت کی مظہر ہی ہوگی۔ انہیں بہروپ کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے کئی بار فروزاں اور یاسمن کو دیکھا۔ انہیں حویلی میں قدم رکھے چوبیس گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ ایک تکلف سا ان کے طور اطوار میں نظر آتا تھا۔ فروزاں کے بارے میں نصیر بابا سچ کہتے تھے۔ وہ تو جیسے پرستان سے آئی ہو' پری اپنے پر جیسے کہیں کھو آئی ہو۔ وہ تو سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ خال و خد' نقش و نگار اپنی جگہ' لیکن تناسب و توازن پہلا وصف ہے۔ رنگ تو پھر مستزاد ہے۔ اس کا رنگ گلابی شہابی تھا' بڑی بڑی آنکھیں' غزال آنکھیں شاید اسی کو کہتے ہیں۔ رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھی ہوئی یاسمن کسی قدر متفکر و متردد نظر آتی تھی مگر یہ اضطراب' حزن و ملال' بے چارگی و ناامیدی کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ نئے ماحول' نئے لوگوں سے مطابقت و مفاہمت کے لیے آمادگی ہی کافی نہیں ہوتی۔ وقت بھی اپنے چکر پورے کرتا ہے۔ آدمی آئینہ نہیں ہوتا کہ کوئی دم لیے بغیر بدلتے چہرے اور منظر اخذ کرتا رہے۔ آئینے کو صرف سامنے آنے والے سے غرض ہے' گزر جانے والے سے واسطہ نہیں۔ آدمی کے آئینہ بصارت پر چہرہ و منظر کی پرتیں چڑھتی رہتی ہیں اور نئے نقش کا جذب و قبول گزشتہ نقش کی شدت سے بھی مشروط ہے یا پھر نئے نقش کی اپنی پختگی اور توانائی پر۔ فروزاں کو ضبط کرنا آ گیا تھا۔ یاسمن ابھی چھوٹی تھی۔ وہ ویسے بھی بڑی سیماب صفت لگتی تھی۔ اچانک بے تاب ہو جاتی تھی جیسے پنجرے میں کوئی سہیلی چنچل پھرے۔ اس کا یہ ہیجان اسے اور دل کش کر دیتا تھا۔ لگتا تھا' کچھ بڑی ہو کے وہ اپنی بہن کا پر تو ہوگی۔

زریں بہتمل کے آگے چیزیں سرکاتی رہی۔ اتنی بہت سی چیزیں تھیں کہ ذرا ذرا سی بھی چکھی جائیں تو جی بھر جائے۔ کھانے میں پھر کیا انتظامات ہوں گے۔ بہتمل نے ابھی ہاتھ کھینچا ہی تھا کہ نیساں نے اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کے سامنے مٹی کی چٹنی کا مرتبان رکھ دیا۔ بہتمل نے اس کا کان پکڑ لیا "تائیکے میں آئے ہیں ری' تیری سسرال میں نہیں۔"

نیساں بری طرح لجا شرما گئی۔ بہتمل نے اسے بازو میں دبوچ لیا "یہ اس نے بنائی ہے" خانم نے مسکراتے ہوئے کہا "اسے کھانا پکانے کا بہت شوق ہے۔"

"پر یہ آپ تو کھاتی پیتی نہیں لگتی' یہ تو بڑی اکھری ہے۔"

"ہاں' یہ عجیب بات ہے۔ جتنا پکانے کا شوق ہے' اتنا کھانے کا نہیں۔ دوسروں کو کھلا کے خوش ہوتی ہے۔"

"لا' پھر نکال اپنے ہاتھ سے" بہتمل نے فراخ دلی سے کہا۔

نیساں نے جلدی جلدی طشتری میں چٹنی نکالی۔ بہتمل نے پوری کے ٹکڑے سے اسے کھایا اور طشتری میری طرف بڑھا دی۔ میں نے بھی ایک لقمہ لیا۔ واقعی مزے دار بھی اور نفاست سے بنی ہوئی تھی۔ بہتمل نے نیساں کی کمر تھپکی اور دیر تک اسے پہلو سے چپٹائے رکھا۔

ناشتے کے بعد سب منتشر ہو گئے۔ بہتمل حویلی کے وسیع صحن میں چہل قدمی کرتا رہا۔ اب صحن کسی گلستاں کی نظیر تھا۔ دیواروں کے ساتھ کیاریاں کھدوا کے پھلواری لگا دی گئی تھی۔ جابجا گملوں کی افراط تھی۔ ان میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سبھی کچھ بدل دیا گیا تھا۔ دالان' دروازوں' محرابوں کی از سر نو تزئین کی گئی تھی۔ طرز تعمیر پرانی تھی' باقی سارا کچھ تازہ تازہ نیا نیا لگ رہا تھا۔

صحن میں بہتمل کو روک کے اور نقدی لے کے میں کسی سے پوچھے بغیر باہر نکل گیا۔ ڈیوڑھی کے باہر مجھے دیکھتے ہی مما تانگا لے آیا۔ میں پیدل ہی جانا چاہتا تھا لیکن دیر تک مسلسل پھوار سے راستے گیلے ہو چکے تھے۔ پھوار اب بند ہو چکی تھی۔ مما سمجھ رہا تھا کہ میرا ارادہ اڈے کی طرف جانے کا ہے۔ اڈے پر جانا چاہیے تھا لیکن وہاں جا کے تو میں گھر جاتا' پھر ادھر حویلی میں بھیڑ اکٹھی ہو جاتی۔ میں نے مما کو بھی منع کر دیا کہ ہماری آمد کی خبر وہ اڈے کے کسی آدمی کو نہ کرے اور راجا ہے' پہلے بہتمل سے معلوم کر لے۔

مجھے خریداری بالکل نہیں آتی تھی۔ نہ مول تول کا علم ... بازار جاکے اندازہ ہوا کہ دوسرے کے لیے کسی چیز کا ...اب کس قدر مشکل ہے۔ کپڑے کی اقسام، معیار اور ... وغیرہ کے بارے میں مجھے کچھ نہیں آتا تھا۔ سونے کی ...وں کے لیے تو آدمی کو خاصا تجربہ چاہیے۔ ادھر ادھر بھٹکتا ... میں سنار کی ایک بڑی دکان پر جاکے ٹھہر گیا۔ شیشے کی ...اری میں رکھا ہوا ایک گلوبند مجھے اچھا لگا۔ ان سبھوں کی ...تی کرکے میں نے اس قسم کے آٹھ گلوبندوں کی قیمت ...چھی۔ دبلا پتلا، تیز و طرار درمیانہ عمر کا سنار میری شکل دیکھا ...یا اور قیمت بتانے کے بجائے اس نے میری نگاہ کی تعریف ... اور گلوبند کی بناوٹ اور خالص سونے کی مقدار کے بارے ...ں زمین آسمان کی باتیں کرنے لگا۔ کہنے لگا کہ لکھنؤ کے بہت ...ے صاحب ذوق نوابین کی طرح نواب اعظم رضا کو بھی اسی ...کے ہاں کے بنوائے ہوئے زیورات پر اعتماد ہے۔ یہ خاص ...ہی کی فرمائش پر بنوایا گیا ہے۔ اس کا کاریگر بھی اپنے فن ...یں یکتا و یگانہ ہے۔ مصری نگینے جڑے ہوئے ہیں اس میں۔ ...ہرحال میں اسے لے جاسکتا ہوں۔ ایسے قدردان کو لوٹایا کیسے جاسکتا ہے۔ نواب صاحب کے لیے وہ جلد ہی اور بنوالے گا۔ اس نے معذرت کی کہ سردست اس کے پاس دو ہی عدد ہیں۔ دو ہفتے میں وہ مزید چھ عدد تیار کروالے گا۔ میری مایوسی پر اس نے یہ مدت ایک ہفتے کردی۔ بڑی مشکل سے میں نے اس سے جان چھڑائی اور مجھے ایک ترکیب سوجھی، کیوں نہ میں سب کو یکساں نقدی سپرد کردوں، وہ خود اپنی مرضی کی سوغات منتخب کرلیں لیکن لائی ہوئی چیز کی بات ہی اور ہوتی ہے، پھر مجھے خیال آیا کیوں نہ صرف ایک گلوبند ہی خریدا جائے۔ میں چپکے سے کسی وقت اسے زریں کے حوالے کردوں گا، باقی کا پھر دیکھا جائے گا مگر کیا یہ مناسب ہوگا؟ زریں کے لیے تو کوئی بہت بڑا تحفہ ہونا چاہیے بلکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ سبھوں کو کوئی نہ کوئی تحفہ نذر کیا جائے، زریں کو اس رسم سے دور رکھا جائے۔ زریں کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو اپنی اس تخصیص پر نازاں ہوگی۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے زریں سے مشورہ کرکے بازار کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ میں بازاروں میں یوں ہی بھٹکتا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ اپنی اس ناموزونی اور بے مائگی سے مجھے الجھن ہونے لگی۔ جو اوروں کو آتا ہے، وہ مجھے کیوں نہیں آتا۔ میں تو جیسے اس دنیا کا آدمی ہی نہیں ہوں۔ کچھ یہی وجہ ہوگی جو حویلی میں سب مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں کوئی عجوبہ ہوں جیسے۔

تانگا میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسے واپس چلنے کی ہدایت کی اور وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ واپسی کے راستے میں ایک جگہ تانگے کو رک جانا پڑا۔ آگے بہت بھیڑ تھی۔ میں نے اتر کے دیکھنا چاہا اور ٹھہر گیا۔ پیچھے اور سواریاں آجانے سے تانگا واپس ہونے اور کسی اور راستے سے جانے کا امکان بھی مسدود ہوگیا تھا۔ شور بڑھتا گیا اور ہجوم بھی۔ میں نے طے کیا، تانگا چھوڑ کے پیدل ہی چلوں۔ تانگے والے کو پیسے ادا کرکے کنارے کنارے راستہ بناتا ہوا میں آگے کھسکتا گیا۔ چند قدم بعد راستہ اور تنگ ہوگیا اور ہجوم عبور کرنا دوبھر ہوگیا۔ لوگوں نے پیچھے ہٹتے ہٹتے دائرہ بنادیا تھا۔ ہریا، ہریا کی پکار پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ فیض آباد کے اڈے کا پرانا آدمی تھا۔ تیس سے کچھ اوپر عمر ہوگی، جمرو اور جامو کا خاص آدمی تھا۔ ہریا کا نام سن کے مجھ سے ٹھہرا نہ گیا اور میں لوگوں کی بھیڑ کاٹتا ہوا دائرے میں آگے کی طرف چلا گیا۔ وہ ہریا ہی تھا اور ایک چاقو بردار نوجوان سے زور آزمائی کررہا تھا۔ میں نے لوگوں سے واقعے کی نوعیت پوچھی مگر انھیں تماشا دیکھنے ہی سے فرصت نہیں تھی۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ۔ ان کے اچٹتے ہوئے کلمات سے اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ کوئی لڑکی وجہ نزاع ہے۔ ایک سن رسیدہ آدمی نے اعانت کی، کچھ اس کی زبانی اور کچھ دوسروں کے بیان کے مطابق خلاصہ یہ تھا کہ کسی نوجوان لڑکی کے باپ نے فیض آباد سے باہر دور کے ایک رشتے دار کو اپنی لڑکی کا رشتہ دینے سے انکار کردیا تھا۔ لڑکے کے والدین مال و زر میں حیثیت مند تھے۔ انھوں نے طرح طرح زور ڈالا اور آخر لڑکی کو بہ جبر لے جانے کی دھمکی دی۔ لڑکی کے باپ نے ہریا کے پاس جاکے دہائی دی۔ گزشتہ دنوں ایک رات لڑکے والے اپنے شہ زوروں کی مدد سے لڑکی کو اغوا کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ ہریا ان کے راستے کا پتھر بن گیا۔ اس نے انھیں مار بھگایا اور لڑکی کو بہ سلامت والدین کے پاس پہنچادیا۔ اب لڑکے والوں نے اس رات اپنی ناکامی کا صدمہ مٹانے اور لڑکی کے باپ کو سبق سکھانے کے لیے اس شوریدہ پشت نوجوان کو فیض آباد بھیجا ہے۔ نوجوان نے سرراہ ہریا کو للکارا اور حملہ کردیا۔

میں سامنے نہیں ہوا، لوگوں کی آڑ سے دیکھتا رہا۔ ہریا اپنا چاقو گنوا چکا تھا اور چاقو بدست نوجوان کو زیر کرنے کے جتن کررہا تھا۔ دونوں کو زخم آئے تھے اور خون رس رہا تھا لیکن دونوں وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے پر حاوی آنے کے لیے داؤ آزما رہے تھے۔ ہجوم میں بیشتر ہریا کے حامی تھے۔

اتنے بہت سے لوگ اپنے محلے، اپنے شہر کی لڑکی کی ناموس کے لیے ایک نوجوان کو قابو میں نہیں کرسکتے تھے۔ وہ ذرا حوصلہ کرتے تو نوجوان کو اس دیدہ دلیری کی جرأت نہ ہوتی۔ سب نظارہ بازی کررہے تھے اور شاید نوجوان کے آمادۂ غضب تیوروں سے زیادہ اس کے کھلے چاقو سے ہیبت زدہ تھے۔ ہتھیار کی اپنی دھاک ہوتی ہے۔ نوجوان یقیناً اکیلا بھی نہیں ہوگا۔ اس نے لوگوں اور خصوصاً ہریا پر اپنا اثر دبدبہ قائم رکھنے کے لیے اپنے ساتھی یا ساتھیوں کو الگ رکھا ہوگا۔ ہریا تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ نوجوان میں پھرتی زیادہ تھی اور اسے اپنے زور پر کوئی ناز ہی ہوگا جو اس اجنبی شہر میں بہادرہ معرکہ آرا تھا۔ وہ ہریا کو تقریباً نچا رہا تھا بلکہ اب تو اس سے جیسے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ہریا کی ہر کوشش ناکام ہورہی تھی۔ اس کا تعلق جمرو اور جامو کے اڈے سے تھا۔ ایسے ویسے کو تو وہاں داخل ہی نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ اتنی دیر تک چاقو کے بغیر اپنا دفاع کوئی کہنہ مشق ہی کرسکتا تھا تاہم ہریا کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے تھا کہ اس کا حریف ضروری نہیں نوجوان ہے تو ناپختہ کار بھی ہو۔ وہ صاف اڈے کا لڑی تھا۔ کسی مستند استاد سے اس نے تربیت حاصل کی ہوگی اور استاد کی نگہ داری کتنی ہی اہم ہو، اڈے کا آدمی تو اپنے جوہر، ارادے، اپنی جستجو اور ریاضت سے بنتا ہے اور ہمت اور تجربے سے اس پر اور نکھار آتا ہے۔

ہریا نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے مقابل کے سوا اسے کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت بھی کہاں مل سکتی تھی۔ میں بھی اپنے آپ کو چھپائے ہوئے تھا۔ جلد یا بدیر اڈے پر اس لڑائی فساد کی خبر پہنچ جانی تھی اور اڈے کا کوئی بھی آدمی کسی وقت یہاں آسکتا تھا۔ فیض آباد کا اڈا میرے لیے کوئی غیر جگہ نہیں تھا۔ یہ جمرو اور جامو کا اڈا تھا۔ ہم میں بھائیوں کا رشتہ تھا۔ بھائی کے رشتے کے لیے بھائی ہونا لازم نہیں ہے۔ جامو نے بھٹل کی خاطر اپنا فیض آباد کا اڈا ترک کردیا تھا اور کلکتے کے اڈے کی نگرانی کررہا تھا۔ اس نے اباجان کی تلاش میں ہمارے ساتھ تبت کا صبر آزما سفر کیا تھا۔ زریں کی حویلی واگزار کرانے میں جامو پیش پیش تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی ...نے بھی ہماری وجہ سے اپنا اڈا خیرباد کہہ دیا تھا اور عرصے سے کشتی بستی ہمارے ساتھ سفر کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ اب بھی وہ اپنا گھر، اپنا شہر چھوڑ کے کلکتے میں ہم دونوں کا منتظر ہے۔ یوں فیض آباد کا اڈا بھٹل کا اور میرا ہی اڈا تھا۔ اپنے اڈے کا ایک شخص مشکل وقت سے دوچار تھا۔ میرے ہاتھ کھلا میں اینٹھن ہونے لگی۔ میں نے خود کو روکا، پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ایسے وقت میں کوئی اور ہوتا تو اسے کس ردعمل کا اظہار کرنا چاہیے تھا؟ اس کا شاید ایک ہی جواب تھا۔ میں نے نوجوان کا اچھی طرح تخمینہ کرلیا تھا۔ اس کی لگام اسی کے ہاتھوں میں تھی اور وہ خاصا اترایا اترایا نظر آتا تھا۔ اترانے والا جلد بھڑک جاتا ہے۔ بھڑکے ہوئے آدمی کو چاقو زیب نہیں دیتا۔ میں نے طے کرلیا تھا، اس کے سامنے جانے کی صورت میں اس کا پارا اور تیز کرنا ہے۔ اشتعال میں آدمی ضد پر آجاتا ہے اور ضد میں بینائی متاثر ہوتی ہے۔ میں نے بہ جبر خود کو روکا۔ مجھے بھٹل کی بات یاد آئی۔ چاقو بردار کیسا ہی نو مشتاق، غصہ ور ہو، یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ اس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔ اس کے سامنے اسی وقت جانا چاہیے جب کوئی متبادل راستہ نہ ہو۔ چاقو بازی میں نیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ نیت کی استواری، مقصد کی توانائی یا ناتوانی پر منحصر ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی مقصد پس پشت چلا جاتا ہے۔ آدمی پر انا اور غیرت مسلط ہوجاتی ہے۔ یہ مرحلہ بڑا جنون انگیز ہوتا ہے۔ یہ جنون جاں نثاری پر بھی آمادہ کرتا ہے اور ہزیمت کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ پھر بہت کچھ مخالف فریق کی سوجھ بوجھ پر ہے کہ جنون کم کرنا اس کے لیے سودمند ہوگا یا فزوں کرنا۔ بھٹل کے خیال میں بدلتی صورت حال میں فیصلہ بدلنے کی اہلیت کی لمحے لمحے ضرورت پڑتی ہے۔ نوجوان کا مقصد اتنا توانا نہیں تھا۔ وہ اپنے لیے نہیں، دوسرے کے لیے سینہ سپر تھا۔ وہ خریدا ہوا تھا، سو اس کی نیت بھی مجہول ہوگی۔

میں نے خود کو ضبط و تحمل کی تاکید کی۔ ہریا اگر پسپا ہوجاتا ہے تو جمرو اور جامو کے اڈے پر اکیلا ایک ہریا ہی نہیں ہے۔ میرے لیے مداخلت سے باز رہنا ہی بہتر ہے۔ بات دور تک بھی جاسکتی ہے اور میری خوش گمانی کے برعکس بھی ہوسکتی ہے۔ پھر سارے شہر میں چرچا ہوگا۔ درمیان میں پولیس بھی آسکتی ہے۔ پھر وہی سوال و جواب، وہی سلسلہ۔ ابھی کل ہی ہم آسن سول سے کسی طور بچ کے آئے ہیں۔ پہلے ہی کچھ کم تجربے نہیں ہوئے ہیں۔ بات حویلی تک بھی جائے گی اور حویلی جو بہت دنوں سے سب کے لیے ایک گوشۂ اماں ہے، نگاہوں کی زد پر آجائے گی۔ منیر علی کے دونوں بیٹے تنویر، نجو اور بھانجا ارشد اسی شہر میں رہتے ہیں۔ حویلی سے باہر اب مختلف لوگوں سے ان کی اچھی سلام دعا ہوتی جاتی ہے۔ جانے کیسی کیسی کہانیاں انھیں سننے کو ملیں۔ اپنے لیے نہیں تو اپنے متعلقین کے لیے مجھے محتاط رہنا چاہیے۔ میں اور پیچھے ہٹ آیا۔ اس سے پہلے کہ اڈے کے آدمی یہاں پہنچیں اور پولیس آجائے، مجھے دور ہوجانا چاہیے۔ کسی کی نگاہ مجھ پر

پڑسکتی ہے۔ اڈے کے تقریباً سارے آدمی مجھ سے واقف ہیں۔ میں اس وقت گھر سے نہ نکلتا یا ہم اس شہر میں ایک دن کی تاخیر سے پہنچتے تو! لمحوں تک میں خود سے حجت کرتا رہا اور میں نے سر اٹھا کے آخری بار دائرے میں جھانک کے دیکھا۔ ہریا ابھی تک اپنا دفاع کر رہا تھا اور نوجوان اس کی ذلت کے درپے تھا۔ میں ہجوم کے دائرے سے باہر آگیا لیکن اپنی ہی تاویلیں میرے رگ و پے سے چمٹ گئی تھیں۔ مجھے کیا یہی کرنا چاہیے تھا؟ جامو اور جمرو کے کسی عزیز ترین شخص کا یہی طور ہونا چاہیے؟ کسی کو یہاں میری موجودگی کا علم نہیں ہے مگر میں خود تو جانتا ہوں۔ میں یہاں بہ تمام ہوش و حواس حاضر و ناظر تھا۔ اس اقدام سے تو ناروائی، بے غیرتی، کم ہمتی اور خود غرضی کی بساند آتی ہے۔ اگر یہ گریز کسی بڑی بھلائی کے لیے ہے تو تاسف و ندامت کا کانٹا کیوں سینے میں کھٹک رہا ہے۔ میں دور ہوتا رہا اور میرے پیر الجھتے رہے۔ ہجوم کا شور میرا تعاقب کر رہا تھا۔ نہ معلوم، میں نے کتنا فاصلہ طے کیا، دو سو قدم، تین سو، چار سو۔ یکایک میں نے پلٹ کے پھر ہجوم کا رخ کیا۔ میں اب کچھ اور سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ بھاگتا ہوا میں دائرے تک پہنچا اور ہجوم چیرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

دائرے کے اگلے حصے میں کھڑے ہوئے لوگ تیسرے شخص کی اس ناگہانی آمد سے بڑبڑائے گئے۔ وہ دونوں، ہریا اور نوجوان اس وقت دائرے کے وسط میں ایک دوسرے کو بھپکیاں دے رہے تھے۔ دونوں منتشر ہوئے، حیران بھی۔ دونوں کو ٹھہر جانا پڑا۔ کسی جھجک کے بغیر میں ان کے درمیان جا کھڑا ہوا تھا۔ نڈھال ہریا ہذیانی انداز میں چیخا "ارے لاڈلے میاں! تم!" اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔

میں نے ہاتھ اٹھا کے اسے پرسکون رہنے کی تلقین کی اور گز بھر کی دوری پر رہ کے نوجوان سے پوچھا "کیا ہو رہا ہے یہ؟"

"تم... م م! کون ہو تم؟" اس نے بپھر کے کہا "دکھائی نہیں دیتا تم کو؟"

"دے رہا ہے، اچھی طرح دکھائی دے رہا ہے پر کیوں، کیوں...؟"

میری بات اس نے پوری نہیں سنی۔ وہ قہر و غضب کی حالت میں تھا۔ میرا سرد اور فہمائشی لہجہ اسے گراں گزرنا چاہیے تھا بلکہ چڑ ہونی چاہیے تھی۔ وہ دہاڑ کے بولا "ہٹ جاؤ ایک دم ادھر سے۔"

میں نے آہستگی سے کہا "ہم کو بولو، بات کیا ہے، کیوں خون خرابا کرتے ہو۔"

"وہ اس حرام کے جنے سی پوچھنا" نوجوان نفرت سے بولا "اس نے اپنے ٹھاکر صاحب کا رستہ روکا ہے پر آج طے ہو جائے گا۔"

"یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے" میں نے اپنی آواز نرم رکھی "کوئی فیصلہ کرنا ہے تو اس کا اڈا کھلا ہے، وہاں جا کے بات کرو۔"

"ارے ہٹو" وہ گرج کے بولا "تم کوئی ٹھیکے دار ہو۔" اس نے میرے سینے پر ہاتھ مار کے مجھے دھکیل دیا اور چاقو لہرانے لگا۔

اس کے دھکیلنے سے میں ایک قدم پیچھے ہو گیا تھا اور ذرا کچھ ڈگمگا بھی گیا تھا۔ وہ نوجوان کے ساتھی ہوں گے جنھوں نے پچکارتے ہوئے مجھے مشورہ دیا "جاؤ بھیا صاحب! اپنا کام کرو، تم بیچ میں مت پڑو، تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔" کوئی جواب دینے کے بجائے میں ایک قدم بڑھ کے پھر نوجوان کے سامنے ہو گیا۔

"کیا کہا تم کو!" اس نے دوبارہ میرے سینے پر دو ہتڑ مارنا چاہا، میں خود پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اصول قاعدے کا اتنا خیال نہیں رکھنا تھا۔ میں اڈے پر نہیں تھا، نہ یہ اڈے کی چوکی، اپنا حق جتانے کا کوئی معاملہ تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا، فوراً کرنا تھا لیکن چند تمہیدی کلمات تو ضروری تھے۔ رتی بھر امکان اس خوش فہمی کا بھی تھا کہ وہ ایسے ہی باز آجائے۔ نشان دہی ہونے کے بعد اس کے دونوں ساتھی بھی [illegible] میری نظر میں تھے "جاؤ، جاؤ، اپنا کام کرو" وہ مجھے دھتکارنے لگا۔

"اپنا چاقو تو مجھے دے دو" میں نے رسان سے کہا۔

وہ کھل پڑا، اس نے کئی بار بل کھائے "چاقو دے دوں تمہیں، ہیں، گلا کاٹو گے تم اس کا یا اپنا" اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کے وہ طنز، حقارت اور مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا "کیا بولتے ہیں صاحب بہادر! چاقو دے دوں ان کو لے چاقو" اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ تیزی سے اس طرح میری طرف بڑھایا جیسے واقعی چاقو میرے سپرد کرنا چاہتا ہو، میرے ہاتھ بڑھانے پر اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کئی بار اس نے یہی کھیل کیا۔ بچوں کو ان کی کوئی پسندیدہ چیز [illegible] کے لیے جیسے لطف لیا جاتا ہے۔ چاقو حاصل کرنے کے [illegible] میرا شوق و اضطراب اور میرے پھیلے ہوئے ہاتھ پر وہ [illegible] اپنا ہاتھ پیچھے کر لیتا۔ مجھے عجلت کی فکر تھی لیکن اتنی جلد [illegible] برآری کی توقع نہیں تھی۔ دوسری بار، تیسری، چوتھی بار [illegible] ... پھر ایک بار وہ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ نہیں سکا۔ اس کی کلائی میرے پنجے کی گرفت میں تھی۔

مجھے معلوم تھا، پہلے تو وہ ششدر رہے گا پھر سارے جسم کا زور صرف کرے گا۔ وہ بری طرح بوکھلا جائے گا۔ میرے ہاتھ پر اپنے دوسرے ہاتھ سے ضرب لگائے گا یا میرے سینے پر ٹھونسے مارے گا۔ یہ تبھی ممکن ہوتا جب میں اسے کوئی مہلت دیتا۔ ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پر پنجہ ڈال کے میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا اور اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑے پکڑے ادھر کھلے ہاتھ سے پے در پے ضربیں اور مسلسل ٹھوکریں لگائیں۔ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اسے حواس باختہ ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ دیکھ کے اس کے دونوں ساتھی مجھ پر جھپٹ پڑے۔ ایک کو تو میں نے ٹھوکر مار کے دور کر دیا۔ جانے کہاں اسے چوٹ لگی تھی کہ وہ وہیں دوہرا ہو گیا، دوسرا میری زد پر نہ آسکا۔ اس نے عقب سے میری پیٹھ اور گردن بے دریغ مکوں سے نشانہ بنائی۔ مجھے یہ ضربیں برداشت کرنی تھیں اس لیے کہ مجھے اپنی ساری توجہ نوجوان کی کلائی پر مرکوز رکھنی تھی اور ایک جگہ کھڑے رہنے کے بجائے گھوم پھر کے ہی میں اسے بے حال کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھی نے پیچھے سے میری گردن جکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نوجوان کو کھینچتا، اس کے ہاتھ کو جھٹکے دیتا دائرے میں یہاں سے وہاں گردش کرتا رہا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی اٹھ کے مجھ سے چمٹ چکا تھا، وہ میرے ایک جگہ ٹھہرے نہ رہنے سے کام یاب نہ ہو سکا۔ میں پل بھر میں اپنا رخ تبدیل کر لیتا تھا، پھر ادھر سے ہریا آگیا۔ حالانکہ میں نے ابتدا میں اسے خاموشی سے کھڑے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ پہلی بار میں نے دیکھا کہ ہریا بھی اکیلا نہیں ہے۔ اڈے کا ایک اور آدمی اس کے ساتھ تھا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا تھا۔ دونوں نوجوان کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ یوں مجھے یکسو ہونے کی فراغت مل گئی۔ میری پہلی اور آخری ترجیح یہی تھی کہ کسی طرح جلد سے جلد نوجوان کو چاقو سے دستبردار کراؤں۔ اس اذیت سے بے پروا ہو کے کہ وہ کہاں کہاں مجھ پر ضربیں لگاتا ہے، میں پیشتر، جب بھی موقع ملا، اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی اور بازو پر ترچھے ہاتھ سے وار کرتا رہا۔ اس نے بہت زور لگایا تھا مگر تنہا زور کافی نہیں ہوتا۔ زور کے ساتھ ایک ہنر بھی چاہیے۔ اس کے چاقو والے ہاتھ پر ان ضربوں میں کوئی ایک کاری ہونی چاہیے تھی۔ اس کی کلائی ٹوٹی یا بازو اترا کہ ایک چیخ بلند ہوئی۔ چاقو جیسے ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹا، میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ اپنا توازن کھو چکا تھا، لڑکھڑاتا ہوا ہجوم پر جا گرا۔ اس اثنا میں جتنی جلد ممکن ہوا، میں نے چاقو زمین سے اٹھا کے اور چند لمحے اپنے پاس رکھ کے ہریا کی طرف اچھال دیا۔

میرے اشارے پر ہریا اور اس کے ساتھی نے نوجوان کے ساتھی چھوڑ دیے۔ وہ کچھ ادھ موئے اپنے سرغنہ کا حال دیکھ کے بھی ہو گئے تھے۔ اب مزید زحمت کی ضرورت نہیں تھی لیکن پیش بندی کے لیے میں نے دونوں کو سنبھال لیا اور جب تک وہ زمین پر ڈھیر نہیں ہو گئے اور ان کے ہاں التجا اور رحم طلبی کے آثار نمودار نہیں ہوئے، میں نے ہاتھ نہیں روکا۔ اس میں کچھ انہی کا بھلا تھا۔ آئندہ وہ منہ اٹھائے کسی طرف نہیں چل پڑیں گے، دس بار عواقب پر ضرور غور کریں گے۔

پھر میرے وہاں ٹھہرے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہریا نے نیم جاں نوجوان کے بال پکڑے، اس کے سر کو جھٹکے دیے اور گرجنے لگا "دوبارہ تو نے اگر اس شہر کا..."

اس کے بعد مجھے کچھ سنائی نہیں دیا۔ لوگوں نے مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کے دھکم پیل کرتے ہوئے راستہ دیا۔ مجھے احساس تھا کہ ان کی نظریں مجھ پر منڈلا رہی ہیں لیکن میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا اور سر جھکائے تیز رفتاری سے بڑھتا رہا۔

○☆○

میرا گریباں چاک ہو چکا تھا۔ سڑک گیلی تھی۔ پائنچوں پر کیچڑ تھپ گئی تھی۔ کمر سے کرتا بھی پھٹ چکا تھا۔ اس حالت میں حویلی جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ایک صورت تھی کہ اڈے جا کے گھر سے نیا جوڑا منگواؤں مگر اڈے پر جا کے جلد چھٹکارا نہ ملتا۔ اس حلیے میں بازاروں سے گزرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لوگ میری طرف حیرت سے دیکھتے تھے۔ اس وقت یہی ترکیب سوجھی کہ کہیں سے نئی چادر یا شال خریدوں۔ تانگا پکڑ کے اور مطلوبہ دکان تک سفر کر کے میں نے سفید کشمیری شال خریدی اور جسم پر لپیٹ لی۔ جس طرح حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس بیمار جاتے ہیں، میں حویلی میں داخل ہوا۔

دو بج چکے تھے۔ سب میرے منتظر تھے۔ کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میری اس ہیئت کذائی پر انھیں مضطرب ہونا چاہیے تھا، ان کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ان کے سامنے جا کے مجھے ایسی ندامت نہیں ہو رہی تھی۔ میرا جسم ہلکا ہلکا تھا۔ لباس تبدیل کر کے میں باہر آیا تو دستر خوان پر کھانا چن دیا گیا تھا۔ لگتا تھا، ابھی صبح سے بس کھانے کا اہتمام کرتی رہی ہیں۔ طرح طرح کے خوان یہاں سے وہاں تک سجے ہوئے تھے۔ صبح دیر سے ناشتا کیا تھا لیکن طبیعت حاضر ہو، سر پہ کوئی بوجھ نہ

RAWALPINDI PH:5556532
PROP:ALI KHAN

ر وہ جو کہتے ہیں' آدمی عملی بالطبع ہو' نشاط خاطر والی
ت ہو تو بھوک بھی اچھی لگتی ہے۔ پھر ماحول ہی کھانے کا
برسات کی نسبت سے انہوں نے برسات میں کھائی
نے والی چیزوں کا خیال رکھا تھا۔ کھانے کے بعد میں اپنے
رے میں آگیا۔ بستر پر ذرا کمر ٹکائی تو آنکھیں بھاری ہونے
ں۔ نوجوان کے ساتھی نے میری کمر پہ بہت کے مارے
ب درد تو نہیں تھا لیکن تھوڑی دیر بعد کسک سی
تی۔ کچھ مرغن کھانوں کا خمار' کچھ گھر کی فراغت و راحت'
اطمینان کہ جمرو اور جامو کا سامنا کرنے میں پیشانی سے
نہیں جھلکے گا' مجھے نیند آگئی اور دروازہ بند کیے بغیر میں
م تک سوتا رہا۔

شام کو جہاں گیر کی دستک پر آنکھ کھلی۔ وہ بتانے آیا تھا
بہت سے لوگ ملاقات کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ مجھے
علوم تھا' وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں۔ منہ ہاتھ دھوکے میں
بیٹھک میں آیا تو چوکی پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مجھے
یکھتے ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اڈے کے نگراں سلامت'
رف سلامی نے تو دیر تک مجھے سینے سے چمٹائے رکھا۔ ہریا
بھی وہاں تھا یعنی جُھل کو سارے واقعے کی خبر ہوچکی تھی۔ یہ
چھپی بھی کیسے رہ سکتی تھی۔ جلد یا بدیر معلوم ہونا ہی تھا۔
درمیان میں بہت سے لوگ تھے۔ میں جُھل سے دور چوکی
کے کنارے پر بیٹھ گیا' ہریا اور اس کے ساتھیوں نے مجھے
گھیر لیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ہریا سے زور آزمائی کرنے
والا نوجوان گورا کے لقب سے مشہور ہے۔ ساٹھ میل دور
بارہ بنکی سے اس کا تعلق ہے۔ اڈے کے پرانے استاد کو
نکال کے اس نے چوکی پر قبضہ جمالیا تھا اور دور دور تک اپنے
چاقو کی دھاک بٹھادی تھی۔ اصل میں وہ ٹھاکر ہردیو کا پروردہ
تھا۔ ٹھاکر کے نوجوان اور اوباش لڑکے بل دیو نے قریبی شہر
ایودھیا میں تیرتھ یاترا کے دوران میں فیض آباد کے اوسط
درجے کے ایک تاجر کاشی داس کی نوجوان حسین و جمیل بیٹی
برکھا کو کہیں دیکھ لیا تھا۔ اس نے تیرتھ استھان ہی میں برکھا
سے زیادتی کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ پھر اس نے
فیض آباد میں باقاعدہ کاشی داس کو برکھا کے لیے پیغام بھیجا۔
بہ ظاہر یہ رشتہ کاشی داس کے لیے عزت و مرتبت کا باعث
ہونا چاہیے تھا۔ ٹھاکر ایک صاحب حیثیت آدمی تھا' اس
پاس کے کئی علاقوں میں اس کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں لیکن
جہاں دیدہ کاشی داس کو اس پیام کے پیچھے ٹھاکر کے مذموم
ارادوں کا اندازہ تھا۔ ٹھاکر کے تعیش' عشرت اور زور واثر کی
داستانیں اطراف و اکناف میں عام تھیں۔ لوگ اپنی نوجوان
لڑکیوں کو پردوں میں چھپائے رکھتے تھے۔ کاشی داس کو معلوم
تھا کہ انکار کے جرم میں وہ کیسے عبرت ناک انجام سے دوچار
ہوسکتا ہے لیکن اپنی لخت جگر کو وہ جیتے جی' سب کچھ جانتے
بوجھتے جہنم میں تو نہیں دھکیل سکتا تھا۔ وہ بہانے کرتا رہا۔
ٹھاکر کو بہت جلدی تھی۔ اس نے دھمکیاں دینی شروع
کردیں۔ کاشی داس نے ہامی نہیں بھری تو ٹھاکر نے اپنے
گرگوں کے ذریعے برکھا کو اغوا کرالیا۔ اڈے کے لوگوں کو
بروقت خبر ہوگئی اور انہوں نے ٹھاکر کے کارندوں کو راستے
میں جالیا اور مار بھگایا پھر ٹھاکر نے فیض آباد کے اڈے کے
لوگوں پر دباؤ ڈالنے یا انہیں آزمانے کے لیے گورا کو یہاں
بھیج دیا یا گورا خود اپنے مالکوں کی سبکی کی خبر سن کے دیوانہ
ہوا۔ کم و بیش یہ وہی داستان تھی جو میں نے مختلف لوگوں اور
ایک بوڑھے تماشائی سے سنی تھی۔ ہریا اور اڈے کے دیگر
آدمی رازدارانہ انداز میں مجھے ٹھاکر کے جاہ و اقبال اور
شقاوت و سفاکی کے قصے سناتے رہے اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ
مجھے جتارہے ہوں کہ گورا کی ہزیمت سے مراد یہ نہیں ہے کہ
ٹھاکر بل دیو نے بھی شکست قبول کرلی ہے۔

ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اندر حویلی سے ان کے
لیے کھانے پینے کا سامان آتا رہا۔ چائے' شربت' نمکین'
مٹھائیاں' پان حقہ' بیڑی' سگریٹ کا دور مسلسل چل رہا تھا۔
پھر اندھیرا گہرا ہوجانے پر ممانے آکے کاشی داس کی آمد کی
اطلاع دی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے سوچا' ٹال
کردوں۔ میں یہ معاملہ آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا لیکن ہریا کی
سفارش پر میں نے اسے بلالیا۔ وہ ایک ادھیڑ' دراز قد' دبلا
پتلا' گندمی رنگ کا خوش پوشاک شخص تھا۔ دھوتی کرتے اور
بند گلے کے کوٹ میں ملبوس تھا۔ ممانے اسے میرے پاس
پہنچادیا۔ اس نے ادب سے مجھے پرنام کیا اور میرے پیر
چھونے چاہے تو میں نے اسے روک دیا۔ میرا شکریہ ادا کرتے
ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے' وہ بہت دل برداشتہ
نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا' وہ ایک عزت دار آدمی ہے' چھوٹا موٹا
کاروبار ہے۔ اچھی گزر بسر ہوجاتی ہے۔ زیادہ کی ہوس نہیں
اس نے اپنی بیٹی برکھا کو بی اے کی تعلیم دلائی ہے۔ برکھا کے
علاوہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ دو بیٹے بچپن میں مرگئے
دوسرے بیٹے کی ولادت پر بیوی بھی جدا ہوگئی تھی۔ برکھا کو
اس نے ماں کی طرح پالا پوسا ہے۔ وہ مزید تعلیم حاصل کرنا
چاہتی ہے۔ کئی رشتے اسی لیے مسترد کردیے گئے۔
داس دل سوزی سے کہہ رہا تھا کہ وہ ٹھاکر بل دیو کے زور واثر
سے بہ خوبی واقف ہے۔ کسی طور وہ اس کا ہم سر نہیں
اس کے سامنے بات کرنے کی جرات بھی نہیں کرسکتا۔ اغوا
کے واقعے کے بعد برکھا کی حالت نہایت ابتر ہے' وہ بیٹھے بیٹھے
چونک پڑتی ہے۔ نہ کچھ کھاتی ہے' نہ پیتی ہے' ساری رات
دیواریں تکتی رہتی ہے اور کبھی کبھی بری طرح کپکپانے لگتی
ہے۔ وہ بہت خوف زدہ ہے۔

میں نے اسے تسلی تشفی دی "سب ٹھیک ہوجائے گا'
حوصلہ رکھیے۔" میں یہی کہہ سکتا تھا۔ گو مجھے اپنے لفظوں کی
بے قدری کا خوب احساس تھا۔

ہریا' کاشی داس کو میرے پاس سے اٹھا کے جُھل کے
پاس لے گیا۔ میں نے دور سے دیکھا' کاشی داس نے جُھل
کے پیر پکڑ لیے اور بلک بلک کے اپنی روداد سنانے لگا۔ اس کی
آواز مجھ تک اس قدر نہیں پہنچ رہی تھی۔ جُھل بے حس
و حرکت بیٹھا سنتا رہا۔ جہاں دیکھو' آدمی' آدمی کا تعاقب کررہا
ہے اور آدمی' آدمی سے بھاگ رہا ہے۔ کاشی داس کی حالت
زار سے جی تو یہ کرتا تھا کہ ٹھاکر کے علاقے میں جاکے اس کا
قصہ ہی ہمیشہ کے لیے ختم کردوں۔ موذی جانور بھی تو مار دیے
جاتے ہیں۔ ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ مٹھی بھر آدمی' انسانوں کے
ایک ہجوم کی زندگی عذاب کردیتے ہیں۔ ہر جگہ یہ دنیا گنتی کے
آدمی ہی خراب کرتے ہیں۔ کوئی ان کا کچھ نہیں کرپاتا۔ سب
دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ آدم خور درندوں کی طرح آدم خور
آدمیوں کو بھی لوگ گھیر کے' اکٹھے ہوکے مار دیا کریں تو دنیا ہی
بدل جائے۔

کاشی داس جلد ہی چلا گیا۔ اڈے کے کئی آدمی رات
تک بیٹھے رہے۔ ان کے جانے کے بعد کھانا ہوسکا۔ میں
جُھل کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات
نہیں کی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ کھانا بھی اس نے
خاموشی سے کھایا۔ مجھے شبہ ہورہا تھا کہ کہیں یہ سکوت میری
وجہ سے تو نہیں ہے؟ ممکن ہے' ہریا اور گورا کے معاملے میں
میری مداخلت سے وہ ناخوش ہو۔ میں کیا صفائی پیش کرتا۔ میں
نے خود کو بہت روکا تھا۔ میں تو وہاں سے ہریا کو اس کے حال پر
چھوڑ کے چل ہی پڑا تھا مگر مجھ سے آگے نہ بڑھا جاسکا۔ میری
جگہ وہ ہوتا تو کیا کرتا؟ کھانے کے بعد وہ بیٹھک میں آبیٹھا۔
اس وقت لوگ کم تھے' جہاں گیر' نیساں' منیر علی کے دونوں
بیٹے اور نصیر بابا وہاں موجود تھے۔ میں نے سوچا' اسے کریدوں
لیکن مجھے کوئی سرا ہی نہیں مل رہا تھا۔ کوئی اور بات سمجھ میں
نہیں آئی تو اس کا موڈ توڑنے اور دھیان بٹانے کے لیے میں
نے اسے یاد دلایا "وہ فروزاں اور یاسمن کی چیزیں" میں نے
دھیمی آواز سے پوچھا "تم نے ان کے سپرد کردیں؟"

"ہاں رے' وہ تو یاد ہی نہیں رہا" وہ کسمساکے بولا' اس
کی آواز بھاری تھی "دے دے ان کا سارا۔"

"میں' میں کیا!" میں نے بھلا کے کہا "تم تم خود ان کے
حوالے کرو' میں سامان لے آتا ہوں اور انہیں
بلالیتا ہوں۔"

وہ پھر کہیں گم ہوگیا۔

میں نے جہاں گیر سے فروزاں اور یاسمن کو بلانے کے
لیے کہا اور کمرے میں جاکے' اٹیچی سے ان کا صندوقچہ
اٹھالایا۔ ان دونوں کے ساتھ وہ بھی آگئیں۔ خانم' زریں'
زہرہ اور دونوں سلمائیں۔ صندوقچہ میں نے جُھل کے
سامنے رکھ دیا۔ "ادھری آجاؤری!" اس نے فروزاں اور
یاسمن کو مخاطب کیا۔

دونوں گھبرائی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے انہیں
تردد ہوا پھر سر جھکائے' اپنا سراپا چرائے ہوئے وہ جُھل کے
قریب جاکے بیٹھ گئیں۔ ل نے خانم کو صندوقچہ کھولنے کا
اشارہ کیا۔

"کیا ہے اس میں؟" خانم نے حیرانی سے پوچھا۔ حیرانی
میں اشتیاق کی آمیزش غالب تھی۔

جُھل نے حقے کا لمبا کش کھینچ کے بدبداتے ہوئے کہا۔
"تاکن ہے اس میں۔"

سب اپنی جگہوں سے کھسکتے ہوئے جُھل کے گرد جمع
ہوگئے تھے۔ ان کی آنکھیں تجسس سے چمکنے لگی تھیں۔ خانم
نے احتیاط سے صندوقچہ کھولا اور پلکیں جھپکانے لگی۔
"ہائیں' یہ کیا ہے؟ اتنا سارا؟" اس نے اوپر رکھا ہوا ہیروں
جڑا ہار اٹھاکے دیکھا۔ اس کے ہیرے جگ مگ کررہے تھے۔
سبھوں نے باری باری وہ ہار دیکھا۔ فروزاں اور یاسمن تو
مبہوت سی ہوگئی تھیں۔ حیرت و مسرت سے انہوں نے
سسکاری بھری۔ ان کے دیدے بھی ہیروں کے مانند دمکنے
لگے۔ وہ اپنا ہار پہچان گئی ہوں گی۔ دونوں پھٹیں ایک دوسرے
کی صورت دیکھنے لگیں۔ انہیں جیسے یقین نہ آرہا ہو۔

"دیکھ لو اچھی طرح" جُھل نے تھکی آواز میں کہا "ہم
کو معلوم نہیں' اس کتے نے کتنا کم دیا۔ پورا نہیں تو ہم کو بولو'
چلے جائیں گے پھر اس کے پاس۔"

خانم ایک ایک کرکے سارے زیور صندوقچے سے
نکالنے لگی۔ وہ خاصا بڑا ذخیرہ تھا۔ سید محمود علی کے گھر تو ہم نے
سرسری طور سے دیکھا تھا۔ اس وقت تو حالت ہی دوسری
تھی۔ زیورات کے پہلو میں دبی ہوئی نوٹوں کی گڈی اور زمین'
مکان کے کاغذات' خانم نے ایک نگاہ ڈال کے فروزاں اور

STATIONARY AND LIBRARY
NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH-5556532
PROP: ALI KHAN

ن کے آگے رکھ دیے۔ جبل نے مختصراً انہیں نقدی اور
ات کے بارے میں بتایا اور کہنے لگا "ابھی تھوڑا ٹھہر کے
ں ادھری بھیج دیں گے۔ مکان، زمین کا سودا کرنے کو، یا
اتم بولو۔"

دونوں بہنوں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ان سے
ھ نہ کہا گیا۔ فروزاں نے دوپٹے سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔
من کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ خانم اور زریں نے
یں آنسوؤں میں چھپالیا۔ نصیر بابا کی آنکھیں بھی چھلکی ہوئی
یں۔ کبھی جبل کو دیکھتے تھے، کبھی مجھے اور فروزاں، یاسمن
و اور ہاتھ اٹھا کے شکر ادا کرتے تھے۔

جانے کیوں یہ منظر دیکھنے کی مجھے بہت آرزو تھی۔ زریں
ے علاوہ یہ بھی ایک وجہ تھی جو میں فیض آباد آنا چاہتا تھا۔
آدمی کبھی کبھی اپنی مرادوں، امیدوں سے خود آگاہ نہیں ہوتا،
وہ بر آتی ہیں تب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی تو نہاں خانے میں
کہیں جاگزیں تھا۔

سب کچھ اتنا وافر تھا کہ فروزاں اور یاسمن آسودگی
سے زندگی بسر کر سکتی تھیں مگر جبل کے بہ قول یہ مال و زر ان
کے ماں باپ کا بدل نہیں تھا۔ جبل نے ان سے کہا کہ ہمیں
ان تک پہنچنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ ساری زندگی کی دیر
سویر ہوتی رہتی ہے۔ وقت پہ پہنچ جانے کا موقع تو آدمی کو کم کم
ہی ملتا ہے۔ دونوں بہنوں سے ضبط نہ ہو سکا۔ کہتے ہیں
آنسوؤں میں بڑا زہر ہوتا ہے، جتنا نکل جائے، اتنا ہی اچھا
ہے۔ ابھی دونوں کی عمر ہی کیا تھی۔ شاید آنسوؤں پہ
قابو پانا پختگی ہی ہے۔ وہ بچوں کی طرح بلک کے بلکنے لگیں۔
زریں اور خانم نے انہیں اپنا جزو بنائے رکھا تھا۔ ایک کے
آنسو دوسرے کے لیے کچھ کم عذاب نہیں ہوتے۔ وہ
فروزاں اور یاسمن کو سنبھال رہی تھیں اور خود انہیں اپنا
یارا نہیں تھا۔ پھر نصیر بابا اپنی جگہ سے اٹھ کے فروزاں اور
یاسمن کے سامنے بیٹھ گئے اور طرح طرح سے ان کی دل جوئی
کرتے رہے حالانکہ ان کی آواز بھی چھلک رہی تھی۔ کہنے
لگے "گزرا ہوا بھول جانے ہی میں بہتری ہے۔ سمجھو اس کی
منشا یہی تھی اور اس کا کوئی کام مصلحت کے بغیر نہیں ہوتا۔
انہیں اب شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایک قیامت ان کے سر
سے گزر گئی۔ اب آگے اللہ نے چاہا تو سارے دکھوں کا مداوا
ہو جائے گا۔ وہ بہت مہربان لوگوں میں آ گئی ہیں۔ ایسے لوگ
قسمت والوں ہی کو ملتے ہیں۔ زندگی کا حاصل یہی ہے کہ کتنے
اچھے لوگوں کی رفاقت نصیب ہے۔"

نصیر بابا کی باتوں میں بڑی دردمندی اور دل نشینی تھی۔
سچ کا اپنا اثر ہوتا ہے۔ پھر جبل نے ظفر کا ذکر چھیڑ کے جیسے
چراغ روشن کر دیے۔ دونوں کے ہاں ظفر کے نام سے تموج
سا نمودار ہوا۔ جبل نے انہیں مژدہ سنایا کہ جلد ہی ظفر بھی
یہاں آجائے گا اور کوشش یہی ہو گی کہ ان کا اپنا ایک گھر
ہو جائے۔ یہ بھی انہی کا گھر ہے اور ان کی مرضی پہ ہے، وہ
یہاں رہیں یا اپنے گھر، اس شہر میں یا کسی اور جگہ۔ ہم ان
سے کہیں بھی دور نہیں رہیں گے۔ جب بھی ہماری ضرورت
پڑے، وہ اپنا حق سمجھ کے ہمیں بلا سکتی ہیں۔ وہی حق جو انہیں
اپنی ماں اور اپنے باپ کی طرف سے حاصل تھا۔

میرا بھی جی چاہتا تھا، میں بھی ان سے کچھ کہوں۔ میرے
دل میں بھی بہت سی باتیں مچل رہی تھیں۔ میں کہنا چاہتا تھا
کہ وہ خود کو کبھی تنہا، بے یار و مددگار نہ سمجھیں۔ ظفر کو وہ
اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں نے بھی اس کے بارے میں سب
کچھ اچھا ہی سنا ہے۔ یقیناً وہ ان کے لیے بڑا سہارا ہو گا۔
اب آگے اسی کا کام ہے لیکن کسی مرحلے پر وہ ان کے اعتبار پر
پورا نہ اترے تو وہ دل برداشتہ نہ ہوں، خاطر جمع رکھیں اور
صرف ظفر ہی نہیں، نصیر بابا، جبل اور زریں اور خانم ہی
نہیں، ایک میں بھی ہوں۔ اور ان میں کوئی بھی نہ ہو تو میں تو
ہوں اور میں اکیلا بھی بہت ہوں، اور بہت سے میری مراد ہے
کہ میرے سینے میں ان کے لیے بے پناہ احساس موجزن ہے،
شاید سب سے زیادہ، اور یہ محض ہم دردی ہے تو ہم دردی
کوئی کم تر درجے کا جذبہ نہیں ہوتی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا۔ زریں اور خانم انہیں وہاں سے
اٹھا لے گئیں۔

○☆○

دوسرے دن صبح میرے بیدار ہونے سے پہلے ناشتا
کر کے جبل اڈے چلا گیا تھا۔ وہ رات گئے واپس آیا اور کچھ
دیر بیٹھک میں نشست کے بعد اپنے کمرے میں روپوش
ہو گیا۔ وہ الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ اگلے دن صبح بھی یہی ہوا۔
وہ سویرے سویرے نکل گیا۔ اس روز میرا بھی اڈے پر جانے
کا ارادہ تھا لیکن جہانگیر نے گزشتہ کل کی طرح بساط
بچھا دی۔ جہانگیر نے گزشتہ کل کی طرح بساط بچھا دی۔ میں نے
عرصے بعد شطرنج کو ہاتھ لگایا تھا۔ گیا میں اسکول کے دنوں میں
شطرنج خوب کھیلی تھی۔ اب تو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ جہانگیر
کے ساتھ چند بازیاں کھیلنے کے بعد خانے اور مہرے سمجھ میں
آنے لگے۔ کیرم، پچیسی، گنجفہ اور کئی طرح کے دروں خانہ
کھیل ان کے روز مرہ میں شامل تھے۔ عمارت کے عقب میں
واقع باغ کے ایک حصے میں فرش پختہ کر کے بیڈمنٹن کا اہتمام

بھی کیا گیا تھا۔ زریں نے اوپر کی منزل میں درمیانہ درجے کا
ایک کمرا کتب خانے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہاں کتابوں
اور رسالوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ نیساں نے مجھے بتایا تھا کہ
ہر ماہ اس ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ زریں کی دیکھا
دیکھی سبھی کو مطالعے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ کتابوں کی حفاظت
کے لیے بہ طور خاص شیشے کی الماریاں بنوائی گئی تھیں اور
ہوا، روشنی اور خاموشی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ فروزاں
اور یاسمن کا تو پھر یہاں بہت جی لگنا چاہیے۔ کتابوں اور
رسالوں سے ان کا تعلق تو موروثی تھا۔ گیا میں انگریزی کا
بوڑھا پروفیسر کہتا تھا، کثرت مطالعہ سے بہتر، منتخب مطالعہ
ہے۔ کثرت مطالعہ کو کثرت حافظہ بھی چاہیے اور وہ کہتا
تھا، ادب ضرور پڑھنا چاہیے، ادب آدمی کو مہذب کرتا ہے۔
تمہارا موضوع کوئی سا ہو، منطق ہو یا ریاضی، طبیعات ہو یا
ارضیات۔ ایک دو فی صد ادب یا لٹریچر کی گنجائش رکھنی
چاہیے۔ مجھے یاد ہے، میں نے پوچھا تھا "اور کھیل؟" اس
نے جواب دیا تھا، وہی کھیل کھیلنے چاہئیں جن میں دونوں فریق
جیت سکیں، کسی کی ہار نہ ہو۔ کھیلوں میں فریق مخالف کی ہار پہ
اظہار مسرت ایک غیر اخلاقی رویہ ہے۔ کہتا تھا، مغربی ملکوں
میں باکسنگ بہت مقبول ہے۔ کھیل میں دو مخالف ایک
دوسرے پر مکے برساتے رہتے ہیں اور لہولہان ہو جاتے ہیں،
جو جتنی ضربیں لگائے اور جو جتنی ضربیں کھائے۔ دیکھنے
والے اس تماشے پر خوب اچھلتے کودتے ہیں۔ یہ کیسی اذیت
پسندی ہے۔ وہ ورزش اور بہادری کے کارناموں کا حامی تھا۔

جہانگیر مجھ سے جیت رہا تھا اور اسے ایک ندامت آمیز
سرخوشی بھی تھی۔ شطرنج بھی عجب نشہ ہے۔ اردگرد سے آدمی
بے گانہ ہو جاتا ہے۔ نصیب میاں کہتے تھے، آدمی کسی کام کا
نہیں رہ جاتا۔ گھر بیٹھے وافر آمدنی کی صورت ہو تو اس سے
اچھا مشغلہ بھی کوئی نہیں۔ آدمی ساری زندگی شطرنج کی
رفاقت میں گزار سکتا ہے۔ ایک زمانے میں نصیب میاں کو
شطرنج کا عارضہ تھا، ایک دن اچانک چھوڑ دی۔ میں نے پوچھا
"کیوں؟" کہنے لگے "میاں! اسری خواب میں بساط بچھتی تھی،
مہرے گردش کرتے رہتے تھے۔" عادتیں بھی جزو بدن
ہو جاتی ہیں اور غالباً ضد ہی ان کا ایک علاج ہے۔ میں نے
شطرنج میں اپنی دلچسپی کا اظہار کچھ جہانگیر کی خاطر کیا، کچھ میں
خود کو حویلی میں قیام کے دوران میں اپنے آپ سے دور رکھنا
چاہتا تھا۔ میں شاید کوئی تجربہ کر رہا تھا۔ یوں بھی میزبان،
مہمانوں کی خوشنودی کا لحاظ رکھتے ہیں تو مہمانوں پر بھی اپنے
میزبانوں کی دل جوئی لازم ہے۔ میزبانی کے بھی آداب ہوتے
ہیں، مہمان نوازی کی طرح اسے میزبان نوازی کہنا چاہیے۔
تنویر بھی میرے اور جہانگیر کے درمیان بازی میں شریک ہو گیا
تھا اور جہانگیر کی التجاؤں کے باوجود مجھے مشورے دینے سے
باز نہیں آیا۔ کچھ دیر میں خانم بھی ہمارے پاس آ کے بیٹھ گئی
اور جہانگیر نے بتایا کہ خانم سے کسی کا جیت جانا بہت مشکل
ہے، انہوں نے زہرہ اور زریں کو بھی ماہر کر دیا ہے۔ خانم کو
دیکھ کے جہانگیر بساط کے آگے سے ہٹ گیا۔ اس کی
ادھوری بازی خانم نے جاری رکھی اور وہ مجھے مسلسل مات
دیتی رہی۔

سونے، کھانے اور کھیلنے میں دو دن ایسے ہی گزر گئے۔
وقت کا کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ جبل پھر رات کو واپس
آیا۔ رات کو اس کے چہرے کا غبار مجھے کھٹکنے لگا۔ یہ تھکن
نہیں تھی۔ اڈے پر بھی وہ آرام ہی کرتا رہا ہو گا۔ وہاں کون
سے ہل بیل جوتے ہوں گے۔ پھر کیا ہے؟ وہ اڈے پر اتنی دیر
کیوں بیٹھا رہا ہے؟ وہ تو اب اڈوں پاڑوں سے دور دور رہتا
ہے۔ اسے زریں کا خیال بھی نہیں ہے۔ یہاں آ کے تو وہ
یہیں کا ہو جاتا ہے۔ زریں کچھ دیر کے لیے اوجھل ہو جاتی
ہے تو اسے بے کلی ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے تو وہ فیض آباد
آنے سے کتراتا رہا تھا کہ پھر یہاں سے جلد نکلنا ممکن نہ ہو سکے
گا۔ زریں مزاحم ہو جائے گی۔ زریں کے سامنے تو وہ بہت
ناتواں ہو جاتا ہے۔ اس سے کچھ پوچھنے کے بجائے میں نے
طے کیا کہ کل اڈے جا کے خود دیکھوں گا، ایسی کیا بات ہے۔
ممکن ہے، مجھے یوں ہی وہم ہو رہا ہو۔ جامو اور جمرو کے چلے
جانے کے بعد ظاہر ہے، اڈے کی پہلے جیسی حالت نہیں رہنی
چاہیے۔ اڈا تو مضبوط استادی سے ٹھیک طرح چلتا ہے۔ کوئی
کتنا ہی زور آور، چاقو کا دھنی ہو، اڈے کے نگراں کو دوسری
خوبیوں سے بھی متصف ہونا چاہیے۔ اڈے کا تعلق جامو اور
جمرو سے تھا۔ جبل نے ضرور کوئی ایسی بات دیکھی ہو گی جو
اسے صبح سے رات تک وہاں بیٹھنے کی ضرورت پیش آ گئی
ہے۔

تیسرے دن، میں جلدی اٹھ گیا تھا یا اسے دیر ہو گئی
تھی۔ وہ اڈے جانے کے لیے تیار ہوا تو میں نے بھی اس کے
ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔

"نہیں رے" اس نے صاف منع کر دیا بلکہ دھتکار دیا
"تو ادھری رہ، دو میں ایک کو ادھری ہونا چاہیے۔"

"مگر تمہیں روز اتنی پابندی سے وہاں جانے کی ضرورت
کیوں پڑ گئی ہے؟"

"ہے رے۔"

"کیوں؟ ایسی کیا بات ہے؟"

"اڈے کو تھوڑا دیکھنا ہے۔"

"کیا دیکھنا ہے؟ اڈے پر بیٹھنے یہاں آئے ہو؟"

"دو ایک دن میں کیا ہو جائے گا۔"

"بس رے!" اس کی تیوری چڑھ گئی' اس نے پنچھ اور
ے سننے کا موقع نہیں دیا' دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں
ں کے ساتھ جا سکتا تھا لیکن اس حجت سے اس کی ناگواری
امکان تھا۔ میں چپ ہو گیا۔ میری خاموشی میرا شکوہ تھی۔
ے بھی اس کا احساس ہونا چاہیے۔ اس نے پلٹ کے
ری طرف دیکھا ہی نہیں' وہ چلا گیا اور سارے دن کے لیے
ے اجیرن کر گیا۔

دن بھر میرے سر میں ریت اڑتی رہی۔ اس دن شام
حویلی میں اڈے کے لوگوں کی آمد ہوئی اور دوسرے دن سے
بھٹل نے اڈے پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس تواتر اور اتنے
اتنے وقت کے لیے اڈے پر اس کی حاضری کسی علت کے بغیر
غیر ضروری سمجھی گئی ہے یا دانستہ مجھے الگ رکھا جا رہا ہے۔
باربار ایک ہی خدشہ مجھے ڈنک مارتا تھا کہ بھٹل کی اس
تندہی اور سرگرمی کا سبب لکشمی داس اور اس کی بیٹی پر کھا تو
نہیں ہے۔ ہریا اور لکشمی داس نے ٹھاکر ہردیو کے زور و اثر
کے بارے میں جو کچھ مجھے ذہن نشین کرایا تھا وہ مجھے اچھی
طرح یاد تھا۔ اس روز ہریا اور گورا کے درمیان معرکہ آرائی
کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن وہ فیصلہ قصہ تمام ہو جانے کی ضمانت
نہیں تھا۔

شام کو ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ بھٹل آ گیا'
مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا' اس کے ساتھ جامو تھا۔
جامو نے مجھے دیکھتے ہی لپک کے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ سینے کی
زبان سینہ خوب سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں' ایسا جذب تھا جو
کسی بہت ہی محبوب اور مطلوب شخص کے لیے ہو سکتا ہے۔
دیر تک وہ مجھے پیوست کیے رہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے
الگ ہوئے تو میں نے حیرت سے پوچھا "جامو بھائی! تم کیسے
یہاں؟"

"بس آ گئے بھیا!" وہ فور مسرت سے بولا۔

"کمال ہے!" میں نے بشاشتی آواز میں کہا۔ "اتفاق
ہے یا تمہیں معلوم..."

"بس آ گئے استاد' وہ جو بولتے ہیں' بلی کا پھرکنا' کیا
بولتے ہیں اس کو" وہ ہنستے ہوئے بولا "جی تم کو دیکھنے کو جی
بہت کرتا تھا۔"

میں نے تحمل کیا۔ جامو اپنی اچانک آمد کے بارے میں
سچ کے اظہار سے گریز کر رہا تھا۔ ہمیں یہاں سے جلد ہی بنگال
کی طرف جانا تھا۔ دو ایک شہروں کے بعد کلکتے پہنچ ہی جاتا
تھا۔ جامو کے ساتھ جمرو اور زورا بھی نہیں تھے۔ بلاتا تھا تو
بھٹل کو پہلے انہیں بلانا چاہیے تھا۔ "سب خیریت تو ہے
جامو بھائی؟" میری آواز کا تردد اس جہاں دیدہ سے اوجھل
نہیں رہا ہوگا۔

"ہاں بھیا' کشل منگل' سب ٹھیک' ایک دم۔"

بھٹل اسے چوکی پر لے گیا۔ زریں بھی بھاگی بھاگی
آ گئی۔ جامو نے جلدی سے اٹھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔
زریں بھی اس کی غیر متوقع آمد پر پلکیں جھپکا رہی تھی۔ میری
طرح اس نے بھی تعجب سے پوچھا۔ جواب میں جامو
مسکرانے لگا اور اس نے وہی جواب دیا "بس آ گئے بھنو!"

"بہت اچھا ہوا' آپ کو دن بھی کتنے ہو گئے۔ میں نے تو
خط میں بھی لکھا تھا' جامو بھیا! ہمیں بھول گئے کیا۔ جمرو بھائی
کے ہاتھ خط بھیجا تھا" زریں چہکتی آواز میں بولی۔

"خط مل گیا تھا' خط بھی اور تمہارا انگاجر کا حلوہ بھی۔ جی
کرتا تھا' اسی دم چل پڑوں پر کوئی نہ کوئی..." جامو مچل کے
بولا "حلوہ سبھی نے کھایا۔ سب انگلی چاٹتے تھے۔ ہم نے بولا'
یہ میری بہنا نے اپنے ہاتھ سے بنا کے بھیجا ہے۔"

"وہ تھا ہی کتنا" زریں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"کم چیز زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

"پھر تو اس کا کم ہونا اچھا ہوا۔"

"نہیں' نہیں" جامو نے گھبرا کے تردید کی "ایسی بات
نہیں بہنا! ادھر تو کتنا ہی زیادہ بھیجتیں' چٹ ہو جاتا۔"

"اور' اور جمرو بھائی آپ کے ساتھ نہیں آئے؟"

زریں نے موضوع بدل کے جامو کو عافیت دلائی۔

"ادھر ان کا تھوڑا کام تھا" جامو صاف بہانے بازی
کر رہا تھا۔ جمرو اور زورا سے تو ہمارے فیض آباد پہنچ جانے کی
خبر سن کے رہا نہیں جا رہا ہوگا۔ جامو نے بھی انہیں مشکل
سے روکا ہوگا اور یہ ہدایت بھٹل ہی کی ہو سکتی ہے۔

اتنی دیر میں جہاں گیر' نیساں' تنویر اور ارشد آ گئے۔
جامو سے ان کا خاص ربط ضبط معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس گھر کا
کوئی فرد لگ رہا تھا' بالکل ایک مختلف آدمی' جیسے اڈے سے
اس کا واسطہ ہی نہ ہو۔ کسی کو بھی شاید معلوم نہیں تھا کہ
جامو' اڈے کا کیسا پختہ کار آدمی ہے' چاقو اس کے اشاروں کا
تابع رہتا ہے' زور آور ڈوبلا کا ماہر ہے۔ بڑے بڑے استاد
اس سے پہلو بچاتے ہیں۔ اس کے اڈے سے وابستہ آدمی تو
اس کے سامنے سر نہیں اٹھاتے' سوچ سمجھ کے زبان کھولتے

ہیں۔

تھوڑی دیر میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ جامو نے وہیں
کھانا کھایا اور اڈے واپس نہیں گیا۔ اس سے خلوت میں
بات کرنے اور سن گن لینے کا موقع میں تلاش کرتا رہا۔ رات
گئے بھٹل نے اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

میں نے تقریباً ساری رات جاگ کے گزاری۔ جامو کی
آمد نے مجھے اور بدگمان اور ویران کر دیا تھا بلکہ ہراساں۔ یہ
مبہم اندیشے تو اور ستم کرتے ہیں۔ صبح میں جلدی اٹھ گیا اور
یہ جان کے مجھے اور حیرانی ہوئی کہ جامو علی الصباح حویلی سے
چلا گیا ہے۔ بھٹل بھی نکل جاتا۔ وہ تو میں نے اسے دروازے
پر روک لیا اور جامو کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بے
نیازی سے بتایا کہ جامو کو کسی کام سے کہیں جانا تھا۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے" میں نے جھجکتے ہوئے
کہا۔

اس نے آنکھیں میچ لیں اور بڑبڑاتے ہونٹوں سے
جانے کیا کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

"میں کچھ جاننا چاہتا ہوں" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"کیا رے؟" وہ ٹھٹک کے بولا۔

"جو تم بتا نہیں رہے' بتانا نہیں چاہتے۔"

"کیا بتا نہیں رہے؟"

مجھے یہ استفتا گراں گزرا' میں نے جھلا کے کہا "میں
کوئی پاگل آدمی نہیں ہوں۔"

"پورا نہیں تو آدھا تو ہے۔"

میرا سر گھومنے لگا "وہاں میں نے کیا غلط کیا تھا؟"

"کدھری رے؟"

"وہی' ہریا اور گورا کے بیچ میں پڑ کے۔ گورا اس پہ زور
ڈال رہا تھا۔ میں نے تو..."

اس نے میری بات پوری نہیں ہونے نہیں دی "تنی
بات کر۔"

"پھر بھی کیا ہے؟ میں تو جاننا چاہتا ہوں۔"

"تیرے الجھنے کو نہیں ہے۔"

"لیکن یہ' یہ اندھیرا تو مجھے اور الجھاتا ہے۔"

"کوئی اندھیارا نہیں۔" وہ سرسری انداز میں بولا "تو
ابھی آرام کر۔" اس نے فیصلہ سنایا اور دروازے سے نکل
گیا۔ میں وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

ناشتے کے بعد کمرے میں آ کے میں نے دروازہ بند
کر لیا۔ ممکن ہوتا تو میں کمرے کے باہر پہرے دار بٹھا دیتا یا
سنے ہوٹلوں کی طرح تختی آویزاں کر دیتا کہ کوئی دستک نہ
دے۔ میں اب آرام ہی کرنا چاہتا تھا۔ شاید بھٹل کا مشورہ
صائب تھا کہ مجھے ہر طرف سے بے نیاز ہو کے آرام کرنا
چاہیے۔ ہو سکتا ہے' وہ سب کچھ اتنا نہ ہو جتنا مجھے نظر آ رہا
ہے۔ میں تو یوں بھی اس کے بہ قول آدھا دیوانہ ہوں۔ میری
نگاہ یا تو کم دیکھتی ہے یا بہت زیادہ۔ مجھے تسلیم کر لینا چاہیے کہ
میں ایک ادھورا آدمی ہوں۔ دنیا میں ایک مکمل آدمی کے
لیے جو معیار مستند قرار دیے گئے ہیں' میں ان پر کس قدر پورا
اترتا ہوں۔ ایک بے توازن شخص کو انہیں دور ہی رکھنا
چاہیے۔

کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا لیکن آدمی کتنا ہی
تنہا ہو' وہ اپنے ساتھ بھی تو ہوتا ہے۔ کوئی آدمی شاید ایک
آدمی نہیں ہوتا' کبھی وہ دو ہوتا ہے' کبھی اس سے زیادہ۔ کبھی
ایک حاوی آ جاتا ہے' کبھی دوسرا' تیسرا' اور کبھی بہت سے
ایک پر غالب آ جاتے ہیں۔ یہ جو آدمی ایک نظر آتا ہے' یہ
ایک نہیں ہوتا' جانے کتنے آدمی ایک آدمی میں شامل ہوتے
ہیں۔ اسے خود نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا کون سا آدمی کس
وقت کیا رنگ اختیار کر سکتا ہے۔ یک وقت اسے طرح طرح
کی ترغیبیں ملتی رہتی ہیں۔ کبھی پہلا آدمی اپنے دوسرے آدمی
کے سامنے بہت بے بس ہو جاتا ہے' کبھی دوسرا پہلے کے
سامنے۔ ایک آدمی' ایک آدمی ہوا کرے تو پھر ایک ہی آدمی
کا ارادہ ہوا کرے۔ یہ جو ایک آدمی میں بہت سے آدمی نہاں
ہوتے ہیں' یہی اسے منتشر کرتے رہتے ہیں۔ بہت کم' یہ کہیں
متفق ہوتے ہیں۔ صرف ایک آدمی ہوا کرے تو فکر و خیال کی
ایسی یورش نہ ہو اور زندگی کیسی آسان ہو جائے۔ میں اپنے
آپ پر غلبہ و تسلط حاصل کرنے اور یکسو ہو جانے کے جتن
کرتا رہا' سکون بھی جبری ہو تو کیا عجیب ہوتا ہے۔ میں نے
نرمی اور متانت سے خود کو باور کرانے کی کوشش کی کہ بدگمانی
سے اجتناب میں میرے لیے بہتری ہے اور بھٹل کی نسبت تو
کسی بدگمانی کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے دور رکھنے یا
الگ رکھنے میں ضرور میری آسودگی کا کوئی پہلو مضمر ہے۔ دو
ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو کوئی ایسا واقعہ ہی نہیں جو مجھے قریب
رکھنے' مجھے زحمت دینے کی ضرورت پیش آئے یا کوئی بڑا واقعہ
درپیش ہے جس میں میرے زیاں کا احتمال ہے یا پھر میری
شرکت میں میری جانب سے کسی کوتاہی یا کوتاہ بینی کا کوئی شبہ
بھٹل کو لاحق ہے کہ یہی ہوتا رہا ہے۔ میرا ضرر اسے گوارا
نہیں یا یوں ہے کہ میری شرکت میرے ہی خواہوں اور
دردمندوں کے لیے کسی ضرر کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ دونوں
صورتوں میں میرے پاس کیا چارہ ہے؟ میں خاموش بیٹھا

سورج طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھتا رہوں۔ بھسل کے خیال سے گوشہ گیری ہی میں میرے لیے عافیت ہے۔ اس کی خواہش کا احترام بہرحال مجھ پر واجب ہے۔ یہ تو عین سعادت ہے۔

بے شک کچھ دیر کے لیے میں خود کو یک جا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن کسی کج فہم' شوریدہ نگاہ کو قرار کہاں سزاوار ہے پھر وہی حشرات میرے جسم سے چمٹ گئے اور میری نگاہیں دیواروں کے پار جھانکنے لگیں۔

فیض آباد کا اڈا ایک پرانا اور مضبوط اڈا ہے۔ یہاں جامو اور جمرو کے تربیت یافتہ آدمی موجود ہیں مگر تبت سے ہماری واپسی کے بعد جامو کلکتے میں بھسل کی مسند کا نگراں ہے' جمرو عرصے سے ہمارے ساتھ کوچہ گردی کر رہا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی عدم موجودگی کے باعث اڈے کے نظم وضبط میں شکستگی لازم ہے۔ بھسل نے جامو کو فیض آباد طلب کرلیا ہے لیکن جامو کی ضرورت اسے اڈے کی استواری کے لیے نہیں پڑی ہوگی۔ جامو کو اس لیے طلب کیا جانا چاہیے کہ وہ اس علاقے کے گوشے گوشے سے آشنا ہے۔ وہ ٹھاکر ہردیو سے بھی واقف ہوگا۔ اڈا چاہے استاد جامو یا استاد جمرو کی تحویل میں ہو یا ان جیسے کسی بے بدل استاد کے قبضے میں' ٹھاکر ہردیو کے جاہ و حشم کے آگے بہت بے حیثیت اور کم حیثیت ہے۔ ٹھاکر کے پروردہ اور فرستادہ نوجوان استاد گورا کے راستے میں رخنہ اندازی کا شاخسانہ کسی طور ظاہر ہو سکتا ہے۔ اب تک مجھ سے بھی ٹھاکر اچھی طرح متعارف ہو چکا ہوگا۔ میرے مسکن' زریں کی حویلی کا محل وقوع بھی اسے اچھی طرح نقش کرا دیا گیا ہوگا۔ میں اور بھسل آج نہیں تو کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ کل پھر یہ حویلی معمول کے مطابق اڈے کے لوگوں کی نگرانی میں ہوگی۔ وہ تمام بڑے جاں باز' ایثار پیشہ لوگ ہیں۔ ایک' دس کے مساوی ہے۔ ہتھیار ساتھ ہو تو بے شمار بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں تاہم وہ ٹھاکر کے لاؤ لشکر کے آگے کتنی دیر دیوار بنے رہیں گے۔ لاؤ لشکر کے اعتماد میں قہر و غضب بھی شدید ہوتا ہے۔ شہر میں اپنی حویلی کے فسانے بھی کم نہیں ہوں گے۔ چھوٹے شہروں کے لوگوں کے کان بڑے ہوتے ہیں۔ چھوٹے شہروں میں گھروں کی دیواریں کتنی ہی اونچی ہوں' لوگوں کی نگاہیں بڑی کاری ہوتی ہیں۔ لوگوں کی نگاہیں روزن تراش لیتی ہیں۔ چھوٹے شہروں کا پسندیدہ مشغلہ ایک دوسرے سے باخبر رہنا ہے۔ زریں کی حویلی سے تو ایک داستان منسوب ہے۔ بہت سوں کو آگہی ہوگی کہ حویلی کی واگزاری کس طرح ممکن ہوئی تھی' پشت پر کون سو رہا تھا کون کون یہاں اقامت گزیں ہے اور کن لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے' وغیرہ۔

انہی عواقب پر مشورت کے لیے بھسل نے جامو کو طلب کیا ہوگا۔ یقیناً لکشمی داس نے بھسل کے روبرو حاضر ہو کے بڑی دہائیاں دی تھیں' اس کی نوجوان لڑکی پرکھا انودھیا میں تیرتھ کے دوران ٹھاکر کے شکنجے میں پھنس آ گئی تھی کہ بال بال بچ گئی۔ دوسری بار بھی نرغے میں آجانے کے باوجود اڈے کے آدمیوں نے اسے بچا لیا تھا۔ ادھر میں نے ٹھاکر کے حاشیہ نشین گورا کو خستہ حالت میں واپس بھیج دیا ہے۔ علاقے میں ٹھاکر کی حرص و ہوس' سینہ زوری و کینہ توزی کی کہانیاں زباں زد ہیں۔ صاحبانِ زر چھوٹے بڑے بادشاہ ہوتے ہیں اور بادشاہ تو بادشاہ ہی ہوتا ہے' سرکاران کی' عمال ان کے۔ زر سب سے بڑا زور ہے۔ جس کے پاس جتنا' اتنا ہی وہ برانا۔ دولت آدمی کو آدمی کا غلام بنا دیتی ہے۔ ٹھاکر کے ولی عہد کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے' وہ اس کا عادی نہیں ہے۔ یہ مزاحمتیں تو ایک کج کلاہ کی توہین کے مترادف ہیں۔ کہتے ہیں' زردار کا کینہ بڑا ہلاکت خیز ہوتا ہے۔ دولت مندوں کو انکار سے چڑ ہوتی ہے۔ دولت سے مراد اقرار ہے' اقرار کا اختیار ہے۔

سو کلکتے سے استاد جامو کی آمد کا مقصد محض لکشمی داس کی بیٹی پرکھا کو ٹھاکر کی آتش نفس سے محفوظ کرنا ہی نہ ہوگا۔ بھسل کو یہ آنچ اپنے قریب بھی محسوس ہو رہی ہوگی۔ گورا اور پرکھا کے معاملے میں میری مداخلت سے پہلے ٹھاکر کو صرف لکشمی داس کا گھر معلوم تھا یا فیض آباد کا اڈا۔ اب ایک تیسرے راستے' حویلی کی طرف جانے والے راستے کی نشان دہی بھی ہو گئی ہے اور بھسل کے لیے یہ حویلی آج محل کا درجہ رکھتی ہے مگر کیا واقعی مجھے وہاں سے لوٹ آنا چاہیے تھا؟ بھسل نے اس نادانی کی بابت مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا تھا' شاید وہ بھی ایسی صورت حال میں یہی کچھ کرتا' میں نے کوئی غلطی بھی نہیں کی تھی۔ ہر پہلو پر غور کر کے قدم بڑھایا تھا۔ ٹھاکر کی منزلت و مرتبت کے تخمینے میں البتہ مجھ سے چوک ہو گئی تھی۔ بلکہ میں نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ آدمی اتنی سمتوں میں دیکھنے کی احتیاط کرے تو پھر بند کر ہی نہ سکے۔ پھر تو وہ ویرانوں میں نکل جائے' جنگلوں میں جا بسے۔

اپنے سر میں بھن بھناتے ہوئے مبہم و موہوم خدشوں کی صورت گری سے مجھے کچھ اطمینان ہوا اور اس تجزیہ یقین نے مجھے تقویت و استقامت عطا کی کہ دخل اندازی کا میرا فیصلہ ہر اعتبار سے صائب تھا۔ یہ فیض آباد کے اڈے

جامو اور جمرو سے متعلق اڈے کے بھرم' اس کی وقعت کا معاملہ تھا۔ مجھے کمرے کے خلوت سے بیزاری ہونے لگی۔ میں باہر آ گیا۔

چمک دار دھوپ بکھری ہوئی تھی مگر دھوپ میں تیزی نہیں تھی۔ ملازمائیں فرش' طاقوں اور محرابوں کی صفائی میں مصروف تھیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا' حویلی سے باہر جا کے دیکھوں۔ کئی دن مجھے گھر میں بند ہوئے ہو گئے تھے لیکن پھر میرے قدم زریں کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ زریں سے ابھی تک کوئی بات ہی نہیں ہو پائی تھی۔ ہر وقت مجھے کوئی نہ کوئی گھیرے رہتا تھا یا میں خود گھرا رہتا تھا۔ وہ بھی کبھی تنہا دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں اس کے کمرے کے قریب پہنچ چکا تھا کہ نیساں اچانک کسی طرف سے نکل آئی۔ وہ اب خاصی بڑی بڑی لگتی تھی۔ رنگ و روپ بھی خوب نکھر آیا تھا۔ یہ حیدر آباد کی وہ نٹ کھٹ نیساں تھی ہی نہیں جسے میں نے پہلی بار خانم کے بالا خانے پر دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس کا سراپا کھل اٹھا۔ وہ دوڑی دوڑی یار بھائی' یار بھائی کا ورد کرتی' چہکتی ہوئی میرے پاس چلی آئی اور میرے بازو سے چمٹ گئی اور زیر و زبر سانسوں سے پوچھنے لگی کہ میری طبیعت تو ٹھیک ہے۔

میں نے مسکرا کے کہا "کیوں' کیا میں بیمار لگتا ہوں؟"

"آپ صبح ناشتے کے دوران میں بہت خاموش خاموش نظر آ رہے تھے پھر اپنے کمرے میں جا کے آپ نے دروازہ بند کرلیا۔ ہم لوگوں نے کئی چکر لگائے۔ دروازہ بند دیکھ کے لوٹ آئے۔" وہ پٹر پٹر باتیں کرتی گئی۔

میں نے شرمندگی سے کہا "ہاں' کچھ سر بھاری تھا۔"

"اب کیسے ہیں آپ؟" وہ پریشانی سے بولی "درد تو نہیں ہے؟ لائیے' میں دبا دیتی ہوں۔ خانم تو مجھی سے مالش کراتی ہیں۔ کہتی ہیں' میری انگلیوں میں جادو ہے' اور زری آپا بھی۔ آزمائش شرط ہے۔" وہ کھلکھلانے لگی۔

"اچ.... اچھا۔" میں نے دیدے گھما کے کہا "دیکھیں گے پھر کسی دن تمہارا کرشمہ۔"

"کسی دن کیوں' آج اور ابھی کیوں نہیں۔" وہ وارفتگی سے بولی "ہاں یار بھائی!"

"ابھی تو بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے اسے بازو میں سمیٹ لیا "تم خوش تو ہو نیساں؟!"

"جی' جی ہاں۔" وہ چونک سی پڑی "کیوں' آپ نے یہ کیوں پوچھا؟"

"ایسے ہی بس' تم بتاؤ' کوئی ایسی ویسی بات ہو تو چپکے سے کان میں مجھے بتا دو۔"

"آپ کیا' کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ بے کل سی ہو گئی۔

"میرا مطلب ہے۔" میں نے جلدی سے صراحت کی "تمہیں کسی بات' کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔"

"زری آپا کے ہوتے ہوئے یہاں کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔"

وہ اب بڑوں جیسی باتیں کرنے لگی تھی۔ میں تو اسے یوں ہی چھیڑ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی شگفتگی و شادابی اس کی باطنی طمانیت کی غماز تھی۔ میرے لیے تو وہ کسی تخلیق کے مانند تھی جیسے میں نے اسے تراشا ہو۔ اسے شاداں دیکھ کے مجھے ایک سرشاری سی محسوس ہوتی تھی۔ اس سے بہتر خریداری کیا ہو سکتی ہے۔ کرشنا جی کی روح ان کے لیے ہوئے پیسوں کے صحیح تصرف سے بہت خوش ہوگی۔ ساٹھ ہزار روپے کی پیش کش پر نیساں کی خود ساختہ ماں شوکت آرا نے میری دماغی حالت پر شک کیا تھا' خاصی حیران ہوئی تھی کہ میں نے اتنی بڑی رقم کی بولی کیوں لگا دی۔ وہ تو شوکت آرا آگے نہیں بڑھی' میں تو نیساں کے لیے کرشنا جی کی بخشی ہوئی ساری دولت اس کے آگے رکھ دیتا۔

"آپ بتائیے یار بھائی!" نیساں مچل کے بولی "یہ آپ کا سفر کب ختم ہوگا؟"

مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جا سکا "دیکھو!" میں نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔ "کب ختم ہوتا ہے' کسی دن تو ختم ہونا ہی ہے۔"

وہ ایک ذہین اور حساس لڑکی تھی۔ اسے فوراً احساس ہو گیا کہ اس سوال کا جواب میرے لیے گراں باری کا سبب ہوگا "میں نے آپ کے لیے بہت دعائیں کی ہیں یار بھائی!" وہ والہانہ انداز میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔"

"اور مجھے یقین ہے' میری دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ ہاں' دیر سویر کی بات اور ہے۔"

"بس تم دعا کرتی رہو' کسی دن تو...." میری آواز گھٹنے لگی۔

"خانم آپا کہتی ہیں' آدمی کو نا امید نہیں ہونا چاہیے۔"

"امید ہی سے تو سلسلہ جاری ہے۔" میں نے پژمردگی سے کہا اور موضوع بدلنے کے لیے زریں کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا۔ اس کا دریا رواں ہو گیا۔ کہنے لگی کہ زریں کو تو وقت ملتا ہی نہیں۔ خالی بیٹھنا اسے آتا ہی نہیں۔ ہر ایک کی خیر خبر رکھنا' جہاں گیر' نیساں اور زہرہ کی چھوٹی بہن کی

...بی تعلیم میں مدد کرنا' انہیں ٹوکتے رہنا' تحفے تحائف تقسیم ...ے۔ حویلی میں آئے دن اکھاڑ پچھاڑ ایک معمول بن چکا ...ے' آج جو تبدیلی' کل وہ تبدیلی۔ بار بار نئے سازوسامان کی ...یداری۔ کمروں کی آرائش و زیبائش' نئے نئے کھانوں کا ...ریہ' باغ کی نگہداشت' دور دور سے طرح طرح کے پھولوں ...ے پودے منگوانا اور گلدستے بنانا' روزانہ تقریباً آدھ گھنٹے ...شطرنج کھیلنا' ورزش اور یوگا کی مشقیں' مہینے میں ایک بار ...یتیم خانے کے بچوں کے لیے کھانا بھیجنا' خط لکھنا' کبھی ابا جان ...کو بمبئی' کلکتے میں جامو کو۔ لائبریری پر اس کی خاص توجہ ...ہے۔ تازہ رسالے اور کتابیں آتی رہتی ہیں۔ بہت دنوں تک ...انگریزی کا ایک استاد' انگریزی کے استعداد بڑھانے کے لیے ...آتا رہا تھا۔ کسی اور شہر میں اس کا تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے ...یہ سلسلہ اب موقوف ہو گیا ہے۔ رات کو دیر تک مطالعہ کرتی ...رہتی ہے اور جب بھی فراغت ہو' خانم سے ستار بجانے کی ...فرمائش کرتی ہے اور ہاں۔" یہ تفصیل بتا کے نیساں چہکتی ...آواز میں بولی "اور ہاں' ایک اور وظیفہ' صبح و شام بابا ...(بٹھل) کو یاد کرنا' آپ کا ذکر کرنا اور اس بات پر کڑھتے رہنا ...کہ اتنے دنوں سے آپ لوگوں کا خط کیوں نہیں آیا۔ جب ...کہیں سے آپ کا خط آجاتا ہے' زری آپا کی خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔"

میں اضطراب آمیز اشتیاق سے سنتا رہا۔ اضطراب یہ تھا کہ کہیں نیساں کے منہ سے زریں کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے مگر زریں کا کلمہ پڑھتے ہوئے اس کی زبان رکتی' تھکتی ہی نہیں تھی۔ اتنا کچھ سن کے جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری خوبیاں گنوا رہی ہو۔ اپنے اوصاف سن کے آدمی کو جو مسرت ہوتی ہے' وہی حال میرا تھا۔ میں نے یہی جاننے کے لیے نیساں کو کریدا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ حویلی میں نہ منیر علی کا خاندان اپنے قدیم گھر سے بچھڑ جانے کے ملال سے آلودہ ہے نہ کوئی اور۔ خانم' نیساں' جہاں گیر اور حیدر آباد سے آئی ہوئی سلمیٰ یہ تمام و کمال اس گھر میں شامل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فروزاں اور یاسمن بھی اس گھر کا حصہ بن جائیں گی کیونکہ یہاں زریں ہے۔ سمندر کے مانند بے کراں۔

گزشتہ کئی دن سے وہ میرے سامنے تھے۔ ان کی آنکھیں چمکتی تھیں اور چہرے دمکتے تھے۔ ان کے اطوار' ان کی باتوں سے سکون جھلکتا تھا لیکن آدمی کے اتنے رنگ دیکھ لیے تھے کہ مشکل ہی سے دیکھے اور سنے ہوئے پر اعتبار آتا تھا' کوئی نہ خانہ آدمی جتنا گہرا نہیں ہوتا۔ ساتویں در میں بھی آدمی کے اسرار نہیں کھلتے۔ اپنی خوشی' دکھ' کینہ اور حسد چھپانے میں آدمی کو بڑی مہارت ہوتی ہے۔ نوٹنکی ہی میں لوگ بہروپ نہیں بھرتے' ہر شخص اس ہنر پر قادر ہوتا ہے۔ بس یہ ہے' عام آدمی کا معلوم نہیں ہوتا' نوٹنکی میں بہروپ عیاں رہتا ہے مگر اعتبار کی خوش گمانی کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔ بے شک ایک آدمی' ایک آدمی ہوتا ہے' دوسرا آدمی' دوسرا۔ دو آدمی دو آدمی ہیں۔ کوئی زود حس' زود رنج' کوئی سنگ دل اور کوئی باطن' کوئی راگ رنگ کا دیوانہ' کوئی سوز و گداز سے عاری۔ لوگ کہتے ہیں' کئی آدمی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو برتنوں کی طرح کھڑکتے ہیں۔ اختلاف و انحراف ان کا شیوہ بلکہ خاصہ ہے۔ اختلاف تو فرشتوں نے بھی کیا ہے' حویلی کے مکیں تو پھر بھی آدم زاد تھے۔ آدم زاد تو ابتدا ہی سے ایک دوسرے کے درپے آزار ہو گئے تھے۔ حویلی کے مکین ابھی تک' اتنے دن گزر جانے کے باوجود جتے ہوئے' جڑے ہوئے ہیں تو بسا غنیمت ہے' شاید اس لیے کہ یہ بڑے حادثوں اور سانحوں کے بعد یہاں تک پہنچے ہیں۔ منیر علی کو اپنا آبائی گھر خیرباد کہنا پڑا تھا۔ اگر ہم بروقت انہیں جیسلمیر سے یہاں نہ لے آتے تو جانے ان پر کیا قیامت گزرتی۔ گو اس عتاب و عذاب کا سبب بھی ہم ہی تھے۔ خانم بھی تہمت و دشنام کے ایک دور سے گزر کے یہاں آئی ہے۔ بالا خانے پر کوئی عورت' عورت نہیں رہتی' وہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔ وہ مورتی ہو جاتی ہے۔ خانم نے خود کو بہت محدود کر رکھا تھا لیکن تعلق تو اس کا بالا خانے ہی سے تھا۔ نیساں اتنی بڑی نہیں تھی پر ہوش مندی کی عمر میں اس نے بالا خانے کے دن دیکھے تھے۔ سوتے دنوں اور جاگتی راتوں کا وہ زمانہ' وہ دن اسے خوب یاد ہوں گے۔ وہیں ہوتی تو رقص و موسیقی کی تعلیم سے آراستہ ہو کے محفل میں بیٹھ چکی ہوتی اور اگر ہم سلمیٰ کو بے آسرا چھوڑ کے چلے آتے تو وہ کمینہ خصلت ارشد علی' سلمیٰ جیسی نرم و نازک' خوش و شاد اور پاک باز لڑکی کو کس رسوائی سے دوچار کر دیتا۔ اس نے سلمیٰ کو چور تو بنا ہی دیا تھا اور زریں کا بھی کچھ ماجرا تھا۔ وہ بھی اس فاحشہ نسترن کے پھندے میں پھنس چکی تھی۔ اسے بھی بالا خانے میں سجایا جاتا۔ وہ بھی طوائف بن گئی ہوتی۔ زریں تو یہ ذلت برداشت نہ کر پاتی۔ وہ چوڑیاں پیس کے پھانک لیتی حویلی کی زندگی سب کے لیے نئی زندگی تھی اور نئی زندگی انہیں اس لیے عزیز ہونی چاہیے تھی کہ بیتے وقت نے ان سے بہت مخاصمت اور عداوت کی تھی۔ وہ سارا عہد ان کے لیے کسی بدترین خواب کے مانند ہونا چاہیے۔ نئے وقت میں روشنی' نرمی اور کشادگی بے حساب تھی۔ یہ گھر اور گردو

سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں درد مشترک کی بنیاد پر رشتے استوار ہوئے تھے۔ بہ قول شاعر۔ "بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی" یہاں آدمی' آدمی کی پناہ تھا' آدمی' آدمی کا قدر داں اور زریں ان کے درمیان تھی۔ وہ ترک کی رمز سے آشنا تھی۔ ترک کیا ہے؟ ترک ایثار ہے اور شاید سب سے اعلیٰ انسانی وصف ہے۔ میں نے دیکھا تھا۔ وہ سب زریں ہی کو مختار سمجھتے ہیں اور زریں نے اپنا اختیار ان پر نثار کر دیا ہے' اور زریں کی مثال ان کے لیے درس کا درجہ رکھتی ہے۔ سب نے اسی طور میں امان سمجھی ہے۔ وہ سارے ایک دوسرے کو رعایت دیتے ہیں۔ ہر کوئی یہاں خود مختار ہے اور کوئی بھی اپنے اختیار کا داعی نہیں۔ انہیں دیکھ کے زندگی پر اعتبار آتا ہے۔ آدمی میں ایک خوبی اچھائی کی بھی تو ہوتی ہے۔

مجھے یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ حویلی کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ آدمی کی یادداشت خاصی کمزور ہوتی ہے۔ وہ پرانے وقت کے نقش محفوظ رکھیں گے تو نئے وقت کی روشنی' نرمی اور کشادگی کا احساس تازہ رہے گا۔ آدمی جلد بھول جاتا ہے کہ کیسے تنگ و تاریک راستوں سے گزر کے وہ کسی سایہ دار درخت تک پہنچ پایا ہے۔ عجیب بات ہے' سائے' خوشبو' روشنی اور گداز کے تسلسل اور یکسانی سے بھی وہ اکتا جاتا ہے۔ تنوع اور تلون بھی جبلتوں میں شامل ہے اور جبلت کا کوئی کیا کرے۔ کل کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ کل بھی یہی چلن رائج رہے گا مگر کسی کے پیر میں زنجیر نہیں پڑی تھی۔ بٹھل نے انہیں جتا دیا تھا کہ ہر شخص کا ارادہ اس کے پاس ہے۔ وہ کسی وقت' کسی بھی لمحے دوسرا راستہ منتخب کر سکتے ہیں۔ وہ تسلی رکھیں کہ کوئی دخل دے گا' نہ کوئی مزاحم ہو گا۔ نیساں مجھے بتا رہی تھی کہ یہاں سب ہی ایک دوسرے کے لیے مقدم و محترم ہیں اور سب ایک دوسرے کے حکم کے تابع۔ کوئی اس وقت تک کسی کو نہیں ٹوکتا جب تک وہ خود مشورے کا طالب نہ ہو۔ ان کی احتیاط خود ان کی جانب سے ہے' ان پر محتاط روی کا کوئی دباؤ نہیں۔

یہ میرا گھر' بٹھل کا گھر ہے اور یہ ان سب کا گھر ہے۔ یہ صرف زریں کا گھر نہیں ہے۔ ہم نے یہ گھر بچانے کے لیے کئی بار اپنے آپ کو داؤ پر لگایا تھا۔ سو حویلی پر بری نظر ڈالنے والے کو نہ بٹھل برداشت کر سکتا تھا نہ میں' نہ جامو اور جمرو اور فیض آباد کے اڈے کے بہت سے لوگ۔ اور زریں ایک جواں لڑکی ہم سب کی حاکم تھی اور خود اسے اپنی حکومت کا علم نہیں تھا۔ زریں کا کوئی زور تھا نہ جبر۔ اس کا جلال تو اس کے جمال میں تھا اور یہ جمال محض تراشے ہوئے لب و رخسار' شفق گوں رنگت اور سانچے میں ڈھلے ہوئے سراپا کا نہیں ہوتا' یہ تو ذکاوت' حلم' ایثار اور تپاک سے بھی عبارت ہے۔ کوئی پری زادہ' ماہ پیکر' بہت بے ذوق' کم نگاہ اور ستم شعار' کوئی بے تناسب اور کم رو نہایت نرم و شیریں خوش نظر و خوش اطوار ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے۔

زریں کی جستجو میں نیساں مجھے حویلی کے اس حصے میں لے آئی جہاں منیر علی کا خاندان مقیم تھا۔ حویلی کا ایک گوشہ ان کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ منیر علی کی بڑی بیٹی زہرہ ایک طرح فیض آباد آئی تھی اور میں اسے آپ سے مخاطب کر رہا تھا تو وہ ناراض ہو گئی تھی۔ زہرہ سے میری ایک نسبت خاص یوں تھی کہ اس نے جیسلمیر میں کورا کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئی تھیں۔ زہرہ نے کورا کے بارے میں مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ نرجس (کورا) کو تو جب دیکھو' اپنے آپ میں گم رہتی تھی' ذرا سی آہٹ سے چونک پڑتی' جیسے کسی کا انتظار ہو۔ وہ بہت کم کسی سے بات کرتی تھی' ہر وقت جیسے خواب دیکھتی رہتی ہو۔ صبح ناشتے پر زہرہ سے آمنا سامنا ہوا تھا لیکن اب اپنی طرف میرے آنے سے وہ بڑی بے تاب ہوئی اور خاطر میں لگ گئی۔ مجھے اناس کا رس پلایا' گلوری بنا کے لائی۔ وہاں اس کی چھوٹی بہن سلمیٰ کے علاوہ حیدر آباد سے آئی ہوئی سلمیٰ بھی تھی۔ سلمیٰ سے اب تک میری رسمی بات چیت ہی رہی تھی۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر جب ہم نے اسے زورا اور جمرو کے ساتھ زریں کی حویلی کے لیے وداع کیا تھا اور ہم آگے سفر کے لیے نکل گئے تھے' تب سے اب تک مہینے گزر گئے تھے۔ اس دوران میں زریں' خانم' زہرہ نیساں اور جہاں گیر نے اسے میرے اور بٹھل کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہو گا۔ زہرہ کہتی تھی' کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب ہمارا ذکر نہ ہوتا ہو۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے سلمیٰ کے ہاں بہت جوش اور شوق تھا۔ شناسائی کے بغیر یہ پذیرائی نہیں ہوتی۔ میری نظروں میں بار بار وہ سلمیٰ بھٹکنے لگتی جسے ہم نے پہلی بار ریل گاڑی میں دیکھا تھا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی اور بدباطن ارشد علی اسے ڈبے میں تنہا چھوڑ کے فرار ہو گیا تھا اور پولیس آ گئی تھی۔ پولیس کی توجہ سلمیٰ کی طرف سے ہٹانے کے لیے ہم نے سارا زور صرف کر دیا تھا پھر جب سلمیٰ نے زیورات اور جواہر سے بھری ہوئی پوٹلی بٹھل کے آگے رکھی تو ہم سب ہی حیران رہ گئے۔ بٹھل کے استفسار پر وہ پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ وہ سہمی ہوئی دبکی ہوئی سلمیٰ اب

بدلی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ رخساروں پر لالی پھوٹ
تھی۔ حسین تو وہ پہلے ہی کچھ کم نہیں تھی۔ اب تو بات
کچھ اور تھی۔ آدمی بھی سارے نہیں تو اکثر پھولوں اور
وں کے مانند ہوتے ہیں، موافق موسموں کے پابند۔ سلمیٰ
ایک عرصہ حیدر آباد کے ایک بڑے نواب کے ہاں گزارا
۔ محلات کی بود و باش سے وہ خوب واقف تھی۔ ایسی الالہ
سار لڑکی کو وہاں کی بیگمات نے زنان خانے ہی تک محدود
کھا ہوگا کیونکہ وہ انہی جیسی ہوگی۔ شہزادیاں کیا سونے کی بنی
ی ہوتی ہیں۔ سلمیٰ نے بتایا کہ وہ بڑی بیگم کی منظور نظر
ی۔ ایک عام خادمہ کی حیثیت سے محل میں داخل ہونے
ی سلمیٰ نے بہت جلد اپنی فرض شناسی، ذہانت اور سادہ
عاری سے سبھی کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ کسی کو کیا معلوم تھا
کہ وہ تو ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ ایک بڑے گھر سے اس کا
تعلق ہے لیکن سونگلی قسمت کیا کہیے۔ سلمیٰ کی آواز میں
شگفتگی اور شائستگی تھی، کھنک اور لچک۔ وہ ہر لمحے مستعد سی
نظر آتی تھی، کسی اشارے کی منتظر، کوئی خدمت بجالانے کے
لیے کربستہ۔

میں وہاں بیٹھا رہا۔ عرصے بعد اس طرح فراغت سے ان لوگوں کے درمیان بیٹھنے کا موقع ملا تھا، ان کی نظروں میں میرے لیے لطف ہی لطف تھا۔ وہ سب ہی میری قربت کے خوگر تھے اور میرے لیے دعا کرتے تھے اور میرا انتظار کرتے تھے۔ بمبئی میں فرخ، فریال، فارحہ، نکیتا، اس کی ماں جولین، اس کی ماں شہ پارہ اور چمپا بیگم کا بھی یہی حال تھا اور وہاں رہا! اس کا تو معاملہ ہی دگر ہے۔ اسے کون بھول سکتا ہے۔ وہ کسی اور دنیا کی لڑکی ہے۔ میں خود کہنے والا تھا کہ زہرہ نے جیسے میرے منہ کی بات چھین لی۔ ناز برداریاں انداز میں کہنے لگی "بابر بھائی! آپ ہمیں بمبئی کب لے جائیے گا؟" میں نے اس سے وعدہ کیا کہ بس جلد ہی۔ اب شاید زیادہ دیر نہ لگے۔ واقعی انہیں وہاں جانا چاہیے تھا یا فارحہ، فرخ، فریال، اور جولین وغیرہ کو یہاں آنا چاہیے تھا۔ دونوں ایک ہی گھر تھے اور گھر کے بیشتر افراد نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً منیر علی نے بمبئی سے آ کے ابا جان کی خریدی ہوئی کوٹھی کی کشادگی اور خوش نمائی کی جزئیات اور بمبئی شہر کی رونق، سمندر، سیر گاہوں، بلند و بالا عمارتوں اور روشنیوں کا حال احوال سنا کے انہیں اور بے تاب کیا ہوگا۔ پھر کانتے، ماری اور پیرو دادا کا ذکر آ گیا۔ زہرہ نے ان تینوں کو دیکھا تھا۔ ان کے ذکر پہ وہ خود بھی آزردہ ہوئی، مجھے بھی دل گیر کیا۔

وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ درمیان میں جہاں گیر اور تنویر بھی آ گئے تھے۔ زریں اور خانم اس طرف نہیں آئیں۔ ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ دونوں باورچی خانے میں مصروف ہیں۔ بٹھل کے لیے دوپہر کا کھانا بھیجنا ہے۔ اڈے پر کھانا بھیجنے سے مراد تھی کہ انہیں ایک چھوٹی موٹی برات کے لیے کھانا تیار کرنا ہے۔

○☆○

رات کو بٹھل ڈیڑھ بجے کے قریب واپس آیا۔ دونوں باتیں پریشان کن تھیں۔ ایک تو اتنی دیر سے اس کی آمد، دوسرے اس کے ساتھ جامو نہیں تھا۔ میں بیٹھک میں نیم دراز ان کا منتظر تھا۔ کچھ دیر اور ہو جاتی تو مجھے کسی اور کو اڈے بھیجنا پڑتا یا خود جانا پڑتا۔ میرے پوچھنے پر بٹھل یہ کہتا ہوا کہ جامو شہر سے باہر گیا ہوا ہے، اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں تیزی سے اٹھ کے لپکتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔

"کب تک کے لیے؟"

"بول نہیں سکتے، کب لوٹے گا، لوٹے گا بھی کہ نہیں۔"
وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے کبیدگی سے کہا۔

"اس کو کام ہے رے۔"

"کیسا کام؟"

"اس نے یا تو سنا نہیں یا ان سنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا لیکن میں نے خود کو روک لیا۔ مجھے اتنا ہی سمجھنا چاہیے تھا جتنا وہ بتانا چاہتا تھا یا جتنا میری فہم کے مطابق تھا یا میری صحت کے لیے بہتر۔

حسب معمول وہ صبح سویرے اڈے چلا گیا اور رات کو پھر تنہا آیا۔ وہ میرے سامنے آیا تھا۔ نہ میں نے کوئی سلسلہ جنبانی کی نہ اس نے مجھ سے کلام کرنے کی ضرورت سمجھی۔ اس وقت وہ جلد واپس آ گیا تھا۔ بیٹھک میں حقہ کاری کرتا رہا۔ گھر کے تقریباً سب ہی لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اس لیے کہ وہ گزشتہ کئی روز سے پورے پورے دن کے لیے اڈے چلا جاتا تھا۔ صبح ناشتے پر کچھ ہی دیر کے لیے اس سے ملاقات ہو پاتی تھی۔ نصیر بابا کو ارشد علی اپنے ساتھ زمینوں پر لے گیا تھا۔ نصیر بابا اطراف کے سبزہ زاروں کی خوب صورتی اور شکار کی کثرت کا ذکر کر کے بٹھل کو اکساتے رہے۔ رات گئے تک محفل جمی رہی۔ خنکی بڑھ گئی تھی لیکن سردی ایسی نہیں تھی۔ ہر محفل بہ قول نصیب میاں "[illegible]" کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔ خانم اور بڑی سلمیٰ فنجانوں میں قہوہ بھر کے سب کو پلاتی رہیں اور خشک میوے کی طشتریاں ادھر

ادھر گردش کرتی رہیں۔ بٹھل کے حقے کی خوشبو بیٹھک میں رچ گئی تھی۔

رات کا آخری پہر تھا۔ خاص دروازے پر بڑا کنڈا کھٹکھٹانے اور گھنٹا بجنے کی آواز پر میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ڈیوڑھی کے ایک گوشے میں دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی زنجیر کھینچنے پر اندر عمارت میں چھت سے ٹنگا ہوا مندروں کی طرح پیتل کا بڑا گھنٹا بجنے لگتا تھا۔ بہت ضروری موقعوں پر گھنٹے کی زنجیر کھینچنے کی اجازت تھی اور شاید پہلی بار یا بہت عرصے بعد یہ نوبت آئی تھی۔ میں ادھر سے باہر آنکلا، ادھر سے بٹھل۔ حویلی میں سب ہی جاگ گئے تھے۔ سب ہی کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ ملازمہ شکوران نے پہلے دروازے کے وسط میں لب چند انچی قطر کے سوراخ کی لکڑی کو کھسکا کے پوچھا "کون ہے؟"

جواب میں مما کی گھبرائی ہوئی آواز گونجی "ارے شکوران بی! بابا سے بولو! استاد سلامی آئے ہیں، ضروری کام ہے۔"

احتیاطاً میں نے کرتے کی جیب میں تمنچا اور چاقو رکھ لیا تھا اور میرا ہاتھ جیب ہی پر تھا۔ بٹھل نے حیران و پریشان کھڑے حویلی کے مکینوں کو اپنے اپنے کمروں میں واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جانا نہیں چاہتے تھے لیکن بٹھل کو دوبارہ ہاتھ اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی، وہ دور ہو گئے۔ شکوران نے دروازہ کھول دیا۔ مما کے ساتھ تین آدمی حواس باختہ انداز میں اندر آئے۔ ان میں اڈے کا نگراں استاد سلامی، بٹھل کو دیکھ کے جھپٹتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور ادھر ادھر نگاہیں گھماتے ہوئے اس نے کچھ کہنا چاہا، بٹھل نے اسے روک دیا "اندر چل۔"

تینوں کے چہروں پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھک کی چوکی پر بیٹھنے سے پہلے استاد سلامی نے سنسناتی آواز میں کہا "استاد غضب ہو گیا۔"

بٹھل نے آنکھیں میچ لیں۔

سلامی کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے بے ترتیبی سے بتایا کہ ابھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے پہلے ہریا اور اس کے چھوٹے بھائی پھجو کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اڈے سے اٹھ کے ہریا، پھجو کے ساتھ لکشمی داس کے محلے میں معمول کے دورے پر تھا کہ انہیں چاقو مار کے ہلاک کر دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، اندھیرے میں تاک لگائے ہوئے آدمیوں نے اچانک ان پر حملہ کیا۔ دونوں کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں ملی، پے در پے وار کیے گئے۔ حملہ کرنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہی ہوگی کہ ایسا شور و غل نہ ہو سکا۔ دونوں کی لاشیں قریب کی اندھیری گلی میں پھینک دی گئیں۔ ادھر انہوں نے ہریا اور پھجو کو ختم کیا، ادھر ان کے دوسرے ساتھی لکشمی داس کے گھر میں داخل ہو کے اس کی لڑکی ریکھا کو اٹھا کے لے گئے۔ چند دن ہوئے، لکشمی داس نے گھر کے ایک حصے میں ایک ادھیڑ میاں بیوی کو ملازم رکھ لیا تھا۔ مرد اچھا جان دار اور جی دار شخص تھا۔ عورت کے بیان کے مطابق اس کے شوہر نے لاٹھی سنبھال لی اور ایک دو کو زخمی کر دیا تھا لیکن وہ تعداد میں کئی تھے۔ انہوں نے اس کے شوہر کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا۔ عورت کی آہ و بکا، ریکھا اور لکشمی داس کی چیخ و پکار پر کوئی پڑوسی مدد کو نہیں آیا۔ دبلے پتلے لکشمی داس نے بساط بھر مزاحمت کی کوشش کی مگر انہوں نے اس کے سر پر کسی بھاری چیز سے ضرب لگائی یا اس کا سر دیوار سے ٹکرایا، وہ بے ہوش ہو گیا، عورت بھی یہ منظر دیکھ کے اپنے حواس کھو چکی تھی۔ لکشمی داس نے ہریا کے مشورے پر ایک گورکھا دربان بھی تعینات کیا تھا۔ سب سے پہلے وہی نشانہ بنا۔ لکشمی داس کو زخمی حالت میں بڑے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ اس کے بچنے کی امید کم ہے۔ پولیس ہریا اور پھجو کی لاشیں تھانے لے گئی ہے۔"

بٹھل خاموش رہا اور استاد سلامی کے چپ ہو جانے پر اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"ایسا یہاں کبھی نہیں ہوا۔" سلامی کی آواز تھمتا بھی رہی تھی، ماتم و کناں بھی تھی "ایسا کبھی نہیں ہوا استاد! ہریا اپنے اڈے کا ہیرا تھا۔"

بٹھل بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"ادھر اڈے پر وہ سارے بہت پاگل ہو رہے ہیں۔ مشکل سے ان کو روک کے آیا ہوں۔ ان کے سر پہ خون سوار ہے۔ بولتے ہیں، ہریا، پھجو کی ارتھی پہ ان حرامی پلوں کے خون سے رنگی چادر چڑھائیں گے تب ہی ان کو چین آئے گا۔"

"تو کیا بولتا ہے۔" بٹھل نے ترشی سے پوچھا۔

"میں، میں کیا بولوں۔" استاد سلامی اضطراری انداز میں بولا "اگر پوچھتے ہو تو اپنا خون بہت کھول رہا ہے استاد! قسم سے، تم کو کیا بولوں۔ اپنا دماغ گھوم رہا ہے۔ اپنے کو معلوم ہے کس طرف جانا ہے۔ بس تم اجازت دیو۔"

"تجھ کو اب اڈے پر نہیں بیٹھنا چاہیے۔" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔

"کیوں؟ کیا؟ کیا بولتے ہو استاد؟" سلامی بوکھلا گیا۔

بٹھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے سناٹا طاری رہا
بٹھل چوکی سے اٹھ گیا اور سلامی کے کندھے پر ہاتھ رکھ
اس نے تھپکی دی اور سوچی ہوئی آواز میں بولا "تھوڑا
کے تڑکے کاکا۔"

سلامی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا کیا۔

"چل دیکھتے ہیں ادھری چل کے۔" بٹھل نے آہستگی
سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

سلامی کی حالت دگرگوں تھی۔ اس نے اپنا سر میرے
شانے سے ٹکا دیا اور ہڑکنے لگا "نہیں نہیں سلامی بھائی! ایسے
نہیں، حوصلہ رکھو، ذرا صبر سے کام لو۔" مجھ سے اس کی تسلی
تشفی نہیں کی جاسکی۔ خود میرا حال اس سے مختلف نہیں تھا۔

"خبر ہے 'ابھی رات کو اڈے سے نکلتے ہوئے ہریا کیا کہہ
رہا تھا۔" سلامی زار زار آواز میں بولا "کہہ رہا تھا 'استاد کئی
دن ہوگئے۔ اپنے لاڈلے راجا کے درشن کیے ہوئے۔ کیا
خیال ہے 'کل سویرے ان کی طرف چلتے ہیں۔ تمہارا تو وہ
دیوانہ تھا بھیا! کہتا تھا 'ان سے بنتی کروں گا 'اپنے کو بھی دو چار
جادو کے ہاتھ سکھادو۔ اس دن کے بعد سے اٹھتے بیٹھتے وہ
تمہارا ہی نام جپتا تھا۔" استاد سلامی کی آنکھوں سے آنسو ابل
رہے تھے۔ "ہائے مرگیا حرامی۔"

"میری آنکھیں بھی جل رہی تھیں اور دل بیٹھا جارہا
تھا۔ یکایک مجھے جامو کا خیال آیا 'میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا
"اور یہ جامو بھائی کہاں ہیں؟"

سلامی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا 'اتنا ہی کچھ جو بٹھل
نے مجھے بتایا تھا 'کہنے لگا کہ جامو صرف ایک دن کے لیے آیا
تھا اور پورا دن بھی کہاں ٹھہرا۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر چلا گیا
اور کچھ معلوم نہیں 'کہاں گیا ہے 'کب واپس آئے گا۔ اس
سے پہلے کہ میں سلامی سے کچھ اور پوچھتا 'بٹھل تیار ہو کے
آگیا "میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں
کہا۔

"تو ابھی ادھری رہ 'ضرورت پڑی تو بلالیں گے۔"
بٹھل کی آواز بگڑی ہوئی تھی۔

"میں جلد واپس آجاؤں گا 'میں چلنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں رے 'ابھی نہیں۔"

"ابھی کیوں نہیں؟" میں نے درشتی سے کہا۔

"ابھی تجھ کو ادھری رہنا ہے۔"

"یہاں میں کیا کروں گا؟"

"ادھری بھی کیا تیر مارے گا۔"

"مجھے ہریا اور پھو کے کریا کرم میں شریک نہیں ہونا؟!"

"تیرے بنا بھی پھنک جائیں گے سور کے جنے۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں 'میں یہاں اکیلا الجھتا رہوں گا۔"

"پھر میں ادھری ٹھہر جاتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"مطلب ایک ہی ہے رے 'ایک آدمی کو ادھری رہنا
ہے۔"

"ہاں لاڈلے بھائی! استاد ٹھیک بولتے ہیں۔ سمجھا کرو۔"
سلامی نے مجھے نرمی سے مشورہ دیا "ادھر پولیس کا چکر چلے
گا۔ ابھی تو لوگوں کو معلوم نہیں 'سویرے شہر کا کیا نقشہ ہوگا '
کیا کہا جاسکتا ہے 'تم الگ ہی رہو بھیا!"

بٹھل نے کوئی تاخیر نہیں کی۔ وہ تینوں تیز تیز قدموں
سے چلتے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو کے اندھیرے میں گم
ہوگئے۔ سلامی تانگے میں آیا تھا۔ دیر تک تانگے کی آواز
گونجتی رہی پھر معدوم ہوگئی۔

میں نے کمرے میں جاکے گھڑی دیکھی۔ سوا تین بج
رہے تھے۔ کمرے میں مجھے وحشت ہوئی تو میں نے صحن کا رخ
کیا۔ میرا سر بھن بھنا رہا تھا۔ صحن میں کچھ فاصلے پر کمراہوں
کے درمیان مجھے سائے سے نظر آئے۔ وہ خانم 'زریں اور
زہرہ تھیں۔ مجھے دیکھ کے وہ روشنی میں آگئیں۔ "خیریت تو
ہے میاں؟"

خانم نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں 'کوئی ایسی بات نہیں 'یہ تو ہوتا رہتا ہے '
ہوتا رہے گا۔" میرے لہجے کی تپش سے وہ اور ہراساں ہو
گئیں میں نے دھیمی آواز میں کہا "آپ آرام کریں آپا! آپ
کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہوسکے تو کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔" خانم نے ہچکچاتے ہوئے
پوچھا۔

"کیا بتاؤں۔" میں نے جھنجلا کے کہا "مجھے خود اتنا نہیں
معلوم۔"

خانم نے مزید بازپرس نہیں کی۔ اسے چہروں اور لہجوں
کی اچھی پہچان تھی۔ وہ تینوں وہاں سے ہٹ گئیں۔ میں بھی
دوبارہ اپنے کمرے میں آکے بستر پر دراز ہوگیا۔ مجھے کسی کل
چین نہیں تھا۔ ہریا کا چہرہ بار بار نظروں کے سامنے آجاتا۔
زندگی کیسی بے وقار ہوتی ہے۔ زندگی اور موت میں بس
ایک کمان کا فاصلہ ہے۔ آدمی ہر وقت موت کے قریب رہتا
ہے 'موت کے پہلو میں۔ میں جاگتا ہی رہا۔

شام تک اڈے سے کوئی نہیں آیا۔ اندھیرا گہرا ہوگیا
باہر کا بھی اور میرے اندر کا بھی۔ میں نے ڈیوڑھی میں جاکے

ممّا سے بات کی۔ اس کا بھتیجا مجھے ٹکرا گیا۔ اس نے بتایا کہ
دن بھر شہر میں ہو کا عالم رہا ہے۔ صبح سے لوگ گلی کوچوں میں
ٹولیاں بنائے کھڑے تھے کہ پولیس نے دفعہ ایک سو چوالیس
نافذ کردی۔ سارے شہر میں سپاہی گشت کرتے رہے۔ اڈے
کے لوگ ہریا اور پھو کی لاشیں صبح اسپتال سے اڈے لے
آئے تھے۔ اڈے پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ چار بجے
کے قریب دونوں کی ارتھیاں اٹھائی گئیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ
سپاہیوں کی ایک بڑی نفری موت کے جلوس کے ساتھ چلتی
رہی۔ لکشمی داس کے ملازم اور گورکھے چوکی دار کی ارتھیاں
الگ اٹھائی گئیں۔ شمشان گھاٹ پر ایک اژدحام تھا۔ ادھر
اڈے پر لوگ بین کرتے رہے۔ بٹھل اس رات نہیں آیا۔
اڈے کے ایک آدمی کو اس نے نیا جوڑا منگوانے کے لیے
بھیج دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ استاد جامو ابھی تک واپس
نہیں آیا ہے۔ وہ فیض آباد کے آس پاس ہوتا تو ہریا اور پھو
کی آخری رسوم کے لیے اس کا انتظار ضرور کیا جاتا۔ بٹھل
نے جامو کو کیوں طلب کیا اور وہ اتنی جلدی واپس کیوں چلا
گیا؟ بٹھل نے صاف طور سے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ جامو
کلکتے واپس چلا گیا ہے۔ وہ کلکتے واپس جاتا تو مجھ سے اور
زریں سے ملے بغیر کیسے چلا جاتا؟! جامو کی اچانک آمد کا
مطلب سمجھ میں آتا تھا لیکن اس کے اس طرح غائب
ہوجانے کے عقدے سے ل ہی واقف ہوگا۔ یہ کوئی
احتیاط ہی ہوسکتی ہے کہ اڈے کے نگراں 'جامو کا دست
راست اور جانشین استاد سلامی بھی اپنے مربی کے حال
احوال سے بے خبر تھا۔ میں نے اپنے طور پر اندھیرے میں
ہاتھ پاؤں مارنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں
آیا۔

بٹھل دوسرے دن بھی اڈے پر رہا۔ دوسرے دن میں
نے اڈے جانے کی ٹھان لی تھی اور حویلی سے نکل بھی گیا تھا
کہ کچھ دور جاکے واپس آگیا۔ مجھے خود پہ اعتبار نہیں رہا تھا۔
آدمی کا سب سے بڑا انتشار خود اس کی بے اعتباری ہے۔ یہ
اعتبار بٹھل کو بھی مجھ پر نہیں تھا اسی لیے اس نے مجھے حویلی
میں مقید کردیا تھا۔ دوسرے دن رات کو بھی بٹھل گھر نہیں
آیا۔ ہریا اور پھو کے کریا کرم کے بعد تیسرا دن تھا 'ممّا کے
بھتیجے نے مجھے بتایا 'صبح سویرے سحرخیزوں کو لکشمی داس کی بیٹی
برکھا کی برہنہ لاش گھر کے قریب سڑک پر پڑی نظر آئی۔
ایک کہرام مچ گیا۔ برکھا کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ جن
لوگوں نے یہ منظر دیکھا ہے 'ان کا کہنا ہے کہ جسم پر جا بہ جا
لاتوں گھونسوں کے نشانات تھے۔ برکھا کا باپ لکشمی داس

...میں ہے اور معلوم نہیں' اسے اس سانحے کی اطلاع ...ہے یا نہیں۔ لوگ کہتے ہیں' وہ خود موت اور زندگی کی ...میں ہے۔ ہوش میں آتا ہے تو چیخنے چلانے لگتا ہے۔ ...لوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ پاگل ہو چکا ہے۔

...میں نے پرکھا کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کا ماجرا سن سن ...یک شناسائی سی ہو گئی تھی۔ ہریا ہی نے اس کے بارے ...بایا تھا کہ وہ بے حد حسین اور ذہین لڑکی ہے۔ اس کے ...نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا ...ہے۔ گریجویشن تو اس نے کر ہی لیا تھا۔ اپنی بیٹی کے ...علم کی خاطر باپ نے اس کی شادی مؤخر کر دی تھی۔ وہ ...ی اکلوتی لڑکی تھی۔ کلشی داس کہتا تھا کہ پرکھا میری بیٹی ...یں' میرا بیٹا بھی ہے۔ کہتا تھا' وہی میری زندگی ہے۔ اب ...ی داس کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ معلوم نہیں' جو لوگ ...ا کو لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے' وہ اسی کے قبضے ...تھی پھر انہوں نے اسے مار کیوں دیا۔

...ما کے بھتیجے نے یہ روداد سنا کے میرے جسم میں آگ ...ی۔ اس رات استاد سلامی جب ہریا اور بچھو کی موت کی ...ن کے حویلی آیا تھا تو اس نے بجھل سے اجازت مانگی تھی ...ر کہا تھا' اسے معلوم ہے' کس سمت جانا ہے۔ مجھے بھی ...ت کا اندازہ تھا۔ شہر کے بہت سے لوگوں کو علم ہو گا۔ ...ولیس بھی جانتی ہو گی کہ کون اتنا سفاک' اتنا بڑا درندہ ہو سکتا ...ہے۔ پرکھا کے ختم ہو جانے اور اس کے باپ کے پاگل ...و جانے کے بعد یہ قصہ تمام ہو گیا ہے مگر کیا یہ قصہ یہیں ختم ...و جانا چاہیے؟ میرا جی کرتا تھا' اسی وقت گھر سے نکل پڑوں۔ ...چن چن کے ایک ایک کو ختم کر دیا جائے۔ ایسے آدمیوں کی ...کی سزا ہونی چاہیے۔ اس شہر میں بے شک مجھے کچھ لوگ ...جانتے ہیں لیکن اطراف میں کوئی واقف نہیں ہے۔ استاد ...سلامی کی طرح بجھل سے میں کہوں گا تو وہ آگ بگولا ہو جائے ...گا۔ مجھے خود ہی نکل جانا چاہیے۔ پوچھتا پاچھتا اپنی منزل پر پہنچ ...ہی جاؤں گا۔

تیسرے دن رات کو ہریا اور بچھو کے تیجے کی رسم ادا کر کے بجھل گھر واپس آیا۔ وہ بس اپنی صورت دکھانے اور ہماری صورتیں دیکھنے حویلی آیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد چلا گیا۔ رات اور صبح ناشتے کے دوران میں اس سے بات کرنے کا موقع ملا تھا مگر میں نے خاموشی اختیار کی۔ دن بھر حویلی میں میرا کام' جہاں گیر' خانم' تنویر اور نیساں کے ساتھ شطرنج اور کیرم کی بازیاں جمانے' بیڈمنٹن کی مشق کرنے' انواع واقسام کے ذائقے آزمانے' حویلی میں ادھر ادھر سرگشت کرنے اور اپنے کمرے میں یا اپنے حجرے میں بند ہو کے گزران وقت سے آنکھیں چرانے اور وقت دھکیلتے رہنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وقت بھی کیسا آئینے کے مانند ہوتا ہے۔ آدمی کبھی اس سے بہت آنکھیں چراتا ہے اور درگزر کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وقت آئینہ بھی تو نہیں جسے توڑ دیا جائے' جس سے منہ چھپالیا جائے۔ وہ سامنے کھڑا رہتا ہے اور ٹھینگا دکھاتا رہتا ہے۔

ہریا اور بچھو کے تیجے کے بعد دو دن اسی طرح گزر گئے۔ بجھل کا وظیفہ بھی وہی تھا۔ صبح جا کے رات کو کبھی جلدی' کبھی دیر سے واپس آنا۔ اڈے پر اس تواتر سے اس کی آمدورفت کسی سبب کے بغیر نہیں ہو گی۔ اسے نصیب ہی کہنا چاہیے' ہمارے نصیب میں سکون نہیں لکھا تھا' شاید یہی بہتر ہوتا کہ ہم آسن سول سے آگے بڑھ جاتے۔ فروزاں اور یاسمن کا سامان بہت قیمتی تھا لیکن آسن سول سے کلکتہ دور ہی کتنا رہ گیا تھا۔ درمیان میں دو تین جگہ رکتے ہوئے بھی ہمیں چند دن بعد کلکتے پہنچ جانا تھا۔ کلکتے میں یاسمن اور فروزاں کا اثاثہ کسی معتبر شخص کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ وہاں جا کو تھا' جمرو اور زورا تھے۔ مگر یہاں آنے کے لیے میرا اصرار اتنا بے جواز بھی نہیں تھا۔ یہاں آئے ہوئے ہمیں ایک وقت گزر گیا تھا۔ زریں' جہاں گیر' نیساں وغیرہ کے خیال سے زیادہ حویلی میں نوواردو فیروزاں اور یاسمن کی دل داری مقصود تھی۔ صرف ایک روز بعد یہاں ہماری آمد سے انہیں یقیناً بڑی طمانیت اور تقویت ملی ہو گی۔ انہیں اس گداز کی بہت ضرورت تھی۔ اس لیے بجھل بطور خاص ان سب سے زیادہ ان کی پرستش کرتا تھا۔ میں بھی صبح و شام انہیں پوچھتا رہتا۔ یاسمن تو اب مجھ سے خاصی مانوس ہو گئی تھی اور تقریباً بھی سے کھل مل گئی تھی۔ آسن سول سے آگے بڑھ جانے کے بعد ہمارا کیا ٹھیک تھا' کہاں کون راستہ روکے کھڑا ہو پھر جانے کب اس طرف آنے کا موقع ملتا۔ یہاں آنے کے بعد مجھے ہمہ دم یہاں کے مقصد کا خیال رہا۔ حویلی کے مکینوں کے روز و شب اور معاملات و مشاغل میں ہمہ جان شامل رہنے کے تاثر میں شاید میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ شاید کسی کو احساس نہ ہوا ہو کہ میری یہاں موجودگی برتنا ہے وضع و مروت ہے ورنہ میں تو کوئی اور آدمی ہوں۔ میں صرف اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے پھرتا ہوں۔ ان کی جانب میری نگران نگاہیں میری شائستگی اور ادائے فرض پر محمول کرنی چاہئیں۔ میری نگاہیں تو جانے کہاں کہاں بھٹکتی ہیں۔ کسی ایک جانب مرتکز نگاہوں سے یہ مراد نہیں کہ آدمی اسی جانب مصروف دید

ہے۔ کسی جگہ میری موجودگی سے مراد میری موجودگی نہیں' میں ہوں اور نہیں بھی۔ غالب نے کہا تھا' ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔ اپنی اس کجی کی خفت مٹانے کے لیے میں زیادہ سے زیادہ ان کے درمیان رہتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ انہوں نے میری چوری پکڑ لی ہے' میرے اندر کا احوال بھانپ لیا ہے' مگر حرفِ شکایت زبان پر لانے میں پاسِ وضع' پاسِ ادب لازم ہے۔ ان کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ انہیں میری خود سری' میرے اصرار کی توانائی اور اپنی اختیار کی ناتوانی کا خوب اندازہ تھا۔ سو یہی قرینہ موزوں تھا کہ وہ مجھ پر اپنی نوازشوں کی ارزانی کریں۔ بچھ بچھ جانا' میرے اشاروں کی جستجو میں رہنا انہوں نے شعار بنا لیا تھا۔ کچھ اسی طرح مجھے زچ کیا جا سکتا تھا یا شرمندہ کیا جا سکتا تھا۔

اس روز میں لائبریری کی طرف نکل گیا۔ یہ ایک پرسکون جگہ تھی۔ یہاں نئی اور پرانی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ مجموع شروع میں میرا دل گھبرایا۔ اوروں کا نہیں معلوم' اتنی کتابوں کے درمیان مجھے تو ہمیشہ بڑی کم تری بلکہ بے بسی کا احساس ہوا ہے۔ میں نے وہاں بیٹھے رہنے کی ضد کی۔ ضد' جبر ہے اور جبر سے اچھے نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔ میں نے افسانوی ادب کی کتابیں تلاش کیں۔ آدمی کا دل سب سے زیادہ کہانیوں میں لگتا ہے۔ کہانیاں' دریچوں اور چلمنوں کی طرح ہوتی ہیں' لفظوں میں جھانک کے دیکھو تو عجب عجب مناظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ گیا میں ہمارا بوڑھا پروفیسر کہتا تھا' ٹھوس کتابوں میں جی نہ لگے تو افسانوی کتابیں پڑھا کرو۔ یہ وقت کا بہترین مصرف ہے۔ افسانوی کتابیں گداز پیدا کرتی ہیں اور خیال و خواب بیدار کرتی ہیں۔ کہانی کی کتاب ایک طرح کی سیاحت ہے۔ سیاحت میں جس طرح نئے نئے تجربے ہوتے ہیں' کہانیاں بھی زندگی کے نئے نئے رنگ دکھاتی ہیں اور وہ کہتا تھا' کہانی کی ہر کتاب نہیں پڑھنی چاہیے' زندگی اتنی بڑی نہیں ہوتی کہ فضول کتابوں میں وقت گنوایا جائے۔ چنے بغیر ہر طرح کی کتاب پڑھنے سے دماغ منتشر ہوتا ہے' منتخب کتابوں کو ترجیح دینا چاہیے۔ کتاب کی قدر و قیمت اس کی ضخامت سے نہیں' متن سے ہوتی ہے۔ متن خیال انگیز' فکر افروز ہو تبھی کتاب ختم کرنی چاہیے ورنہ ادھوری چھوڑ دینی چاہیے اور ہاں پروفیسر کہتا تھا' پرانی کتابوں سے زیادہ نئی کتابوں پر توجہ کرنی چاہیے۔ پرانی کتابوں کی فکر بھی بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ زمانے کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اشارے' عقل' مزاج' لہجے بدل جاتے ہیں۔ آدمی کو ہمیشہ اپنے عہد میں رہنا چاہیے اور آنے والے وقت کے لیے مستعد' پرجوش پیش قدم۔ اب اتنا وقت گزرنے کے بعد اس کی باتیں مجھے بہت یاد آتی تھیں اور زیادہ سمجھ میں آتی تھیں۔ وہ کچھ اتنا پسند بھی تھا۔ کبھی بہت عجیب باتیں کیا کرتا تھا۔

میں نے کئی چھوٹی بڑی کہانیاں ختم کر ڈالیں۔ یہ اچھا مشغلہ ثابت ہوا۔ مجھے کچھ اپنی بساط کا بھی اندازہ ہوا کہ مجھے کچھ آتا ہی نہیں' میں تو بہت پس ماندہ ہوں۔ اچھی کتاب پڑھ کے کیسی سرشاری ہوتی ہے۔ اچھی تحریر کوئی نشہ ہے۔

ہریا اور بچھو کی موت کا پانچواں دن تھا۔ رات کو بجھل اڈے سے جلدی واپس آ گیا۔ رات کا کھانا بھی اس نے سب کے ساتھ کھایا۔ میں نے اڈے کے بارے میں اس سے کوئی بات کرنا ہی بند کر دیا تھا۔ بجھل اس وقت ہلکا پھلکا سا لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد بیٹھک میں محفل جم گئی۔ حقہ سلگا دیا گیا۔ نیساں کچھ طے کر کے آئی تھی۔ بجھل کی خوش گواری دیکھ کے اس نے چپکے سے کہا "بابا! ایک بات کہوں؟"

"بول ری۔" بجھل فیاضی سے بولا۔ نیساں نے بھی دبی زبان سے نینی تال دیکھنے کی فرمائش کی تھی کہ بجھل نے کسی تردد کے بغیر نرمی سے معذوری ظاہر کر دی اور آہستگی سے بولا "ہم نہیں جا سکتے پر دیکھتے ہیں' تیرا کوئی انتظام کرتے ہیں۔"

"نہیں بابا!" نیساں نازبرداری سے بولی "ہمیں تو آپ کے اور ریابر بھائی کے ساتھ جانا ہے۔"

"پھر ابھی نہیں ری۔ اپنے کو اب واپس جانا ہے۔ ادھری لوٹ کے چد ھرو لے گی' چلیں گے۔ لگام تیرے ہاتھ میں دے دیں گے۔"

"واہ' اب آپ کو جانے کی جلدی ہے۔" نیساں شکایتی لہجے میں بولی "ابھی آئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں۔"

"ہاں ری' اب جانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

"اتنے کم وقت کے لیے آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تیرے درشن کو۔" بجھل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے چوم لیا۔

"نہیں بابا!" نیساں حکمیہ لہجے میں بولی "ابھی آپ ٹھہریے' چلیے نینی تال مت جائیے۔"

"اب کے جلدی لوٹیں گے ری پھر تو ادھری رہنا ہے۔"

نیساں کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ خانم نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ نیساں بل کھا کے رہ گئی "اب کب جانا ہے آپ کو؟" وہ اداسی سے بولی۔

"بس جلدی' تین چار دن بعد کو۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ کیوں زری آپا' آپ نے سنا! آپ

...ں نہیں بولتیں۔" نیساں نے زری کو مہمیز کرنے کی ...شش کی۔

زریں نے مضطرب آنکھوں سے پہلے ...ل کی پھر میری ...ف دیکھا اور یاسیت بھری آواز میں بولی "بابا کو کام سے ...ت نہ جانے۔"

"دیکھاری' بلیا جانتی ہے اور سمجھتی ہے۔"

...ل نے روانگی کے لیے تین چار دن بتائے تھے۔ گویا ...ب وہ فیض آباد کے اڈے کے کاموں سے نمٹ چکا تھا۔ ...یض آباد کے علاقے یعنی بجھل کے علاقے میں ایک نوجوان ...ی اغوا کرلی گئی اور ختم کردی گئی۔ ایک شخص پاگل ہوگیا ...ور جاں کنی کے عالم میں ہے۔ اس کے دو بے گناہ ملازم مار ...ے گئے۔ اڈے کے دو آدمی ہیرا اور پھو نشانہ بنادیے ...ور جیسے کچھ نہیں ہوا' جیسے ان سب کو تو مرنا ہی تھا۔ کوئی ...اقعہ نہیں ہوا تھا۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ بجھل کو ...ب واپس جانا چاہیے چنانچہ وہ واپس جارہا ہے۔ استاد جامو ...ھی اتنے بڑے سانحے کے بعد فیض آباد نہیں لوٹا۔ کلکتے میں ...مرو کو بھی خبر ہو گئی ہوگی۔ وہ بھی نہیں پلٹا۔ شاید انہوں نے ...خاموشی بہتر سمجھی ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔ چھوٹا حاکم بڑے ...حاکم سے مغلوب ہوجاتا ہے یا پھر وہ کسی مناسب موقع کے ...منتظر ہیں اور اس درمیان میں کوئی اور حادثہ پیش آسکتا ہے۔ ...بڑا حاکم اپنے اس غلبے پر کیوں قناعت کرے گا۔ اسے اپنے کم ...تر کو سانس لینے کی مہلت بھی نہیں دینی چاہیے۔ حاکیت کو ...اپنے اثر و تسلط کے مسلسل اظہار کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہیرا ...اور پھو کے بعد کوئی اور... وہ مجھ سے بھی واقف ہوگئے ...ہیں۔ اڈے کی چوکی پر بجھل کے مستقل قیام پر بھی وہ نظر ...رکھے ہوئے ہوں گے اور اڈے سے حویلی کی خاص وابستگی ...بھی ان کے علم میں ہوگی۔ میرے دماغ میں بہت سے سوال ...سر ابھار رہے تھے لیکن نہ یہ موقع تھا نہ بجھل سے توقع تھی کہ ...وہ جواب دہی کی زحمت کرے گا۔

رات بہت ہوگئی تو بجھل نے انہیں آرام کا مشورہ دیا۔ آہستہ آہستہ سب ہی چلے گئے' صرف خانم موجود رہی۔ سب کے چلے جانے کے بعد اس نے بجھل سے کہا "بابا! آپ سے کبھی بات کرنی ہے۔"

بجھل نے منال ہونٹوں سے ہٹائی اور چونک کے بولا

"ہاں ہاں بولو؟"

"سوچا تھا' آپ کو خط لکھوں گی لیکن کسی ایک جگہ آپ کا ٹھکانا نہیں ہوتا' میرا مطلب ہے' کوئی مستقل پتا۔" خانم کو بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ ابتدا میں اس نے شائستگی سے بات کی' ایسی گفتگو ... تصنع کا گمان ہوتا تھا مگر اس کا یہی طور تھا۔ سب اس تکلم کے عادی ہوگئے تھے۔ ممکن ہے' میری طرح کسی اور کے جی میں یہ خواہش امڈتی ہو کہ کاش یہ آواز مجسم ہوجائے۔ اس وقت خانم کا تیور خاصا مختلف تھا' اس کے لب و لہجے پر سنجیدگی کا عنصر حاوی تھا۔

"کیا ادھری حیدر آباد کی کوئی بات ہے' نواب لوگ کی؟" بجھل الجھ کے بولا۔

"نہیں بابا! وہ داستان تو ختم ہوگئی۔ وہ لوگ بہت منتیں کررہے تھے لیکن میرے رکے رہنے سے نواب صاحب کو واپس تو آنا نہیں تھا۔ اتنے عرصے تک ان سب کے اصرار نے مجھے مجبور کیے رکھا۔ میرا دل تو یہیں لگا ہوا تھا۔ بے شک نواب بڑے کی نوازشوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ چھوٹے نواب عالم تاب کی بیوہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ اپنے شوہر کی نشانی سمجھ کے مجھے اپنے پاس ہی رکھیں' وہ ایک عالی ظرف خاتون ہیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ میرا ایک بھرا پرا گھر ہے جو مجھے سارے جہاں سے زیادہ عزیز ہے۔ وہاں میری بہنیں' میرے بھائی رہتے ہیں۔ وہ میری راہ تکتے ہوں گے۔ کیا بتاؤں' انہوں نے کس مشکل سے اجازت دی۔ چلتے وقت بہت تحفے تحائف دینے چاہے' میں نے معذرت کرلی۔"

"اچھا کیا' ہم سوچتے تھے تھوڑا ٹائم اور بیتنے اور برف جم جانے کے بعد تم کو لانے کے واسطے ایک پھیرا ادھری کا لگادیں گے۔" بجھل نے بوجھل آواز میں پوچھا "پر تم کو اور کیا بولنا ہے خانم؟"

"یہی کبھی اس گھر' اس حویلی کے بارے میں۔" خانم ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے کسی قدر بے چینی سے بولی۔

"مجھے خیال ہوا' کہیں میری موجودگی سے تو خانم کی آواز میں گرہ نہیں لگ رہی ہے۔ میں اٹھ گیا۔

"ارے تم' تم کہاں چلے؟" وہ گھبرا گئی "تم آخر کیوں؟ نہیں نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔ تم کیا سمجھے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کسمسا کے کہا "بس یوں ہی۔"

"جو بات میں کرنا چاہتی ہوں' اس کا تعلق تم سے بھی ہے لیکن..." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا' کیا بات ہے آپی؟" میں نے تذبذب سے کہا۔

"سوچتی ہوں' اب رات بہت ہوگئی ہے۔ اس وقت طبیعت حاضر نہ ہو تو پھر سہی..."

"اپنے کو سارا برابر ہے' کیا رات' یا دن۔ تم آگے بولو۔"

بجھل کی رسمی اجازت پر خانم سرجھکائے تھمی تھمی آواز میں بولی کہ اس حویلی پر خدا کا لطف و کرم بے اندازہ ہے۔ دنیا کی ہر چیز یہاں میسر ہے جو نہیں ہے' اس کی کسی کو جستجو بھی نہیں ہے۔ جتنا کچھ انہیں فراہم ہے' وہ کتنوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ حویلی بہت کشادہ ہے۔ اس کی نسبت یہاں مکینوں کی نفری بھی بہت کم ہے۔ منیر علی کے خاندان کے پانچ افراد' زہرہ' چھوٹی سلمٰی' تنویر' ارشد' مجو اور زریں' نیساں' خانم' جامو اور جمرو وغیرہ' کبھی ہم' میں اور بجھل آجاتے ہیں تو حویلی کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ یہاں اور بہت سے لوگ سما سکتے ہیں۔ حویلی کی کشادگی اپنی جگہ مگر یہاں کے مکینوں کے دل اس سے زیادہ کشادہ ہیں۔"

مجھے شبہ ہوا' کہیں خانم' فروزاں اور یاسمین کی آمد پر تو گراں باری محسوس نہیں کررہی۔ بظاہر وہ بھی شیر و شکر نظر آتے ہیں۔ فروزاں اور یاسمن بھی بہت کھلی کھلی لگتی ہیں لیکن اندر کا حال مختلف بھی ہوسکتا ہے۔ جلد ہی خانم نے میری دھند دور کردی۔ کہنے لگی کہ خدا انہیں اس نیکی کا اجر ضرور دے گا۔ ہم نے اتنے ستم رسیدگاں کو اس حویلی کی پناہ گاہ میں عزت' عافیت اور مسرت کی ایک نئی زندگی کا موقع دیا ہے۔ کون کسی کے لیے اتنا کچھ کرتا ہے لیکن کیا بس بات اسی پر ختم ہوجاتی ہے۔"

خانم نے توقف کیا تو بجھل نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا "صاف بولو خانم!"

"سمجھ میں نہیں آتا' کس طرح بات کروں۔" خانم ہچکچاتے ہوئے بولی "شاید آپ نے غور نہیں کیا۔ حویلی کے مکینوں میں بیش تر نوجوان لڑکیاں ہیں۔ زریں' زہرہ' چھوٹی سلمٰی اور بڑی سلمٰی' نیساں' فروزاں اور یاسمن..."

"ہاں ہاں' کیا ان کو کسی نے کچھ بولا؟" بجھل کی آواز بھرگئی۔

"نہیں نہیں' یہ مراد نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"کیا' کیا یہ سب اسی گھر میں بیٹھی رہیں گی؟"

بجھل کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"آپ نے ان کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ یہ لڑکیاں بنا' یہ دوسرے گھروں کی امانت ہوتی ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" بجھل نے اضطراری انداز میں سر ہلایا۔

"اور انہیں ایک عمر تک ہی گھر میں بٹھانا مناسب ہوتا ہے۔"

بجھل' خانم کی صورت دیکھنے لگا "پھر کیا کریں' تمہی بولو؟"

"میں' میں کیا بتا سکتی ہوں۔ یہاں حویلی میں آس پاس کے خاندانوں سے واجبی قسم کا تعلق ہے۔ حویلی کے بارے میں معلوم نہیں' باہر کیا کیا مشہور ہے۔ یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ اس کیفیت میں مجھے شبہ ہی ہے کہ اس شہر سے کوئی رشتہ آئے۔ زریں کے اعزا مستقل کنارہ کشی کیے ہوئے ہیں۔ ہم بھی کہیں نہیں جاتے۔ جیسا میرے آنے کے بعد بڑے صاحب منیر علی کا اپنے عزیز و اقارب سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ رشتے' میل جول' رسم و راہ سے آتے ہیں۔ ہماری لڑکیاں ہر اعتبار سے مثالی ہیں لیکن شاید یہاں کوئی رشتہ نہ آئے' پیغام ایسے نہیں آجاتے۔"

بجھل گم صم ہوگیا۔

چند لمحے سکوت کے بعد خانم آزردہ لہجے میں بولی کہ منیر علی بمبئی جاکے ایسے بسے ہیں جیسے یہاں ان کی ضرورت ہی نہ ہو۔ بزرگ ہی یہ سلسلے بڑھاتے ہیں' انہی کی زبان سے سنا ہے' وہاں بمبئی میں ابا جان نے ایک عالی شان کوٹھی خریدی ہے۔ اس کی تزئین و آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے لیکن وہاں بھی یہی کچھ صورت ہے۔ وہاں بھی نوجوان لڑکیاں ہیں' فرخ' فریال' فارحہ' جولین' گیتا' شہ پارہ وغیرہ۔ ابا جان نے ان کے بارے میں معلوم نہیں' کیا سوچا ہے۔ آج نہیں تو کل' انہیں اس طرف توجہ کرنی ہوگی۔"

بجھل چپ بیٹھا رہا' اس کے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔

"بس یہی کچھ کہنا چاہتی تھی۔" خانم دھیمی آواز میں بولی "یہاں کوئی پریشانی نہیں' یہ گھر تو جنت کے مانند ہے۔ وہ زندگی ایسے بھی گزار سکتی ہیں لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ فروزاں کے متعلق سنا ہے' اس کا رشتہ والدین طے کرگئے ہیں اور آپ سے معلوم ہوا ہے' وہ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ظاہر ہے' والدین نے سوچ سمجھ کے ایسی ہیرا لڑکی اس کے لیے منتخب کی ہوگی مگر اس کے بعد یاسمن یہاں' اور دوسری بھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" طویل وقفے بعد بجھل بڑبڑا کے بولا۔

خانم نے پھر کچھ نہیں کہا' اپنے آپ میں گم بیٹھی رہی پھر اس نے بجھل سے کسی چیز کی خواہش کے بارے میں پوچھا۔ بجھل کے انکار پر وہ اٹھ گئی۔ بجھل کے پاس تو حقے کا شغل تھا۔ میں اپنی انگلیاں توڑتا' ناخن کریدتا رہا۔ جب تک بجھل نے اپنے کمرے کا رخ نہیں کیا' میں وہیں رہا۔

اس رات میری طرح بجھل کے رگ و پے میں بھی اینٹھن ہورہی ہوگی۔ خانم تو جیسے کانٹے بکھیر کے چلی گئی تھی۔

کوئی دوسرا آئینہ دکھاتا ہے تو اس کا عکس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے۔ اس نے ایسا کوئی انکشاف نہیں کیا تھا مگر آدمی کتنی حقیقتوں سے آشنائی کے باوجود کیسا غافل رہتا ہے۔ غفلت بھی جہالت ہے۔ آدمی کو بیش تر اپنے صبح وشام، گرد وپیش، اپنے سامنے ہی کا نظر آتا ہے۔ عقب کا، دور کا، اطراف کا اس قدر نہیں۔ دنیا کے اپنے رنگ ڈھنگ ہیں۔ آدمی دنیا کا پابند ہے، دنیا آدمی کی نہیں۔ آدمی کو انہی راستوں پر چلنا پڑتا ہے جو ہموار کردیے گئے ہیں۔ لڑکیاں جہاں پیدا ہوتی ہیں، وہ ان کا گھر نہیں ہوتا۔ شہزادیوں کو بھی محل چھوڑنے پڑتے ہیں۔ جنھیں ہم نے خانم کے بہ قول عزت وعافیت کی زندگی سے ہم کنار کیا ہے، وہ ایک ادھورا کام ہے، یہ عارضی پناہ گاہ ہے۔ ابھی انھیں کہیں اور جانا ہے۔ آگے ان کے فیصلے بھی ہمیں کرنے ہیں۔ ان سب کو چلے جانا ہے۔ زریں جو اس حویلی کی دھڑکن ہے، اسے بھی یہاں سے چلے جانا ہے۔ یہ حویلی اس کے بغیر کیسی لگے گی۔ میرے لیے اس منظر کا تصور ہی وحشت انگیز ہے کہ زریں کسی اجنبی یا شناسا کے ساتھ یہاں سے وداع ہو رہی ہے۔ گویا زریں ہماری ملکیت نہیں ہے اور ہم پر اس کا اختیار عارضی ہے۔ لڑکیاں پیدا ہی کیوں ہوتی ہیں اور ہوتی ہیں تو ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔ خانم کا مخاطب میں بھی تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میری بات تو جداگانہ ہے۔ میں تو کوئی اور آدمی ہوں۔ مجھے اپنے آپ ہی سے فرصت کہاں ہے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میری بھی تین جوان بہنیں ہیں۔

میرا سر جیسے دھنک رہا تھا۔ بٹھل بھی جاگ رہا ہوگا۔ جی میں آتا تھا، اس کے پاس جا کے بات کروں لیکن یہ سوچ کے رہ گیا کہ اسے اور تنگ کروں گا۔ اس کے پاس کون سی جادو کی چھڑی ہے۔ وہ تو بیش تر اڈوں بازاروں میں رہا ہے۔ میرا ابھی ایک زمانے سے کون سا گھر سے تعلق ہے۔ سات سال جیل میں گزرے اور کئی سال سے سفر جاری ہے۔ ہم دونوں کو کسی گھر کے قواعد وضوابط کا تجربہ ہی کتنا ہے۔ ہمیں تو چاقو بازی کا تجربہ ہے، اڑتی چڑیا کو نشانہ بنا سکتے ہیں مگر ہر جگہ زور وبازو کام نہیں آتا، نہ دولت کام آتی ہے۔ گویا سب کی سب حسن وجمال میں یکتا ہیں، ایک سے بڑھ کے ایک، سلیقہ شعار، خوش گفتار، تعلیم یافتہ اور صاحب کردار۔ ان کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے بھی پھر انہی جیسے ہونے چاہئیں۔ خانم کہتی تھی یہ حویلی کسی جنت کے مانند ہے مگر یہ جنت تو ایک جزیرہ ہے۔ ایک جزیرہ جہاں باہر کی دنیا کی معدودے چند لوگوں کے سوا کسی سے کوئی رابطہ واسطہ نہیں۔ باہر کے لوگوں کو حویلی میں آباد لوگوں کے صفات وکمالات کی کیا خبر۔ کون انھیں بتائے کہ یہاں کیسے نادر لوگ بستے ہیں۔ یہ تو ریشم کے مانند ہیں، انھیں پھولوں سے شغف ہے، نہ کتابیں پڑھتے ہیں اور نہ دل نشین باتیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا ادب واحترام ان کا شعار ہے اور ان میں ایک دوسرے کو معاف کرنے، رعایت دینے کی خوبی بدرجہ کمال ہے۔

شہر میں سب کو معلوم ہے کہ اڈے کے آدمیوں نے زریں کی حویلی اس کے غاصب رشتے داروں سے واگزار کرائی ہے۔ فہمیدہ کا واقعہ بھی وہ نہیں بھولے ہوں گے۔ فہمیدہ کا تعلق بھی بازار سے تھا۔ بہت سوں نے دیکھا تھا کہ بازار سے فہمیدہ کا جنازہ حویلی میں آیا تھا۔ انھیں معلوم ہے کہ کلکتے میں مقیم فیض آباد کے اڈے کا مشہور زمانہ استاد جامو فیض آباد کی... حویلی میں ٹھہرتا ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی جمرو کا قیام بھی یہیں رہتا ہے۔ یہ سب ان کا چشم دید ہے۔ حویلی میں ایک بڑا استاد، استاد بٹھل بھی کبھی آکے ٹھہرتا ہے، جب وہ حویلی سے نکلتا ہے اور فیض آباد کی سڑکوں سے گزرتا ہے تو اڈے کے آدمی اسے جلو میں لیے ہوتے ہیں۔ اڈے پر اس کے زور واثر کے فسانے بھی انھوں نے سنے ہوں گے۔ ابھی چند دن ہوئے، میں نے بھی ہریا اور کورا کے بیچ میں پڑ کے انھیں کچھ جتایا تھا۔ وہاں بہت سے لوگوں کا اجتماع تھا۔ کتنے لوگوں نے میری شجاعت، چاقو پر میری گرفت کا تماشا دیکھا تھا۔ کون کس کو باور کرائے کہ ایسا ہم نہیں ہے، جیسا وہ سمجھتے ہیں، جیسا انھیں تلقین کیا گیا ہے۔ اڈے سے وابستگی سے مراد کہاں ہے کہ یہ حویلی اڈے کا ایک حصہ ہے۔ اڈے کے ہر آدمی کو یہاں آنے کی اجازت کب ہے۔ جو یہاں آتے ہیں، وہ یہاں کے مکینوں کے سامنے سر نہیں اٹھاتے۔ وہ جیسے کسی عبادت گاہ میں آتے ہیں۔ یہاں آکے وہ اڈے کے آدمی نہیں رہتے، وہ گھر میں آتے ہیں۔ کون اتنے لوگوں کی بدگمانیاں رفع کرے گا کہ ان کا دیکھا اور جانا ایک بہتان ہے۔ میلے کپڑے دھل کے اجلے ہو جاتے ہیں، غسل سے ناپاک آدمی پاک ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے گناہ متبدل ہو جاتے ہیں۔ بڑی گہری سیاہیاں مٹ جاتی ہیں۔ کسی حادثے یا سانحے کی وجہ سے کسی لڑکی کا واسطہ بازار سے ہو جائے تو سمندر بھی ناکافی ہے۔ عبادت گاہوں سے آکے لوگ کیا دوبارہ ناپاک نہیں ہوتے۔ بازار کی زندگی ترک کرنے کے باوجود کیا کوئی کبھی پاک صاف ہو سکتا۔ لوگ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کون اپنی مرضی سے اڈے سے وابستہ ہے اور کون وہاں کے پنجرے میں...

ماتھے پر کالک لگانے والے خطاکار کون تھے۔ سارے بازار والے بازار میں پیدا نہیں ہوتے۔ سنا ہے، خدا بڑی بڑی خطائیں معاف کردیتا ہے، مگر آدمی! آدمی تو بہت تنگ دل ہوتے ہیں۔

خانم نے اپنا نام نہیں لیا تھا لیکن خانم کی عمر کون سی تجاوز کرگئی تھی۔ وہ بس زریں کی بڑی بہن معلوم ہوتی تھی اور شکوہ وتمکنت میں کسی سے کم نہیں تھی۔ وہ اپنی بے پناہ خوبیوں ہی کی وجہ سے حیدر آباد کے رئیس اعظم مرحوم نواب عالم تاب کو مطلوب ہوگئی تھی۔ اس کا نقش اتنا گہرا تھا کہ نواب سے اس کی جدائی برداشت نہ ہو سکی۔ خانم کے انداز واطوار میں ایسی دل کشی تھی کہ نواب کے پس ماندگان اسے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ حیدر آباد کے بازار محبوب کی منڈی کی بات اور تھی۔ وہاں کے رسم ورواج الگ ہوتے ہیں۔ یہاں خانم ایک گھر میں رہتی تھی۔ اس کے آگے بھی یہ [illegible] زندگی پڑی تھی۔ تاہم وہ اپنی زبان سے کس طرح کہتی کہ اس کا بھی اپنا ایک گھر ہونا چاہیے۔ اس نے مختصر پیرائے میں اپنا مدعا بیان کردیا تھا۔ حویلی کی چھاؤں، اس کے مکینوں کی سرخوشی، راست بازی اور پاکیزگی کتنا ہی بڑا سچ ہو، باہر کے لوگوں کی توثیق ان کی سند کے بغیر ایک واہمہ ہے۔ باہر کے لوگ اسے معتبر قرار دیں گے، تبھی یہ معتبر ہوگی۔

خانم نے بمبئی میں ابا جان کے گھر کی طرف بھی اشارہ کیا تھا مگر وہاں ایسی بات نہیں تھی۔ بمبئی ایک بڑا شہر ہے۔ وہاں لوگ ایک دوسرے کے قریب رہ کے بھی قریب نہیں ہوتے۔ نہ وہ ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ انھیں اپنی ہی بھاگ دوڑ سے فرصت نہیں ملتی۔ بڑے شہر کے لوگوں کی یادداشت بھی کمزور ہوتی ہے۔ بمبئی میں ابا جان اپنی شان وشوکت کے اظہار سے خود گزرے تھے اور خود عائد کردہ شدائد اور مشکلوں کی تلافی کر رہے تھے۔ وہ شاید ساری دنیا خریدنے کے قابل تھے۔ دولت مندوں کی بات تو ہر جگہ بالا ہوتی ہے مگر بڑے شہروں میں غریب اور ناتواں لوگوں کی خوب پردہ پوشی ہو جاتی ہے۔ بڑے شہروں میں ذات پات، چھوت چھات، کسی کے ماضی ومستقبل سے ایسا سروکار نہیں ہوتا۔ وہاں رما جیسی شعلہ صفت لڑکیاں رہتی ہیں، ہر دم کچھ نیا کرنے کے لیے بے تاب اور کیلاش جیسے نوجوان۔ اعلیٰ مقام خاندان کی وہ نوجوان لڑکی رما... بڑے ذوق سے ابا جان کے گھر آتی ہے اور سب سے گھل مل جاتی ہے۔ اس کی بے باکی، روشن خیالی اور آزادی... میں کسی قسم کی ہماری نہیں ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ گھریلو تعلیم وتربیت کے علاوہ رما کے ہاں کچھ خود اس کی افتاد طبع، کچھ بڑے شہر کے بے نیازانہ اور فراخ دلانہ ماحول کا بھی بڑا دخل ہے۔ اس کی رفاقت میں کوئی تلاطم سا جینے میں بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ میری دوستی کی مدعی ہے اور بس، اس کے سوا اس کا کوئی ادعا نہیں۔ وہ کہتی ہے "تم سے میرا تعلق خاطر میرا اپنا معاملہ ہے۔ تم اپنے مثبت یا منفی رد عمل کی زحمت میں نہ پڑنا، ہاں میری کوشش ہوگی، میری آرزو ہے کہ تم مجھے محسوس کرتے رہو۔" ایک بار اس نے ایسا ہی کچھ کہا تھا۔ وہ مجھے کشتی میں بٹھا کے دریاؤں میں لے جاتی ہے اور میرا سر اپنے زانو پر رکھ کے میری چارہ سازی کے لیے بے قرار رہتی ہے اور اس کا بھائی، خوش کلام وجامہ زیب نوجوان ڈاکٹر کیلاش اوسط درجے کے گھر سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی جولین کا طلب گار ہے۔ جولین کے لیے وہ اپنے باپ کے آن جہانی جج دوست کا بڑا ترکہ قربان کردینے کے درپے ہے۔ یہ کیسا عجوبہ ہے، ہر جگہ ایک جیسے آدمی ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ ان کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ دنیا کے طور طریقے جگہ جگہ جدا ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں میں چھوٹی بڑی بستیوں سے آکے لوگ آباد ہوتے ہیں اور کیسے مختلف ہو جاتے ہیں۔

کچھ ابا جان کو بھی احساس ہوگا۔ وہ ایک دور اندیش آدمی ہیں۔ ہر طرف ان کی نگاہ جاتی ہے۔ جزئیات میں تو وہ بے مثال ہیں۔ انھیں احساس ہونا چاہیے، وہ کتنے ہی محل تعمیر کرلیں، موٹر کاریں، چار گھوڑوں کی سواری، مصاحبوں اور خدمت گاروں کا لاؤ لشکر جمع کرلیں، ان کے وابستگان کی آسودگی کے بغیر ان کی بادشاہت ادھوری ہے۔ بادشاہ کا سکون، رعایا کے سکون سے پیوستہ ہے۔ ابا جان کوئی برے آدمی نہیں ہیں، وہ بمبئی میں اتنے لوگوں کو اپنے گھر، اپنی قلمرو میں جمع کیے ہوئے ہیں تو یہ ان کی خوئے خسروانہ ہے۔ وہ اپنے لیے بطور خاص الگ محل بھی بنوا سکتے تھے۔ دولت کی ان کے پاس کمی نہیں ہے۔

شاید یہی بہتر ہے کہ فیض آباد کی حویلی کے سارے مکین بمبئی منتقل ہو جائیں، ویسے بھی سب کو ایک ہی جگہ ہونا چاہیے۔ دونوں گھر ایک ہی ہیں۔ بمبئی اور فیض آباد میں فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔ بمبئی شہر ان سے ایسی مغائرت نہیں برتے گا مگر وہ بمبئی ہو یا فیض آباد یا کوئی اور جگہ، لوگ سڑک پر پڑے ہوئے تو نہیں مل جاتے۔ اچھے آدمی بہت کم یاب ہوتے ہیں۔ دولت کتنی ہی کرشمہ کار ہو، ہر آدمی پر اس کا طلسم کارگر نہیں ہوتا اور اچھے آدمی کا تو کوئی مول بھاؤ نہیں ہوتا۔ صرف ابا جان، بٹھل اور منیر علی کی تن دہی،

مستعدی کافی نہیں، مجھے بھی یوں ہاتھ توڑے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ آگے کسی سفر سے پہلے مجھے اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ میری سرگرمی انہیں بھی مہمیز کرے گی۔ چند روز بعد بجھل یہاں سے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں انکار کروں گا۔ خانم ٹھیک کہتی ہے، وقت تو پھر اسی طرح گزرتا رہے گا اور مزید غفلت کی گئی تو اور دور چلا جائے گا۔ وقت کسی کی نہیں سنتا، اسے اپنی رفتار سے غرض ہے۔ آگے سفر میں کوئی مدت طے نہیں ہے۔ کچھ بھروسا نہیں کہ کہاں کس جگہ کوئی نواب ثروت... یا سید محمود علی راہ میں مزاحم ہو جائے۔ مجھے اپنا یقین استوار رکھنا چاہیے کہ کتنی ہی دیر ہو جائے، وہ میرا انتظار کرے گی۔ مولوی صاحب اسے مجھ سے دور رکھنے کے کتنے ہی جتن کریں، انہیں مایوسی ہوگی۔ اس کی آس نہیں ٹوٹے گی۔ میری امید قائم ہے تو اس کی بھی یقیناً قائم ہوگی۔ میرا دل یہی کہتا ہے۔ مولوی صاحب کیا جانیں، میرا اس سے کیا تعلق ہے۔ میں نے اس کے لیے گھر چھوڑ دیا ہے۔ مولوی صاحب خود گواہ ہیں، میں نے اس کے لیے دو آدمیوں کا خون کر دیا تھا اور سات سال جیل میں گزارے تھے۔ میں تو ابھی تک کسی زنداں میں ہوں اور اندھیری رات میں بدھ گیا ہے۔ اپنے اتالیق اور واحد سرپرست کے قتل کے بعد جان بچا کے جب میرے گھر آئی تھی تو یوں ہی نہیں آگئی تھی، کسی اعتماد میں اس نے میرے گھر کا رخ کیا تھا۔ اپنے مشفق اتالیق کی موت کے بعد اسے حوصلہ ہار دینا چاہیے تھا لیکن کوئی یقین ہی اس کی توانائی کا باعث تھا۔ اسے معلوم تھا، وہ اب اکیلی نہیں ہے۔ کوئی اور بھی ہے جو اس کے لیے بازو پھیلائے کھڑا ہے۔ وہ بھی کچھ طے کر کے آئی تھی۔ وہ خود کو ترک کر کے آئی تھی اور اس نے خود کو میرے سپرد کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کیا جانیں، ہم دونوں ایک دوسرے کی امانت ہیں۔ دو آدمی ایک نہیں ہو سکتے لیکن ایک اگر دوسرے کے لیے خود کو ترک کر دے، صدق طلب ہو تو ترک بھی حصول مراد کا ایک قرینہ ہے۔ مولوی صاحب بہت عالم آدمی ہیں مگر اس رمز و عیاں سے نا آشنا ہیں۔ کب تک وہ حجت کرتے رہیں گے۔ ایک دن وہ قائل ہو جائیں گے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں تو یک جائی کے بغیر دونوں ہی ادھورے، دونوں ہی معطل ہیں۔ وہ تو میرا وجود ہے اور میں تو اس کا وجود ہوں۔

مجھے ایک بار نگریا سادات میں حافظ عبدالخالق کے پاس اور جانا چاہیے۔ فیض آباد سے نگریا سادات اتنی دور نہیں ہے۔ ممکن ہے، اس دوران میں مولوی صاحب نے اپنے دوست حافظ صاحب سے رابطہ کیا ہو یا حافظ صاحب کو ان کے موجودہ ٹھکانے کا کچھ علم ہوا ہو۔ حافظ عبدالخالق نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور وہ ایسے آدمی نہیں ہیں، اپنی بات کا پاس کریں گے، نہیں کریں گے تو انہوں نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ ہمیں دوسرے انداز سے بھی بات کرنا خوب آتا ہے۔ وہ رات انہیں یاد ہوگی جب بجھل نے اپنے اور میرے ہاتھ کی کلائیوں پر چاقو سے لکیر کھینچ دی تھیں۔ یہ لکیریں میری کلائی پر ابھی تک کندہ ہے۔

مجھے نیند نہیں آئی لیکن کسی عزم کی طمانیت سے جسم ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے طے کیا کہ کل پہلے زریں سے پھر بجھل سے بات کروں گا۔ زریں کے لیے اس حویلی کو خیرباد کہنا آسان نہیں ہوگا۔ مجھے اس سے عارضی طور پر بمبئی چلنے کی بات کرنی چاہیے۔ مستقل کی بات ہی نہیں کروں گا۔ بمبئی جا کے دیکھا جائے گا۔ وہاں سے فوراً واپس آنے کو خود اس کا جی نہیں چاہے گا اور اسے آنے کون دے گا۔ جس طرح وہ بجھل کی چہیتی ہے، اسی طرح ابا جان کی، منیر علی کی۔ وہاں فرخ، فریال، فارہہ اسے پلکوں پہ بٹھائیں گی۔ وہاں [illegible] ہے اور اس کی نہایت خوش نہاد ماں اور شہ پارہ ہے جو [illegible] ہے۔ وہاں اس کی ملاقات رما سے ہوگی۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ بمبئی میں سمندر ہے اور بہت روشنیاں ہیں، کشادہ سڑکیں، اونچی عمارتیں، باغات۔ وہاں فیض آباد جیسی چار دیواریاں ہیں، ایسے گھر نہیں ہیں زنداں کے مانند۔ فیض آباد تو بوڑھے گھروں کا شہر ہے۔

جانے کس وقت میری آنکھوں میں نیند اتر آئی۔

○☆○

صبح ناشتے کے بعد حسب معمول بجھل اڈے چلا گیا۔ میں نے اسے نہیں ٹوکا کہ اب تو ہرا اور بچھو کا تیجا بھی ہو چکا ہے اور اڈے کے لوگوں نے سرگزشتی نوشتہ دیوار مجھے قبول کر لی ہے تو اب وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بجھل کے چلے جانے پر میں لائبریری کی طرف نکل آیا۔ اس بار کتابوں میں میرا جی نہیں لگا تاہم دیر تک مختلف کتابوں کے ابتدائی صفحات پڑھ کے انہیں واپس ان کی جگہ رکھتا رہا۔ دوپہر کے کھانے پر سب کے ساتھ زریں بھی موجود تھی۔ کھانے کے لیے وہ میٹھے چاولوں کی قاب رکھنے میرے قریب آئی تو سرگوشی میں اتنا کہنے کا موقع مل گیا کہ مجھے اس سے کچھ بات کرنی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے چونکی، پٹ پٹاتی پلکوں سے اس نے میری جانب دیکھا اور اس کے چہرے کی سرخی ہوئی پھر وہ سنبھل گئی۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

اس کے کمرے میں جا سکتا تھا یا اسے اپنے کمرے میں آنے کے لیے کہہ سکتا تھا لیکن کوئی بھی کسی وقت دخل انداز ہو سکتا تھا۔ دن میں متعدد بار میرا اس کا آمنا سامنا ہوتا تھا لیکن اب تک خلوت میں بات کرنے کی کوئی صورت نہیں بنی تھی۔ مجھے اس سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ کچھ اطمینان بھی تھا کہ ابھی تو دنوں تک یہاں رہنا ہے یا پھر کچھ ایسا تھا کہ میں خود ہی گریزاں تھا۔ اس کے سامنے جاتے ہوئے کوئی جھجک ہوتی تھی، کسی پشیمانی کا احساس غالب تھا۔ اس کے کسی تکدر کا خوف لاحق تھا یا اس کے ایسے سوالوں کا اندیشہ جن کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ غالباً کوئی ایسی ہی بات تھی یا پھر میری خواہش تھی کہ وہ خود کسی وقت موقع نکال کے میرے پاس آئے۔ مجھے خود نہیں معلوم، یہ کیا تھا یا کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا، نہ میرے پاس۔ اعتبار کرتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ میرے سینے میں اس کا کیا مرتبہ ہے، وہ مجھے کس قدر عزیز ہے، حویلی میں سب سے زیادہ، اپنے چھوٹے بھائی جہاں گیر سے بھی زیادہ اور یہ حقیقت بھی مجھ پر روشن تھی کہ وہ بہرحال میری بامرادی، کامرانی کی جویا رہتی ہے۔ میری نسبت، بے شمار آرزوئیں اس کے نہاں خانے میں موجزن ہیں۔ اسے تو میری خوشنودی سے سروکار ہے۔

بجھل رات کو دیر سے واپس آیا۔ اس کے انتظار میں کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے بعد سب بیٹھک میں جمع ہو گئے۔ بجھل پر گزشتہ رات خانم کی آئینہ نمائی کی گرانی تھی یا وہ اڈے سے کوئی بوجھ لے کر آیا تھا کہ جلدی اٹھ گیا۔ محفل اس کی وجہ سے جمی ہوئی تھی پھر یکے بعد دیگرے سبھی اٹھ گئے۔ میں نے زریں کی طرف استفہامی نظروں سے دیکھا تھا، جواب میں اس نے آنکھیں میچ لیں۔ میں نے اسے کسی اشارے پر محمول کیا اور تحمل کی تلقین کے سوا کچھ اور قیاس نہ کر سکا۔ خانم اس کے پہلو میں کھڑی تھی اور کوئی صراحت ممکن نہ تھی۔ ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں اپنے کمرے کے باہر بے ارادہ ٹہلتا رہا۔ نیساں نے سر کی مالش کرنے اور جہاں گیر نے شطرنج کی ایک بازی کھیلنے کی پیش کش کی۔ میری ناآمادگی پر دونوں بجھ سے گئے اور مجھے اپنی اس کج ادائی پر ملال بھی ہوا لیکن میں انہیں منع کر چکا تھا۔ میں کمرے میں چلا آیا۔ چاندنی اور رات کی رانی کی خوشبو ہر جانب بکھری ہوئی تھی۔ چاند اتنا نزدیک نظر آ رہا تھا جیسے حویلی کے آنگن میں اترنا چاہتا ہو، اس کے اطراف ستاروں کا جھرمٹ! لگتا تھا جیسے آسمان میں موتی ٹنکے ہوں۔ اتنے چھوٹے چھوٹے تاروں کے درمیان اتنا بڑا چاند، خصوصاً چودھویں کا چاند کچھ بے ہنگم سا معلوم ہوتا ہے۔ یا تو چاند کچھ چھوٹا ہوتا یا تارے کچھ بڑے ہوتے تو تناسب کی یہ کمی محسوس نہ ہوتی۔ لوگ کہتے ہیں، چاندنی ہمیشہ پرسکون ہوتی ہے، نرم نرم، نازک نازک، دھیمی دھیمی، ہلکی ہلکی، شرمائی، لجائی سی، بالکل دھوپ کی ضد۔ میں تو کہتا ہوں، چاندنی میں کوئی اداسی چھپی ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد میرا تو جی ڈولنے لگتا تھا۔ میں جلد ہی اپنے کمرے میں آ گیا مگر میں نے دروازہ کھلا اور کمرا روشن رکھا۔ مجھے شبہ تھا، زریں آ سکتی ہے یا نہ بھی آئے۔ کیوں نہ میں ہی اس کے کمرے کا رخ کروں پھر ایک اور خیال نے مجھے آزردہ کیا۔ وہ یہاں آئے یا میں اس کے پاس جاؤں، دونوں صورتوں میں اس طرح رات کو چوری چھپے اس کا آنا یا میرا اس کی طرف جانا نامناسب لگتا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو جانے کیسے کیسے گمان اس سادہ شعار کے دل میں نمو پائیں۔ بہتر یہی ہے کہ کل دن میں کسی وقت زریں کو لائبریری میں آنے کے لیے کہوں۔ وہاں خاصا سکون ہوتا ہے۔ زریں ایک ہوش مند لڑکی ہے۔ وہ خود بھی احتیاط کرے گی، البتہ وہ فکر مند خاصی ہوگی، آخر وہ کون سی بات ہے جس کی مخاطب صرف وہی ہے۔ جانے کیوں دیر تک اس کی آمد کا ایک موہوم سا امکان بھی میرے دماغ سے چمٹا رہا اور آخر طرح طرح کی تاویلیں اس امکان یا خواہش یا امید پر غالب آ گئیں اور یوں مجھے کچھ قرار آ گیا۔ بے بسی بھی ایک طرح کا قرار ہے۔ میں نے بستر سے اٹھ کے دروازہ بند کیا اور آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر نیند تو اپنی مرضی سے آتی ہے۔ بستر کے سرہانے رکھی ہوئی چھوٹی الماری میں سجے ہوئے رسالے اٹھا کے میں نے پڑھنے شروع کیے۔ سنا تھا، مطالعہ بھی لوری کا کام دیتا ہے۔ یہ کلیہ بھی فضول ثابت ہوا۔ سارا اول و آخر دماغ ہی ہے۔ آنکھ کے کسی ایک جگہ مرکوز ہونے سے بصارت مراد نہیں ہے۔ کسی بلند صدا کی رسائی تبھی ممکن ہے جب دماغ متوجہ ہو یا پھر آواز اتنی سحر انگیز، اتنی توانا اور منظر ایسا نادر یا حیران کن ہو کہ دماغ کو اپنی جانب کھینچ لے۔ لوگ دلکش تو کہتے ہیں، دماغ کش کیوں نہیں کہتے۔ میں ایک کے بعد ایک رسالہ الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا اور کسی جگہ نظر ٹھہرتی ہی نہ تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ پر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ چند لمحے اسی تذبذب میں گزرے کہ باہر جا کے دیکھوں۔ یکایک دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور میں اچھل سا پڑا۔ دروازہ بند تھا لیکن چٹخنی لگی ہوئی نہیں تھی۔ بستر سے اٹھ کے میں نے جلدی جلدی چپل پہنی اور لپک کے دروازے کا رخ کیا۔ مجھے

یقین تھا' وہ ذریں ہوگی' اور اسے اپنے سامنے دیکھ کے مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی ملکہ یا شہزادی کے مانند دروازے کے پار کھڑی تھی۔ سرتاپا نیلگوں لباس' نیلے دوپٹے میں اس کا گلابی' شہابی رنگ دمک رہا تھا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں بت بنا اسے دیکھ گیا۔

"سو تو نہیں گئے۔" وہ مترنم آواز میں دھیرے سے بولی۔

"نہیں نہیں' ابھی کہاں' آؤ آؤ اندر آؤ۔" میں نے بے ربطی سے کہا اور اسے اندر آنے کی جگہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گیا "میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود ہی تمہاری طرف۔۔۔" میری آواز بھٹک رہی تھی۔

وہ آہستہ قدموں سے اندر آئی "میں نے آج آنے کو کب کہا تھا۔" وہ کھنکتی آواز میں بولی۔

"نہیں کہا تھا مگر مجھے تمہارا انتظار تھا۔" میں نے کرسی کھینچ کے مسہری کے سامنے کر دی "اچھا ہوا' تم آگئیں۔"

"میں کہیں باہر سے نہیں آئی ہوں۔" اس نے شگفتگی سے کہا۔

"معلوم ہے' یہیں سے آئی ہو لیکن فاصلے مقامات ہی سے طے نہیں ہوتے۔"

اس نے نگاہیں اٹھائی تھیں کہ پھر جھکا لیں۔

"اتنے دن ہوگئے' تم سے کوئی بات ہی نہیں ہو پائی۔" میں نے اندتی آواز میں کہا۔

"میں تو ہر وقت موجود تھی۔"

"لیکن' لیکن اور لوگ بھی تو تھے۔"

"کوئی ایسی بات تھی کیا؟" اس کی آنکھیں جگنو کی طرح جلنے بجھنے لگیں۔

"نہیں' ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے شانے اچکا کے کہا "بس یوں ہی' تم سے پوچھنا تھا' اتنے دن تم کیسی رہیں۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ تم' تمہاری باتیں' تمہاری اپنی باتیں' بس یہی کچھ۔۔۔۔"

"میں نے بہت اچھا وقت گزارا۔" اس کی سادگی میں ایک عجب تیکھا پن تھا "یہاں کسی چیز کی کمی نہیں' اور کیا چاہیے۔"

"پھر بھی' لیکن ٹھیک ہے' تم ایسے کیوں کچھ کہو گی۔"

"کچھ ہو تو بتایا جائے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "تم کیا محسوس کرتے ہو؟"

"بظاہر تو واقعی کچھ نہیں ہے۔ میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر۔۔۔" مجھ سے کچھ کہا نہ جاسکا۔

"مگر کیا؟" وہ تجسس سے بولی۔

"مگر کچھ نہیں۔ مجھے تو یہ سب دیکھ کے رشک آتا ہے اور سچ تو یہ ہے' ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ نظر کا میں قائل نہیں لیکن کچھ بھی اچانک ہو جاتا ہے۔ میرا تو اب اعتبار ہی اٹھتا جا رہا ہے۔ سفر میں ایسے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ کیا بتاؤں' آدمی کے بہت روپ دیکھے ہیں۔ گرگٹ تو لوگ کہتے ہیں' یہ آدمی تو پل پل میں رنگ بدلتا ہے۔"

"کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔"

"ہاں' نئی تو نہیں مگر ہر بار دکھ پہنچاتی ہے۔"

"زیادہ توقع ہی نہ کی جائے۔" اس کی آواز کھو سی گئی۔

"یہ بھی آسان کام نہیں' واسطہ تو صبح و شام انہی انسانوں سے پڑتا ہے' طرح طرح کے لوگوں سے اور بار بار چوک ہو جاتی ہے۔"

"مگر دنیا ایسی بری بھی نہیں ہے۔"

"ہاں' کہتے ہیں کہ ابھی پھول کھلنے بند نہیں ہوئے۔ صبح ہوتی ہے اور روز سورج نکلتا ہے' خزاں کے بعد بہار بھی آتی ہے۔" میں نے خود کو روکا' کہیں میں اول فول تو نہیں بک رہا ہوں۔ میں نے منتشر لہجے میں کہا "میری مراد ہے' بے شک ابھی سارے لوگ خراب نہیں ہوئے اور جو کہا جاتا ہے' یہ دنیا انہی کے دم سے جاری ہے اور' اور ان میں سے ایک تم بھی ہو۔ کبھی میں سوچتا ہوں' تم کیا ہو۔"

"کیوں؟" کرسی پر اس کا سراپا متلاطم سا ہو گیا "میں کیا ہوں؟"

"تم ایک مثال ہو۔"

"یہی کچھ کہنے کے لیے تم نے مجھے بلایا ہے؟" اس نے سر جھکا اور آنکھیں بند کر لیں' پھر کسی قدر کترا کے بولی "خدا کے لیے کوئی اور بات کرو' ایسا مت کہو۔"

"ٹھیک ہے' نہیں کہتا مگر ہے تو یہ ایک واقعہ۔ تم نے تو ایک اور بات ثابت کی ہے۔ میں دیکھتا ہوں' تم کیسی حاکم ہو' بے تاج' بے تخت کی حاکم' کسی جگہ کبھی پڑھا تھا' سب سے بڑا حاکم اعلا اوصاف والا ہوتا ہے۔ اس حاکم سے بڑا جو تخت نشین ہوتا ہے اور حکم صادر کرتا رہتا ہے مگر جس کے ہاں مسلسل انکسار' مسلسل ایثار ہے' اس پر لوگ دیوانہ وار نثار ہوتے ہیں۔ یہاں سبھی دل و جان سے تمہاری عزت کرتے ہیں۔ یہ مرتبہ تمہیں یونہی حاصل نہیں ہوا۔ یہ تمہیں وراثت' کسی حادثے اور زور و زر سے نہیں' یہ تمہارے کمال سلوک سے ملا ہے۔ حاکمیت کا یہ پہلو بھی خوب ہے۔" وہ سر جھکائے انگلیوں میں آنچل مروڑ رہی

میں نے بے ترتیبی سے پوچھا "کیوں' کیا میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں؟"

"کیا کہوں۔" اس کی آنکھوں میں شوخی بھر گئی "معلوم ہوتا ہے' گزشتہ سفر میں زور بیاں کی اچھی مشق کی ہے۔"

"تم اسے کچھ بھی کہو' لیکن میں جانتا ہوں' میں مطمئن ہوں کہ میں سچ بول رہا ہوں۔"

"تمہیں جھوٹ بولنا آتا بھی نہیں۔ تم شاید بول بھی نہیں سکتے۔" اس کے لہجے میں تصنع کی رمق نہیں تھی' کہنے لگی "لیکن لازم نہیں' تمہارے اندازے اور قیاس اور تمہاری تعبیریں درست بھی ہوں۔"

"میرا سوچا ہوا غلط ہو سکتا ہے مگر میرا دیکھا ہوا تو۔۔۔"

"اب جانے بھی دو۔" اس نے مجھے بات پوری نہیں کرنے دی اور چہکتی آواز میں بولی "تم اپنی کہو' یہ بتاؤ' سفر کیسا رہا؟ اب کے تو بہت دن ہوگئے۔"

"ہاں' دن تو بہت ہوگئے' لمبی روداد ہے۔" میری آواز میں بشاشت عود کر آئی "لیکن ایک بات کہوں' ہم بھی تم سے غافل نہیں رہے۔ نہ میں' نہ جھمل بھائی۔ تم ہمیں یاد آتی رہیں' بہت یاد آتی رہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس کے رخساروں پر شفق چھا گئی۔ "خبر ہے' آس سول میں جھمل بھائی آگے سفر کے لیے تیار تھے۔ میں نے ضد کی کہ اب فیض آباد چلو' زری کیا کہتی ہوگی' بہت مشکل سے وہ آمادہ ہوئے۔"

"بابا بتا رہے تھے۔" اس کی آواز لہرانے لگی اور ایک مختصر توقف کے بعد وہ کسی قدر ناز سے بولی "ہو سکے تو تفصیل سے بتاؤ' کہاں کہاں جانا ہوا اور کس حد تک۔۔۔؟" وہ شاید مولوی صاحب کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی کہ میرے آبگینے کے زبان سے رک گئی اور جھجک کے کہنے لگی "اتنے عرصے میں تو بہت دنیا گھوم لی ہوگی؟"

"کہاں' یہ دنیا بہت بڑی ہے پھر بھی بس گھومتے رہے۔ آج یہاں' کل وہاں' صبح کہیں' شام کہیں۔ اب تو شہروں' بستیوں کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ تفصیل سے بتانا شروع کیا تو صبح ہو جائے گی۔"

"پھر کیا ہوا؟ رات اپنی ہے۔"

"رات تو اپنی ہے مگر اسے کیوں اذیت سے دوچار کیا جائے۔"

"میں جاننا چاہتی ہوں۔" وہ بے کلی سے بولی۔

اس کے اصرار پر میں نے شکستہ آواز میں کہا "کیا کرو گی

"میں نے آگے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اس نے مجھے روک دیا "کہو تو چائے یا قہوہ بنا کے لے آؤں؟ کسی اور چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ' خشک میوہ یا گلوری وغیرہ۔۔۔۔؟"

"کسی چیز کی خواہش نہیں۔ بس تم یہیں بیٹھی رہو' ایسے ہی۔"

وہ ہمہ تن گوش تھی۔ مجھے بیتا ہوا دہرانے سے الجھن ہوتی تھی لیکن اس کے اضطراب آمیز اشتیاق سے مجھے پسپا ہونا پڑا۔ گزرا ہوا' بکھرا ہوا حال سمیٹنے میں' میں نے کچھ تامل کیا۔ وہ بہت بے تابی تھی۔ مجھے گم دیکھ کے بچوں کے سے انداز میں اس نے مجھے ٹوکا "کہاں کھو گئے؟"

"کہیں نہیں۔" میں نے چونک کے کہا "سوچتا ہوں' کہاں سے شروع کروں۔"

"میں بتاؤں۔" وہ ہمک کے بولی "یہاں سے بمبئی جاتے ہوئے تم ایک پہر کے لیے مراد آباد ٹھہر گئے تھے۔ وہاں سے حیدر آباد چلے گئے۔ ظاہر ہے' مراد آباد سے بمبئی جانے کے بجائے حیدر آباد کا سفر کرنے کی کوئی بڑی وجہ ہی ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو اب پرانی بات ہوگئی۔"

"میرے لیے سب کچھ نیا ہوگا۔ کچھ کچھ مجھے معلوم ہے اور کچھ اندازہ ہے لیکن تمہاری زبانی تو۔۔۔" وہ تجسس سے بولی "وہ اصل بھی ہوگا اور نیا بھی' اور مجھے معلوم ہی کتنا ہے۔"

ابتدا میں میری زبان اٹک رہی تھی کہ کیا بتاؤں' کیا نہیں لیکن سننے والے کا انہماک کہنے والے کے لیے ترغیب کا درجہ رکھتا ہے۔ بعد میں خود مجھ پر منکشف ہوا کہ اپنے حبس سے نجات پانے کے لیے مجھے اس جیسے کسی سامع کی ضرورت تھی۔ دردمند سامع بھی کسی مسیحا کے مانند ہوتا ہے۔ زورِ کلام' شوقِ سماعت سے مشروط ہے۔ آنسو' آنکھیں ہلکی کر دیتے ہیں اور سینہ ہلکا کر دیتے ہیں کیونکہ آنسوؤں کا منبع تو سینہ ہوتا ہے۔ سینے میں یہ آگ سی بھڑکائے رہتے ہیں۔

اس کے چہرے پر اس کے نہاں خانے کا ہیجان صاف نمایاں تھا۔ کسی میں شمولیت کے بغیر یہ اضطراب ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے کہا "یہاں سے بمبئی ہی جانے کا ارادہ تھا مگر مراد آباد راستے میں پڑتا تھا۔ میں نے سوچا' یہاں سے گزر رہے ہیں تو کیوں نہ شہر جا کے ایک بار اور مولوی صاحب کے بارے میں پوچھ آئیں۔ پھر نہ معلوم کب اس طرف آنا ہو۔ راستہ کھوٹا کرنے کا نتیجہ کچھ بہتر ہی نکلا۔ معلوم ہوا' مولوی صاحب اس دوران مراد آباد آئے تھے۔ مسافر خانے کے روزنامچے میں ان کا پتہ درج تھا۔ میری التجا پر پیرو بھائی بمبئی

جانے کے بجائے حیدر آباد چلنے پر آمادہ ہوگئے۔ گو ابا جان کو
جلد سے جلد بمبئی پہنچنے اور اپنے بیٹے اور بیٹیوں سے ملنے کی
بڑی بے چینی تھی لیکن وہ بھی تیار ہوگئے۔"

دلی کے بعد میں نے ریل میں کلکتہ جیل کے جیلر صاحب
کی لڑکی سونیا کے واقعے سے اجتناب کیا۔ زریں شاید اس
سانحے کی متحمل نہ ہوتی یا شاید مجھ میں اس کے اعادہ بیان کی
ہمت نہیں تھی۔ میں نے اسے بتایا "حیدر آباد میں ابا جان کو
ہوٹل میں ٹھہرا کے میں نے اور پیرو بھائی نے اس پتے پر پہنچنے
میں کوئی تاخیر نہیں کی جو ہمیں مراد آباد کے مسافر خانے کے
روزنامچے سے ملا تھا۔ وہ ایک مہذب نواب ثروت یار کی عالی
شان کوٹھی تھی۔ بہت زیب و زینت تھی اس کی مگر مولوی
صاحب کچھ عرصے پہلے وہاں سے جا چکے تھے۔ نواب نے بتایا
کہ وہ جلد ہی واپس آنے کا کہہ گئے تھے لیکن جانے کیوں، آئے
نہیں۔ ہم نے نواب سے کہا تھا کہ مولوی صاحب کی کوئی
امانت لوٹانے کے لیے ہمیں ان کی تلاش ہے۔ کیا ہی
مناسب ہو، مولوی صاحب آجائیں تو انہیں ہماری یہاں آمد
کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے اور ہمیں بمبئی مطلع کردیا
جائے۔ ہم خود مولوی صاحب کے روبہ رو حاضر ہوکے ان کا
تکدر دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ نواب سے وعدہ لے
کے ہم رخصت ہوگئے۔ حیدر آباد میں اب ہمارا کوئی کام نہیں
رہا تھا لیکن ایک مقام پر اچانک کچھ لوگ ہمارے آڑے
آگئے۔ تلخ کلامی سے بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ نتیجے میں
پولیس آگئی اور ہمیں حوالات میں بند کردیا گیا۔

"کیا؟" زریں کی آنکھیں پھیل گئیں "اس طرح کیسے؟
یہ تو بڑی زیادتی ہے۔"

"ہاں، ان کا ہمارے راستے میں مزاحم ہونا دانستہ تھا۔
ان کا مقصد ہمیں کسی طور حوالات پہنچانا تھا۔ یہ سازش کا
حصہ تھا۔ اتفاق سے حوالات میں تھانے دار کے ایک ملاقاتی
کو حوالات میں داد فریاد کرتے ہوئے ہم دو ستم زدگاں پر ترس
آگیا۔ وہ صاحب ہم اجنبیوں کی ضمانت لینے کی سخاوت پر اتر
آئے۔ ہم ان کے ممنون احسان تھے۔ جب انہوں نے ہماری
تواضع کے لیے اپنے گھر چلنے کی درخواست کی تو ظاہر ہے، ہم
منع نہ کرسکے۔ ہمارے سان و گمان میں نہیں تھا کہ یہ کوئی
اتفاق نہیں ہے۔ اس شخص نے ایک بہت بڑے نواب،
جہاں تاب کی عظیم الشان حویلی میں لے جاکے ہمیں نواب
صاحب کے سامنے پیش کردیا۔ نواب نے ہمیں خانم آپی کے
کوائف بتانے کے لیے مجبور کیا۔ ہمارے انکار پر ہمیں حویلی
کے ایک کمرے میں محبوس کردیا گیا۔ پہرے دار بٹھا دیے
گئے۔ ہم نواب کو خانم آپی کے بارے میں کیسے کچھ بتا سکتے
تھے۔ اس کے چھوٹے بھائی نواب عالم تاب کو خانم آپی کی
حیدر آباد سے ہجرت، ان کی جدائی بہت شاق گزری تھی۔
بہت عرصے سے وہ بستر نشیں تھا، مگر کیا۔" میں نے رک کے
زریں سے پوچھا "تمہیں آپی نے کچھ نہیں بتایا؟"

"کسی قدر۔ میں نے خود تفصیل میں جانا مناسب نہیں
سمجھا، کچھ اندازہ ہوگیا تھا کہ آپی کے لیے یہ ذکر تکلیف دہ
ہوسکتا ہے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"بس، ہم اپنے طور پر وہاں سے رہائی کے لیے ہاتھ پاؤں
مارتے رہے۔ پہرا سخت تھا۔ ایک روز نواب عالم تاب کی
بیگم اور بہن جرات کرکے، حویلی کے آداب بالائے طاق رکھ
کے، خادموں کو کسی طرح رام کرکے چھپتی چھپاتی ہم تک پہنچ
گئیں۔ وہ نہایت شائستہ، نفیس طبع اور نازک اندام خواتین
تھیں۔ انہوں نے بہت عاجزی کی، بڑی منتیں کیں، ایک نے
اپنے شوہر، دوسری نے اپنے بھائی کی زندگی کی بھیک مانگی، خدا
کے واسطے دیے۔ کہنے لگیں کہ خانم ہی ان کے جاں بلب
شوہر اور بھائی کا مداوا ہیں۔ ہم ان کے حال پر رحم کریں۔ ان
کی آہ و زاری نے ہمیں بہت آزردہ کیا۔ ہم نے ان سے کہا
کہ یہاں سے آزاد ہونے کے بعد ہی ہم کچھ کرسکتے ہیں۔ پہلے
تو ہمیں خانم سے بات کرنی ہوگی۔ یوں ہم خانم کا پتہ نہیں بتا
سکے۔ اس قید و بند میں کئی روز گزر گئے۔ نواب طرح طرح
سے ہم پر زور ڈالتا، ہمارا حوصلہ آزماتا رہا۔ پھر ایک دن ہمارے
ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ ہم نے بڑے نواب سے ملنے کی
خواہش ظاہر کی۔ گویا پہرے داروں کو سپر ڈالنے کا تاثر دیا۔
نواب کے پاس جاکے ہم نے تخلیے کا مطالبہ کیا۔ وہ بمشکل
راضی ہوا۔ تخلیہ ہوتے ہی، پیرو بھائی نے بہ عجلت اسے قابو
میں کیا اور باہر سے پہرے دار آیا تو میں نے اسے۔ اس کی
بندوق کے ساتھ نواب کو اپنے حصار میں لیے اس کی موٹر
میں ہم حویلی سے دور ہوتے گئے اور ایک محفوظ جگہ پہنچ کے
ہم نے نواب سے ہاتھ اٹھالیا اور موٹر سے اتر گئے۔"

میں نے زریں کو نہیں بتایا کہ اس کے بعد ہوٹل میں
منتظر ابا جان کے پاس جانے کے بجائے پیرو نے وہاں
سیدھے بازار کے اڈے کا رخ کیا اور مجھے اڈے کی
جھٹل کو بیٹھا دیکھ کے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔
یقین تھا کہ اتنے دنوں میں جھٹل کو ہماری خیر خبر لینے
آباد سے حیدر آباد آجانا چاہیے اور حیدر آباد کے اڈے
ہونا چاہیے۔ زریں نے بھی کوئی کرید نہیں کی۔ میں

"ادھر ابا جان شدت سے ہمارا انتظار کررہے تھے۔

اس طرح غائب ہوجانے سے ان کی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا
ہے۔ زورا، شامو، منگو اور مارنی وغیرہ ہمیں گلی گلی ڈھونڈتے
رہے۔ ابا جان نے حیدر آباد میں ایک اجنبی شہر میں اپنے اثر
و رسوخ کے لیے ایک بڑے نواب، نواب حشمت جنگ تک
رسائی حاصل کی اور اسے ایک بیش قیمت ہیرا نذر کیا۔
نواب جوہر شناس و جواہر شناس تھا، ہیرا دیکھ کے وہ ششدر
رہ گیا۔ ابا جان نے حیدر آباد میں مستقل سکونت کے لیے کوئی
معقول حویلی خریدنے میں نواب سے اعانت کی درخواست
کی۔ دوسری طرف انہوں نے جھٹل بھائی کو فوراً حیدر آباد
طلب کرلیا۔ جھٹل بھائی نے حیدر آباد آکے پہلے ہمارے
غائب ہونے کی وجوہ جاننے کی کوشش کی اور سرا ملتے ہی
نواب جہاں تاب کے پاس پہنچے۔ نواب اپنے زنداں میں
ہماری موجودگی کے سلسلے میں کیوں کچھ قبول کرکے دیتا تاہم
اس نے خانم آپی کی موجودہ سکونت جاننے والے ایک اور
شخص کی آمد غنیمت جانی۔ اسے جھٹل بھائی کو زنداں میں
ڈالنے کی جرات نہیں ہوئی۔ اس مرتبہ اس نے عاجزی
اختیار کی اور اپنے عزیز بھائی کی شکستہ حالت کے بارے میں
جھٹل بھائی کو قائل کرلیا۔ جھٹل بھائی بھی یقیناً اس نتیجے پر
پہنچے کہ نواب عالم تاب کی ڈوبتی زندگی کو خانم آپی کی
آمد سے شاید کوئی کنارہ مل جائے، شاید کوئی معجزہ ہوجائے۔
جھٹل بھائی نے خانم آپی کو حیدر آباد بلانے کا وعدہ کیا اور
چلتے چلتے نواب کو یہ انتباہ بھی کیا کہ ان کے دو آدمیوں کو کوئی
گزند نہیں پہنچنا چاہیے ورنہ۔۔۔ جیسے ہی خانم آپی حیدر آباد
آئیں، انہیں ساتھ لے کے وہ نواب کی حویلی جا پہنچے مگر اس
سے پہلے ہم آزاد ہوچکے تھے۔ نواب کو جھٹل بھائی سے اس
فیاضانہ سلوک کی توقع ہرگز نہ ہوگی۔ جھٹل بھائی نے خانم
آپی کی حیدر آباد آمد ہماری رہائی سے مشروط نہیں کی تھی۔
انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا پھر تو نواب کے تیور ہی بدل گئے۔ وہ
ایسا نادم ہوا کہ ہر دم، ہر آن شکر گزاری کے موقع ڈھونڈتا
رہتا۔ خانم آپی کی آمد کو دیر ہوگئی تھی مگر اتنا بے شک ہوا کہ
نواب کو طویل جاں کنی سے نجات مل گئی۔ اس کی سانسیں
خانم آپی کے لیے اٹکی ہوئی تھیں۔ اپنے سرہانے خانم آپی کو
دیکھ کے پھر اس کا کوئی مدعا نہ رہا۔"

میں نے زریں کا چہرہ دیکھا۔ وہ بت بنی ہوئی تھی "سن
رہی ہو؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"ہاں، ہاں۔" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی "نواب عالم
تاب کو بس خانم آپی کا انتظار تھا مگر کیا خانم آپی کو نواب کے
اس۔۔۔" وہ جیسے لفظ ڈھونڈنے لگی "خانم آپی کو نواب
صاحب کے اس التفات، ان احساسات کا پہلے سے کوئی
اندازہ نہیں تھا؟"

"ہوتا تو وہ حیدر آباد سے چلے آنے پر کیوں آمادہ
ہوتیں۔ نواب کو حیدر آباد سے ان کی ہجرت کی اطلاع ملی تو
اس نے نذرانے بھرے طشت کے ساتھ پیغام بھیجا تھا، خانم
آپی نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور جب ہم روانگی کے لیے ریل
گاڑی میں بیٹھ چکے تھے تو نواب عالم تاب نے اسٹیشن آکے
خانم آپی سے عرض گزاری تھی۔ اس کا جلتا ہوا چہرہ اور جلتی
ہوئی آنکھیں میں نہیں بھول سکا ہوں مگر خانم آپی نے کچھ
سوچ کے ہی اسے نامراد و ناشاد واپس کیا ہوگا۔ وہ ایک
متوازن خاتون ہیں۔ نوابوں کی اپنی ایک روایتی طرز زندگی
ہوتی ہے۔ آپی نے سوچا ہوگا، وہ کہاں، کس حد تک نواب
کے ماحول میں موزوں ہوسکتی ہیں۔ کچھ عرصے میں نواب کا
جوش و جذبہ سرد نہ پڑجائے۔ مال و زر والوں کو ایک گداز
اپنے مال و زر کا تو ہوتا ہی ہے۔ ان کی طبیعت میں قرار نہیں
ہوتا۔ مال و زر کی ارزانی انہیں کچھ نیا دیکھنے، نیا کرنے پر
اکساتی رہتی ہے۔ ممکن ہے، خانم آپی نے نواب کو شاید اتنا
محسوس نہ کیا ہو جتنا نواب نے انہیں کیا تھا یا شاید آپی کو اپنا
احوال، اپنی قلبی کیفیت منتقل کرنے کی کوتاہی نواب سے
ہوئی ہو۔ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک آدمی کسی کے بہت
قریب ہو اور کسی کو بہت عزیز سمجھتا ہو تو ضروری نہیں کہ
دوسرا بھی اسی نسبت سے یہ احساس قربت اخذ کرتا ہو، یا اس
کا عرفان رکھتا ہو یا جواب میں اسی شدومد سے تپاک کا اظہار
کرے۔ ٹھیک ہے نا؟" میں نے اسے گم صم دیکھ کے تذبذب
سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" زریں کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔

"اور یہ بھی ہوسکتا ہے، ایک کے جذبہ و احساس کے
یقین و اعتراف کے باوجود دوسرے کے اپنے تحفظات ہوں،
اس کا بھی اپنا ایک ارادہ، ایک اختیار ہوتا ہے۔"

زریں نے سر جھکالیا اور کسی قدر ناتواں آواز میں تائید
کی "ہاں، دوسرا بھی تو اپنا اختیار رکھتا ہے۔"

"میں کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے روانی میں کہا "دو
آدمیوں کی یکجائی کے لیے دونوں کی ایک دوسرے سے آگہی
اور آمادگی ضروری ہے۔ خانم آپی، نواب کی خاطر وہاں رک
جاتیں تو جہاں گیر سے محروم ہوجانے کا خدشہ انہیں لاحق
ہوگا۔ یوں سمجھو کہ جہاں گیر سے جدائی انہیں گوارا نہیں
ہوئی۔ دو راستوں میں سے ایک تو منتخب کرنا تھا۔"

"انہوں نے کیا نواب عالم تاب سے اس سلسلے میں کوئی

بات کی تھی؟" زریں متجسس لہجے میں بولی۔

"اس کا موقع نہیں ملا، شاید آپی جانتی ہوں گی کہ مغلوب نواب ان کی ہر بات تسلیم کرلے گا لیکن کتنے دنوں تک کوئی خوشگوار صورت حال جاری رہ سکتی ہے۔ نواب کے قول و قرار سے زیادہ خانم آپی کو اپنے اختیار میں ضمانت محسوس ہوتی ہوگی۔ کچھ ایسی ہی بات ہوگی۔"

"ہاں، ہوش مندی تو یہی تھی۔" زریں زیرلبی سے بولی "مگر سب کچھ ہوش ہی تو نہیں ہوتا۔"

میں اسے دیکھتا رہا اور مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جاسکا۔

"پھر نواب عالم تاب شاید زندہ رہتے۔" وہ اداسی سے بولی۔

"یہی کہا جاسکتا ہے کہ خانم آپی کو نواب کے تلاطم کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا، احساس میں نہیں کہہ رہا۔ وہ ایک حساس اور نرم و نازک خاتون ہیں۔ نواب کی موت کے بعد شاید انہوں نے اسے جانا یا پہچانا۔ کچھ بھی کہہ لو۔ نواب کے انتقال کے بعد عرصے تک اس کے سوگوار گھر میں ان کے قیام کی یہی وجہ ہوسکتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، نواب کی کم ہمتی اس کی لغزش تھی، اس نے پیروی کیوں نہیں کی، وہ اپنے گھر سے کیوں نہیں نکل گیا۔ اسٹیشن سے وہ گھر واپس کیوں چلا گیا؟ ایک آدمی تو بھی کسی کے لیے ساری دنیا سے بڑا ہوتا ہے، ساری دنیا ہوتا ہے۔ نواب کو معلوم نہیں تھا، ایک آدمی کے لیے بھی ساری زندگی ترک کرنی پڑتی ہے۔"

"اور انہوں نے ترک کردی۔" وہ یاسیت سے بولی۔

"یہ ترک سے زیادہ پسپائی ہے۔ وہ اسی پر کیوں مایوس ہوگیا۔"

"اور اگر پے روی کے بعد بھی یہی صورت ہوتی۔"

"ہوسکتا ہے، لیکن، لیکن۔" میں نے جز بز ہوکے کہا "بہرحال اس نے دستبرداری میں عجلت کی۔ اسے خاطر جمع رکھنی چاہیے تھی کہ اب نہیں تو کل، بعد میں آپی، جو اب تک نہیں جان سکی ہیں، جان لیں گی۔ یوں کسی دن وہ آپی پر اثر انداز بھی تو ہوسکتا تھا۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوتا؟ یہی حاصل رہتا؟"

"تو، تو۔" میری آواز بجھ گئی "ہاں تو پھر یہی ہوتا۔"

"ممکن ہے، نواب عالم تاب اسی نتیجے پر پہنچے ہوں کہ اب مزید عرض حال حجت کے مترادف ہے۔ پھر وہ کیا کرتے؟ منتیں تو نہیں کی جاسکتی تھیں، دہائیاں تو نہیں دی جاسکتی تھیں۔ خانم آپی کے ہاں انہوں نے کوئی گوشہ نہیں دیکھا تبھی پھر انہیں کیا کرنا چاہیے تھا؟ دوسرے آدمی پر تو بہت کچھ منحصر ہے۔ دوسرے آدمی میں اتنا سمندر نہ ہو یا وہ کسی اور منظر کے سحر میں ہو۔ دوسرے آدمی کا تمہارے بقول اپنا ارادہ، اپنے تحفظات، اپنے اندیشے اور اپنی ہوش مندی ہے۔ جستجو اور طلب بھی تو کسی کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ کوئی کسی کی شدید طلب کے باوجود اس سے محروم رہے تو دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو وہ اپنے مطلوب کی آس چھوڑ دے، اس سے کنارہ کش ہوجائے، اسے فراموش کرنے کی کوشش میں اپنے آپ پر قدرت حاصل کرلے۔ یہ ممکن نہ ہو تو مطلوب کی یاد، اس کا تصور ہی متاع جاں سمجھے، اسی پر قناعت کرے لیکن یاد سے تو طلب اور سوا ہوتی ہے۔ مرحوم نواب اپنی مراد بر آنے سے مایوس ہوگئے ہوں گے لیکن اپنے نقش مٹانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ وہ دست بردار کب ہوئے تھے۔ وہ تو اور وابستہ ہوگئے تھے۔ وہ ہوش مندی کی منزل سے دور جاچکے تھے، شاید بہت دور جاچکے تھے۔ ان کے بس میں کچھ نہیں رہ گیا ہوگا۔ کسی کے لیے یہ کیسا عذاب ہے کہ اتنی امنگوں، اتنی قربتوں کے بعد کوئی دوسرا اس کی جانب مائل نہ ہو۔ اور خطاکار کی بھی اپنی ایک انا ہوتی ہے اور انا سرکشی پر اکساتی ہے تو شکستہ بھی تو ہوتی ہے۔ آدمی پھر اپنے آپ کو تمام کرلیتا ہے۔ یہ تو بابا کی عنایت ہوئی۔ انہوں نے آپی کو وہاں پہنچانے کا وعدہ کرلیا اور نواب کو آخری لمحوں میں سکون کی سانسیں نصیب ہوگئیں۔"

میری حیران نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کے بیان میں بڑی اثر انگیزی تھی۔ زریں کی سوجھ بوجھ کا میں کیا، میں تو قائل تھا لیکن یہ نکتہ آفریں کلام، یہ شدت اظہار، یہ درد مندی اور دل سوزی۔ ان معاملات میں اس کی نظر اتنی گہری اور تیز ہے، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ لگتا تھا اس نے گزشتہ عرصے میں کثرت سے مطالعہ کیا ہے۔ مطالعے دریچے کھولتا، سمتیں روشن کرتا ہے۔ وہ چار دیواری میں مقید رہتی تھی، مگر کتابوں سے کچھ کم مشاہدہ نہیں ہوتا اور مشاہدے کے لیے جستجو اور فکر بھی تو لازم ہے۔ مجھے اس پر رشک آرہا تھا۔ مجھے رما یاد آئی، وہ بھی ایسی فکر آفریں باتیں کرتی تھی، اور ہاں، جولین بھی۔ اپنے چہرے پر میری جمی ہوئی نگاہوں سے وہ سمٹنے لگی اور کچھ شرما سی گئی۔ اس کا چہرہ لال ہوگیا "شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے بے قراری سے کہا "تم تو... تم تو... کمال ہے۔"

اس نے موضوع بدل دیا اور رک رک کے بولی "پھر کیا ہوا؟ نواب عالم تاب کے انتقال کے بعد...؟"

"پھر، پھر ہم کئی دن تک اس کے گھر مہمان رہے۔

نواب جہاں تاب نے ہمیں بہ اصرار روک لیا تھا پھر وہاں سے ہم نواب حشمت جنگ کے توسط سے ابا جان کی خریدی ہوئی حویلی میں منتقل ہوگئے۔ حویلی کیا تھی، کوئی محل تھا۔ نواب حشمت جنگ ابا جان کا والہ و شیدا ہوچکا تھا۔ اس نے لعل و جواہر کے دل دادہ اپنے ہم مشرب نوابوں کو ابا جان کے نذر کیے ہوئے ہیرے کا دیدار کرایا تو سبھی دنگ رہ گئے۔ طرح طرح کے امرا، رؤسا ابا جان کے پاس نوادر کی امید میں آئے اور کسی نے ابا جان کی معذرت قبول نہیں کی۔ ایک رات انہی میں سے ایک جنونی نے ابا جان کی نو خرید حویلی میں شب خون مارا، مسلح آدمیوں کا دستہ دیواریں پھاند کے اندر گھس آیا اور ہم سب کو گھیر لیا۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ہم اپنا جواہر کا خزانہ ان پر ظاہر کردیں، انہوں نے ہم سب کو ایک کمرے میں جمع کردیا اور بطور خاص ابا جان کو ہدف بنایا، جنگلی پن کی انتہا کردی۔ ہمارے سامنے ابا جان کو گالیاں بکیں، گریبان پر ہاتھ ڈالا، طمانچے، مکے، ضربیں، لباس تار تار کردیا اور ہم بس داد فریاد کرتے رہے۔ ابا جان کے پاس محفوظ وہ چند نادر ہیرے ان کے منہ پر مارے جاسکتے تھے۔ ابا جان کے پاس ان کی کوئی کمی نہیں تھی مگر پھر تو ریاست میں ہم سب کی نظروں میں آجاتے۔ ریاست سے ہمارا نکلنا مشکل ہوجاتا۔ وہ کرائے کے آدمی تھے، بڑے شوریدہ پشت، اول درجے کے بے رحم۔ وہ طے کرکے آئے تھے کہ انہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹنا۔ وہ ہمیں سنبھلنے، کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔ ہم سبھی نے اپنی اپنی کوشش کی، پھر کالنے سے ضبط نہیں ہوا۔ اس نے خود کو داؤ پر لگا دیا، سرغنہ کے سامنے جاکے کھڑا ہوگیا اور الجھ پڑا۔ اس جرات کی اسے قیمت ادا کرنی پڑی۔ انہوں نے اسے بری طرح مارا اور اپنے چند آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اسے کمرے سے لے جائیں۔ کالنے نے انہیں کچھ ایسا تاثر بھی دیا تھا کہ وہ حویلی میں چھپے ہوئے ہیروں کی جگہ آشکار کرسکتا ہے۔ وہ ٹھڈے مارتے پیٹتے ہوئے بار بار کالنے کو کمرے سے لے گئے۔ ان کی تعداد اس طرح کچھ کم ہوگئی تھی۔ چوبیس کی نفری تھی۔ کچھ باہر پہرا دے رہے تھے، کچھ مختلف کمروں کی تلاشی میں مصروف تھے۔ کالنے کے چلے جانے کے بعد ہم نے آپس میں اختلاف کی شوشہ طرازی کی۔ بظاہر بٹھل بھائی اور پیرو بھائی میں ٹھن گئی۔ سرغنہ نے بٹھل کو طمانچہ مارا۔ پیرو بھائی نے ہیرے افشا کرنے کی آمادگی ظاہر کردی تھی اور بٹھل بھائی انہیں باز رکھ رہے تھے۔ جیسے ہی سرغنہ پیرو بھائی کے مقابل آیا، انہوں نے یکایک پینترا بدل کے نہایت مشاقی اور پھرتی سے اسے جکڑ لیا۔ یہ منظر دیکھ کے سرغنہ کے ساتھی بدحواسی میں پیرو بھائی کی طرف دوڑ پڑے۔ اور ہمیں اس لمحے کی رعایت مل گئی جس کے ہم سب منتظر تھے۔

وہ رات قیامت کی رات تھی۔ بٹھل اور پیرو بھائی، شامو، جمرو، منگو، مارٹی، زورا اور میں، ہم نے ان سے ہتھیار چھین لیے۔ ادھر دوسرے کمرے میں کالنے ان کے چار آدمی بے بس کرچکا تھا مگر اس کوشش میں خود کالنے بری طرح زخمی ہوچکا تھا۔ ان ڈاکوؤں، حملہ آوروں کو جان سے مار دینے کے بجائے ہم نے انہیں بھاگنے پر مجبور کردیا۔ ان کی بندوقیں ناکارہ کرکے انہیں لوٹا دیں اور ان سے یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ انہیں پتھروں کے کس دیوانے نے بھیجا تھا۔"

"کیوں؟ اس میں کیا مصلحت تھی؟" زریں تعجب سے بولی۔

"ہمیں ریاست سے کسی طور بہ عافیت نکل جانا تھا، مزید کسی بکھیڑے میں پڑے بغیر۔ ہماری ذرا سی نادانی سے پولیس کی دخل اندازی ہوجاتی۔ ابا جان کی حویلی مرکز نگاہ بن جاتی۔ اور جانتی ہو، ہم نے ان وحشیوں سے کیوں یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کس ذی حیثیت شخص کے فرستادہ ہیں؟"

"میں، میں سمجھ گئی۔" وہ تیزی سے بولی "یہی پردہ پوشی بہتر تھی۔ وہ شخص زچ ہوکے یا منتشر ہوکے یا اشتعال میں آکے، اپنی رسوائی سے بچنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا اور تمہارے راستے کی رکاوٹ بن سکتا تھا۔ یوں مزید پیچیدگی پیدا ہوسکتی تھی۔ یہی نا؟"

"بالکل، بالکل۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا "یہی بات تھی، اور پھر ہم نے حیدر آباد سے روانگی میں بہت عجلت کی لیکن پیرو بھائی نے ایک بار پھر نواب ثروت یار سے مل لینا مناسب سمجھا۔"

زریں کچھ مستعد ہوگئی اور پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی "میں یہی پوچھنا چاہتی تھی۔"

"میرا تو وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پیرو بھائی نے مجھے بتایا بھی نہیں، بس چل پڑے۔ مجھے تو اس وقت معلوم ہوا جب ہم نواب ثروت یار کے بنگلے حمایت نگر میں داخل ہوئے۔ اتنی جلد ہمیں دوبارہ دیکھ کے نواب حیران ہوا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ابھی ہم حیدر آباد ہی میں تھے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا کہ اسے اتفاق کہیے، آپ لوگوں نے یہاں آنے میں کچھ دیر کردی۔ اس دوران مولوی صاحب آئے تھے۔ وہ کچھ پریشان سے تھے اور حیدر آباد میں

تقل قیام کے لیے کوئی چھوٹا مکان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ب کی درخواست پر کہ جب تک کسی معقول مکان کا بست نہیں ہوجاتا' وہ اس کے گھر قیام کریں' مولوی حب راضی ہوگئے۔ مولوی صاحب کی گفتگو سے نواب کو وس ہوا کہ وہ مالی طور پر خاصے فکر مند ہیں۔ اس نے شتہ ملاقات میں ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر مولوی صاحب ر آباد واپس آگئے تو وہ انہیں ہماری آمد سے مطلع نہیں ے گا اور ہمیں بمبئی خط لکھ دے گا۔ نواب کے بقول' وہ پنے وعدے پر کاربند رہا اور یہ سوچ کے اس نے ہمیں خط ھنے میں جلدی نہیں کی کہ اب تو مولوی صاحب کا قیام تقل حیدر آباد ہی میں ہے' کسی وقت بھی وہ ہمیں مطلع ر سکتا ہے پھر ایک روز اس نے سوچا کیوں نہ اشارتاً مولوی احب سے ہمارا ذکر کرکے ان کا عندیہ جانے اور ہماری رف سے ان کا تکدر دور کرنے کی کوشش کرے۔ مولوی احب کی مالی حالت اس طرح بھی بہتر ہوسکتی ہے' اگر انہیں ن کی آبائی جائداد یا ہماری تحویل میں ان کی کوئی پرانی امانت اپس مل جائے۔ پچھلی ملاقات میں ہم نے مولوی صاحب کی لاش کی یہی وجہ نواب سے بیان کی تھی۔ نواب کی زبانی میرا م سن کے مولوی صاحب کا عجیب حال ہوا۔ وہ بے کل وگئے۔ پوچھنے لگے' کب آئے اور کیوں آئے تھے؟ نواب ثروت یار نے تحمل سے ہماری آمد کی روداد سنائی کہ کہاں سے ہمیں مولوی صاحب کا پتہ ملا' ہم ان کے لیے کتنے مضطرب تھے اور ہم نواب کو بمبئی کا پتہ دے گئے ہیں۔ نواب نے مولوی صاحب سے پوچھا' اجازت ہو تو ہمیں بمبئی مطلع کردیا جائے۔ کیا ہرج ہے' ایک بار ان سے مل لیجیے اور کوئی خطا ہوگئی ہو تو معاف کردیجیے۔ نواب نے ہماری بڑی سفارش کی۔ جواب میں مولوی صاحب نے کہا کہ ہمارا پتہ انہیں دے دیا جائے' ابھی دماغ حاضر نہیں ہے' کسی مناسب وقت ہم سے رابطہ کرلیا جائے گا۔ نواب پھر کیا کہتا' چپ ہوگیا۔ رات کے کھانے پر نواب سے مولوی صاحب کی ملاقات ہوئی تو مولوی صاحب نے ہمارا پتہ طلب نہیں کیا۔ دوسرے دن نواب اپنے کسی ہندو دوست کی شادی میں حیدر آباد سے ملحق شہر سکندر آباد چلا گیا تھا کہ مولوی صاحب کسی ملازم یا گھر کے کسی فرد کو بتائے بغیر وہاں سے رخصت ہوگئے۔ مولوی صاحب کے اس طرح روپوش ہوجانے سے نواب بہت غم زدہ تھا۔ کہنے لگا کہ وہ سمجھنے سے قاصر ہے' آخر اس کی کون سی بات مولوی صاحب کو گراں گزر گئی۔ اس نے بتایا کہ اس کی والدہ کو کورا اتنی پسند آئی تھی کہ وہ مولوی صاحب سے نواب اور کورا کے رشتے کی خواہش کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس کی ماں کا خیال تھا' ممکن ہے' مولوی صاحب ایک نوجوان بیٹی کی ذمے داری کی وجہ سے متفکر ہوں۔ اس طرح ان کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا اور ایک ماں کو اپنی پسند کی بہو مل جائے گی میں نے نواب کو نہیں بتایا کہ یہ بات نہیں تھی۔ مولوی صاحب کو نواب ثروت یار جیسے ذی وقار' وجیہہ اور عالی نسب شخص سے کورا کا رشتہ منظور نہیں تھا تو وہ ہمیں عذر کرسکتے تھے' سوچنے کے لیے وقت طلب کرسکتے تھے۔ شاید کوئی بھی فوراً ہاں نہیں کردیتا۔ مولوی صاحب تو میری وجہ سے کہ کہیں نواب ثروت یار کے قیام کے دوران میں نہ پہنچ جاؤں' فوراً وہاں سے چلے گئے' چلے گئے یا فرار ہوگئے۔"

میری آواز گھٹ گئی۔

"مگر کیوں؟" زریں بے چینی سے بولی۔

"کیا کہا جاسکتا ہے' ظاہر ہے' وہ مجھے کوئی بہت برا آدمی سمجھتے ہیں اس لیے کہ میں سزا یافتہ ہوں' سات سال جیل میں گزارے ہیں میں نے۔ وہ مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ اب وہ کورا کو میری امانت نہیں سمجھتے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ میں ان سے کورا کو چھین لوں گا۔ کیا بتاؤں' کیا کچھ ہوسکتا ہے۔"

"اور وہ' وہ کورا' نرجس بانو کو' وہ اسے کیسے سمجھاتے ہوں گے' کیا باور کرایا ہوگا انہوں نے اسے؟"

"جانے کیا کہا ہوگا' یہی کہ وہ تو میری تلاش میں جہ جگہ گھوم رہے ہیں۔ انہوں نے اسی آسرے میں اسے زندہ رکھا ہوگا۔"

"مگر کب تک وہ اس نازک لڑکی کو دلاسے دیتے رہیں گے؟"

"جانے انہوں نے کیا سوچا ہے۔ ان کے دل میں کیا ہے' یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" میں نے بھر بھرائی آواز میں کہا۔

"زہرہ نے مجھے کورا کی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ وہ بہت پیار کرتی ہے اسے' کہتی ہے' خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔" زریں جھجکتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔" میری آواز ڈوبنے لگی "مگر اب تو وہ مولوی صاحب کے قبضے میں ہے۔"

زریں چپ ہوگئی۔ میں بھی خاموش ہوگیا۔ مولوی صاحب کے ذکر سے میرے رگ و پے میں پھر وہی سوزش ہونے لگی تھی۔ لمحے گزر گئے' پھر زریں نے جیسے چپکے سے پوچھا "پھر تو حیدر آباد سے سیدھے بمبئی چلے گئے ہوں گے؟"

"ہاں' ہاں۔" میں نے چونک کے کہا "اسی دن' رات کے راستے میں زخمی کانجے کی حالت اور خراب ہوگئی۔ ادھر معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ہمارے تعاقب میں ہیں۔ ہم ان سے بچ جان بچے رہے۔ دو ایک کو تو راستے میں جھٹکا دیا' دو کو بمبئی تک لے آئے۔ وہاں پیرو بھائی کے ٹھکانے میں' سمجھو' انہیں قید کردیا گیا۔ بعد میں جب ان کی پٹائی کی گئی تو انہوں نے حیدر آباد کے ایک بڑے سرکاری افسر' نسبت شاہ کا نام لیا۔ انہیں کچھ اور ایذا پہنچائی گئی تو معلوم ہوا کہ نسبت شاہ ابا جان کے دوست نواب حشمت جنگ کا ماتحت ہے۔"

"ارے!" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولی "یعنی اس رات ابا جان کی حویلی میں وہ درندے اس نے بھیجے تھے؟"

"یہ تو انہوں نے قبول نہیں کیا' ان کا کہنا تھا کہ انہیں تو صرف ہمارے پیچھے' ہمارے کوائف جاننے کے لیے ہمارا تعاقب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ خیر' ہم نے زیادہ چھان بین نہیں کی۔ اب ہمیں کرنا بھی کیا تھا۔ اس شخص کی نشان دہی بھی ہوجاتی تو ہم حیدر آباد جا کے کون سا اس کے محل پر یلغار کرتے۔"

"فرخ' فریال وغیرہ سے کب ملنا ہوا؟" زریں نے اشتیاق سے پوچھا "اور کیا حال ہوا؟"

"کچھ نہ پوچھو' تبت کے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے ابا جان کو واپسی کا اعتماد نہیں تھا' انہوں نے وہاں جانے سے پہلے سارا انتظام کردیا تھا۔ اپنے بچوں کے نام ایک سہ منزلہ مکان خرید کے انہوں نے ایک شریف النفس' دین دار شخص مولوی اکرم کے سپرد کردیا تھا۔ اوپر کی دو منزلیں کرائے پر اٹھا دی تھیں' اس کرائے سے مولوی اکرم گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ مولوی اکرم کو ایک بڑی رقم الگ سے بھی دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ تین سال تک ان کی واپسی نہ ہوسکے تو مولوی اکرم مناسب جگہوں پر لڑکیوں کے رشتے کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ دستاویز کی رو سے اکبر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے تک مولوی اکرم ہر معاملے کے مختار تھے البتہ مکان فروخت کرنے یا اپنے نام منتقل کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ مولوی اکرم چھوٹا موٹا کاروبار کرکے اچھی بھلی گزر بسر کرتے تھے۔ اس مکان میں آنے کے بعد کل وقتی نگرانی کی وجہ سے انہیں اپنا کاروباری شغل ترک کرنا پڑا۔ انہوں نے شرافت کی انتہا کردی۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ بمبئی پہنچتے ہی ہم نے کانجے اور ماریا کو جولین کے گھر' جمرو' شامو وغیرہ کو پیرو بھائی کے ٹھکانے پر روانہ کردیا گیا۔ ہم پانچ' میں' ابا جان' پیرو' اکبر علی صاحب اور بھیل بھائی نے ابا جان کے گھر کا رخ کیا۔ کیا کہوں۔ نہ انہیں یقین آتا تھا' نہ مجھے۔ وہ بھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی تھیں' میں بھی اسے خواب ہی سمجھ رہا تھا۔ اتنے دنوں بعد ان کا بھائی اس طرح سامنے آجائے گا اور اتنے دنوں بعد میں ان کی شکلیں دیکھ سکوں گا۔ یہ سارا کچھ کسی خواب کے مانند ہی تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مجھے تو اپنا یارا ہی نہ تھا۔ ان کی خوشی تو دہری تھی۔ ابا جان بھی بہ سلامت واپس آگئے تھے پھر انہیں جہاں گیر کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بھی ان سے دور نہیں ہے۔ وہ سب مجھے چھو چھو کے دیکھتی تھیں اور ان کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اکبر میرے گلے میں جھول جھول گیا۔ وہ منظر عجیب تھا۔ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اتنے عرصے بعد ہم اکٹھے ہوئے تھے۔ مجھے امی اور لُنی بہت یاد آرہی تھیں مگر' مگر کانجے نے سب کچھ منتشر کردیا' اسے اسپتال میں داخل کردیا گیا تھا اور آخر وہ ہار گیا' وہ شخص جو دس بارہ آدمیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا' خود سے ہار گیا۔ آدمی کی سب سے بڑی شکست تو خود سے ہوتی ہے اور کانجے کی موت کا دسواں دن تھا۔ جولین کے گھر سب جمع تھے۔ پیرو بھائی اور رماچی رات کو گھر سے نکلے۔ انہیں گولی ماردی گئی۔ وہ بھی چلے گئے۔"

زریں کو کانجے' پیرو اور رماچی کی موت کا علم تھا۔ اس نے سر جھکا لیا اور دل گرفتہ آواز میں بولی "مگر ان دونوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟"

"وہ ایک لمبی کہانی ہے۔" میں نے زہر خند سے کہا "یوں سمجھو کہ تبت کے سفر پر ہمارے ساتھ جانے کی وجہ سے پیرو بھائی نے اپنا ٹھکانا اپنے معتمد' معتبر لوگوں کے سپرد کردیا تھا۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کے پروردہ لوگوں نے خوب گل کھلائے۔ وہ سمجھے تھے کہ اب شاید پیرو بھائی واپس نہ آئیں۔ پیرو بھائی اچانک ایک روز بمبئی واپس پہنچ گئے تو سبھوں کو سانپ سونگھ گیا۔ پیرو بھائی نے جب سب کچھ الٹ پلٹ دیکھا تو ایک ایک کو خوب لتاڑا' رگیدا۔ کچھ تو سنبھل گئے' کچھ نے دل میں کینہ رکھ لیا۔ ان میں ایک شخص تھا' جارجی نام کا' پیرو بھائی ہی کا بنایا ہوا تھا۔ اس کی شادی بھی پیرو بھائی نے اپنی معنوی بیٹی ماری سے کرائی تھی۔"

میں نے بہت احتیاط کی لیکن جارجی کا نام آتے ہی بے اختیار میری زبان سے نکل گیا "اسی کتے نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے پیرو بھائی کو ختم کیا تھا۔"

زریں نے اپنی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ کرلیا اور مجھے پشیمانی سے بچالیا۔ میں نے کہا "وہ بڑا کمینہ تھا۔ سارے شہر میں پیرو بھائی کی موت کا چرچا تھا۔ پولیس ہم پر بھی شک کررہی تھی۔ ہمیں بھی طلب کرلیا گیا تھا۔ ہم نے بہت دلیلیں

یں تبھی ہمیں چھوڑا گیا، ہم نے ان سے کچھ وقت مانگا تھا۔ ت صاف ستھرا قتل کیا تھا جارجی نے، وہ کبھی نہ پکڑا جاتا۔ ایک روز اس کی بیوی ماری نے اسے انجام کو پہنچا دیا اور تھانے آ کے اقبالِ جرم کر لیا۔ ماری نے سارے واقعات سے پردہ اٹھایا۔ یوں ہم بھی پولیس کے عتاب سے بچ گئے۔ تھانے میں بٹھل بھائی اور میں، ماری سے ملے تھے، وہ اپنے اقدام پر ذرا بھی شرمندہ نہیں تھی۔ وہ تو اپنے بچوں کی طرف سے وحشت زدہ تھی۔ جب تک اس نے اپنے بچوں کو دیکھ بھال کے لیے بٹھل بھائی سے وعدہ نہیں لے لیا، اس کی آہ و بکا جاری رہی۔ بعد میں ابا جان سے کہہ کے بٹھل بھائی نے ماری کے بچوں کی نگرانی کا مستقل انتظام کرا دیا۔ ان کی خیر خبر رکھنے کا کام جولین کے سپرد کیا۔

میں نے اپنی طرف سے اڈے پاڑے کے ذکر سے اجتناب کیا تھا۔ حالانکہ زریں کو بہت کچھ معلوم تھا لیکن اپنی زبان سے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا اسی لیے میں نے پاڑے کے بجائے پیرو بھائی کا ٹھکانا کہا تھا۔ وہ ایک معاملہ فہم لڑکی تھی، سمجھ گئی ہوگی۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ پیرو کی موت کے بعد اس کے پاڑے پر کیا واقعات رونما ہوئے، اس کار[illegible] تھی میں کتنے لوگ شامل تھے۔ میں نے صرف یہ بتایا کہ پیرو کی بیوی اور بیٹی کو ہم اپنے گھر لے آئے۔

آپس میں چاقو بازی کی مشق کے دوران مارٹی کے زخمی ہو جانے اور دمِ واپسیں جولین کے دیدار کی حسرت کے واقعے سے زریں بہت متلاطم ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس دوران حیدر آباد سے نواب ثروت یار کا خط بھی آ گیا تھا کہ مولوی صاحب حیدر آباد واپس آ چکے ہیں۔ مارٹی کی ناگفتہ بہ حالت میں ہم کیسے سفر کر سکتے تھے اور اس کے سانحے کے بعد تو کہیں آنے جانے کا کیا سوال، کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا تھا لیکن بٹھل نے سفر کا ارادہ کر لیا۔ حیدر آباد میں نواب ثروت کے ہاں پہنچے، اس کی زبانی مولوی صاحب کی موجودگی کا مژدہ سننے اور اس کی معیت میں حیدر آباد شہر سے کچھ دور مولوی صاحب کے گھر کے لیے روانگی، درمیان میں ایک سنسان جگہ موٹر کی خرابی کے بہانے رات گزارنے کے لیے نزدیک ترین پناہ گاہ، کسی نواب مجن کے وسیع و عریض باغ میں واقع کوٹھی میں ہمیں ہنکا کے لے جانے، رات گئے اس کے فرستادہ مسلح آدمیوں کا حملہ اور حیرت انگیز طور پر بٹھل کا اصل معاملہ سونگھ لینا۔ ان لوگوں پر بہ وقت تمام قابو پا لینے، بٹھل کا نواب ثروت کو جکڑ لینا اور سرغنہ کا ہیجان و اضطراب، عین لمحے بٹھل کا سرغنہ کے نشانے سے خود بچنا اور اپنے ستم گر نواب کو بھی بچانے کی کوشش اور بدقسمتی سے سرغنہ کے نشانے پر اس کے آقا نواب ثروت کا آ جانا، شدید زخمی حالت میں نواب کو اس کے ایک شناسا ڈاکٹر کے ہاں پہنچانا، آخری وقت میں ڈاکٹر کے سامنے نواب ثروت کا اعتراف کہ مولوی صاحب نے حیدر آباد آ کے کورا اور اس کی وابستگی کے لیے میری دیوار کا ذکر کیا تھا۔ مجھے راستے سے ہٹانے اور کورا کو یہ باور کرانے کے لیے کہ اب میرا انتظار محض ایک سراب ہے، وہ میری آس ترک کر دے، نواب نے یہ ساری نوٹنکی کی تھی۔

زریں کی آنکھوں میں آنسو لرزاں تھے۔ اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

"نواب ثروت بھی نہیں رہا۔" میں نے اسے بتایا۔

"ڈاکٹر کے بقول، آخری وقت نواب ہم سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے کے لیے بے قرار تھا۔ اسے وقت ہی نہیں ملا۔ ہم کچھ دیر سے ڈاکٹر کے ہاں پہنچے، ڈاکٹر کو اس نے مولوی صاحب کے گھر کا پتہ بھی بتایا تھا۔ کسی تاخیر کے بغیر ہم وہاں سے سیدھے اس محلے پہنچے جہاں مولوی صاحب کی سکونت تھی مگر وہ وہاں سے جا چکے تھے۔"

"وہ کیسے؟" زریں بڑبڑا سی گئی۔

"نواب ثروت کئی دن تک ڈاکٹر کے ہاں زیرِ علاج رہا تھا۔ اس کے ڈرائیور نے بہتر سمجھا کہ اس کی شدید حالت سے مولوی صاحب کو بھی مطلع کر دے تاکہ بعد میں انہیں شکایت نہ ہو۔ مولوی صاحب نے اپنے محسن، اپنے مربی نواب ثروت کی عیادت کے لیے ڈاکٹر کے ہاں جانے کے بجائے اسی دن، شاید اسی وقت حیدر آباد چھوڑ دیا، کیونکہ ڈرائیور نے نواب کے ہم سفر ہم دو اجنبیوں، بٹھل بھائی کا اور میرا ذکر بھی ان سے کیا تھا۔

حیدر آباد سے واپسی پر ریل میں سلمٰی سے ملنے کا ماجرا تم سلمٰی سے سن ہی چکی ہوگی۔ حیدر آباد سے دلی جاتے ہوئے ہم مراد آباد کے مسافر خانے میں ٹھہر گئے۔ جمو، زورا اور سلمٰی کو وہاں روک کے بٹھل بھائی اور میں ڈیڑھ ہفتے اطراف کے شہروں میں گھومتے رہے۔ مراد آباد میں ہمیں مولوی صاحب کے ایک دیرینہ رفیق حافظ عبدالخالق کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ وہ دونوں کبھی ایک ساتھ مراد آباد کی مشہور دینی درس گاہ جامعہ قاسمیہ میں پڑھاتے تھے۔ حافظ عبدالخالق نے بھی مدرسہ چھوڑ دیا تھا اور عرصہ ہوا اپنی زمینوں پر نگرا سادات چلے گئے تھے۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ نگرا سادات میں مولوی صاحب کے دیرینہ رفیق حافظ

عبدالخالق سے ملاقات، ان سے بحث و تکرار، بٹھل کا اپنی اور میری کلائی پر چاقو سے لکیر کھینچنا اور حافظ عبدالخالق کا پگھل جانا۔ "ہماری روداد سن کے ان کا وعدہ کہ اب جب بھی مولوی صاحب ان کے پاس آئے، وہ ہمیں ضرور مطلع کریں گے اور میری بابت مولوی صاحب کا غبار یا خوف دور کرنے کی کوشش کریں گے۔" نگرا سادات سے فیض آباد روانگی اور لکھنؤ میں کلن خاں کے استاد، شمشاد خاں کے اصرار پر تین چار دن قیام، فیض آباد اسٹیشن پر جمو، زورا اور سلمٰی کو وداع کر کے آگے کا سفر، مشرقی یوپی اور بہار کی بے شمار بستیوں کی خاک چھاننے کے بعد شہر آسن سول میں سید محمود علی کے ہاں پڑاؤ کی بابت میں نے تفصیل سے اسے بتایا اور لکھنؤ میں استاد شمشاد خاں کے اڈے پر رجن اور بنے خاں کا معرکہ اور بنے خاں کی شکست پر رجن سے میری مڈبھیڑ، بنے خاں کے غیاب اور چاندنی بانو کا قصہ۔ چاندنی بانو کے اغوا کے بیان سے میں نے پہلو تہی کی۔ "آسن سول کے بارے میں نصیر بابا، فروزاں اور یاسمن نے تمہیں سب کچھ بتا ہی دیا ہوگا۔" میں نے پژمردگی سے کہا۔

وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی "فروزاں اور یاسمن کا وہاں سے بچ نکلنا کسی معجزے سے کم نہیں۔"

"اتفاق ہے، مجھے تیز بخار آ گیا تھا اور آسن سول سے آگے سفر مشکل تھا۔ ہر چند میں کلکتے جانے کے لیے کمربستہ تھا۔ کلکتہ اتنا دور بھی نہیں رہ گیا تھا مگر سید محمود علی نے روک لیا۔ اس نے مہمان نوازی کی حد کر دی۔ صبح و شام ڈاکٹر آتا تھا۔ کیا تپاک تھا، کیا خاطر داری تھی۔ طرح طرح کے لوگ اس کے مہمان خانے میں آ کے ٹھہرتے ہیں، عالم فاضل، اپنے اپنے فن کے ماہر، بڑے معزز اور مشہور لوگ۔ کوئی بھی کیسے جانتا ہوگا، ایسا متواضع میزبان اتنا، اتنا بڑا...." میں نے خود کو لگام دی، سید محمود علی کے لیے کوئی بدترین خطاب میری زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ "نصیر بابا کہتے ہیں، کتنے لوگ آئے۔ ہم وہ کے لیے سوچتے رہے، کس سے بات کریں، کس کی منت کریں۔ آخر ہم وہاں پہنچ گئے، انہیں بہت دنوں سے جن لڑکوں کا انتظار تھا۔ تم نے دیکھا؟ وہ کیسی شیشے کی بنی ہوئی گڑیاں ہیں۔ دھوپ سے جیسے ان کا کبھی گزر ہی نہ ہوا ہو۔ وہ ایک شقی القلب کے سائے میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔"

میں نے گہری سانس لی "بس یہی کچھ تھا۔ بہت سی باتیں تو میں نے تمہیں بتائیں بھی نہیں، بہت کچھ مجھے خود یاد نہیں رہا۔"

وہ سرنگوں گم بیٹھی رہی۔ دیر تک سکوت چھایا رہا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کچھ نہیں۔" وہ افسردگی سے بولی "سمجھ میں نہیں آتا، کیا کہا جائے۔"

"کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اسی لیے مجھے تامل تھا کہ میرے پاس تمہاری آسودگی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"لیکن یہ سب جانے بغیر مجھے ایک محرومی سی رہتی۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا، بیتے ہوئے میں کچھ ایسا نہیں ہے جسے دہرا کر کوئی سکون حاصل ہو۔ یہ تو تم تھیں، کسی دوسرے کے سامنے تو شاید میری زبان ہی نہ کھلتی۔"

"یہ سب کیسا عجیب ہے۔"

"مجھے خود بھی یقین نہیں آتا۔"

"کبھی مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے اور کبھی غصہ۔"

"یہی میرا حال ہے۔"

"اور عجب بے بسی ہوتی ہے کہ میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتی۔"

"سچ پوچھو تو تم میرے بہت کام آتی ہو۔ میرے ساتھ نہ رہتے ہوئے بھی تم میرے ساتھ رہتی ہو۔ تمہارے خیال سے میری ہمت بڑھتی ہے۔ میں خود کو مضبوط محسوس کرتا ہوں۔ مجھے احساس رہتا ہے کہ کوئی میرے لیے بہت دعائیں کر رہا ہے۔ تم میرا یقین ہو، تم میرا سچ ہو۔"

"اتنا مت کہو۔" اس کی آواز ڈولنے لگی۔ اس کے سراپا میں تموج سا نمودار ہوا "میں تو صرف دعائیں ہی کر سکتی ہوں لیکن مجھے معلوم ہے، تمہیں اس سے سوا کی ضرورت ہے۔ کاش میں بھی بابا کی طرح، جمو بھائی، زورا بھائی کی طرح تمہارے ساتھ ہوتی۔ میں کیوں نہیں ہو سکتی؟" اس کے لہجے میں بہت سے جذبے نمایاں تھے۔

"بٹھل بھائی اور دوسرے کیا کم میرے لیے آزار بھگتتے ہیں کہ ایک تمہارا بھی اضافہ ہو۔ مجھے انہی سے بڑی ندامت ہوتی ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں، میری وجہ سے کتنے گھر، کتنے لوگ منتشر ہوئے۔"

"اور کتنے گھر آباد، کتنے لوگوں کی نجات بھی تمہارے سبب سے ہوئی۔ ابھی حال ہی میں دیکھو۔ یہ فروزاں اور یاسمن، تم وہاں نہ جاتے تو ان دونوں پر کیا گزرتی۔"

"ہاں ان کا تو واقعی عجیب ہوا۔"

"وہ تو تمہاری بہت احسان مند ہیں۔ ہر وقت خدا کا شکر ادا کرتی ہیں۔ ہر وقت ان کی زبان پر تمہارے اور بابا کے نام کا ورد ہے۔"

"یہاں تو وہ خوش ہیں نا؟" میں نے یونہی پوچھا۔

"بظاہر تو بے حد' شاید بباطن بھی۔"
"یہاں تم ہو تو وہ کیسے نا آسودہ' نا خوش ہو سکتی ہیں۔"
"ہاں۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی "میں تو کوئی آدمی نہیں ہوں۔"
"تم واقعی آدمی نہیں ہو۔"
"پھر کیا ہوں؟"
"تم' تم۔" مجھے فوراً کوئی مناسب لفظ نہ سوجھ سکا "تم نہ جانے کیا ہو۔"
"میں جانے کیسی مٹی کی بنی ہوں' یہ کہنا تو نہیں چاہتے؟"
"نہیں نہیں' مٹی کی نہیں' تم تو شہد کی' ریشم کی بنی ہو' تم تو..."
"بس' بس' خدا کے لیے بس کرو۔" اس کا بدن ایک لمحے کے لیے لرز سا اٹھا' کہنے لگی "مجھے تو اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔"
"کیوں' کس بات سے؟"
"کہیں کسی لمحے شیشہ ہاتھ سے نہ گر جائے۔" وہ اداس ہو گئی "ہاتھ بہک بھی تو جاتے ہیں' بھٹک بھی تو جاتے ہیں۔"
"نہیں ہو گا ایسا۔" میں نے عزم سے کہا۔
"کاش کہ ایسا ہی ہو۔" وہ خمیدہ پلکوں سے بولی۔
اسی لمحے کہیں دور سے مرغ کی بانگ سنائی دی۔ میں نے چونک کے گھڑی دیکھی۔ تین بج چکے تھے "یہ مرغ اب نا وقت بھی بانگ دینے لگے ہیں۔"
"یہ نئے زمانے کے مرغ ہیں۔" وہ مسکرا کے بولی "نئے زمانے میں ہر ایک کو جلدی ہے۔"
"پھر بھی رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہیں نیند تو نہیں آ رہی؟"
"تمہیں آ رہی ہے؟"
"مجھے تو جاگنے کی عادت ہے۔"
"مجھے بھی سونے سے کوئی ایسی رغبت نہیں' پھر اتنے عرصے بعد تو یہ موقع ملا ہے۔ نیند تو ادھار بھی کی جا سکتی ہے۔"
"اور کہتے ہیں' نیند کا ادھار زیادہ مدت کا نہیں ہوتا۔ نیند اپنا قرض معاف نہیں کرتی۔"
یکایک اسے خیال آیا' اس نے جھک کے پوچھا "قہوہ بنا کے لاؤں؟"
"تمہیں خواہش ہو تو لے آؤ۔"
"تمہیں نہیں ہے؟"
"تمہاری زحمت کا خیال آتا ہے۔ اب اتنی رات گئے آگ جلاؤ گی' پانی' پیالیاں۔"
"کچھ دیر نہیں لگے گی' بس چٹ پٹ۔"
"پھر میں بھی ساتھ چلتا ہوں' تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے باورچی خانہ دیکھے ہوئے صدیاں ہو گئیں۔"
"باورچی خانہ کوئی ایسی قابل دید جگہ نہیں ہے۔"
اس نے مجھے روک دیا اور اٹھ کے تیزی سے باہر چلی گئی مگر کمرے سے چلے جانے کے بعد بھی وہ موجود رہی۔ اس کی خوشبو' اس کا خیال۔ میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ہر اعتبار سے کیسی مکمل لڑکی ہے۔ حسین و جمیل عورت اور وجیہہ و شکیل مرد میں ذہانت نہ ہو تو کیسا ادھورا پن ہے۔ ذہانت بجائے خود حسن ہے۔ ذہانت' سلیقہ' خوش گفتاری' خوش اطواری بھی حسن ہے۔
وہ جلد ہی واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں بھرا پرا طشت تھا۔ قہوہ دانی' شکر دانی' فنجان اور چمچوں کے علاوہ طشت میں خشک میوہ بھی رکھا تھا' انناس کی قاشیں اور گلوریاں بھی۔ اتنی جلد اس نے یہ اہتمام کر لیا تھا۔ کام کرنے کا جذبہ ہو تو سارا کام جادو کی طرح ہوتا ہے۔ جذبہ' جادو ہے۔ میں نے بڑھ کر طشت میز پر رکھنے میں معاونت کی۔ اس نے فنجانوں میں قہوہ بھرا۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ میں نے اسے کیوں بلایا ہے۔ قہوے سے مجھے بمبئی کے علاقے دادر میں واقع ایرانی ہوٹل یاد آیا اور میں نے اس کی شگفتگی دیکھ کے سلسلہ جنبانی کی "تمہارا بمبئی جانے کو نہیں جی نہیں چاہتا؟"
اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔
"کیوں نہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا "میں نے اب تک فرخ' فریال' فارہ اور اکبر کو نہیں دیکھا ہے۔ ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔"
"اور وہاں صرف وہی نہیں' وہاں جولین' شہ پارہ اور گیتا ہے۔ وہ بھی اسی گھر کی فرد ہیں۔ میرے لیے تو فرخ' فریال کی طرح' اور ہاں' وہاں رما اور کیلاش بھی تو ہیں۔"
اس نے رما اور کیلاش کے بارے میں تجسس ظاہر کیا۔ میں نے اسے بتایا "کانتے کی بیماری کے دوران اسپتال میں ڈاکٹر کیلاش سے تعارف ہوا تھا۔ تعارف' تعلق میں بدل گیا اور مراسم ایسے بڑھے کہ گھر آنا جانا ہو گیا۔ دونوں میاں بیوی اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ دونوں میں بڑی دلکشی ہے۔ رما سے مل کے تو تمہیں احساس ہو گا' جیسے ایک شخص کی اب تک کمی تھی۔ وہ بالکل الگ لڑکی ہے' بڑی روشن خیال' اور میں کہوں گا' مفکر بھی۔ بڑی فکر انگیز باتیں کرتی ہے۔ تم ملو

اس میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔" میں رما اور ڈاکٹر کیلاش کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا۔ وہ بہ شوق نگاہوں سے سنتی رہی "تو پھر بمبئی چلتے ہیں' ہاں۔" میرے فیصلہ کن لہجے میں التجا بھی شامل تھی۔

"اچانک یہ خیال کیسے آگیا؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"بس آگیا' اصولاً تو بہت پہلے تمہیں وہاں ہونا چاہیے تھا یا ان لوگوں کو اس طرف آنا چاہیے تھا مگر سارے حالات تو تم سن ہی چکی ہو۔ فرصت ہی کہاں ملی لیکن اب' اب تم تیار ہو جاؤ۔"

"مگر تم تو کہیں اور جا رہے ہو؟"

"کہیں اور نہیں' پہلے بمبئی جائیں گے۔"

"مگر بابا تو بنگال کی طرف ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ان سے میں بات کر لوں گا بلکہ تم بھی ان پر زور دینا' تمہاری بات تو وہ ٹالیں گے نہیں۔"

"اور تمہاری ٹال دیں گے؟"

"میری بات جانے دو' مجھ سے تو وہ کبھی کبھی بہت ضد کرتے ہیں۔ میری بات پر کان نہیں دھرتے۔ بہرحال' میرا خیال ہے' انہیں اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ان سے کوئی نامناسب فرمائش تو نہیں کر رہے۔" بمبئی شہر کی فضیلتوں کے لیے میں طرح طرح کی دلیلیں وضع کرتا رہا۔ میں نے کہا "تمہیں وہاں جا کے ہی کچھ اندازہ ہوگا کہ وہ کیسا مختلف شہر ہے پھر شاید لوٹنے کو جی نہ کرے۔"

"میں نے کلکتہ دیکھا ہے۔ وہ بھی تو بڑا شہر ہے' بلکہ بہت بڑا۔"

"بے شک' وہ بمبئی سے بڑا شہر ہے لیکن بمبئی کی بات دوسری ہے۔ وہاں اتنے کشادہ گھر تو نہیں لیکن وہ بھی گھر ہیں۔ وہاں لوگ کام کرتے ہیں اور اپنے آپ سے غرض رکھتے ہیں۔ وہاں آدمی تیز چلتا ہے اور گھڑی پر اس کی نظر رہتی ہے۔ سمجھو ہر شخص کوئی ترازو پاس رکھتا ہے۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے کسی حد تک پیچیدگی اور افراتفری بھی نظر آتی ہے لیکن وہاں زندگی ایسی شخصی' تنگ اور اجاڑ نہیں ہے۔ یہاں تو گھڑی بھی شاید سست چلتی ہے۔ یہاں صرف سکون ہی سکون ہے۔ سکون کی اتنی افراط بھی نہیں ہونی چاہیے۔"

اس نے تحمل سے سنا۔ اس تحمل میں تپاک بھی تھا "میں وہاں جانے سے کب انکاری ہوں اور مجھے کسی شہر سے اتنی غرض نہیں جتنی وہاں کے مکینوں سے ہے اور مکینوں میں بھی چند سے۔ مکین اپنے نہ ہوں تو کوئی بستی اپنی نہیں لگتی۔"

"لیکن شہر سے بھی بڑا فرق پڑتا ہے۔ یہاں ان چھوٹے چھوٹے شہروں اور بستیوں میں آدمی کچھ دوسروں کا پابند نظر آتا ہے۔ لگتا ہے' یہاں ہر شخص' ہر شخص کا نگراں ہے۔ مثلاً تم یہاں بازار میں بڑے اہتمام ہی سے جا سکتی ہو' بہت چھپا کے' اپنے آپ کو سمیٹ کے۔ وہاں یہ سب کچھ نہیں ہے۔ یہاں ذرا سی بات ہو تو فسانہ ہو جاتی ہے' سارے شہر کو خبر ہو جاتی ہے' وہاں پڑوسی کو خبر نہیں ہوتی۔ تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم ان بے سروپا آداب سے نجات پاؤ؟ یہاں تو ہر عورت جیسے کسی زنداں میں رہتی ہے۔ یہ چھوٹے شہر خصوصاً عورتوں کے لیے بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔"

"کیا بات ہے؟" وہ کسی قدر شوخی سے بولی "پہلے بھی تم اس شدومد سے اس شہر کے مخالف نہیں تھے۔"

"مخالفت نہیں' مسلسل سفر کی وجہ سے مجھے موازنے کا موقع اچھا ملا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے' بڑے شہر میں سکونت سے مراد ہے' آدمی نئی زندگی سے قریب ہے۔ نئی زندگی کے سفر میں شامل ہے' وہ بچھڑا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ چھوٹے شہر بھی ایسے متحرک اور سرگرم ہو جائیں تو کیا خوب ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ خوش دلی سے بولی "بمبئی بھی دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے کیا معنی؟ بس چلنا ہے' دور کی بات نہیں' سب سے کہہ دو۔"

"ایسے کیسے؟ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"کیوں' اس میں سوچنے کی کیا بات ہے' کون سی بڑی تیاری کرنی ہے۔ وہ ایک دوسرا گھر ہے' اسی گھر کے مانند' وہاں ساری چیزیں موجود ہیں۔"

"جہاں گیر' نیساں' سلمٰی اور مجو میاں کے سالانہ امتحانات میں دو مہینے رہ گئے ہیں۔"

"یعنی جب تک تم کہیں آ جا نہیں سکتیں۔"

"کیا مجھے اکیلے جانا ہے؟"

"نہیں' سبھی کو' سبھی کو جانا چاہیے۔"

میری مرجھائی ہوئی آواز سے اس کا بدن شکل ہوا۔ اس نے سمجھانے کے انداز میں متعدد عذر پیش کیے۔ کہنے لگی کہ زمینوں کی دیکھ بھال کا کام اب منیر علی کا بھانجا ارشد کرتا ہے۔ معلوم نہیں' فصلوں کی کیا صورت حال ہے۔ ارشد کے ساتھ منیر علی کا بیٹا تنویر بھی کھیتی باڑی میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ انہوں نے کاشت کاری کے

طریقے آزمانے شروع کیے ہیں' کچھ اور زمینوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ باغ بھی کثرت سے لگائے ہیں۔ زریں نے حویلی کے تہ خانے میں مدفون تبت سے لائے ہوئے نوادر سے بھرے ہوئے صندوقوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تہ خانے جانے والے راستے پر نہایت رازداری سے دیوار چن دی گئی ہے۔ زریں کا یہ عذر ایسا معقول نہیں تھا۔ بخشل نے ان صندوقوں کا کوئی بہت ہی معقول انتظام کیا ہوگا۔ نہ فصلوں کے معاملات اتنی اہمیت رکھتے تھے۔ البتہ جہاں گیر اور نیساں وغیرہ کے تعلیمی سلسلے میں رخنہ اندازی کا معاملہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں چپ ہو گیا۔

"ہو سکے تو اب کے سفر مختصر رکھنا۔" وہ نرمی سے بولی "دو ڈھائی مہینے بعد تمہارا ادھر آنا ہوا تو سب کو تیار پاؤ گے یا پھر تم بمبئی سے کہیں قریب ہو تو سیدھے وہیں چلے جانا اور ہمیں لکھ دینا۔ ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ امتحانات کے بعد فراغت ہی فراغت ہوگی۔"

"دو ڈھائی مہینے کیا۔" میں نے بے دلی سے کہا "سفر میں کچھ یقین نہیں ہوتا' کہاں کتنا وقت لگ جائے۔ کہاں زنجیر پیروں میں پڑ جائے۔ سفر اپنے اختیار کا نہیں ہوتا۔ تم نے ابھی کی کچھ تو سنا ہے۔"

"ضروری نہیں کہ ہر بار ایسا ہی ہو۔ ممکن ہے' اس سفر کے بعد کسی اور سفر کی ضرورت ہی نہ پڑے۔"

"کیا معلوم۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "کب تک یہ سلسلہ چلے' کہاں جا کے ختم ہو۔"

"تم بالکل نہیں بدلے' پھر وہی مایوسی کی باتیں' بالکل ایسے ہی جو پہلے تھے۔"

"تم کیا توقع کر رہی تھیں' میرے سینگ نکل آئیں گے؟"

وہ کھلکھلا پڑی۔ کمرے میں جیسے گھنٹیاں بج اٹھیں' پھر تفہیمی انداز میں کہنے لگی "میں سمجھتی تھی' تمہارا ارادہ اور پختہ ہو چکا ہوگا۔ پہلے بھی تم نے ایسی ناامیدی کی باتیں کی تھیں مگر تم نے دیکھا' کئی جگہوں پر تم منزل پر پہنچ ہی گئے تھے' بس کبھی تو ہوا' پہنچنے میں کچھ دیر سویر ہو گئی' جیسا میر پور آباد' نگریا سادات۔"

"منزل پر پہنچ کے ناکام واپس آ جانا' منزل پر پہنچ جانا نہیں ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔ اپنے لہجے کی بیزاری مجھے خود اچھی نہیں لگی۔

"لیکن راستے بند تو نہیں ہوئے۔"

"جتنے راستے ہیں' اتنی بڑی زندگی نہیں ہوتی۔"

"پھر یہ بھی تو ملال نہیں ہوتا کہ ہم نے راستے آزمائے ہی نہیں۔ تمہارا عزم تو استوار رہا۔ نیت تو ثابت تھی' جستجو تو جاری رہی تھی۔" اس نے میرے فنجان میں کچھ اور قہوہ ڈال دیا۔ میں نے منع نہیں کیا۔ قہوہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں نے دو گھونٹ میں ختم کر لیا۔

"تم بھی کہیں بدلیں' بالکل وہی ہو۔ مجھے یاد ہے' پچھلی مرتبہ بھی تم نے یہی کچھ کہا تھا' اور کوئی کہہ بھی کیا سکتا ہے۔ کسی کے پاس ان تشفیوں کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے۔ سب مجبور ہیں' میری طرح۔ لوگ دعاؤں کی قبولیت' ستاروں کی کرشمہ سازی اور نوشتۂ دیوار کی بات کرتے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم' میرے لیے دعاؤں کی قبولیت کا وقت کب آئے گا۔ ستارے کب مہربان ہوں گے اور دیوار کا لکھا کب بدلے گا۔" میرے سینے میں ہوک سی اٹھی اور میری آواز ڈولنے لگی "میرے لیے تو شاید سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ اب شاید کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ یوں ہی میں بھٹکتا رہوں گا' یہی کچھ بس یہی ہوتا۔۔۔"

"تم ایک باہمت اور بہادر نوجوان ہو۔ تم نے تو مثال قائم کی ہے۔ تم نے تو۔۔۔"

"مگر کیا حاصل؟ میں نے کیا قصور کیا ہے' کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔" میری آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"ارے رے' یہ کیا! نہیں نہیں' یہ نہیں۔" وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتی ہوئی مسہری کے پاس آ کے بے تابانہ اس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن اس کے لمس میں ایسی جاذبیت اور وارفتگی تھی کہ میری آنکھیں اور جلنے اور کھلنے لگیں۔ مجھے کچھ یارا ہی نہ رہا۔ میں سسک سسک کے بلک بلک کے روتا رہا۔ اس نے میرا سر اپنی بانہوں میں جکڑ لیا تھا پھر وہ اضطراری انداز میں میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ میرے آنسوؤں سے اس کا کرتا بھیگ گیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے سراپا میں جذب ہو جاؤں۔ میرا وجود انہی آنسوؤں میں تحلیل ہو جائے۔ اس کے ہاں بہت گداز تھا' بہت چھاؤں تھی۔

جانے کب یہ آنسو تھمے۔ سیلاب بھی کہیں جا کے تھم جاتا ہے۔ اس نے اپنے آنچل سے میرے آنسو پونچھے' میرے بھیگے ہوئے گال خشک کیے' میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی لبریز تھیں۔ میں نے اسے بھی رلا دیا۔ میری حالت کسی بچے کی سی ہو گئی تھی۔ اس نے گلاس بھر کے مجھے پانی پلایا۔ میرے اوسان کچھ

ہوئے تو ندامت نے آگھیرا۔
کمرے میں دیر تک سکوت رہا۔
''تم جاؤ اب' صبح ہونے والی ہے۔'' میں نے ناتوانی سے
کو جی چاہتا تھا کہ وہ میرے پاس ہی رہے۔
''ہاں' اب مجھے جانا چاہیے۔'' وہ بدبداتے ہوئے بولی
ن تم اپنے آپ کو سنبھالے رکھو گے۔''
''مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے تندی سے کہا ''بس
ے ہی کبھی کبھی ایسا کچھ ہو جاتا ہے اور میں تنہا اپنے آپ
نٹ لیتا ہوں' میں نے تمہیں بھی پریشان کیا۔''
''کوئی سب کے سامنے' ہر ایک کے سامنے نہیں
تا۔'' اس کی آواز بھی بکھری ہوئی تھی ''آنسوؤں کا بہہ جانا
اچھا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ رکے ہوئے
نسو زہر ہوتے ہیں اور آنسوؤں کے بغیر آدمی نامکمل ہوتا
ہے۔''

صبح بہت تیزی سے طلوع ہوتی ہے۔ اندھیرا کم زور
نے لگا تھا۔ اذانوں کی آواز پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی ''جا رہی
ہو۔'' میں نے جھپکتی پلکوں سے کہا۔
''اب تم آرام کرو' پوری رات ہو گئی۔''
''میرا کچھ نہیں' تم یقیناً بے آرام ہو گئیں۔''
''میرے لیے اس سے اچھی رات کیا ہوگی۔''
''تمہیں تلخیوں اور آنسوؤں سے واسطہ پڑا۔''
''لیکن ان کی نسبت تم سے تھی۔'' اس نے یاسیت آمیز برجستگی سے کہا۔
میری ویران نظریں اس کے چہرے پر بھٹکنے لگیں۔
اس نے دروازے کا رخ کیا تو میں بھی مسہری سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے چاہا کہ اس کے کمرے تک اسے پہنچا آؤں۔
''میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے دروازے کے پاس جا کے کہا۔

دروازے سے باہر نکلتے نکلتے وہ ٹھہر گئی اور پلٹ کے اس نے مجھے ایک نظر دیکھا۔ میں نے بے اختیار بڑھ کے اپنے بازو پھیلا دیے۔ ایک لمحے بعد وہ میرے بازوؤں میں سمٹ آئی۔ میں نے جیسے پھولوں کو' ریشم کو اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ میرا جسم شل سا ہونے لگا۔ میرا جسم جیسے میرا نہ رہا ہو' جیسے میں کوئی اور شخص ہوں' جیسے میں اپنے آپ سے بچھڑ رہا ہوں۔ اس نے اپنا چہرہ میرے شانے پر ٹکا دیا تھا یا چھپا لیا تھا۔ اس کی دھڑکنیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔
یکایک میں نے اسے آزاد کر دیا۔
وہ مجھے سلگتی آنکھوں سے دیکھتی رہی مگر مجھ سے اس کی طرف نہ دیکھا گیا۔ میں نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ دوسرے لمحے وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اسے پکارنا چاہا اور گنگ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جلد ہی وہ راہداری کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔
میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا اور بستر پہ آ کے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن نیند نہیں آئی۔ آدمی کو کبھی اپنا آپ بھی کیسا اجنبی لگتا ہے۔ میرا بھی کچھ یہی حال تھا۔ میں شاید کوئی فیصلہ' کوئی ارادہ کرنا چاہتا تھا لیکن دماغ ہی ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ کھڑکیوں اور روشن دانوں سے اجالا کمرے میں در آیا تھا' پرندوں کی چہکار بھی معتدل ہو گئی تھی۔ یہ کیسی حالت ہے آدمی کو نیند بھی نہ آئے اور وہ بیدار بھی نہ ہو۔ نیم خوابیدگی و نیم بیداری شاید معذوری ہی کی کوئی کیفیت ہے۔ کمرے کے باہر بھی چہل پہل ہو گئی تھی۔ میں بستر پہ پڑا اپنی کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈتا رہا اور ایک سناٹا سا مجھ پر طاری رہا۔ شاید میرا ارادہ کھو گیا تھا۔ ارادہ بھی تو کھو جاتا ہے۔ ایسی بے بسی تو اسی محرومی میں ہوتی ہے۔
جانے کتنا وقت گزر جاتا اور جانے کتنا وقت ہوا تھا۔ کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ میری نظر فوراً گھڑی پر گئی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ دستک دوسری بار نہیں ہوئی۔ لیکن میں نے اٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ وہ جہانگیر تھا۔ بہت تر و تازہ لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میری طبیعت کے بارے میں اضطراب کا اظہار کرنے لگا۔
''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے بظاہر مستعدی سے کہا۔
''کہاں' معلوم ہوتا ہے' آپ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ آنکھیں سوجی سوجی ہیں۔ ناشتے پر بھی آپ کو پوچھ رہے تھے۔ زری آپا نے کہا' آپ کو آرام کرنے دیا جائے۔''
میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بٹھل کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ تو ناشتے سے پہلے گھر سے نکل گیا ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی ''کب؟ کس وقت؟''
''شاید بہت سویرے۔'' وہ بے یقینی سے بولا۔
''ناشتا بھی نہیں کیا؟''
''میرے سامنے تو نہیں کیا لیکن زری آپا نے انہیں ایسے کیسے جانے دیا ہوگا۔'' میری بے چینی جہانگیر نے محسوس کر لی۔ اس نے مضطربانہ سادگی سے پوچھا ''کیا بات ہے بھائی! خیریت تو ہے؟''
''ہاں ہاں۔'' میں نے بہ عجلت خود کو ہموار کیا اور جہانگیر کے مزید سوالوں سے گریز کے لیے اسے چائے بنوانے کی ہدایت کی ''اتنی دیر میں' میں تیار ہوتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

کسی معمول کی طرح وہ لپکتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔
منہ ہاتھ دھو کے اور نیا لباس پہن کے میں بیٹھک میں آیا تو کوئی نیا آدمی لگ رہا تھا' کم سے کم اپنے آپ کو۔ چوکی پر ناشتا سجا ہوا تھا۔ نیساں' زہرہ' بڑی سلمٰی اور یاسمن نہایت سرگرم تھیں۔ یوں اکیلے سب کے سامنے ناشتا کرتے ہوئے بڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ انہیں بھی خیال تھا۔ میرا ساتھ دینے کو وہ بھی بیٹھ گئیں اور ٹونگتی رہیں۔ جہانگیر البتہ پیش پیش تھا۔ زریں وہاں نہیں تھی۔ کئی بار جی میں آیا' اس کے بارے میں پوچھوں لیکن میں خاموش رہا۔
بٹھل نے پرسوں رات روانگی میں چند دن بتائے تھے تو اب وقت بہت کم رہ گیا تھا اور یہ وقت مجھے زیادہ تر اسی کے ساتھ گزارنا چاہیے تھا۔ اس میں میرے لیے عافیت کا پہلو بھی تھا کیونکہ تنہائی میں طرح طرح کے وہم سر میں پنپنے لگتے تھے۔ بار بار دھیان بٹھل کی طرف جاتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس باقاعدگی سے اڈے پر اس کی حاضری کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ ہریا اور بچھو کی موت کو سات دن ہو گئے تھے۔ بٹھل نے روانگی کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اب اسے یہ چند دن تو حویلی کے لیے وقف کر دینے چاہئیں تھے۔ میری طرح سبھی کو بٹھل کی یہ مستقل ناموجودگی کھٹکتی ہوگی۔
دوپہر کے کھانے میں زریں بھی موجود تھی۔ اس کی سنجیدگی میں بڑی شادابی تھی۔ گلابی جوڑے میں ملبوس' سراپا گلاب ہو جیسے۔ یہ رنگ اس پر خوب جچتا تھا۔ لباس کے اور اس کے رنگ میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ زریں کو خود پر بڑی قدرت تھی۔ گزشتہ رات کا کوئی تاثر میں نے اس کے چہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن یہ میری بے ہنری ہی تھی۔ کسی کو پڑھنا ہی نہ آتا ہو اور اخذ کرنا ہی نہ آتا ہو تو وہ کیا پڑھے اور کیا جانے۔ مجھے اس کے معمول سے ایک طمانیت محسوس ہوئی۔ کھانے کے دوران میں اپنی عادت کے مطابق وہ سرکاتے میرے آگے یکے بعد دیگرے ڈونگے رکھتی رہی۔ کھانے کے بعد نیساں' جہانگیر اور خانم وغیرہ کا ارادہ تاش جمانے کا تھا مگر زریں نے مجھے آرام کا اشارہ کیا' میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور مجھے نیند نے آلیا۔
خانم مغرب کے وقت سونا اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ سو انہوں نے نیساں کو بھیج کے مجھے اٹھوا دیا۔ آتے ہی نیساں نے خانم کی طرف سے حکم صادر کیا کہ بابر بھائی! دونوں وقت مل رہے ہیں۔ میں نے تعمیل کی اور تازہ دم ہو کے ان کے دیوان بیٹھک میں آ بیٹھا۔ وہاں تو ایک محفل آراستہ تھی۔ مرشد' مجو میاں اور نصیر بابا بھی شریک تھے جو اب گھر ہی کے کوئی فرد ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ گلے سے لپٹ جاتے اور بے تحاشا دعائیں دینے لگتے۔ گھر کی بہت سی ذمے داریاں' سودا سلف لانے کا کام انہوں نے سنبھال لیا تھا۔ وہ عموماً کسی نہ کسی بہانے خود کو مصروف رکھ کے ہم سب کے ساتھ بیٹھنے سے اجتناب کرتے تھے۔ آدمی' عزت کا سب سے زیادہ آرزومند ہوتا ہے اور وہ عزت جو دولت کے بغیر حاصل ہو' سب سے بڑی مرتبت یا سب سے بڑی دولت ہے۔ اتنی جلد ان کے چہرے کی جھریاں بھر رہی تھیں اور رنگ نکھر رہا تھا۔ پانچوں وقت کی نماز وہ پابندی سے ادا کرتے تھے۔
زریں نے ان کے لیے نئے جوڑے بنوائے تھے۔ وہاں سے تو وہ ایک ہی جوڑے میں آئے تھے' اس کمینے سید محمود علی کی برسوں کی رفاقت اور خدمت کا صلہ ایک جوڑا تھا۔ اسے بھی انہیں جلا دینا چاہیے تھا یا اس وحشی کو ڈاک کے ذریعے واپس کر دینا چاہیے تھا۔
بٹھل' رات کے کھانے کے وقت واپس آ گیا۔ میں نے اپنے سر میں ڈنک مارتے ہوئے سوال خود تک محدود رکھے۔ یہ بے نیازی اس کا شیوہ اور یہ سوزش و شورش میرا حصہ تھی۔ کھانے کے بعد رات گئے تک تقریباً سبھی اس کے گرد جمع رہے۔ گزشتہ رات کی طرح میں زریں کو اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کر سکتا تھا لیکن سوچتا ہی رہ گیا۔
دوسرے دن صبح میرے اٹھنے سے پہلے بٹھل پھر غائب تھا۔ اس روز ناشتے کے بعد میں نے لائبریری کا رخ کیا ہی تھا کہ دروازے میں داخل ہوتے ہوتے میرے قدم ٹھٹک گئے۔ مجھ سے پہلے وہاں فروزاں موجود تھی اور کسی کتاب کی ورق گردانی میں محو تھی۔ چند لمحے میں شش و پنج سے دوچار رہا کہ واپس کیوں نہ چلا جاؤں لیکن فروزاں کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے سرخم کر کے مجھے آداب کیا تو مجھ سے واپس نہ جایا جا سکا۔ فروزاں سے اب کوئی ایسی اجنبیت نہیں رہی تھی۔ صبح و شام آمنا سامنا ہوتا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل ناشتے پر اسے دیکھا تھا لیکن اس طرح خلوت کا موقع پہلے نہیں ملا تھا۔ کوئی اور بات نہ سوجھی تو میں نے جھجکتے ہوئے کہا ''اچھی ہیں آپ؟''
''جی' جی'' وہ کسی قدر گھبرائے ہوئے انداز میں بولی ''آپ بیٹھیے نا۔''
''جی' جی ہاں'' میں بھی کچھ سٹپٹا سا گیا تھا' بے ارادہ اس سے کچھ دور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری موجودگی شاید آپ کے مطالعے میں حارج ہو'' میں نے بہ مشکل کہا ''میں پھر آ جاؤں گا۔''

"نہیں، نہیں" وہ تکلف آمیز عجلت سے بولی "میں تو ایسے ہی کسی نئی کتاب کی تلاش میں آنکلی تھی۔ سنا تھا کل ہی نئی کتابوں کا پارسل آیا ہے۔"

"ہاں، نصیر بابا نے بتایا تھا' آپ کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔"

"بس یوں ہی" وہ شرما سی گئی اور اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے۔

"کون کون سے موضوعات آپ کو پسند ہیں؟"

"ہر اچھی تحریر' افسانہ و شاعری' ادبیات کہئے' کچھ کچھ تاریخ بھی۔" وہ کچھ سوچ سوچ کے اٹک اٹک کے بولی۔ اس کے انداز میں بلا کی شائستگی اور نفاست تھی۔ "اور آپ! کوئی بتا رہا تھا' آپ کو بھی مطالعے کا خاصا شوق ہے" اس نے ترنم ریز آواز میں پوچھا۔

"مجھے مطالعے کا وقت کہاں ملتا ہے۔ اسے شوق کی کمی ہی کہئے لیکن مطالعہ تو کرنا چاہیے۔ مطالعے سے دریچے کھلتے ہیں۔"

"آپ کو کون سے موضوعات ....؟" اس نے سمٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"میرا بھی کچھ یہی ہے" میں نے ہچکچا کے کہا۔ "بالکل آپ جیسا' اصل میں کچھ فکر انگیز قسم کی تحریریں ہی اچھی لگتی ہیں۔ نئے خیال' نئے لفظ' نئی ترکیبوں سے مرصع' پہلے سے نئی' پہلے سے کچھ مختلف۔"

"اور ایسی تحریریں کم کم ہی ملتی ہیں" وہ مستعدی سے بولی۔ اس کی مدھم آواز میں بھی رس گھلا ہوا تھا۔

"کسی اچھی تحریر تک پہنچتے پہنچتے بڑی ناگوار تحریروں سے گزرنا پڑتا ہے اور مشکل یہ ہے' ایک معیاری تحریر کے مطالعے کے بعد کم تر درجے کی تحریروں میں جی نہیں لگتا اور یوں آدمی کا دل مطالعے سے اکتا بھی سکتا ہے" میں نے خود کو لگام دی' کہیں میں تجاوز تو نہیں کر رہا ہوں۔ اس کے لبوں پر دل آویز مسکراہٹ کھلی دیکھ کے مجھے تقویت حاصل ہوئی۔ میں نے پوچھا "آپ تو فارسی خوب جانتی ہوں گی؟"

"بس جانتی ہوں۔"

"آپ کی مادری زبان تو فارسی ہے۔"

"جی ہاں" اس نے دھیمی آواز میں کہا "لیکن مطالعے اور باقاعدہ زبان جانے بغیر مادری زبان سے کیا ہوتا ہے۔"

"آپ کی بات سے مجھے یاد آیا' عرصہ ہوا' ہمارے کالج میں ایک سن رسیدہ پروفیسر ہوتا تھا۔ عجب عجب قسم کی دلیلیں تراشتا' کلیے وضع کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا' زید اس علم سے جو اکتسابی ہو۔ علم سے اس کی مراد زبان ہی تھی۔ کیونکہ اس وقت یہی بحث ہو رہی تھی کہ زید کی مادری زبان انگریزی ہے اور بکر نے ذوق و شوق سے انگریزی سیکھی ہے' دونوں میں بہتر کون ہوا؟ پروفیسر سیکھنے والے کو فوقیت دیتا تھا لیکن کوئی کتنا ہی سیکھ لے' میرا خیال ہے مادری زبان کی برتری تو اپنی جگہ ہے۔"

"مادری زبان بھی اکتساب کے بغیر نامکمل ہے" وہ باوقار انداز میں بولی۔

"یعنی کچھ یوں ہے' دونوں خوبیاں آمیز ہوں تو بات بنے" میں نے لپکتی آواز میں کہا "آپ کا تو علمی و ادبی خانوادے سے تعلق ہے۔ فارسی میں یقیناً بہت کچھ پڑھا ہوگا آپ نے؟"

"سیکھ رہی تھی لیکن بس ...." اس کی آواز جیسے ٹوٹ گئی اور چہرے پر گھٹا سی چھانے لگی۔

مجھے دھچکا لگا۔ افسوس بھی ہوا' خجالت بھی ہوئی۔ واقعی اس کی عمر تو سیکھنے کی تھی کہ سید محمود علی نے اس کے والدین اس سے جدا کر دیے۔ میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا "خیر' آپ یہ سلسلہ اب بھی جاری رکھ سکتی ہیں۔ آپ چاہیں گی تو یہاں کسی فارسی استاد کا بندوبست ہو جائے گا۔"

وہ ایک آہ بھر کے رہ گئی۔

وہ ایک ماہ جمال لڑکی تھی' حسن و جمال کا بھی کوئی دبدبہ ہوتا ہے۔ باربار احتیاط کا خیال آتا تھا کہ کہیں میری کوئی بات اس نازک اندام کو ناگوار خاطر نہ ہو جائے۔ غالباً اسی لیے میری زبان لکنت کرنے لگتی تھی۔ کچھ یہ امتناع پہلی مرتبہ کی روبہ روئی' دوبہ دوئی کے سبب سے بھی ہوگا۔ یقیناً اسے احساس ہوگا کہ میں نے اس کے زخم پر دانستہ خار زنی نہیں کی ہے اور جو کسی مہذب شخص کا وتیرہ ہوتا ہے' وہ اپنے دکھ' اپنے ستم خود ہی تک محدود رکھتا ہے۔ ان کا اظہار کر کے وہ دوسرے کو بے آرام نہیں کرتا۔ ایک وقفہ سکوت کے بعد وہ سرگوشیانہ انداز میں بولی "آپ کو فارسی بہت پسند ہے؟"

"بے حد!" میں نے کسی قدر جوش سے کہا "فارسی تو بہت شیریں' بڑی نرم و نازک زبان ہے۔"

"جس زبان میں ڈ' ٹ' ٹھ' ڈھ وغیرہ جیسے کرخت حروف نہ ہوں' اس کی نفاست اور فصاحت اور لطافت کیا کہنے۔"

وہ بے ساختہ کھل کھلا پڑی اور ایسا لگا جیسے پھل جھڑیاں چھوٹ پڑی ہوں' کسی نے ستار کے تار چھیڑ دیے ہوں۔

"فارسی میں' کہتے ہیں' شاعری بے پناہ ہے بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ فارسی زبان بنی ہی شاعری کے لیے ہے۔

میں نے ابتدا میں تھوڑی بہت فارسی سیکھی تھی۔ اب تو سب کچھ بھول بھال گیا ہوں۔ کاش یہ سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی وقت ملا تو وہ زبانیں ضرور سیکھوں گا' ایک فارسی' دوسری فرانسیسی۔ میں آپ کو بتاؤں' میرے ایک بزرگ دوست اور بھائی تھے' راج کرشنا۔ پولیس کے بہت بڑے افسر تھے لیکن پولیس میں ہونے کے باوجود ایک عالم آدمی تھے۔ ان کے پاس کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ انہیں بہت عمدہ انگریزی آتی تھی لیکن وہ فرانسیسی اور فارسی زبانوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔"

آپ کی مادری زبان تو اردو ہے' اردو داں جلد فارسی سیکھ سکتے ہیں" اس کا لہجہ مربیانہ بھی تھا' والہانہ بھی۔

"مگر کبھی فرصت ملے بھی تو۔"

"ابتدائی طور پر تو میں بھی کچھ مدد کر سکتی ہوں" وہ آہستگی سے بولی۔

"آپ!" میرا جسم لرز گیا "آپ جیسا استاد ہو تو پھر کوئی کیوں نہ پڑھے" میری زبان سے نکل گیا اور میں نے اس بے تکلفی پر خود کو سرزنش کیا۔ سب سے بڑا نظم و ضبط زبان ہی کا ہوتا ہے اور یہی آدمی سے نہیں ہو پاتا۔

اس کے رخسار تمتما اٹھے' جیسے شعلے سے بھڑک اٹھے ہوں مگر جلد ہی وہ سنبھل گئی گویا اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر وہ کھنچی ہوئی' دبی ہوئی آواز میں بولی "آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں' ہمیں اب جانا ہے" میں نے انکسار سے کہا۔

"پھر کب' کب واپسی ہوگی؟"

"دیکھئے' کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن جلد ہی' جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا" وہ چپ رہی' میں نے کہا "یہ بتائیے' آپ کو یہاں کسی قسم کی پریشانی تو نہیں؟"

"کیسی پریشانی؟" وہ ہراساں سی ہو گئی۔

"ہر نئی جگہ ذرا سا وقت تو لیتی ہے۔ ہمارے پاس یہی کچھ تھا۔ کوئی چیز آپ کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتی ہو تو درگزر کر دیجئے گا۔ اتنے لوگوں میں کبھی کبھی الجھن ہو ہی جاتی ہے۔"

"یہاں کا تو ہم تصور ہی کر سکتے تھے" اس کے لہجے سے ممنونیت ٹپک رہی تھی۔

"آپ سے میری بات ہی نہیں ہو پائی اور میرے پاس کہنے کے لیے کوئی نئی بات بھی نہیں۔ یہ تلقین تو کبھی نے آپ کو کی ہوگی کہ یہاں آپ خود کو کچھ غیر نہ سمجھیں' کسی قسم کی اجنبیت نہ برتیں۔ گھر ایک دوسرے سے مماثلت کے باوجود ایک جیسے نہیں ہوتے اور زندگی میں گھر بدلتے رہتے ہیں۔ اب یہ آپ کا نیا گھر ہے۔ اس پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا یہاں کے کسی دوسرے مکین کا۔"

"یہ گھر تو ہماری کسی نیکی کی جزا ہے" وہ جھن جھناتی آواز میں بولی۔

"دیکھئے' آپ کے نقصان کی تلافی تو کسی طور نہیں ہو سکتی۔ جانے والوں کا بدل نہیں ہوتا لیکن جانے والے کو جانا ہی ہوتا ہے۔ سب کی یہی آرزو ہے' یہاں آپ کو کوئی تنگی نہ ہو۔ پھر کچھ عرصے بعد ظفر میاں بھی آجائیں گے' وہ اب تک آ بھی جاتے مگر بابا یہاں آ کے کچھ ایسے مصروف ہو گئے کہ اس طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ ظفر میاں کے آجانے کے بعد آپ کو اور تقویت اور طمانیت ہوگی پھر انہیں اختیار ہے۔ وہ یہاں رہیں یا کہیں اور۔"

وہ سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر مضطربانہ سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس نے عزم سے کہا "ہم یہاں سے کہیں اور نہیں جائیں گے' ہمیں معلوم ہے' اس سے بہتر تلافی ممکن نہیں ہو سکتی۔ ظفر آجائیں تو اچھا ہے لیکن اگر انہوں نے یہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش کی تو شاید ہم ان کا ساتھ نہ دے سکیں' ہم انکار کر دیں گے۔"

میرے ذہن میں بہت سی باتیں منڈلائیں۔ اس کے لہجے کا اثبات دیکھ کے مجھے ہمت نہیں ہوئی "جو آپ مناسب سمجھیں" میں نے متانت سے کہا "یہ تو اور اچھی بات ہے۔ ہمارا ایک دوسرا گھر بھی ہے۔ سفر سے واپسی پر سب کو وہاں لے جانے کا ارادہ ہے۔ آپ نے بمبئی میں ابا جان کے گھر کے بارے میں شاید کچھ سنا ہو؟"

"مجھے معلوم ہے" وہ مسکرا کے بولی۔

"پھر تو مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میری کوشش ہوگی' اب کے جلد واپسی ہو جائے۔ یوں ہم خط لکھتے رہیں گے لیکن چونکہ ہم آج اس جگہ' کل اس جگہ' ہمارا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا اس لیے ہمیں آپ کا خط نہیں مل سکتا اور اس کی نوبت بھی نہ آئے شاید۔ یہاں زری اور خانم آپا ہیں۔ ان کی موجودگی میں آپ کو کسی قسم کی گھٹن نہیں ہونی چاہیے۔"

"وہ تو' وہ تو..." فروزاں سیمابی آواز میں بولی "ان کے لیے کیا کہا جائے۔ خدا نے انہیں اعلیٰ صفات سے نوازا ہے۔ وہ تو سراپا محبت ہیں۔ ان کا لطف و کرم تو بے پایاں' بے کنار ہے۔"

"خدا کرے' ایسا ہی رہے۔"

فروزاں کی تابندہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے بیان

میں کتنی معصوم اور پرجوش ہے۔ چند ثانیوں بعد وہ نازبردارانہ لہجے میں بولی "آپ سے ایک گزارش ہے۔"

"ہاں ہاں، کہیے۔ کیا بات ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"آپ مجھے آپ کہہ کے کیوں مخاطب کرتے ہیں؟"

"بس یوں ہی، نجانے کیوں۔" میں نے بہکی بہکی آواز میں کہا "مگر آپ بھی تو اس جرم کی مرتکب ہو رہی ہیں۔"

"آپ کی بات دگر ہے۔"

"میری بات کیا ہے؟" میں نے لطف لیا۔

"مجھ سے نہیں کہا جائے گا" وہ شرمگیں لہجے میں بولی "یاسمن کو تو آپ اس ادب و احترام سے مخاطب نہیں کرتے۔"

"لیکن آپ.... ٹھیک ہے" مجھے اس کی دل بستگی عزیز تھی۔ میں نے وعدہ کیا "چلیے میں کوشش کروں گا۔"

"اور.... اور آپ سے کچھ اور بھی کہنا تھا۔"

"کیا؟" میں نے گھبرا کے کہا "دیکھیے ممنونیت کی کوئی بات۔"

"آپ نے تو...."

وہ شاید یہی کچھ کہنا چاہتی تھی یا کوئی اور بات، سیڑھیوں پر دھمکتی چاپوں سے وہ رک گئی۔

کوئی تیزی سے سیڑھیاں طے کر رہا تھا۔ وہ نیساں تھی۔

"ارے بابر بھائی!" وہ اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولی "آپ یہاں ہیں، سارے میں ڈھونڈ لیا۔"

"خیریت تو ہے؟ ذرا تسلی سے بھئی۔"

"ممابتاتے ہیں" نیساں پٹ پٹاتی آواز میں بولی "بابا نے آپ کو بلایا ہے، دو آدمی پیغام لے کے آئے ہیں۔"

"بابا نے بلایا ہے" میں کرسی سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا کہتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم، آپ جا کے پوچھیے۔"

میں نے فروزاں کی طرف دیکھا اور معذرت چاہی۔ وہ بھی سراسیمہ ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کے، میں ڈیوڑھی میں پہنچا۔ مما کے پاس اڈے کے دو آدمی بیٹھے تھے۔ انھیں میں جانتا تھا، نام یاد نہیں آ رہے تھے۔ کسی دھوکے کا امکان نہیں تھا۔ وہ اڈے کے مستند آدمی تھے۔ پھر بھی میں نے تصدیق چاہی "استاد کہاں ہیں، اس وقت؟"

"اڈے پر ہیں بھیا!" دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

انھیں وہیں بٹھا کے میں اندر آیا، چپل کے بدلے جوتیاں پہنیں، واسکٹ پہنی اور احتیاطاً چاقو جیب میں رکھ لیا۔

راستے بھر میں مستعد رہا لیکن ان دونوں کا رخ اڈے ہی کی جانب تھا۔

اڈے کی چوکی پر بٹھل بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد بھیڑ لگی ہوئی تھی اور حقہ سلگ رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کے سب اٹھ گئے اور انھوں نے مجھے گھیر لیا۔ بٹھل کے چہرے پر چھائے ہوئے اطمینان کے باعث میں نے سکون کی سانس لی۔ سارے راستے طرح طرح کے وسوسے مجھے تنگ کرتے رہے تھے۔ بٹھل نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلا لیا۔ میں نے اپنی اس اچانک طلبی کا مقصد جاننے میں تحمل کیا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ چوکی پر کھانا چن دیا گیا۔ وہ سادہ سا کھانا تھا۔ کھانے کے بعد حقے کے چند لمبے کش لے کے بٹھل اٹھ گیا۔ استاد سلامی اور اڈے کے دو آدمی بھی ہمارے ہم راہ تھے۔ تانگے میں بیٹھ کے ہم بازار آ گئے اور بٹھل کپڑے کی دکانوں پر خریداری کرتا رہا۔ مجھ سے بھی کپڑے کی اقسام اور رنگ کے بارے میں وہ پوچھتا جاتا تھا۔ مجھے کپڑوں کی قسموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن جو نظر کو بھاتا، میں نشان دہی کر دیتا۔ اس نے مردانہ کپڑے بھی خوب خریدے۔ تنویر، ارشد، مجو میاں اور جہانگیر کے لیے قیمتی قیمتی کپڑے۔ میں سمجھ گیا، یہ روانگی کی تیاری ہے۔ ہم خالی ہاتھ واپس آئے تھے۔ اب جاتے وقت ہمیں ایسے نہیں جانا چاہیے تھا۔

بازار میں شام ہو گئی۔ کپڑوں کے کئی پلندے بن گئے تھے۔ انھیں ساتھ آنے والے آدمیوں کے سپرد کر کے ہم آگے چلے آئے۔ استاد سلامی ہمارے ساتھ رہا۔ پھر فیقی آباد کے بڑے اسپتال آ کے ہم نے دم لیا۔ برکھا کے باپ کاشی داس کی جان اس کے ڈھانچے میں کہیں اٹک گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے دماغ کی رگ پھٹ چکی ہے۔ انھیں حیرت تھی کہ اتنے دنوں سے وہ کیسے زندگی جھیل رہا ہے۔ آدمی کو موت بھی پریشان کرتی ہے۔ کاشی داس کو بالکل ہوش نہیں تھا، زندہ لاش کے مانند تھا۔ اسپتال سے نکلتے نکلتے اندھیرا چھانے لگا اور مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ چلتے چلتے وہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔ تھانے دار موجود نہیں تھا لیکن اس کا ماتحت اس کی جگہ سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ ایک سنجیدہ شخص تھا۔ اس نے ہمیں کرسیوں پر بٹھایا اور خوش خلقی سے ہماری آمد کا مقصد و مدعا پوچھا۔ استاد سلامی نے مجھے اور حیران کیا۔ اس نے دہائی دی کہ اس کے اڈے کے دو آدمی ہیرا اور بجھو مارے گئے۔ اتنے دن گزر گئے پولیس نے اب تک قاتلوں کی گرفتاری میں کوئی پیش رفت

نہیں کی۔ پولیس کی اس بے توجہی اور سرد مہری سے اس کے اڈے کے آدمی نہایت شاکی اور بے چین ہیں، مایوس ہیں۔

پولیس کے سامنے اڈے کے ایک استاد کی طرف سے اس طرح کے شک اور خدشوں کا اظہار میرے لیے نیا بھی تھا، عجیب بھی۔ استاد سلامی پولیس افسر کو قائل کرتا رہا، بٹھل اس کی ہم نوائی کر رہا تھا کہ شہر میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں، بازاروں اور محلوں پر دہشت چھائی ہوئی ہے۔ آگے کوئی اور بھی سنگین واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ پولیس کی ناکامی سے شوریدہ پشتوں کے حوصلے اور بڑھ سکتے ہیں۔ وہ پاگل اڈے پر بھی آنے کی جرات کر سکتے ہیں۔ استاد سلامی نے کہا کہ اس نے اپنے آدمیوں کو اب تک تھامے رکھا ہے، اب وہ انھیں اڈے سے بہت کم باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے لیکن کب تک وہ اس کے قابو میں رہیں گے، کب تک پولیس کی طرف سے کسی جوابی کارروائی کا انتظار کرتے رہیں گے۔ ان کی عجیب کیفیت ہے۔ اپنے ساتھیوں کے خون پر وہ جتنے غم زدہ ہیں، اتنے ہی مشتعل بھی ہیں، مایوس بھی اور کسی حد تک خوف زدہ بھی۔

پولیس افسر تندہی سے استاد سلامی کی عرض داشت پر ہمدردی کا اظہار کرتا رہا۔ استاد سلامی اور بٹھل نے تجویز پیش کی کہ کسی ممکنہ فتنے کے پیش نظر چند دنوں کے لیے اڈے پر یا اڈے کے آس پاس پولیس تعینات کر دی جائے تو بہتر رہے گا۔ رفع شر کے لیے یہ مشورہ معقول تھا۔ پولیس افسر نے اس کی تائید کی اور ہمیں عزت سے رخصت کیا۔

پولیس اسٹیشن سے نکل کر ہم تینوں سڑکوں پر ٹہلتے رہے۔ پھر ایک چائے خانے میں آ کے ہم نے چائے پی اور فضول میں خاصا وقت گزارا۔ اڈے واپس پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔

پولیس افسر نے وعدہ نبھانے میں بڑی مستعدی دکھائی۔ اڈے کی عمارت کے باہر تین بندوق بردار سپاہی موجود تھے۔ دو ایک کو ہم نے گلیوں میں گشت کرتے دیکھا تھا۔ استاد سلامی نے ان سے بہت تپاک سے سلام دعا کی۔ وہ اس کی جان پہچان کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ نہ ہوتے تو پولیس والوں سے جان پہچان میں کون سی مشکل ہوتی ہے۔ استاد سلامی نے انھیں رات کے کھانے کی پیش کش بھی کی اور کہا، کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ کوئی تکلف نہ کریں۔ اڈے کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ کھانا بھی تیار ہی تھا۔ ہمارے پہنچنے کی دیر تھی کہ دستر خوان بچھا دیا گیا۔

کھانے کے بعد استاد سلامی، بٹھل اور اڈے کے چند آدمی باہر نکل آئے۔ مجھے بھی انھوں نے ساتھ رکھا تھا۔ ہیرا اور بچھو کی موت کا آٹھواں دن تھا۔ اڈے پر انھی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہر شخص مغموم تھا۔ انھیں اب بازار کی طرف بڑھتے دیکھ کے میرا سر گھومنے لگا۔ بازار میں دن کا سماں تھا۔ در و بام نے جیسے گھنگھرو باندھ رکھے ہوں۔ سارا علاقہ ساز و آواز سے گونج رہا تھا۔ ایک بالا خانے پر ہمارے قدم رکھتے ہی نغمہ سرائی بند ہو گئی۔ استاد سلامی کا وہاں بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی حاکم جلوہ افروز ہو گیا ہو۔ ہمیں ایک جانب قالین پر بٹھا دیا گیا۔ ہم سے پہلے وہاں اور بھی تماش بین موجود تھے۔ ہماری جگہ خالی رکھی گئی تھی۔ سب ہماری آمد کے منتظر تھے۔ بٹھل کے لیے پیچوان کا اہتمام تھا۔ چہکتی مٹکتی ہوئی کم سن لڑکیاں پھلوں کے طشت، گلدستے اور گلوریاں لے آئیں۔ انھوں نے موتیا کے ہار ہمارے گلوں میں ڈالے۔ قہوہ بھی آ گیا۔ یہ ایک بڑا بالا خانہ تھا، خوب سجا ہوا، زرنگار پردے، منقش در و دیوار۔ نفری بھی کم نہیں معلوم ہوتی تھی۔ دراز قد، فربہ اندام نائکہ نے ہم سے باقاعدہ اجازت مانگی اور دل کش نقش و نگار کی ایک نوجوان سانولی سلونی لڑکی نے از سر نو تان اٹھائی۔ اس کی آواز بھلی تھی، ادائگی بھی بری نہیں تھی۔ کلام بھی معاملہ بندی، چھیڑ خانی کا خوب یاد تھا۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت کی دو نوخیز لڑکیاں رقص کناں تھیں۔ واجبی سا رقص آتا تھا۔ لباس ہی ایسا چمکتا دمکتا، سلمے ستاروں ٹنکا پہنا ہوا تھا کہ رقص کی تیزی و طراری دو چند ہو گئی تھی۔ لکھنؤ میں چاندنی بانو کی نغمہ سرائی اور رقص کاری دیکھنے کے بعد اب سب کچھ ہیچ معلوم ہوتا تھا۔ میرا تو دماغ ہی الجھا ہوا تھا، محسوس کیا کرتا۔ میں تو بٹھل اور استاد سلامی کی وجہ سے خود کو جکڑے ہوئے وہاں بیٹھا تھا اور کوئی پہیلی تھی تو مسلسل اسے بوجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

انھیں وقت کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ ایک اور مغنیہ آ گئی پھر ایک اور پھر چھریرے بدن کی ایک خوش چہرہ پختہ عمر کی عورت نے سر الاپنے شروع کر دیے اور سماں باندھ دیا۔ وہ بہت سریلی تھی، آواز میں گونج تھی اور اعتماد بھی بلا کا تھا۔ دوسرے تماشائی رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے۔ آخر میں ہم ہی باقی رہ گئے۔ نائکہ نے بٹھل کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ استاد سلامی نے ابتدا میں بٹھل کا تعارف کرا دیا تھا۔ بٹھل کے سامنے وہ خود بھی مودب، ہاتھ باندھے تقریباً دو زانو بیٹھا رہا اور بٹھل کے عطیات آگے کرتا رہا۔

کوئی تین بجے کے قریب یہ محفل تمام ہوئی اور گھر جاتے

کے بعد بجائے بٹھل اڈے واپس آگیا۔ پولیس گلیوں میں بھی موجود تھی' اڈے کی عمارت کے باہر بھی۔ استاد سلامی نے ہر ایک کی خیریت دریافت کی۔ اڈے کی وسیع چوکی خالی پڑی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں میں چار بج گئے' پھر سب وہیں چوکی پر پڑ رہے اور دو ایک گھنٹے بعد ہی اٹھ گئے۔ میں تو جاگتا ہی رہا تھا۔ صبح ناشتے کا اہتمام ہوتے ہوتے نو بج گئے اور کوئی ساڑھے دس بجے بٹھل نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں تو کل دوپہر سے ایک معمول تھا' منہ اٹھائے اس کے پیچھے چل دیا۔ عمارت کے باہر تانگا تیار کھڑا تھا۔ ہم جلد ہی حویلی واپس آگئے۔

○☆○

گو کہ بٹھل نے گزشتہ رات گھر نہ آنے کی بابت کہلوا دیا تھا' لیکن حویلی میں سب کے ستے ہوئے چہرے بتا رہے تھے کہ انہوں نے رات آرام سے نہیں گزاری ہے۔ بٹھل نے ان کی دل داری دل نوازی کے لیے احکام جاری کرنے شروع کردیے۔ اسے دیسی غذائیں مرغوب تھیں۔ میٹھی ٹکیاں' چنے کی دال کا حلوہ' سرسوں کی بھجیا' چھلکوں والی ماش کی دال کی کھچڑی وغیرہ۔ دوپہر کے کھانے پر اس کے فرمائشی کھانے بجے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد بیٹھک میں اس نے زریں کو حکم دیا کہ سفر کا سامان تیار رکھا جائے۔ آئندہ دو تین دن میں کسی وقت بھی ہماری روانگی ہو سکتی ہے۔ پھر اس نے فروزاں اور یاسمن کو پاس بلا کے کہا کہ اس نے ایک آزمودہ کار وکیل سے بات کرلی ہے۔ ہفتے بھر میں وکیل کلکتے چلا جائے گا اور استاد جامو کو ساتھ لے کے آسن سول میں ان کی زمین اور جائداد کے معاملات نمٹائے گا۔ وہ ظفر کو بھی ہر مرحلے اور ہر معاملت میں ساتھ رکھیں گے اور ظفر کو پھر یہیں لے آئیں گے۔ فروزاں اور یاسمن سرجھکائے سنتی رہیں۔ بٹھل کے ٹوکنے پر فروزاں نے کچھ جرأت کی اور دبے لہجے میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا کہ آسن سول کا رخ کرنے میں پھر کوئی قضیہ نہ کھڑا ہو جائے' کیوں نہ زمین اور جائداد پر خاک ڈال دی جائے۔ انہیں اب اس کی ضرورت نہیں' یہاں انہیں سبھی کچھ مل گیا ہے۔ فروزاں نے ظفر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اتنے لوگوں کے سامنے اس کی زبان پر ظفر کا نام آنا شاید مناسب بھی نہیں تھا۔

"نہیں ری' اب سارا ٹھیک ہوگا" بٹھل نے کڑوی آواز میں کہا "ستے میں چھوٹ گیا ری وہ۔۔۔" اس کی زبان پر سید محمود علی کے لیے کوئی برا لفظ آتے آتے رہ گیا۔ وہ سر جھٹک کے بولا "بہت بوجھا ہے اپنے پر۔ ٹائم ملا تو اس کو دیکھیں گے۔"

فروزاں اتنا ہی کہہ سکتی تھی' چپ ہوگئی۔ کھانے کے بعد خاصی دیر محفل جمی رہی اور جمی ہی رہتی لیکن یقیناً زریں نے انہیں اشارہ کیا ہوگا کہ ایک ایک کرکے سب جانے لگے۔ ان باتوں کے احساس میں زریں ماہر تھی' اسے اندازہ ہوگا کہ گزشتہ رات ہم کتنی دیر سو پائے ہوں گے۔ میں بھی اٹھ گیا تھا لیکن اپنے کمرے کی جانب ابھی میں نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ رک جانا پڑا۔ کسی نے استاد سلامی کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ زریں' خانم' نیساں اور جہانگیر ابھی وہاں موجود تھے۔ یہ سن کے انہوں نے جلدی جلدی تخت صاف کیا اور لمحوں میں وہاں سے چلے گئے۔ اڈے کے آدمی آجانے پر پھر کوئی بیٹھک میں نہیں پھٹک سکتا تھا تاوقتیکہ اسے طلب نہ کیا جائے۔

استاد سلامی بولایا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اڈے کے تین اور آدمی بھی تھے۔ سلامی کا چہرہ تمتما رہا تھا' آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں' اسے سلام کا بھی خیال نہیں رہا۔ بوکھلائی ہوئی آواز میں اس نے بتایا کہ اسے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے' گزشتہ رات ٹھاکر ہردوپور اور اس کے بیٹے ٹھاکر بلدیو کا خون ہوگیا ہے' ان کی خاندانی حویلی اور کھیت کھلیان راکھ ہوگئے ہیں۔ ٹھاکر ہردیو کی پتنی اور کنبے کے سارے افراد ختم ہو چکے ہیں' ان میں سے کوئی نہیں بچا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر کا پروردہ استاد گورا اور اس کے ساتھی بھی مارے گئے۔

بٹھل نے ہنکاری بھری اور خاموش رہا۔

سب کی مضطرب نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کے جمود پر استاد سلامی اور بدحواس ہوا "سنا تم نے استاد؟"

"سن لیا رے!" بٹھل نے منہ بنا کے کہا' اس نے ممّا کو بلا کے استاد سلامی اور اس کے ساتھ آنے والے اڈے کے آدمیوں کے لیے چائے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کرنے کی ہدایت کی۔

"یہ کیا؟ کیسے ہوگیا استاد؟" سلامی جھنجھنی آواز میں بولا۔

"کیا بولیں رے!" بٹھل نے تنک کے کہا "خبر تو پکی ہے؟"

"ایک دم پکی استاد! مجھ کو اپنے خاص حوالدار نے بولا ہے۔ دیکھ لینا' تھوڑی دیر میں سارے شہر میں ہلڑ مچ جائے گا۔"

"تو جا کے اب کمر ٹکا' پوری رات کا جاگا ہوا ہے' ابھی کدھری سویا ہوگا۔"

"کدھر استاد!" سلامی بیزاری سے بولا "تمہارے جانے کے بعد کمر سیدھی کرنے کو چوکی پر پھیلا تھا پر سالی اور اچاٹ ہوگئی۔"

"اب ٹھیک سے آئے گی رے۔۔۔" بٹھل نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"کیا بولتے ہو استاد!" سلامی کھسیا سا گیا "اپنا حوالدار بولتا تھا' ٹھاکر کوئی چھوٹا موٹا آدمی نہیں تھا۔ بڑا خاندانی رئیس تھا' ہاتھی' گھوڑے اوپر نیچے بہت زور تھا اس کا۔ پولیس میں بھی آگ لگی ہوئی ہے۔ لکھنؤ تک بات جا پہنچی ہے۔ سرا کوئی بھی ہاتھ نہیں آیا۔ کیا صفائی سے کام دکھایا ہے۔ پولیس سارے میں چھاپے مار رہی ہے۔"

بٹھل سر ہلاتا رہا۔

سلامی کے ساتھ آنے والے اڈے کے پرانے آدمی تھے' ماکھن' دولہے خاں اور ڈوڈا' تینوں اپنے دماغوں پر چھایا ہوا اندھیرا دور کرنے کے لیے ذرا سی روشنی' ذرا سے گداز کے طالب تھے۔ بٹھل اس سخاوت پر قادر تھا مگر سردست اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بٹھل کی بے نیازی' بے حسی کے مترادف تھی۔ یہ انہیں اور مضطرب اور متوحش کر رہی تھی۔ پھر وہ خود ہی الجھنے' ایک دوسرے سے حجت کرنے لگے۔ میں گنگ بیٹھا ان کے وہم و گمان' قیاس آرائیاں' شوشہ طرازیاں سنتا رہا۔ پھر میں نے وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا لیکن میری حالت ان سے مختلف تھی۔ معلوم و نامعلوم کا ستم مختلف ہوتا ہے۔ جاننے کا عذاب نہ جاننے سے سوا ہوتا ہے مجھے اٹھتا دیکھ کے بٹھل نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔ "تو کدھری چلا رے؟"

"کمرے میں" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تو بھی جا کے اب لمبی کھینچ۔"

میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ بہت سی باتیں سینے میں امڈیں لیکن یہ گفتگو کا موقع نہیں تھا۔ میں نے خود کو تھام لیا اور اپنے کمرے میں آکے بستر پر دراز ہوگیا۔ مجھے استاد سلامی کی سادگی پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کی صرف دو ہی آنکھیں تھیں' صرف سامنے کی طرف دیکھنا آتا تھا اسے۔ جانے کون سی خصوصیت پر جامو نے اسے اڈے کا نگراں نافذ کیا تھا۔ وہ کل دوپہر سے بٹھل کے ساتھ تھا اور بٹھل سے سوال کر رہا تھا۔ ایسے سوال جن کے جواب نہیں دیے جاتے۔ کون سی عقدہ کشائی اسے مطلوب تھی۔ اس کے معنی تھے' کل سے استاد سلامی محض' بٹھل کا آلۂ کار رہا تھا۔ ایک سعادت آثار' اطاعت گزار شخص کی طرح بٹھل کے احکام کی تعمیل اس نے مقدم جانی تھی۔ کسی اور طرف جاننے بوجھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اسے بٹھل سے برائے نام آگہی تھی۔ اسے صرف استاد بٹھل کے بل' چاقو بازی میں کرشمہ سازی اور اڈا گیری کے معاملات میں حسن تدبیری کا علم تھا۔

سلسلہ اسی دن سے شروع ہوتا ہے' استاد گورا اور ہریا کے معاملے میں میری دخل اندازی سے۔ کلکتے سے جامو کی اچانک فیض آباد آمد اور ایک رات کے قیام کے بعد شہر سے غیاب پر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ بٹھل کا اڈے پر مستقل پڑاؤ اور اڈے کے آدمیوں کی باگیں کھینچے رکھنا' مجھے ہر معاملے میں الگ رکھنا اور مسلسل حویلی میں محبوس رکھنا۔ میں نے بھی عواقب پر اچھی طرح غور کیا تھا اور میں نے بھی کچھ ہی نتائج اخذ کیے تھے جن کی توثیق ان کی طرف سے کی گئی ہے۔ حویلی کے خیال نے مجھے بھی وحشت زدہ کیے رکھا تھا۔ جامو' ہریا اور بچھو کی موت سے پہلے فیض آباد آیا تھا۔ گویا اس سے پہلے ہی امکانات ذہن نشین کر لیے گئے تھے اور دیوار پر نوشتہ کندہ کردیا گیا تھا' نوشتہ آدمی بھی تحریر کرتے ہیں۔ جامو اور جمرو' دونوں بھائی اپنے دیرینہ رفیق ہریا اور بچھو کی موت پر' اتنے بڑے سانحے پر نہیں آئے۔ سوم بھی ایسے ہی گزر گیا۔ جامو اور جمرو دوسرے اہم کام میں جو مصروف ہوں گے۔ ہریا اور بچھو کی جدائی کے صدمے نے انہیں مہمیز کیا ہوگا۔ پھر ادھر ان کے علاقے میں ایک نوجوان لڑکی برکھا' اس کے بدنصیب باپ لکشمی داس' اس کے بے گناہ ملازمین کے خون کے بعد تو انہیں اپنے اقدام کی تجدید و تائید کا ایک اور جواز مل گیا تھا۔ ان کے عزم میں پھر اور پختگی آگئی چاہیے۔ انہوں نے کوئی جلدی نہیں کی۔ جامو اور جمرو کو کلکتے ہی میں ہونا چاہیے۔ بالکل اپنے مخدومی و مکرمی استاد بٹھل کے نقش قدم پر۔ وہ کل سہ پہر سے مختلف جگہوں پر اپنے نشانات ثبت کر رہا تھا اور کل اس نے مجھے بھی حویلی کی قید سے آزاد کردیا تھا کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میری چہرہ نمائی کے لیے یہ رہائی بڑی ضروری تھی۔

بٹھل اور جامو کے پاس حاشیہ برداروں کی کمی نہیں۔ ادھر بمبئی' ادھر کلکتہ اور حیدرآباد۔ جانے کتنی جگہوں سے ان کے اشارے پر سربازوں' سرفروشوں کی فوج اکٹھی ہو سکتی ہے۔ ان کے پاس پیسے کی بھی کمی نہیں اور جہاں حویلی کی حرمت اور حفاظت پیش نظر ہو' وہاں تو وہ۔۔۔ میں نے بھی تو ارادہ کیا تھا کہ کیوں نہ چپکے سے ایک دن خود ٹھاکر کی ریاست' اس کے محل دو محلوں کی طرف نکل جاؤں۔ یہ کیسی

نادانی ہوتی! یہ کام کیا ایک آدمی کے بس کا تھا۔

سب کچھ آئینے میں صاف نظر آتا تھا مگر نظر آنے سے مراد خاطر جمعی نہیں ہے۔ میرا جسم بار بار دھڑکنے لگتا تھا مجھ سے تادیر بستر پر نہ رہا گیا اور نہ ہی کسی سے ملنے، کسی کو دیکھنے کو دل چاہا۔ استاد سلامی ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بھجل کے سایہ عاطفت کی اس قدر شدید ضرورت ہوگی، وہ اور اس کے ساتھیوں کا زور و شور تھم چکا تھا۔ کسی نتیجے پر نہ پہنچنے کا پہلا مرحلہ حیرانی، دوسرا مایوسی کا ہوتا ہے۔

میں وہاں سے گزرتا ہوا باہر آگیا اور ڈیوڑھی میں مونڈھے پر ممّا کے پاس بیٹھ گیا۔ ممّا کے سینے میں داستانیں دفن تھیں۔ اڈے سے بھی اس کا بہت عرصے تعلق رہا تھا۔ وہ اہل ثروت کا ڈسا ہوا تھا، زہر اگلتا رہا۔ اس کے بوڑھے جسم میں بڑی نفرت بھری ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں اس کا بھتیجا بھی آگیا۔ ممّا نے اسے شہر کی سن گن لینے کے لیے بازار کی طرف بھیجا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، ہر جگہ ایک ہی چرچا ہے بہت سی دکانیں بند ہوگئی ہیں۔ شہر میں جابجا پولیس گھوم رہی ہے۔ شہر سے باہر جانے والے ہر راستے پر پولیس کا پہرا ہے۔ ہر آنے جانے والے شخص، سواری کی تلاشی لی جارہی ہے۔ ٹھاکر کی بستی سے آنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ ٹھاکر کی قدیم حویلی کا ڈھانچا ہی باقی رہ گیا ہے۔ ابھی تک دھواں اٹھ رہا ہے اور باغات میں تو اب تک آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ حویلی کی فصیل کے اندر آبادی میں ملازم، عورتوں اور ان کے بچوں کے سوا کوئی نہیں بچا۔ حملہ آور، چاقو، خنجر، بندوق اور تمنچوں سے لیس تھے اور ان کی تعداد خاصی تھی۔ انہوں نے اپنے کام بانٹ رکھے تھے۔ پولیس نے ساری بستی گھیرے میں لے لی ہے۔ خاکستر حویلی میں تو کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ ممّا کے بھتیجے نے جگہ جگہ لوگوں سے اصل واقعے کی ٹوہ لینے کی کوشش کی مگر ہر جگہ تضاد بیانی ملی۔ کوئی کہتا تھا، حملہ آوروں نے بہت لوٹ مار کی اور عورتوں سے زیادتی کی، کسی کا کہنا تھا وہ آندھی کی طرح نمودار ہوئے اور جلد سے جلد اپنا کام نمٹا کے آناً فاناً غائب ہوگئے۔ ان کے پاس عورتوں سے زیادتی اور لوٹ مار کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔

اندھیرا گہرا ہوگیا تب استاد سلامی اور اس کے ساتھی بھجل سے رخصت ہوئے۔ میرے قدم کہیں بھی نہیں ٹک رہے تھے۔ رات کے کھانے پر معمول کے مطابق دسترخوان پر اہتمام تھا۔ بھجل بھی کھانے میں شامل تھا۔ میں تو اسے دیکھتا کیا اور خانہ پری کے لیے وہاں بیٹھا رہا۔ کھانے کے بعد پرسوں رات کی طرح وہ سارے بیٹھک میں آگئے اور بھجل نے نیساں سے فرمائش کی کہ وہ اسے کچھ سنائے۔ نیساں کی آواز بہت اچھی تھی۔ اب نیساں بڑی ہوگئی تھی، وہ شرمانے لگی مگر بھجل کا حکم کس طرح رد کیا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک پوربی گیت سنایا پھر زریں کی فرمائش پر ایک غزل اس نے شروع کی۔ اس کی آواز بہت سُر میں تھی۔ سب محو ہوگئے، شاید سوائے میرے۔ میرا دماغ ہی بھٹکا ہوا تھا۔ ابھی نیساں نے غزل ختم نہیں کی تھی کہ دروازے پر ممّا کو منڈلاتے دیکھ کے میں اور منتشر ہوگیا۔ ممّا اندر آنے کے لیے مضطرب معلوم ہوتا تھا۔ میں تخت کے کنارے ہی بیٹھا تھا۔ غزل ختم ہونے ہی پر مجھے اٹھنا چاہیے تھا لیکن میں آہستہ سے اٹھ گیا اور دبے پاؤں باہر چلا آیا۔ کسی نے محسوس کیا یا نہیں، میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ ممّا، بھجل کو یہ اطلاع دینے اندر آنا چاہتا تھا کہ پولیس حویلی کے آس پاس بھی آچکی ہے۔ یہ بڑے مکانات اور حویلیوں کا علاقہ تھا۔ جہاں شہر کے گنجان علاقوں کی طرح پولیس کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔

"کب پولیس آئی؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے۔" ممّا بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے" مجھے اس کے سامنے استقامت کا اظہار ہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کی کمر تھپتھپا کے میں بیٹھک میں واپس آگیا۔ جیسے ہی نیساں نے غزل ختم کی، میں بھجل کے پاس جا پہنچا۔ میں نے سرگوشی میں اسے بتایا تو اس نے توجہ سے سنا اور سر کی جنبش پر اکتفا کیا۔ بھجل کو میرے اس طرح باہر جانے اور بھجل سے کاناپھوسی کرنے پر کھٹک جانا چاہیے تھا۔ بھجل نے اس کے تدارک کے لیے نیساں سے پھر کچھ سنانے کی خواہش کی۔ اوروں نے بھی شدومد سے بھجل کی ہم نوائی کی۔ نیساں نے اب کے میر کی غزل 'پتا پتا بوٹا بوٹا' شروع کی۔ اس دوران میں اس کی آواز اور کھل گئی تھی۔ سب کی محویت نیساں کے لیے داد کے مانند تھی۔ پچھلی مرتبہ بھی بھجل نے اس سے چند غزلیں سنی تھیں۔ اب تو اور نکھار آگیا تھا۔ غزل ختم ہونے پر بھجل نے نیساں کو اپنے پہلو میں دبوچ لیا، اس کی پیشانی چومی۔ زریں، فروزاں اور زہرہ بھی نیساں سے لپٹ گئیں۔ اسے بہت پیار کیا۔ پھر نیساں کی باری تھی۔ وہ مچل کے بولی "بابا! کچھ دن کے لیے اور ٹھہر جائیے۔"

بھجل نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا، پھر بھاری آواز میں بولا "ہاں ری، دیکھیں گے ابھی۔"

اس رات جلد ہی سب اٹھ گئے۔ ان سب کے ہٹ جانے کے بعد میں بھجل سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے موقع نہیں دیا، اپنے کمرے میں جاکے دروازہ بند کرلیا۔ میں نے بھی یہی کیا۔ کل رات بھی میں ایک پل کے لیے نہیں سو پایا تھا۔ کل رات میں بھجل کا پابند تھا، آج خود اپنا۔ خود پر اختیار رکھنا آدمی کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہے۔ میں نے اپنی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کی کہ میں اچھی طرح دیکھ اور سن سکتا ہوں۔ مجھے دلیلیں دینا آتا ہے اور سیاہ و سفید بھی خوب نظر آتا ہے اور میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ ادھر بھجل بھی ہے اور کیا مختلف ہے؟ پہلے بھی ایسا ہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ اور ہونی کو میرا اضطراب نہیں روک سکتا۔ کون سی دلیل میرے سینے میں کانٹا بنی ہوئی ہے۔ کئی بار میں نے زریں کی طرف جانے کا ارادہ کیا کہ اس کے ہاں بہت سایہ ہے لیکن یہ بہلاوا مجھے قائل نہ کرسکا۔ آدمی کتنی بار اپنی زندگی ختم کرنے کے درپے ہوتا ہے اور زندگی ہے کہ اڑی رہتی ہے۔ اس رات بھی مجھے موت نہیں آئی۔

○☆○

صبح ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی کہ کمرے کے باہر شور پر میں نے باہر جاکے دیکھا۔ حویلی کی معمر خادمہ نوران بی، بھجل کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ میں نے پاس جاکے پوچھا تو اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں بتایا۔ "پولیس نے حویلی گھیرے میں لے لی ہے۔ ممّا کہتا ہے، بابا کو بتادو، پولیس بابا کو اور آپ کو پوچھ رہی ہے۔"

بھجل بھی اتنی دیر میں باہر آگیا "ٹھیک ہے ری، غل کیوں مچاتی ہے۔" بھجل نے اسے جھڑک دیا۔ "ان کو بولو، آتے ہیں باہر۔"

بھجل نے مجھے تیار ہوجانے کا اشارہ کیا۔ جانے کیوں، مجھے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ اس حبس سے تو کوئی قیامت ہی بھلی۔ جلدی جلدی کپڑے بدل کے میں باہر آیا تو بھجل بھی تیار ہوچکا تھا۔

ڈیوڑھی کے باہر چبوترے پر دس بارہ پولیس والے مونڈھوں پر موجود تھے، ہمیں باہر نکلتا دیکھ کے پختہ عمر کا افسر کھڑا ہوگیا "تمہی استاد بھجل اور استاد بابر ہو؟" اس نے نخوت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟" بھجل نے ناگواری سے کہا۔

"تم کو ہمارے ساتھ چلنا ہے" افسر نے اکڑی ہوئی آواز میں حکم دیا۔

"کہاں لائے ہو؟" بھجل نے تلخی سے پوچھا۔

پولیس افسر نے سرتاپا بھجل کو دیکھا اور دھتکارتے لہجے میں بولا "کیسی پرچی؟"

"آدمی تو پرانے جان پڑتے ہو، تھوڑا حساب بھی آتا ہوگا" بھجل کی آواز بھی اکھڑی ہوئی تھی۔ "تیو تا ساتھ ہو تو درشن کراؤ مہاراج!"

"تیو تا!" پولیس افسر چونک پڑا، پھر سر ہلا کے بولا "اچھا، اچھا، تیو تا!" اس نے نخوت سے کہا "ہم تم کو دکھائی نہیں دے رہے؟"

"تلے سے اوپر تک، پورے کے پورے دکھائی دے رہے ہو" بھجل نے تیکھے لہجے میں کہا "ادھر فیض آباد میں گوری سرکار کا تختہ ہوگیا کیا؟ یہ پرچی پٹے کا چکر اسی نے چلایا ہے۔ ہم کیا الٹی بات بولتے ہیں صاحب بہادر!"

"ہم، ہم تم کو گرفتار کرنے نہیں آئے" پختہ عمر پولیس افسر نے بہ عجلت دخل اندازی کی "کوتوال صاحب کو تم سے ملنا ہے۔"

"تو ایسا بولو نا صاحب!"

"تم سے پہلے کیا بولا تھا" ماتحت افسر نے دوبارہ مداخلت کی اور معذرتانہ انداز میں بولا "اب جلدی کرو۔"

"ایسا کیسے، گھر آئے ہو پہلی بار، تھوڑا جل پان کرکے چلو، ابھی ناشتا بھی کدھری ملا ہوگا۔ لگتا ہے، رات ساری کانٹوں پر بتائی ہے۔ چہرے لوٹے ہوئے ہیں۔"

بھجل کے تیور کی تبدیلی برموقع تھی۔ ان سے زیادہ حجت کرنا لاحاصل تھا، نامناسب بھی۔ ہمیں بہرحال ان کے ساتھ جانا تھا اور اس پہلے مرحلے پر کوئی ناروا تاثر قائم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بس اتنا ہی، جس کے وہ متحمل ہوسکیں اور ہمارے بارے میں ان کی کوئی حتمی رائے متزلزل ہوسکے۔ ظاہر ہے، یہ رائے منفی ہی ہوسکتی تھی۔ وارنٹ کا مطالبہ بھی بے جا نہیں تھا۔ وہ اڈے پر نہیں، فیض آباد کے ایک اقبال مند، عزت دار محلے کی ایک بڑی حویلی میں آئے تھے لیکن وارنٹ پر اصرار کتنا ہی اصولی اور قانونی ہو، زیادہ دیر حویلی کے چبوترے پر انہیں روکے نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ صبح کنارے پر کھڑی تھی، سورج امڈ رہا تھا۔ سورج کو طلوع ہونے میں ایک رات کی منزل طے کرنی پڑتی ہے اور جب طلوع ہوتا ہے تو اسے بڑی بے کلی ہوتی ہے۔ عبادت گاہوں میں جانے اور چہل قدمی کرنے والے سحرخیز سویرے سویرے حویلی کے چبوترے کی تماش بینی کو اپنے معمولات پر ترجیح دیں گے۔ پہلے ہی حویلی کی داستانیں کیا کم زبان زد خاص و عام تھیں۔ ادھر اس اثنا میں حویلی کے مکین بھی جاگ سکتے تھے۔ پولیس کی آمد کا سن کے تو اندر کہرام مچ جاتا۔ چلتے چلتے بھجل

نے احتیاط کی تھی۔ شکوران بی اور مما کو زبان بندی کی سختی سے تاکید کردی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" ماتحت افسر نے کسی قدر بیزاری سے کہا "ہمیں رات بھر آرام نہیں ملا ہے اور ابھی جانے کب نصیب ہو۔"

"پر ہم لوگوں نے راتا دنگا نہیں کیا ہے' منہ اٹھائے سیدھے بستر سے آگئے ہیں۔ ایسے کیا تمارا منہ دربار میں سلامی کو جائیں' ایسا کرو صاحب! ہم کو عزت دینا آپ کو بھاری پڑتا ہے تو آپ اپنے ٹھکانے چلو' پیچھے ہم آتے ہیں' کدھری جانا ہے؟"

"کوتوالی چلنا ہے' اطمینان رکھو۔ ناشتا بھی وہیں مل جائے گا۔ وہاں ہمارا انتظار ہوگا۔"

"پر بات کیا ہے صاحب؟" جھلل نے تجسس آمیز سادگی سے پوچھا۔ "یہ تو آپ بولے نہیں؟"

"وہ تم کو وہاں جاکے پتا چل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" جھلل نے بہ ظاہر تذبذب سے کہا "بڑے صاحب نے بلایا ہے تو ضرور کوئی بڑی بات ہوگی' راتی سپنا بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی ایک چلا آتا' سر کے بل پہنچ جاتے۔ ادھری ہم گھر پہ رہتے ہیں۔ یہ اڈا نہیں ہے۔ ادھری اور بھی لوگ رہتے ہیں' کیا بولیں گے ان کو۔ اور وہ لوگ آس پاس والوں کو۔"

"وقت برباد مت کرو" پختہ عمر افسر نے کبیدگی سے کہا "زیادہ بات بالکل نہیں' سمجھے!"

جھلل نے سر اٹھاکے تند نظروں سے اسے دیکھا۔ "ایسا نہیں صاحب! ذرا رسان سے' ہم جانے سے منع بھی بول سکتے ہیں۔"

"پھر تم اپنے لیے اچھا نہیں کرو گے۔" اس بار ماتحت افسر کا لہجہ بھی ترش تھا۔

"پھر آپ کیا کرلو گے صاحب؟ توپ دم کرادو گے؟"

"ہم تمہیں ایسے بھی لے جاسکتے ہیں۔"

"نا صاحب! نا' ایسا نہیں" جھلل نے سپاٹ آواز میں کہا "تھوڑا اپنا بھی دھیان کرو' آگے سارا اوندھیا جائے گا۔"

"یہ کیا' کیا ہو رہا ہے" پختہ عمر افسر بھنا کے بولا "یہ آدمی کس طرح بول رہا ہے" اس نے جھلل کو گالی دی۔

"ناپ تول کے منہ کھولو' اچھا رہتا ہے۔ اونچے سر اپنے کو راس نہیں آتے۔ آپ بادشاہ لوگ ہو' اپنا بھی راج دربار سے پرانا تال میل ہے۔ پر جی ساتھ لاتے تو اتنا نہیں بولتے' رسی ہاتھ میں تھمادیتے۔ کوتوال صاحب شہر کے لاٹ صاحب ہیں' پر ہم ان کے پالتو نہیں ہیں۔ جاکے ان کو بولو' اپنے سے کام ہے تو ادھری آنے کا کشٹ کریں' دوپہر کو دال دلیا اپنے ساتھ کھائیں۔"

مونڈھوں پر بیٹھے ہوئے سارے سپاہی ایک دم کھڑے ہوگئے اور انہوں نے بندوقیں سیدھی کرلیں۔ پختہ عمر افسر کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ وہ مضطربانہ چند قدم آگے آگیا۔ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ جھلل کے گریبان پر ہاتھ ڈالے یا کوئی اور حرکت کرے' مگر معاً اس کا ماتحت درمیان میں آگیا اور وحشت زدہ لہجے میں بولا "بات مت بڑھاؤ استاد!"

"بات تو آپ بڑھا رہے ہیں۔" جھلل نے مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا لیکن اس کی تیوری سے کچھ کچھ اندازہ ہوگیا تھا۔

میں نے اپنی آواز پر قابو رکھنے کی کوشش کی "آپ نے کیا سمجھا ہے' آپ یوں سر اٹھائے ناوقت کسی کے گھر آکے اس کی توہین کیجیے' نہ فرد جرم سنایئے نہ وارنٹ دکھایئے۔ کسی معاملے میں ہماری ضرورت ہے تو بہتر ہے' اپنا لہجہ بدل کے بات کیجیے۔ ہم آپ کی رعیت نہیں ہیں۔"

سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔ ماتحت افسر نے ہیجانی انداز میں اپنے افسر کو دیکھا۔ ان کی جانب سے کسی ردعمل سے پہلے میں نے سر جھٹک کے کہا "چلیے' کہاں جانا ہے؟" یہ کہتے ہی میں چبوترے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جھلل نے بھی پھر کوئی دیر نہیں کی۔

نیچے پانچ تانگے قطار میں کھڑے تھے' پختہ عمر افسر لپکا جھپکا سب سے آگے والے تانگے کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ ماتحت افسر کے تانگے میں ہم دونوں سوار ہوگئے۔ اگلی نشست پر اس کے ساتھ ایک بندوق بردار سپاہی بھی آگیا۔ دوسرے سپاہیوں نے بھی جلدی جلدی باقی تانگوں میں جگہیں سنبھال لیں۔ چلتے وقت انہوں نے یہ اہتمام رکھا تھا کہ ہمارا تانگا درمیان میں رہے۔ گھوڑا گاڑیوں کی چرخ چوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے گلی کوچے دھمکنے لگے تھے جیسے کوئی لشکر گزر رہا ہو۔

اندھیرا سمٹ رہا تھا۔ صبح بیدار ہونے والوں کی تعداد ایسی زیادہ نہیں تھی مگر ایک ساتھ اتنے تانگے اور پولیس والے دیکھ کے وہ ٹھٹکتے اور رک جاتے۔ گشت کرنے والے سپاہی ٹولیوں میں جگہ جگہ تعینات تھے۔ ہمارے کارواں کی آمد کی اطلاع انہیں دور سے ہوجاتی ہوگی۔ ابھی کچھ دیر پہلے حویلی کی طرف جانے والے تانگوں کی واپسی کی توقع بھی ہو

ان کی چستی و مستعدی کا سبب ہوگی۔ ایسے شور سے آخری ساعت کی نیندیں منتشر ہوجانی چاہیے تھیں۔ کئی جگہ لوگ سٹ پٹاتے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے۔ بہت سوں نے دریچوں' موکھلوں اور چھتوں سے ہمارے مختصر قافلے کا حیرانی و پریشانی سے نظارہ کیا۔ سڑکوں پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ گھوڑے بھی خاصی جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ راستے میں ماتحت افسر نے کوئی کلام کیا نہ ہم نے سلسلہ جنبانی کی۔ میری طرح جھلل بھی آنے والے وقت سے نبرد آزمائی کے لیے خود کو مجتمع کررہا ہوگا۔ آنے والا وقت بڑی آزمائش کا بھی ہوسکتا ہے' بات بہت دور بھی جاسکتی ہے۔ پولیس کے طور طریقے ہمارے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہاں کوئی ایک شخص نہیں ہوگا۔ جہاں بہت سے لوگ ہوتے ہیں' وہاں اختلاف ضرور ہوتا ہے۔ آدمی کتنے ہی ایک جیسے' ایک دوسرے کے قریب ہوں' وہ ایک دوسرے سے بہت الگ' بہت دور بھی ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ آدمی ایک جیسے ہوا کرتے تو زندگی کیسی آسان اور سہل ہوتی۔ کئی مرتبہ ہمیں ایک سے زیادہ پولیس افسروں کے سامنے پیش ہونے کے تجربے سے گزرنا پڑا ہے۔ ہر ایک شوشہ طرازیوں اور نکتہ پردازیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔ دلیلیں کھوٹیں کیسی ہی مضبوط ہوں' بہت سے اختلاف آدمی کی اپنی انا کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ انا بھی ایک کجی ہے اور کہتے ہیں' آدمی کی سب سے بڑی کمزوری اس کی انا ہے۔ زندگی بھر وہ بے جا اختلاف پر آمادہ رہتا ہے اور یوں اپنی انا کی افزائش و پرورش کرتا رہتا ہے۔ پولیس افسروں کا یہ باہمی اختلاف کبھی ہمارے لیے مفید بھی ثابت ہوا ہے۔ ایک دوسرے کو قائل کرتے ہوئے وہ زچ ہونے لگتے ہیں اور انہیں خود اپنی جزرسی و نکتہ آفرینی دگرگوں کردیتی ہے۔ کسی نتیجے پر نہ پہنچ پانے کی بیزاری میں وہ کسی آسان راستے اور دفع الوقتی قسم کے فیصلے پر متفق ہوجاتے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہو' ہمیں بہرحال بدترین صورت حال کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔ واپسی کا تعین جھلل بھی نہیں کرسکتا ہوگا۔ پولیس شک کی بنیاد پر ہمیں دیر تک روک سکتی ہے۔ اصل مجرم کا سراغ نہ ملنے کی صورت میں اپنے حکام کے سامنے جواب دہی اور خود اپنی دل دہی یا تن آسانی کے لیے پولیس مشکوک آدمی ہی کو سپر بنالیتی ہے۔ ویسے بھی اصل مجرم تک ان کی رسائی تقریباً ناممکن ہے لیکن انہیں ایسی آسانی سے دستبردار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے ماتحت اور سب سے آگے کے تانگے میں فرد کش اس کے افسر کی بدحواسی ظاہر کررہی تھی کہ کچھ دیر میں انتشار سے دوچار کیسے کیسے افسروں سے ہمارا واسطہ پڑسکتا ہے۔ ان پیشیوں کے ہم کتنے ہی تجربہ کار ہوں' واقعے کی نوعیت تو ہر جگہ مختلف ہوتی ہے۔ سامنا پڑنے والے لوگ بھی ہر بار بدلتے رہتے ہیں۔

بیس پچیس منٹ کے سفر کے بعد قدیم و جدید طرز کی ایک عمارت کے سامنے تانگے ٹھہر گئے' اندھیرا ماند پڑچکا تھا اور اجالا ابھی ایسا روشن نہیں ہوا تھا۔ اول صبح بستیوں پر چھاجانے والی پرندوں کی چہکار تھم چکی تھی۔ صبح سے بہتر روز و شب کا کوئی پہر نہیں ہوتا۔ کسی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ صبح قدرت کا سب سے شاہکار منظر ہے۔ صبح نہ ہوتی تو یہ دنیا بڑی ادھوری ہوتی مگر وہی بات ہے' ساری خوش منظری اور خوش موسمی آدمی کی اپنی کیفیت سے مشروط ہے۔ آدمی میں اندھیرا چھایا ہو تو کیا سہانی صبح اور کیا نشیلی شام۔

عمارت میں ہر طرف سپاہی موجود تھے۔ تانگے سے اترکے جھلل نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے پنجے کے دباؤ سے شاید میں نے وہی اخذ کیا جس کی وہ تلقین کرنا چاہتا تھا۔ ماتحت افسر کی پیروی میں ایک مختصر راہ داری سے گزرتے ہوئے ہم اونچی چھت والے ایک وسیع کمرے میں داخل ہوگئے اور دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بینچوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ کمرے کی حالت خاصی ابتر تھی۔ دیواریں سیلن زدہ' رنگ روغن میلا میلا' روشنی بہت مدھم' ہمارے سامنے کی دیوار پر لکڑی کے فریم میں محصور ایک بڑا نقشہ آویزاں تھا۔ نقشے کے نیچے لمبی پشت کی بھاری کرسی اور اس سے آگے بہت بڑی میز تھی' میز کے اردگرد چھ کرسیاں' میز پوش البتہ صاف ستھرا تھا۔ فرش بھی دیواروں کی نسبت کچھ بہتر تھا۔

ماتحت افسر بہت بے کل نظر آتا تھا "ابھی انتظار کرو۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "اندر میٹنگ ہو رہی ہے۔"

جھلل کی خاموشی سے وہ جزبز ہوا' کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لمحے بھر ٹھہر کے واپس چلا گیا۔ کمرے کے کئی دروازوں اور کھڑکیوں میں سے صرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس پر دو مسلح سپاہی فی الفور مامور کردیے گئے تھے۔ وہ چند فٹ کی لمبائی میں ایک دوسرے کے مخالف فوجیانہ انداز میں گشت کرنے لگے۔ ایک ادھر آتا تو دوسرا ادھر جاتا اور دروازے کے وسط میں دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہوجاتے۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ لیکن باہر راہ داری میں خاصی سرگرمی تھی۔ جھلل نے بیڑی سلگائی اور گہرے کش بھرنے لگا۔ جانے

کیوں میرا خیال تھا یا میری خواہش تھی' وہ آنے والے لمحوں کے بارے میں کچھ زبان کھولے یا مجھے کوئی ہدایت دے۔ وہ اپنے آپ میں گم بیٹھا رہا۔ کسی رائے اور مشورے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس کی موجودگی میں میری حیثیت ایک معمول کی سی تھی۔ مجھے خاموش رہنا تھا اور میں جانتا بھی کس قدر تھا۔ میرا علم میرے قیاس پر مبنی تھا۔ جو میں سمجھ رہا تھا' ضروری نہیں اسی ترتیب سے وہ کچھ پیش آیا ہو' وہ اس سے مختلف بھی ہو سکتا ہے لیکن جو کچھ بھی ہوا ہے' بہت ناقابل یقین' بڑا لرزہ خیز ہے۔ پولیس کو تحقیق و تفتیش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہیے۔ یہ اس کی آن اور ساکھ کا معاملہ ہے۔ فرائض سے زیادہ پولیس کو اپنی ساکھ اور آن کا خیال ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیں خاصی دیر بعد طلب کیا ہے۔ پورا ایک دن اور ایک رات گزر جانے کے بعد۔ پہلے انہوں نے شہر کی ناکابندی کی' سارے شہر اور گردونواح میں پولیس کا جال بچھایا پھر انہوں نے حویلی کے علاقے میں پہرا لگا دیا۔ گویا ہر سمت اور ہر پہلو ٹٹولنے کے بعد ان کی نظریں حویلی پر جا کے لگی ہیں اور واقعے کے محرک تک رسائی میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں' آگے اور سرے بھی ان کے ہاتھ آ سکتے ہیں۔

میں نے چھچلتی نگاہ سے بجھل کو دیکھا اور مجھے اس کے چہرے سے کچھ جاننے میں ناکامی ہوئی۔ وہ تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا' کبھی کبھی مجھے اس کی اس بے چہرگی سے بڑی الجھن اور چڑ ہوتی تھی۔ وہ چہرہ جس پر کوئی نقش' کوئی تاثر مرقوم نہ ہو' کورے کاغذ کی طرح وہ تو اور متوحش کرتا ہے۔ یقیناً بجھل کو اس تلخی کا اچھی طرح احساس ہو گا کہ یہ کوئی اور شہر نہیں' فیض آباد ہے' یہاں زریں کی حویلی ہے اور یہاں زریں ہے۔ آدمی کی استقامت کا ایک پیمانہ ہوتا ہے اور جگہوں کی بات دیگر تھی' یہاں حویلی میں زریں کے علاوہ ہمارے اور بھی خوش نما و پرسان حال ہیں۔ ان کے لیے ہم سائے اور ستون کی علامت ہیں' روشنی کے بھی۔ ہمارے اچانک غیاب کی خبر کب تک ان سے چھپی رہے گی۔ حویلی کے گرد پولیس کے گھیرے کی اطلاع گزشتہ رات انہیں نہ ہو سکی ہو گی تو آج ہو جائے گی۔

منیر علی کے بھانجے ارشد اور بیٹے تنویر کو فیض آباد میں آباد ہوئے اب وقت گزر گیا ہے۔ وہ حویلی میں محبوس نہیں رہتے' زمینوں کی دیکھ بھال کرنے جاتے ہیں' شہر کے لوگوں سے بھی اب ان کی اچھی رسم و راہ ہونی چاہیے۔ کچھ دیر پہلے حویلی میں صبح صبح پولیس کی آمد اور ہمیں ساتھ لے جانے کا واقعہ دن چڑھتے تک ہر شخص کے وردِ زباں ہو گا اور ہماری قید و بند کے پس منظر' سنگینی و سفاکی کی ساری جزئیات' کچھ حقیقتوں' کچھ فسانوں کے ساتھ۔ ارشد اور تنویر بہت لائق اور ہوش مند نوجوان ہیں۔ ان سے یہی توقع ہے کہ شہر میں گونجتے ہیبت ناک تذکروں سے حویلی کے مکینوں کو دور رکھنے کی احتیاط کریں لیکن خود ان کا کیا عالم ہو گا' انہیں ایسے سانحوں اور حادثوں کا تجربہ ہی کس قدر ہے۔ ادھر حویلی کا واسطہ بیرونی ملازموں اور دیگر چھوٹے موٹے کام کرنے والوں سے بھی رہتا ہے۔ بدنامی کے پر لگ جاتے ہیں۔ اوروں کا اتنا نہیں' مجھے تو فروزاں اور یاسمن کا خیال آتا ہے۔ کس قیامت سے گزر کے وہ اس پناہ گاہ میں پہنچی ہیں۔ انہیں تو ابھی نرمی و گداز کی ضرورت ہے۔ وہ تو کملا جائیں گی۔ وہ تو ویسے بھی شیشے کے مانند ہیں۔

اور پولیس سے کیا بعید ہے۔ ہم پر زور ڈالنے کے لیے وہ کسی وقت حویلی میں نہ داخل ہو جائے۔ مطلب براری کے لیے پولیس کسی بھی ناروا اور انتہائی حربے پر اتر آتی ہے خواہ بعد میں لوگ دہائیاں دیتے پھریں اور پولیس کو پشیمانی اٹھانی پڑے لیکن اس پشیمانی سے عتاب زدگان کے زیاں کی تلافی نہیں ہوتی۔ شہر کے سمندر میں پہلے ہی حویلی کسی جزیرے کا درجہ رکھتی ہے۔ ان ہرزہ سرائیوں کے باعث وہ اور ہدفِ توجہ بلکہ ہدفِ ملامت ہو کے رہ جائے گی۔ پھر حویلی کے بے چارگان کے پاس یہی ایک چارہ ہو گا کہ وہ بمبئی ابا جان اور منیر علی کو' کلکتے جاسو اور جبرو کو تار دے کے بلائیں۔ میں اس رات زریں کو یہی کچھ تو باور کرانا چاہتا تھا۔ یہ چھوٹے شہروں کے لوگ بڑے فسانہ طراز ہوتے ہیں' قصے کہانیوں میں ان کا جی بہت لگتا ہے۔ ان کے پاس وقت ہی وقت ہوتا ہے۔ یہی ٹھیک تھا کہ ہم پہلی فرصت میں بمبئی کی طرف نکل جاتے۔ بمبئی جا کے بھی جہاں گیر' نیساں اور مجو میاں اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ بڑے فائدے کے لیے تھوڑا نقصان برداشت کر لیا جاتا ہے۔ کچھ میں زریں کو قائل نہ کر سکا' کچھ خود میری کوتاہی' نادانی۔ اس دن ہریا اور گورا استاد کے معاملے میں دخل اندازی کرنے کی چوک جو مجھ سے ہو گئی تھی' بات اتنی دور جانے کا مجھے کوئی اندازہ ہی نہ تھا پھر سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وقت ہی نہیں ملا۔ ہم اتنی جلد بمبئی روانگی کے فیصلے پر کس طرح عمل کر سکتے تھے۔

دوسروں کے کیا' آدمی تو اپنے قابو میں نہیں ہوتا' خود کو اپنا مطیع نہیں کر سکتا۔ اپنے دل و دماغ تابع نہیں رکھ سکتا۔ اسی کے اپنے دست و بازو منحرف ہو جاتے ہیں۔

اچانک جسم کا کوئی حصہ اذیت سے دوچار کر دیتا ہے۔ اچانک دل بھٹکنے' دماغ بھٹکنے لگتا ہے۔ آدمی کی سب سے بڑی خوبی یا توانائی اس کی اپنی قابو یافتگی ہے۔ میں نے بجھل کی طرح سکون و سکوت اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن جسم میں پیچ و گرہیں پڑ گئی تھیں۔ طرح طرح کی وہم و گمان سر میں بھن بھنا رہے تھے۔ یہ اندیشے اور وسوسے خود رو کانٹوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ کانٹوں بھرے پودے پتھروں میں بھی نمو پا لیتے ہیں۔ آدمی کتنا ہی مضبوط ہو' وہم و گماں کے خار و خس سے اسے مفر نہیں۔ میں اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا اس تشویش و تردد سے کچھ حاصل نہیں۔ ہم بہ ہمہ وجود کوتوالی میں موجود ہیں۔ تھوڑی دیر میں پیشی ہونے والی ہے۔ اب فیصلہ کرنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ کس تحمل اور توجہ سے ہماری روداد' ہماری بات سنتے ہیں۔ ہم تو اپنے جتن کریں گے ہی لیکن اگر انہوں نے کچھ اور ٹھان رکھی ہو تو؟ اس نیم جانی و نیم زندانی میں گھنٹے بھر سے زیادہ ہو گیا۔ درمیان میں ایک مجہول قسم کا سپاہی تاروں کے اسٹینڈ میں اٹکے ہوئے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں بھری چائے لے کے آیا۔ بجھل کے انکار پر اس کا بگڑا ہوا چہرہ اور بگڑ گیا' وہ بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ روشنی بڑھ گئی تھی لیکن روشنی اور حبس میں کوئی نسبت باہم نہیں ہے۔ ان کی طرف سے ہماری طلبی میں تاخیر ناقابل فہم تھی۔ بجھل نے اس دوران کئی بیڑیاں پھونک ڈالیں۔

کمرے میں پرانے زمانے کی دیوار گیر گھڑی جانے کب سے بند پڑی تھی۔ گھڑی کا شیشہ گرد و غبار سے دھندلا گیا تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ماتحت افسر کا تمتماتا چہرہ دروازے پر نکال دیا۔ وہ تیز قدموں سے اندر آیا "چلو' اٹھ جاؤ" اس نے مصنوعی تحکمانہ لہجے میں کہا۔

بیڑی زمین پر پھینک کے بجھل کھڑا ہو گیا اور کسمساتا ہوا مجھ سے مخاطب ہوا "چل رے' ابھی اندر کا زرت بھاؤ بھی دیکھیں۔"

"دیکھو استاد!" ماتحت افسر تنبیہی انداز میں بولا "ذرا دھیان رکھنا' یہ عام لوگ نہیں' تینوں اونچے افسر ہیں۔ کل رات سورج ڈوبتے لکھنؤ سے ادھر پہنچے ہیں اور رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ ان میں ایک افسر ورما صاحب سینٹر سے ڈیپوٹیشن پر لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ اتنے پرانے نہیں پر بڑے بڑے کیس کیے ہیں۔ بڑا نام ہے ان کا۔ ولایت میں پورے پانچ سال گوروں کے ساتھ کام کیا ہے۔"

بجھل نے اپنا بھاری سر ہلایا "ہاں صاحب! گوروں کی کیا بات ہے۔ گوروں کی چھایا بھی گوری ہوتی ہے' ان کا چھوا بھی سونے کا ہو جاتا ہے۔"

"تمہارے بھلے کو بولتے ہیں" ماتحت افسر ناگواری سے بولا "آگے تم جانو۔"

"بولو تو منہ بند رکھیں؟"

"نہیں نہیں' یہ ہم نے کب بولا ہے' پر تھوڑا دھیان رکھنا' ہاں!"

"یہ تو ان پہ بھی ہے صاحب! ایک ہاتھ سے کدھری بجتی ہے۔"

ماتحت افسر کے چہرے پر رنگ آیا' وہ چپ رہا اور عجلت سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم بھی کمرے سے باہر آ گئے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے وہ بائیں جانب مڑ گیا اور پہلے دروازے پر ٹھہر کے اس نے وہاں تعینات سنگین بردار سنتری کو ہمیں اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔ سنتری نے اسے سلام کیا اور کسی توقف کے بغیر دروازہ کھول دیا۔

وہ ایک کشادہ' روشن اور صاف ستھرا کمرا تھا۔ کھڑکیوں پر سفید اور گیروے دھاری دار پردے جھول رہے تھے۔ سامنے عنابی رنگ کے کپڑے سے ڈھکی ہوئی وسیع میز پر دفتری سامان سجا ہوا تھا۔ کرسیاں بھی نئی نئی تھیں۔ میز کے اس پار تین کرسیوں پر تین اور میز کے دائیں بائیں کرسیوں پر دو افسر موجود تھے۔ ان کی عمریں چالیس اور پچاس کے درمیان تھیں۔ وسط میں جو شخص تمکنت سے کرسی نشین تھا' غالباً وہی ورما ہو گا۔ ان میں سب سے کم عمر وہی لگتا تھا' ناک نقشہ ترشا ہوا' چوڑی پیشانی' بڑی بڑی چمک دار آنکھیں' سیاہ بال' سلیقے سے مانگ نکلی ہوئی' رنگت بادامی' قد متناسب' جسم فربہی کی طرف مائل۔ سینے اور شانوں پر پولیس کے امتیازی نشانات آویزاں۔ وہ تازہ کڑک وردی میں ملبوس تھا' وردی میں نہ ہوتا تو کوئی بھی اسے پولیس والا نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے دونوں جانب بیٹھے ہوئے افسر پختہ گندمی رنگت کے حامل' بھاری جسامت کے اور نسبتاً معمر تھے۔ میز کی شرقی و غربی جانب دو افسروں میں ایک سرمئی رنگ کا' بانس کی طرح لمبا' چھریرا اور چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ پولیس میں اتنی عمر کا ایسا سوکھا ہوا آدمی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ دوسرا خود سرا افسر وہی تھا جو صبح صبح حویلی آیا تھا اور وارنٹ کے مطالبے پر برگشتہ ہو گیا تھا۔ پانچوں افسروں کے آگے کاغذ اور قلم رکھے تھے۔ وہ سب ہمارے منتظر تھے۔ ان کے چہروں سے بے چینی ہویدا تھی۔ ہمارے داخل ہوتے ہی ان کے جسم تن گئے۔ ہم میز

ے گز بھر کے فاصلے پر جا کے ٹھہر گئے۔ ایک قدم دور کرسیاں خالی تھیں۔ انہوں نے ہم سے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے انہیں سلام کیا۔ میں نے بھی بادل ناخواستہ اس کی نقل کی۔ درمیان میں بیٹھے ہوئے افسر نے سر کی خفیف سی جنبش پر اکتفا کیا۔ ان سب کی نظروں نے جیسے ہمیں حصار میں لے رکھا تھا۔ اسی اذیت ناک خاموشی میں کئی لمحے گزر گئے پھر وسط میں بیٹھے ہوئے افسر نے شانے اچکائے اور سامنے رکھے ہوئے گلاس سے گھونٹ بھر پانی پی کے کھن کھناتی آواز میں بولا "استاد بٹھل! استاد بابر!" اس کے تخاطب میں طنز اور استہزا کی آمیزش تھی۔

بٹھل بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

"نیوتے بنا تم کو یہاں آنا پسند نہیں تھا' کیوں استاد؟" اسی افسر نے زہرخند سے کہا۔

"بنا تو آپ نے ڈالی ہے" بٹھل نے دھیمی آواز میں جواب دیا "پر اب تو ادھری ہیں۔"

"یہ تو اچھا کیا استاد' سیدھے سبھاؤ آگئے۔"

"اب اچھا ہو کہ برا' دیکھیں گے صاحب!"

"بڑی تعریف سنی ہے تمہاری استاد بٹھل! کلکتہ شہر کے استاد' فیض آباد کے استاد' ابھی پتا چلا کہ لکھنؤ کی گدی استاد بابر کے نام پر چلتی ہے۔ وہاں بابر استاد اپنی مرضی کا چنتر بٹھا کے آئے ہیں۔ ادھر بٹھل استاد نے' سے بیٹا' جامو استاد کو فیض آباد سے لے جا کے کلکتے کے راج سنگھاسن پر بٹھلا دیا ہے۔ دوسرے شہروں کا ابھی ہم کو پتا نہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ہے۔ لوگ کہتے ہیں' بابر استاد کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی آتا ہے' دونوں کی پرانی جوڑی ہے اور دونوں کے ہاتھ میں جادو ہے۔ چاقو' چھرا' خنجر' لاٹھی' ڈنڈا' بلم' بندوق' تمنچا ہاتھ میں آنے کی دیر ہوتی ہے' آواز کا نشانہ لے لیتے ہیں۔ کوئی کھر بند نہیں' پیادوں کی پوری سینا حاضر' اشاروں پر ناچنے' سے پڑنے پر سر بھی کٹا دے۔ پولیس سے آنکھ مچولی من بھاتا کھیل ہے۔ جیل' کچہری' تھانا گھر کی طرح ہے۔ بڑی موٹی کھال ہے۔ ان سے دشمنی پاپ ہے۔ پلٹ جائیں تو کسی کو شا نہیں کرتے۔ دور دور تک نام ہے استاد بٹھل کا" پولیس افسر نے سر جھکا کے سامنے رکھے کاغذوں پر نظر ڈالی اور رک رک کے بولا "استاد بٹھل! استاد بابر! استاد جامو' جمرو' شمشاد خاں اور... اور لمبی لسٹ ہے" اس نے بٹھل کو مخاطب کر کے چبلے پن سے پوچھا "کیوں استاد' ایسا ہی ہے نا!"

"کیا بولیں صاحب! آپ کرسی پر بیٹھے ہو" بٹھل نے جیسے اپنے آپ سے کہا "ایسا ہی ہوگا۔"

"نانا' کچھ کم' زیادہ یا غلط ہو تو بولو؟"

"ابھی کم ہے صاحب!"

"ہاں!" پولیس افسر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کرسی پر سیدھا نہ رہ سکا' اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا "کم ہی ہوگا' ہم کتنا جان سکتے ہیں' پھر تم ہی کچھ بتاؤ استاد!"

"اپنے منہ سے کیا بولیں" بٹھل نے آہستگی سے کہا "اچھا نہیں لگتا صاحب! اور آپ شاید سن بھی نہ پاؤ۔"

"رات بھر تمہارا ہی چرچا ہوتا رہا ہے۔ شہر میں تمہارے ٹھکانے کے سنگی ساتھی رات سے ہمارے مہمان ہیں۔ کیا کیا بولتے ہیں وہ تمہارے بارے میں' تمہارا دم بھرتے ہیں۔ بولتے ہیں' یہاں شہر میں تمہاری محل جیسی اونچی حویلی ہے۔ حویلی کی اصل مالک جوان کنیا' اور اس کا تو نام ہے' حویلی کے مالک تم ہو یا استاد بابر۔ تم کو وہ بابا بولتی ہے' بابر استاد کو بھی کچھ مانتی بولتی ہوگی۔ معلوم ہوا ہے "اڈے کے بس خاص خاص آدمیوں کا وہاں آنا جانا رہتا ہے اور رہتے ہیں' حویلی میں اور بھی لوگ رہتے ہیں جن کا رشتہ ناتا فیض آباد شہر سے نہیں ہے۔ شہر میں تمہارے نہ ہونے پر حویلی کی دیکھ بھال اڈے کے آدمی کرتے ہیں اور کسی میں ہمت نہیں جو حویلی کی طرف سر اٹھا کے دیکھے یا نظر ٹیڑھی کرے" پولیس افسر نے چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا "ایسے کون کون لوگ حویلی میں رہتے ہیں استاد؟"

بٹھل کو جواب دینا چاہیے تھا کہ وہ کون ہوتا ہے' اتنی باتیں کرنے اور اتنا کچھ پوچھنے والا۔ میری توقع کے خلاف بٹھل نے دبے لہجے میں کہا "اپنے ہی لوگ ہیں صاحب!"

"اپنے کیا؟ تمہارے رشتے دار یا..."

"اب تو سارے اپنے ہیں۔"

"پہلے کیا تھے؟"

"پہلے نہیں تھے" بٹھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"سنا ہے' بابر استاد کی سگی بہن کا جنازہ بھی حویلی سے اٹھا تھا۔ وہ شہر کے کوٹھے پر ناچتی تھی۔"

فہمیدہ کے ذکر پر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ حد سے تجاوز کر رہا تھا۔ جی میں آیا' میز پھلانگ کے اس کے سر پر جا پہنچوں' زبان کاٹ لوں یا گلا دبوچ دوں۔ بٹھل نے زور سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

وہ کمینہ پولیس افسر ہرزہ سرائی کرنے لگا "ایک رات کوٹھے پر بہن کا بھائی سے سامنا ہو گیا۔ بھائی کو دیکھ کے بہن کھڑکی سے کود پڑی اور بے چاری نے جان دے دی۔ کیا نام بتایا ان لوگ نے بائی کا؟" اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے افسر سے پہلو بدل کے پوچھا "نیلم' نیلم جان!" افسر نے کاغذات الٹ پلٹ کے کہا۔

میرا جسم کپکپانے لگا تھا۔

"بڑی دکھ بھری بپتا ہے۔ رات ہی سنی' کیا بات تھی؟" درمیان میں بیٹھا ہوا افسر مسلسل ٹھٹھول کر رہا تھا۔

"کام کی بات کرو صاحب!" بٹھل کی آواز تپی ہوئی تھی۔ ادھر اس نے میرا ہاتھ زور سے جکڑ رکھا تھا۔

"ٹھیک ہے' کام کی بات کرتے ہیں' اسی واسطے تم کو یہاں بلایا بھی ہے۔ دیکھو استاد!" اس کی آواز تند ہو گئی "اچھا ہوگا' ایک بات دھیان سے سن لو۔ ہم کو دونوں طریقے آتے ہیں' دیسی بھی' ولایتی بھی۔ تم کو کون سا پسند ہے؟"

"ادھری تمہارے سامنے ہیں' اپنے گھر میں نہیں" بٹھل نے ترشی سے کہا "اپنے سے کیا پوچھتے ہو۔"

"آل رائٹ!" وہ ڈھٹائی سے بولا "صاف صاف بات کرتے ہیں۔ تم نے ساتھ دیا تو کام آسان ہو جائے گا۔ بعد میں یہ لوگ جائیں" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان کو دیسی طریقے آتے ہیں' ولایتی پہ یہ وشواس نہیں کرتے۔ تم سے اتنی بات کرنے کی بھی ضرورت یوں پڑی کہ تم جان لو' ہم تمہارے بارے میں کتنا کام کر چکے ہیں۔ کتنی جان کاری رکھتے ہیں۔"

"ایسے اپنا بھی بھلا ہوا ہے۔"

"تمہارا کیا؟" پولیس افسر بے کل ہو گیا "تمہارا بھی بھلا؟ ہاں!"

"اپنے کو بھی تھوڑی آپ لوگ کی جان کاری کا..." بٹھل نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ہا' ریئیلی' اٹز گڈ۔ اٹز فنٹاسٹک!" اس نے جوش و مسرت کا طرزاً اظہار کیا پھر تجسس سے بولا "تم نے کیا جانا؟"

"آپ کا دھیان ہے صاحب! مت پوچھو۔"

"نانا' بتاؤ' بولو!"

"چھوڑو صاحب! آپ ولایت سے پلٹے ہو' مرچی چھوٹ گئی ہوگی۔"

پولیس افسر نے پہلے تو پلکیں پٹ پٹائیں اور کرسی پر اچھل پڑا۔ وہ ایک تیز فہم افسر تھا۔ بٹھل کا مفہوم اخذ کرنے میں اسے لمحہ بھر صرف ہوا اور اس نے قہقہہ لگایا۔ قہقہے میں بے ساختگی کم تھی لیکن اس کے ساتھیوں نے ہم نوائی کی اور لاعلمی میں سنجیدہ بھی ہو گئے۔ ہم سے مخاطب افسر نے تنی ہوئی آواز میں کہا "تمہاری غلط فہمی ابھی دور ہو جائے گی استاد!"

"دیکھتے ہیں صاحب! کس کی دور ہوتی ہے" بٹھل زیرلبی سے بولا۔

پولیس افسر کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے افسر نے معاً اپنا سر قریب کر کے دخل اندازی کی اور سرگوشی میں غالباً کوئی مشورہ دینے کی جسارت کی۔ اس کا انداز مودبانہ تھا' فدویانہ بھی۔ جواب میں پولیس افسر متانت سے سر ہلاتا رہا۔ کچھ دیر وہ گم صم سا رہا۔ اس کی پھنکارتی نظریں ہم پر بکھری ہوئی تھیں "ہاں استاد' استاد بٹھل!" وہ جکڑی ہوئی آواز میں بولا "آگے کی بات کریں' تم اچھی طرح جانتے ہو گے کہ تم کو یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟"

"اپنے کو پیچھے کا دکھائی نہیں دیتا" بٹھل نے تنک کے کہا۔

"ٹھیک ہے" پولیس افسر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی "ہم دکھاتے ہیں' پرسوں رات پڑوس کی ٹھاکر بستی میں ۲۷ آدمیوں کو یا تو مار دیا گیا ہے یا زندہ جلا دیا گیا ہے۔ پورے ۲۷ آدمی۔" وہ زور دے کے بولا۔

بٹھل خاموش کھڑا رہا۔

"مرنے والوں میں ٹھاکر بل دیو' ٹھاکر ہردیو' جیسے نامی لوگ شامل ہیں۔ وہ اس طرف کے بہت بڑے زمیں دار تھے' پرکھوں سے رئیس' بڑی آن بان والے۔ یہ عام لوگوں کی ہتیا نہیں ہے۔"

"بڑے لوگ کی ہتیا بھی بڑی ہوتی ہے۔" بٹھل نے بہ ظاہر تاسف سے کہا۔

"یہاں ایسا' ایسا اندھیر دور دور تک نہیں ہوا' سرکار نے اب ہم کو ادھر بھیجا ہے اور بھیجا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہوگا۔ ان کو معلوم ہے' ہم نے ناکام ہونا نہیں سیکھا اور ہم پولیس' چاروں طرف دیکھنے کے بعد ہی ہم کسی پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔"

"چار کھونٹ دیکھ کے ہی بڑھنا ٹھیک رہتا ہے" بٹھل نے کسمساتے ہوئے کہا "ایک بات پوچھیں صاحب! آپ کا کوئی رشتہ ناتا لگتا ہے ٹھاکروں سے؟"

"کیا' کیا کہا' کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"تھوڑا ٹھاکروں کا بھی آگا پیچھا' الٹا سیدھا دیکھا آپ نے؟"

"کیا مطلب؟" پولیس افسر بھڑک اٹھا "وہ بہت جانے پہچانے لوگ تھے۔ بہت اونچا گھرانا ہے ان کا۔ ان کے دادا رگھوبیر ٹھاکر کو انگریزوں نے سر کا ٹائٹل دیا تھا۔ اس علاقے

میں کون ہے جو ان کو نہیں جانتا۔"
بِھَل نے سرہلا کے تائید کی "ہاں صاحب! چرچے سنے ہیں ٹھاکروں کے۔"
صرف چرچے سنے ہیں" پولیس افسر نے گویا بِھَل کی نقل اتاری۔ "اور کچھ نہیں؟"
"اور کیا صاحب؟" بِھَل نے اکھڑی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"دیکھا نہیں کبھی؟"
"ہاں صاحب! درشن سے رہ گئے۔"
"درشن ضروری بھی نہیں' جاننا کافی ہے۔"
بِھَل نے خاموشی مناسب سمجھی۔
"استاد بِھَل!" پولیس افسر کی زبان کسی اندرونی خلفشار سے ہکلا گئی' کہنے لگا "ٹھاکر بل دیو' ٹھاکر ہردیو اور ان کے گھرانے کے اتنے لوگوں کی موت پر سرکار ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں رہ سکتی۔ سینٹر تک بات جاچکی ہے۔ ٹھاکروں کی حویلی میں ڈھانچوں کے سوا کچھ نہیں بچا۔ اس خون خرابے کی سزا بھی آخری درجے کی ہوگی۔ مجرموں سے پھانسی کا پھندا دور نہیں ہے۔ وہ بچ نہیں سکتے۔"
"نہیں بچنا چاہیے' پر صاحب بہادر! آپ نے گھٹنا کے کارن پر دھیان دیا؟ کوئی کارن تو ہوگا۔"
"کارن ایک ہی ہو سکتا ہے' ٹھاکروں سے دشمنی کا' کسی بدلے کا۔"
"لگتا ہے' پرانا بیر ہوگا۔ پہلے آپ اس کی کھوج کرو۔"
"تمہارے بتاؤ کی ضرورت نہیں' ہم یہاں جھک نہیں مار رہے" پولیس افسر کا پارا چڑھ گیا "بیر نیا بھی ہو سکتا ہے۔"
"ہاں صاحب! نیا پرانا کیا' بیر تو بیر ہے پر اس کا بھی کوئی سِرا ہوگا۔ ٹھاکروں نے کسی کو بڑی چوٹ دی ہوگی جو گھٹنا بھی اتنی بڑی ہوئی۔ لوگ بولتے ہیں' ٹھاکر' ٹھاکر نہیں رہے تھے' بس تاج ہی نہیں انکا تھا اوپر' اور یہ چھوٹا ٹھاکر' وہ راج کمار تو آدمی کا جنا نہیں لگتا تھا۔ بہت کٹ کھنا' مرکھنا تھا' منہ مارتا' ڈکراتا پھرتا تھا سارے میں۔ ادھری لوگوں سے پوچھو' بولتے ہیں صاحب' ایک دم کھلا ہوا تھا۔"
"اور کیا جانتے ہو تم ٹھاکروں کے بارے میں؟"
"اور کیا صاحب...!" بِھَل کا منہ بن گیا۔
کئی بار میرے جی میں آئی کہ دخل دوں مگر کسی بے زبان' مخبوط الحواس' کسی بے جواز آدمی کے مانند میں بِھَل کے پہلو میں بت کی طرح ایستادہ تھا۔ کسی یقین ہی میں زبان ساتھ دیتی ہے اور بیان میں تاثیر کے لیے کوئی یقین لازم ہے اور یقین کے لیے علم کی شہادت' علم کی سند چاہیے۔ میرا علم مفروضوں' اندازوں اور قرائن و آثار تک محدود تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ ٹھاکر کی حویلی کا رخ کرنے والے آتش بدوش سم جو بِھَل ہی کے فرستادہ تھے اور وہ وہی ہوں گے' پھر اور کون ہو سکتے ہیں لیکن ایک تنگ و تاریک گوشہ ان کے نہ ہونے' کسی اور کے ہونے کا بھی از روئے امکاں موجود تھا۔ بہرحال اتنا تو واضح ہو گیا تھا کہ ہمیں کوتوالی طلب کرنے کے باوجود اب تک وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں اور اس نوک جھونک' حجت و تکرار کا سبب کوئی رائے قائم کرنا ہے۔ بِھَل کو میں نے ایسا محتاط کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ پھونک پھونک کے انہیں جواب دے رہا تھا شاید اس لیے کہ کبھی ایسی' اتنی بڑی واردات یا سانحے کے سلسلے میں ہم کبھی پیش نہیں ہوئے تھے۔ واقعے کی نوعیت پہلے سے مختلف تھی۔ ولایت کا تربیت یافتہ پولیس افسر ورما بھی عام افسروں جیسا نہیں تھا۔
اس کی ساتھی بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ ان کے چہروں سے کدورت اور خشونت جھلکتی تھی جیسے ان کا بس نہ چل رہا ہو کہ وہ اس تو تکار کے بجائے جلد از جلد کوئی حکم نافذ کریں کہ بعد میں یہ حکم واپس بھی لیا جا سکتا ہے۔ پشیمانی پولیس کا معمول ہے۔ ان کا چلایا ہوا تیر کبھی نشانے پر بھی لگ جاتا ہے۔ ان کے درمیان بیٹھے ہوئے پولیس افسر کو کسی کارروائی اور خانہ پری سے غرض نہیں تھی۔ وہ سرا پکڑنے کی جستجو میں تھا۔ ولایت والوں کو یوں بھی وقت بہت عزیز ہوتا ہے۔ وقت کی قدر و قیمت کا فرنگیوں کو کوئی غیر معمولی احساس ہی ہوگا کہ ایک دنیا ان کی اسیر تھی۔ دیسی لوگوں کے پاس وقت بہت وافر ہوتا ہے اور کہتے ہیں' جو چیز وافر ہوتی ہے' اس کی قدر و قیمت بھی کم ہوتی ہے۔ دیسی لوگ ان معاملات میں بھی جوش و خروش سے شامل ہوتے ہیں جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پولیس افسر ورما ایک طباع تھا' ایک حقیقی پولیس افسر جو کسی معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے اپنی ذات سے بے پروا ہو جاتا ہے' خود سے کوئی سروکار نہیں رکھتا اور ایسا شخص زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ولایت کے بارے میں کسی نے مجھے بتایا تھا۔ شاید کرشنا جی نے وہاں پولیس کے لوگ تحقیق و تفتیش کی دوران میں مشین بن جاتے ہیں۔ مجرم یا ملزم سے انہیں ذاتی قسم کا عناد نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد اپنے مقصد کا حصول ہوتا ہے۔ وہ مجرم کے نہیں' جرم کے دشمن ہوتے ہیں اور دلیل و منطق کی ترازو ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کرشنا جی کہتے تھے کہ کبھی مجرم کے جرم کی نوعیت' اس کے وحشیانہ تیور' اس کے سفید جھوٹ اور پینترے بازی پر بہت خون کھولتا ہے' جی کرتا ہے' اسے وہیں گولی مار دی جائے۔ عدالت تو بہت دیر میں فیصلہ سناتی ہے اور کبھی شہادتوں کی کمی اور دلیلوں کی کوتاہی سے فیصلہ مجرم کے حق میں بھی ہو جاتا ہے' پولیس منہ دیکھتی رہ جاتی ہے لیکن پولیس کا کام مجرم کو اس کے اعمال نامے کے ساتھ عدالت کے سپرد کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایک انصاف پسند' فرض شناس پولیس افسر کو واقعی اپنی ذات بالائے طاق رکھ دینی چاہیے۔ مجرم سے نفرت و حقارت' بغض و عداوت اور احساس توہین و شکست جیسی ذاتی آلودگیوں سے مبرا ہو کے کوئی پولیس افسر جلد اور بہتر نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ سرزد ہو جانے والا جرم ماضی ہوتا ہے۔ جتنا نقصان ممکن تھا' ہو چکا ہوتا ہے۔ مجرم موجود ہوتا ہے اور اس کا مستقبل بھی ہوتا ہے۔ مجرم سے آئندہ قلب ماہیت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ورما بھی کچھ کرشنا جی کے قبیل سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ کرشنا جی کا مثیل نہیں تھا' کرشنا جی میں ہم دردی' مروت اور انسان دوستی بدرجہ کمال تھی۔ ورما اپنے طور پر ہم سے معاملت کر رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں کے تردد و تکدر کی کوئی فکر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ "تمہیں تو ٹھاکروں نے کوئی چوٹ نہیں دی؟" اس نے جھجکتی آواز میں پوچھا۔
"اپنے کو کیا صاحب!" بِھَل نے سر جھٹک کے کہا۔ "اپنے کو ادھری آئے بھی تو برس لوٹ جاتے ہیں' آتے ہیں تو تھوڑے ٹائم کے لیے۔" بِھَل کا لہجہ نرم تھا لیکن مدافعانہ نہیں۔
"اب کتنے دن بعد آنا ہوا؟"
"ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا۔"
"بیچ میں کہاں کہاں رہے؟"
"ایسے ہی گھوما پھیری رہی" بِھَل نے بے اعتنائی سے کہا "کیا بولیں؟"
"کیوں گھوما پھیری کیوں؟ کوئی خاص بات؟"
"اپنے کو کتے نے نہیں کاٹا ہے۔"
"کتے آدمی کو کاٹتے ہیں" ورما کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے افسر نے اچک کے کہا۔ ورما نے آنکھیں بھینچ لیں' اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار صاف نمودار ہوئے۔
"جواب آتا ہے اپنے کو" بِھَل درشتی سے بولا "پر آپ بدک جاؤ گے صاحب!"
"ہاں' بتاؤ گے نہیں؟" ورما نے بہ عجلت کہا "کیا بات ہے؟"

سدا بہار فلمی گیتوں کا...
سُر سنگ گیت
موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک منفرد تحفہ!
اس کتاب میں دیئے گئے گیتوں کا نوٹیشن ایسا ہے جس پر عمل کر کے گلوکاروں کی گائیکی کے مخصوص انداز بھی اپنائے جاسکتے ہیں۔ "سرنولپی" میں نئی علامات اختراع کر کے گلوکاروں کے ہر انداز کو اجاگر کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔ اپنی طرز کی ایسی کتاب پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی۔
صفحات 208 — ڈاک خرچ 25 روپے — قیمت 200/-
کتاب کی قیمت - بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 ... کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat@yahoo.com
KHAN BOOKS STATIONARY AND LIBRARY RAWALPINDI

"آپ کا واسطہ نہیں اس سے" بھجل آہستگی سے بولا "اپنے کو کسی کی کھوج ہے۔"

"کس کی؟" ورما نے جھک کے پوچھا "کون ہے وہ؟"

"کوئی کھو گیا ہے اپنا۔"

"کھو گیا ہے؟" ورما تذبذب سے بولا "کون؟ اڈے کا آدمی؟"

"گھر کا آدمی۔"

"اوہ!" پولیس افسر ورما نے لمبی سانس کھینچی۔

"وہ الگ چکر ہے" بھجل نے کھردری آواز میں کہا "آپ اپنی پھرکی گھماؤ۔ ہم کو ادھری کیوں بلایا ہے؟ لگتا ہے' آپ ہم پر شک کرتے ہو۔"

جانے کیوں بھی مضطرب ہو گئے۔ ورما کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی۔ ترخ کے بولا "تم پہ کیوں نہیں کیا جاسکتا؟"

"کرو صاحب!" بھجل کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔

"ہم اڈے کے آدمی ہیں۔"

"اور اڈے پہ بھی نمبر ایک۔"

"تو دیری کا ہے کی؟"

"ابھی نہیں استاد! ابھی تم سے کچھ اور جاننا ہے۔"

"اب آگے جاکے ہی زبان کھولیں گے۔"

"آگے کدھر؟"

"ابھی ادھری سارا ختم نہیں ہو جاتا۔"

"تم ایک چالاک آدمی ہو استاد!"

"پہلا نمبری بولا تھا آپ نے؟"

"ہاں' اور اس میں اب شک بھی نہیں۔ پہلے سنا تھا' اب دیکھ رہے ہیں لیکن استاد! ہمارا نمبر بھی کم نہیں ہے۔ جہاں کی تم بات کر رہے ہو' وہاں بھی ہمارا دیکھا اور جانا ہوا سامنے رکھا جاتا ہے۔"

"ادھری ہم ہوں گے اور اکیلے نہیں۔ ساتھ میں چونچ لڑانے کو اور بھی کالے چلے پہنچیں۔ ادھری ہم جو بھیرویں الاپ رہے ہیں اور آپ کے پلے نہیں پڑ رہی' ادھری ایسا نہیں ہوگا۔ ادھری کانٹے کا بڑا دھیان ہوتا ہے' آنے پائی کا حساب۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" ورما کی زبان بگڑنے لگی "اور کہہ بھی کیا سکتے ہو۔ اچھی طرح جان لو استاد! تمام شواہد تمہارے خلاف جاتی ہیں۔ تمہارے ٹھکانے کا آدمی بیچ بازار میں ٹھاکر کے کھلائے پلائے استاد گورا کے دباؤ میں ہوتا ہے کہ کہیں سے استاد بابر سینہ پھلا کے آجاتا ہے۔ اپنے اڈے کے آدمی کی بری درشا دیکھ کے اس کا خون جوش مارتا ہے۔ استاد گورا پر ٹھاکر کی چربی چڑھی ہوئی تھی۔ اس دو آنکھوں کے اندھے کو پتا نہیں تھا کہ سامنے کون مانا ہوا استاد ہے' چاقو کا' بل کا دھنی۔ ان جانے میں استاد گورا سے بھول ہو گئی اور زمین کا منہ دیکھنا پڑا' ایسا ہی نا؟"

"ایک دم ایسا ہی" بھجل نے ستائشی انداز میں کہا "لگتا ہے' ولایت میں کوئی میم نہیں پالی صاحب نے' گھڑیال سے بندھے رہے ہو' ذرا پچھلے سے بات کرو۔"

"پچھلے سے کیا؟" ورما گڑبڑا گیا۔

بھجل نے ٹھہری اور جمی ہوئی آواز میں اسے بتایا کہ فیض آباد شہر کے ایک آسودہ حال' سادہ شعار کاروباری شخص لکشمی داس کی جواں سال' نازک اندام' تعلیم یافتہ اور زیر تعلیم بیٹی برکھا ایودھیا میں تیرتھ یاترا کو گئی ہوئی تھی کہ ٹھاکر بستی کے مالک و مختار ٹھاکر بلدیو کے منہ زور' بے لگام اور نفس پرست بیٹے ہردیو کی نظروں میں آگئی۔ برکھا کا حسن و جمال دیکھ کے ٹھاکر اوسان کھو بیٹھا۔ اس نے وہیں تیرتھ استھان پر برکھا سے زیادتی کرنی چاہی اور ناکام رہا۔ پھر اس نے فیض آباد میں لکشمی داس کو برکھا کے لیے پیغام بھیجا۔ ٹھاکروں کے مال و زر' عیش و عشرت' رعب' دبدبے اور جور و ستم سے لکشمی داس خوب آشنا تھا۔ آس پاس کے لوگ اپنی نوجوان لڑکیاں پردوں میں چھپائے رکھتے تھے۔ لکشمی داس اس حقیقت سے واقف تھا کہ انکار کی سزا کیسی عبرت ناک ہو سکتی ہے لیکن سب کچھ جانتے بوجھتے وہ اپنی نرم و نازک بیٹی کو ٹھاکر کے جہنم میں نہیں دھکیل سکتا تھا۔ وہ بہانے کرتا رہا۔ ٹھاکر نے دھمکیاں دینی شروع کر دیں اور ایک روز اپنے شوریدہ پشت کارندوں کے ذریعے برکھا کو اغوا کرالیا۔ شہر کے' اڈے کے آدمیوں کو بروقت خبر ہو گئی۔ انہوں نے ٹھاکر کے نمک خواروں کو راستے میں جالیا اور مار بھگایا۔ برکھا بہ سلامت گھر واپس آگئی۔ اڈے کے آدمیوں کی یہ جرات ٹھاکر کے لیے ہتک اور توہین کے مترادف تھی۔ انہیں قابو میں رکھنے کے لیے ٹھاکر نے اپنے پروردہ بارہ بجی کے ہتھ چھٹ' چاقو باز' اڈا گیر استاد گورا کو فیض آباد بھیج دیا۔ گورا نے فیض آباد میں داخل ہوکے بیچ بازار میں ایک دن لکشمی داس کے محلے میں تعینات استاد ہریا کا راستہ روک لیا۔ چاقو نکل آئے۔ بھجل نے کہا کہ اتفاق سے اس دوران میں بابر (بستی میں) کسی کام سے وہاں سے گزر رہا تھا کہ مجمع دیکھ کے ٹھہر گیا۔ اس کی دخل اندازی کی وجہ سے گورا چاقو پر گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ ٹھاکر ہردیو کو پہلی ذلت اس وقت ہوئی تھی جب لکشمی داس نے اپنی بیٹی کے لیے اس کے رشتے پر ہامی نہیں بھری تھی۔ دوسری ندامت گورا کی ہزیمت سے ہوئی۔ ادھر برکھا اپنے اغوا کے حادثے سے ایسی دل برداشتہ ہوئی کہ ہنسنا بولنا' کھانا پینا بھول گئی۔ وہ سکتے کی سی کیفیت سے دوچار تھی۔ اس طرف ٹھاکر کے سینے میں پھانس اٹک گئی تھی۔ اور جلد ہی چند دنوں کے اندر اندر ٹھاکر ہردیو نے ایک رات اپنے زر خرید مسلح آدمی دوبارہ شہر بھیج دیے۔ جو اندھیرے میں تاک لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے چھپ کر اپنے علاقے کا گشت کرنے والے ہریا اور اس کے حقیقی بھائی پھجو پر وار کیا اور انہیں ختم کر دیا اور لکشمی داس کے گھر پر یلغار کی۔ اس کے گھر کے دربان اور ملازم کو راستے سے ہٹا کے وہ برکھا کو ساتھ لے گئے۔ لکشمی داس کو بھی انہوں نے زخمی کیا۔ وہ اب پاگل ہو گیا ہے اور اسپتال میں ہے۔ اڈے کے دو جوان آدمیوں کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنے شہر کی ایک لڑکی کی عزت و آبرو محفوظ کرنے پر سینہ سپر ہو گئے تھے۔"

بھجل ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ پولیس افسر ورما نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا "آگے ہم بتاتے ہیں استاد!" اس کا چہرہ تمتما رہا تھا' وہ اضطراری انداز میں بولا "بالکل ویسا ہی' جو تم بولنا چاہتے ہو۔ پھر یہ ہوا کہ لکشمی داس بچ گیا لیکن بے موت مرنے سے بدتر' ٹھاکر کے لوگ برکھا کو لے گئے اور تیسرے دن برکھا کی ادھڑی ہوئی برہنہ لاش شہر کے کنارے جھاڑیوں میں پڑی ملی۔ لکشمی داس پہلے ہی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا' اس دکھ سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ہریا' پھجو' لکشمی داس کے دونوں نوکر اور بیٹی برکھا' سب کی ارتھیاں آگے پیچھے اٹھیں۔ شہر کے بہت سے لوگ کریا کرم میں شریک ہوئے۔ اتنا ہی نا؟ چلو مان لیا کہ یہ ہتیا ئیں ٹھاکر کے آدمیوں نے کیں لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ بولو استاد!"

"جو آپ کی مرضی ہو' بول دیں۔ اپنے پلے اب کیا رہ گیا ہے۔" بھجل نے برگشتگی سے کہا "ہاں' اس کے بعد بدلی والوں نے چوڑیاں ڈال کے شہر میں ٹھرکا لگایا پھر کھیل ختم پیسہ ہضم۔"

"اور ان کی جگہ کسی اور نے لے لی۔ ٹھاکر بستی کا صفایا کیا' ایک دو نہیں' پورے ستائیس آدمی بھون دیے۔ ان کے سارے کھیت کھلیان' سارا کچھ" ورما کی آواز حلق میں پھنسے لگی اور اس نے تقریباً بلبلا کے پوچھا "وہ' وہ کون تھے؟"

"اب سُر تال آپ ملاؤ صاحب!" بھجل نے بے نیازی سے کہا۔

"وہی کر رہے ہیں" پولیس افسر ورما ترخ کے بولا "اور ایسا گمبھیر معاملہ نہیں' دھیان دو تو ادھر ادھر آمنے سامنے کا صاف دکھائی پڑتا ہے۔ زیادہ دن نہیں بیتے تھے' ہریا اور پھجو کو شمشان گھاٹ پہنچائے' ٹھاکر ہردیو کو پورے کنبے پریوار' نوکر چاکر' دھن دولت سمیت ختم کر دیا گیا اور جانا کہ حساب چکتا ہو گیا ہے اور یہ سارا اس سمے ہوا جب لکھنؤ کا بادشاہ بھجل اور اس کا وزیر بابر' فیض آباد میں تھے۔"

اب کیا کلام رہا تھا۔ پولیس افسر کے لہجے میں ایسی کوئی رمزیت اور معنی خیزی نہیں تھی' بھجل کو کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے تھا۔ اس نے خاموشی اختیار کی' شاید اس لیے کہ غیر معقول جواب سے خاموشی بہتر ہوتی ہے۔

"تم اسے اتفاق بولو گے' ہیں نا؟ تم کو ایسا ہی بولنا چاہیے لیکن ایسے اتفاق بڑے کم ہوتے ہیں استاد! اڈے کے دو جوان مارے گئے۔ آج دو کم ہوئے تھے' کل چار بھی ہو سکتے تھے۔ کیا اڈے کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ اڈا ہوتا کس لیے ہے؟ اس کے آدمی اتنے سستے نہیں ہوتے' کیوں استاد!"

"اڈے کے آدمی کا کیا مول۔ وہ حرام کا' بلی کا بکرا ہوتا ہے۔" بھجل نے بے زاری سے کہا "کوئی نئی بات کرو صاحب! آپ نے فیصلہ کر دیا ہے' اب آگے حکم کرو۔"

"نہیں استاد' معلوم ہے تم کس نشے میں ایسا بول رہے ہو۔ کام پکا ہوا ہے' سولہ آنے پکا۔ ہم نے تمہارے پھجو استاد سلامی اور اڈے کی اور آدمیوں سے پوری جان کاری لے لی ہے' پرسوں شام سے کل صبح سویرے تک تمہارے اٹھنے بیٹھنے کی۔ پرسوں شام تم سلامی کے ساتھ پولیس کی مدد مانگنے تھانے گئے تھے۔ پھر کسی ہوٹل میں چائے پی' بازار گھومے اور اسپتال جاکے لکشمی داس کی پوچھ گچھ کی۔ اڈے سے رات کو گانا سننے کوٹھے پہنچے اور دیر تک مستی کرتے رہے پھر اڈے لوٹ کے باقی رات وہیں گزار دی۔ دوسرے دن سورج نکلنے بلکہ دن چڑھنے کے بعد گھر کا رستہ لیا۔ اس میں کچھ غلط تو نہیں ہے؟" ورما نے تپیدہ آواز میں پوچھا۔

"آنے پائی سے برابر!" بھجل نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔

"معلوم ہوا' فیض آباد آنے کے بعد استاد بابر گھر میں یا حویلی میں بند رہا۔ وہ صرف اس دن باہر نکلا تھا اور یہ دوسرا دن تھا' جب بازار میں ہریا اور استاد گورا میں چاقو چل رہے تھے اور ہریا کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ پھر اتنے دن بعد پرسوں پہلی بار استاد بابر اڈے پر آیا' وہ بھی تمہارے بلانے پر' تم نے اڈے کے آدمی بھیج کے اسے بلایا تھا۔ ہریا اور پھجو کے کریا

کرم میں بھی وہ شریک نہیں ہوا تھا۔ وہ استاد یار' جو ہریا کو نچلا پڑتے دیکھ کے تڑپ گیا تھا' ہریا کی موت پر گھر میں آرام کرتا رہا۔ کلشی داس کی یاد بھی پرسوں تم دونوں کو بہت آئی جب کہ وہ کئی دن سے اسپتال میں مر رہا تھا۔ ہریا اور پھجو کے مرن کو ابھی سے نہیں بیتا تھا کہ گانا سننے اور ناچ دیکھنے کا تمہارا من ہو گیا۔ رات گئے تک آشا بائی کے کوٹھے پر چکنی کے گھنگرو کھنکتے رہے۔ ادھر شہر میں بیس آدمی گواہ ہیں کہ تم دونوں یہیں تھے' بیچ شہر میں۔ سب کے سامنے اور اڈے کا کوئی بھی آدمی باہر نہیں تھا۔ تھانے جا کے تم نے رات کو اڈے کے آس پاس پولیس کا پہرا بھی لگوا لیا تھا۔ اتنے دن بعد تمہیں اڈے کی رکھوالی کی بھی چنتا ہو گئی۔ سارے کام اسی شام اور اسی رات۔ بڑے تجربے کے بعد ایسا تانا بانا بنا ممکن ہوتا ہے۔ تجربہ بڑی چیز ہے" ورما نے آخری لفظ انگریزی میں ادا کیے اور نتھنے پھلائے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ بٹھل کی خاموشی پر اس نے تقریباً جھڑکتے ہوئے ٹوکا "بولو استاد! پرسوں رات اور کل صبح تک ہی اتنی چلت پھرت کیوں۔۔؟"

"بھول ہو گئی صاحب!" بٹھل نے پشیمانی کے انداز میں کہا "پر اتنا صاف ہو گیا' ادھری ٹھاکر بستی میں جانے اور ناک دھنا دھن کرنے والے ہم نہیں تھے۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب کہاں ہوا کہ ٹھاکر بستی میں چیر پھاڑ کرنے والے وحشی' وہ بھیڑیے تمہارے بھیجے ہوئے نہیں تھے۔"

"آپ جو مطلب نکالو صاحب!" بٹھل نے سر جھکا کے کہا۔

"وہ لوگ کون تھے؟" ورما اکڑی ہوئی آواز میں بولا "تم کو اب یہی بتانا ہے' وہ کون تھے؟ ہمیں وہ آدمی چاہئیں۔"

"سمجھو' ہمی تھے وہ" بٹھل نے دبے لہجے میں کہا۔

وہ پانچوں اپنی نشستوں پر زیر و زبر ہو گئے۔ پولیس افسر کے جسم میں ہڑک سی اٹھی "ہاں ہاں" اس نے بے تابی سے کہا "تم یا تمہارے آدمی' سنگی ساتھی۔ بات ایک ہی ہے۔"

بٹھل نے ہاتھ جوڑ دیے "ایک بات تو دوسری کوئی نہیں رہی مہاراج!"

"اب صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ تم جلد سے جلد ان آدمیوں کے نام بول دو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے' ہم بولتے ہیں' وہ ہمی تھے۔ ہم یا ہمارے سنگی ساتھی اور آپ نے ابھی اَنڈا کھا دیا ہے۔ بات ایک ہی ہے تو آپ کا کیا جاتا ہے۔ ان کے بدلے ہمیں کھینچ دو۔ پھندے کے لیے گردن چاہیے آپ کو' ہماری کہ ان کی۔ اپنا کام ہلکا کرو اور گھر جا کے گھر سیدھی کرو' بل کھائی ہوئی۔"

"جانتے ہیں' ایسا کیوں بولتے ہو" ورما کی آواز کا زہر فزوں ہو گیا "اس پر تم چھوٹ جاؤ گے لیکن وہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تم یہاں ہو' کیا سمجھتے ہو' ہم تمہیں اتنی آسانی سے آگے جانے دیں گے؟ ایک دن' دو دن' ہفتے بھر' کئی ہفتے تک ہم تمہیں روک سکتے ہیں۔"

"پر ایک دن تو بدا کرو گے" بٹھل نے چڑ مراتی آواز میں کہا۔

"وہ دن ابھی دور ہے۔"

بٹھل کسمسا کے رہ گیا۔

چند لمحے وہ تینوں سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میز کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے مقامی افسر بھی شامل ہونے کے لیے مضطرب تھے۔ معاً ورما کی بھڑکتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی "کون تھے وہ؟"

"آپ سمجھتے ہو' ہم بتا دیں گے؟"

"نہیں تو اپنے لیے برا کرو گے۔"

"اور بتائیں گے تو کیا ہمارا کچھ بھلا ہو گا؟"

"اس میں تمہارے لیے ضرور کوئی نرمی ہو جائے گی' ہم بھی سفارش کریں گے۔"

"اور چپ رہنے پہ کیسا رہے گا؟"

"یہ دھیان من سے نکال دو پھر تمہارا انگ انگ بولے گا' ہم کو معلوم ہے' کیسے۔"

بٹھل نے جھجکتے ہوئے کہا "اس سے آپ کو کیا ملے گا؟ کچھ بھی نہیں صاحب! کچھ نہیں۔"

"دیکھیں گے' تم ہی لوگوں میں ہماری بھی گزری ہے۔"

"اپنے ساتھ نہیں گزری صاحب! وہ اور لوگ ہوں گے۔"

"تم' تم کون ہو؟" ورما کو طیش آ گیا "دادا گیر؟ پھنے خاں' طرم باز؟"

"ہم کیا' کچھ بھی نہیں صاحب! دھوکا ہو رہا ہے آپ کو' دور ہو جائے گا۔"

"ایسے' ایسے ہی دور ہو جائے گا؟" ورما چلا کے بولا۔

"بنتی ہی کر سکتے ہیں صاحب!"

"ہا' بنتی' بنتی" ورما اکھڑ گیا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کے بولا "سنتے ہیں آپ' استاد بٹھل کیا بولتے ہیں' وہ بنتی کر رہے ہیں۔ انہیں شما کر دیا جائے۔ واہ استاد!" ورما کے ساتھیوں کے چہروں پر رعونت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی "تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو استاد!" ورما کڑکتی آواز میں بولا۔

بٹھل اپنے جتن کر رہا تھا۔ اپنی اور میری برات کی کوشش اسے آخری لمحے تک کرنی تھی۔ میرا اتنا کچھ نہیں تھا۔ مجھے تو اپنی لاعلمی کی ایک آسودگی حاصل تھی۔ اسے آسودگی ہی کہنا چاہیے۔ اندھے اور بہرے کو دیکھنے اور سننے سے امان حاصل رہتی ہے' گونگے کو بولنے سے۔ آدمی کو اختیار نہیں ہے' نہ دیکھنے پر' نہ سننے پر' نہ بولنے پر۔ مجھے کوئی محنت نہیں کرنی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے تو میرا ایک ہی جواب ہوتا' اپنی معذوری کا اظہار۔ غالباً میری ثانوی حیثیت سے وہ بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے خیال میں مجھ سے ہم کلامی وقت کے ضیاع کے مترادف ہوگی۔ بٹھل ہی کو ساری پیروی کرنی تھی مگر مآل دونوں کا مقدر تھا۔ بٹھل کی کشمکش کا مجھے خوب اندازہ تھا۔ اس شخص کے لیے اپنی وکالت کیسی اعصاب شکن اور صبر آزما ہوگی جو فی الواقعی کسی قابلِ گرفت اقدام کا مرتکب ہوا ہو۔ صاف دامنی کی توانائی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ بہرحال ایسا انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے بٹھل کو عواقب و مضمرات کا بدرجہ تمام احساس ہو گا۔ حویلی میں پولیس کی آمد' کوتوالی میں طلبی' اس طرح کمرے میں گھرے ہوئے مجرموں کی طرح باز پرس اور دلیلیں' تاویلیں۔ اور بعد میں پیش آنے والے ممکنہ بہت ناروا بڑے اذیت ناک مرحلوں سے نبرد آزمائی کے خاکے بھی اس کے ذہن میں واضح ہونے چاہئیں۔ ٹھاکر کوئی ایک آدمی نہیں تھا۔ کوئی بھی اقبال مند محض ایک آدمی نہیں ہوتا' کبھی وہ دو کے مساوی ہوتا ہے' کبھی چار کے' کبھی سو کے اور کبھی ہزار کے۔ اپنی اپنی حیثیت پر موقوف ہے۔ ٹھاکر کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ پولیس افسر ورما کے تجزیے پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ یہ بٹھل وہی تھا جو میں نے اپنے طور پر قیاس کیا تھا۔ ورما نے گویا اس کی تصدیق یا تکرار کی تھی۔ اس کی زبانی یہ ترتیب بٹھل سن کے مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا ہم زاد رہا ہو۔ ابھی تک بٹھل' ٹھاکر بستی میں جانے والے جاں بازوں سے اپنی لاتعلقی کی کوئی معقول' مدلل توجیہ پیش نہیں کر سکا تھا۔ اس کا اقرار بھی مبہم تھا' انکار بھی۔ کبھی تردید' کبھی تائید' کبھی لہجہ کبھی نرمی' مدافعانہ اور سرکشانہ۔

انہوں نے ہمیں طلب کرنے سے پہلے ہمارے بارے میں خاصی معلومات جمع کر لی تھیں۔ اڈے کے آدمیوں نے ازراہِ نیاز مندی ہماری ہنرکاری و مشاقی' چستی و چابک دستی کے فسانوں میں خاصی مبالغہ آرائی کی ہوگی۔ سب کچھ تازہ تازہ تھا۔ یہ نقش دھندلانے یا زائل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت تو درکار ہوتا۔ بٹھل نے ابتدا ہی میں اندازہ کر لیا ہو گا کہ ہمیں سامنے بلانے سے پہلے وہ کوئی رائے قائم کر کے بیٹھے ہیں۔ سیدھا انکار انہیں آسانی سے منظور خاطر نہ ہو گا۔ وہ سارے بڑے اہتمام میں نظر آتے تھے۔ کچھ دیر کے لیے سہی' انہیں ان کی جزرسی و دیدہ ریزی' خود کچھ اخذ کرنے کی سرخوشی سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ بٹھل کی جانب سے صاف انکار انہیں مایوس کر سکتا تھا۔ مایوسی بھی اشتعال کا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ میرا گمان تھا' بٹھل کی طول کلامی بھی بے سبب نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پتنگ بازی کے دوران میں ڈھیل دینے جیسا کوئی حربہ۔ وہ انہیں متردد و متذبذب کرنے کی جستجو میں تھا لیکن ورما بھی کوئی روایتی طرز کا پولیس افسر نہیں تھا۔ اس کا طریق کار جداگانہ تھا۔ ہمارے لیے بہت نیا۔ امتیازی کارکردگی کی کوئی وجہ ہی ہو گی جو اس نے کم عمری کے باوجود پولیس میں یہ مرتبہ حاصل کیا تھا۔ اب خلاصہ اتنا تھا' ورما کچھ ٹھانے ہوئے تھا' ہم اس کی تحویل میں تھے اور اسے ہر لحاظ سے ہم پر فوقیت حاصل تھی۔ اپنی دھمکی کے مطابق وہ ہمیں عرصے تک حوالات میں روک سکتا تھا اور یہ عرصہ کسی طور ہمارے لیے سودمند نہیں تھا۔ اگر واقعی ٹھاکر بستی میں ٹھاکر بل دیو' اس کے خاندان اور کھیت کھلیان نیست و نابود کرنے والے بٹھل ہی کے بھیجے ہوئے آدمی تھے تو اپنا کام پورا کر کے راتوں رات وہ بہت دور جا چکے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے' گروہ کے بجائے وہ الگ الگ سمتوں میں بکھر گئے ہوں۔ انہوں نے ہر ممکن احتیاط کی ہو گی مگر کہتے ہیں' جرم اپنے سائے چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی ذرا سی لغزش بھی ہمیں بڑے عذاب سے دوچار کر سکتی تھی۔ وہ کلکتے اور بمبئی کے آدمی ہوں گے۔ ان شہروں کے سوا کہاں کے ہو سکتے ہیں اور ضرور انہیں جامو اور جمرو نے اکٹھا کیا ہو گا' بٹھل تو مستقل فیض آباد میں تھا۔

دیر تک ایک جگہ خود کو باندھے ہوئے کھڑے کھڑے ٹانگیں اکڑنے لگی تھیں۔ "دیکھو صاحب!" بٹھل نے نیم التجائی' نیم شکایتی لہجے میں کہا "اپنی مانو تو کچھ بولیں؟"

"اب کیا رہ گیا ہے۔ اب تک تمہاری ہی سنی ہے" ورما آتش بار آواز میں بولا۔

"اچھا ہو گا کسی اور طرف بھی دھیان دو۔"

"کسی اور طرف؟ کس طرف؟" ورما کے تیوروں میں

ذرا بھی مزاحمت نہیں تھی، بگڑ کے بولا "بس استاد! تم کو اب صرف یہ بتانا ہے، وہ کون لوگ تھے؟"

بھمل نے ایک بار پھر صراحت سے مدعا بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بندھی ہوئی آواز میں کہا کہ بہتر ہوگا، وہ ہمدردانہ انداز میں ہمارے معاملے پر نظر ثانی کریں۔ کیا یہ معلوم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ کس بنیاد پر اتنے بڑے واقعے میں ہمیں ملوث کیا جارہا ہے۔ لکشمی داس کی نوجوان اور معصوم بیٹی پرکھا کے اغوا، خون اور ساتھ میں دو ملازموں کی ہلاکت اور لکشمی داس کی بے چارگی، اس کی شکستہ حالت پر اڈے کے آدمی دل گرفتہ تھے۔ شہر میں ان کے ہوتے ہوئے یہ سانحہ کیسے ممکن ہو گیا۔ یہ ان کے لیے بڑی سبکی اور شرم کی بات تھی۔ لیکن ظاہر ہے، اس سے بڑا صدمہ انہیں اپنے دو بے گناہ ساتھیوں کی موت کا ہونا چاہیے۔ وہ تو بے حال تھے اور ان کی کیفیت جنونیوں کی سی تھی۔ ہریا اور بھوکے کریا کرم سے پہلے وہ بارہ بھنگی جاکے استاد گورا کے سر پر پہنچنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ان سے معلوم کیا جائے یا شاید خود انہوں نے پولیس کو بتایا ہو کہ ان کی لگامیں کس نے کھینچے رکھیں، کس نے انہیں صبر و ضبط کی "تلقین" کی، کون راہ کی دیوار بن گیا، کس نے انہیں تسلی دی کہ وہ خاطر جمع رکھیں، گورا کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ اسے یہ سودا الانا بہت مہنگا پڑے گا۔ عجلت مناسب نہیں، کوئی بھی الٹا سیدھا قدم پڑ سکتا ہے۔ ٹھاکر مل دیو اور ٹھاکر ہردیو سے اڈے کے آدمیوں کا براہ راست کوئی معاملہ نہیں تھا۔ انہیں تو گورا مطلوب تھا، وہ اور اس کے ساتھی۔ گورا ہزار ٹھاکروں کا پروردہ ہو لیکن انہیں گورا سے سروکار تھا۔ اصولاً گورا ہی ان کا ہدف ہونا چاہیے۔ ٹھاکر تو دور کی بات تھے۔ گورا کی ہزیمت ٹھاکروں کے لیے درس عبرت ہوتی۔ اڈے کے آدمی بس اشارے کے منتظر تھے۔ وہ انگاروں پر وقت گزار رہے تھے لیکن ہوش و حواس سے عاری نہیں ہوئے تھے۔ ٹھاکروں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے انہیں بدترین نتائج کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ ٹھاکروں کے جاہ و جلال اور اثر و رسوخ سے وہ خوب واقف تھے۔ وہ اتنی ہی دور تک جا سکتے تھے جتنی ان کی استطاعت ہے۔ اڈے کے آدمیوں کو چاقو اور زور کے علاوہ پولیس اور قانون کی بھی شد بد ہوتی ہے۔ کسی کو بھی زنداں پسند نہیں۔ کوئی بھی سولی پر چڑھنا نہیں چاہتا۔ یہاں سب ایک دوسرے کے گواہ ہیں اور شہر کے لوگ بھی۔ اڈے کے آدمیوں میں کوئی بھی اس عرصے میں شہر سے باہر نہیں گیا۔ نہ یہاں باہر سے کوئی آیا۔ شاید پولیس نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ فیض آباد کے اڈے کا کوئی آدمی ٹھاکر بستی کی غارت گری میں شامل نہیں تھا۔ پھر وہ کون تھے؟ وہ کون ہو سکتے ہیں؟ وہ اڈے کے آدمی نہیں تھے تو ان کے فرستادہ ہو سکتے ہیں یعنی اڈے کے آدمیوں نے ادھر ادھر اپنے دوستوں سے فریاد کی ہو یا مال و زر صرف کرکے کرائے کے آدمی جمع کیے ہوں اور انہیں ٹھاکر بستی جانے والے راستے کی طرف ہنکا دیا ہو۔ وہاں تباہی مچانے والوں کی نفری بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ ٹھاکروں کی حویلی کی دیواریں اونچی ہوں گی، پہرے دار بھی کم نہیں ہوں گے۔ ٹھاکروں کے اتنے بڑے گھر اور لاؤ لشکر پر چند آدمیوں سے غلبہ نہیں پایا جا سکتا۔ وہ لوگ بہت منظم ہوں گے اور مسلح بھی خوب، پیشہ ور بھی۔ اس منصوبے پر انہوں نے پوری طرح غور و فکر کیا ہوگا۔ غور و فکر کے لیے وقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ آندھی کی طرح ٹھاکر بستی میں وارد ہوئے تھے اور چھلاوے کے مانند غائب ہوگئے۔ اس منصوبے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے کہ یہ سرفروش مہم جو فیض آباد کے اڈے کے آدمیوں کی تحریک پر ٹھاکر بستی میں آئے تھے اور اس طرح فیض آباد کے اڈے کے آدمیوں نے مرنے والے اپنے عزیز ساتھیوں سے رفاقت کا حق ادا کردیا۔ ان کی روحوں کو سکون پہنچانے کے اسباب پیدا کیے اور اپنے سینوں کا بوجھ ہلکا کیا۔ کسی مضبوط جواز، معتبر شہادت اور بین ثبوت کے بغیر ان پر ایسا کاری الزام عائد کرنا ستم ہے، ناانصافی اور ہٹ دھرمی ہے۔ "ایسا کیسے صاحب!" بھمل نے گمبھیر لہجے میں کہا "یہ اتنا بڑا کارن نہیں ہے کہ اڈے کے دو آدمی مارے گئے تھے۔ چاقو رکھنے اور زور کرنے والوں کے بیچ ایسا اوپر نیچے روز ہوتا ہے۔ ہم پاگل نہیں ہیں صاحب!"

پہلی بار مجھے اپنے آپ پر شبہ ہوا۔ میں یقیناً کسی بدگمانی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ بھمل کے بیان میں بڑا اثر تھا۔ پانچوں افسر انہماک سے سنتے رہے۔ ورما کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے معمر افسر نے دخل اندازی کرنی چاہی تو ورما نے اسے روک دیا۔ بھمل کے چپ ہو جانے پر چند لمحے سناٹا چھایا رہا پھر ورما کی بپھری ہوئی آواز گونجی "کارن پوچھتے ہو گرودیو! کارن ہے۔ سب سے بڑا کارن تم خود ہو۔ شہر میں تم ہو، یہاں تمہارا اور تمہارے سیدھے بازو والے استاد بابا کا ہونا سب سے بڑا کارن ہے۔ تم اڈے کے آدمیوں میں خود کو کیوں شامل کر رہے ہو۔ ان سے خود کو الگ کرکے بات کرو۔ تم ٹھیک بولتے ہو۔ ان لوگ نے بھی یہی بولا ہے۔ تمہی نے انہیں روکا تھا پر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم نے خود کو بھی روکے رکھا ہو۔ تم نے انہیں ہوا ہی نہیں لگنے دی۔

معلوم تھا کہ ٹھاکر بستی سے کچھ دنوں بعد ایسی سوچنا آنے پر وہ آپ ہی آپ ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ ہم نے چاروں طرف دھیان دیا، پوری چھان بین کی ہے۔ پرکھوں سے آس پاس میں ٹھاکروں کا سکہ چل رہا ہے۔ کوئی بڑی دشمنی نہیں تھی ان کی کسی سے۔ دشمنی کے لیے برابر کا ہونا چاہیے۔ ہم نے ادھر کلکتہ پولیس کو بھی ارجنٹ تار دیے۔ کلکتے کی ساری پولیس استاد بھمل کو جانتی اور مانتی ہے۔ بولتے ہیں، استاد بھمل کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں۔ ایک وقت سارے کلکتہ شہر میں اسی کا راج تھا۔ اب بہت دنوں سے استاد کلکتے میں نہیں ہے اور جامو استاد اس کی گدی پر بیٹھا ہوا ہے، ویسے اڈا استاد بھمل کے نام ہی پر چلتا ہے۔ جامو بھی بڑا تگڑا استاد ہے۔ استاد بھمل نے کوئی ایسا ویسا تو اپنی جگہ نہیں بٹھایا ہوگا۔ کلکتے سے آنے والی رپورٹ میں بڑی بڑی باتیں، بڑی بڑی کہانیاں لکھی ہیں تمہارے لیے۔"

"وہ تو سارا ٹھیک ہے۔" بھمل نے ناراضگی سے کہا "پر یہ کدھری ہے کہ ٹھاکر بستی پہ ہمارے آدمی چڑھ دوڑے تھے۔"

"وہی تم کو بتاتا ہے" ورما نے جلی کٹی آواز میں کہا۔ "پولیس ایسے کسی پر الزام نہیں دھرتی۔ ہمارے پاس کارن ہیں۔ یہ بھی تم ٹھیک بولتے ہو، دو ساتھیوں کو کھو دینا اڈے کے آدمیوں کے لیے اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ دیر سویر سہی، وہ گورا ہی سے نمٹتے۔ ٹھاکروں تک وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ٹھاکروں تک وہی سوچ سکتا ہے جس کی آنکھ دور تک دیکھتی ہو۔ یعنی وہ آدمی تم جیسا ہو یا تم۔ اڈے کے آدمیوں کو ہم نے دیکھ لیا ہے۔ ان میں زیادہ تر کدھے ہیں۔ بس ان کو سامنے کا دکھائی دیتا ہے۔ جامو اور جمرو کو تم نے بلا لیا۔ اب یہاں ان دونوں جیسا کوئی استاد نہیں رہا۔ پھر بھی اڈا چل رہا ہے اور یوں چل رہا ہے کہ اڈا جمرو اور جامو کا ہے اور ان کے سر پر استاد بھمل بیٹھا ہے، کوئی سینہ پھلا کے دندناتا ہوا آئے تو کیسے آئے؟"

ورما کو معاً کچھ خیال آیا۔ اس نے رک رک کے ایک نگاہ سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر ڈالی۔ دو ایک ورق الٹنے کے بعد وہ اسی کرخت لہجے میں بولا "اب کے یہاں تم بہت دنوں بعد آئے۔ تم کہیں بھی رہو، کہیں بھی جاؤ، کتنی ہی دور، کہیں تو تمہارا یہاں انکار رہتا ہے۔ تم کو بار بار یہاں آنا ہے، جب تک تمہارا راج محل کھڑا ہے اور محل میں بیٹی رہتی ہے، بیٹی یا جو کوئی بھی ہے۔ محل کی چوکیداری اڈے کے آدمی کرتے ہیں۔ جامو اور جمرو کے ناتے شہر کا اڈا تمہارا اڈا اور مونچھ کی کمان کھنچی ہو۔ سینہ پھلائے، ہنٹر لہراتا وہ بھمل کے عین مقابل آکے ٹھہر گیا۔ ورما کے اشارے پر دو سپاہی مجھے بھمل سے کچھ دور لے گئے۔ گویا وہ ابھی صرف بھمل کو تختہ مشق بنانا چاہتے تھے۔ بڑی مونچھ والا سپاہی، بھمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتا رہا۔ "تو ہی رستم ہے؟" بھمل نے کاٹ دار آواز میں پوچھا۔

سپاہی کا جسم بل کھا گیا، آنکھیں کچھ اور چوڑی ہو گئیں۔ اس کے بجائے معمر افسر نے اشتعال کی حالت میں کہا "ہاں، یہی رستم ہے، یہ سپاہی کم، جلاد زیادہ ہے۔ اس کو تمہارے جیسے موٹی کھال کے سوروں کے لیے یہاں رکھا ہے۔"

"اپنے کو نقلی لگتا ہے۔" بھمل نے جھٹ ہاتھ بڑھا کے سپاہی کے بائیں گال پر پھیلی ہوئی مونچھ کی نوک مروڑ ڈالی "مونچھ تو اس کی کراری ہے۔ تیل پلاتا ہے رے اس کو؟"

سارے افسر پھڑک اٹھے۔ سپاہی رستم بری طرح سٹپٹا گیا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کے اس نے ہنٹر گھمایا پھر کچھ خیال آنے پر اپنے ساتھی سپاہی کو بھمل کے ہاتھ باندھنے کی ہدایت کی۔

"آدمی بھی کرارا ہے۔" ایک مقامی افسر نے زبان کھولی "مونچھ ہی کو نہیں، سارے بدن کو تیل پلاتا ہے۔"

"اپنے کو تو بہروپیا دکھتا ہے۔ کسی اور کو بلاؤ صاحب! اس نے بس چربی چڑھائی ہے۔" بھمل نے یقیناً کوئی فیصلہ کرلیا تھا۔

رسی باندھنے کے لیے دو سپاہی بھمل کا ہاتھ پکڑ کے پشت کی طرف کرنے کو آگے بڑھے ہی تھے کہ بھمل نے اچانک دونوں ہاتھ پھیلا کے ان کی گردن پر ترچھی ضرب لگائی۔ یہ افتاد دونوں کے سان و گمان میں نہ ہوگی۔ دونوں بے توازن ہوئے اور پاگلوں کے مانند چیختے ہوئے بھمل کی طرف جھپٹے۔

لمحے بھر میں کمرا منتشر ہو گیا، پانچوں افسروں نے کرسیاں چھوڑ دیں۔ معمر افسر نے طمنچا نکال کے تان لیا۔ دو سپاہی میرے لیے جست لگانے کا تاثر دیا تو انہوں نے اپنی گرفت سخت کردی۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ مجھ سے الجھے رہیں اور انہیں بھمل کے پاس جانے کا موقع نہ ملے۔ نوجوان افسر کھنا بھی بھمل کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ رستم ہوش و حواس سے بیگانہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے بھمل کے ہاتھ بندھ جانے کا انتظار کرنے کے بجائے ہنٹر بلند کیا اور گھما کے بھمل کو مارنا چاہا مگر بھمل نے ہنٹر کا چمڑا چابک دستی سے اچک لیا اور اپنے

ہاتھ میں تیزی سے لپیٹ لیا۔ رستم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں' سارا جسم پھڑک رہا تھا۔ ادھر سے نوجوان افسر اور دو سپاہیوں نے بھل کو دبوچ لیا لیکن بھل نے پھر کوئی مزاحمت نہیں کی "ان بھانڈوں کو دور کرو صاحب!" اس نے گونجتی آواز میں کہا۔

"تم ایک اور جرم کر رہے ہو۔" ورما دہاڑنے لگا "قابل دست اندازی پولیس۔"

"خون سے بڑا نہیں ہے' ان کو روکو صاحب! ہم مانتے ہیں' ہمی ٹھاکر بستی میں گئے تھے۔"

"ہونہہ۔" ورما کے چہرے پر سکون کے آثار ہویدا ہوئے۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے لیے اس نے کچھ وقت لیا "مگر تم نہیں' تمہارے ساتھی۔" اس کی آواز کی جھلاہٹ ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔

"جامو اور جمرو استاد۔" بھل نے سر جھکا کے کہا۔ مجھے جھٹکا سا لگا' یہ جواب میں نے اپنی سماعت کا فتور جانا مگر بھل نے جامو اور جمرو ہی کے نام لیے تھے۔

"جامو اور جمرو استاد' ہا!" ورما بپھر گیا "پھر تم... تم پھر چکر چلا رہے ہو۔ یہ' یہ تار دیکھتے ہو' یہ' یہ۔" ورما نے بے قراری سے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات ٹٹول کے ایک کاغذ اٹھایا اور بھل کو دکھانے لگا۔ لال رنگ کا یہی کاغذ تھوڑی دیر پہلے نوجوان افسر کھنا نے ورما کے حوالے کیا تھا "تار میں لکھا ہے' جامو اور جمرو دونوں کلکتے میں موجود ہیں' موجود رہے ہیں اور اڈے کے دوسرے آدمی بھی۔ کلکتہ پولیس کی طرف سے ہماری پوچھ گچھ کے جواب میں یہ تار آیا ہے۔" ورما کی زبان فرط غضب سے بہکنے لگی۔

"پھر کس کا بولیں صاحب! آپ تو ادھار کھائے بیٹھے ہو۔" بھل کا لہجہ ورما کی ضد تھا' بڑی حد تک معتدل "آپ کو بولا ہے' ہم اڈے کے لوگ ہیں' اپنا کام دوسرا ہے۔ آپ کو تھوڑا ٹھنڈا ہونے کا ٹائم ملے' اس واسطے ہم نے جامو اور جمرو استاد کا نام لیا ہے۔"

میرے سینے سے کوئی بوجھ ہٹ گیا۔ بھل نے ورما سے پوچھا کہ اس نے جواب نہیں دیا؟ جب کہ ورما نے ابھی تسلیم کیا ہے کہ ہریا اور کچھو' لاکشمی داس کے دو ملازم' برکھا کے اغوا اور اس کے ساتھ درندگی کے واقعات میں ٹھاکر ہریو اور استاد گورا ہی ملوث تھے۔ بھل نے ایک بار پھر اپنا مدعا دہرایا "ہم کو بولو صاحب! شہری پولیس پھر اس طرف کیوں نہیں گئی؟"

"ان کی طرف جانے کے لیے پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔" ورما نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا "ہم سمجھتے ہیں' وہ ٹھاکر ہی ہو سکتا ہے' ٹھاکر اور اس کے کارندے لیکن کسی نے انہیں دیکھا نہیں' کسی نے تھانے میں آ کے کوئی شکایت نہیں کی' کسی نے رپٹ درج نہیں کرائی۔"

"پر آپ جانتے ہو' سارے جانتے ہیں' ادھری سارا شہر بولتا ہے' وہ کوئی اور نہیں تھے۔ اپنی بھی کسی تھانے میں آ کے رپٹ نہیں کٹائی' اپنے کو بھی کسی نے نہیں دیکھا اور پولیس کو معلوم ہے' اس رات ہم ادھری شہر میں تھے۔ اپنا کیا ثبوت ہے صاحب؟"

بھل نے ورما کو جواب دہی کی زحمت نہیں دی۔ شاید اسے یقین تھا کہ ورما کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ کبھی ایسے جواب طلب نہیں کرنے چاہئیں کہ مسئول زچ ہو کے اپنے کسی نادر' غیر مدلل جواب ہی پر اڑ جائے۔ بھل کے رنگ بدلتے لہجے میں اب حیرت انگیز مدافعت اور مقاہمت نظر آتی تھی۔ دو سپاہی اور نوجوان افسر اسے جکڑے ہوئے تھے۔ رستم کچھ فاصلے پر ہنٹر لیے اپنی سبکی کی تلافی کے لیے بے تاب تھا۔ بھل کی عدم مزاحمت اور افسران کی جانب سے کوئی ترغیب نہ ملنے پر سپاہیوں کا جوش اور جذبہ کسی قدر ماند پڑ چکا تھا لیکن بس وہ کسی ہدایت کے منتظر تھے۔

بھل نے ورما سے کہا کہ اس نے طرح طرح اپنی بے گناہی باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہی کر سکتا ہے۔ اس اعادہ و تکرار کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا ہے۔ اسے مجرم قرار دینے کی بنا پولیس کے اعلا افسر نے اپنے طور پر اخذ کیے ہوئے چند حقائق پر رکھی ہے' ان کا خلاصہ یہ ہے۔ اڈے سے بھل کی پرانی وابستگی' اڈے کے نامی گرامی استاد کی حیثیت سے شہرت' اڈے کے دو نوجوان ساتھیوں کے خون پر غم و غصہ' اڈے کے زیر نگرانی شہر کے ایک محلے کے مکین لاکشمی داس کے گھر کی تباہی پر ندامت اور ذلت کا احساس' شہر میں بھل کے شیش محل اور اس کے شیشہ نفس مکینوں کی عزت و حرمت پر آنچ آنے کے اندیشوں کا غلبہ' استاد جامو کی کلکتے سے ہنگامی انداز میں آمد اور روانگی۔ پولیس کی دانست میں ٹھاکر بستی پر یلغار کے ناقابل یقین جرم کے لیے یہ حقیقت آمیز نشانیاں کافی ہیں مگر یہ ثبوت اور شہادتوں سے عاری ہیں۔ بین ثبوت کے بغیر' جیسا کہ اس نے پہلے بھی کہا ہے' یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ اس کی کوئی عقلی حیثیت ہے نہ قانونی۔ پولیس کی یہ امید کہ اپنی عام روش' آخری درجے کی ایذاؤں سے وہ بھل اور بابر کو اعتراف پر مجبور کر دیں گی' ایک خام خیالی' خوش خیالی ہے' جرم کے مرتکب نہ ہونے کی

...ورت میں وہ کس طرح اپنی گردنوں کی نذر پر آمادہ ہو جائیں ...آخر پولیس کو بھی انہیں عدالت میں پیش کرنا ہے۔ اگر ...یہاں پولیس کے جبر و ستم سے سرنگوں بھی ہو جائیں عدالت ...منحرف ہو سکتے ہیں۔

ورما توجہ سے سنتا رہا' بھل نے اسے دخل اندازی کا ...موقع بھی نہیں دیا۔ بھل نے کہا کہ کچھ دیر جاتی ہے' زیادہ ...سے بس کا وکیل عدالت کی ابتدائی کارروائی مکمل کر کے ...روائی میں پولیس کی زبردستی اور زیادتی پر بازپرس کے لیے ...بھی چاہتا ہو گا۔ وہ ایک مستند وکیل ہے اور ایسے پیچیدہ ...معاملات کا ماہر۔ اپنے موکلین کی برات کے لیے وہ ...تک' جس حد تک ممکن ہوا' حکام بالا کی' یہاں تک کہ ...حاکموں کی خدمت میں حاضر ہو کے داد و فریاد سے ...نہیں چوکے گا اور حویلی کے مکین بھی اپنے دریچے' ...دروازے مقفل کر کے نہیں بیٹھ جائیں گے۔ وہ اعلا تعلیم سے ...آراستہ ہیں اور اپنے اور دوسروں کے حقوق کا پورا شعور ...رکھتے ہیں' وہ جس حد تک بھی آسودہ ہیں۔ اس سے کہیں ...زیادہ اپنے مربی و محسن بھل اور بابر کی عافیت کے لیے داؤ پر ...لگانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ ورما نے انہیں یہاں طلب ...کرنے کی دھمکی دی ہے حالانکہ پولیس اچھی طرح اس ...حقیقت سے واقف ہے کہ اڈے کے لوگ ٹھاکر بستی کی خون ...ریزی کے ملزم ہیں۔ بھل اور بابر' جامو اور جمرو کے کسی بھی تعلق سے ...بے خبر ہیں۔ پولیس نے گزشتہ رات انہیں کن کن ...ذہنی اذیتوں سے دوچار نہ کیا ہو گا' پولیس بہتر جانتی ہے' اسے ...کس قدر مایوسی ہوئی ہے۔ حویلی کے مکین تو بہت دور کے ...ہیں۔ انہیں تو اور رکھا گیا ہو گا۔ ورما نے حویلی کی خانہ ...نشین خواتین کو کوتوالی بلا کے رسوا کرنے کی شوشہ طرازی بھی ...کی ہے بے شک اس جگہ قدم رکھنے کا حادثہ ان کے لیے ...ناقابل فراموش ہو گا لیکن ظاہر ہے' بھل اور بابر کی سلامتی ان ...کے لیے بہر طور مقدم ہونی چاہیے اور رسوائی کی ابتدا تو گھر ...کی چار دیواری کا رخ کرنے ہی پر ہو جاتی ہے پھر کیا رہ ...جاتا ہے پھر ان کے لیے کیا رکاوٹ رہ جائے گی۔ یہ ...بات پولیس کی سمجھ میں نہیں آئے گی جتنے گہرے نقش کی ...وابستگی' وارفتگی اور والہانہ ایثار۔ بھل نے پیشکش کی ...ورما کو یقین نہ آئے تو انہیں طلب کر کے دیکھ لے۔ ...اس نے کہا کہ اسے اور بابر کو اڈوں ہی سے متعلق نہ سمجھا ...جائے' اڈوں کے سوا بھی ان کے بہت سے پرسان حال ہیں ...جو انہیں دیکھتے رہیں گے' وہ ہر سطح پر' ہر جگہ یہ سوال ...اٹھائیں گے کہ کن شہادتوں کے جواز پر ان کے رفیقوں'

عزیزوں کو مورد عتاب ٹھہرایا گیا ہے۔

ورما کی نگاہیں بھل پر مرکوز تھیں۔ دوسرے افسروں کے چہروں پر خون جل رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے اور ان کی آنکھیں چڑھ جاتیں۔ ورما کا یہ شوق سماعت انہیں گراں گزر رہا ہو گا مگر ورما تو جیسے ان کی موجودگی بھول چکا تھا۔

بھل نے اپنا بیان جاری رکھا' کہنے لگا کہ ٹھاکر بستی میں دو آدمیوں کے خون کی واردات کتنی ہی ہولناک اور سنگین ہو لیکن ایک دوسرا پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ ایک بار یوں ہی' ازراہ آگہی اردگرد کے دیہات' قصبوں اور شہر کے لوگوں کے پاس جا کے پوچھا جائے کہ وہ اب کیسا محسوس کرتے ہیں؟ اب کچھ موسم بدلا ہوا لگتا ہے کہ نہیں؟ بعض خرابیاں اور تباہیاں باعث مسرت بھی ہوتی ہیں۔ کون جانے' کتنے ہریا اور کچھو جیسے جوان' ٹھاکروں نے اپنے اقبال کی بھینٹ چڑھائے ہوں۔ جانے کتنی برکھائیں ان کی ہوس کا شکار ہوئی ہوں' پولیس کو خوب احساس ہو گا کہ ٹھاکروں کی زندگی میں کتنے موقعوں پر وہ خود بے بسی و بے چارگی سے دوچار ہوئی ہے۔ یہاں کون ہے' شاید کوئی بھی نہیں جس کے دل میں ٹھاکروں کے اس انجام پر ہوک اٹھی ہو' ان کے ختم ہو جانے پر کسی نے دہائی نہیں دی' کہیں ماتم برپا نہیں ہوا' پولیس کچھ دیر کے لیے زمین پر آ کے دیکھے تو اسے اپنے مطلوب مجرم ایسے شقی القلب معلوم نہیں ہوں گے۔ انہوں نے ٹھاکروں کے مانند ناداروں کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے۔ انہوں نے ٹھاکروں کو نشانہ بنایا ہے' کسی اور کو نہیں' لاکشمی داس' برکھا اور ان کے بے زبان ملازموں کو نہیں۔ جانے کتنے لوگ ٹھاکروں کے لیے سینوں میں آگ جلائے' زہر چھپائے ہوئے تھے۔ ان گنت ماہ و سال' روز و شب کے دکھوں کے بعد کم سے کم ایک پہر تو ان کا بھی ہونا چاہیے تھا۔ بھل نے کہا' اس کا بس چلتا تو وہ بھی ٹھاکروں کے لیے کچھ ایسی ہی سزائیں تجویز کرتا لیکن' لیکن بھل نے خود کو روکا اور ڈھلکی ہوئی آواز میں بولا کہ اس تلخ نوائی اور حقیقت بیانی کے اظہار سے مجرموں کی وکالت اس کا مقصود نہیں ہے۔ پولیس اپنا کام جاری رکھے۔ ایسے واقعات کے اعادے کی پیش بندی کے لیے اسے حرکت میں رہنا چاہیے۔ یہ توحش و تجسس' تردد و تشویش اس کے منصب کا لازمہ ہے کہ آخر وہ کون تھے۔ وہ کون تھے' کینہ پرور' شوریدہ پشت یا زخم خوردگاں' ستم زدگاں' آمنے سامنے کچھ دکھائی سجھائی نہ دینے پر پولیس کی بھٹکتی نظریں اڈے پر منڈلانے لگیں۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھل اور بابر بھی

ہوسکتے ہیں' وہ یا ان کے ساتھی' اندھیرے میں شک کی نمو زیادہ ہوتی ہے۔ شک ہی سے راہیں نکلتی ہیں۔ ایک شک بجھل اور بابر پر بھی کیا جاسکتا ہے لیکن شک اور یقین میں بہت دوری ہے۔ شک محض شک ہے۔ شہادتوں کے اعتبار کے بغیر محض شک ہے اور کوئی شہادت یوں نہیں اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے کہ وہ بجھل اور بابر نہیں ہیں۔ ہر مجرم کتنا ہی پختہ کار اور دیدہ دلیر ہو' ارتکاب جرم کی ایک پشیمانی' ناتوانی اس کے ہاں ضرور ہوتی ہے۔ اسے پرکھنے کے لیے چشم بینا اور گوش نیوش چاہیے۔ پولیس کے خیال میں بجھل اور بابر کے ساتھیوں نے بجھل اور بابر کے ایما پر یہ سرفروشانہ یا وحشیانہ کام کیا ہے۔ کسی کامل اعتماد اور غیر معمولی تعلق کی خاطر ہی میں انہوں نے یہ جرات کی ہے اور اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو بابر اور بجھل پر اپنے جاں نثاروں کی تعظیم بہرحال واجب ہے۔ پولیس نے یہ کیسے قیاس کرلیا کہ بجھل اور بابر اتنے حقیر ثابت ہوں گے کہ اپنے مبینہ محسنوں کی نشان دہی کردیں گے۔ انہیں آشکارا کرنے سے مراد ہے جیسے پولیس کی خدمت میں ان کے سر طشت میں رکھ کے نذر کرنا۔ بجھل اور بابر کی کھال تن سے جدا کردی جائے' انہیں شکنجے میں کس دیا جائے' انہیں انکار ہی کرنا چاہیے۔ وہ تو انکار ہی کرتے رہیں گے' آخری دم تک۔ وہ اس احسان کشی' اعتماد شکنی' اس کمینگی و ذلالت پر موت کو ترجیح دیں گے۔ انہیں تو پھر مر ہی جانا چاہیے۔ وہ تو مرجائیں گے پھر پولیس کو کیا حاصل ہوگا؟

بجھل نے کہا کہ وقت گزاری کے لیے طرح طرح کے نام لے کے پولیس کو جگہ جگہ بھٹکایا دوڑایا جاسکتا ہے۔ ہمیں وقت کی ضرورت ہے۔ آخر پولیس کو ایک دن ہمیں عدالت کے حوالے کردینا ہے جہاں ترازو سے فیصلہ ہوتا ہے۔ سو ہمارے لیے یہی ایک تدبیر قرین عافیت ہے کہ پولیس اپنی تحویل میں رکھنے کا ایک محدود وقت گزارنے کے بعد ہمیں عدالت میں پیش کردے۔ ادھر ہمارے وکیل' غرض مند اور دعوے دار بھی اپنی کوششیں کرتے رہیں گے اور وہ لوگ بھی.... بجھل کی زبان یکایک چر مرا سی گئی' وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا کہ اگر پولیس کا اندازہ درست ہے تو وہ لوگ جو اپنے رفیقوں کے لیے اتنی دور جاسکتے ہیں' ایسا ایثار کرسکتے ہیں' ان سے کیا بعید ہے کہ ہم پر پولیس کے بے جا تصرف سے ان سرکشوں کے دماغ میں کس وقت کیا سما جائے۔ ان کی وحشت کا کیا عالم ہو' آگے وہ کیسی دیوانگی پر تل جائیں۔

ورما کے ساتھ بیٹھے ہوئے معمر افسر کو سب سے پہلے بچھو نے ڈنک مارا' اس کا رنگ متغیر ہوگیا' آنکھیں ابل آئیں "یہ' یہ دھمکی ہے سراسر اتنا آپ نے' یہ کیا بکتا ہے؟" وہ بلبلاتے ہوئے بولا "اس کا اشارہ کس طرف ہے؟"

"اور اس دھمکی میں اقرار بھی چھپا بلکہ کھلا ہے۔" دوسرے افسر نے شدومد سے اس کی تائید کی۔

ورما اپنے ساتھیوں کی پراگندگی سے دگرگوں ہوگیا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے انہیں تحمل کا مشورہ دیا اور گمبھیر آواز میں بجھل سے مخاطب ہوا "کیا' کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"صاف ہے صاحب! پولیس نہیں مانتی اور اپنے کو ایسے سمجھے ہوئے ہے تو...." بجھل نے تنک کے کہا "اوجی آپ بولتے ہو' وہ ہمارے سگی ساتھی تھے۔ وہ ہمارے ساتھی ہیں تو وہ تو اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔ ان کا کیا ٹھیک ہے۔"

"دیکھا سر آپ نے!" ورما کے بائیں جانب بیٹھا ہوا افسر چمک کے بولا "یہ کہنا چاہتا ہے' اگر ہم نے اسے آزاد نہ کیا تو...."

ورما نے اس کی بات پوری نہیں سنی اور بجھل کی طرف انگلی اٹھا کے درشتی سے پوچھا "کیا مطلب ہے تمہارا....؟"

"کیا بولیں صاحب! جو آپ کی مرضی ہو' نکال لو۔ کبھی تو ادھر صاحب لوگوں سے پوچھو' ان کا زیادہ چلتا ہے۔ اپنے کو جو لگا تھا بول رہا ہے۔"

بھی بجھڑ گئے تھے۔ بجھل کو ایسا کچھ کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اپنے خاصے موثر انداز میں عرض گزاری کرتے کرتے اسے یہ کیا ہوگیا۔ پولیس افسروں کی خاموشی سے ظاہر تھا کہ بجھل کا کہا ہوا ان تک منتقل ہو رہا ہے۔ اس موقع پر ربطی بلاغت کے منافی تھی۔ زبان پر اختیار سب سے بڑا اختیار ہے۔ لوگ صحیح کہتے ہیں' زبان آگ' زبان شبنم ہے۔ آدمی کو آدمی سے قریب کردے اور دور کردے۔ افسروں کی برہمی دیکھ کے مجھے اور بجھل کو دسار میں ہوئے سپاہیوں میں کچھ اور پھرتی آگئی لیکن ہم دونوں نے کوئی مدافعت نہیں کی۔

اس سے پہلے کہ ورما یا کوئی دوسرا افسر ہم پر یورش کرتا بجھل نے ورما سے کہا "دیکھو صاحب! ابھی آپ کی کوئی انگلی ہوئی نہیں ہے۔ رشتہ ناتا ابھی نہیں ہے پہلے کوئی ہے۔ کوئی عورت بھی اپنے بیچ میں نہیں آئی' زمین مال کا بھی نہیں۔" بجھل کا لہجہ کئی قسم کے تاثرات کا آمیزہ تھا۔ تلخی' تاسف' یاسیت اور اس میں التجا بھی شامل تھی۔ بجھل نے کہا کہ ورما کے ساتھ موجود پولیس افسروں کے تیور

محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے ان کے درمیان کوئی خاندانی بغض و عناد ہے اور انہیں اصل مجرموں کی اتنی جستجو نہیں جتنی ہم سے اپنی کسی عداوت کی ضد ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ اڈے سے وابستہ آدمی پولیس کی نظروں میں ہمیشہ مشکوک رہتے ہیں۔ سب سے پہلے وہی معتوب قرار پاتے ہیں لیکن یہ ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔ ہمیں بہرحال اپنا دفاع کرنا ہے۔ پولیس ایک جبری اعتراف پر کیوں مصر ہے۔ ہمارا مشورہ ہے' ماننا نہ ماننا پولیس کی مرضی ہے' پولیس واقعی اصل مجرموں تک پہنچنا چاہتی ہے تو اسے اپنے نقطہ نگاہ اور طریق عمل پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ اسے ازسر نو اپنی تفتیش کا آغاز کرنا چاہیے۔ اس دوران وہ ہم پر بھی نظر رکھے' ہمیں اپنی تفتیش کے دائرے سے خارج نہ کرے۔ یہاں سے ہمیں رخصت کردینے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم پولیس کے ہاتھوں سے نکل گئے' ہمارے گناہ معاف ہوگئے اور یہ آخری موقع تھا۔ پولیس کو اپنی حاکمیت' ذرائع اور اہلیت پر اعتماد رکھنا چاہیے۔ اس کے ارادے اور راستے میں کون مزاحم ہوسکتا ہے۔ وہ بار بار ہمارے دروازے پر دستک دے سکتی ہے۔ ہم ابھی شہر میں ہیں۔ گویا ہمیں جلد سے جلد یہاں سے روانہ ہوجانا تھا۔ پولیس خاطر جمع رکھے' اس کے خیال سے ہم یہاں اپنے قیام کی مدت کسی حد تک بڑھا سکتے ہیں' اور ہمارے یہاں موجود رہنے نہ رہنے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم جہاں بھی ہوں گے' نزدیکی دور بھی' ہر جگہ پولیس کے قریب ہی ملیں گے۔ اطراف و اکناف میں کون سی ایسی جگہ ہے جہاں پولیس کا جال نہ تنا ہو۔ ہم کوئی گمنام لوگ نہیں اور اتنے کم فہم بھی نہیں کہ فرار ہونے کی نادانی کریں۔ کلکتہ ہمارا پرانا ٹھکانا ہے۔ لکھنؤ کا اڈا بابر کے نام سے چلتا ہے۔ یہاں فیض آباد میں بھی ہمارا اڈا ہے اور یہاں ہمارا ایک گھر ہے۔ اتنے ٹھکانوں سے روپوش ہوکے ہم کہاں جاسکتے ہیں۔ بجھل نے دہلی اور حیدر آباد وغیرہ کا ذکر نہیں کیا اور ورما سے فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ اب اسے کچھ کہنا اور نہ کسی سوال کا جواب دینا ہے۔

شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ بجھل اس طرح اچانک خاموش ہوجائے گا۔ ورما نے مضطرب ہوکے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب کشمکش و پیچ کی کیفیت سے دوچار تھے۔ کمرے میں ہیجان آمیز سکوت چھا گیا۔ لمحے گزر گئے پھر بجھل نے یہ سکوت توڑا اور اٹھتی ہوئی آواز میں کہا "ہم کو اجازت دو صاحب!"

ورما چونک سا پڑا' اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال بچھ

ابتدا سے بلیک بیلٹ
تک کی مشقیں

ان لوگوں کے لئے جو تنہا یا کسی
ایک ساتھی کے ساتھ کراٹے سیکھنا
چاہتے ہیں۔

اردو میں پہلی بار کراٹے سکھانے
کی ایک مکمل اور آسان کتاب

قیمت	ڈاک خرچ
40 روپے	23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
منی آرڈر ارسال کریں

kitabiat@hotmail.com
kitabiat@yahoo.com

اڈے کے آدمی تمہارے آدمی ہیں۔ اس اڈے کا تم کو کلکتے کے اڈے سے زیادہ دھیان ہونا چاہیے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اڈے کے دو آدمی مارے جائیں اور استاد جھمل گردن ڈالے بیٹھا رہے۔ تم یارو بھی جا کے استاد گورا کو ڈھیر کر سکتے تھے۔ تمہارے آگے وہ کتنی دیر کا تھا پر ٹھنڈا کر کے کھانا اچھا رہتا ہے۔ تم کو پتا تھا' وہ ٹھاکروں کا پالا ہوا ہے۔ یہ پالتو مالکوں کے ہاتھ پیر ہوتے ہیں۔ پر جا کے بنا راجا نہیں ہوتا۔ جیسے تمہاری آن کی بات تھی ویسی ٹھاکروں کی بھی ہو گی اور ٹھاکروں سے بیر کا تم کو معلوم تھا' بھاری پڑے گا۔ یہ تمہارے بس کا نہیں تھا۔ ٹھاکر بگڑ جاتے تو چن چن کے اڈے کے آدمی سلا دیتے۔ تم نے اپنے آدمیوں کو روک لیا تھا اور تم بھی گورا استاد سے بدلے کا دھیان من سے نکال دیتے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید یہی کرتا۔ گورا کو ایک بار ڈھیل دینے سے وہ اور پھیل سکتا تھا۔ آج اس نے اپنے آڑے آنے والے دو آدمی مار دیے' لکشمی داس کا گھر اجاڑ دیا' کل اس کا سانڈ پنا اور بڑھ سکتا تھا۔ اس کے پیچھے ٹھاکر تھے اور ٹھاکر ہردیو' اسے جوانی اور پیسے کا نشہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ ایک بار منہ کو خون لگ جائے تو آگے کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ کل تمہارے راج محل پر بھی اس کی نظر پڑ سکتی تھی۔ وہاں راج کماریاں' اور لوگ بولتے ہیں' بے پروں والی پریاں رہتی ہیں۔ اپنے کتے استاد گورا کے ختم ہو جانے پر ٹھاکر ہردیو نچلا بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اس کا دماغ بہت پھرا ہوا تھا۔ تم نے اسی سے آگے کا سوچ لیا تھا جب بازار میں ہریا اور گورا کا جھگڑا ہوا تھا اور استاد بابر نے بیچ میں کود کے گورا کو ادھ موا کر کے ایک طرح سے جیون' دان کر دیا تھا۔ اسی سمے سے تم کو... چار کرتا تھا کہ آنے والے دن کیسے بدلے ہوئے' پر کشٹ کے' کتنے کٹھور بلکہ کٹھن ہو سکتے ہیں۔ استاد سلامی نے تم کو بول دیا تھا کہ گورا کس راستے سے آیا تھا' اس کی ڈوری کس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے دوسرے دن سے تم نے سویرے سے شام تک اڈے پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ تم کو نئی طرف دیکھنا تھا۔ اڈے کی طرف' اڈے کے بیوپار کی ساکھ باقی رکھنا یا بند باندھنا' اڈے کے لوگوں کی رکھشا کرنا' اپنے دوست جمرو اور جامو کو منہ دکھانا اور اپنے راج محل کو بچانا' اڈے پر بیٹھتے ہی تم نے سوچ بچار کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ تاروے کے استاد جامو کو کلکتے سے بلا لیا۔ جامو' ہریا اور پچھو کی موت سے پہلے آیا تھا۔ وہ ان کی موت اور تیجے پر نہیں آیا' کیوں؟ یہ تم ہی بہتر جانتے ہو گے کہ اسے کون سا کام پڑ گیا تھا جو شہر میں صرف ایک رات بتائی اور چلا گیا اور سنا ہے' کسی کو بتائے بنا۔"

ورما نے گلاس اٹھا کے گھونٹ بھر پانی پیا اور رومال سے باچھیں خشک کر کے کہنے لگا "چھوڑو" آگے چلتے ہیں۔ ادھر کنور صاحب بہادر ٹھاکر ہردیو کے پاس۔ گانٹھ تو اسی دن پڑ گئی تھی۔ جب گورا پھٹے کپڑوں' سوجے منہ اور ننگے پیروں سے اس کے سامنے پہنچا تھا۔ اپنے پٹھو کی یہ درگت دیکھ کے چھوٹے ٹھاکر کا خون کھول جانا چاہیے اور یہ جان کے تو اور سر گھوما ہو گا کہ گورا اور ہریا کے بیچ میں آنے والا اجنبی کون شیر کا بچہ تھا' کدھر رہتا اور کیا کرتا ہے۔ گورا کا ایسے اکھڑی سانسوں سے لوٹنا صاف ٹھاکر کا اپمان تھا۔ ٹھاکروں کی ناک لمبی ہوتی ہے۔ پھر اس سوچنا پر کہ اب فیض آباد کے اڈے پر کوئی اور نہیں' استاد جھمل بیٹھنے لگا ہے' جس کا دور دور تک کوئی جوڑ نہیں۔ ٹھاکر کی چھاتی میں اور کھلبلی مچنی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ استاد جھمل اڈے پر پہنچ جائے' اس کا پتن کچل دینا ہی ٹھیک ہے۔ ٹھاکر کے من سے پرکھا بھی چپکی ہوئی تھی۔ ایک بار وہ اس کے ہاتھ میں آتے آتے نکل گئی تھی اور نکلوانے والے ہریا اور اڈے کے آدمی تھے۔ گورا استاد بھی اپنے مالک کی آنکھوں اور دل میں کھوئی ہوئی جگہ پانے کے لیے بڑا ویاکل ہو گا۔ اسے بھی جلدی تھی۔ استاد جھمل اڈے پر اپنے آپ کو تھپکیاں دے رہا تھا اور اچھے سمے کے شگون لے رہا تھا کہ گورا ایک رات فیض آباد آ گیا۔ اب کے وہ بڑی تیاری سے آیا تھا۔ اس نے اپنا کام کر دکھایا۔ ٹھاکر کو پرکھا بھینٹ کر دی اور ہریا اور پچھو کو گرا کے اپنی طرف سے ہارا ہوا یدھ جیت لیا لیکن ٹھاکر اور گورا استاد' دونوں کو استاد جھمل کی جان کاری پوری نہیں تھی۔ جاننے نہ جاننے کا سارا چمتکار ہے' اور بڑھتی گھٹتی جاننے کا۔ کچھ نہیں معلوم تھا کہ دوسری طرف کیا فیصلہ ہو سکتا ہے اور کیا فیصلہ ہو چکا ہے۔ دوسری طرف استاد جھمل ہے۔ اڈے کے آدمی رات ہی ہم کو بولے تھے۔ استاد کی چار آنکھیں' آٹھ ہاتھ پاؤں ہیں۔ ہاتھ پیر ناپ تول کے اٹھتے ہیں۔ استاد کے دماغ میں 'نا' شطرنج بچھی رہتی ہے۔ لگتا ہے' ہریا اور پچھو کے جانے سے پہلے ہی استاد جھمل نے سارا بھانپ لیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد فیصلے پر ٹھپا لگا دیا۔ ادھر ادھر کی جانچ پڑتال پر بس ایسا بے بھاگی دیا کہ ایک ہی جھٹکے میں سارا تنا جھکا دیا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ کون گورا استاد' کون ٹھاکر کنور' ہردیو' حویلی' سونا' چاندی' نوکر چاکر' زمین جاگیر' گاجر مولی کی طرح سارا ہی جڑ سے اکھاڑ دو۔ وہ کیا بولتے ہیں' سو سنار کی' ایک لوہار کی۔"

"اور ایک بات بولیں استاد!" ورما کے مشتعل لہجے میں ہیبت سی نمودار ہوئی "استاد گورا ذرا خود کو تھام کے رکھتا اور ٹھاکر ہردیو کا خون بھی اتنی گرمی نہ کھاتا تو بھی کیا ہوتا! ہاں' ہریا اور پچھو ضرور بچ جاتے۔ پرکھا بھی زندہ رہتی۔ اس کے دو نوکر بھی جان سے نہ جاتے' لکشمی داس بھی پاگل نہ ہوتا' پر ادھر کا' ٹھاکر کی طرف کا شاید کچھ نہ بدلتا۔ ان کا فیصلہ تو لکھا جا چکا تھا۔ ہریا اور پچھو کے کریا کرم اور تیجے اور ٹھاکر بستی کی دُرگھٹنا کے بیچ میں سے کم ہے۔ اتنے لوگ اکٹھے کرنے میں کچھ سمے تو لگنا ہی چاہیے۔ یہ تو جان پڑتا ہے' اسی سے طے ہو چکا تھا جب ہریا اور گورا کے ٹکراؤ میں استاد بابر نے آ کے پانسا پلٹ دیا تھا۔ اس کے دوسرے تیسرے دن جامو کلکتے سے آیا تھا۔ جامو کا اچانک فیض آباد آنا اور ترنت واپس ہو جانا بھی کسی کارن بنا نہیں ہو گا۔ جامو استاد کو ٹھاکروں کی چھب' ڈھب' چلت پھرت' ان کی راج ہٹ کا پورا معلوم تھا' سارا کچا چٹھا۔"

میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ ورما نے پھر مجھے متزلزل کر دیا تھا۔ وہ جیسے مجھے اور جھمل کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ اس کی تجزیے میں ان سنے اور ان دیکھے کی کوئی بے اعتباری نہیں تھی۔ وہ ایسا پر اعتماد تھا جیسے ہر مرحلے میں شریک رہا ہو اور سرگزشت کی نگرانی کرتا رہا ہو۔ اس الزام تراشی یا فرد جرم کا بقیہ حصہ بھی وہی تھا جو نزدیک و دور کے مشاہدے سے میں نے وضع کیا تھا یا میری جستجو کا حاصل تھا۔ ورما جیسے میرا آموختہ دہرا رہا تھا مگر وہ ہمیں یہ سب کچھ بتانے پر کیوں مصر تھا' ان وضاحتوں کی اسے کیا ضرورت تھی؟ اس حد تک تفصیل سے۔ اپنی منطق وہ خود تک بھی محدود رکھ سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ طبعیتاً کوئی اذیت پسند شخص تھا' اس قدر جزئیات بیانی سے وہ ہمیں کوئی آزار پہنچانے کے درپے تھا یا وہ کوئی سنکی آدمی تھا' خود نما' خود پسند۔ بعض ذہین آدمیوں کو داد طلبی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس تجزیہ و تحلیل سے اپنے ساتھیوں پر اپنی ذہانت و فطانت' نکتہ رسی و خیال آفرینی کا کوئی اثر ڈالنا مقصود تھا یا پھر اپنے اخذ کیے ہوئے نتیجے پر اسے کوئی شبہ تھا۔ جھمل کا ردعمل شاید اس کی توقع کے مطابق نہ ہوا اس لیے وہ اسے ٹٹول اور جھنجھوڑ رہا تھا۔ ورما کے لب و لہجے کا اعتماد ہر چند کسی شک یا ابہام کی نفی کرتا تھا۔ اعتماد تصنعی بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے قیاس اور شکوک کا اظہار بھی بڑے تیقن سے کرتے ہیں' بعض لوگوں کا انداز ہی حکمی ہوتا ہے اور ورما تو پولیس کے بڑے عہدے پر سرفراز تھا۔ اس کی آواز کی توانائی کچھ اپنے منصب کے سبب سے بھی ہو گی۔ عہدہ و منصب' مال و زر' شہرت و مقبولیت کی قوت ہی کچھ اور ہوتی ہے یا ہو سکتا ہے' اپنی تشریح و توضیح سے وہ جھمل کو متنبہ کرنا چاہتا ہو کہ جس شخص کی نگاہ اتنی تیز اور رسا ہو' دیر تک اس سے کچھ چھپانا لاحاصل ہے۔ ورما کو سرے ڈھونڈنے کا فن آتا تھا۔ وہ کھوجیوں کے مانند تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا' میری طرح جھمل کو بھی جکڑے ہوئے ہو گا۔ پولیس افسر ورما ہوا میں تیر نہیں چلا رہا تھا۔

میں نے سر گھما کے ایک نظر جھمل کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور بس! اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ باطن تو نہاں ہوتا ہے' ظاہر بھی عیاں نہیں تھا۔ مجھے تو بڑی وحشت ہو رہی تھی۔ دماغ پھٹا جا رہا تھا' جسم جیسے کوئی دھنک رہا ہو۔

ورما نے بیٹھے بیٹھے جھرجھری سی لی' چھت کی طرف دیکھا اور ایک لحاتی توقف کے بعد اضطراری لہجے میں بولا "ہاں استاد!" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن جانے کیوں رک گیا۔

جھمل خاموش رہا۔

"کچھ انیس بیس ہو تو بولو!" ورما کی ڈنک ماری آواز گونجی۔

"پورا سو ہے صاحب! آپ گیانی دھیانی ہو۔"

"کارن پر زور تھا نا تمہارا' اور کو تو جانے دو' ہم نے بولا تھا' سب سے بڑا کارن تم ہو' ادھر تمہاری حویلی بڑا کارن ہے۔ حویلی میں تمہاری جان اٹکی ہے۔ پتا نہیں' کیا ہے وہاں' کچھ ہیرے (دل) کا سمبندھ ہو گا۔ تم آج فیض آباد میں ہو' کل تم کو یہاں سے چلے جانا ہے۔ اڈے کے آدمیوں کے کس بل کا تم کو اچھی طرح معلوم ہے۔ سمے پڑنے پہ وہ کتنی دیر ٹھہر سکتے ہیں۔ ایک طرف تو چاقو' چھرا' لاٹھی' بلم دوسری طرف بندوق' طمنچا' پوری ایک سینا' سرکار دربار میں جان پہچان بلکہ خود سرکار دربار۔ تم نے اپنی جگہ ٹھیک سوچا۔ ٹھاکر ہردیو اور استاد گورا کو کھلا چھوڑ دیا جاتا تو لکشمی داس کے گھر کی طرح اور گھروں سے بھی لڑکیاں بالیاں اٹھتیں۔ وہ حویلی کی طرف بھی جا سکتے تھے۔ سمجھ میں یہ آتا ہے' پہلے تو ادھر ہی جانے کو پھڑپھڑاتے۔ استاد بابر نے سامنے آ کے ان کو اپنی حویلی کا رستہ دکھا دیا تھا' پر استاد! ان کو کوئی اور روک بھی ہو سکتا تھا۔ اتنا آگے' اتنا زیادہ ہی کیوں؟"

"لگتا ہے' گانٹھ کس گئی ہے۔" جھمل نے رکھائی سے کہا "کچھ اور ہو تو بولو صاحب!"

"اب تمہاری باری ہے' سب تم کو بولنا ہے۔"

"اپنے پاس کچھ نہیں۔"

"اتنا کچھ سن کے اب تم کو اپنے ساتھیوں کا بول دینا

چاہیے" ورما سنی ان سنی کرتا ہوا بولا۔
"ہم سے کیوں پوچھتے ہو؟"
"پھر کس سے 'مرنے والوں کی آتماؤں سے پوچھیں؟"
"آپ کے لیے کیا دور ہے 'پل بھر میں دودھ پانی الگ کر دیتے ہو' اپنی اتنی ٹوہ کی ہے 'ان کے لیے بھی تھوڑا زور لگاؤ۔"

"وہ تو ہم پہنچ ہی جائیں گے ان تک بھی۔ آج نہیں تو کل" ورما کی آواز تکبر آمیز تھی۔
"دیکھو صاحب! اپنے کو زیادہ گھوما پھیری نہیں آتی۔" بجھل نے سپاٹ لہجے میں کہا "جو پہلے بول دیا ہے 'پورا قول کے بولا ہے۔ اسی کو آخری جانو۔ اپنا کوئی ساتھی نہیں تھا اور ہوگا تو آپ سمجھتے ہو 'ہم بول دیں گے؟"
"تم کو بولنا ہے 'تم کو بولنا پڑے گا استاد!" ورما نے حکمیہ انداز میں کہا پھر اسے کچھ خیال آیا اور اس کی غراتی آواز ماند پڑ گئی' کہنے لگا "اچھا ٹھیک ہے 'ہم یہاں سے اٹھ جاتے ہیں 'تم کو ہماری زبان نہیں آتی۔ اب ہمارے افسر تم کو دیکھیں گے پھر یہ جانیں اور تم جانو۔ ہم نے تم کو جتا دیا ہے 'یہ دیسی لوگ ہیں۔"
"ہم بھی پردیسی نہیں 'یہ کیا کرلیں گے صاحب!"
بجھل کی بے باکی گستاخی پر محمول کی جانی چاہیے تھی۔ یہی ہوا' وہ سارے تلملاتی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
"ابھی پتا چل جائے گا" ورما گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ آدمی کی شکل بگاڑ دیتے ہیں 'اس کو آدھا کر دیتے ہیں۔"
"آدھے پر رہتے ہیں نا!"
"پھر چ اگلتے ہی بن پڑتا ہے۔"
"دیکھتے ہیں صاحب! ان کو بھی۔"
"ہاں 'تمہارا تجربہ بھی کم نہیں ہوگا۔"
"اپنے کو تو ہر بار نیا لگتا ہے۔"
"اس بار بہت نیا ہوگا اور شاید آخری بھی 'یہ تمہیں اس قابل نہیں چھوڑیں گے کہ تم دوبارہ کوئی من مانی یا ہٹ دھرمی کرسکو۔"
بجھل سرہلانے لگا اور کسی قدر سنبھلی ہوئی آواز میں بولا "ایک بات پوچھیں صاحب! آپ ہمی پر کیوں جم گئے ہو؟"
ورما نے شانے اچکائے اور کسمسا کے بولا "کارن بنا نہیں تھے 'اور کارن تم کو ایک ایک کرکے گنا دیے ہیں۔"
"اگر اس کے الٹ ہو تب صاحب!"

کوئی جواب دینے کے بجائے ورما شعلہ بار نظروں سے بجھل کو گھورا کیا۔
"تب ہم کو آپ کے اور ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟" بجھل نے کٹیلی آواز میں پوچھا۔
"تم... تم کیا کرسکتے ہو؟" ورما چیخا کے بولا۔
"ہم تو بس پوچھتے ہیں مائی باپ! پھر اپنے کو کیا کرنا چاہیے؟ ہم جنگل میں نہیں بستے۔"
"جنگلی 'جنگل ہی میں نہیں بستے۔"
"اپنی بات کا جواب دو صاحب!"
"پھر تم اپنا رستہ لینا 'ہم اپنا" ورما جھلا کے بولا۔
"اور اپنے ساتھ مستی کرنے کا بھگتان کون دے گا؟"
"اس کے لیے تم کچہری جا کے زنجیر کھینچنا 'کچہریاں ہر طرف کھلی پڑی ہیں۔"
بند دروازے پر دستک سے سبھی چونک پڑے۔ دوسرے ہی لمحے وہ نوجوان پولیس افسر دروازے پر نمودار ہوا جس نے ہمیں اس کمرے تک پہنچایا تھا۔ ورما کی اجازت سے وہ لپکتا ہوا اندر آیا اور اس نے مستعدی سے ایک کاغذ ورما کے سامنے رکھ دیا۔ نوجوان افسر فوراً واپس ہوگیا۔ ورما نے غور سے کاغذ دیکھا' اس کے نتھنے پھول گئے' بھویں سکڑ گئیں۔ بے دلی سے اس نے دائیں طرف بیٹھے ہوئے افسر کی طرف کاغذ بڑھا دیا۔ ان چاروں نے باری باری اسے دیکھا اور ان کے چہروں پر شکنیں کھنچ گئیں۔ چند ثانیے ورما اپنے آپ میں گم رہا پھر بھاری آواز میں بولا "تم کو بول دیں استاد! ہم کو حویلی کا رستہ بھی معلوم ہے۔ چھان بین کے لیے ہم کو کوئی گھر بند نہیں۔"
"جاؤ صاحب! ادھری بھی جاؤ۔ آپ وردی والے ہو' منہ اٹھائے کسی بھی گھر میں گھس سکتے ہو۔ اپنے کو آپ کے لیے ہاتھ کاٹا ہے۔ ہر جگہ سات کی معافی بولتے ہیں' آپ کے لیے کوئی گنتی نہیں' آپ ساری حویلی اٹھا کے ادھری لے آؤ۔"
"تم نہیں مانتے تو ایسا ہی ہوگا' بولتے ہیں' وہ موم کی بنی ہیں' موم کی یا ریشم کی' جو بولو۔ بہت سنبھال کے رکھا ہے تم نے ان مورتوں کو۔ ادھر تمہارے سامنے آئیں گی تو سارا موم' سارا ریشم..." ورما نے خود کو روکا اور مچلتے ہوئے بولا "جس حویلی کے لیے تم اتنی دور کا سوچ سکتے ہو استاد! وہاں کے لوگوں کے حوالات میں آنے پر' دیکھتے ہیں' تم کتنی دیر ٹھہرتے ہو۔"
"اپنی مانو صاحب! تھوڑا آرام کرکے متھے پہ زور ڈالنا'

رت جگائی سے الٹا ہو جاتا ہے کبھی۔" بجھل نے تاکیدی لہجے میں کہا۔
بڑی عمر سے مراد تحمل اور برداشت نہیں ہے۔ دائیں طرف کے معمر افسر نے برہم انداز میں ورما سے درخواست کی "دیر نہ کیجیے سر! ان کو ان کی اصل جگہ بھیج دیجیے۔ ہم دیکھتے ہیں ان کو' یہ لاتوں کے بھوت ہیں' ایسے حرام ذلیوں سے نمٹنا ہم کو آتا ہے۔"
اس سے پہلے کہ ورما کوئی رائے ظاہر کرتا' بجھل نے اونچی آواز میں کہا "ان کی بات مان لو صاحب! کسی کو کھجلی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بھی پولیس کے افسر ہیں۔ ادھری منہ دکھائی کو نہیں بیٹھے۔ ان کو بھی کچھ حلال کرنے دو۔"
"زبان سنبھال کے استاد!" ورما بگڑ کے بولا "اپنی حد سے مت بڑھو۔"
"حد ساری آپ کے لیے ہے۔ آپ بھی تھوڑا اندر رہو' آپ کی چاکری نہیں کرتے۔"
بجھل کا لہجہ واضح طور پر مختلف تھا۔ مجھ سے زیادہ اس پر پولیس کو حیرت ہونی چاہیے تھی۔ برافروختگی ان کے چہرں سے عیاں تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ تبدیلی بے وجہ نہیں ہوگی لیکن وجہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہی ہو سکتا تھا کہ بجھل کو ان سے کسی رعایت کی توقع نہ رہی ہو۔ ورما نے بے چینی سے اپنے آمادہ غضب افسر کو دیکھا۔ اسے کچھ پس و پیش تھا لیکن معمر افسر کو اب مزید اپنے عالی مرتبت افسر کی خاطر منظور نہ تھی' اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی گھنٹی پر زور زور سے ہاتھ مارا۔ سنتری جیسے ہی اندر داخل ہوا' معمر افسر نے کھنا نامی کسی شخص کو جلد از جلد حاضر ہونے کا حکم دیا۔
کھنا راہداری میں دروازے کے قریب ہی منڈلا رہا ہوگا' فوراً اندر آگیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے کوئی اہم کاغذ لے کے آیا تھا "دونوں کو ڈارک روم لے جاؤ۔" معمر افسر نے ترختی آواز میں کہا "اور اپنے رستم کو بولو' وہ بھی تیار ہو جائے۔"
"وہ تیار ہے جناب!" نوجوان افسر نے مودبانہ جواب دیا۔
"یہاں کیوں نہیں؟" ورما کچھ الجھتے ہوئے بولا۔
"ڈارک روم میں پورا انتظام ہے سر!" معمر افسر کی بوڑھی آواز جوش میں ہکلائی "ابھی دیکھیے گا' ہوش ٹھکانے آجائیں گے ان چینے خانوں کے۔"
"کیا' کیا نام لیا تھا اس کا؟" ورما نے تذبذب سے کہا

"ہاں' وہ رستم' سہراب' اس کو یہاں کیوں نہیں بلایا جاسکتا؟" ورما کو اپنی جگہ سے اٹھنے میں جانے کیوں تامل تھا۔
"یہاں بھی بلا سکتے ہیں سر لیکن..."
ورما نے ہاتھ اٹھا کے افسرانہ تمکنت سے کہا "اسے یہیں آنے کا کہو۔"
معمر افسر نے بادل ناخواستہ کھنا کو اشارہ کیا۔ کھنا نے فدویانہ انداز میں سر جھکایا اور کسی تاخیر کے بغیر دروازے کی طرف لوٹ گیا۔
"ہم ایسا نہیں چاہتے تھے استاد!" کھنا کے جانے کے بعد کمرے پر چھائی ہوئی خاموشی ورما کی آواز سے ٹوٹی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا "وہ کمرا ہم نے دیکھا نہیں لیکن بڑی باتیں سنی ہیں۔ وہاں آدمی کا دم گھٹنے لگتا ہے۔"
"ادھری آپ کون سا سانس لینے دے رہے ہو۔" بجھل نے بیزاری سے کہا۔
"ہم نے تم کو پورا موقع دیا۔"
"کاہے کا صاحب! اس کا کہ جو آپ بولو' اس کو مان لیں؟ وہ رستہ تو سیدھا سولی کی طرف جاتا ہے۔"
"دھیرج رکھو' تم کو بولا ہے' ہمارا کام آسان کرنے پر تم کو چھوٹ مل جائے گی۔ ہمارا کام آسان کرنے کا مطلب سمجھتے ہو؟"
"چھوٹ تو اپنے کو پوری ملے گی' آپ کے پیچھے سے نکلتے ہی مل جائے گی اور آپ کا پیچھا بھی کتنی دیر کا ہے۔ زیادہ ٹائم کو نہیں روک سکتے اپنے کو آپ۔"
"تم ایسا ہی سوچو' ہم جانتے ہیں' تم کو کب تک روک سکتے ہیں۔"
نوجوان افسر ٹھیک کہتا تھا۔ یکایک تازہ وردیوں میں ملبوس پانچ تومند سپاہی جوتے بجاتے اندر داخل ہوئے۔ ہم سے قریب آکے انھوں نے اپنے افسروں کو تمام تر سرکاری ادب سے سلام کیا۔ نوجوان افسر کھنا بھی ان کے ساتھ تھا۔ ابھی وہ اس رسم سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک چوتھا سپاہی ہاتھ میں کینوس کا لمبا بیگ لیے اندر آیا۔ وہ آخری درجے کا سپاہی ہوگا کہ ایک گوشے میں بیگ رکھ کے چپکے سے واپس چلا گیا "ان کو دیکھتے ہو؟" معمر افسر نے حاکمانہ لہجے میں کہا "یہ جو دو سورما تمہارے پاس کھڑے ہیں۔ ذرا دیکھو' راون کے ان کتوں میں کس نے ماں کا کتنا دودھ پیا ہے۔"
"بھاری بھرکم تھے' اوسط قد' تانبے جیسی چمکتی رنگت' گول چہرے کے ایک ادھیڑ سپاہی نے بیگ سے ہنٹر نکالا۔ اس کی بڑی مونچھیں چہرے پر چھائی ہوئی تھیں' بالوں پر جیسے

گیا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں بھسل پر بھٹکنے لگیں پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف نگاہ کیے بغیر ہاتھ اٹھا کے ہمیں گھیرے ہوئے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ ایک کے تذبذب و تامل کے بعد سپاہیوں نے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہمارے بازو آزاد کر دیے "تم، تم جا سکتے ہو۔" ورما نے بوجھل آواز میں کہا "لیکن.... لیکن...."

بھسل نے اسے روک دیا "کچھ اور نہیں صاحب!" اس نے تنبیہی انداز میں کہا "ہم پہلے آپ کو سارا بول چکے ہیں۔"

ورما نے آنکھیں میچ لیں اور ایک گہری سانس بھر کے کرسی کی پشت سے کمر ٹکا دی۔

سپاہی ہم سے دور ہو گئے۔

مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرا جسم ہی معطل ہو گیا تھا جیسے میں خواب کی حالت میں ہوں اور میں نے جو دیکھا، سنا ہے، وہ کوئی فریب نظر، فریب خیال ہے۔ سپاہی ہٹ جانے کے بعد بھی میں اپنی جگہ گنگ کھڑا رہا۔ بھسل نے بھی دروازے کی جانب لوٹنے میں عجلت نہیں کی۔ وہ اپنی جگہ موجود رہا، پھر آہستہ آہستہ میں نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔ میری رگوں میں خون سن سنا رہا تھا "چل رے۔" اس نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ میرا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما تو میں ہڑبڑا سا گیا اور چند قدموں سے اس کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتا رہا۔

باہر جاتے جاتے بھسل ٹھہر گیا "ایک بات صاحب!" اس نے مودبانہ لہجے میں کہا "اپنی بجتی ہے، آج نہیں تو کل، جب بھی آپ کو ٹائم ملے، وہ جو آپ بولتے ہو، اپنے راج محل میں آؤ۔ آپ نے ادھری رہنے والوں کو جانے کیا کیا بولا ہے۔ وہ ایسے کسی کے سامنے نہیں آتے، پر آپ کی دوسری بات ہے۔ ایک بار ان کو اپنی آنکھ سے دیکھ لینا۔ گھر تو آپ کا بھی کوئی ہوگا۔"

یہ کہتے ہی بھسل دروازے سے نکل آیا۔

○☆○

دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کوتوالی سے چند قدم کے فاصلے پر کئی تانگے خالی کھڑے تھے۔ کچھ کہے بغیر بھسل پہلے تانگے پر سوار ہو گیا۔ دن اس قدر چڑھنے کے باوجود سڑک پر ایسی چہل پہل نہیں تھی۔ جا بجا پولیس موجود تھی۔ ہم نے آدھ میل کے قریب راستہ طے کیا ہوگا کہ بھسل نے ایک پکے اور صاف ستھرے ہوٹل کے پاس تانگا رکوا دیا۔ اس کے اتر جانے پر مجھے بھی اترنا پڑا۔ وہ ہوٹل کے باہر کھلی جگہ میں رکھی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس طرف سایہ تھا اور سکون بھی۔ ہم منہ اندھیرے گھر سے نکلے تھے۔ بھسل کو صبح چائے پینے کی عادت تھی۔ اسے طلب ہو رہی ہوگی، مجھے تو بھوک اور پیاس کا احساس ہی نہ رہا تھا۔ میں گھر پہنچ کے اپنے کمرے میں بند ہو جانا چاہتا تھا۔ گھر دور تھا اور اتنی دور بھی نہیں تھا کہ سیدھے گھر کا رخ کر لیتے تو وقت صرف ہو جاتا۔ میں نے نہیں سنا کہ بھسل نے چائے والے سے کیا کہا ہے۔ گلاس بھر پانی ایک ہی سانس میں پی کے اس نے بیڑی سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا۔ اسے تھکن ہونی چاہیے تھی۔ میرا جسم تو کوئی بوجھ بنا ہوا تھا۔ ایک جگہ کھڑے رہنے کے سوا ہم نے کوئی مشقت نہیں کی تھی لیکن تھکن کا تعلق تو گزرے ہوئے وقت کے رویے سے ہے۔ کبھی ایک لمحہ ہی پہاڑ ہو جاتا ہے، آدمی کو ویران کر دیتا ہے۔ زندگی تو ویسے بھی لمحوں میں بٹی ہوتی ہے، تند و گرم، بے جان، بے بس، نرم و لطیف لمحوں پر مشتمل، دبلے پتلے کم عمر لڑکے نے ہمارے سامنے ملائی سے ڈھکی ہوئی چائے اور گرم گرم کچوریاں رکھ دیں۔ میرا جی لوٹ رہا تھا۔ بھسل کے خیال سے کچوری کا ایک ٹکڑا منہ میں لیا تھا کہ گلے میں پھنسنے لگا۔ ملائی کی تہ ہٹا کے میں نے چائے کے چند گھونٹ کسی طرح انڈیل لیے

"کیا ہے رے؟" بھسل نے ناگواری سے مجھے ٹوکا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "بس چائے ٹھیک ہے، اب گھر چلو۔"

"چلتے ہیں رے۔" وہ منہ بنا کے بولا "تھوڑا دم لے۔"

اس نے بھی دو ایک کچوریوں پر قناعت کی اور چائے کی چسکیوں سے خود کو سیراب کیا۔ کاش آدمی کو جانوروں کی طرح جسم کی آبیاری کے لیے خورد و نوش کی حاجت نہ ہوا کرتی یا پھر وہ جانوروں سے مختلف نہ ہوتا۔ ہم نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ دور سے شور بلند ہوا۔ استاد سلامی کے ساتھ اڈے کے کئی آدمی لپکے بھاگتے ہماری جانب امڈ رہے تھے۔ انہوں نے دور سے ہمیں دیکھ لیا تھا اور دیوانے سے ہو گئے تھے۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی پریشان ہو گئے۔ ہمارے پاس پہنچ کے اڈے کے آدمیوں کا شور اور بڑھ گیا۔ وہ سارے بھسل اور مجھ سے گلے ملنے کے لیے ہمک رہے تھے۔ تقریباً سب کی حالت ایک جیسی تھی، بال بکھرے ہوئے، کپڑے شکستہ، آنکھیں بھاری بھاری، چہروں پر دھول جمی ہوئی۔ بھسل اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ اس نے انہیں شور مچانے سے منع کیا اور سکون سے بیٹھ جانے کی ہدایت کی۔

سب نے ادھر ادھر سے بینچیں کھینچ کے ہمارے قریب کر لیں۔ کچھ اندر سے کرسیاں اٹھا لائے، کرسیاں، اسٹول، مونڈھے، جس کے جو ہاتھ لگا۔ سارے ہوٹل میں افراتفری ہو گئی۔

"اپنے کو ابھی پتہ چلا، وہ حرام کے جنے تم کو بھی سویرے سویرے کوتوالی لے آئے تھے۔" استاد سلامی حواس باختگی سے بولا۔

"پہلے ذرا سانس باندھ لے۔" بھسل نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

"کیا استاد کیا بولوں، سالوں نے رات حویلی سے نکلتے ہی چھمن میاں کی ارتھی تک گئے تھے کہ دھر لیا، رات بھر حرامی پلوں نے پل بھر کو کمر ٹکانے نہیں دی۔" استاد سلامی کراہتے ہوئے بولا۔ بھسل کی ہمدردی سے وہ اور بکھر گیا اور ہذیانی انداز میں کہنے لگا کہ اڈے کے تقریباً سبھی آدمیوں نے رات بڑی آزمائش میں گزاری ہے، پولیس نے ایک ایک کو الگ کمرے میں لے جا کے جیسے کسی پرانی دشمنی کا حساب چکتا کیا ہے۔ گھونسے، طمانچے، ٹھوکریں، ڈنڈے، ہنٹر اور پھینیاں۔ کسی کو الٹا لٹکایا، کسی کو برہنہ کر کے ہنٹر اور چھڑیوں سے نیل ڈال دیے۔ سب سے زیادہ بد سلوکی استاد سلامی سے کی گئی۔ کچھ اڈے کے نگراں کی وجہ سے، کچھ اپنی تلخ کلامی کی وجہ سے وہ عتاب کی زد پر رہا۔ اس کے بقول اس سے برداشت نہیں ہوا۔ پولیس کی زیادتی پر وہ منہ پر آئیں مغلظات نہ روک سکا۔ نتیجے میں افسروں کا پارا اور چڑھ گیا۔ سلامی کا منہ سوجا ہوا تھا اور گالوں پر کھروچے نمایاں تھے۔ وہ کہہ رہا تھا، شاید انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا، وہ اور اکڑ جاتے تھے۔ اڈے کے کسی آدمی نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ پولیس نے کھانے کو پوچھا نہ چائے پانی کو۔ صبح چھوٹے سے کپ میں چند گھونٹ کڑوی چائے دی گئی تھی۔ بھسل سنتا رہا۔ سلامی کے ساتھ سبھی اپنی شب بیتی سنانے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک ساتھ کئی بول اٹھتے تھے۔ بھسل نے جھڑک کر انہیں خاموش کیا۔

"اور تم، تمہارے ساتھ کیا بیتی استاد!" سلامی نے تھکتے ہوئے پوچھا "ان کتوں نے تم کو تو کچھ، کچھ...." اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی۔

بھسل نے جواب میں آنکھیں میچ لیں۔

"ہاں۔" سلامی کا منہ کھل گیا۔ بھسل کی خاموشی سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا "تم، تم سے بھی استاد.... انہیں...." وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا "قسم سے دیکھ لوں گا ان کو، وقت اپنا بھی آئے گا۔ وہ حرامی بچھڑا! آج تو اس توتے کی آنکھیں ہی پھری ہوئی تھیں۔ سالا کاغذی شیر، افسروں کے آگے تیس مار خاں بنا ہوا تھا۔" سلامی یقیناً لمبی مونچھ والے رستم نامی اس سپاہی کے بارے میں بتا رہا تھا جو افسروں کی طلبی پر بھسل اور مجھے ہنٹر مارنے آیا تھا۔ سلامی نے بتایا کہ گزشتہ کل، شام ہوتے ہی پولیس کی بہت بڑی نفری نے اڈا گھیرے میں لے لیا تھا۔ استاد سلامی اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ بھسل سے ملنے حویلی گیا ہوا تھا۔ سلامی اڈے پر کسی کو بتا کے نہیں آیا تھا کہ وہ حویلی کی طرف جا رہا ہے ورنہ پولیس اس کے تعاقب میں حویلی آ دھمکتی۔ جو لوگ چھاپے کے وقت اڈے پر موجود نہیں تھے، انہیں گلی کوچوں اور ان کے گھروں سے پکڑا گیا۔ ٹولیوں میں انہیں کوتوالی کے مختلف کمروں میں بند کر دیا گیا۔ ساری رات ان سے بازپرس ہوتی رہی۔ ہر ایک نے ایک ہی بات دہرائی کہ ٹھاکر بستی میں ہونے والے واقعے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پولیس پر وحشت طاری تھی۔ کسی کے پاس، دوسرے سے زیادہ کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں جو پولیس کی مشکل آسان کرتا۔ وہ کہہ رہے تھے، بھسل اور میرے بارے میں پولیس افسروں نے کرید کرید کے طرح طرح کے سوال کیے۔ سب کا ایک ہی جواب تھا۔

بھسل نے ہاتھ بلند کر کے حیران و پریشان ہوٹل والے کو طلب کیا۔ رام پوری مخملی ٹوپی، چکن کے سفید کرتے اور پاجامے میں ملبوس چھریرے جسم کا ہوٹل والا اڈے کے آدمیوں سے خوب واقف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں قریب آ کے بھسل کو سلام کیا اور گھٹنے چھوئے۔ بھسل اسے سب کے لیے ناشتے کی تیاری کا حکم دینا چاہتا تھا کہ ہوٹل والے نے سر جھکا کے اور سینے پر ہاتھ رکھ کے شائستگی سے کہا کہ وہ پہلے ہی اپنے کارندوں کو ہدایت دے چکا ہے۔ ناشتا تیار ہو رہا ہے۔ اس نے کہا "اسے معلوم ہے، اور اسے کیا، سارا شہر جانتا ہے کہ اڈے کا ہر آدمی کل رات، پولیس گھیر کے لے گئی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سب صحیح سلامت واپس آ گئے۔ پوچھنے لگا، ناشتے کو جانے دیجیے، کوئی اور خدمت ہو تو اسے بتائی جائے۔ کوئی اور خدمت کیا ہوتی جو اسے بتائی جاتی۔ بھسل کے اشارے پر سب نے وہیں میزوں پر رکھے جگوں سے منہ پر چھپکے مارے اور آستینوں، دامنوں سے چہرہ خشک کیا۔

"تم نے چچوا کو دیکھا استاد؟ اتنی دھنائی کی سور کے جنوں نے کہ نکسیر چل پڑی۔" سلامی کو رہ رہ کے گزری ہوئی

رات ستا رہی تھی' کہنے لگا "سالا خون رکتا ہی نہیں تھا۔ ادھر اپنے بچھن کو ٹھوکریں مار مار کے دیوار میں گھسیڑ دیا۔ آگے طاق کی اینٹ نکلی ہوئی تھی' جا کے متھا ٹکرایا' وہ تو کہو' آنکھ رہ گئی۔ کپڑے دیکھتے ہو استاد اس کے۔" سلامی نے بے تابانہ ادھر ادھر دیکھ کے بچھن کو آواز دی۔ بچھن دور بیٹھا تھا۔ اڈے کے آدمیوں نے اسے اٹھا کے آگے کی جانب دھکیل دیا۔ بچھن کی پیشانی پر میلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جا بجا خون کے دھبوں نے کپڑے رنگ دیے تھے۔ بٹھل نے بچھن کو پاس بٹھا لیا۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی استاد۔" سلامی کا شکایتی لہجہ غصے سے لبریز تھا' کسی کی بھی گردن پکڑ کے اندر کر دو' آدمی دیکھو نہ آدمی کی ذات' چھوٹا دیکھو نہ بڑا' دے دھواں دھوں..... کوتوالی نہیں' قصائی خانہ ہے۔ سالے کوئی بات ہی پوری نہیں سنتے تھے۔ سب نے چڑھائی ہو جیسے۔ ایسا جنگلی پنا' حرامی پنا ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ کیا ہے استاد؟"

بٹھل سر جھکائے بیٹھا رہا۔

اتنی دیر میں ہوٹل کا مالک اور اس کے آدمی میزوں پر ناشتا لگانے لگے اور یوں وہ سارے بھوکے پیاسے رکابیوں اور پیالیوں پر ٹوٹ پڑے۔ بٹھل نے ان کے لیے خوشبودار پان منگوائے اور تمباکو نوشی کرنے والوں کو سگریٹ' بیڑی سے آسودہ کیا۔ ہوٹل والا ناشتے کے پیسے لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ بٹھل نے اس کی جیب میں روپے ٹھونس دیے۔ وہ روپے واپس بٹھل کی جیب میں ڈال دینا چاہتا تھا کہ بٹھل کی ناراضگی بھانپ لی اور اس کا جسم چرمرا کے رہ گیا۔

ہوٹل سے کچھ دور تک سب پیدل چلتے رہے۔ بازار میں ہم تماشا بن گئے تھے۔ راہ گیر ٹھہر ٹھہر کے ہمارا گزرتا قافلہ دیکھتے اور کانا پھوسی کرنے لگتے۔ بعض راہ گیروں نے بڑھ کے اپنے شناسا اڈے کے آدمیوں کو مبارک باد بھی دی۔ آمنے سامنے' دائیں بائیں ہر طرف لوگ جمع ہونے لگے۔ کھڑکیوں اور چھتوں پر عورتوں اور بچوں کے چہرے نظر آنے لگے تھے اور اطراف میں دبا دبا شور گونجنے لگا تھا۔ بٹھل اور میں سامنے پڑنے والے پہلے تانگے میں بیٹھ گئے۔ وہ سارے ہمارے پیچھے آنا چاہتے تھے لیکن بٹھل نے استاد سلامی کو اڈے جا کے حلیے درست کرنے کی تلقین کی اور کہا کہ پولیس دوبارہ آئے تو اڈے کا کوئی آدمی اپنے تکدر کا اظہار نہ کرے اور نہ شہر میں گزشتہ رات کوتوالی کی روداد کا چرچا کرے۔ بہتر ہے' وہ سب اڈے پر جمے رہیں اور آرام کریں اور شہر میں غیر ضروری گشت سردست ملتوی کر دیں۔ کسی مشورے کے لیے

سلامی کسی وقت بھی بٹھل کے پاس حویلی آسکتا ہے ورنہ آج شام یا کل صبح' جیسا مناسب ہو' بٹھل خود اڈے آئے گا۔

کچھ دور وہ ہمارے ساتھ تانگے کے پیچھے چلتے نظر آئے پھر ایک موڑ پر اوجھل ہو گئے۔ پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد حویلی آگئی۔ تمام راستے اور خصوصاً حویلی کے اردگرد پولیس تعینات تھی۔ مما اور اس کا بھتیجا گلو چبوترے پر پہرا دے رہے تھے۔ مما کے کندھے پر دو نالی بندوق لٹکی ہوئی تھی۔ ہمارا تانگا دیکھتے ہی دونوں میں تلاطم سا اٹھا۔ ان کے چہروں پر کوندتی تابانی دیدنی تھی۔ مما' بٹھل کا بہت لحاظ کرتا تھا' تیزی سے چبوترے کی سیڑھیاں اتر کے وہ بٹھل سے لپٹ گیا۔

دھوپ اپنی انتہا پر تھی لیکن تپش برائے نام تھی۔ ارشد' تنویر اور جہانگیر یقیناً ڈیوڑھی ہی میں موجود تھے کہ ہماری آوازیں سن کے تقریباً بھاگتے ہوئے باہر نمودار ہوئے اور جیسے ہم کوئی عجوبہ ہوں' پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری شکلیں دیکھنے لگے۔ لمحے بھر سکتے جیسے ایک عالم کے بعد انھوں نے خود کو سنبھال لیا۔ ان کے دیدوں میں روشنیاں سی جھلملانے لگیں۔

صاف نظر آ رہا تھا' ان کے سینوں میں بہت سے سوال دھڑک رہے ہیں لیکن کسی استفسار میں پاس ادب حائل ہے۔ باہمی مفاہمت کے لیے یہی ایک طور کارگر ہے اور وہی بات۔ وہ سوال ہی کیوں کیے جائیں جن میں مسئول کی گراں باری کا شائبہ ہو۔ سوالوں کا تو یہ ہے' آدمی کبھی خود کو بھی ٹھیک سے جواب نہیں دے پاتا تو دوسرے کو کیا مطمئن کر سکتا ہے۔ سوال آسان' جواب مشکل ہوتے ہیں۔ بہت سے سوال صرف سوال ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ بہت سے سوال خوابوں کے مانند ہوتے ہیں اور شرمندہ جواب نہیں ہو پاتے۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مضطرب ارشد' تنویر اور جہانگیر کو اپنی جلو میں لیے ہوئے ہم اندر چلے آئے۔

زریں' خانم' نیساں اور زہرہ خاص دروازے کے پہلو میں واقع بیٹھک میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہاں ان کی موجودگی کی ایک یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ حویلی سے باہر کی دنیا سے قریب رہیں۔ ہماری آہٹوں پر ان کے کان لگے رہیں۔ مطلب کی آمد رات کو متوقع ہو' طلب گار صبح سے انتظار کی اذیت سے کیوں دوچار ہوتے ہیں؟ اور ہماری واپسی کا کوئی وقت ہی طے نہیں تھا اور یہ فاصلوں کا گمان بھی خوب ہے۔ فاصلوں کی کمی و بیشی سے کسی کی طلب یا کسی کی یاد کی شدت

کہاں متاثر ہوتی ہے؟ کوئی دیوار کے پار ہو یا سمندروں کی دوری پر' دوری تو ایک ہی ہے۔ دسترس کی دوری سب سے بڑی دوری ہے۔ ارشد' تنویر اور جہانگیر کی ڈیوڑھی میں اور خانم' زریں' نیساں اور زہرہ کی بیٹھک میں نشست میں ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی تھی۔ صبح حویلی میں پولیس کی آمد اور ہمیں ساتھ لے جانے کے معاملے کو مما نے کتنا ہی دبا چبا کے بیان کیا ہو' یہ تو سننے والے پر موقوف ہے' اسے لفظوں کی غلطیں درست کرنے اور گرہیں نکالنے کی کتنی مہارت ہے۔ ان سب کی ہوش مندی میں کیا کلام تھا۔ حویلی میں آنے جانے والے ملازمین سے انھیں کل شام ہی معلوم ہو جانا چاہیے کہ حویلی کو چاروں طرف سے پولیس نے گھیرے میں لے لیا ہے اور شہر میں جگہ جگہ اس کے دستے ڈیرا جمائے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ بھی ذہن نشین کر دی گئی ہوگی کہ شہر سے کچھ دور ٹھاکر بستی میں کیسا خوں ریز واقعہ ہو چکا ہے۔ ارشد اور تنویر حویلی میں قید نہیں رہتے تھے۔ باہر جانے کتنے لوگوں سے ان کے مراسم رسمی نوعیت سے تجاوز کر گئے ہوں گے۔ آدمی کتنا ہی خلوت نشیں' محتاط اور مردم بیزار ہو' نئی جگہوں پر دوسرا دن اس کے لیے ایسا اجنبی نہیں رہتا۔ ارشد اور تنویر کو تو فیض آباد میں بسے ہوئے وقت گزر چکا تھا۔ بیٹھک میں موجود زریں' خانم' نیساں اور زہرہ کے لالہ رنگ رخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ بٹھل نے جاتے ہی دسترخوان آرائی کی فرمائش کی۔ دو بج چکے تھے۔ کھانا کھانے کا جواز بھی تھا' بٹھل کو توضیح و توجیہ کی عادت نہیں تھی لیکن ان کے کسی سوال سے پہلے اس نے از خود واضح کیا کہ پولیس کسی غلط فہمی میں انھیں کوتوالی لے گئی تھی۔ پولیس کو جب یقین ہو گیا کہ ہم لوگ تو کئی دن سے فیض آباد سے باہر نہیں نکلے' معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ نیساں اور زہرہ کو اس کے سامنے لب کشائی کی توفیق نہیں تھی۔ زریں اور خانم نے خاموشی شعار کی۔ نیاز مندی کا یہی شیوہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے' ہوں کا توں تسلیم کر لیا جائے اور اپنے مربی و محسن کو جواب دہی کا آزار نہ دیا جائے۔ ان کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں لیکن آنسو انھوں نے آنکھوں ہی میں جذب کر لیے اور وہاں سے منتشر ہو گئیں۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا' ایک پہر نہیں' جیسے صبح حویلی سے جانے اور دوپہر واپس آنے میں کئی دن' کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ میں نے کمرا بند کر لیا۔ میں کچھ دیر اپنے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ مجھے بھی تو بہت سے جواب مطلوب تھے۔ وہ تو بٹھل کی زبان سے ایک کلمۂ خیر سن کے

چلی گئی تھیں لیکن میں نیاز مندی کے اس درجے پر فائز نہیں تھا جہاں تسلیم و رضا کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ ان کے لیے ایک پہر بعد ہماری واپسی ہی مژدہ جاں فزا تھی۔ انھیں کیا معلوم تھا' یہ ایک پہر ہم نے کیسا گن گن کے' کیسا کانٹوں پر بتایا ہے۔

مجھے کسی طور قرار نہیں تھا۔ میں نے بستر پر جسم پھیلا کے' آنکھیں موند کے گہری گہری سانسیں بھرنے کی مشق کی۔ کہتے ہیں' جسم و جاں پر چھائی دھند سے نجات کے لیے آسودہ کاروں کا یہ ہنر خاصا مجرب ہے مگر درون خانہ ہی زہر پھیلا ہوا ہو۔ بٹھل اور میں اپنے بے دریدہ چہرے اور بے شکستہ لباس کے ساتھ واپس آگئے تھے۔ پولیس ہمیں کوتوالی میں روک سکتی تھی۔ بہرحال اب ہم بہ ہمہ وجود اپنے گھر میں تھے' اپنے در و بام' اپنے لوگوں کے درمیان۔ ہماری خلوت گاہیں ہمارے ارادے سے قریب تھیں۔ ہمیں اپنا اختیار واپس مل چکا تھا لیکن یہ تو بٹھل ہی جانتا تھا کہ اس اختیار کی نوعیت کس قدر عارضی یا دائمی ہے۔ اس نے پولیس کو قائل کر دیا تھا کہ ٹھاکر بستی میں ٹھاکروں اور ان کے حواریوں کو نیست و نابود کرنے والے اس کے اشاروں کے تابع نہیں تھے' دوسرے لفظوں میں وہ کوئی اور مہم جو' غیرت مند' حمیت پسند ٹھاکروں کے زخم زدہ' ستم دیدہ یا ٹھاکروں کے ہم پلہ و ہم رتبہ رقیب تھے۔ بٹھل نے بہ ظاہر پولیس افسروں کو باور کرا دیا تھا کہ ٹھاکر بستی میں پیش آنے والے واقعے کی رات ہمارے بالا خانے کا رخ کرنے اور دیر تک رقص و سرود کی محفل میں قیام کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس سے پہلے شام کو بازار میں خریداری اور چائے خانے میں چائے نوشی' اسپتال میں جاں بلب لکشمی داس کی عیادت' ہریا اور پھبو کی موت پر دہائی دینے اور مجرموں کے تعاقب میں پولیس کی بے بسی کا ماتم کرنے اور بطور حفظ ماتقدم اڈے پر پولیس کی نگہداری کے مطالبے کے لیے تھانے میں حاضری کے مشاغل بھی غیر شعوری اور غیر ارادی تھے۔ یہ تو میں جانتا ہوں اور پولیس افسر رمانے بھی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ فیض آباد آمد کے اتنے دن گزر جانے کے بعد بٹھل کو یکایک مجھے حویلی سے اڈے طلب کرنے کا خیال کیوں آیا۔ اسی دن کیوں' ایک دن پہلے اور ایک دن بعد کیوں نہیں؟ مجھے اسپتال اور تھانے میں ساتھ لے جانے' رات کو مجرے کی محفل میں شریک رکھنے' باقی رات اڈے پر گزارنے اور صبح سورج چڑھ آنے کے بعد حویلی واپس ہونے میں کیا مصلحت تھی یا یہ بھی محض اتفاق تھا؟ صرف اسی شام اور خاص اسی

رات' شمار کر بستی کی واردات کے عرصے میں میری ہمراہی کی ضرورت کیوں پیش آگئی تھی؟ اور ایک رات کے لیے گلگتے سے جاموکی فیض آباد آمد کا بھی اس سارے فسانے سے کوئی تعلق نہیں ہے؟

یہ سارے اتفاقات کیسے غیر یقینی اور عجیب و غریب ہیں' ایک ساتھ اتنے اتفاقات! یہی بہتر تھا کہ میں خود کو کسی بدترین نتیجے کے لیے آمادہ رکھوں۔ آدمی بدترین کے لیے ہمہ وقت کمربستہ رہے تو آنے والی ابتلا کی شدت کم ہوجاتی ہے۔ بھجل نے کوتوالی میں اپنے جتن تمام کیے ہیں۔ رائیگاں گئے تو کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے؟ جو ہوگا' اس سے مفر کی صورت بھی وہی باراں دیدہ بھجل جانتا ہوگا اور.... اور مفر کی ایک صورت یہ بھی تو ہے کہ میں یہاں سے نکل بھاگوں کہ میرا تعلق تو کسی معاملے سے نہیں ہے۔ میں تو تماشا دیکھنے والوں میں بھی شامل نہیں تھا۔ میرے وجود میں حقارت کی کوئی لہر سی اٹھی۔ سارا جسم جیسے غلاظت میں لتھڑ گیا ہو۔ میں آدمی سے کچھ اور بن گیا ہوں۔ دوسرے کو نہیں' آدمی کو سب سے زیادہ مشکل خود کو قابو میں رکھنے کی ہوتی ہے۔ آدمی کتنے ہی ہاتھ پاؤں باندھ کے رکھے' دل و دماغ کے آگے بے بس ہے اور دل بھی کیا' آدمی سر بہ سر' سرتاپا دماغ ہی ہے۔ نیکی دماغ' بدی دماغ ہے' دماغ ہی بھٹکتا' بھٹکتا رہتا ہے۔ یہ دماغ کوئی عجائب خانہ ہے۔ کبھی ایسے خیال اور ارادے در آتے ہیں کہ خود پر ہزار نفریں بھیجنے سے بھی بوجھ کم نہیں ہوتا۔ سب سے بڑی ذلت خود اپنی نظروں میں رسوا ہوجانا ہے اور آدمی خود کو کس طرح معاف کرے۔ ایسے رکیک اور مذموم خیال پر مجھے خود کو طمانچے مارنا یا کہیں ڈوب مرنا چاہیے۔ اگر سب کچھ اسی ترتیب سے واقع ہوا جس پر پولیس افسر ورما اصرار کر رہا تھا تو بھجل نے پرسوں شام اڈے کے آدمیوں کو حویلی بھیج کے مجھے اڈے طلب کرنے اور مسلسل اپنے ساتھ رکھنے میں کیسی ایک سپر فراہم کی۔ اسے کس درجے کا مربیانہ سلوک کہنا چاہیے۔ پولیس تو ہر حال میں میری بھی جستجو کرتی اور واردات کی رات' میں حویلی میں اپنی موجودگی اور کسی معاملے سے لاتعلقی کی شہادتیں کس کس طور سے پیش کرتا اور وہ میری بات پر کس قدر یقین کرتے۔ اس سارے فسانے کی ابتدا تو مجھی سے ہوئی تھی' ہریا اور لاکھو کے بیچ میں دیوار بن جانے اور نقشہ پلٹ جانے سے۔ پولیس' استاد بھجل کے "سائے" سے ایسی بے نیاز کیوں رہ سکتی تھی اور رہتی بھی تو کیا بھجل کو تنہا پولیس کے نرغے میں جاتا دیکھ کے میں سرنہوڑائے بیٹھا رہتا۔ جو بھجل

کا نوشتہ ہے' وہی میرا ہونا چاہیے' میری زنجیر تو اس سے بندھی ہوئی ہے۔

یہ کوئی خوف ہے؟ میں اپنی رگوں سے چمٹے ہوئے کسی خوف' احساس زیاں کی نشان دہی کے لیے اپنے آپ میں بھٹکتا رہا۔ یہ کاہے کے اندیشے مجھے بے آرام کیے ہوئے ہیں۔ کہیں میری وحشت زدگی کا سبب یہ تو نہیں کہ اس بار اس پیچیدہ معاملے میں الجھ کر کب گلو خلاصی ہو اور ہو بھی یا نہیں۔ یوں میرا تو سب کچھ تمام ہوجائے گا۔ سفر میں اسے کھوجنے کی ایک تشفی تو رہتی ہے۔ سمتوں کی خاک چھانی ہے' سمتوں کی خاک چھانے بغیر وہ کیسے مل سکتی ہے۔ چار سمتوں کے تو صرف نام ہیں' جدھر نگاہ اٹھے' وہی سمت ہے۔ دیر ہوجانے کی ایک ہیبت ہر لمحے میرا سینہ کھرچتی رہتی ہے۔ اب اور کب تک' کتنے عرصے تک وہ میرا انتظار کرے گی۔ انتظار' استطاعت سے سوا نہیں ہونا چاہیے اور مولوی صاحب بھی ایک دن کسی نواب ثروت یا حافظ عبدالخالق کے سامنے پسپا ہوجائیں گے۔ ایک راستہ میری طرف بھی آتا ہے اور وہ اس راستے کا رخ کرنا چاہتے تو میں کتنی دور تھا۔ منزلیں ارادے کی دوری پر ہوتی ہیں۔ انہوں نے میری حیثیت متعین کرلی ہے' جرم و سزا کی نوعیت کا اچھی طرح علم ہوجانے کے باوجود میں ان کی نظر میں ایک سزا یافتہ' عدالت کی طرف سے تسلیم کیا ہوا قاتل ہی ٹھہرا ہوں۔ حیرت ہے' اتنا وقت گزر جانے کے بعد ان جیسے جہاں دیدہ' صاحب نظر کو اس حقیقت کا عرفان کیوں نہ ہوسکا کہ کورا کی تو ایک ہی منزل ہے مگر مولوی صاحب کا واسطہ بیشتر لفظوں اور کتابوں سے رہا ہے۔ کچھ ماورائے علم' ماورائے بیاں بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ باتیں کیا جانیں۔ کوئی ایک شخص ہی کسی کی منزل ہوتا ہے۔ نہ دولت نہ طاقت' کسی کے لیے کوئی ایک شخص ہی کل کائنات ہوتا ہے۔ وہ حاصل نہ ہو تو آدمی کا ہونا نہ ہونا بس ایک گمان ہے۔ مولوی صاحب یقیناً کورا کے لیے کسی محفوظ پناہ گاہ کے بارے میں بھی سوچتے ہوں گے۔ آدمی کا کیا یقین ہے۔ پل میں خاک ہوجاتا ہے۔ یہاں کون جاودانی زندگی لے کے آتا ہے۔ اپنے بعد کا بھی سوچا ہوگا انہوں نے۔ نواب ثروت اور حافظ عبدالخالق کی پناہ گاہیں ان کے لیے بہت مضبوط اور محفوظ تھیں اور کتنے اس کے طلب گار' سایہ دار لوگ انہیں مختلف جگہوں پر ملے ہوں گے۔ کہیں ہامی نہ بھرنے کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ انہیں معلوم ہوگا' کورا نے اب تک خود کو ترک نہیں کیا ہے۔ مولوی صاحب نے نواب ثروت یا کسی حافظ عبدالخالق جیسے صاحب اقتدار کی دہلیز

تک جانے کا قصد کرلیا تو کورا کے لیے وہ آخری دن ہوگا۔ انہیں توقع ہوگی کہ ایک دن بالآخر کورا مایوس ہوجائے گی اور اپنا ارادہ ان کے حوالے کردے گی۔ مجبوری کی بات دوسری ہے' عمداً وہ اسے میری تلاش میں اپنی تگ و دو کا تاثر دینے کے لیے جگہیں بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ اسی طرح وہ اسے اب تک مطمئن رکھے ہوئے ہیں۔

میرے جیل جانے کے بعد انہوں نے میری سزا کے بارے میں جانے اسے کیا باور کرایا ہو۔ سات سال' دس سال یا چودہ سال۔ وہ اسے میری موت کی اطلاع بھی دے سکتے تھے۔ تصدیق کے لیے وہ کہاں جاتی لیکن مولوی صاحب کو اس خبر کے نتائج کا اچھی طرح احساس ہوگا۔ وہ تو مجھے موت کی سزا ہوجانے کی خبر بھی لازماً اس سے چھپاتے۔ انہوں نے اسے میری سزا کی مدت صحیح بتائی ہے تو سال گزر جانے کے بعد کورا کو ان سے میرے گھر یا شہر چلنے کے لیے اصرار کرنا چاہیے۔ کورا کو میرے محلے اور گھر کا پتا خوب یاد ہوگا۔ کیا کہا جاسکتا ہے' مولوی صاحب نے اسے کیا کیا سفر سے باز رکھنے کے لیے کیسے کیسے عذر تراشے ہوں اور اس کی دل جوئی کے لیے بادل ناخواستہ کیا کا سفر کیا بھی ہو تو وہاں پہنچ کے اسے میرے گھر سے دور رکھنے کی کیا تدبیریں کی ہوں۔ گیا پہنچ کے انہیں ملتا بھی کیا' سارا گھر ہی اجڑ گیا تھا۔ امی جان کے رخصت ہوجانے کے بعد ابا جان نے اپنا شہر' عزیز و اقارب' کاروبار' سبھی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ مولوی صاحب کو وہاں کیا حاصل ہوتا۔ چند محلے دار اور اعزا سے ان کی ملاقات ہوئی بھی تو کیا فرق پڑتا۔ رہائی کے بعد میں نے بھی وہاں کا رخ کیا تھا۔ ابا جان کسی کو کچھ بتا کے ہی نہیں گئے تھے اگر واقعی کورا کی ضد پر مولوی صاحب گیا جانے پر مجبور ہوگئے ہوں تو انہوں نے کورا کو کہیں ٹھہرا کے پہلے خود ہمارے محلے میں جاکے سیدھے ہمارے گھر پر دستک دینے کے بجائے ارد گرد سے سن گن لینے اور آس پاس کی صورت حال کا اندازہ لگانے کی احتیاط کی ہوگی پھر یہ تسلی کرکے وہاں اب کوئی نہیں' کچھ بھی نہیں' وہ بعد میں کورا کے اطمینان کے لیے اسے بھی ساتھ لے گئے ہوں۔ یہی کچھ ہوا ہوگا۔

کوئی آس' کوئی امید' کوئی یقین ہی کورا کے لیے نشاط روح ہے جس دن یہ آس' یہ امید ٹوٹ گئی' میری بازیابی کا یقین اٹھ گیا' مولوی صاحب اسے کھودیں گے مگر کب تک۔ کب تک وہ اسے آنے والی بدلی ہوئی کل کی بشارت دیتے رہیں گے۔ ایک یہی ہول تو میرے دل میں بار بار اٹھتا ہے کہ کہیں دیر نہ ہوجائے۔ مجھے تو کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا

چاہیے۔ مجھے تو اندھیروں' آندھیوں میں رات دن چلتے رہنا چاہیے۔ یوں ہاتھ پیر توڑے گھر بیٹھے رہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے پاس میرے جلد پہنچ جانے سے اس کی زندگی مشروط ہے۔ اس کے پسپا ہوجانے سے مراد نواب ثروت یا حافظ عبدالخالق کی چوکھٹ پر اپنے آپ سے دستبردار ہوجانا نہیں ہے۔ اس کے پسپا ہوجانے سے مراد خود کو تمام کردینا ہے اور مولوی صاحب کے اعصاب جواب دے گئے تو.... پھر کیا ہوگا؟ پھر وہ کہاں جائے گی؟ اس کے پاس کون سا راستہ ہوگا؟ اور مجھے مجھے....

میری سانسیں الجھنے لگیں جیسے کسی نے مجھے کہنی ماری یا چٹکی بھری ہو' میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ جیسے کسی نے مجھ سے کہا' میں یہ کیوں سمجھتا ہوں کہ ایک روز اس کی امید ٹوٹ گئی تو اس دن وہ.... وہ موجود نہیں رہے گی۔ مجھے تو ہر حال میں اس کی سلامتی مقدم ہونی چاہیے۔ میری یہ خواہش ایک طرح کی خود غرضی اور کس قدر ستم ظریفانہ ہے کہ میں اس سے انتہا درجے کی تاب استقامت چاہتا ہوں۔ آدمی اپنے بس سے زیادہ کیا کرسکتا ہے۔ وہ ایک ہوش مند لڑکی ہے۔ بے شک ایک شخص کا ایک شخص سے بے ربط ضبط بھی عقل و ہوش سے سوا ہوجاتا ہے' دونوں بے اختیار ہوجاتے ہیں لیکن یہ جنون نہیں ہے۔ یہ زندگی سے بالاتر نہیں ہونا چاہیے۔ زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔ اسے بہت طور قائم رہنا چاہیے۔ میرے ملنے نہ ملنے کی شرط کے بغیر اور یہی بہتر ہے' کوئی ایسا ویسا فیصلہ کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو مولوی صاحب کی مرضی و منشا کے سپرد کردے۔ اس نے بہت حوصلہ کیا' بہت میری راہ دیکھی' بہت دعائیں کی ہوں گی اس نے۔ وہ تو ہر لمحے ایک ہی دعا کرتی ہوگی۔ کہتے ہیں' دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے۔ زندگی گزر جاتی ہے اور کسی کے لیے وہ گھڑی نہیں آتی۔ معلوم نہیں' یہ سب کیا ہے؟ ایسا کیوں ہوجاتا ہے؟ یہ کیسا امتحان ہے؟ دو آدمی ایک دوسرے کے طلب گار ہیں۔ اس میں کیا مصلحت ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا رہیں۔ بس وہ باقی رہے' میرا کیا ہے۔ اتنا وقت اس کے بغیر گزارا ہے' اور گزر جائے گا اور نہ بھی گزرے تو کیا ہے۔ قسمت کی بات ہے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ مجھے تو آخری دم تک یا اس کے نظر آجانے تک سمتوں سمتوں چلتے رہنا ہے اور مجھے تو یہی دعا کرنی چاہیے کہ وہ شکستہ خاطری' مجھ سے دور رہنے' میرے نہ ملنے کی محرومی کے باوجود اپنے آپ کو قائم رکھے۔ میرے لیے یہی بہت ہونا چاہیے۔ وہ جسمانی طور پر مجھ سے کتنی ہی جدا رہی ہو' وہ تو میری سانسوں

میں موجود ہے۔ اس کی خوشبو میرے سینے میں بسی ہوئی ہے۔ میرے کانوں میں اس کی آہٹیں سرسراتی رہتی ہیں۔ وہ تو ہر پل میرے ساتھ رہتی ہے اور ساتھ رہے گی۔ میری تو یہی متاع ہے۔ مجھے اس کی سلامتی کے عوض اسی کو غنیمت جاننا چاہیے۔ میری عمر بھی اسے لگ جائے۔

مجھے کچھ نہیں معلوم، یہ جاننے کے بعد کہ وہ نواب ثروت یا حافظ عبدالخالق جیسے آسودہ خانوادوں سے وابستہ ہو چکی ہے، میرا کیا حال ہوگا۔ میرا جو بھی حال ہو، یہ کیا کم ہے کہ وہ سلامت ہے، وہ امان میں ہے۔ گو ایسی کسی جگہ اس کا حال بھی کیا مختلف ہوگا۔ جانے کتنے لوگ اپنے محسنوں، عزیزوں کے لیے اپنی ذات کی نفی کر دیتے ہیں۔ مولوی صاحب کی خوشنودی کے لیے وہ بھی ایک دن شاید خود کو نذر کر دے لیکن پھر وہ کہاں رہے گی۔ وہ اپنے لیے کتنی زندہ ہوگی۔ آدمی اپنا تو اپنے ارادے سے ہوتا ہے۔ اس کا نام، اس کا چہرہ وہی رہتا ہے، رفتار گفتار بھی وہی مگر بس ایک گمان، ایک قیاس، جانے کتنے لوگ، چلتے پھرتے، زندگی میں شامل، کوئی نہیں جانتا کہ وہ کتنے زندہ ہیں، کتنے نہیں۔ ان کی زندگی کتنی اپنی ہے، کتنی پرائی۔ مولوی صاحب، کورا کے لیے بڑے محترم و محبوب ہوں گے۔ وہ نہ ہوتے تو وہ کہاں ہوتی۔ دریائے ہگلی کے کنارے دو خون کرنے کے جرم میں جب پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا تھا، مولوی صاحب اسے بچا لے گئے ورنہ وہ اسی رات ہگلی میں ڈوب جاتی۔ یہ مولوی صاحب ہی تھے جنھوں نے خود کو اس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کی نظروں میں مولوی صاحب کا کیا مقام، کیسا درجہ ہوگا۔ تمام مراتب ان پر تمام ہیں۔ ان کا وجود اس کے لیے سائے اور ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسلمیر میں جب مولوی صاحب منیر علی کے پاس رہتے تھے، زہرہ، کورا سے خاصی مانوس ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ مولوی صاحب کورا کو شہزادیوں کی طرح رکھتے تھے اور شہزادی جب دیکھو گم صم، مضطرب مضطرب سی رہتی تھی۔ بہت کم کسی سے بات کرتی۔ کسی دن اس کی حالت زیادہ اضطرابی ہوتی تو مولوی صاحب کی پریشانی دیدنی ہوتی تھی۔ زہرہ کہتی تھی، ان دونوں کے درمیان ایک عجب تعلق تھا۔ زہرہ نے انہیں بہت کم ہم کلام ہوتے دیکھا تھا اور دونوں ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مولوی صاحب منتظر رہتے تھے کہ وہ کوئی خواہش کرے لیکن وہ ایک بے نیاز لڑکی تھی۔ نہ آرائش و زیبائش سے اسے کوئی سروکار تھا نہ کہیں آنے جانے اور کھانے پینے سے کوئی ایسی رغبت۔ مولوی صاحب سے کبھی وہ فرمائش کرتی تو کتابوں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، مولوی صاحب نے اسے تعلیم سے اچھی طرح آراستہ کیا ہے۔ وہ ایک عالم کے ساتھ تھی۔ بہت سیکھا ہوگا اس نے مولوی صاحب سے۔ مجھ سے بچھڑتے وقت اس کی عمر ہی کیا تھی، سیکھنے کی عمر تھی۔ تنہائی میں کتابوں سے بڑا رفیق کوئی نہیں ہوتا۔ کچھ کتابوں نے بھی اس کا حوصلہ استوار کیا ہوگا۔ مطالعہ وقت کا بہترین مصرف ہے۔ علم سے زندگی زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ برداشت اور تحمل کی قوت بھی علم فزوں کر دیتا ہے۔ بہرحال کچھ حاصل کرنا، کچھ نہ حاصل کرنے سے بہتر ہے۔ اسی کی طرح مولوی صاحب میرے بھی کیا کم مربی و محسن ہیں۔ وہ کوئی دولت مند جاگیردار آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی ناتوانی اور دربدری کے باوجود کیسا اسے اپنی امان میں رکھا ہے۔ زمانے کی دھوپ اور تیز ہواؤں سے بچا کے۔ اس کی خاطر زندگی ہی بدل دی۔ جانگ قبیلے کے جنونی لوگوں سے آمنا سامنا ہو جانے کا بھی دھڑکا انہیں ہر وقت لگا رہتا ہوگا۔ کیا میں کورا کے اتالیق پر حملے کے وقت کورا بھی زد پر آ جاتی۔ وہ تو اس کی زندگی تھی، اسے بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔

جانگ قبیلے کے وحشت زدہ لوگ اس کی جستجو میں ابھی تک سارے ہندوستان میں بھٹک رہے ہوں گے۔ کورا کی بازیابی کی صورت ہی میں انہیں اپنے قبیلے کی متبرک دستاویزات کا سراغ مل سکتا ہے۔ ان کی ملکیت قبیلے کے لیے سعادت ہے۔ ان کے بغیر قبیلہ بدبخت ہے اور سردار ناتواں۔ اس کی حکمرانی عبوری ہے۔ ایسی آسانی سے وہ ان سے دست کش نہیں ہو جائیں گے۔ وہ تو اپنی نسلوں کو یہ فرض منتقل کرتے رہیں گے۔ کون انہیں اس واقعے سے آگاہ کرے کہ ان کے یہ مقدس صحیفے انہیں اب کبھی واپس نہیں مل سکیں گے۔ وہ ... تو کورا جس رات اپنی جان بچا کے ہمارے گھر آئی تھی، ابا جان کی تحویل میں آ گئے تھے۔ میں نے ان کی ورق گردانی نہیں کی تھی، میں سمجھتا بھی کیا۔ ان کی زبان قدیم اور مختلف ہوگی۔ یقیناً وہ میری فہم اور استطاعت سے بالاتر ہوں گے۔ ان میں بدھ نظریے، فلسفے، اقوال و ارشادات، ہدایا تو احکام مندرج ہونے چاہئیں اور ان پر کندہ پیچیدہ خطوط اور اشارتی عبارتوں سے ایک مدفون گنج بے بہا کی نشان دہی بھی ہوتی ہوگی۔ ابا جان ایسے ہی ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں ہو گئے۔ ابتدا ہی سے وہ ایک نکتہ بیں اور جز رس شخص ہیں۔ جن کاغذات کی وجہ سے تبت کے ایک معتبر عالم کا قتل ہو گیا تھا، ان کی نوعیت اور اہمیت کے بارے میں ابا جان کا متجسس ہو جانا لازم تھا۔ پہلے انہوں نے کاغذات کی

زبان سے آشنائی حاصل کی ہوگی۔ برسوں کی شب و روز ریاضت کے بعد کہیں انہیں لعل و جواہر کے ذخیرے کی موجودگی، محل وقوع سے متعلق اسرار و رموز تک رسائی ہوئی ہوگی۔ جانگ قبیلے کے لوگوں کو مدفون خزانے سے اتنی غرض نہیں ہونی چاہیے جتنی انہیں کاغذات کی یادگاری، تاریخی اور روحانی حیثیت سے ہوگی۔ عقیدت بجائے خود ایک دولت ہے۔ عقیدت کا بینائی سے ایسا تعلق نہیں ہوتا۔ یہ جینے کا معاملہ ہے۔ کاش کورا کا اتالیق تبت سے بھاگتے وقت یہ کاغذات ساتھ نہ لاتا پھر نہ وہ زندگی سے جاتا، نہ کورا کو جانگ قبیلے کے لوگوں کے مسلسل تعاقب کی فکر ہوتی، نہ ابا جان اپنا آبائی شہر چھوڑنے کا فیصلہ کرتے اور شاید امی بھی اس طرح زندگی نہ ہار بیٹھتیں۔ فہمی بھی گھر میں محفوظ ہوتی، بالا خانے تک نہ جاتی۔ ان کاغذات نے ابا جان پر جیسے جادو کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو، اپنے سارے خاندان کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ خاندان میں نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ایک بے اندازہ دولت کی صورت میں اذیت ناک حوادث اور مصائب کی تلافی ہو گئی تھی اور یہ ابا جان ہی بہتر جانتے ہوں گے کہ اس تلافی سے ان کا دل کس قدر مطمئن ہے۔

کہیں کسی جگہ یقیناً جانگ قبیلے کے لوگوں سے مولوی صاحب کا تصادم نہیں ہوا ورنہ مولوی صاحب کو نجات حاصل کرنی مشکل ہو جاتی۔ مولوی صاحب نے کورا کا نام بدل کے نرجس بانو رکھ دیا اور پردہ کرا دیا تھا۔ ان کے پاس رہ کے اسی کے شعائر سیکھ سکتی تھی۔ مولوی صاحب کے ساتھ ایک برقع پوش لڑکی کو دیکھ کے کسی کو بھی شک نہیں ہوتا ہوگا مگر مولوی صاحب اپنی جگہ تو بہت محتاط رہے ہوں گے۔ پھونک پھونک کے اس کے ساتھ سفر کرتے رہے ہوں گے۔ [illegible] کی ہے، مجھ سے زیادہ اس پر مولوی صاحب کا استحقاق ہے۔ بس وہ ایک بات کیوں نہیں جانتے۔ انہیں ایک بار تو تحقیق کرنی چاہیے تھی کہ جیل جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری۔ یہی بات میں نے اور بجھل نے حافظ عبدالخالق سے کہی تھی، سزا ہو جانے کا مطلب میرا مر جانا یا منقلب ہو جانا نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے طور پر یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں کسی کام کا نہیں رہا ہوں، جیل جانے کے بعد میرا چہرہ اور دل سیاہ ہو جائے گا۔ وہاں آدمی صرف چوری چکاری سیکھتا ہے۔ حافظ عبدالخالق نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا مگر ان کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔ مولوی صاحب کبھی گجرات واپس آئے تو حافظ صاحب ضرور ان سے میری بات کریں گے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے، اصول پسند، شریف الطبع شخص نظر آتے تھے۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب پر ان کا بہت اثر ہے۔

میرا سر گھوم رہا تھا۔ کمرے میں مجھے بہت حبس محسوس ہونے لگا۔ بس یہی ایک تلقین اور تاکید دماغ میں گھمی جاتی تھی کہ ہمیں کسی طرح جلد سے جلد اپنے سفر پر روانہ ہو جانا چاہیے۔ جی یہی کرتا تھا کہ سب کی نظروں سے بچ کر یہاں سے بھاگ نکلوں اور دوسرے لمحے سارا وجود زنجیروں میں جکڑا ہوا لگتا تھا، رواں رواں جیسے بندھا ہوا ہو۔ میں اگر طے کر لوں تو یہاں سے کسی بھی وقت جا سکتا ہوں۔ کون مجھے روک سکتا ہے لیکن خود میری ایک دیوار تو درمیان میں حائل ہے۔ دروازے کھلے ہوئے ہوں، پروں کو بھی تو تاب پرواز چاہیے۔ میں ایسے کس طرح کہیں جا سکتا ہوں۔ مجھے تو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ بجھل نے پولیس افسر ورما سے صاف کہا تھا کہ وہ پولیس کی خاطر جمعی کے لیے مجبوراً ابھی کچھ عرصے فیض آباد میں رہے گا۔ میرے چلے جانے سے بجھل پر نظریں مرکوز ہو جائیں گی اور میرے یوں چلے جانے سے پولیس جانے کیا کیا مفہوم اخذ کرے۔ بجھل تو پھر بہت ناتواں ہو جائے گا۔ مجھے تو اس وقت تک یہیں ٹھہرے رہنا ہے جب تک حویلی پولیس کی نگاہوں کے حصار سے آزاد نہ ہو جائے۔ اصل بات تو اب بھی وہی ہے۔ پولیس نے ہمیں چھوڑ دیا ہے لیکن جیسا کہ بجھل نے خود پولیس افسر ورما سے کہا تھا، اس سے یہ کہاں مراد ہے کہ پولیس نے ہم سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ آدمی کے متعلقین بھی اس کے وجود کا حصہ ہوتے ہیں۔ آدمی کیا ہے، اپنے منظر و پس منظر کا شیرازہ۔ بجھل کے علاوہ یہاں زریں ہے، نیساں، خانم، جہانگیر، منیر علی کا خاندان، فروزاں، یاسمین اور نصیر بابا ہیں۔ میرے اس طرح روپوش ہو جانے سے وہ دل گرفتہ تو اور آزردہ ہو جائیں گے۔ سب کو بتا کے جانے کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔

میں اپنے کمرے سے نکل آیا۔ بیتے ہوئے کے اعادہ و تکرار سے ذہن بہت پریشان ہوتا ہے لیکن اس بازگشت سے کچھ سکون بھی ملتا ہے کہ آدمی کا رشتہ اپنے آپ سے قائم ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھولا نہیں ہے۔ ابھی دن خوب روشن تھا۔ سب سے پہلے نیساں مجھے دکھائی دی۔ وہ میری طرف ہی آ رہی تھی، مجھے کھانے پر بلانے کے لیے۔ اچھا ہوا جو میں خود باہر آ گیا۔ بیٹھک سے متصل بڑے کمرے میں یہاں سے وہاں تک دسترخوان سجا ہوا تھا۔ آج ناشتے میں اتنی فراوانی اور گوناگونی نہیں تھی۔ انہیں وقت ہی کتنا ملا تھا۔ یہ سن کے کہ

ہمیں صبح صبح پولیس لے گئی ہے۔ ان کا عالم بھی عجیب رہا ہوگا۔ انہیں شاید اتنی جلد، صرف ایک پہر بعد ہماری واپسی کی توقع بھی نہ ہو۔ جانے کیوں اب مجھ پر ایسا بار نہیں تھا۔ غالباً اس لیے کہ مجھے اپنا بکھرا ہوا سمیٹنے، الجھا ہوا سلجھانے اور کسی گوشے میں محفوظ کرنے کا وقت مل گیا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنے اور اپنی بے دست و پائی کے احساس سے بھی آدمی کو قرار آجاتا ہے۔ سامنے جو دنیا پڑی ہوئی تھی۔ اسے پھلانگنا میری استطاعت سے باہر تھا۔ ناتوانی، قناعت پر آمادہ کرتی ہے۔ بٹھل بھی وہاں موجود تھا اور تقریباً سبھی۔ ارشد اور تنویر مجھے اپنے پاس بٹھانے کے لیے ادھر ادھر سرک گئے۔ میرے انتظار میں وہ ہاتھ روکے بیٹھے تھے۔ زریں، خانم، نیساں اور یاسمین لپکتے جھپکتے گرم گرم کھانوں کے ڈونگے لاتی رہیں پھر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔ یہ سارے لوگ ایک دسترخوان پر جمع ہوجاتے تو اچھا خاصا کسی دعوت کا منظر ہوجاتا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کے دیکھا، سب کے چہروں پر بادل سے چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا، وہ گویا کھانے کی رسم ادائی کے لیے وہاں اکٹھے ہوگئے ہیں۔ کھانے کے لیے خلوئے معدہ سے زیادہ خلوئے دماغ ضروری ہے۔ بٹھل نے کچھ کھانوں کی تعریف، کچھ نئے کھانوں کی فرمائش کے تذکروں سے تکدر دور کرنے اور یہ جتانے کی کوشش کی کہ باقی سب خیریت ہے۔ مجھے فروزاں اور یاسمن کا خیال آتا تھا۔ یہاں آتے ہی حویلی کے اردگرد پولیس کی موجودگی، حویلی کے دروازے پر پولیس کے آنے اور ہمیں ساتھ لے جانے کی سرگوشیوں کی بھنک سے ان کے دل بھی بہت دھڑکے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر گہری سنجیدگی طاری تھی، البتہ وحشت نہیں۔ آس پاس غمگساروں کی کثرت ہو تو وحشت یوں بھی کم ہوجاتی ہے۔

کھانے کے بعد وہ بیٹھک میں آکے بیٹھ گئے اور بٹھل اپنی خاص جگہ پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو کے حقہ کشی کرنے لگا اور اس نے جہانگیر سے پیچیں منگوائی۔ ارشد اور تنویر بھی شامل ہوگئے۔ ان کے مصروف ہوجانے پر مجھے باہر جانے کا موقع مل گیا۔ ڈیوڑھی میں مما سے معلوم ہوا کہ صبح دس بجے کے قریب شہر کا بڑا وکیل رام پرساد بھارگو زریں سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کاغذات پر زریں سے دستخط کرائے اور بہ عجلت روانہ ہوگیا۔ زریں اور وکیل کے درمیان ہونے والی گفتگو کا مما کو علم نہیں تھا۔ یقیناً وہ ضمانت کے کاغذات ہی ہوسکتے ہیں۔ وکیل کو عدالتی کارروائی میں دیر لگ گئی جو وہ ہماری موجودگی میں کوتوالی نہ آسکا۔ میرے پوچھنے پر مما نے بتایا کہ حویلی سے کوئی ہرکارہ وکیل کو صورت حال سے آگاہ کرنے یا بلانے کے لیے نہیں گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا، بٹھل نے یہ انتظامات گزشتہ رات ہی کرلیے ہوں گے۔ اس نے کل رات یا ممکن ہے، کچھ اور پہلے وکیل بھارگو کو آج صبح سویرے سے بلکہ ہمہ وقت حویلی پر نگاہ رکھنے، پولیس کی دخل اندازی کی صورت میں مستعد رہنے کے لیے کسی ذریعے سے کوئی رابطہ کیا ہی ہوگا۔ وکیل از خود تو نہیں آسکتا تھا۔ بٹھل نے حویلی کے محاصرے کی خبر سن کے اور شاید اس سے بھی پہلے سارے امکانات قیاس کرلیے تھے۔ ہوسکتا ہے، اس نے زریں کو بھی پیش آنے والے سانحوں کے لیے حوصلہ قائم رکھنے کی فہمائش کی ہو۔ صبح وکیل کی آمد پر زریں نے خاموشی سے کاغذات پر دستخط کردیے۔ اس آمادگی میں اس کی معاملہ فہمی کے علاوہ بٹھل کی تلقین و تاکید کا بھی دخل ہوگا۔ مما نے مجھے نہیں بتایا کہ وکیل کی آمد پر زریں نے کسی تشویش یا حیرت کا اظہار کیا ہو۔ ادھر کوتوالی میں بٹھل نے پولیس افسروں کے سامنے یوں ہی ہوا میں تیر نہیں چلایا تھا کہ اس کا وکیل ہم دونوں کے قانونی تحفظ کے لیے بس آیا ہی چاہتا ہوگا۔ وکیل وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اس اثنا میں بٹھل نے اپنی وکالت کا فریضہ خود انجام دے لیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں نکلتے تھے کہ وکیل کی اب ضرورت نہیں رہی۔ کسی وقت بھی ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

شام کو میں یوں ہی وقت گزاری کے لیے ٹہلتا ہوا بالائی منزل پر واقع لائبریری میں چلا گیا تھا۔ مجھے تازہ رسالوں کی ورق گردانی میں وقت لگ گیا۔ وہاں سے واپسی پر معلوم ہوا کہ وکیل بھارگو بٹھل سے ملنے آیا تھا۔ مجھے ان کے درمیان موجود نہ رہنے کا ملال تھا۔ اس دن اڈے سے کوئی شخص حویلی نہیں آیا۔ بٹھل بھی حویلی میں بند رہا۔ رات کو کھانے کے بعد مما سے گردوپیش کی سن گن لینے کے لیے ایک بار پھر میں نے ڈیوڑھی کا رخ کیا۔ مما کا بھتیجا بھی وہاں موجود تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سارے شہر میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ پولیس نے جانے کتنے لوگ گرفتار کرلیے ہیں۔ کسی بھی مشکوک راہ گیر سے پولیس پوچھ گچھ شروع کردیتی ہے، جو ذرا سی مزاحمت یا حجت کرتا ہے، پولیس والے اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر پولیس کی نفری میں اور اضافہ کردیا گیا ہے۔ سنا ہے، بارہ بنکی سے پولیس کے دستے بلوائے گئے ہیں۔ شام کو دکانیں بند ہوگئی تھیں۔ دن بھر شہر میں ہو کا سا عالم رہا ہے۔ اڈے پر بھی پولیس کی بھاری جمعیت ہے لیکن اڈے کے آدمیوں نے خود کو عمارت تک محدود رکھا ہے۔ بٹھل نے دوپہر رخصت

ہوتے وقت انہیں یہی مشورہ دیا تھا۔

کھانے کے بعد بیٹھک میں سبھی موجود تھے۔ میری طرح ہر ایک کو توقع ہوگی کہ بٹھل رات گئے تک ان کے ساتھ بیٹھا رہے گا۔ وہ جلد ہی اٹھ گیا۔ اس کے چلے جانے کے یکے بعد دیگرے سبھی کسمساتے ہوئے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ میں بھی پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ جی میں آیا تھا کہ زریں، خانم، نیساں، جہانگیر وغیرہ سے کمرے میں آنے کو کہوں گا مگر اس خیال سے رک گیا کہ وہ ایسے سوالات شروع کردیں جن کا جواب دینا میرے لیے آسان نہ ہو۔ بہت سے جواب مجھے خود نہیں معلوم تھے۔ نیساں اور یاسمن جگ اور گلاس کا طشت رکھنے آئیں تو میں نے انہیں بھی نہیں روکا۔ نیساں نے سر کی مالش کے لیے بھی مجھ سے پوچھا تھا۔ مالش کا تو عذر ہوگا، ان کی چمکتی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ دونوں کچھ وقت میرے ساتھ گزارنے کی خواہش مند ہیں۔ میرے انکار پر وہ چپ چاپ چلی گئیں۔ لائبریری سے لائی ہوئی کتابوں اور رسالوں میں بھی جی نہیں لگا تو میں نے آنکھیں موند لیں اور کسی وقت جیسے رسیاں کھل گئیں، نیند بھی ایک طرح کی آزادی ہے، بے اختیار آزادی اور اختیار کے احساس کے بغیر آزادی کیسی۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد بٹھل حویلی سے نکل گیا۔ مجھ سے اس نے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا اور جانے کیوں میں اسے اکیلا جانے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھ سے نہیں کہا تو میں بھی چپ رہا اور اس کی طرف استفہامی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ مما سے اس نے تانگا منگوایا تھا۔ اڈے کے علاوہ وہ کہاں جاسکتا تھا۔ دوپہر کھانے کے وقت وہ واپس آگیا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں نے زیرلبی سے پوچھ ہی لیا "ادھر سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں رے۔" اس نے سرسری انداز میں جواب دیا "اینڈ رہے ہیں حرام کے جنے۔"

"سنا ہے، شہر میں ہر طرف پولیس ہے۔" میں نے اپنا اضطراب خود تک محدود رکھنے کی کوشش کی "پولیس بہت بولائی ہوئی ہے۔"

اس کی آنکھیں چڑھ گئیں، گہری سانس لی، کچھ کہنا چاہا اور بڑبڑا کے رہ گیا۔ وہ کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے کیا سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے بہت غصہ آتا تھا بلکہ اپنے آپ سے چڑ سی ہونے لگتی تھی۔

رات، کھانا کھانے کے بعد بیٹھک میں جانے کے بجائے میں ڈیوڑھی میں چلا آیا۔ مما کا بھتیجا مجھ سے اب خاصا مانوس ہوچکا تھا۔ ان لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا جو سوتے میں بھی چپ نہیں رہتے۔ مجھے کریدنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رواں ہوگیا۔ کہنے لگا، صبح وہ بازار سے حویلی کی طرف آرہا تھا کہ چوراہے پر اسے بٹھل کا تانگا نظر آگیا۔ بٹھل نے اسے بھی ساتھ بٹھالیا۔ راستے سنسان تھے، ہر جگہ راہ گیر کم تھے، پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ دو جگہوں پر پولیس مزاحم ہوئی اور فضول قسم کے سوالات شروع کردیے۔ بٹھل نے انہیں اپنی منزل یعنی اڈے، جامو استاد کی چوکی کا پتہ بتایا اور اپنی سکونت کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا۔ حویلی کے ذکر پر سوال کرنے والوں کی بھویں تن گئیں لیکن اس اطمینان کے بعد کہ کل صبح کوتوالی میں بٹھل ہی کو بلایا گیا تھا، انہوں نے مزید کوئی تعرض نہ کیا۔ اڈے سے قریب پولیس کا دستہ زیادہ محتاط تھا۔ انہوں نے بٹھل کو تانگے سے اتار لیا، تلاشی لی۔ بٹھل کی جیب سے چاقو برآمد ہونے پر ان کا پارا چڑھ گیا۔ بٹھل نے ہر سوال کا جواب نرمی سے دیا اور صاف بتا دیا کہ وہ اڈے کا آدمی ہے۔ چاقو تو اس کے لیے جسم کے کسی حصے کی مانند ہے۔ وہ فیض آباد پولیس کے آدمی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کسی بات سے ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ چاقو کی موجودگی اور اڈے سے تعلق کے اعتراف نے انہیں اور متوحش کیا۔ تھانے لے جانے کے لیے وہ بٹھل اور مما کے بھتیجے کو تقریباً دھکے دیتے، دھکیلتے ہوئے اڈے کی گلی سے باہر لے آئے، کچھ اس طرح کہ دو پولیس والے دائیں بائیں، دو پیچھے، ایک آگے، پورا گھیرا ڈال کے۔ گھیرے کے ساتھ ان کا افسر چل رہا تھا۔

مما کا بھتیجا کہہ رہا تھا، بٹھل کا ساتھ ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس سے تو ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ بازار والی سڑک پر بہت سے راہ گیر یہ منظر دیکھنے کے لیے اپنی اپنی جگہوں پر ٹھہر گئے تھے۔ کسی کو قریب آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سڑک کے نکڑ سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر گشت کرتی ہوئی فیض آباد پولیس کی دخل اندازی پر کہیں یہ تماشا ختم ہوا۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ انہوں نے جانا، شاید بٹھل کسی نئے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ بٹھل کو ساتھ لانے والے پولیس والوں سے استفسار پر ان کے چہروں کی تندی دور ہوئی۔ مقامی اور غیر مقامی سپاہیوں میں تھوڑی سی تکرار ہوئی۔ بٹھل اس دوران خاموش کھڑا رہا۔ فیض آباد پولیس کے حوالدار نے غالباً اپنے غیر مقامی ساتھیوں کی خوشنودی کے لیے تحکمانہ لہجے میں بٹھل سے بازپرس کرنی چاہی۔ بٹھل نے کہا کہ ان

سوالوں کے جواب وہ پہلے دے چکا ہے۔ حوالدار اپنے ساتھیوں سے پوچھ لے۔ حوالدار نے شہر کی مخدوش حالت میں چاقو ساتھ لے کے چلنے پر سرزنش کی اور کہنے لگا کہ بہتر ہے' وہ ان دنوں خود کو گھر تک محدود رکھے۔ اس نے بُھّل کو متنبہ کیا کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی گئی ہے' سایوں پر بھی شک کیا جارہا ہے' افسران کا حکم ہے' کسی سے کوئی رعایت نہ کی جائے جو بھی ذرا سا مشکوک نظر آئے' پکڑ کر تھانے لے آئیں۔ بُھّل نے رکھائی سے کہا "سوپچاس کیا' پورا شہر تھانے میں بند کردو۔" حوالدار زچ سا ہوگیا اور بھنا کے بولا کہ وہ تو بُھّل کی بھلائی کی بات کررہا ہے۔ بُھّل کی سمجھ میں نہیں آرہا تو جہنم میں جائے۔ حوالدار بکتا جھکتا غیر مقامی پولیس افسر کو الگ لے گیا اور سرگوشیوں میں جانے کیا کچھ باور کراتا رہا۔ افسر کے اشارے پر سپاہی' بُھّل اور مما کے بھتیجے کے محاصرے سے دستبردار ہوگئے۔ بُھّل نے وہاں سے حرکت نہیں کی اور اپنے چاقو کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ افسر کو چاقو کی واپسی میں کچھ عار تھی لیکن چند لمحوں کے پس و پیش کے بعد اس نے منہ بگاڑتے اور گالیاں بکتے ہوئے چاقو بُھّل کی طرف اچھال دیا۔

یوں بُھّل اڈے تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ مما کے بھتیجے کے مطابق' اڈے پر لوگوں کا اژدحام تھا' بُھّل کو دیکھ کے سبھی پاگل ہوگئے۔ ساری عمارت نعروں سے گونج اٹھی۔ ہر شخص بُھّل کی پذیرائی کے لیے مضطرب تھا۔ استاد سلامی نے فوراً حقہ تازہ کرایا۔ مما کا بھتیجا چوکی سے دور بیٹھا تھا اس لیے وہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکا۔ دو ڈھائی گھنٹے اڈے پر قیام کے بعد بُھّل وہاں سے اٹھ گیا' اس کی واپسی کے انتظار میں تانگا اڈے کے باہر کھڑا تھا۔ واپسی کے راستے میں بھی ایک جگہ انہیں روکا گیا اور چند سوالات کے بعد آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ دوپہر کے وقت سڑکوں پر سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ کل رات بازار کے علاقے میں بالاخانے بھی بند رہے۔

اس رات بھی بُھّل نے بیٹھک میں زیادہ دیر نشست نہیں جمائی۔ حالانکہ کھانے کے بعد تقریباً سبھی بیٹھک میں آچکے تھے اور کسی رنگ جمنے کے آرزو مند معلوم ہوتے تھے۔ ڈیوڑھی سے اٹھ کے میں بیٹھک میں داخل ہوا تھا کہ بُھّل نے سب کو آرام کرنے کی ہدایت کی۔ نصیربابا نے اس کا حقہ اس کے کمرے میں پہنچادیا۔ بیٹھک میں میری موجودگی کی وجہ سے کچھ دیر وہ سارے بیٹھے رہے اور کلبلاتے رہے۔ میرا سر خالی خالی تھا۔ دماغ پر ہجوم بھی خالی پن کا سبب ہوتا ہے۔ ان سبھوں کی حالت بھی کچھ مختلف نظر نہیں آرہی تھی۔ بُھّل نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ حویلی کے مکین اس کی جانب سے خوش امید کی کسی نوید کے طلبگار ہیں۔ ظاہر ہے' گردوپیش کے گردو غبار نے ان کے اعصاب بھی شکستہ کیے ہوں گے۔ بُھّل کو زیادہ نہیں تو کچھ دیر ان کی نشاط خاطر کے لیے وہاں بیٹھے رہنا چاہیے تھا لیکن لگتا تھا' بُھّل بھی آنے والے دنوں کے سازگار موسم کی پیش گوئی سے قاصر تھا اور کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا' آگے جس کی تردید میں بکی کا امکان ہو۔ بُھّل کی جگہ ان کی دل داری و دل جوئی کا کام میں بھی کرسکتا تھا لیکن میری باتوں سے ان کی ایسی تشفی نہیں ہوتی اور پہلے تو خود مجھے اس تشفی کی ضرورت تھی۔

بُھّل کی پان خوری شوقیہ تھی۔ ہرچند پانوں کی اقسام کے بارے میں اس کی معلومات پان کے عادی کسی شخص سے کم نہیں تھیں' حویلی میں اس کے قیام کے دوران پان دان کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ صبح و شام' ناشتے اور کھانے کے بعد چاندی کے ورق میں ملبوس گلوریاں اس کے سامنے رکھ دی جاتیں۔ الائچی والے' لکھنؤ کے خاص زردے' زعفران اور طرح طرح کے مسالوں سے بھری چھوٹی چھوٹی منقش بناری ڈبیوں سے خاص دان آراستہ کیا جاتا تھا۔ بُھّل کے ہونٹوں پر پان رچتا بھی خوب تھا۔ اس رات معمول کے خلاف سامنے رکھے خاص دان رکھ آنے کی تاکید کی۔ نیساں کے واپس آنے پر زریں کا اضطراب کچھ کم ہوا۔ یہ کام وہ خود بھی کرسکتی تھی مگر اس کے بُھّل کے پاس جانے کی بات اور ہوتی۔ اسے سامنے دیکھ کے بُھّل کو توجہ اس کی طرف مرکوز کرنی پڑتی اور یہ توجہ مزید گراں باری کا سبب ہوسکتی تھی۔ زریں نے یقیناً بُھّل کے چہرے پر کسی قسم کا تکدر بھانپ لیا تھا۔ حسن اور نازکی لازم و ملزوم ہیں۔ وہ بہت شیشہ نفس لڑکی تھی۔ نازکی سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی آب گینے کے مانند ہے۔ اسے دوسروں کے آب گینے کا احساس بھی اتنا ہی ہونا چاہیے۔ جہانگیر اور نیساں بساط بچھانے کے لیے مچل رہے تھے۔ خانم کا تیور دیکھ کے دونوں بجھ سے گئے اور سر جھکائے بیٹھک سے نکل گئے۔ کچھ دیر میں سبھی ایک دوسرے کے پیچھے وہاں سے رخصت ہوگئے۔ میں بھی پھر آہستہ قدمی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اپنا ساتھی آدمی کو بہت مرغوب ہوتا ہے لیکن اپنا آپا ہی زہر لگے۔ کبھی اپنے آپ سے دور ہونے کو جی کرتا ہے' اپنا چہرہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

ہمیں کوتوالی میں حاضری دیے تیسرا دن تھا۔ بُھّل بیشتر اپنے کمرے میں بند رہا۔ سرِشام استاد سلامی کی آمد کی اطلاع پر وہ بیٹھک میں آیا۔ میں ڈیوڑھی میں تھا اس لیے سب سے پہلے میرا اس کا سامنا ہوا پھر میرے ساتھ ہی وہ بیٹھک میں داخل ہوا۔ یوں مجھے اس کے اور بُھّل کے درمیان موجود رہنے کا ایک جواز مل گیا۔ استاد سلامی کے پاس سنانے کے لیے یہی ایک خبر تھی کہ دوپہر کے وقت پولیس کا ایک مسلح دستہ اڈے پر وارد ہوا اور اسے کوتوالی چلنے کا حکم دیا۔ کوتوالی میں جلد ہی اسے ایک مقامی' دو غیر مقامی افسروں کے سامنے پیش کردیا گیا۔ یہ کمرا اس کمرے سے مختلف تھا جہاں تین دن پہلے اڈے کے آدمی لے جائے گئے تھے اور ان کی زبانیں کھلوانے کے لیے طرح طرح کی ایذائیں دی گئی تھیں۔ استاد سلامی سے از سرِ نو وہی سوال کیے گئے جن کے جواب وہ اس روز تفصیل سے دے چکا تھا۔ یہ سوال زیادہ تر بُھّل اور میرے متعلق تھے۔ اس مرتبہ پولیس افسروں کی ترش گفتاری میں پہلے جیسی تیزی نہیں تھی۔ استاد سلامی کے بہ قول اس نے ایک بار پھر صراحت کی کہ استاد بُھّل اڈے کا آدمی ہے اور محض اڈے کے آدمی قتل و خون کے اتنے بڑے اور منظم واقعے میں ملوث نہیں ہوتے۔ وہ ڈاکو اور نقب زن نہیں ہوتے۔ میرے بارے میں اس نے پولیس افسروں کو بتایا' اڈے اور چاقو سے میرا تعلق بالواسطہ ہے۔ میں اڈے کا آدمی قطعاً نہیں ہوں۔ بُھّل سے ربطِ خاص کی وجہ سے کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے۔ بے شک استاد بُھّل کی معیت کی وجہ سے مجھے چاقو' بلم' لاٹھی اور زور آزمائی وغیرہ میں بڑی مہارت حاصل ہے لیکن اڈاگیری اور چاقو بازی میرا مقصود نہیں ہے۔ ضرورت ہی پر میں قدم بڑھاتا ہوں' کسی سے زیادتی ہورہی ہو یا درمیان میں پڑے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ ہریا کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ ہریا' جامو استاد کے اڈے کا آدمی تھا۔ یہ کس طرح ممکن تھا' جامو استاد کے شہر فیض آباد میں اس کے اڈے کے ایک آدمی پر باہر کا آدمی حاوی آرہا ہو اور استاد باہر کھڑا دیکھتا رہے۔

پولیس نے گھما پھرا کے سوال کرنے اور استاد سلامی کو الجھانے کی کوشش کی۔ استاد سلامی نے ہوش و حواس قائم رکھے۔ اصل صورت حال کی تصدیق کے لیے انہوں نے ٹاکر ہردیو اور رلیا دیو کی بستی میں خون خرابہ ہونے والی رات بُھّل کی مصروفیات کی ترتیب دہرائی اور اپنی طرف سے ترمیم و اضافہ کردیا۔ استاد سلامی نے شدت سے تردید و تصحیح کی کہ اس نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ استاد بُھّل اس روز شام کو چائے خانے میں چائے نوشی کے بعد سنار کی کسی دکان پر نہیں گیا اور نہ ہی اسی رات اس نے شاہ زادی کے بالاخانے کا رخ کیا۔ افسران نے اس سے بحث نہیں کی اور اسے اڈے واپس جانے کی اجازت دے دی۔

"یہ اپنی مائی ہریالی کدھر ڈوب گئی؟" یکایک بُھّل نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں سمجھ گیا' استاد سلامی کو آئے دیر ہوگئی تھی۔ اس کی خاطر تواضع کے لیے کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ حویلی میں کسی مہمان کی آمد کی اطلاع زریں' خانم اور زہرہ کو فی الفور ہوجاتی تھی اور محمودی نامی ادھیڑ عمر ملازمہ حرکت میں آجاتی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں سارا انتظام جیسے خود بہ خود ہوجاتا تھا۔ محمودی بیگم اس کا اصل نام تھا۔ حویلی کے مکین اسے مودا بوا کہتے تھے۔ وہ بیشتر سبز دوپٹا اور سبز چادر اوڑھے رہتی تھی۔ اسی نسبت سے بُھّل نے اس کا لقب ہریالی رکھ دیا تھا۔ مہمانوں کے لیے وہی باورچی خانے سے خورونوش کا سامان بیٹھک میں لاتی تھی۔ میں باورچی خانے جانے کے لیے نکلا ہی تھا کہ وہی ہوا۔ محمودی بیگم طشت اٹھائے بیٹھک کی طرف آتی دکھائی دی۔ میں بیٹھک میں واپس جانا چاہتا تھا' مجھے گمان ہوا' کہیں میں بُھّل اور استاد سلامی کی گفتگو میں مخل تو نہیں ہورہا ہوں۔ مجھے اٹھانے کے لیے بُھّل نے یہ بلاغت اختیار کی ہو۔ شاید مجھے وہاں بیٹھے ہی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے پھر بیٹھک میں واپس جانا مناسب نہیں سمجھا اور لائبریری کی طرف نکل گیا۔

سورج ڈوب رہا تھا' نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ حویلی کے اندرونی حصے میں خاصی چہل پہل تھی۔ جہانگیر مل گیا اور اس نے بتایا کہ پیچھے باغ میں ارشد اور تنویر بیڈمنٹن کھیل رہے ہیں لیکن باغ میں جانے کے بجائے میں نے لائبریری کی سیڑھیاں طے کیں اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے میرے قدم ٹھٹک گئے۔ وہاں فروزاں موجود تھی۔ شاخ پر جیسے گلاب تازہ تازہ کھلا ہو۔ سفید چکن کے کرتے' دوپٹے اور آڑے پاجامے میں ملبوس۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے' جیسے سیاہ بادلوں کی اوٹ سے چاند دمکتا ہو۔ بصارت کی بھی ایک استطاعت ہوتی ہے۔ روشنی بصارت سے سوا ہو تو! میری آنکھیں ایک لمحے کے لیے بینائی کھو بیٹھیں' لگتا تھا' چہرے سے چنگاریاں لپک رہی ہوں یا کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ ذرا ہوا کا رخ بدلے' ذرا دھوپ نرم ہو اور ذرا سی پھوار پڑے تو پژمردہ پودوں اور پھولوں پہ زندگی لہلہانے لگتی ہے۔ آدمی بھی کچھ اسی کی طرح کے ہوتے ہیں۔ بس ذرا سا سایہ' ذرا سا

گداز اور ذرا سا گرد و پیش کا اعتبار ہونا چاہیے۔ وہ کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھی۔ مجھے سامنے دیکھ کے سٹپٹا سی گئی اور اضطراری انداز میں دوپٹے سے سر ڈھانپا' لباس درست کیا اور کسی قدر سراسیمہ آواز میں آداب کیا۔ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی "آیئے' آیئے۔"

میں نے سر جھکائے کرسی کھینچ لی "آپ' آپ ٹھیک تو ہیں" اپنی آواز کا ہیجان خود مجھے کھٹک رہا تھا۔ ناشتے' کھانے اور بیٹھک میں روز دو تین بار تو چہرہ نمائی ہو جاتی تھی لیکن اس طرح آمنے سامنے بات کیے ہوئے دن ہو گئے تھے۔ "کوئی' کوئی پریشانی تو نہیں آپ کو؟" میں نے بے ترتیبی سے کہا۔

اس نے اپنی غزالیں آنکھیں میچ لیں' تراشیدہ لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ جھجکتے ہوئے بولی "یہاں تو کسی اور دنیا کے لوگ رہتے ہیں۔"

"جی' جی مگر..." جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی زبان قابو کی اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے کی کوشش کی "گزشتہ دنوں۔ جھمل بھائی اور میں کچھ بے ہنگم سے معاملات میں گھرے رہے۔ بس اتفاقات کہیے۔ ایسے اتفاقات ہمارے ساتھ آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے بار بار خیال آتا رہا' آپ اور یاسمن کیا کہیں گی' ہم آپ کو کوئی وقت ہی نہ دے سکے۔ جس صورت حال میں آپ یہاں آئی ہیں' اس کی ستم ناکی کا ہر لمحے احساس رہتا ہے۔ خدا کرے' یہاں آپ کو کوئی الجھن' کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس نئے ماحول میں آپ کا جی لگ جائے۔ ہر جگہ کی اپنی مشکلیں اور آسانیاں ہوتی ہیں۔ کوئی شخص مکمل نہیں ہوتا اور جگہ کا بھی کچھ یہی ہے۔ کبھی کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو نظرانداز کر دیجیے اور کسی چیز کی ضرورت ہو' کہیں آنا جانا اور کبھی کچھ ناگوار خاطر ہو جائے تو براہِ راست مجھے بتا دیجیے' مجھے یا جھمل بھائی کو یا زریں کو۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس کی آواز کرچی کرچی سی ہو رہی تھی "آپ شاید بھول گئے۔ یہی کچھ آپ نے پہلے بھی کہا تھا۔ یہ تو ہماری خوش بختی ہے کہ اس طرف آپ کا آنا ہو گیا۔ خدا نے آخر ہماری بھی سن لی اور نہ جانے کیا... کیا"

اس کی آواز جھرجھرائی۔

"نہیں' ایسے نہیں" میں نے منتشر لہجے میں کہا "اسے اب' وہ سب کچھ اب بھول جائیے' کوئی دھیان ہی مت دیجیے اس طرف۔ سمجھیے کوئی برا' بھیانک خواب تھا۔ واقعی یہ کیسا اتفاق ہے۔ کوئی جیسے کھینچ کے ہمیں وہاں لے گیا تھا۔ سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ کہاں آسن سول' اس وحشی سید محمود علی سے ملاقات' اس کا مہمان خانہ' میری بیماری اور وہاں قیام کی معذوری' نصیر بابا سے رسم و راہ اور ہم پر ان کا اعتماد۔ کیسا تانا بانا ہے یہ۔ ہم تو بستی بستی گھومتے رہتے ہیں۔ آج یہاں' کل وہاں۔ آسن سول کی طرف نہ جاتے' ہو سکتا ہے' کسی اور شہر کا رخ کر لیتے۔"

وہ مضطربانہ طلائی چوڑیاں گھماتی رہی۔ اس کے شفق زار رخساروں پر بادل سے امڈ آئے۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ آہستگی سے بولی "اب آپ کب جا رہے ہیں؟"

"جلد ہی مگر سچ پوچھیے تو ابھی کچھ طے نہیں ہے۔ کچھ نہیں معلوم' کتنا وقت اور لگ جائے۔ میں یہی تو کہہ رہا تھا' یہاں آتے ہی ایک ناگہانی سے دوچار ہو گئے اور یوں سمجھیے' ابھی پیروں میں زنجیر پڑی ہے۔"

وہ اپنی ریشمیں پلکیں پٹ پٹا کے بولی "ایسی کیا بات ہے' کچھ بتایئے گا؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے پہلو بدل کے کہا "ہمارے لیے تو یہ معمول ہے۔ یہ گھٹا میں تو صبح و شام ہم پر منڈلاتی رہتی ہیں اور کوشش یہی رہتی ہے کہ حویلی پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ایسا ہی ہو گا لیکن میں آپ سے کہتا ہوں' آپ ایک تعلیم یافتہ اور ہوش مند لڑکی ہیں۔ تجربوں کے لیے درازیٔ عمر ضروری نہیں ہے۔ کم عمری کے باوجود زندگی نے آپ پر بہت کچھ آئینہ کر دیا ہے۔ ایک فیصد امکان ناگہانی کا ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے' بس حوصلہ نہیں کھونا چاہیے۔ ہمارا کچھ نہیں ہے۔ کچھ دن سکون سے گزرتے ہیں کہ پھر کوئی افتاد۔ جانے کب سے آزمائشوں' اندھیروں' اجالوں کی آنکھ مچولی جاری ہے۔ آنے والا کل ہمارے لیے بہت بے یقین ہوتا ہے۔ کچھ راستے ساتھ نہیں دیتے' کچھ ہماری اپنی کجی ہے۔ بس ہم ایسے ہی لوگ ہیں' الٹے سیدھے اور یہ بھی تو ایک سچ ہے' ہم ایسے نہ ہوتے تو آپ ابھی تک اس ارذل ترین شخص' سید محمود علی کے..."

میرا دماغ کوئی مناسب لفظ نہ ڈھونڈ سکا اور میری زبان اینٹھ کے رہ گئی۔ اپنے آپ کو مجتمع کرنے کے لیے میں نے کچھ توقف کیا اور قدرے تھمی ہوئی آواز میں کہا "اس خیال سے ہول آتا ہے' اگر ہم بروقت نہ پہنچ پاتے' وقت تو ویسے بھی بہت نکل چکا تھا۔ کاش' ہم کچھ پہلے ہی ادھر چلے جاتے تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو چکا تھا۔ پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ آپ' یاسمن اور اس ناتواں بوڑھے نصیر بابا کے ہم کچھ کام آ سکے... اب آپ کو یہاں دیکھ کے' کیا بتاؤں' مجھے اور جھمل بھائی کو کیسی طمانیت ہوتی ہے۔"

"ہم سے' ہم تینوں سے زیادہ نہیں" اس نے بے ساختہ کہا۔ اس کی کھنکتی آواز انفعال و امتنان' حسرت و شیدائیت کا آمیزہ تھی "ہمارے لیے تو یہ دوسری زندگی ہے۔"

"اور یہاں سب کی خواہش بلکہ آرزو ہے کہ اس نئی زندگی میں' خدا کرے آپ کے تمام دکھوں کا ازالہ ہو جائے۔ اب آپ اپنے اختیار کی زندگی گزاریں جہاں تک ہمارا معاملہ ہے" میں نے کہا "ہمارا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آنے والے کل کے تیور ہمارے لیے کیا اور کیسے ہوں لیکن ہم یہیں ہوں یا کہیں اور' کہیں بہت دور' کیسے ہی حالات اور حادثات سے نبرد آزما۔ یہاں سبھی ہمارے ہمجائے ہیں۔ ان کا اور آپ کا گزرا ہوا کچھ جدا نہیں ہے اور درد مشترک بھی کمال چیز ہے۔"

میری زبان پر جو آیا کہتا رہا۔ کل اسے ہمارا سارا سفید و سیاہ معلوم ہو ہی جاتا تھا۔ شاید میں کسی پیش بندی کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کر رہا تھا۔ آنے والے کل کا کسی تاریکی سے اس کی آمادگی یا کل کسی ناروا انکشاف کا اثر اور شدت کم کرنے کے لیے۔ یوں اسے اب تک ہمارے بارے میں تھوڑا بہت اندازہ ہو جانا ہی چاہیے تھا۔ میں نے اپنے آپ کو روکا۔ اتنا ہی بہت تھا۔ اس سے پہلے کہ اس شیشہ نفس' گل اندام کے نہاں خانے میں ان جانے اندیشہ و اوہام سر اٹھانے لگیں' میں نے صراحت کی "میں یہ سارا کچھ اس لیے باور کرا رہا ہوں کہ آپ کی استقامت اور آپ کا حوصلہ بھی توانائی کا سبب ہو گا۔ اپنے گھر سے وابستہ افراد یا یوں کہیے' اپنے متعلقین اور پرسانِ حال کے عزم و ارادہ کی پختگی کا یقین ہو تو پیش آنے والے سخت مرحلوں' منزلوں کی دشواری ارزاں ہو جاتی ہے۔"

میں نے نظر اٹھا کے دیکھا' اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ مرتعش تھے اور انہیں دیکھ کے گلاب کی پنکھڑی کا گمان ہوتا تھا' میں نے کہا "ذرا کچھ وقت' یہ پریشانی کا وقت ٹل جائے تو بمبئی چلیں گے۔ مجھے یاد ہے' میں نے آپ سے بمبئی کا ذکر کیا تھا کہ وہاں بھی ہمارا ایک گھر ہے' بڑا گھر۔ فرخ' فریال' فارعہ' اکبر' گیتا' جولین' شہ پارہ' چچا ابا جان اور زہرہ کے بابا' منیر علی صاحب وہاں موجود ہیں۔ وہاں ایک اور لڑکی بھی۔ اس کا نام رما ہے۔ اس کے ارادے تو کچھ ہیں۔ بڑی پڑھی لکھی' بہت عجیب لڑکی ہے وہ۔ بہت خیال آفریں باتیں کرتی ہے اور بھی بہت کچھ ہے وہاں۔"

"گھروں اور جگہوں سے کیا ہوتا ہے؟" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی "سب کچھ مکینوں سے ہے۔"

"ہاں' آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن جگہوں کی بھی اپنی حیثیت ہوتی ہے۔ بمبئی ایک بڑا شہر ہے۔ جگہ جگہ کے لوگ وہاں آباد ہیں۔ ان کے روز و شب کے معاملات گاؤں دیہات اور چھوٹے شہروں سے الگ ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور دور بھی بہت۔ یہ دوری و نزدیکی غالباً ہر بڑے شہر کی خصوصیت ہے۔ بڑے شہروں کی گنجانی اداس بھی کرتی' جی بھی خوب بہلاتی ہے۔ بڑے شہر میں رنگارنگی بہت ہوتی ہے۔ صاحب استطاعت شہریوں نے گنجان آبادیوں سے دور بڑے بڑے محل جیسے گھر بنا لیے ہیں اور ان گھروں میں ان کی اپنی ایک دنیا ہے۔"

"مگر آپ تو کہیں اور جا رہے ہیں" اس کے لہجے کا تیکھا پن شائستگی سے عاری نہیں تھا۔

"ہاں دیکھیے' اب کے کس طرف جانا ہو لیکن ہم کہیں بھی جائیں' میں نے زریں سے بات کی ہے' کچھ وقت جاتا ہے' یہ عارضی دھند جلد چھٹ جائے گی۔ جہاں گیر اور نیساں کے امتحانات کے بعد زریں کا ارادہ ہے۔ بہرحال کسی ذریعے سے ہمیں معلوم ہو جائے گا اور ہم سیدھے بمبئی پہنچ جائیں گے۔ کوشش کریں گے کہ اس مرتبہ سفر اتنا طویل نہ ہو۔"

"یہاں بہت سکون ہے" اس نے سرسراتی آواز میں کہا "یہاں کیا کچھ نہیں ہے۔"

"بمبئی جانے سے مراد ہجرت نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے' وہاں بھی ایسا ہی ایک گھر ہے' جی لگے تو وہاں رہیے' نہیں تو واپس آ جائیے۔"

"مگر..." وہ کسی قدر ہچکچاتے ہوئے بولی "دیکھا جائے تو ہماری طرز کے گھروں کی عورتوں کو بستیوں اور شہروں کے طول و عرض کی کمی بیشی اور رنگارنگی سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ چار دیواریاں تو ہر جگہ چھوٹی بڑی ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

"واقعی!" میں کرسی پر سیدھا نہ بیٹھا رہ سکا "آپ نے کیا یہی بات کہی ہے" میں نے اٹلتی آواز میں کہا "بے شک' ہمارے خاص طرز کے خاندانوں کی عورتیں تو زندگی بھر چار دیواریوں میں رہتی ہیں' ایک کے بعد دوسری' تیسری چار دیواری... مگر ساری دنیا میں ایسا نہیں ہے۔ ادھر گوروں کے ملکوں میں عورتیں' مردوں کی طرح زندگی کے معمولات میں شامل رہتی ہیں اور مرد نہیں بن جاتیں... اور آپ کو' آپ کو کیا اچھا' کیا مناسب لگتا ہے؟"

"مناسب نامناسب کیا" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی

بہت ہے کہ ہمیں وہاں سے رہائی مل گئی۔ آپ کو آگے سفر درپیش ہے۔ بہتر ہوگا' پہلے آپ اپنے کام کو اولیت دیجئے بعد کو کسی مناسب وقت اس طرف جانے کا قصد کیجئے۔"

"ہاں' ابھی اتنی جلد ممکن بھی نہیں مگر میں آپ سے سچ کہوں' جی چاہتا ہے کہ پہلی فرصت میں وہاں پہنچوں۔ بٹھل بھائی بھی یہی سوچتے ہوں گے۔ انہوں نے یہاں اپنے وکیل سے آپ کے معاملے پر ضروریات کی ہوگی' مجھے اس بابت ویسے کچھ علم نہیں ہے' صرف اندازے سے کہہ رہا ہوں۔ ظفر میاں کو بھی یہاں آنے دیجئے۔ انہیں بھی ساتھ رکھیں گے۔ مجھے تو یہ نہیں معلوم کہ ظفر میاں سے بٹھل بھائی یا نصیر بابا کی کیا بات ہوئی ہے۔ میں ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ میرے خیال میں انہیں اب تک یہاں آجانا چاہیے۔ شاید بٹھل بھائی نے ان دنوں یہاں کی دگرگوں صورت حال دیکھ کے انہیں بلانے میں تامل کیا ہو۔ آپ اطمینان رکھیں' وہ آجائیں گے۔" میں نے سر اٹھا کے ظفر کے ذکر سے اس کے رخساروں پر آتے جاتے رنگ دیکھنے چاہے لیکن اس کے چہرے پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ گم صم بیٹھی رہی "ظفر میاں نے بڑی اذیتیں جھیلی ہیں" میں نے کہا "انہیں دیکھئے' ان سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ کاش وہ ہماری موجودگی میں یہاں آجائیں۔ بڑی تعریفیں سنی ہیں ان کی۔ نصیر بابا بتا رہے تھے کہ علم کا شوق ہی انہیں آپ کے والد محترم کے دروازے پر لے گیا تھا۔"

وہ سر جھکائے دوپٹے کی پیل کریدتی رہی۔

"ان کے آنے کے بعد یہ خلش بھی دور ہو جائے گی کہ وہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔"

"ہم یہاں ہر طرح مطمئن ہیں" اس نے بہ عجلت کہا۔

"لیکن ابھی ایک حصہ تو باقی ہے۔ ظفر میاں کے آجانے پر گویا ایک خانوادہ مکمل ہو جائے گا۔"

"لیکن ہمیں کہیں اور نہیں جانا" وہ کسی حد تک نازبردارانہ انداز میں بولی۔

"بالکل' بالکل' کون آپ سے کہتا ہے' یہ تو آپ پر منحصر ہے۔ آپ کا اختیار ہے۔ ظفر میاں چاہیں تو وہ بھی یہیں رہیں' ہم سب کے ساتھ..."

"وہ نہیں چاہیں گے تو... تو بھی" اس نے زیرلبی سے کہا۔

"جی' جی' جی ہاں" میں نے مضطربانہ تائید کی۔

"ہم کہیں اور نہیں جائیں گے" وہ مچل کے بولی۔

خوش اندام' خوش کلام اور خوش اطوار لوگوں کی صحبت بھی کسی سیرگاہ کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے روبرو وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ اندھیرا جتنا گہرا ہوتا جاتا ہے' روشنی بھی اتنی گہری ہو جاتی ہے۔ کئی اطراف جلتی روشنیوں سے لائبریری جگ مگا رہی تھی۔ ان روشنیوں میں اس کے کانوں میں جھولتے آویزوں کے نگینے دمک اٹھتے تھے۔ مجھے وہاں بیٹھے رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ شائستگی کی بھی اپنی ایک تمکنت ہوتی ہے۔ اس کی آواز میں ترنم تھا اور تکلف اور تصنع سے عاری تھا۔ جیسی وہ خود سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی' سانچے میں ڈھلی ہوئی اس کی گفتگو بھی تھی۔ اس طرح باتیں کرتی تھی جیسے کوئی شہزادی ناپ تول کے خرام کرتی ہو۔ کبھی کبھی فارسی لب ولہجہ اور تراکیب کی آمیزش اس کی گفتار کا تیور اور دل نشیں' اثر آفریں کر دیتی تھی۔ حسن اور ذہانت دو آئینے کے مانند ہے اور کوئی جوہر علم سے آراستہ ہو تو مستزاد ہے۔ مجھے ہر دم یہ احساس رہا کہ میں ایک مختلف' ایک منفرد لڑکی سے ہم کلام ہوں۔ میں وہاں بیٹھا باتیں بناتا رہتا کہ زینے پر کسی کی تیز چاپوں سے وہ بھی چونک پڑی' میں بھی منتشر ہوا۔ وہ نیماں تھی۔ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے سے اس کی سانسیں پھول رہی تھیں "ارے آپ یہاں ہیں؟" وہ ہانپتے ہوئے بولی "سارے میں دیکھ لیا۔"

"کیوں خیریت تو ہے؟"

"بابا' آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے تردد سے پوچھا۔

"کوئی مہمان ان کے پاس آئے ہیں۔"

"کون مہمان؟"

"مجھے نہیں معلوم" وہ سادگی سے بولی۔

"استاد سلامی؟ وہ' وہ ہیں یا کوئی اور؟" لیکن نیماں کو کیا معلوم ہو سکتا تھا' مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے فروزاں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے رابطی سے معذرت کی اور سیڑھیاں طے کرکے نیچے آگیا۔

بیٹھک میں کوئی اور نہیں' استاد سلامی تھا۔ میرے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا "کدھری کھو گیا تھا رے؟" بٹھل نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"کیوں' یہیں تھا' لائبریری کی طرف" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر سپاٹ تھا۔

"ادھری سلامی کب سے تیرے لیے ہڑک رہا ہے' باربار کہنی مارتا تھا' یہ اپنا لاڈلا راجا..."

بٹھل کی بات استاد سلامی نے مکمل نہیں ہونے دی' جھنجلاتی آواز میں بولا "ہاں لاڈلے استاد' اپنے کو بے کلی تھی تم ایک دم... ایک دم سے..." سلامی نے بے تابانہ اٹھ کے مجھے گلے لگا لیا اور دبوچنے لگا۔

رات کا کھانا ہم تینوں نے بیٹھک میں کھایا۔ کھانے کے بعد سلامی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ بٹھل اور اس کے رویے سے مجھے اپنی بدگمانی پر ندامت ہوتی رہی۔ میرا دماغ ایسے ہی الٹے سیدھے جالے بنتا رہتا ہے۔ استاد سلامی کی خاطرداری کے لیے باہر جاکے کسی کو متوجہ کرنے کی ہدایت پر میرا دماغ کیوں بہکنے بھٹکنے لگا تھا۔ گھر کے اندر میں ہی جا سکتا تھا یا بٹھل۔ میں نے کیوں سمجھا کہ میری موجودگی بٹھل اور استاد سلامی کے مابین حارج ہو رہی ہے۔ بٹھل تو یوں بھی مجھے اٹھا سکتا تھا۔ اس عذر کے تکلف کی اسے ضرورت نہیں تھی۔ اسے بھی کچھ میری بدظنی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے صراحت نہیں کی اور اچھا ہی کیا۔ مجھے اور شرمندگی ہوتی۔ میری بدوضعی کی اسے عادت ہو جانی چاہیے۔ میں نے بھی خاموشی مناسب سمجھی۔ ندامت کا سب سے موثر اظہار خاموشی ہے۔ کھانے کے بعد میں بیٹھک سے جلد ہی اٹھ گیا اور کمرے میں آکے بستر پر پڑا اپنے آپ کو نوچتا رہا۔

○☆○

ہمیں کوتوالی میں حاضری دیے ساتواں دن تھا۔ رات کا کھانا کھا کے تقریباً سبھی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ حقے کے سلگتے ہوئے خمیرے کی خوشبو ہر طرف مہکی ہوئی تھی کہ ممات بچاتا ہوا اندر آیا۔ مما کو سب کے سامنے زبان کھولنا دشوار ہو رہا تھا۔ بٹھل خود ہی اٹھ گیا۔ میں نے بھی اس کی پیروی کی۔ بیٹھک سے باہر آنے پر مما نے بوکھلائی آواز میں بتایا کہ چبوترے پر پولیس موجود ہے۔

بٹھل نے آنکھیں میچ لیں اور مما کی کمر تھپکتے ہوئے بولا "بولو' آتے ہیں۔ ادھری بیٹھنے کو مونڈھا کرسی لگوا دو۔"

میرا وجود ایک لمحے کے لیے متلاطم ہوا تھا لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا۔ پولیس کی آمد تو کسی وقت بھی ممکن تھی۔ کوتوالی سے آنے کے بعد کسی بھی لمحے' مجھے تو جیسے ان کا انتظار تھا۔

بیٹھک میں واپس آکے بٹھل نے پان کا بیڑا کھایا' حقے کے چند کش لیے' بیڑی کا بنڈل جیب میں رکھا اور دھیمی آواز میں زریں کو مخاطب کیا "اپنے کو جانا ہے ابھی' لوٹنے میں دیری بھی لگ سکتی ہے۔ رات بھی لگ جائے' تم لوگ آرام کرو۔"

بیٹھک میں سکوت چھا گیا۔

بٹھل نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ ہم دونوں ڈیوڑھی پار کرکے چبوترے پر آئے تو کئی سپاہی ادھر ادھر منڈلاتے دکھائی دیے۔ مما اور اس کا بھتیجا اندر سے کرسیاں لا لا کے رکھ رہے تھے۔ چبوترے کے نیچے گلی میں اتنی روشنی نہیں تھی لیکن تانگوں کی ٹمٹماتی روشنیوں میں پولیس کا دستہ وہاں بھی مستعد کھڑا نظر آرہا تھا۔ چبوترے پر موجود سپاہیوں کے درمیان پولیس افسر وہی تھا جو گزشتہ مرتبہ ہمیں حویلی سے کوتوالی لے گیا تھا اور اس نے پانچ افسروں پر مشتمل جماعت کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے ہمیں احتیاط کی تلقین کی تھی۔ ہمیں سامنے دیکھ کے اس کا جسم اکڑ گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بٹھل اور مجھ پر جم گئی تھیں جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو یا پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو "کیا ہے مہاراج! کوئی سپنا دیکھ لیا یا پھر رستہ بھول گئے؟" بٹھل نے اٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

پولیس افسر نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے کندھے لٹک گئے "ٹھیک ہے استاد!" اس نے منہ بنا کے کہا "تم کو دیکھنا تھا۔"

"مورتی بنوا کے بھجوا دیں ادھری..." بٹھل تنک کے بولا۔

پولیس افسر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خشمگیں نظروں سے بٹھل کی صورت دیکھا کیا۔

"اتنا کشٹ کیوں کیا مائی باپ! پوری سینا کے ساتھ آئے ہو۔" بٹھل کا لہجہ بدلا ہوا تھا' کہنے لگا "آپ کسی پالتو کو بھیج دیتے۔ سر کے بل آجاتے درشن کو۔"

"زیادہ بات نہیں استاد!" پولیس افسر نے چڑچڑے پن سے کہا "ٹھیک ہے' اب جاکے آرام کرو۔"

"ایسا کیا صاحب!" بٹھل نے حیرانی کا اظہار کیا "کچھ الٹا ہو گیا کیا؟"

"بس بس' ٹھیک ہے' تم کو بولا نا' اندر جاؤ اور لمبی کھینچو۔ ہم کو دیکھنا تھا' تم یہیں پر ہو کہ نہیں۔"

"صاحب بہادر' کو بول کے چلے تھے' پندرہ بیس روز تک ادھری رہیں گے۔ کدھری نکلیں گی تو پرنام کرکے' اگلے پچھلے سارے معاف کرا کے۔"

"دیکھو استاد!" پولیس افسر مصنوعی تحکم سے بولا "تمہاری بھلائی کے واسطے بولتے ہیں۔ ابھی احتیاط کرو' بہت خراب حالت ہے۔ اڈے کے آدمیوں کو بھی تھام کے رکھو۔ پوری حکومت یہاں سے وہاں تک پلٹی ہوئی ہے۔ گورے ریزیڈنٹ نے لکھنؤ پولیس کی گردن دبوچ رکھی ہے۔ اب تک مجرم گرفتار کیوں نہیں ہوئے؟ پولیس کیا کر رہی ہے؟

آواز پر اس کی ہمت استوار ہوئی۔ "ارے یاسمن' آؤ آؤ' ادھر آؤ میرے پاس" میں نے اشتیاق سے کہا "دیکھو' اس نیساں کی بچی' تمہاری ہم زاد نے میرا کیا حال کر دیا ہے۔"

بستر کے نزدیک آکے وہ متذبذب سی' سمٹی سکڑی کھڑی رہی۔ میں نے اسے پاس آنے کو کہا۔ وہ قریب آئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے بستر پر اپنے سامنے بٹھالیا' وہ بہت معصوم اور دلکش لگ رہی تھی۔ نیساں اور اس کی عمر میں انیس بیس ہی کا فرق ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کا سایہ بن چکی تھیں۔

"دیکھا' نیند نہیں آرہی نا" نیساں لہکتی آواز میں بولی "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا' ساتھ چلو' بابر بھائی تمہیں دیکھ کے خوش ہوں گے۔"

"کیوں؟" میں نے بناوٹی حیرانی سے وضاحت چاہی۔ "یاسمن یہاں آنا نہیں چاہتی تھی کیا؟"

"نہیں بابر بھائی! یہ تو آپ کا دم بھرتی ہے' آنے کے لیے بے کل بھی تھی اور جھجک بھی رہی تھی۔ کہتی تھی' اس وقت انہیں زحمت ہوگی۔"

"کیسی زحمت!" میں نے شکایتی لہجے میں کہا اور یاسمن کا ہاتھ اٹھا کے اسے بوسہ دیا "جیسے نیساں' ویسے تم... تم جب چاہو' بے روک ٹوک آسکتی ہو اور ایسے آؤگی تو سچ' مجھے بڑی خوشی ہوگی" اس کا ہاتھ میں نے سینے سے لگائے رکھا۔ اس لمحے اس کی لیے میرا دل بہت الڈا اور میری سمجھ میں نہیں آیا' میں اس سے اپنی شیفتگی کا اظہار کس طرح کروں۔ نیساں نے مالش کی زنجیر سے مجھے باندھ رکھا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ یاسمن کا رہا سہا امتناع' اس کی بچی کھچی اجنبیت دور کرنے کے لیے مجھے بہت شفقت' بہت محبت اور بہت گداز کا تاثر دیتے رہنا چاہیے۔ دن میں کئی بار آمنا سامنا ہوتا تھا اور ہر بار میری کوشش رہتی تھی کہ بیتے ہوئے دن وہ جتنی جلد ہو سکے' بھول جائے۔ آج اگر بہتر نہ ہو تو گزرا ہوا کل ستانے لگتا ہے' چاہے کتنا ہی کرب ناک رہا ہو۔ آج اگر بہتر ہو تو گزرے ہوئے کل کی طرف کوئی پلٹ کے نہیں دیکھتا۔ آج کی شادمانی گزرے ہوئے کل کی ہولناکی سے سوا ہو جاتی ہے' جب بھی وہ میرے سامنے آتی تھی' میری نظروں میں وہ منظر گھوم جاتا تھا جب آسن سول میں سید محمود علی کے مہمان خانے میں پہلی بار نصیر بابا کے ساتھ چھپتی چھپاتی کسی دہشت زدہ ہرنی کی طرح ہم دو اجنبیوں کے پاس آئی تھی۔ اس کا سراپا لرز رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بے یقینی' ناامیدی کی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ نصیر بابا کی زبانی اس کی روداد سن کے ہی میرا سینہ بہت جلا تھا۔ اس رات اسے سامنے دیکھ کے تو میں گنگ ہو گیا تھا۔ اس کا وہ چہرہ' گلاب ابھی کھلا نہیں کہ مرجھا گیا' اس کا وہ خزاں زدہ چہرہ آنکھوں میں نقش تھا۔ یہاں آکے اتنے دنوں میں اس کا رنگ روپ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے عارض چمک رہے تھے' پہلے سے بڑی معلوم ہوتی تھی۔ بہت سے لوگ بہت دل کش ہوتے ہیں لیکن سب کے لیے دل ایسا نہیں کھنچتا۔ کچھ لوگوں میں جانے کیا خوبی ہوتی ہے کہ بے اختیار ان سے ربط خاطر کو جی مچلتا ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ نیساں کی طرح چہکا کرے' نیساں کی طرح وہ میرے بازو میں جھول جائے اور مجھ سے شکایتیں کرے' ناز کرے' یاسمن سے باتیں کرنے کی ایک ہی صورت تھی۔ میں نے نیساں سے منت کی کہ اب وہ اپنا یہ شغل سرنوازی ترک کرے۔ آخر وہ مان گئی۔ اس نے میرے روغن زدہ بال' گردن اور پیشانی کو تولیے سے رگڑ رگڑ کے خشک شوئی کی۔ بالوں میں کنگھی کی۔ غسل خانے جاکے صابن سے ہاتھ دھوئے اور واپس آکے میرے پہلو میں دبک کے بیٹھ گئی اور رات گزرتی رہی۔ جتنی دلچسپ باتیں' لطیفے' اپنی قلابازیاں' اپنی گھر اور اسکول کے زمانے کے قصے ذہن میں محفوظ تھے' میں انہیں سناتا رہا۔ میرے پاس خوش گوار یادوں کا ذخیرہ تھا ہی کتنا۔ جتنی شوخی اور شگفتگی مجھے آتی تھی' میں نے ان پر تمام کی۔ وہ مسکراتی' کھل کھلاتی رہیں۔ وقت چپکے سے گزر گیا۔ کچھ یاد نہیں رہا کہ رات کو توالی سے پولیس شہر میں ہماری موجودگی کی تصدیق کے لیے حویلی آئی تھی اور کل کا کچھ اعتبار نہیں ہے' کب وہ پھر آن دھمکیں۔ ہم اپنے گھر میں ہیں' پر کٹے پرندے کی طرح۔ اسے پنجرے کی قید سے آزاد کر دیا جاتا ہے۔ ہم اپنے گھر میں ہیں اور گھر کو چاروں طرف سے پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ کوئی عاقبت اندیشی یا کسی کی عائد کردہ پابندی' گھر اور زنداں میں پھر کیا فرق ہے۔ یہ کیسی رہائی' کیسی اسیری ہے۔

کوئی تین بجے کے قریب نیساں کو ہوش آیا۔ اس کے ٹوکنے پر یاسمن بھی ہڑبڑاتی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ وہ منع کر رہی تھی لیکن ان کا اکیلے جانا مناسب نہیں لگتا تھا۔ انہیں طویل راہ داری سے گزرنا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ باہر نکلا۔ اپنے کمرے میں جاتے جاتے وہ پلٹ کے بے تابانہ مجھ سے چمٹ گئیں۔ جانے کیوں میری آنکھیں سلگنے لگیں۔ میں نے ان کے سروں پر ہاتھ رکھا' پیشانیاں چومیں اور ان کے شانے تھپ تھپاتا لوٹ آیا۔ وہ چلی گئی تھیں لیکن دیر تک وہ میرے ساتھ رہیں۔ پھر کسی وقت آنکھ لگ گئی اور جب ٹوٹی تو کمرے میں ہر سو روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیواری گھڑی

پولیس جھک مار رہی ہے" پولیس افسر نے پولیس کو غلیظ گالی دی اور جلی بھنی آواز میں بولا "پولیس کے پاس جادو کی ڈنڈا ہے؟ گھمایا اور مجرم حاضر۔ سالے اوپر بیٹھے حکم چلا رہے ہیں۔ تم کو کیا بولیں۔ آٹھ دن ہو رہے ہیں۔ ٹھیک سے کمر ٹکانے کو نہیں ملی سمجھو' ۲۴ گھنٹے کی بیگار بھگتنی پڑ رہی ہے۔ ان لوگوں نے جادوگر سمجھ کے ورما صاحب کو بھیجا تھا۔ جاتے ہی جنت کار ہو جائے گا۔ وہ سورما پہلے بھی نتھی کیے تھے۔ وہ بھی اب ڈھیلے ڈھیلے سے نظر آتے ہیں۔ کتنے پکڑے چھوڑ دیے۔ کتنے ابھی حوالات میں سڑ رہے ہیں۔ سارے ... پولیس کتوں کی طرح مجرم سونگھتی پھر رہی ہے۔"

بھل خاموشی سے سنتا رہا۔ اسی اثنا میں مما اور اس کے بھتیجے نے ترتیب سے کرسیاں رکھ دی تھیں۔ بھل نے پولیس افسر سے ہمدردی کا اظہار کیا "آپ بیٹھو نا صاحب! تھک گئے ہو' تھوڑا جل پان کر کے جاؤ۔"

"نہیں استاد! اب چلتے ہیں' جاکے رپورٹ کرنی ہے' پولیس افسر کا منہ ابھی تک چڑھا ہوا تھا۔ "تم کو بول دیں' تم سامنے نہیں آتے تو تمہارے پاس حویلی کی تلاشی کا حکم تھا۔"

"آپ کو معلوم ہے" آپ کتنا اوٹ پلٹ کر سکتے ہو۔ اپنی اور بھی اڈے نے داب رکھی ہے۔ اڈے کی گانٹھ نہیں پڑی ... تو بات اور ہوتی ان داتا!" بھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

پولیس افسر کے سانولے چہرے پر آگ بھری تھی لیکن اس نے شفقانہ لہجہ اختیار کیا "ہاں' ابھی کھینچ ہی کے رکھو ... تم کو جانے دیا ہے۔ ورما نہیں ہوتا تو ایسے دھلے ہوئے نہیں آجاتے' پر ورما ہو یا دوسرے۔ صاف بول دیں' یاران کا دھیان جاتا تمہاری ہی طرف ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بھل نے گہری سانس بھری اور ... کیا "بیٹھو نا صاحب! گھر آکے ایسے جانا اچھا ہے کو..."

"نہیں استاد!" پولیس افسر نے بھل کا شانہ پکڑ کے ... سے کہا "پھر دیکھیں گے۔ ذرا یہ آنکھ مچولی' کھینچم ... کا نشہ اترنے دو۔ آئیں گے ضرور' ہم کو تو ادھر ہی ... صاحب۔"

جب تک وہ تانگوں میں بیٹھ نہیں گئے' ہم چبوترے پر کھڑے انہیں جاتا دیکھتے رہے۔

ان کی آمد اور روانگی میں چند ہی منٹ صرف ہوئے ... ہم بیٹھک میں واپس پہنچے تو نیساں اور یاسمن کے ... کوئی موجود نہیں تھا۔ ہمیں دیکھ کے ان کے چہروں پر جیسے ... پھوٹنے لگی۔ دونوں ادھر ادھر بکھری ہوئی خشک میوے کی تشتریاں اور قہوے کی پیالیاں سمیٹ رہی تھیں۔ بھل نے اپنی جگہ بیٹھ کے چلم کی راکھ کریدی اور پھونکیں مار مار کے سوئی ہوئی آگ بیدار کی۔ نیساں نے کو تازہ حقہ بھر کے لانے کے لیے کہا لیکن حقے کے رموز سے بھل خوب واقف تھا۔ دو چار کشوں کی حجت کے بعد نے سے دھواں افراط سے آنے لگا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمباکو میں ابھی جلنے کی سکت ہے۔ دھوئیں کا بھی ذائقہ ہوتا ہے۔ میں نے پہلے بھی ایک دو کش لے کے دیکھے تھے' میرا تو سر گھومنے لگا۔ حلق میں دھواں جیسے اٹک گیا ہو۔ بھل نے فرمائش نہیں کی تھی۔ نیساں بھاگم بھاگ کہیں سے تیل کی شیشی لے آئی۔ شاید بھل کو بھی کچھ سکون یا توجہ منتشر ہونے کی ضرورت تھی۔ نیساں کا ارادہ بھانپ کے اس نے سر ڈال دی۔ آنکھیں موندے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ نیساں حویلی کے مکینوں کی دل جوئی کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ ہر دم کوئی خدمت بجا لانے کے لیے مستعد۔ اشارے کی جستجو اور اشارے پر تعمیل کے لیے بے کل۔ مالش کی تو وہ ماہر تھی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے سر دباتی اور بالوں میں تیل پیوست کرتی تھی کہ ایک سرور سا رگ و پے میں اترنے لگتا تھا۔ بھل کے عقب میں کھڑی نیساں نے مسکراتے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں مجھے اشارہ کیا کہ بھل کے بعد میری باری ہے۔ ادھر یاسمن نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے گاؤ تکیے ترتیب سے رکھنے اور فرش وغیرہ کی درستی کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ کچھ دیر تو میں چپ چاپ بیٹھا انہیں دیکھتا رہا پھر دبے قدموں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دیگر ضرورتوں کے علاوہ ہر آدمی کو کسی خلوت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ گھر اور گھر میں گوشے نہ ہوتے تو آدمی کو خود سے نمٹنا کیسا دشوار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں' آدمی گروہ بند' غول پسند مخلوق ہے لیکن تنہائی کی بھی اسے شدت سے طلب ہوتی ہے۔

رات اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ بستر پر جسم پھیلا کے میں نے بھی بھل کے مانند آنکھیں بند کر لیں مگر کھلی آنکھوں میں سامنے کے منظر کی ایک حقیقت یا دیوار حائل رہتی ہے۔ بند آنکھوں میں گزرا ہوا منظر اور اجاگر ہو جاتا ہے۔ گزرا ہوا منظر آنکھوں میں کھبا ہوا تھا۔ پولیس افسر ہمیں دیکھنے آیا تھا۔ وہ ہمیں ساتھ بھی لے جاسکتا تھا' پھر سب کچھ بدلا ہوا ہوتا' حوالات کا بوسیدہ کمرا' اسلاخیں' مردہ روشنیاں' شکستہ بینچیں اور پہرے داروں کی دھمکی چاہیں' ان کی گھڑکیاں' دھمکیاں اور جانے کیا کیا۔ مما کے بھتیجے کے بہ قول شہر میں طرح طرح کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ ہماری روپوشی کی افواہ ہی

نے پولیس کو اس وقت حویلی پر یلغار کرنے کے لیے مجبور کیا ہوگا۔ ایک بات تو واضح ہو گئی تھی اور پولیس افسر بھی کچھ باور کرا رہا تھا کہ پورا ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی وہ ہماری طرف سے غافل نہیں ہوئے ہیں۔ حویلی کے گرد پولیس کی نفری ابھی تک تعینات تھی۔ شہر کے ناکوں' باہر جانے والے راستوں پر وہ مسلسل نگرانی کر رہے تھے۔ اس حصار کے بعد انہیں ہمارے بارے میں کسی افواہ پر توجہ نہیں دینی چاہیے تھی۔ اس سے پولیس کی بدحواسی اور بے چارگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دو دن پہلے بجھل دوسری بار اڈے کی طرف گیا تھا۔ اس مرتبہ ممّا کا بھتیجا اس کے ساتھ نہیں تھا' سو مجھے نہ معلوم ہو سکا کہ اب کے اڈے جانے والے راستوں پر اسے کتنی جگہ روکا گیا اور کیا تو تکار ہوئی۔ سہ پہر کو وہ حویلی واپس آگیا تھا۔

یکایک ایک خیال نے مجھے بستر سے اٹھا دیا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ فیض آباد سے ہمارے فرار کی شوشہ طرازی اڈے کے آدمیوں ہی نے کی ہو۔ ظاہر ہے' بجھل کی ایما پر' اس کی اجازت سے۔ بجھل سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اس طرح وہ پولیس پر اپنا اعتبار برقرار رکھنے کا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو۔ گزشتہ سات دن میں ٹھاکر بستی کی واردات کی تفتیش سے متعلق کسی افسر سے یہ ہمارا پہلا رابطہ تھا۔ ہو سکتا ہے' اتنا وقت گزر جانے کے بعد بجھل نے اپنے اطمینان اور استغنا کا اظہار ضروری سمجھا ہو۔ کسی افواہ کی ترغیب ہی پر حویلی میں پولیس کی آمد ممکن تھی۔ یہ ایک بالواسطہ دعوت تھی۔ ہماری طمانیت اور بے نیازی یقیناً پولیس کا شک متزلزل ہونے کا باعث ہو سکتی ہے۔ دوسری جانب بجھل کو بھی کچھ پولیس کا رجحان' اس کی فکر کی سمت جاننے کی جستجو ہونی چاہیے۔ اس اقدام میں کئی پہلو مضمر تھے۔ پولیس کو اس یقین کا اعادہ بھی بجھل کا مقصود ہوگا کہ ہم اس کی دسترس سے دور نہیں ہیں۔ یہ امکان تو قطعاً نہیں ہے کہ بجھل کے ذہن میں شہر سے فرار کا کوئی ارادہ پنپ رہا ہو اور یوں وہ حویلی کے گرد پولیس کا محاصرہ ختم کرنا چاہتا ہو۔ اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ کچھ لکھا ہو تو کچھ پڑھا جائے۔ آدمی لفظ پڑھ سکتا ہے' نشانات' شناخت کر سکتا ہے۔ بجھل کا چہرہ تو کورے کاغذ کی طرح تھا۔ وہ تو کوئی بت تھا' چلتا پھرتا بت۔ جس نے جو کچھ نہیں دیکھا اور جس نے جو کچھ نہیں جانا' اس کی آنکھیں کتنی ہی روشن ہوں' وہ بینا تو نابینا کے مانند ہے اور کسی نابینا کی طرح چیزیں ٹٹولنا اور راستے کھوجنا ہی میرا کام تھا۔ میں تو سرے ہی ڈھونڈ سکتا تھا۔

میرے اندیشے اور وسوسے اس واقعے پر انحصار کرتے تھے کہ ٹھاکر بستی کی خوں ریزی سے بجھل کا کوئی واسطہ ہے کہ نہیں۔ بہرحال کچھ بجھل کو بھی احساس ہوگا کہ پولیس' ٹھاکر بستی کے اتنے بڑے سانحے سے یوں دستبردار نہیں ہو جائے گی۔

دروازہ کھلا ہوا اور کمرے میں خوب اجالا تھا۔ نیساں شور مچاتی' کودتی پھاندتی اچانک وارد ہوئی "ہاں بابر بھائی' اب تیار ہو جایئے" مالش والوں کی طرح تیل کی شیشی اس کے ہاتھ میں دبی اور سفید تولیہ کلائی پر لٹکی ہوئی تھی۔

"ارے ارے' یہ ایک دم حملہ...... آج چھوڑ دو' پھر کل دیکھیں گے" میں نے کتراتی آواز میں کہا "تم تھک گئی ہوگی۔"

"تھکنا کیسا؟" وہ چہکنے لگی "آزما لیجیے۔ پوری رات کی شرط۔ اچھا' ٹھیک ہے جب تک آپ کو نیند نہ آجائے۔"

اس نے مزید کسی عذر خواہی کا موقع نہیں دیا' مسہری کے سرہانے کے عقب میں کھڑی ہو کے اس نے تیزی اور مہارت سے اچھی طرح تولیہ میری گردن اور سینے پر لپیٹ دی۔ تیل کے قطروں کی ٹھنڈک مجھے سر میں محسوس ہوئی۔ شیشی بند کرکے پہلے وہ ہتھیلیوں کی نرم نرم تھپکیوں سے مساموں میں تیل سموتی رہی پھر اس کی موی' ریشمی انگلیاں بالوں میں تیرنے' سرسرانے لگیں۔ ہاتھوں کی بھی کیا کرشمہ کاری ہوتی ہے۔ آدمی کے حواس جیسے خواص ہوتے ہیں' ہاتھوں میں ہاتھ بولتے' ہاتھ سنتے' ہاتھ دیکھتے ہیں۔ نرم و سخت' گرم و سرد' تلخ و شیریں' ریشم بھی' پتھر بھی۔ ہاتھوں کی اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ نیساں کے ہاتھوں کی لپک' اس کے تپاک' اس کی وارفتگی کی مظہر تھی۔ آنکھوں میں خمار سا چھانے لگا۔ وہ بار بار انگلیوں کے پینترے بدلتی تھی۔ ہتھیلی سے کنپٹیاں دباتی' پوروں کی دھیمی دھیمی چٹکیوں سے بھویں گرفت میں لیتی' کبھی پیشانی پر وہ ایک تواتر و توازن سے انگلیاں تھرکاتی' انگلیاں بجاتی تھی۔ مالش میں انگلیوں کا ردم بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ اس رمز سے بھی بہ خوبی واقف تھی کہ مالش کے دوران میں اندازہ ہوتا ہے کہ سر میں کتنا درد چھپا ہوا تھا۔ نیساں کی انگلیاں میرے سر پر رقص کر رہی تھیں اور مجھ پر ایک سرور آمیز' نشاط انگیز کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ میرا جسم نیساں کی انگلیوں کی لوری میں جھول رہا تھا یا محو پرواز تھا کہ دروازے پر ابھرتی آہٹ نے چونکا دیا۔ نیساں نے اسے مجھ سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ وہ یاسمن تھی۔ نیساں کے اصرار کے باوجود دروازے پر کھڑی رہی۔ میری

میں دس بج رہے تھے۔

اس دن بجھل صبح سویرے حویلی سے نکل گیا تھا۔ اڈے کے سوا کون سی منزل ہوگی۔ سورج ڈوبتے وقت وہ واپس آگیا۔ دوسرے دن ممّا کے بھتیجے نے مجھے بتایا کہ شہر میں تعینات غیر مقامی پولیس واپس چلی گئی ہے۔ اب مقامی پولیس ہی خاص خاص مقامات پر گشت کر رہی ہے۔ صبح دکانیں وقت پر کھلتی ہیں لیکن شام کو جلد بند ہو جاتی ہیں۔ لوگ جلد ہی گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ کئی دن پہلے بازار کا علاقہ کھل گیا لیکن بالاخانے سونے پڑے ہیں۔ شہر میں مسافروں کی آمدورفت بہت کم ہے۔ باہر سے ضروری اشیا اور دیگر سامان لانے والے تاجروں نے جگہ جگہ پولیس کی مداخلت کی وجہ سے باربردار گاڑیاں لانی بند کر دی ہیں اس لیے شہر میں بعض اشیا کی قلت ہو گئی ہے۔ ممّا کے بھتیجے کو اس کے کسی شناسا پولیس والے نے بتایا تھا کہ گوروں کے حکم پر سنگین واردات کی تفتیش کرنے والے خاص ماہروں کی ایک اور جماعت ٹھاکر بستی بھیجی گئی ہے۔ دو دن سے وہ حویلی کے خاکستر میں ایک ایک چیز کرید رہے ہیں لیکن شاید وہ بھی ناکام ہو جائیں۔ واقعے کے روز پولیس واردات کی جگہ دیر سے پہنچی تھی۔ سنا ہے' آس پاس کے دیہاتوں کو لوٹ کھسوٹ کا خوب وقت مل گیا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے' پولیس نے بھی دیہاتیوں سے بچ نکلنے والا ساز و سامان کہاں چھوڑا ہوگا۔ ٹھاکروں کی حویلی ایک قدیم اور وسیع و عریض حویلی تھی۔ بہت مال و اسباب تھا وہاں۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حملہ آوروں نے روپے پیسے' زیور اور نادر اشیا سے سروکار نہیں رکھا تھا۔ روز نئی توجیہات اور تاویلات کی جا رہی ہیں۔ کچھ لوگ مصر ہیں کہ [illegible] اور نہیں' پولیس خود الجھ رہی ہے۔ مختلف شہروں اور قصبوں میں مقیم' مرنے والے ٹھاکروں کے دور و نزدیک کے رشتے داروں کی باہمی رنجش' عداوت اور حسد اس سانحے کی اصل وجہ ہے۔ ٹھاکروں کی زمینوں پر کام کرنے والے کسانوں کے ایک گروہ کے مطابق' ٹھاکروں کے ساتھ رہنے والے واحد چچا زاد بھائی ٹھاکر ہرچرن کی وفا شعار بیوہ نے اپنی جان کا نذرانہ دے کے اپنے شوہر کی ارتھی پر کیا ہوا [illegible] چکایا ہے۔ ٹھاکروں نے آبائی جائداد میں بڑی حصے داری کی وجہ سے اس کے شوہر کو زندہ رہنے نہیں دیا۔ اسے اپنے شوہر کی طبعی موت کا یقین نہیں تھا۔ وہ مسلسل آگ میں جل رہی تھی۔ یہ تو لوگ پہلے ہی کہتے تھے کہ سارا کچھ لکشمی داس [illegible] کی پاداش ہے۔ وہ ایک نہایت پاک باز اور معصوم لڑکی تھی۔

اس سے اگلے دن شام کو میں تنہا لائبریری میں بیٹھا تھا کہ جہانگیر نے آکے کہا "ننگو آپ کو یاد کر رہا ہے۔ کہتا ہے' آپ اپنے کام سے نمٹ جائیں تو ذرا ڈیوڑھی کی طرف آجائیں۔"

میرا دل پھر کسی کتاب میں کیسے لگ سکتا تھا۔ یقیناً ممّا کا بھتیجا پھر کوئی نئی خبر لے کے آیا ہے۔ ڈیوڑھی میں وہ میرا منتظر تھا۔ اسے یقین تھا کہ پیغام ملتے ہی میں آجاؤں گا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں سلام کیا' پھر رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا "چھوٹے صاحب سیدھا بازار سے آرہا ہوں۔ مدنی ہوٹل کے مالک شدن میاں سے اپنی یاد اللہ ہے۔ آتے جاتے سلام دعا ہو جاتی ہے۔ میں نے خیریت پوچھی تو پاس بلا کے بولے' برخوردار' وہ تو نقشہ ہی دوسرا بن رہا ہے' ابھی سہ پہر کے وقت تین چار وردی والے لاٹ صاحب اپنے ہاں چائے پینے کو آئے تھے' وہ تو کچھ اور ہی راگ الاپ رہے تھے۔

ممّا کے بھتیجے نے مجھے بتایا کہ ٹھاکر بستی میں واردات سے ایک دن پہلے لکھنؤ سے مینا نامی رقاصہ اپنے چند سازندوں کے ساتھ محفل آرائی کے لیے آئی تھی۔ اسے حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ دو دن بعد اس کی محفل طے ہوئی تھی۔ ارد گرد کے رؤسا اور اعلیٰ حکام مدعو کیے جا چکے تھے۔ کسی کے سان و گمان میں نہیں تھا کہ مینا' بینا کی بڑی بہن ہے۔ بینا کچھ عرصے پہلے حویلی سے چند کوس کے فاصلے پر ٹھاکروں کے باغات میں واقع عشرت گاہ میں اسیر رہ چکی تھی۔ بنارس کے بازار میں ٹھاکر بل دیو نے اسے دیکھا تھا' پھر وہ روز بالاخانے جانے اور مال و زر لٹانے لگا۔ اس نے بینا کی ماں لیلا کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طور حسن و جمال میں بے پایاں' نرت بھاؤ میں بے مثل بیٹی سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوئی۔ ٹھاکر میں انکار سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ ناشاد بنارس سے واپس آگیا۔ کچھ مدت اس نے جبر کیا' آخر ایک دن اس کے شوریدہ پشت نمک خواروں نے بینا کو اپنے آقا کی جناب میں پیش کر دیا۔ بینا کو باغات والی عشرت گاہ میں محصور کر دیا گیا۔ آس پاس بیٹی کی تلاش میں ناکامی کے بعد لیلا کی نظریں ٹھاکر بل دیو پر گئیں لیکن ٹھاکر بستی پہنچ کر اسے اپنی کم قامتی اور ٹھاکروں کی بلند اقبالی کا اندازہ ہوا۔ اس نے بہت دہائیاں دیں' کون اس کی فریاد سنتا۔ اوپر سے نیچے تک عمال' حکام ٹھاکروں کے تابع تھے۔ وہ آہ و بکا کرتی ہوئی بنارس لوٹ گئی۔ بنارس میں ٹھاکروں کا سکہ نہیں چلتا تھا۔ کوئی کتنا ہی عالی مرتبہ ہو مگر یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ لیلا

ایک ممتاز خاندانی طوائف تھی۔ زندگی بھر دونوں ہاتھوں سے سمیٹا تھا اور ایسی دو بیٹیوں کی ماں تھی جن پر اہل ثروت لعل وجواہر نچھاور کرتے تھے۔ بنارس سے اسی نے ٹھاکروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ کیا لیکن اسے کچھ مہلت ہی نہیں ملی۔ ٹھاکر کے کارندے اس کے تعاقب میں تھے۔ ایک صبح اس سمیت سارے مکین مردہ پائے گئے۔ ادھر ٹھاکر بستی میں مینا کا بھی یہی انجام ہوا۔ سنا ہے، وہ ماں بننے والی تھی۔

لکھنؤ میں مقیم لیلا کی بڑی بیٹی، مینا کی بڑی بہن مینا کے ساتھ سازندے بھی ٹھاکر بستی آئے تھے۔ سازندے یا کوئی اور۔ قیاس ہے، اس نے باہر بھی ہتھیار بند لوگ تیار رکھے ہوں گے۔ اسی سراپا غضب نے ٹھاکر بستی کھنڈر کی ہے۔ وہ پورے اہتمام وانتظام سے آئی ہوگی۔ بعض لاشیں ایسی مسخ ہو گئی تھیں کہ انھیں پہچاننا مشکل تھا۔ مینا لکھنؤ واپس نہیں پہنچی۔ وہ اور اس کے سازندے کہاں چلے گئے؟ پولیس نے مختلف شہروں کے بالاخانوں پر چھاپے مارے، مینا کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ ابھی تک وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ یا تو یہ قصہ ہی سرے سے غلط ہے۔ مینا بھی ٹھاکروں کے خاندان اور ملازموں کے ساتھ لپیٹ میں آگئی یا پھر وہ خود کو فنا کردینے کا کوئی عزم کرکے لکھنؤ سے چلی ہوگی۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں ہوگی۔ دولت ہونی چاہیے۔ آدمی کو نچانے والے، آدمی کو ختم کرنے والے بہ کثرت مل جاتے ہیں، ہو سکتا ہے، مینا نے بالاخانے کی زندگی ہی ترک کردی ہو اور دور دراز کسی شہر میں شرفائی بستی کا رخ کرلیا ہو۔ ماں اور بہن کے چلے جانے کے بعد اب اس پر گزر بھی کیسی رہی ہوگی۔ اس خوں ریز واقعے کے انجام کا اسے خوب علم ہوگا اور اس نے ہر ممکن احتیاط کی ہوگی۔ آدمی کبھی اس نتیجے پر بھی پہنچتا ہے کہ کیا جینا اور کیا مرنا۔ کبھی کسی کی زندگی خود اس کی نظروں میں بہت حقیر ہو جاتی ہے۔

مما کا بھتیجا گلو کہہ رہا تھا کہ شہر میں سبھی متفق ہیں، مرنے والوں کی جتنی تعداد پولیس نے بتائی ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے۔

کچھ سادہ دل یہ سانحہ ٹھاکروں کے اعمال کا مآل قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ ہر شخص بہ قدر توفیق تخلیق کار ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ رائے کی اصابت دیگر بات ہے۔ جب کسی معقول اور مستند ذریعے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو لوگ خود ہی جیسا تیسا اخذ کرنا شروع کردیتے ہیں اور فیصلے صادر کرنے لگتے ہیں، اندھیرے میں کتنے قیاس ہی کی جاسکتی ہیں، کوئی ایک ان میں درست بھی ہوتی ہے۔ کچھ داستانیں مجرموں نے بھی عام کی ہوں گی۔ تو یہ تو داستانوں کی بھول بھلیوں میں مجرم تک رسائی آسان نہیں رہتی۔

مما کے بھتیجے سے حویلی کے باہر کا احوال سن کے میں خاموش رہا۔ میں نے اس سے نہیں کہا، ظاہر ہے، پولیس نے ہر متبادل، امکان پر جگر کاوی کی ہوگی۔ وہ شہر میں منڈلاتی خیال آفرینیوں اور قیاس آرائیوں سے بھی بے بہرہ نہیں رہے ہوں گے۔ ان میں ورما جیسے دیدہ ور، تدبیر گر افسر موجود ہیں۔ ورما نے اس واقعے سے ہمارے تعلق کی جس یقینی اور منطقی انداز میں توجیہ کی تھی، اسے سن کے میں ششدر رہ گیا تھا۔ ورما نے مجھے بھی دگرگوں کردیا تھا۔ جیسا کہ اس نے کہا تھا، بے شک ٹھاکر بستی کی واردات کسی نہایت منظم، ماہر و مشاق پیشہ وروں کی شعبدہ گری ہے۔ ان کی تعداد بھی کم نہیں ہوگی۔ انھیں ٹھاکر بستی کی طرف کوچ کرنے سے پہلے وہاں سے بہ سلامت واپسی کی فکر ہوگی۔ نہ وہ ایک ساتھ وہاں داخل ہوئے ہوں گے نہ ایک ساتھ واپس۔ کسی دل فگار بیوہ، کسی برگشتہ بہن اور بیٹی اور کسی حاسد رشتے دار کی آتش انتقام شاید اتنی شدید واردات کی متحمل نہیں ہوتی۔ حالت غضب میں بینائی متاثر ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی چوک ہو جاتی ہے۔ فریق اور فریق کے فرستادے میں فرق ہوتا ہے۔ ٹھاکر بستی میں جانے والے کسی فریق کے فرستادے ہی ہوسکتے ہیں۔ اصل فریقین کی دوبدوئی میں خون کی گردش کا عالم کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ تو خود کو قابو میں رکھنے والوں کا کام نظر آتا ہے۔ یہ نکتہ پولیس اور بہ طور خاص ورما کے ذہن رسا سے پیوست ہوجانا چاہیے۔

گزشتہ تین چار دن سے بٹھل نے اڈے جانا معمول بنالیا تھا۔ کبھی سہ پہر کبھی شام کو وہ واپس آجاتا۔ کوتوالی میں ہماری پیشی کے پندرھویں روز، دوسرا پہر تھا کہ سن رسیدہ مما کلیلیں بھرتا میرے پاس آیا۔ اس وقت بٹھل گھر پہ نہیں تھا۔ مما نے دھڑکتی آواز میں حویلی کے اطراف پولیس کے ہٹ جانے کا مژدہ سنایا۔ دو دن پہلے اڈے اور شہر کے بہت سے مقامات سے پولیس کے دست کش ہو جانے کی خبر مجھے اس کے بھتیجے سے مل ہی چکی تھی۔ شہر میں زندگی معمول پر آرہی تھی۔ روز و شب کی ضرورتیں ایک حد تک ہی ڈھیل دے سکتی ہیں۔ ضرورتیں بھی قرضے کی طرح ہوتی ہیں۔ بٹھل نے شروع میں منیر علی کے بھانجے اور بیٹے ارشد اور تنویر کو حویلی تک محدود رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ مشورہ حکم کا درجہ رکھتا تھا، پھر چند دن بعد انھیں شہر جانے کی اجازت اس ہدایت کے ساتھ دی گئی کہ وہ گھر واپسی میں دیر نہ لگائیں اور غیر ضروری لوگوں سے سر دست رسم و راہ موخر رکھیں۔ اب کوئی تین چار دن پہلے اپنے کام کی دیکھ بھال کے لیے انھیں بیٹھکوں پر جانے کا اختیار بھی دے دیا گیا تھا۔ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور معاملہ فہم بھی۔ انھوں نے اپنے طور پر دور اندیشی کی۔ بیش تر وقت حویلی میں گزارا۔ اس احتیاط میں خوف بھی شامل ہوگا۔ خوف ہر موقع پر بزدلی نہیں ہوتا۔

یقیناً بٹھل کو حویلی کے محاصرے کے باوجود رفتہ رفتہ ہوا کا رخ اپنے حق میں بدلنے کا اندازہ ہو چلا تھا۔ بہرحال اب حویلی سے پولیس ہٹالی گئی تھی۔ بہ ظاہر یہ دھند چھٹ جانے کی علامت ہے مگر حویلی شہر میں سب سے آخری مقام ہے جہاں مسلح وردی پوش دھرنا دیے بیٹھے رہے۔ یہ حقیقت محل نظر ہے۔ بٹھل کو ہمہ دم اس کا احساس ہوگا، ہونا چاہیے۔

بٹھل نے مجھ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی لیکن میں نے ازخود شہر کا رخ نہیں کیا۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا، کوئی کوتاہی، کوئی نادانی مجھ سے سرزد ہو ہی جاتی تھی اور میں نکل کے کرتا بھی کیا۔ گلو سے شہر بھر کی اطلاعات مل ہی جاتی تھیں۔ دن بھر میں حویلی کے مکینوں کے ساتھ رہتا۔ رات نیساں اور یاسمن کے ساتھ کچھ وقت گزار کے ان کی بشاشت اور خوش نودی کا جیسے کوئی نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ میں ان سب میں شامل رہا۔ شام کو بیڈ منٹن، دن بھر کیرم، نئے نئے کھانوں کے تجربے، خوش گپیاں، مطالعہ، کبھی لائبریری میں، کبھی اپنے کمرے میں، رات کو کسی کمرے میں محفل جمی رہتی۔ میں انھیں خود مدعو کرتا۔ جب میں اکیلا ہوتا تو اپنے سامنے آجاتا تھا۔ میں اپنا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا دل پھر الجھنے، گھبرانے لگتا تھا۔

وہ اٹھارھواں دن تھا۔ صبح ناشتے کے بعد بٹھل نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے منزل پوچھنی چاہی مگر چپ رہا۔ کسی جواب سے حاصل بھی کیا تھا۔ بہرصورت تعمیل واجب تھی۔ کپڑے صاف ستھرے تھے، بٹھل نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ باہر تانگا ہمارا منتظر تھا۔ اتنے دنوں بعد باہر آکے گلیوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے اجنبیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ گیارہ بج رہے ہوں گے۔ دھوپ ہر سو قابض ہو چکی تھی۔ گلو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، سارا کچھ بحال ہونے کے باوجود شہر ٹھہرا ٹھہرا، سہما سہما سا نظر آرہا تھا۔ راستے میں کئی جگہ لوگوں نے چونک کر ہماری طرف انگلیاں اٹھائیں۔ لگتا تھا، اتنے دنوں میں سب لوگ بٹھل کو پہچان گئے ہیں۔ چوک میں اڈے کے آدمی گشت پر تھے۔ ہمیں دیکھ کے چہکنے لگے۔ وہ اس کے تیور شناس تھے۔ کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جس سڑک سے اڈے کی طرف راستہ جاتا تھا، تانگا وہاں سے آگے گزر گیا تو مجھے گھٹن ہونے لگی اور جلدی دور ہوگئی۔

کوتوالی کی عمارت کے سامنے تانگا رک گیا۔ عمارت میں سپاہیوں کی ایک بڑی نفری ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی اور پہلے جیسی چہل پہل نہیں تھی۔ ان میں کئی ہمارے صورت آشنا تھے۔ ہمیں یوں عمارت کی طرف بڑھتا دیکھ کے وہ گڑبڑا سے گئے اور دو سپاہیوں نے تیزی سے عین ہمارے مقابل آکے روکھی آواز میں ہماری آمد کا مقصد جاننا چاہا۔ ورما کا نام سن کے ان کے جسم تن گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مضطرب نظروں سے دیکھا۔ انھیں متذبذب چھوڑ کے ہم عمارت میں داخل ہوگئے۔ دونوں سپاہی لمحوں کے تامل کے بعد ہمارے پیچھے لپک پڑے اور انھوں نے ہمیں ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ ایک سپاہی راہداری میں آگے چلا گیا۔ وہ فوراً ہی لوٹ آیا اور ایک کشادہ اور صاف کمرے میں ہمیں لے گیا۔ وہ کوئی نیا پولیس افسر تھا۔ پینتیس سے چالیس کے درمیان عمر، رنگ سرخی، قد مناسب، الٹی مانگ نکالے ہوئے۔ کڑک وردی پہنے ہوئے تھا۔ رسمی سلام کے بعد بٹھل نے نرمی سے کہا "اپنے کو بڑے صاحب، ورما جی سے ملنا ہے۔"

"کیا کام ہے؟" پولیس افسر نے ناگواری سے پوچھا۔

"انہی کو ملنا ہے صاحب!"

"کس واسطے؟" پولیس افسر کے لہجے میں درشتی آگئی۔

"ان کو معلوم ہے، استاد بٹھل بولو گے تو پورا سمجھ جائیں گے۔"

"اوہ، استاد بٹھل!" پولیس افسر کرسی پر مچل سا گیا۔ اس کی متجسس نگاہیں بٹھل کے چہرے پر اٹک گئیں "بہت نام سنا ہے تمہارا۔"

"ادھری آپ نئے نئے آئے ہو؟"

"ہاں، تین چار دن ہی ہوئے لیکن باربار تمہارا نام سنا ہے" پولیس افسر کے لہجے میں طنز نمایاں تھا پھر نخوت سے بولا "کیوں ملنا چاہتے ہو بڑے صاحب سے؟ وہ اس وقت میٹنگ میں ہیں۔"

"اپنے پاس ٹائم ہے۔"

"ہم کو بولو کیا بات ہے؟"

"تھوڑی اپنی ان کی بات ہے" بٹھل نے سرسری انداز میں کہا "آپ جان کے کیا کرو گے؟"

پولیس افسر کی آنکھوں میں خشونت اتر آئی، چہرے پر

LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH:5556532
PROP: ALI KHAN

تناؤ بڑھتا، کم ہوتا رہا۔ اس نے سر کو جھٹکا [illegible] کرکے کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کی ہدایت پر ہم کمرے کے باہر بنچ پر بیٹھ گئے۔

کوئی دس منٹ بعد وہ راہ داری میں واپس آتا دکھائی دیا اور اس نے ہمیں دوبارہ کمرے میں آنے کی دعوت دی اور اس بار کرسیوں پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے بتایا کہ ورما ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہے اور میٹنگ کے اختتام کا کچھ طے نہیں ہے۔ باہر سے کئی پولیس افسران آئے ہوئے ہیں۔ وہ اندر نہیں جا سکا لیکن اس نے پہرے دار کے ہاتھ رقعہ بھیج کے ہماری آمد سے ورما کو مطلع کیا تھا۔ پولیس افسر کے ہاتھ میں ایک مختصر رقعہ دبا ہوا تھا جو اس نے ہماری طرف بڑھا دیا پھر شاید یہ سوچ کے کہ ہم اسے پڑھنے سے قاصر ہوں گے، وہ رقعہ میز پر رکھنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔ یہ جسارت ایسی گستاخانہ بھی نہیں تھی۔ پولیس افسر نے پہلے ہی رقعہ ہماری طرف بڑھایا تھا، شاید اسی لیے اس نے برا بھی نہیں مانا، صرف کندھے اچکا کے اور منہ بنا کے رہ گیا۔ مجھے پڑھنے میں دیر نہیں لگی۔ پولیس افسر کی جانب سے ہماری آمد اور ملاقات کی خواہش اور نیچے ورما کا جواب رقعے پر سادہ اور مختصر لفظوں میں مندرج تھا۔ دونوں تحریریں انگریزی میں تھیں۔ ورما نے جواب میں لکھا تھا کہ وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتا۔ ملاقات کا مقصد معلوم کیا جائے۔

"تم، تم انگریزی جانتے ہو؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"تھوڑی بہت" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

بہت خوب، تم تو جامو استاد کے ڈیرے کے آدمی ہو؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو تم لوگ، مجھے بتاؤ۔" اس کی آواز میں ہیجان چھپا ہوا تھا "بڑے صاحب تک تمہارا پیغام پہنچا دیا جائے گا" وہ انگریزی میں بولا پھر شاید بھٹل یا میری کم فہمی کے خیال سے ہندوستانی میں اپنا مدعا بیان کرنا چاہا۔

بھٹل نے اس کی بات پوری نہیں سنی، ہاتھ اٹھا کے بولا "ٹھیک ہے صاحب، ان کو بولو، اپنے کو اب ادھری سے باہر جانا ہے۔ جتنا ہم نے بولا تھا، اتنا کام پورا کر لیا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟" پولیس افسر نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

"صاحب بہادر کو پتا ہے۔" بھٹل نے سپاٹ لہجے میں کہا اور یہ کہتے ہی اٹھ گیا۔ پولیس افسر اس طرح ہمارے اٹھ جانے پر حیران و پریشان ہوا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے بھٹل ٹھہر گیا اور نسبتاً اونچی اور بھاری آواز میں کہا کہ ورما کو بتا دیا جائے، ابھی تین چار دن تک ہمارا قیام یہیں ہے۔ ہماری کوئی ضرورت ہو تو ہمیں بلا لیا جائے یا کسی کو حویلی بھیج دیا جائے۔ آنے والے دنوں میں ہم مسلسل سفر میں رہیں گے اور کوشش ہوگی کہ کلکتے میں استاد جامو کو اپنے آئندہ ٹھکانوں سے آگاہ کرتے رہیں۔ اس دوران ہم مطلوب ہوں تو استاد جامو کو مطلع کر دیا جائے ہمیں پیغام مل جائے گا۔

اس پیغام رسانی میں کچھ دیر لگ سکتی ہے لیکن پولیس نے جس طرح اب تک ہم پر اعتماد کیا ہے، آئندہ بھی وہ تسلی رکھے، جب بھی ہمیں طلب کیا جائے گا، ہم جلد یا بدیر حاضر ہو جائیں گے اور واضح رہے، پولیس نے ہم سے رابطہ کیے بغیر یہاں ہمارے متعلقین سے کسی قسم کی بازپرس کی تو ہم سے کوئی امید نہ رکھی جائے پھر ہم وہی کریں گے جو اپنے دفاع میں ہمیں کرنا چاہیے۔ بہتر ہوگا، پہلے ہمارا انتظار کیا جائے۔

پولیس افسر کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کے نتھنے پھول گئے تھے اور ہونٹ کچھ کہنے کے لیے دھڑک رہے تھے، بھٹل کمرے سے نکل گیا۔

○☆○

رات کو کھانے کے بعد حقہ نوشی کرتے ہوئے بھٹل نے بتایا کہ اب سفر درپیش ہے۔ اسے جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا ہے۔ اس وقت تقریباً سبھی موجود تھے۔ بیٹھک میں سکوت چھا گیا۔ یہ سکوت بڑا فطری تھا۔ انہیں دشواری پیش آ رہی ہوگی کہ وہ سوگواری کا اظہار کریں یا مسرت کا۔ ان کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ آنکھیں بہت چھوٹی موٹی ہوتی ہیں، غم کی تاب لا پاتی ہیں نہ خوشی کی۔ اس اطلاع میں ہماری جدائی کی اداسی کے ساتھ سکون کا ایک پہلو بھی مضمر تھا، ہماری روانگی، ہمارے حق میں ہونے والے کسی فیصلے کی نوید کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ایسے فیصلے کے شدت سے آرزو مند ہوں گے۔ اس میں ایک طرف کسی بڑے عتاب سے ہماری برات، دوسری طرف خود ان کے، حویلی کے مکینوں کی عزت و عافیت کی تجدید کی سرخوشی نہاں تھی۔ انہوں نے بھی یہ دن پوری نیند نہیں گزارے ہوں گے۔ تھا کر بستی کی واردات پر انہوں نے ہم سے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا لیکن انہیں اچھی طرح دیکھنا، سننا اور محسوس کرنا آتا تھا اور حویلی کی دیوار کتنی ہی اونچی ہوں، حویلی میں بہت سے دروازے، دریچے اور روزن تھے۔ گرم و سرد ہوائیں تو خانوں میں در آتی ہیں۔ انہوں نے یہاں آ کے اپنی تربیت کی تھی اور یہ رمز جان لی تھی کہ کون سی بات کس وقت کہنی اور پوچھنی چاہیے۔ انہیں اپنی اور ہماری نسبتوں کی پائداری کا یقین تھا۔ ہمارے درمیان تعلق خاطر کی ایک وضع خود بخود طے ہو گئی تھی اور یہ ہم دونوں کو بڑی عزیز تھی۔

اس رات بھٹل رات گئے تک بیٹھک میں موجود رہا۔ اس کی فرمائش پر نیساں نے کئی غزلیں سنائیں۔ اس رات نیساں کی آواز بھی جولانی پر تھی۔ وہ جو کہتے ہیں، واقعی رنگ چھا دیا۔ جی چاہتا تھا، رات بھر وہ گاتی رہے اور رات کبھی ختم نہ ہو۔ باورچی خانے سے گرم گرم قہوہ آتا رہا اور وہ گاتی رہی۔ پھر اس کے اشارے پر بھٹل نے جیسے یاسمن کی کوئی چوری پکڑ لی۔ میرے لیے یہ انکشاف تھا۔ سب یاسمن کے پیچھے پڑ گئے۔ پہلے تو وہ بہت شرمائی، لجائی۔ بالکل چھرا سی گئی لیکن زریں، خانم اور اپنی بہن فروزاں کے اصرار اور حوصلہ افزائی پر اس نے مخصوص فارسی ترنم میں عمر خیام کی تین رباعیاں سنا کے سبھی کو گم صم کر دیا۔ لحن داؤدی پھر کسے کہتے ہیں۔ شاید کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یاسمن میں یہ گن بھی ہے۔ بڑی رس بھری، رنگ بھری آواز تھی اس کی۔ بھٹل آنکھیں موندے سر جھکائے سر ہلاتا رہا۔ ہر زبان کا اپنا ایک خاص ترنم اور تکلم ہوتا ہے۔ فارسی کلام خالص ایرانی لب و لہجے میں اور موثر ہو گیا تھا۔ فروزاں اور غالباً زریں کے سوا معانی و مفاہیم بہت کم کسی کی سمجھ میں آ رہے ہوں مگر آہنگ کا بھی اپنا ایک اثر اور سحر ہوتا ہے، لے اور تال کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ سر کسی زبان سے مشروط نہیں ہے۔ الاپ بھی محض آواز ہوتا ہے۔

بھٹل کے اٹھ جانے اور اپنے کمرے میں چلے جانے کے بعد بھی سب وہیں بیٹھے رہے۔ پھر زریں، نیساں، یاسمن، فروزاں، زہرہ، اس کی چھوٹی بہن سلمٰی اور بڑی سلمٰی میرے کمرے میں چلی آئیں۔ جہانگیر اور مجو میاں بھی آ گئے۔ صبح کاذب کے وقت زریں کے ٹوکنے پر انہوں نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی۔ صبح سبھی دیر سے اٹھے۔ ناشتا بھی دیر سے ہوا۔ بھٹل صبح سویرے اڈے چلا گیا تھا۔ مغرب کے وقت واپس آیا۔ سارے گھر میں دن بھر ہنگامہ سا رہا۔ طرح طرح کے دیگی پکوان پکتے رہے۔ زریں نے اپنے پرانے درزی کو بلوا لیا تھا۔ میرے اور بھٹل کے پاس کپڑوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور بھٹل سفر میں زیادہ سامان لے کر چلنے کا قائل بھی نہیں تھا۔ مختلف جگہوں پر کپڑے دھلوا دھلوا کے ہم کام چلا لیتے تھے۔ حیدر آباد میں نئے سلوانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ دگنی سلائی پر درزی نے ایک دن میں کئی جوڑے تیار کر دیے۔ اعلیٰ درجے کے لباس کا نہ بھٹل کو شوق تھا نہ مجھے۔ درزی کے ناپ لینے پر معلوم ہوا کہ زریں میرے لیے شیروانی سلوا رہی ہے، میں نے منع کیا کہ واسکٹ ہی میرے لیے موزوں ہے۔ شیروانی میں آدمی بہت نمایاں ہو جاتا ہے اور اسے کون سنبھالے پھرے گا۔ بچپن میں کبھی باقاعدہ شیروانی پہنی تھی۔ کسی تقریب میں تو شیروانی پہن کے جانا بہرحال لازم تھا۔ زریں نے ایک نہ سنی۔ درزی کو سخت احکام دیے گئے تھے کہ دوسرے دن وہ آخری ناپ کے لیے کچی سلائی کی سیاہ شیروانی لے کے حاضر ہو گیا۔ رات بھر وہ اور اس کے کارندے اسی پر مشق کرتے رہے ہوں گے۔

بھٹل نے روانگی کے دن کا اعلان نہیں کیا اور اس کا کیا ٹھیک تھا، کب اچانک سامان اٹھا لے۔ اتنے دن حویلی میں رہنے کے بعد سفر کے خیال سے اب جی کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ مگر جانا تو تھا ہی۔ گزشتہ رات میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ کوشش کریں گے، اب کے اتنا وقت نہ صرف ہو۔ درمیان میں کچھ عرصے کے لیے آ جایا کریں گے۔ زریں بھی سن رہی تھی، دبی زبان سے کہنے لگی "اس طرح کیوں کہئے۔ دعا کیجئے کہ اس کے بعد کسی ایسے سفر کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس بار ہی سرخ روئی نصیب ہو۔ کسی ایک سفر میں تو یہ ضرور ہو گا، سو اسی مرتبہ ہی کیوں نہ ہو" جواب میں، میں کیا کہتا۔ ہر بار یہی توقع تو ہوتی ہے مگر یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ یہ زمین آدمی کی نسبت سے بہت بڑی ہے۔ اتنی بستیوں، شہروں اور انسانوں کے اتنے ہجوم میں ایک آدمی کی تلاش کوئی آسان کام نہیں۔ کاش آدمی کی کئی آنکھیں ہوا کرتیں۔ یوں بھی ہر شخص کو صرف آدھا نظر آتا ہے۔ اسے تو صرف سامنے کا نظر آتا ہے۔ عقب کی ایک دنیا اوجھل رہتی ہے اور سامنے کا بھی کتنا نظر آتا یا آ سکتا ہے، بس ایک دیوار تک، اور دیوار نہ ہو تو بینائی خود دیوار بن جاتی ہے۔

دو دن بعد میں نے نصیر بابا کو ساتھ لیا۔ کچھ نقدی میرے پاس تھی، کچھ بھٹل سے مانگ لی۔ نصیر بابا کو اس خیال سے ساتھ رکھا تھا کہ کسی کے ساتھ میں سنبھلا رہوں گا حالانکہ یہ احتیاط اپنے آپ سے حجت کے مترادف تھی۔ میں نے خود کو چھپانے کی بہت خواہش کی لیکن چوک سے کچھ آگے اڈے کے دو آدمیوں سے سامنا ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بے قابو ہونے لگے۔ سلام دعا کر کے میں نے ان سے صاف معذرت چاہ لی کہ مجھے کچھ ضروری ذاتی کام درپیش ہیں۔ دونوں تملا کے رہ گئے۔ جتنے پیسے میری جیب میں تھے، کپڑوں اور زیوروں کی

خریداری میں تمام کروا لے۔ ایک بالی مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کا دائرہ درمیانے درجے کا تھا اور نگینے جڑے ہوئے تھے۔ سنار کے پاس تین چار جوڑیاں ہی تھیں۔ میرے اصرار پر وہ شش و پنج میں پڑ گیا اور اس نے کسی اور جگہ جانے نہیں دیا۔ کچھ مہلت طلب کی اور جانے کہاں سے بھاگ دوڑ کر کے وہ اور اس کے ملازم کم و بیش اسی طرز کی بالیاں مطلوبہ تعداد میں اکٹھی کرلائے۔ اتنی دیر میں' میں نے کچھ اور کپڑے خریدے۔ کپڑوں میں یکسانی ضروری نہیں تھی۔ مجھے انتخاب کا سلیقہ آتا تھا نہ خریداری کا ایسا تجربہ تھا۔ بس جو کپڑا سب سے زیادہ مہنگا' دیکھنے میں خوش نما اور چھونے میں نرم و لطیف لگا' میں الگ کرتا رہا۔ واپسی میں اچھا خاصا گٹھر بن گیا۔ ہم لدے پھندے گھر لوٹے۔ بٹھل اڈے پر گیا ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میرے اشارے پر نصیر بابا نے خانم کی خدمت میں گٹھری پیش کردی۔ ان کے چہروں کی تابانی دیکھنے کے لائق تھی۔ گو میں نے دکان دار سے کہہ دیا تھا کہ کوئی چیز پسند نہ آنے کی صورت میں واپس کردی جائے گی۔ شکر ہے' سبھی کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ ارشد' تنویر' بجو میاں اور جہانگیر کے لیے انگریزی سوٹ اور شیروانی کا کپڑا میں نے الگ خریدا تھا۔ نصیر بابا' مما' اس کے بھتیجے گلو اور دیگر ملازمین کا بھی خیال رکھا تھا۔ بالیاں لیتے وقت گنتی میں کچھ چوک ہو گئی۔ ایک بالی بچ گئی۔ میں نے اسے خانم کے سپرد کردیا۔

تحفہ کتنا ہی قیمتی یا بے حیثیت ہو' اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ رات کو کھانے کے بعد میں نے دیکھا۔ بٹھل بھی حیران ہوا۔ سب نے وہی بالیاں پہنی ہوئی تھیں اور بالیاں ان پر خوب سج رہی تھیں۔ روشنی میں بالیوں کے رنگ برنگے نگینے دمک رہے تھے۔ ان سب کی آنکھیں بھی دمک رہی تھیں اور یہ روشنی جیسے میرے سینے میں اتر رہی تھی۔

چار دن گزر گئے۔ بٹھل نے روانگی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ روز اڈے جا رہا تھا۔ جانے اب کیا رکاوٹ تھی۔ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔ مما کے بھتیجے گلو نے بھی ان دنوں شہر سے متعلق کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی' بس یہی کہ شہر بتدریج اپنے پرانے روز و شب کی طرف واپس آرہا ہے' پولیس کا گشت جاری ہے لیکن پولیس اب دور دور ہی رہتی ہے۔ ہاں' گلو سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ٹھاکر بستی کا ملبہ کریدنے' کھرچنے' واردات کی رات بچ جانے اور حویلی میں موجود نہ رہنے والے ٹھاکروں کے اہل کار اور عام کسانوں سے تفتیش پر پولیس نے ساری توجہ مرکوز کی ہوئی ہے۔ ابھی تک باہر سے افسران کی آمد و رفت جاری ہے۔ ان میں گورے افسر بھی ہیں۔ صبح و شام پولیس کی گاڑیاں ٹھاکر بستی کی طرف آتی جاتی نظر آتی ہیں اور شہر کے لوگوں کا وہی عالم ہے' صبح کوئی رائے قائم کرتے ہیں' شام کو کوئی اور قصہ سناتے ہیں۔

بٹھل کے ذہن نشین ہوگا کہ چار دن پہلے کوتوالی میں حاضری کے وقت جس نوجوان پولیس افسر سے ہمارا واسطہ پڑا تھا' اس نے کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ شہر میں اس کا تبادلہ ہوئے چند ہی دن ہوئے ہیں اور اس نے متعدد بار بٹھل کا نام سنا ہے۔ یہ نام بے سبب تو نہیں لیا جا رہا ہوگا۔ شہر میں ہماری موجودگی کی تصدیق کے لیے حویلی آنے والے پولیس افسر نے بٹھل کو محتاط رہنے کی صلاح دی تھی' پھر کوئی نزاکت ہی بٹھل کو روکے ہوئے ہے۔ کیا شہر' اطراف اور خصوصاً حویلی سے پولیس کا ہٹ جانا محض ایک سراب ہے۔ ہمارے لیے کوئی ذہنی آسائش اور رہائی سارا کچھ جوں کا توں ہے۔ ایسا ہوتا تو.... اس دن کوتوالی میں بٹھل صاف طور سے متنبہ کر آیا تھا کہ اب وہ شہر سے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پولیس کو روکنا ہوتا تو ضرور کوئی کارروائی کرتی۔ اس خاموشی سے یہی ظاہر ہے کہ ہمارے شہر میں موجود رہنے نہ رہنے سے پولیس کو کوئی غرض نہیں ہے۔ کیا معلوم' بٹھل اب پابندی سے اڈے جا رہا ہے' اس دوران میں پولیس کا کوئی قاصد یا حکم لے کے اڈے آیا ہو اور بٹھل نے روانگی موخر کردی ہو۔ کسی کی تعمیل میں یا از خود حفظ ماتقدم کے طور پر۔ کون جانے' یہ سلسلہ کہاں جا کے ختم ہو۔ معذور کے پاس اپنی بے جانی و بے حالی سے مفاہمت کے سوا کیا چارہ رہ جاتا ہے۔ لاعلمی بھی ایک معذوری ہے اور مجھے اپنی یہ ناتوانی و ناداری تسلیم کرتے رہنا چاہیے۔

پانچویں دن بٹھل ناشتے کے بعد معمول کے مطابق اڈے جانے کے لیے تیار تھا اور بیٹھک میں حقے کے آخری کش لے رہا تھا کہ ملازمہ شکوراں بی نے آکے مطلع کیا' کوئی مہمان موٹر میں بٹھل سے ملنے آیا ہے۔

"موٹر میں؟" میں نے چونک کے پوچھا "کون' کون؟"

بٹھل نے حقہ چھوڑ دیا۔ شکوراں بی کو اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ اڈے یا پولیس کا کوئی آدمی ہوتا تو مما' شکوراں بی کو کوئی حوالہ ضرور بتاتا۔ اڈے سے مستقل آنے والوں کے نام اسے ازبر تھے۔ میں نے عجلت کی اور بیٹھک سے اتر کے ڈیوڑھی کی طرف لپک پڑا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوتے بٹھل کے آنے کے انتظار میں' میں نے کھل کیا۔

مجھے کوئی جھٹکا سا لگا۔ میری طرح بٹھل کو بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا ہوگا۔ ڈیوڑھی میں کرسی پر پولیس افسر ورما بیٹھا تھا۔ مجھے تو کسی خواب کا گمان ہوا۔ ورما تنا تھا اور سوٹ اور ٹائی میں ملبوس نہایت تازہ تازہ لگ رہا تھا "صاحب' آپ؟" بٹھل نے تعجب سے کہا "کوئی خبر بھی نہیں کی۔" بٹھل نے اسے سلام کیا۔ میں بے حس و حرکت کھڑا ورما کو دیکھتا رہا۔

"ہاں استاد تم نے اس روز حویلی آنے کی دعوت دی تھی۔ یاد ہے؟ سوچا' اس سے پہلے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ' تم سے مل لیں۔" ورما کے چہرے پر نہ نرمی تھی نہ ترشی۔ اس کا لہجہ بھی کسی قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا رہا۔

"آپ نے مان بڑھایا صاحب' کسی کو بول دیتے' ہم آجاتے۔" بٹھل نے سادگی سے کہا "اپنے کو سمجھ میں نہیں آرہا' کیا بولیں۔ سب ٹھیک تو ہے صاحب؟"

"ہاں ہاں۔" وہ آنکھیں چڑھا کے بولا "ابھی تک تو سارا ٹھیک ہے۔ دھیرج رکھو' کوئی پرچی وریچی لے کے نہیں آئے۔"

"وہ تو صاحب پرچی نکلتی تو آپ ادھری کیوں ہوتے۔" بٹھل نے مسکراتے ہوئے کہا "آؤ صاحب اندر آؤ' اندر آؤ۔"

ورما نے کوئی تکلف نہیں کیا' کرسی سے اٹھ گیا' بٹھل نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ورما نے آگے جاتے ہوئے پہلے بٹھل کو دروازے میں داخل ہونے کی پیش کش کی۔ بٹھل آگے چلا گیا "آؤ صاحب ادھری سے۔" ڈیوڑھی سے نکل کے اس نے دائیں جانب چلنے کا اشارہ کیا۔ ورما نے اندر آتے ہی' سر گھما کے ایک سرسری نظر حویلی کے اندرونی حصے پر ڈالی پھر بٹھل کی معیت میں تیزی سے چند قدم کا فاصلہ طے کر کے بیٹھک کے قریب آگیا۔ بٹھل نے جوتے اتارے تو اس نے بھی تقلید کی۔ ہمیں اندر مطلع کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ زہرہ اور زریں بیٹھک میں موجود تھیں۔ ہمارے ساتھ ایک اجنبی دیکھ کے وہ سٹ پٹا گئیں اور منہ چھپائے یک دم بیٹھک سے نکل جانا چاہتی تھیں کہ بٹھل نے انھیں روک لیا۔

دونوں نے سروں پر دوپٹے اس طرح ڈھانپ لیے کہ ان کے چہرے آدھے چھپ گئے۔ اندر جانے والے دروازے کے پاس دیوار سے چپک کے وہ سکڑی سمٹی کھڑی رہیں۔ "یہ ورما صاحب ہیں بیٹا! پولیس کے بڑے اونچے افسر۔ ان سے پردہ نہیں۔ یہ اپنے گھر آئے ہیں۔" بٹھل نے بلند آواز میں کہا "اور صاحب' یہ دونوں بیٹیاں ہیں اپنی۔ ایک کا نام زری ہے' دوسری کا زہرہ۔" بٹھل کے لہجے سے فخر و ناز چھلک رہا تھا۔ زہرہ اور زریں نے اضطراری انداز میں سر کے ایک خفیف خم سے ورما کو آداب کہا۔

"اب جاؤ' جا کے بڑے صاحب کے لیے کچھ چائے پانی کا کرو۔"

"نہیں نہیں' اس کی ضرورت نہیں۔" ورما نے ہاتھ اٹھا کے شدت سے منع کیا۔

"کیا صاحب' ادھری آکے ایسے چلے جاؤ گے آپ۔" بٹھل شکایتی شکایتی لہجے میں بولا۔ "ادھری کوتوالی میں ہم آپ کے بندی تھی' ادھر آپ ہمارے گھر میں ہو۔" بٹھل کو یکا یک خیال آیا اور وہ متردد آواز میں بولا "آپ کو اپنے ہاں جل پان کرنے میں کوئی...."

"نہیں نہیں۔" ورما نے فوراً تردید کی۔ "ہم بہت دنوں ولایت میں رہے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے صاحب۔" بٹھل نے شگفتگی سے کہا "اب ہم پہ چھوڑو' دیکھو' اپنی راج کماریوں کے ہاتھ میں کیسا سواد ہے۔ بول دیتے ہیں' لوٹ کے بھی آؤ گے۔"

ورما کا جسم پینترا کے رہ گیا۔

میں نے نہیں دیکھا' زہرہ اور زریں کس لمحے بیٹھک سے نکل گئیں۔

"آپ کو دیکھ کے اپنا من بھی ولایت جانے کو ہمکتا ہے۔" بٹھل نے خوش دلی سے کہا "آدمی آپ جیسا ہو جاتا ہے تو ایک بار سب کو ادھری کا چکر لگانا چاہیے۔"

ورما کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی "وہاں کی بات دوسری ہے۔" وہ خوابیدہ سی آواز میں بولا۔

"ہاں صاحب' ایسا ہی سنتے ہیں۔ گوروں میں کچھ الگ سے ہوگا۔ سارے میں انہی کا ٹھپا چلتا ہے۔"

"ان کے پاس گیان ہے۔" ورما کی آواز میں مایوسی شامل تھی۔

بٹھل نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے سنا اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ "آپ ٹھیک سے بیٹھو صاحب' تھوڑا آرام سے۔" اس نے گاؤ تکیہ ورما کے آگے کردیا۔

انگریزی لباس کو فرشی نشست سے مناسبت نہیں ہے لیکن ورما نے لباس کی پروا نہیں کی۔ تکیے سے ٹیک لگا کے کسی قدر پاؤں پھیلا لیے۔ اس کے سکون سے میری رگوں

کے بل کھل رہے تھے۔ "کب جارہے ہو؟" اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"بس آج کل میں صاحب۔"

"کس طرف جانا ہے؟"

"ایک ٹھکانا ہو تو بولیں۔"

"کس کام سے؟" ورما نے بہ ظاہر سادگی سے پوچھا۔

"آپ کو بولا تھا' اپنے کو کسی کی کھوج ہے۔" بٹھل نے گہری سانس لی۔

"کون ہے' کون ہے وہ؟"

"کیا بولیں صاحب۔" بٹھل کی آواز بجھنے لگی "اچھا ہے' مت پوچھو۔"

"نہیں پوچھتے" ورما سر جھٹک کے بولا۔

"آپ کی ٹھاکر بستی سے اس کا کوئی ناتا نہیں ہے۔"

ورما کے چہرے پر لہریں گزر گئیں پھر وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا اور تیکھے لہجے میں بولا "تو جس کا ٹھاکر بستی سے ناتا ہو' اس کی بات کرو۔"

"لگتا ہے' سوئی اٹک گئی ہے۔"

"ہاں استاد' ایسا ہی ہے بچھو' کتنی چابی بھرو' سوئی ایک جگہ پہ آکے پھنس جاتی ہے۔" ورما نے سنجیدگی سے کہا "آس پاس کوئی اور دکھائی نہیں دے رہا۔"

"پھر صاحب' آپ کے سنگ چلیں۔"

"اس کا سے نہیں آیا لیکن آجائے گا۔"

"پر اپنے کو اب آگے جانا ہے۔"

"معلوم ہے۔" ورما سر ہلا کے بولا "کتنے آگے جاؤ گے' ہندوستان کے پار؟"

"یہی بہت بڑا ہے صاحب۔"

"لیکن راج ایک ہی ہے۔"

"اپنے کو آپ نے کیا جانا ہے؟"

ورما نے کچھ توقف کیا اور جیسے خود سے مخاطب ہو' بدبداتے ہوئے بولا "تم جیسا نہیں دیکھا۔"

"کچھ زیادہ ہی جان لیا آپ نے۔"

"نہیں استاد' لگتا ہے' ابھی بہت کم ہے لیکن ابھی تو گیان دھیان چل رہا ہے۔ آگے دیکھو' اور کیا کیا دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے۔"

"ایک بات پوچھیں صاحب؟" بٹھل کی آواز میں کوئی کجی نہیں تھی "دیر کا ہے کی ہے؟"

"ہاں استاد! یہ سوال اچھا ہے۔ ہمارے ساتھی بھی کل یہی بول رہے تھے' دیر کیوں کرتے ہو صاحب۔"

"پھر آپ نے کیا بولا؟"

"جواب تم بھی جانتے ہو۔"

"اور جواب یہی رہے گا۔"

"نہیں استاد' اتنی جلدی ہاتھ پیر نہیں ڈالتے ہم۔"

"پر ایک دن ڈال دو گے۔ اگلے چلنے پہ دیوار دکھائی نہیں پڑتی۔"

"دیکھتے ہیں۔" ورما بے نیازی سے بولا "پہلا مل گیا ہے تو دوسرا بھی مل جائے گا۔"

"یہ تو بھجنے پہ ہے صاحب' کتنا بڑا ہے۔ کبھی دوسرے کے چکر میں پہلا بھی ہاتھ سے نکل پڑتا ہے۔"

ابھی تک دونوں کے چہروں پر کشیدگی اور لہجوں میں کدورت نہیں تھی لیکن نظر آرہا تھا کہ کسی بھی وقت یہ طرز کلام تلخی میں بدل سکتی ہے۔ بٹھل کو بھی اس کا احساس ہوگا اور اسے حویلی میں ورما کی آمد کا سبب متعین کرنے کی جستجو یقیناً ہوگی۔ ورما کو آخر اچانک اڈے یاروں سے متعلق ایسے اجنبیوں کے گھر آنے کی کیا ضرورت تھی جنہیں وہ آلودہ قرار دینے کے درپے تھا گو اس کا اظہار کنایتہً کیا مگر کنایے میں کوئی ابہام بھی نہیں تھا اور بے شک ایک دوسرا امکان بھی قیاس کیا جاسکتا تھا کہ یوں منہ اٹھائے حویلی میں آنے سے مراد خود اس کے اپنے ہاں کا کوئی ابہام ہے۔ اچھا ہوا' شکوراں بی نے آکے کچھ دیر کے لیے دونوں کو خاموش کردیا۔ وہ دسترخوان لے کے آئی تھی۔ میں نے دسترخوان بچھانے اور چینی کی پلیٹیں' چمچے ورما اور بٹھل کے آگے رکھنے میں شکوراں بی کی مدد کی۔ وہ چلی گئی تو ورما کی تیور بھری آواز بیٹھک میں گونجی "ہم کبھی ناکام نہیں ہوئے استاد۔"

"اس بار بھی کیوں ہوگے صاحب۔"

"ہونا نہیں چاہیے۔" ورما عزم سے بولا۔

"اسی لیے تو آپ کو ادھری بھیجا ہے' کچھ جان بوجھ کے' پہلے کا دیکھ کے ہی۔"

"اور اس بار ہم ناکام ہوئے تو پولیس چھوڑ دیں گے۔"

"کیوں صاحب' آپ اکیلے تو ادھری نہیں ہو۔ ایک بار نشانے پر نہیں بیٹھا تو پچھلے پر پانی پڑ جائے گا کیا؟"

"ان کا نہیں۔" "ہمیں کسی کی فکر نہیں۔ یہاں گورے افسر بھی آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں تو اپنی فکر ہے۔ اپنے آپ کا بھی تو سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

"ایسا ہے تو ایک دن آپ پہنچ جاؤ گے۔"

"پہنچ تو ہم اب بھی گئے ہیں۔" ورما کے لہجے میں پہلی مرتبہ نخوت کی جھلک دکھائی دی۔

"پھر کھنچوا دو صاحب۔"

"ہم راج گدی پر نہیں بیٹھے۔"

"یہ تو پرجا کے بھاگ ہے۔"

ورما کی آنکھوں میں سرخی کوندی لیکن اس نے سرد آواز میں کہا "پولیس بھی بندھی ہوئی ہے۔ اس کے ہاتھ کتنے ہی لمبے ہوں' چھوٹے پڑجاتے ہیں۔"

"ادھری کون کھلا ہے اور کون سارے پہ بھاری ہے۔ چھور (کنارہ) ہنا تو کوئی نہیں' کچھ بھی نہیں۔" بٹھل زیر لب سے بولا "اپنے کو معاف کرنا' پھر پہنچنا کیسا صاحب؟"

"ہاں۔" ورما کا چہرہ سوچ سا گیا "تم ٹھیک کہتے ہو۔"

دروازے پہ آہٹیں نمودار ہونے پر وہ پھر منتشر ہوگئے۔ دروازے کے پاس مجھے زریں' زہرہ اور نیساں کے چہرے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں خوان پوشوں سے ڈھکے تشت تھے۔ میں نے جلدی سے دروازے کا رخ کیا' زہرہ کے ہاتھ سے تشت لیا۔ اتنے میں جہاں گیر بھی آگیا۔ تشت ہمارے حوالے کرکے وہ تینوں پلک جھپکتے میں غائب ہوگئیں۔ میں نے خوان پوش ہٹائے تو ورما بے قرار ہوگیا "یہ کیا ہے استاد!" وہ تشتوں میں نفاست سے رکھی چیزیں دیکھ کے حیرانی سے بولا۔

"آپ کو پتا ہے' ہم نے کچھ نہیں بولا تھا۔ آپ شروع کرو صاحب' سارا تازہ تازہ ہے۔"

کئی قسم کی شیرینی' کئی قسم کا نمکین' خشک میوہ' پھل' ایک تشت میں چائے دانی' پیالیاں' چمچے' کانٹے' چھری اور پھلوں کے رس سے بھرا شیشے کا جگ' سارے برتن چمکتے دمکتے ہوئے۔

ورما نے ابتدا میں تکلف سے کام لیا تھا پھر اس سے رہا نہیں گیا اور اس کی آنکھوں کی تابانی فزوں ہوتی گئی۔ کہنے لگا کہ وہ ناشتہ کرکے گھر سے چلا تھا۔ ہم دونوں بھی ناشتہ کرچکے تھے لیکن میزبانی کے آداب واجب تھے۔ ادھر زریں نے کچھ زیادہ ہی اہتمام کرلیا تھا۔ ورما داد و تحسین میں کفایت کا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں۔ یہی تو شعر کی خوبی ہے کہ سننے اور پڑھنے والے کو متلاطم کردے۔ بتدریج اس کے ہاتھ کھلتے گئے اور زبان بھی رواں ہونے لگی۔ مجھے معلوم تھا' لوکی کے حلوے کی ترکیب خانم نے زریں کو تعلیم کی تھی۔ حیدرآباد میں پہلی بار ہم نے نواب ثروت کے ہاں یہ حلوہ کھایا تھا۔ زریں نے اپنی طرف سے کچھ ترمیم و اضافہ بھی کیا ہوگا کہ ذائقہ اور سوا ہوگیا تھا۔ زعفران کی آمیزش نے اسے اور اشتہا انگیز کردیا تھا۔ چاندی کے ورق اور طرح طرح کے میووں سے اس کی آرائش کی گئی تھی۔ ورما کو بہت مرغوب ہوا اور اس نے تکیلی آواز میں پوچھا "تم یہی کچھ کھاتے ہو استاد؟"

"کیوں صاحب؟" بٹھل نے تجسس ظاہر کیا۔

"سوچتے تھے' اس گری' تیزی پھرتی کا کوئی کارن تو ہوگا' سو ایک یہ بھی ہے۔ اچھی خوراک سے دماغ ہرا بھرا رہتا ہے۔"

"جب تلک آپ شہر میں ہو' ادھر آجایا کرو' آپ کو آج کل تھوڑی ضرورت بھی ہے۔"

بٹھل کی یہ برجستگی خود کلامی کے انداز میں تھی۔ ورما کے حواس بہت تیز تھے' اس نے سن لیا اور لقمہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ وہ اپنی ہنسی نہ روک سکا "ہاں ہاں' پھر یہی کرتے ہیں' پر تم اپنے لیے وچار کرو' اس طرح تمہارا گھاٹا نہ ہوجائے۔"

"اپنی چھوڑو صاحب۔" بٹھل نے بے نیازانہ کہا "مٹی سب ایک جیسی نہیں ہوتی اور' اور کوئی ایک تو آخری دن ہوتا ہی ہے۔"

ورما نے ایک لمبی ہنکار بھری اور کہیں گم سا ہوگیا۔

بٹھل نے اس کے رکے ہوئے ہاتھ پر اعتراض کیا اور پنیر کے پکوڑوں کی قاب اس کی طرف بڑھادی۔ ان پکوڑوں کی بٹھل خود فرمائش کرتا تھا۔ پکوڑے واقعی خستہ و لذیذ تھے۔ ورما تعریف و توصیف میں سر گھمانے لگا "ادھری ولایت میں تو صاحب سارا سواد لوٹ پلٹ گیا ہوگا۔" بٹھل کے استفسار میں تبصرہ بھی شامل تھا۔

"شروع شروع میں پریشانی ضرور ہوئی۔" ورما نے جواب کا اعزاز بخشا "بعد میں منہ کو ایسا لگا کہ دیسی کی یاد ہی نہیں آئی تھی۔ لگتا تھا' اب ٹھیک سے کھانے کو ملا ہے۔ پہلے تو جیسے گھاس چرا تھا۔ وہاں کی کیا بات ہے۔ وہ لوگ کھانا پکانے اور کھانا سجانے پہ ایک سا دھیان دیتے ہیں۔ روز نئی نئی ترکیبیں نکالتے ہیں۔ وہ اتنا پکاتے اور بھونتے نہیں کہ سبزی ماس کا اپنا رنگ جاتا ہے نہ سواد۔ ادھر تو مرچ مسالے کی بھرمار سے اصلی رنگ اور سواد کا پتا ہی نہیں چلتا۔ یہاں آکے دوبارہ اپنے کھانوں کی طرف لوٹنے میں بڑی مشکل ہوئی۔ ہم سے اب زیادہ مرچ مسالے نہیں کھائے جاتے لیکن یہ' یہ تو بہت سواشٹ (ذائقے دار) ہے۔" اس نے سامنے رکھے ہوئے خوان کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "ہم نے ایک ساتھ اتنی سواد بھری چیزیں کبھی نہیں کھائیں اور پھر یہ' یہ۔" اس کا اشارہ یقیناً کھانا پیش کرنے کی نفاست

ولطافت، خوش رنگی و رنگارنگی سے متعلق تھا۔

بھٹل نے اس پسندیدگی پر ممنونیت کا اظہار کیا اور دوپہر کے کھانے تک ٹھیر جانے کی درخواست کی۔ بھٹل نے کہا کہ یہ سارا کچھ تو عجلت میں تیار ہوا ہے اور یہ تو کھانا نہیں تھا۔ دوپہر کا باقاعدہ کھانا ورما کے لیے مزید لطف و لذت کا باعث ہوگا۔ ورما نے صاف انکار کردیا وہ تادیر نہیں ٹھیر سکتا اور اتنی شکم سیری کے بعد دوپہر کے کھانے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ اس نے ابھی تک اپنی آمد کے مقصد کا سراغ نہیں لگنے دیا تھا۔ ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ کسی طور اسے آمادہ گفتار رکھا جائے۔ کھانے کے دوران، بھٹل اسے مسلسل ٹوکتا اور ادھر ادھر کے موضوعات و معاملات پر اکساتا رہا۔ ہم دستار خوانی کی مروت بھی خوب ہوتی ہے اور جب کوئی میزبان شستگی و شائستگی سے ایسے سوالات ابھار رہا ہو جن کے جواب میں کسی پیچیدگی اور ناگواری کا پہلو نہ نکلتا ہو تو چاہے کوئی طبیعتاً کتنا ہی کم سخن ہو یا اپنے رتبہ و منصب کی وجہ سے دانستہ کم سخنی و کم گوئی شعار کیے ہو، کتنی دیر تک اپنے اس ناروا، نازیبا سکوت کا متحمل ہوسکتا ہے۔ میں نے اور بھٹل نے کسی تردید اور اختلاف سے بھی اجتناب کیا تھا۔ ہم ایک بہترین سامع بنے ہوئے تھے، کسی طالب علم اور کسب فیض کرنے والے عاجز کے مانند۔ اچھے سامع ہر ایک کو مرغوب ہوتے ہیں بلکہ ان کی تلاش رہتی ہے۔ بھٹل کی کوشش رائیگاں جاتی رہی۔ وہ ورما کی آمد کی غرض و غایت جاننے میں ناکام رہا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ورما کے چہرے پر کھنچی مغائرت اور کدورت کی لکیریں کم ہوتی رہیں۔ وقت خاصا گزر گیا۔

قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے ورما نے ایک بار پھر مجھے کشمکش سے دوچار کیا۔ کہنے لگا "تم نے سنا ہوگا استاد، پولیس کی دوستی اچھی ہے نہ دشمنی۔"

"اپنی آپ کی دشمنی کا کوئی کارن نہیں بنتا۔" بھٹل نے مستعدی سے کہا۔

"اور دوستی کا بھی تو۔" ورما بے باکی سے بولا۔

"دوستی کا ایک ہی کارن بہت ہے، ایک کا دوسرے کو بھلا لگنا۔"

"ہم ہم تمہیں کیسے لگتے ہیں؟"

"ہم آپ کو ابھی باہر سے لوٹا سکتے تھے۔"

ورما بیٹھے بیٹھے لہرا سا گیا اور خاموش رہا پھر اٹھنے کے لیے کسمسانے لگا "اب چلتے ہیں استاد۔"

"ایسا کیسے صاحب۔" بھٹل کی استدعا رہی تھی

"تھوڑا اور بیٹھیے۔"

"جانا ہے۔" ورما نے مختصراً کہا اور کسی قدر بے چینی سے بولا "تم نے نہیں پوچھا، ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔"

"کیا جاننا ہے۔ اپنے واسطے آپ کا ادھری آنا اور ساتھ بیٹھنا بہت ہے اور کوئی بات ہو تو بولو۔"

"تم کو دوبارہ دیکھنے کو من کرتا تھا استاد۔" ورما اپنے لہجے کا طنز نہ چھپا سکا۔

"ہم تو دیدن کرانے اس دن کوتوالی پہنچے تھے۔"

"ہاں!" ورما تیوری چڑھا کے بولا "اس دن ضروری میٹنگ تھی۔"

"بعد کو کسی تجنت ٹائم پہ اپنے کو بلوا لیتے۔"

"سے ہی نہیں ملا اور ہم کو خود یہاں آنا بھی تھا۔" ورما نے بیٹھک کے در و بام پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے کہا "تم کو دیکھنے، تمہارا یہ راج سنگھاسن دیکھنے۔"

"یہ اپنا راج سنگھاسن نہیں ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے، راج بھون بولو، سنا بہت تھا، پر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔"

"کدھری دیکھا ابھی، تھوڑا ٹائم اور دو، اندر چلتے ہیں۔"

"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی بہت ہے۔ اٹ از ویری مسٹیریس۔ اس کو دیکھنے کے بعد...." ورما پہلو بدل کے بولا "کوئی شک نہیں، کسی کو بھی اس کی فکر ہونی چاہیے۔ کوئی بھی اور کبھی بھی ٹھاکروں جیسے راون رستہ بھٹک کے ادھر کا منہ کر سکتے ہیں۔"

ورما نے اب کوئی ابہام رہنے نہیں دیا تھا۔" بھٹل نے غیر متوقع طور پر جواب نہیں دیا۔

ورما اپنی نشست سے یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور کپڑوں کی شکنیں، ٹائی درست کرتا ہوا، بھٹل کے روبرو آ کے بولا "ہمارا کام جاری ہے۔ ہم نے ہر طرف چھان بین کرلی ہے اور کر رہے ہیں اور ابھی نہیں، سینٹر سے کورے ماسٹر جی آ گئے ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں مل رہا۔ لوٹ کے وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اتنا ڈی پلینڈ جرم کوئی بڑا گروہ ہی کر سکتا ہے۔ وہ ٹھاکروں کے رشتے دار یا ان کے مال پہ نظر رکھنے والے ڈاکو لٹیرے نہیں ہوسکتے۔ یہ تو بہت پلانڈ سوچا سمجھا ہوا ایکس پرٹ لوگوں کا ایڈونچر ہے۔"

بھٹل نے آنکھیں موند لیں۔

اس کی خاموشی سے ورما جز بز ہونے لگا اور سرد آواز میں بولا "اور یہ معاملہ ایسا نہیں، ایک دو آدمیوں کا نہیں،

42 آدمیوں کا خون کا ہے۔ وہ ستائیس نہیں تھے۔ یہاں کی پولیس نے جان بوجھ کے گنتی کم کی یا اسے اس رات ٹھاکر بستی میں باہر سے آنے والوں کے بارے میں پوری جان کاری نہیں تھی۔ پولیس تھک کے چپ ہو جائے اور ہاتھ پیر چھوڑ دے تو اوپر سرکار تلی بیٹھی ہے۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے۔" بجھل نے ہم نوائی کی۔

"اور صرف دوسرا سرا ملنے کی دیر ہے۔"

"شاید نہیں ملے آپ کو۔"

"یہ، یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟؟"

"آپ ہی بول رہے تھے۔ کوئی سورما لوگ تھے۔ پورا دیکھ بھال کے ادھری گئے ہوں گے۔"

"لیکن پولیس میں بھی کمی نہیں، دیکھنے، سننے سوچنے اور بال کی کھال نکالنے والوں کی۔"

"پھر تو مل جائے گا۔" بجھل کا لہجہ استہزائی نہیں تھا۔ اس نے بہ ظاہر اکتاہٹ سے کہا "اپنے لیے کوئی حکم ہو تو بولو۔"

"تمہیں معلوم ہے، تم کس وجہ سے کھلے پھر رہے ہو؟؟"

"آپ برا مانو گے، پر صاف بولیں۔" بجھل نے اینٹھی ہوئی آواز میں کہا "بیچ میں آپ کے ہونے سے اتنا ٹائم بھی لگا اپنے کو۔ ہم لٹکے رہے۔"

"ورنہ کیا ہوتا؟؟" ورما نے تلخی سے پوچھا۔

"جتنی جلدی وہ کرتے، اتنی جلدی اپنی مکتی ہو جاتی۔ ایک ہاتھ سے پھندا ڈالتے، دوسرے سے گانٹھ کھولتے۔ اپنے ساتھ اب کچھ نیا نہیں ہوتا۔ ادھر ہم بھی ایسے سے کے لیے ڈوریاں ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ آپ نے کوئی چھوٹ ڈھیل نہیں دی اپنے کو۔ آپ ان میں زیادہ سیانے ہو۔ ٹنٹی پہ پکے کی بات اور ہوتی ہے۔ تھوڑا اپنے کو دیکھنا، آگے پیچھے کا وچار بھی کرنا تھا آپ کو۔ ذرا ترچھا پڑنے پہ پچھلے کا سارا اکارت ہو جاتا۔ سامنے صاف ہونے پہ تھوڑا داپا ٹھیک رہتا ہے۔ کیا بولیں، آپ سارا جانتے ہو۔ اوپر سر کے اجلے کالے سے اندر گودے کا کوئی ناتا نہیں۔ کوئی آگے کی بات ہو تو بولو صاحب۔" بجھل نے ناگواری سے کہا۔ "پہلی دفعہ سامنے پڑنے پہ ہم نے سارا برابر کر دیا تھا۔ اس کے بعد اپنے پاس کچھ نہیں ہے اور اب ہم ادھری سے جا رہے ہیں۔"

ورما کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ بجھل کے چپ ہو جانے پر اس نے جیسے کب کی رکی ہوئی سانسوں سے سینہ ہلکا کیا اور زہرخند سے بولا "اور جلدی تم کو لوٹ کے بھی آنا ہے۔"

"وہ بھی دیکھ لیں گے صاحب، جدھری ہوں گے، آ جائیں گے، بعد کو پورا ہرجانہ خرچا بھی لیں گے اور آپ دھیرج رکھو، آپ پہ بھاری نہیں پڑے گا۔" بجھل نے ورما کو مزید کچھ کہنے نہیں دیا اور تاکیدی انداز میں وہی کچھ دہرانا مناسب سمجھا جو وہ چند پہلے کوتوالی میں ورما کے ماتحت پولیس افسر سے کہہ چکا تھا۔ اس نے کہا کہ بہتر ہوگا، ہماری عدم موجودگی میں حویلی کے مکینوں سے کوئی علاقہ نہ رکھا جائے۔ انہیں چھیڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پیچیدگی ہی بڑھے گی۔ ہماری طلبی مقصود ہو تو کلکتے میں استاد جامو سے رابطہ کیا جائے۔ ہم تک طلبی کی اطلاع پہنچنے اور ہمارے فیض آباد آنے میں کچھ وقت صرف ہو سکتا ہے لیکن پولیس اطمینان رکھے، ہم بہرصورت واپس آ جائیں گے۔

ورما کے ہونٹوں پر طنز و نخوت سے آلودہ مسکراہٹ عود کر آئی۔ اس نے سر ہلایا اور ڈیوڑھی کی طرف جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جوتے پہن کر ہم تینوں ایک دوسرے کے پیچھے ڈیوڑھی میں آئے۔ ادھر سے شکوران بی کی بڑبڑاتی چاپیں سنائی دیں۔ تینوں رک گئے۔ شکوران بی خاص دان لائی تھی۔ میں نے خاص دان اس کے ہاتھ سے لے کے ورما کے سامنے پیش کر دیا "ہم ہم پان نہیں کھاتے۔" وہ گھبرا کے بولا۔

"ادھری جیسا پیچھے نہیں کھایا ہوگا۔" بجھل نے اسے حوصلہ دیا اور اشتیاق پیدا کیا۔

ورما نے ایک لمحاتی تامل و تردد کے بعد چاندی کے ورق میں ملبوس بیڑا اٹھایا۔ ابھی اس نے بیڑا منہ میں رکھا تھا کہ پلکیں جھپکانے لگا اور انگریزی میں بے ساختہ بولا "ہا! از ڈیلی سس.... مارویلس۔"

اس کے چہرے کی بشاشت کسی قدر لوٹ آئی تھی۔ حویلی کے وسیع چبوترے کے نیچے گلی میں سیاہ رنگ کی موٹر کھڑی تھی۔ بندوق بردار اردلی اور وردی پوش ڈرائیور وہاں موجود تھے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے بجھل نے بڑبڑاتے انداز میں کہا "پولیس کا الٹا سیدھا بھی پلے نہیں پڑتا صاحب، راون کو منانے والے کو بھی شما نہیں دیتی۔" ورما ایک ذکی الحس اور تیز فہم شخص تھا، اس نے بجھل کا مفہوم سمجھ لیا ہوگا کہ کسی ستم کار سے خلق خدا کو نجات دلانے والا بھی مستوجب سزا ہے، گردن زدنی ہے، یہ بوالعجبی بھی خوب ہے۔

موٹر میں بیٹھنے سے پہلے ورما چند لمحے مجھے اور بجھل کو متلاطم نظروں سے دیکھا کیا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے میں بھی پہل نہیں کی تو ہم نے بھی اپنے ہاتھ کھینچ

رکھے لیکن ہمارے سلام کا جواب اس نے سر کی خفیف جنبش سے ضرور دیا۔ اس کے بیٹھتے ہی موٹر روانہ ہو گئی۔

بجھل اور میں دیر تک چبوترے پر کھڑے رہے، دیکھتے ہی دیکھتے موٹر گلی کے موڑ سے او جھل ہو گئی۔

ہم ٹھیک آٹھ بجے فیض آباد اسٹیشن پہنچ گئے۔

اندر آنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی چالیس منٹ کی تاخیر سے لکھنؤ سے آ رہی ہے۔ بجھل ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ فرسٹ کلاس کے اس ویٹنگ روم میں نسبتاً سکون تھا۔ پلیٹ فارم پر تو بہت بھیڑ تھی اور چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ باوردی نگراں نے ہمیں ایک گوشے میں آرام کرسیوں پر بٹھا دیا اور چائے کے لیے پوچھا۔ خالی بیٹھے رہنے سے کچھ شغل بہتر تھا۔ بجھل سے اجازت ملنے پر نگراں نے فدویانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا اور سر جھکائے باہر چلا گیا۔

اس کشادہ اور عمدہ قسم کے ساز و سامان سے آراستہ صاف ستھری انتظار گاہ میں پہلے سے ایک جوڑا موجود تھا۔ ایک خوش پوش ادھیڑ آدمی اور گلابی ساڑھی میں ملبوس، لگ بھگ تیس سال کی عمر کی ایک سانولی، نازک اندام عورت۔ وہ کوئی بڑا افسر معلوم ہوتا تھا۔ ہماری آمد پر اس کا چہرہ واضح طور پر بگڑ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ہماری وضع قطع اول درجے کے مسافروں سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

دوپہر کھانے کے بعد، بجھل نے روانگی کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت سبھی دسترخوان سے اٹھنا چاہتے تھے۔ سبھی کو جیسے دھکا سا لگا۔ حالانکہ بجھل نے دو تین دن پہلے ہی انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کے بجائے بجھل حویلی سے نکل گیا اور سورج غروب ہوتے وقت واپس آیا۔ یقیناً وہ اڈے کے لوگوں سے وداعی ملاقات کے لیے گیا ہوگا یا پھر کہیں اور، وکیل بھارگو سے صلاح مشورہ کرنے، اسے کچھ ہدایتیں دینے۔ ورما، خانہ پری والا افسر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کوئی ابہام بھی نہیں رہنے دیا تھا، صاف جتلا دیا تھا کہ حقائق جاننے کے لیے وہ کتنا مضطرب ہے اور کہاں تک جا سکتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں اس نے پولیس کی ملازمت سے دست بردار ہو جانے کا عہد کر رکھا ہے۔ کون جانے، ہماری روانگی میں رکاوٹ نہ ڈالنے میں بھی کوئی مصلحت چھپی ہو۔ ورما سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز ہی مختلف تھا۔ بجھل کو بھی اس کا احساس تھا کہ ابھی دھند پوری طرح نہیں چھٹی ہے۔ ہمیں بہت محتاط رہنا تھا۔ پولیس نے کوئی شرط عائد نہیں کی تھی لیکن بجھل نے اپنی جانب سے ایک طرح کا وعدہ کیا تھا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہوئے کلکتے میں مقیم استاد جامو کو باخبر رکھے گا۔ بہتر ہے، حویلی کے مکینوں کو تنگ کرنے کے بجائے پولیس پہلے استاد جامو سے رابطہ قائم کرے۔ ہر چند یہ ایک مشکل کام تھا۔ نئے مقامات پر ہمیں اپنی سکونت کا کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ بس یہی ہو سکتا تھا کہ ریل سے اترتے ہی ہم اس مقام کے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور اسٹیشن ماسٹر کی معرفت جامو سے تار منگوائیں۔ ہر جگہ آمد اور روانگی کے وقت اسٹیشن ماسٹر کی خدمت میں حاضری لازم قرار دیں۔ مشکوک لوگ جس طرح صبح و شام تھانے میں حاضری دینے کے لیے پابند کیے جاتے ہیں۔

انتظار گاہ کے نگراں کے ساتھ سفید وردی پوش خادم ہاتھ میں تشت اٹھائے اندر آیا۔ تشت سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ ضیاع بھی اقبال مندی کی ایک نشانی ہے۔ ضیاع سے دولت کو داد ملتی ہے۔ بجھل نے صرف چائے کے لیے کہا تھا۔ تشت میں چائے کے علاوہ تشتریوں میں کئی طرح کے لوازم سجے ہوئے تھے، مکھن توس، انگریزی بسکٹ، کیک اور پیسٹریاں۔ ہم میں سے کسی کو ان کی طرف رغبت نہیں ہوئی۔ گھر سے ہم خوب کھا پی کے چلے تھے اور زریں نے منع کرنے کے باوجود جانے کیا کیا چیزیں ساتھ کر دی تھیں۔ بجھل نے چائے نوشی سے پہلے کمرے میں موجود مسافر سے چائے کے لیے پوچھا۔ مسافر لمحے بھر کے لیے سٹ پٹایا پھر اس نے انکسار سے انکار کر دیا۔ انکسار صاف مصنوعی تھا۔

اتنے دن گھر میں رہنے اور گھر میں تقریب بند رہنے کے بعد مجھے یہ گرد و پیش عجیب سا لگ رہا تھا جیسے سفر کیے ہوئے وقت گزر گیا ہو۔ ان سب کے چہرے آنکھوں میں گھوم رہے تھے کانوں میں ان کی آوازیں، آہٹیں بسی ہوئی تھیں۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے وہ سبھی اسٹیشن آنے کے خواہش مند تھے۔ بجھل نے انہیں روک دیا۔ ان آخری لمحوں میں جب حویلی سے باہر جانے کے لیے ہم دروازے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے، ہمیں ٹھہر جانا پڑا۔ یاسمن بڑکنے لگی تھی۔ بجھل نے پلٹ کے اسے بازوؤں میں چھپا لیا اور اسے تھپکیاں دیتا رہا۔ نیساں اور فروزاں، بڑی اور چھوٹی سلمی بھی پھر ضبط نہ کر سکیں۔ زریں، خانم اور زہرہ کو اپنے آپ کو قابو میں رکھنا آتا تھا لیکن کبھی خاموشی آنسوؤں سے زیادہ کاری ہوتی ہے۔ ادھر ارشد، تنویر اور نصیر بابا بھی بہت سراسیمہ، گھبرائے گھبرائے سے لگتے تھے۔ فیض آباد میں ہمارے آنے کے بعد پیش آنے والے حالات سے وہ کم و بیش واقف تھے۔ یہ کم و

بیش کی شناسائی بھی بڑی ستم ناک ہوتی ہے۔ تاہم کسی نے ہم سے مزید کچھ عرصے ٹھیر جانے کی التجا نہیں کی۔ انہیں احساس ہونا چاہیے تھا کہ بٹھل نے روانگی کا ارادہ کسی اطمینان کے بعد ہی کیا ہوگا۔ بٹھل نے انہیں یہی کچھ جتانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر باری باری سب کے سروں پر ہاتھ رکھے اور بہ طور خاص فروزاں کے پاس جاکے اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے بولا "جلدی آنے کا کریں گے اب کے اور پیچھے خیر خبر بھی رکھیں گے۔ کوئی بات ہو تو اپنے کو کلکتے کے پتے پر چٹھی ڈال دینا۔" فروزاں بلک پڑی۔ اسے زریں کے حوالے کرکے بٹھل نے پھر مڑ کے نہیں دیکھا اور بہ عجلت دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے جلدی نہیں کی۔ میں نے بھی جو لفظ مجھے آتے تھے، فروزاں کی دل جوئی کرنی چاہی مگر وہ کچھ اور ہی سننا چاہتی تھی۔ کوئی کچھ اور سننا چاہتا ہو اور کہا کچھ اور جارہا ہو تو لفظ بڑے بے وقعت ہوجاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ کے آرہے تھے۔ میرا سینہ بھی پگھلنے لگا تھا۔ میں نے طے کیا کہ بٹھل سے کہوں گا، پہلے وہ دھن باد اترے اور ظفر کو فیض آباد روانہ کرنے کی تعمیل کرے۔ وہ تو اشارے کا منتظر ہوگا۔ اس کی آمد سے دونوں بہنوں کے اضطراب میں کمی ہوجائے گی۔"

ویٹنگ روم میں ہمیں آئے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ سامنے دروازے کے پٹ جھٹکے سے کھلے۔ وہ استاد سلامی تھا۔ اس کے ساتھ اڈے کے دو اور آدمی دینو اور بنا بھی تھے۔ تینوں قاعدے کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کے بٹھل کا جسم تن گیا اور پیشانی پر لکیریں کھنچ آئیں۔ استاد سلامی دروازے ہی سے ہاتھ باندھے آیا تھا "اپنے کو معاف کرو استاد!" وہ مچلتی آواز میں بولا "تم نے منع بولا تھا پر ایمان سے جی نہیں مانا۔"

بٹھل بت بنا رہا۔

استاد سلامی نے اس کے پیر پکڑ لیے "جبل پور سے تمہارے لیے خاص قسم کی بیڑی منگوائی تھی۔ سالے ورکی نے آنے میں دیر لگادی۔ سوچا ادھری پڑی پڑی سوکھ جاویں گی۔ اب پھر تمہارا کب پھیرا لگے۔" اس نے دائیں طرف بیٹھے دینو کی طرف جلدی سے ہاتھ بڑھایا۔ دینو نے بڑبڑاتے ہوئے ریشمی کپڑے کی ایک چھوٹی پوٹلی بٹھل کے آگے کردی۔ بٹھل نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں نے دینو سے پوٹلی لے کے بیگ میں ڈال دی۔

"جا چکی ہے۔" بٹھل نے تنک کے پوچھا۔

"نانا استاد۔" سلامی سر جھٹک کے بولا "تم کو دیکھ لیا، جانو ساری پیاس تھکن دور ہوگئی۔ من میں شام سے بے کلی ہورہی تھی۔ وہ تو سالے سارے کے سارے آنے کو پھڑک رہے تھے۔ مشکل سے کھونٹے سے باندھ کے آیا ہوں کہ پوچھو ان حرام خوروں سے۔" استاد سلامی نے دینو اور بنا کی تائید چاہی۔

"بیٹھ جا رے چرکا۔" بٹھل نے ناگواری سے کہا پھر لمحے بھر کے توقف کے بعد بولا "ان کو کھینچ کے رکھنا ہے۔"

"پکا استاد!" سلامی سینہ ٹھونک کے بولا "جو حرام کا جنا مستی کرے گا، اپنی مٹی خراب کرے گا۔ تم آرام سے جاؤ۔ آگے تم دیکھنا۔ چاروں خانے ٹھیک رہے گا۔"

سلامی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ رک گیا۔ انگریزی لباس میں تیس بتیس سالہ شخص ہاتھ میں بڑا سا چرمی بیگ لیے انتظار گاہ میں داخل ہوا اور ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی رسالہ دبا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کے وہ رسالے کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ سلامی نے معنی خیز نظروں سے بٹھل کو دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولا "کیا بولتے ہو استاد!"

بٹھل نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔

"اپنے کو تو تنگی والا جان پڑے ہے۔"

بٹھل نے ہنکاری بھری۔

"پھر تو استاد تمری تیرتھ یاترا اچھی گرما گرم رہے گی۔" سلامی نیلے پن سے بولا "بٹھل کی خاموشی پر وہ سنجیدہ ہوگیا اور اس کا منہ بن گیا "حرام کے اور سرکاری مال میں تھوڑا ہی انتر ہے۔ سالے اوپر والوں کو تھما رہے ہیں اور خوب مال پانی بنا رہے ہیں۔ اوپر والوں کو کبھی کبھار پیاں بھی لونی لگتی ہے۔ کم جارہے ہو پر ابھی سارا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سور کمانے آگے بھی بہت اندھا پن کریں گے۔"

"پر ادھری چوکی پر تو بھی تو راجا بنا بیٹھا ہے۔"

"جتنا چاہے جوتے مار لو، تمہارا حق ہے۔ اپنے کو پتا ہے، کوئی مائی کا لال ہی چوکی پر بیٹھتا ہے۔ تمہارے اس غلام نے بھی اپنی ماں ہی کا دودھ پیا ہے۔ وہ تو تم ادھر تھے "اپنے لیے دیکھنے اور کرنے کو کیا رہ جاتا تھا۔ آگے جو ہوگا، دیکھ لیں گے استاد۔ تم سے بھی سارا جان لیا ہے اور اپنے سب حرام زادوں کو بھی بول دیا ہے۔ تم بے فکر ہوکے جاؤ اور کچھ نہ انیس بیس ہوا تو اپنا استاد جامو کتنا دور ہے۔ شام کو تار دو گا، سویرے ادھر آجاوے گا۔ اب اپنے پہ تھوڑا بھروسا کرو جامو اور جمرو استاد نے کچھ سمجھ ہی کے چوکی پر راجا کیا کرنے کا مان دیا ہے۔" سلامی کے عجز میں شکوہ بھی نمایاں تھا۔

بٹھل نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ سلامی اس کے پیر دبانے لگا۔ اول درجے کی انتظار گاہ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا ... پہلے سے موجود میاں بیوی ہم سے دور بیٹھے تھے۔ ... کی آواز شاید ان تک نہ پہنچ رہی ہو لیکن کمرے میں ... روشنی تھی اور بینائی کے وہ دونوں کمزور بھی نہیں معلوم ... تھے۔

... کچھ دیر خاموشی رہی۔ سلامی کی نظریں بار بار رسالے ... مطالعے میں مصروف مسافر پر جاتی تھیں۔ وہ شخص بے ... بیٹھا تھا۔ سلامی کو جیسے کسی نے کانٹا چبھو دیا ہو کہ ایک اور ... آواز میں بولا "ایک بات پلے نہیں پڑتی استاد۔ جس ... ٹھاکروں کے ہاں ہولی کھیلی گئی، ہم لوگ دلن بیگم کے ... کے یہاں مجرے کی محفل میں تھے۔ ایک دو نہیں گانٹھ کے ... رے نہ ہوں پر آنکھ کے پورے، بیس گواہ تھے اور پھر ان ... سرے تیس ماروں نے خود بھی اچھی طرح چھان پھٹک کرلی ... ی۔ یہ بات تو سامنے کی ہے کہ اس رات ہم ادھر شہر میں ... تھے.... پھر کیا رہ جاتا ہے کون سے قانون سے۔"

"چپ رہ۔" بٹھل نے اسے دھتکار دیا "قانون کے ... کے ڈوری کھینچنے والا بھی انتا ہی پاپی ہوتا ہے۔ ان کا بولنا ... ہے، ڈوریاں اپنے ہاتھ میں تھیں۔"

"ہاں!" سلامی نے کسی قدر ہذیانی انداز میں کہا "ایسا ... لیے.... اپنا کیا واسطہ.... "وہ ہکلانے لگا اور گالی بکتے ہوئے ... بولا۔ "سارے بالکل ہی پیدل ہوگئے ہیں۔"

"نشانہ ٹپ نہیں رہا رے۔" بٹھل کی آواز بھری تھی۔

"تیر کمان تو چاروں اور تھمانا پڑے گی۔"

"اور بیچ میں جو دس بیس حرام موت کام آجاویں ... گے۔"

"آجانے دے۔ سرکار کو معاف ہوتا ہے، پھر سرکار ... کی ہوئی۔" بٹھل نے سرد مہری سے کہا۔

"اتنا بھی اندھیر نہیں ہوتا۔" سلامی کی آواز بجھ سی گئی ... اور وہ کسی حد تک بچوں کی طرح مچل کے بولا "ایک بات ... بولوں استاد! ایسے وقت تم ادھری نہ ہوتے تو یہ سور کی اولاد ... اپنے کو تو گھنی کا ناچ نچا دیتے۔ کوتوالی میں اس رات جب اپنے ... مزدوروں کی بے وجہ دھنائی کی جارہی تھی تو سب بولا گئے ... تھے۔ ایک دم پڑی سے اتر گئے تھے ایمان سے۔ دو چار کو تو اس رات ضرور ٹھکانے لگا دیتے۔ بعد کو کیا ہوتا، بعد کو دیکھا جاتا۔ ان پہ تو خون سوار تھا۔ وہ تو بس تمہارا دھیان تھا استاد!"

میری توجہ کسی اور طرف تھی۔ میری سمجھ میں دیر سے آیا کہ ان کا مقصد ایک دوسرے کو قائل کرنا نہیں، انہیں اپنے بازو میں بیٹھے ہوئے شخص پر شبہ ہے اور وہ اسے اپنی تکرار سے کچھ باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہ سوال و جواب، حیرانی، غصہ، نفرت اور بیزاری کا اظہار عمداً ہے۔ سلامی نے ٹھاکر بستی میں خون خرابے کی رات مجرے کی محفل میں ہماری موجودگی کا ذکر بہت چونک کے بٹھل سے کیا تھا۔ جیسے پہلی بار یہ نکتہ اس کے دماغ میں روشن ہوا ہو۔ ابھی ابھی یہ دلیل اسے سوجھی ہو۔ یہ دلیل ہماری سب سے بڑی پیر تھی۔ دلیل کیا، شہادت۔ اس سے ہماری برات کے پہلو نکلتے تھے۔ سلامی کی حیرانی کے جواب میں بٹھل کی وضاحت اور وضاحت کی سادگی بھی دانستہ تھی۔ سلامی کا شبہ کچھ ایسا خیالی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ رسالے کے مطالعے میں مصروف شخص ہم سے اتنے قریب بیٹھے رہنے کے باوجود کیا بے گانہ بنا ہوا تھا۔ وہ اندھا نہیں تھا، بہرا بھی یقیناً نہیں ہوگا۔ بٹھل اور سلامی کے درمیان ہونے والی اس قسم کی گفتگو سن کے کسی تشویش اور اضطراب کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہونے چاہیے تھے۔ اس کے برعکس نسبتاً دور بیٹھے میاں بیوی خاصے بے چین نظر آرہے تھے۔ اگر واقعی وہ آدمی پولیس کا فرستادہ ہے تو سلامی کا یہ اندیشہ بھی درست ہونا چاہیے کہ آگے سفر میں بھی ہمارے تعاقب کا سلسلہ جاری رہے گا۔ پولیس افسر رمانے بھی صبح دہلی میں آتے ہی یہ کہا تھا کہ پولیس نے ہمیں شبے سے بری نہیں کیا ہے۔ ادھر بٹھل اور سلامی کو بھی اڈے میں چھو کی بھیدیوں کی موجودگی کا تلخ احساس ہونا چاہیے۔ بٹھل نے سب پر اڈے جاکے اپنی روانگی کے متعلق بتایا تھا۔ اڈے ہی کے کسی آدمی سے اس نے ٹکٹ منگائے ہوں گے۔ پولیس کیسے خبر ہوگئی، یہ الگ بات ہے، بٹھل ہی نے اڈے کے لوگوں کو اپنی مخبری پر مامور کیا ہو کہ پولیس کو ہمارے تعاقب سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا بلکہ ہمارے لیے تو یہ کچھ بہتر ہی تھا۔ ہمارے سفر کی مصروفیت جان کے ان کی شدت میں کمی ہوسکتی تھی۔ یہ تعاقب ان کے لیے اعصاب شکن بھی تھا اس کا احساس چند بستیوں کے بعد ہی انہیں ہونا چاہیے۔

انتظار گاہ کے نگراں نے سر جھکا کے ہمیں بتایا کہ گاڑی کی آمد کا اعلان ہوچکا ہے۔ چند لمحوں میں چائے لانے والا خادم بھی آگیا۔ بٹھل نے اسے بخشش کے ساتھ چائے کے پیسے ادا کیے۔ ... کبھی اس نے بند مٹھی سے پوری رقم دی۔ ... سارا جسم لرزا گیا۔ ہم اٹھنا چاہتے تھے کہ سلامی

نے جُھل کے پیر پکڑ لیے۔ "استاد! بس ایک منٹ ... اپنے یہ دیبو اور بنا ..." جُھل کی آنکھوں میں تندی دیکھ کے سلامی کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"کیا ہے رے؟" جُھل نے جھڑکتی آواز میں پوچھا۔

سلامی کے اشارے پر دیبو اور بنا نے نہایت عجلت سے اپنی جیبوں سے کھٹکے دار چاقو نکال کے جُھل کے قدموں میں ڈال دیے۔ چاقو نئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ ایک قدیم رسم تھی۔ نئے چاقو پر کسی مستند استاد کا ہاتھ پھروانا اچھی علامت سمجھا جاتا تھا مگر اس مظاہرے کا اس وقت کوئی محل نہیں تھا۔ مجھے ناگوار محسوس ہوا۔ جُھل کا چہرہ بھی مکدر ہوا لیکن اس نے تحمل سے دونوں چاقو اٹھا لیے۔ ان کے دستے نقشین تھے۔ پورے چھ انچ لمبائی ہوگی۔ جُھل نے باری باری انہیں کھولا۔ کھٹکا دبتے ہی تیزی سے پھلکا باہر آجاتا تھا۔ روشنی میں پالش کیے ہوئے پھلکے چمچما رہے تھے۔ جُھل نے انگلی پھیر کے دھار کا اندازہ کیا "اچھے ہیں رے۔" اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"پھر قبول کرو استاد۔" سلامی جھٹ سے بولا۔

"تارے۔" جُھل نے چاقو بند کر کے دیبو اور بنا کے ہاتھوں میں تھما دیے۔ انہوں نے سر سے آنکھوں سے لگایا اور جیبوں میں واپس رکھ لیے۔

"چاقو سے پہلے انگلیوں پہ دھار رکھ۔" جُھل کا لہجہ تلقینی بھی تھا تنبیہی بھی۔ یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ دونوں میاں بیوی نے کرسیاں چھوڑ دی تھیں۔ ان کے لیے یہ منظر ایک تجربہ ہوگا۔ اس اثنا میں ان کا قلی بھی آگیا تھا لیکن ہمیں اٹھتا دیکھ کے وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔ پڑوس کا مسافر رسالہ تہ کر کے بیگ اٹھائے بے نیازانہ پہلے ہی دروازے سے نکل چکا تھا۔ ہمارا قلی بھی ہانپتا کانپتا اندر آگیا تھا۔ دیبو اور بنا نے اسے سامان اٹھانے نہیں دیا۔ قلی خالی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ڈبے تک اس نے ہماری رہنمائی کی۔ گاڑی آنے پر افراتفری سی ہوگئی تھی۔ مگر جلد ہی پلیٹ فارم پر گونجتے شور اور بھاگ دوڑ میں ٹھہراؤ آگیا۔ جب تک گاڑی نے حرکت نہیں کی' سلامی' دیبو اور بنا ہمارے ساتھ ہی بیٹھے رہے اور چلتی گاڑی سے کود کے رخصت ہوئے۔ ان کا بس چلتا تو ہمارے پاس ہی بیٹھے رہتے۔ منٹوں میں گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی۔ فیض آباد شہر کی روشنیاں کچھ دور ساتھ چلتی رہیں پھر گاڑی اندھیروں میں آگئی۔